رودِ کوثر

شیخ محمد اکرام

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ

یہ کتاب برِصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی مذہبی، ثقافتی اور علمی تاریخ اور ان کے کارناموں پر مشتمل ایک اہم دستاویز ہے اور اس کو سلسلۂ کوثر کی دُوسری کڑی کی حیثیت حاصل ہے۔ اس میں عہدِ مُغلیہ سے لے کر سرزمینِ برِصغیر پر انگریزوں کے قابض ہونے تک کے واقعات معرضِ تحریر میں لائے گئے ہیں۔ عہدِ مغلیہ میں عُلَما، مشائخ اور صُوفیہ نے جو خدمات انجام دیں اور اُن سے جو نتائج برآمد ہوئے، اُن کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ شیر شاہ سُوری اور خاندانِ سُوریہ کے دیگر حکمرانوں کے حالات اور اس عہد کے اسلامی و علمی واقعات بھی زینتِ کتاب ہیں۔ کتاب میں مسلمانوں کے مُختلف فرقوں کے بارے میں بھی معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ یہ کتاب اس قسم کی بے شمار معلُومات کا مُستند ذخیرہ ہے۔

رودِ کوثر

اسلامی ہند اور پاکستان کی مذہبی اور علمی تاریخ

عہدِ مُغلیہ

اِدارۂ ثقافتِ اسلامیّہ
۲۔ کلب روڈ، لاہور

ISBN 969-469-04102

سنہ اشاعت: جون 2005ء

تعداد: 1100

ناشر: ڈاکٹر رشید احمد (جالندھری)
ناظم ادارہ ثقافتِ اسلامیہ

مطبع: مکتبہ جدید پریس، لاہور

قیمت: -/300 روپے

اس کتاب کی طباعت و اشاعت اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، انفاق فاؤنڈیشن، کراچی اور محکمہ اطلاعات و ثقافت، حکومتِ پنجاب کی مالی معاونت کی بدولت ممکن ہوئی ہے۔ شکریہ!

فہرستِ مضامین

۴ - شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ

نمبر شمار	عنوان	صفحہ

۸ ۔ بنگال میں اسلام

۹ ۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ

حکیم الامت کون ہے؟

حکیم الامت کے فرزانِ ارجمند

تمہید

(۱۹۵۷ء)

رُودِ کوثر اسلامی ہند اور پاکستان کی مذہبی تاریخ کی دوسری کڑی ہے۔ اس میں عہدِ مغلیہ کی شخصیتوں اور تحریکوں کا بیان ہے۔

ہر ایک دَور کی تاریخ نویسی خاص مسائل اور مخصوص مشکلات سے دوچار ہوتی ہے۔ ابتدائی ایام کے متعلق بڑی دشواری کمیِ معلومات کی تھی۔ عہدِ مغلیہ کے متعلق معلومات اور روایات کی افراط ہے۔ یہاں اصل مشکل بے خبری نہیں، بلکہ افواہوں، غیر مصدقہ قصوں اور غلط تاثرات کا وہ رنگ و روغن ہے، جس نے حقیقت کے خدوخال چھپا دیے ہیں۔

اس صورتِ حال میں غالباً سب سے زیادہ دخل مولانا ابوالکلام آزاد کے تذکرہ کو ہے۔ مولانا کی قابلیت اور علم و فضل مسلّمہ ہے۔ بلاشبہ تذکرہ ایک عہد آفریں کتاب ہے۔ انشا پردازی کا شاہکار بھی اور علم و فضل کی ضیافتِ خوش ذائقہ بھی۔ لیکن مولانا کو مؤرخ ہونے کا دعویٰ نہیں۔ ہماری قومی تاریخ کے جن واقعات کو انھوں نے بیان کیا ان کے ذکر سے ان کا مقصد مورخانہ نہ تھا۔ پھر اُن کے متعلق مولانا نے جو کچھ لکھا تھا، اس سے وہ بہت آگے نکل گئے[1] لیکن مولانا کی کمال انشا پردازی نے ان نیم صحیح بیانات کو اردو ادب میں دوامی جگہ دے دی ہے۔ اور "انشا پرداز کا ایک فقرہ ہزاروں علمی اور تاریخی اوراق پر بھاری ہوتا ہے۔" (مہدی گورکھپوری)۔ اب حالت یہ ہے کہ ان مضامین پر جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ بیشتر تذکرہ ہی کی صدائے بازگشت ہے! مولانا کی سحر نگاری سے کئی مشتبہ امور نے مسلّمات کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔

---

[1] مثلاً بدایونی کے متعلق تذکرہ اور پچیس برس بعد کی تصنیف غبارِ خاطر میں جو تفاوتِ فکر ہے۔ وہ غور کی مستحق ہے۔

مثلاً یہ کہ اکبری الحاد کا قلع قمع "تن تنہا" حضرت مجدد الف ثانیؒ نے کیا۔ یا یہ کہ اکبر کی شیخ الاسلام (مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطانپوری) اور صدر الصدور (شیخ عبدالنبی گنگوہیؒ) میں بُرائیاں ہی برائیاں تھیں اور اکبر کی مذہبی پالیسی متعین کرنے کا باعث فقط ان علماؒ کی خرابیاں تھیں۔ اکبر کی اپنی سیاسی اغراض نہ تھیں یا یہ کہ جب شیخ عبدالحق محدث نے حضرت مجددؒ کے بعض بیانات کے متعلق ایک رسالہ لکھا تو اُن سے ایک "سخت لغزش" سرزد ہوئی جس کی "اخیر عمر کے اعتراف و رجوع نے تلافی کر دی"۔ مولٰنا کے نقطۂ نظر کا کرشمہ تھا کہ حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ کی خوبیوں سے کما حقہٗ باخبر ہوتے ہوئے بھی وہ اس مردِ عصر آفریں کو جس کے فیض سے شاہ اسماعیل شہیدؒ جیسے کئی علما اور مجاہد برسرکار ہوئے، اپنے نواسے سے نچلا درجہ دیں۔

مولٰنا ابوالکلام آزاد تو خیر اصلاً سیاسی رہنما اور اخبار نویس تھے، کسی علمی ادارے سے وابستہ نہ تھے۔ چند سال ہوئے ایک نوجوان فاضل نے شیخ مجددؒ کے نظریۂ توحید پر ایک تحقیقی مقالہ لکھا جس پر مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی طرف سے انھیں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری عطا ہوئی تھی۔ جہاں تک فلسفیانہ حصّے کا تعلق ہے، مقالہ دلچسپ۔ واضح اور متوازن ہے۔ لیکن سوانحی حصّہ اس طرح رطب و یابس سے بھرا ہوا ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ اس حصّہ کی اصلاح کیے بغیر اس مقالہ کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کا مستحق کیسے قرار دیا گیا اور فاضل محقق اور ان کے فاضل نگران نے زبدۃ المقامات جیسی معاصرانہ تصانیف چھوڑ کر ڈیڑھ سو سال بعد کی داستانوں (روضۃ القیومیہ) پر کیوں اعتماد کیا اور حضرت مجدد کی تائید میں مہابت خاں کی بغاوت اور اس طرح کے دوسرے حصّوں کو درج کتاب کرتے وقت معاصرانہ کتب تاریخ کو کیوں نظر انداز کر دیا؟

جب ان کتابوں کی جو یونیورسٹیوں کی مہرِ تصدیق کے ساتھ شائع ہوں، یہ حالت ہے تو عامۃ الناس کی معلومات کا کیا حال ہوگا؟ آئندہ سطور میں ہم نے ان

ؔ مولٰنا نے بغیر کسی استدلال کے حضرت مجددؒ کے "علمائے سوء" والے فقرے کا اطلاق ان بزرگوں پر کر دیا، جو ہمارے نزدیک صحیح نہیں۔

مباحث سے تفصیلی بحث کی ہے اور عام غلط فہمیوں کی اصلاح کی کوشش کی ہے۔ بزرگانِ رُوحانی کا ذکر کرتے ہوئے سب سے نازک مرحلہ ان کے کاموں کا تجزیہ اور ان پر تبصرہ آرائی ہے۔ بلاشُبہ اس میں اَدب و احتیاط لازم ہے۔ اور غیرضروری بحثیں اور نکتہ چینی مناسب نہیں لیکن جب ان ہستیوں کا ذکر ہو، جنھوں نے ہماری قومی زندگی کا دھارا بدل دیا ہے۔ تو ان کے کاموں کا تجزیہ کیے بغیر ایک موُرخ اپنے فرائض سے کس طرح عہدہ برآ ہو سکتا ہے؟ اس کے علاوہ وہ واقعہ نگاری ہی کیا ہوئی، جس میں آپ اصحابِ تذکرہ کے خط و خال نہ پہچان سکیں اور ان کا امتیازی رنگِ طبیعت نہ سمجھ سکیں۔

ہم نے اپنی تصانیف میں مختلف بزرگانِ دین کے کاموں کا تجزیہ کرنے کی جسارت کی ہے۔ ہماری کوشش یہ رہی ہے کہ کہیں اَدب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے اور تمام وہ آداب ملحوظ رہیں جو ان بزرگوں کے ذکر و بیان سے وابستہ ہیں، بلکہ ان کے کام کو عقیدت مندانہ حُسنِ ظن سے دیکھا جائے، لیکن قومی بہی خواہی بھی نظر سے اوجھل نہ ہو اور تبصرہ و تجزیہ کو نظر انداز کر کے موّرخانہ فرائض سے پہلوتہی نہ کی جائے۔

ہمارا اصولِ کار وُہی ہے، جسے غالب بار بار اپنے خطوط میں درج کرتا تھا. یعنی "راستی بالائے طاعت است"۔ ہماری مسلسل کوشش ہے کہ حقیقت سے پردہ اٹھائیں۔ واقعات اور شخصیتوں کو ان کی صحیح شکل و صُورت میں دیکھیں، خواہ اس سے قومی خودپسندی کی تسکین ہو یا نہ۔ ہمارے ہاں شبلی کے "مضامین عالمگیر" کے وقت سے جو اسلوبِ تاریخ نویسی رائج ہے، وہ اس اصول کے خلاف ہے۔ اور فی الحقیقت اسلامی ہندوستان کی تاریخ اور مذہب اسلام کے متعلق غلط بیانیوں اور غلط پراپیگنڈا کا جو طوفان مغربی علمی اداروں سے چلا آرہا ہے۔ اسے دیکھ کر ایک خاص قسم کا مدافعانہ یا خودپسندانہ نقطۂ نظر پیدا ہو جانا قدرتی امر ہے، لیکن کیا یہ قومی فلاح کا راستہ ہے؟ کیا اسے اختیار کر کے اور واقعات کو

ایک رنگین کھڑکی میں دیکھنے سے ہم تاریخ سے وہ فوائد حاصل کرسکتے ہیں، جن کے لیے یہ علم کار آمد ہوتا ہے؛ راقم الحروف کو یقین ہے کہ یہ طریق کار نہ مورخانہ ہے۔ نہ قومی بہی خواہی کا۔ اگر قومی خودداری کی تسکین ہی منتہائے آرزو ہے تو اس کے لیے ایم اسلم اور نسیم حجازی کے تاریخی رومان ہی کیوں نہ پڑھ لیے جائیں۔ تاریخ نگاری اور تاریخ خوانی سے فائدہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے اگر اس کے اصول و آئین پیش نظر رہیں اور ان میں "راستی بالاے طاعت است" کا اصول سب سے مقدم ہے۔

رُودِ کوثر کا یہ تیسرا ایڈیشن ہے۔ لیکن کتاب کو زیادہ مفید اور مکمل بنانے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ حجم میں کوئی ڈھائی سو صفحے کا اضافہ ہے۔ بعض ابواب (مثلاً عہدِ اکبری کی مذہبی تاریخ اور شیخ عبدالحقؒ محدث کے سوانح اور مذہبی کارناموں کا بیان) دوبارہ لکھے گئے ہیں اور کوشش کی گئی ہے کہ اس سلسلے میں تمام نئی معلومات کو سمیٹ لیا جائے۔ بعض اہم مباحث (مثلاً اسلامی بنگال کی مذہبی تاریخ۔ روشنیہ فرقہ اور حضرت اخوند درویزہ پشاوریؒ کے حالات۔ اٹھارھویں صدی میں شیعہ فرقے کے فروغ کی تاریخ اور مشاہیرِ شیعہ کا تفصیلی تذکرہ) بالکل نئے ہیں اور کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ کرتے ہیں۔ شروع سے ہم نے ان ہستیوں کے متعلق معلومات فراہم کرنے پر خاص توجہ کی ہے، جن کے کام اہم تھے، لیکن جن کے متعلق صحیح واقفیت نہ تھی۔ مثلاً نواب مرتضیٰ خاں شیخ فریدؒ کی اسلامی خدمات کو پہلی مرتبہ رُودِ کوثر میں بیان کیا گیا اور حضرت خواجہ باقی باللہؒ کی اہمیت بھی تفصیلی طور پر پہلے پہل اسی کتاب میں نمایاں کی گئی۔ موجودہ ایڈیشن میں بھی ایسے کئی بزرگوں کے حالات اضافہ ہوئے ہیں۔ مثلاً شیخ محمدؒ بن فضل اللہ برہان پوری اور شیخ صبغت اللہ کا بیان، جن کے علمی اور روحانی کارناموں کی یاد ابھی تک جاوا اور سماٹرا میں باقی ہے۔ یا افغان بزرگ شیخ محمدؒ سونی کا ذکر جنھوں نے عہدِ جہانگیری میں سب سے پہلے سجدۂ دربار ادا کرنے سے انکار کیا اور اپنی حمیتِ اسلامی

کی بنا پر قید و بند کی سختیاں برداشت کیں۔ اُمید ہے اِن اضافوں کو دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

قوم کی مذہبی، علمی، فکری تاریخ کے متعلق معلومات فراہم کرنے کے جو مواقع میسر آئے ہیں، ان کے لیے عنایتِ ایزدی کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے، کم ہے۔ لیکن جس قدر طلب کا میدان وسیع ہے، اُسی قدر ٹھوکریں کھانے اور بے راہروی کا سامان بھی زیادہ ہے۔

رُودِ کوثر کی کتابت، تصحیح اور طباعت مصنف سے بہت دُور لاہور میں ہو رہی ہے۔ اس میں سینکڑوں بزرگوں کا ذکر ہے۔ ہزاروں کتابوں کے نام آتے ہیں۔ مہتممینِ مطبع کی پوری احتیاط کے باوجود کئی غلطیاں رہ جائیں گی۔ بعض میں میری کوتاہیوں کو دخل ہوگا۔ کاش وہ اہلِ دل، اہلِ علم جن کی رسائی علی گڑھ، ندوہ، دیوبند، دارالمصنفین وغیرہ کے کتب خانوں تک ہے۔ کتاب پر تنقیدی نگاہ ڈالیں۔ اور مصنف کو اُس کی غلطیوں سے آگاہ اور اپنے مشوروں سے مُستفید کریں۔

اکرام

استدراک

(۱۹۶۷ء)

رُودِ کوثر کا تیسرا ایڈیشن ۱۹۵۸ء میں شائع ہُوا تھا۔ اس وقت کتاب غیر معمولی تعداد میں طبع کی گئی۔ چوتھے ایڈیشن کی نوبت قریباً نو سال کے بعد آ رہی ہے۔ اس تعویق کا افسوسناک پہلو یہ ہے۔ کہ چونکہ ڈھاکہ میں قیام کے باعث راقم السطور کتابت شدہ کاپیوں اور پروفوں کی تصحیح نہ کرسکا۔ اور کتابت کی بہت سی غلطیاں رہ گئیں، ان کی اصلاح میں بڑی تاخیر ہوئی۔

اس وقفہ میں مزید مواد کی فراہمی جاری رہی، جس کے لیے خوش قسمتی سے غیر معمولی مواقع میسر آئے۔ موجودہ اشاعت میں صفحات کا سائز بدلنے کے باوجود کتاب کے حجم میں کوئی کمی نہیں ہوئی، بلکہ مزید مواد سمیٹنے کے لیے ایک دو ابواب کو جن کا تعلق مذہبی سرگزشت سے زیادہ ادبی تاریخ سے تھا، حذف کرنا پڑا۔ اور خالص مذہبی تاریخ کے متعلق قریباً بیس پچیس فیصدی مواد نیا یا نو ترمیم شدہ ہے۔

اس دوران میں کئی ایسی کتابیں شائع ہوئیں، جن سے عہدِ مغلیہ کی مذہبی زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً روشنیہ سلسلہ پر غیر مطبوعہ مواد کی مدد سے پروفیسر ظہور الدین احمد اور مولٰنا اعجاز الحق قدوسی نے بالترتیب اپنی کتب پاکستان میں فارسی ادب اور تذکرہ صوفیائے سرحد میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے حقیقتِ حال زیادہ واضح ہو گئی ہے۔ اسی طرح حیدر آباد کے ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں صاحب نے مجددی بزرگوں کی قلمی اور نایاب تصانیف وغیرہ کی اشاعت کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے، ان سے بھی تاریخ کے طالب علم کو بڑی مدد ملتی ہے۔ ہم نے ان سب سے استفادہ کیا ہے۔ بعض کتب کی اشاعت میں ہاتھ بٹانے کی سعادت راقم السطور کو نصیب ہوئی۔ مثلاً رسائل مجددیہ۔ مکتوبات سعیدیہ۔ مکتوباتِ امام ربانی کا امرتسری ایڈیشن (اشاعتِ ثانی) وغیرہ۔ مکتوباتِ معصومیہ کی (دوبارہ) اشاعت ابھی زیرِ تکمیل ہے، لیکن اس کی تین جلدیں، کسی زمانے میں (مختلف مطابع سے) ایک ایک کر کے چھپی تھیں۔ پہلی ندوہ کے کتب خانہ سے ۱۹۴۶ء میں دستیاب ہوئی تھیں۔ اب دوسری حکیم ذوالقرنین اور تیسری مولوی جمیل الدین احمد (جامعہ بہاولپور) کی بدولت حاصل ہو گئی۔ یہ سب کتابیں میرے زیرِ مطالعہ رہی ہیں۔ شاید اس سے بھی زیادہ ہمت افزا وہ مواقع تھے، جو سلسلۂ مجددیہ کے بعض مشہور کتب خانوں سے مستفید ہونے کے حاصل ہوئے۔ مدینہ منورہ میں دو مرتبہ حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔ اور دونوں مرتبہ

کافی وقت رباطِ مظہری کے کتب خانہ میں گزرا۔ جہاں سلسلۂ مجددیہ ہی نہیں، بلکہ عام تصوف اور علومِ اسلامی کا (بالخصوص ان شعبوں کا، جن کا ہند۔ پاکستان سے تعلق ہے) ایک بیش بہا ذخیرہ ہے۔ اسی طرح خانقاہ شریف دہلی اور خانقاہ کندیاں شریف بھی پہنچے اور بعض نوادر سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ سرہند شریف کی زیارت بھی نصیب ہوئی، لیکن اگرچہ روضۂ مبارک کے باہمت منتظمین نے، عین اغیار کے نرغے میں، درگاہ کا بڑا ستھرا انتظام کر رکھا ہے۔ وہاں علمی ذخیرہ کوئی نہیں[1]۔ ان کے علاوہ انڈیا آفس لائبریری میں ذخیرۂ دہلی (Delhi Collection) کے نام سے ایک وسیع مجموعۂ کتب ہے۔ جس کی فہرست کبھی شائع نہیں ہوئی۔ لیکن جس میں کتب خانۂ شاہی کے بچے کھچے سرمائے کے علاوہ، دہلی کے مشہور مدارس اور خانقاہوں کی وہ کتابیں بھی شامل ہیں، جو سن ستاون کی لوٹ میں انگریزوں کے ہاتھ آئیں اور ان میں قلمی نوادر کی افراط ہے۔ اولیا کے متعدد غیر مطبوعہ، نادر تذکروں کے علاوہ، خواجہ باقی باللہؒ کے صاحبزادے خواجہ خُرد کی قریباً تمام تصانیف ہیں۔ خواجہ کلاں کا ایک اہم غیر مطبوعہ رسالہ ہے۔ شیخ آدم بنوریؒ اور ان کے سلسلہ کے متعلق مناقب آدمیہ اور شیخ کے بعض رسائل ہیں۔ حضرت خواجہ باقی باللہؒ کی تصانیف کے نہایت قدیم العہد مخطوطے ہیں۔ کلیاتِ باقی باللہ کے ایک بیش قیمت نسخے میں ان کی وفات کے متعلق بارہ تیرہ ورق کا رسالہ دربیانِ رحلت ہے، جس میں میاں (شیخ؟) عبدالحق کی لکھی ہوئی تاریخ وفات ہے۔ اور آخر میں "میاں نور محمد (شیخ نور الحق؟) ولد میاں (شیخ؟) عبدالحق" کا ایک معرکے کا مرثیہ ہے[2]۔ راقم السطور کو اس ذخیرۂ دہلی سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔

ان کے علاوہ مطبوعہ سہ ابہار ماخذ، زبدۃ المقامات۔ حضرات القدس (اردو ترجمہ) منتخب التواریخ وغیرہ کو پھر سے کھنگالا اور مکتوباتِ امام ربانی کا کئی بار پھر سے بغور مطالعہ کیا۔

---

[1] صرف شہر میں ایک سکھ کے پاس فارسی کی ایک قلمی تاریخ سرہند کا سراغ ملا لیکن بوجوہ، میں اس کی تلاش نہ کر سکا۔ [2] افسوس کہ حافظہ نے دھوکا دیا۔ یہ سمجھ کر کہ یہ مرثیہ وہی ہے جو اردو ترجمہ مکتوبات خواجہ باقی باللہ میں شامل ہے، اسے نقل نہ کیا۔

ان سب کی روشنی میں رودِ کوثر کو نئے سرے سے مرتب کیا گیا ہے۔ متعدد ابواب بالکل نئے ہیں۔ اور کئی نظرِ ثانی اور اضافوں کے بعد نئے سرے سے لکھے گئے۔ جو مباحث بالکل نئے ہیں۔ ان میں خانِ اعظم۔ خواجہ باقی باللہ کے صاحبزادگان۔ حضرت مجددؒ کے خسر حاجی سلطان تھانیسری اور والد ماجد مخدوم عبدالاحدؒ۔ صاحبزادگانِ (مجددیہ) کی والدہ محترمہ۔ عالمگیر اور بزرگانِ سرہند۔ خانگی صدمات کے مقابلے میں حضرت مجدد کی عالی حوصلگی۔ شیخ عبدالحق محدث اور بدایونی۔ شاہ احمد سعید دہلوی ثم مدنیؒ اور مغربی پاکستان میں مجددی سلسلے کی توسیع، قابلِ ذکر ہیں۔ جن ابواب میں تفصیلی اضافے ہوئے ہیں ان میں روشنیہ فرقہ۔ ذکرِ حضرت خواجہ محمد باقی باللہؒ۔ ابوالفضل اور اکبر کا ابکارؒ صوفیانہ احوال اور نظریہ قیومیت اور شیخ محدث اور حضرت مجدد الف ثانیؒ شامل ہیں۔

تاریخی تحقیق اور عقیدتمندانہ ارادت کے تقاضے ایک طرح کے نہیں۔ کم از کم ابتدا میں ان کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنا خاص طور پر دشوار ہوتا ہے لیکن اگر فریقین انصاف اور سمجھ سے کام لیں اور ان کے درمیان نقطۂ نظر کا کوئی بنیادی اختلاف نہ ہو تو یہ منزل طے ہو جاتی ہے۔ سلسلۂ کوثر شروع کرتے وقت ہمیں ان کی ان دشواریوں کا احساس تھا، لیکن خدا کا شکر ہے کہ صدہا بزرگوں کے اس تذکرے میں دو باتوں کے علاوہ کہیں کوئی خاص مشکل پیدا نہیں ہوئی۔ ان دو میں بزرگوں میں سب سے اہم ہستی حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ کی ہے جن کے متعلق ہمارے بعض بیانات سے اور بالجملہ تذکرہ اور روضۃ القیومیہ سے جس اختلافی نقطۂ نظر کا ہم نے مندرجہ بالا تمہید میں اظہار کیا ہے، اس سے بعض بزرگانِ سلسلہ نے تفصیل، بلکہ شدت سے اظہار کیا ہے۔ اس سلسلے میں جو تحریر سب سے پہلے ہماری نظر سے گزری۔ پروفیسر محمد فرمان کی حیاتِ مجدد ہے۔ جس میں انھوں نے رودِ کوثر کو ایک متوازی تصنیف کی حیثیت سے پیشِ نظر رکھا ہے۔ اور ہمارے بعض بیانات کی تفصیلی تردید کی ہے۔ پروفیسر صاحب کو بعض امور میں غلط فہمی ہوئی ہے (مثلاً شیخ بدیع الدین کی نسبت ہمارے اندراج کے متعلق) اور جیسا کہ انھیں اعتراف ہے، ان کا لہجہ کہیں کہیں تلخ بھی ہو گیا ہے۔ لیکن چونکہ انھوں نے انصاف اور تحقیق کے اصولوں کو نظرانداز نہیں کیا اور محبتِ سلسلہ کی محبت میں سرشار ہو کر دل کو خوفِ خدا سے خالی نہیں ہونے دیا اس لیے ان کی تصحیح و تنبیہ سے استفادہ کرنا دشوار نہ تھا چنانچہ سوائے ایک اہم بحث کے (جسے اب زیادہ وضاحت سے بیان کر دیا گیا ہے) ہم نے اپنی

کتاب بیان کئے اعتراضات کی روشنی میں نظرثانی کی ہے۔ اور حسب ضرورت اپنے بیان میں ترمیم کر دی ہے۔

اس سلسلے میں دوسری تحریر ایک محترم بزرگ کی ہے جن کے احسانات محبانِ سلسلہ پر بڑے وقیع ہیں اور جن کا مرتبہ سلوک میں ہی نہیں علم و فضل میں بھی بڑا بلند ہے۔ ہم نے ان کے ارشادات کا بڑے غور سے مطالعہ کیا ہے۔ (بلکہ مدینہ منورہ کے پہلے سفر کا فوری محرک یہ خیال تھا کہ اس پاک سرزمین میں پہنچ کر ایک کٹھن مسئلے میں راہنمائی کی درخواست کی جائے) لیکن افسوس کہ فاضل موصوف اور ہمارے نقطۂ نظر میں بنیادی اختلافات ایسے ہیں کہ بحالاتِ موجودہ اس خلیج کو پُر کرنا ممکنات سے نہیں۔ دوسرے امور سے قطع نظر اس کی اہم وجوہ مااختصار یہ ہیں:

(۱) حضرت مجددؒ کی نسبت محترم کا بنیادی نقطۂ نظر وہی ہے جو روضۃ القیومیہ کے مصنف کا تھا اور جس میں مولانا ابو الکلام آزاد نے (تذکرہ میں) رنگ و روغن بھرا ہے۔ ان کے نزدیک دورِ حاضر میں حضرت مجدد کے متعلق بہترین کتاب ابوالفضل مولانا احسان اللہ عباسی گورکھپوریؒ نے لکھی۔ (جس کا سوانحی حصہ روضۃ القیومیہ کا خلاصہ ہے)۔ فرماتے ہیں "حضرت مجددؒ کے متعلق یہی ایک ایسی کتاب ہے جسے ہمارے دور میں بڑی ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ مولانا مرحوم نے حضرت مجددؒ کے حالات بڑی تحقیق سے لکھے ہیں"۔ ہماری رائے اس سے بالکل مختلف ہے۔

(۲) معاملہ صرف تاریخی معاملات کے متعلق اختلاف رائے کا نہیں بلکہ جیسا کہ موصوف کو احساس ہے۔ جلالی اور جمالی نقطۂ نظر کا ہے یعنی فلسفۂ زندگی اور مسلک کا اختلاف ہے۔ ان کو ہم سے اصولی شکایت یہ ہے کہ ان کے خیال میں ہم نے ... "جلالی رنگ" والے حضرات کی تنقید یا تنقیص میں بڑا زور صرف کیا ہے۔ "تنقیص" کے متعلق تو ہمیں ان سے اتفاق نہیں لیکن اگر ان کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے "جلالی رنگ" والے حضرات کے متعلق متداول نقطۂ نظر کو نسبتاً کڑے طریقے سے پرکھا ہے۔ اور "جمالی رنگ" والے حضرات کے حالات کی تلاش اور ان کی خوبیاں سمجھنے اور نمایاں کرنے کی خاص کوشش کی ہے تو ان کی شکایت بے بنیاد نہیں۔ شاید اس میں ہمارے رجحانِ طبع کو دخل ہو۔ لیکن اصل وجہ یہ ہے کہ جب تک یہ طریقِ کار اختیار نہ کیا جائے بیانِ واقعات میں صحت و توازن کا حصول ناممکن ہے۔ یعنی جلالی شان والے بزرگوں کی عظمت کا احساس تو سطحی نظر میں بھی ہو جاتا ہے لیکن جو اصحاب سترِ احوال اور استغفار پر شدت سے عامل رہے ہیں اور جن پر انکسار کا رنگ غالب ہے ان کے حالات کا اندازہ بغیر خاص کوشش کے نہیں ہو سکتا۔ اس حقیقت کو نظر انداز کرنے سے واقعہ نگار جس طرح فاش

غلطیوں کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ اس کی ایک نمایاں مثال احسان اللہ صاحب کی کتاب میں ملتی ہے۔ جو بادی زمانہ حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ کے انکسارانہ بیانات سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ "حضرت خواجہ باقی باللہؒ بظاہر آپ (حضرت مجددؒ) کے پیر اور درپردہ مرید تھے"!!

اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی خیال ہے کہ اگر عہدِ اکبری کی کمزوریوں اور جارحانہ ہندو احیائیت کے خلاف "جلالی طریق کار اختیار کرنا مستحسن بلکہ عین صواب" تھا۔ تو خودی اور خود پسندی کے موجودہ دور میں جمالی خوبیوں کو نمایاں کرنا بھی اسی طرح ضروری ہے۔

آج یہ خیال کہ ان ہستیوں پر، جنھوں نے قومی زندگی کا دھارا بدل دیا، جدید تحقیق و تجزیہ کی روشنی نہ پڑے گی۔ یا زورِ بیان اور جوش و جذبہ سے روضۃ القیومیہ کی روایات کو برقرار رکھا جا سکے گا، ممکن الحصول نہیں۔ اور ذمہ دار بزرگانِ سلسلہ اس حقیقت کو محسوس کر رہے ہیں۔ (مثلاً خانقاہ شریف دہلی کے سربراہ حضرت زید ابوالحسن فاروقی مدظلہ نے فاضل موصوف کے رسالے کے ساتھ روضۃ القیومیہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، وہ اس احساس کا بین اظہار ہے)۔ اب تحقیق و تلاش کے عمل کو روکا نہیں جا سکتا، لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ محبانِ سلسلہ اور غیر جانبدار اہلِ تحقیق حضرت مجدد قدس سرہ کے ارشادات اور مستند متعلقہ تحریروں کا مورخانہ دیانت کو ملحوظ رکھتے ہوئے، لیکن پورے ادب، احترام بلکہ حسنِ ظن اور دلی محبت کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مطالعہ کریں۔ اور ان کی شخصیت، مرتبے اور حقیقی احسانات کو بے نقاب کریں۔ حضرت قدس سرہ کی شخصیت اتنی بلند و بالا تھی اور ان کی شخصی زندگی میں ہمت، جرأت، بلند کرداری، شفقت و محبت کا ایسا امتزاج تھا۔ ان کی دینی خدمات اتنی عظیم الشان تھیں! اور جارحانہ ہندو احیائیت کا (جب اس کا دار السلطنت میں احساس ہی نہ تھا!) مقابلہ کر کے انھوں نے قومی شخصیت کو اس طرح خود بینی، خود اعتمادی اور توانائی بخشی اور ان کی سیاسی سوجھ بوجھ اس پائے کی تھی (ان کی دوسری خوبیوں۔ مثلاً عظیم مدارج روحانی، علمیت، غیر معمولی تنظیمی صلاحیت، ممتاز طرزِ تحریر کے علاوہ)۔ کہ اگر ان پہلوؤں کا صحیح طور پر مطالعہ ہو تو خواہ تحقیق کی روشنی میں روضۃ القیومیہ کے نقطۂ نظر کو ترک کرنا پڑے، بلکہ حضرتؒ کے بعض ارشادات (مثلاً ہندسہ اور دوسرے علومِ عقلی کے متعلق ان کے اظہارِ خیال) کو لائقِ تاویل سمجھا جائے۔ تب بھی ان کے علوِ مرتبہ میں کوئی کمی نہ ہوگی۔

راقم السطور نے اپنی بساط اور سمجھ کے مطابق اس طریقِ کار پر عمل کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنا رحم کرے اور غلطیوں سے بچائے۔

اکرام

رُودِ کوثر

اکبر سے پہلے

عہدِ مُغلیہ اسلامی ہندوستان کے ابتدائی دَور کی تاریخ پڑھیں تو مغلوں سے زیادہ ہیبت ناک اور قابلِ نفرت کوئی ہستی نظر نہیں آتی۔
سلاطین دہلی کے لیے سب سے بڑا مسئلہ "فتنۂ مغول" کا سدِ باب تھا۔ باقی سب باتیں جزوی اور ضمنی تھیں۔ منہاج سراج ،ضیاء الدین برنی اور امیر خسرو منگولوں کا ذکر کرتے ہیں تو "کفار" "کفار مغول" "ملاعین" اور اس قسم کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ ان میں سے جو مسلمان ہو گئے تھے، ان پر بھی اعتماد نہ کیا جاتا اور علاء الدین خلجی نے مغل نو مسلموں کا قتل عام کیا۔
واقعہ یہ ہے کہ اگر ان مظالم کا خیال کریں جو چنگیز خاں اور ہلاکو نے نہیں بلکہ تیمور نے اہلِ دہلی اور شمالی ہندوستان پر توڑے تو یہ خوف اور جذبۂ نفرت بیجا نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن قدرت کے طریقے عجیب ہیں۔ جب ہندوستان میں اسلامی حکومت کی کمزوری سے وہ فصیل جو غیاث الدین بلبن اور علاء الدین خلجی نے مغلوں کے خلاف قائم کی تھی، ٹوٹ گئی اور ہندوستان پر مغلوں کا تسلط ہو گیا تو اسلامی ہندوستان کے سب سے زیادہ شاندار اور پُرامن دَور کا آغاز ہُوا۔ اور نہ صرف ملکی نظم و نسق اور

خلقت کی مرفہ الحالی کا اعلےٰ درجے پر انتظام ہوا۔ بلکہ ہندوستانی تہذیب و تمدن اور قومی علم و ادب کی تاریخ میں ایک درخشاں باب کا اضافہ ہوا۔ اس کی کئی وجہیں تھیں پہلی یہ کہ جو حکمران تاریخ میں شاہانِ مغلیہ کے نام سے مشہور ہیں، ان کا مغلوں یا منگولوں سے فقط دُور کا تعلق تھا۔ وہ حقیقت میں چغتائی ترک تھے، امیر تیمور کی نسل سے۔ ان میں منگولوں نہیں ترکوں کی خصوصیات تھیں۔ اور وہ بھی ان ترکوں کی جنھوں نے امیر تیمور کی عالمگیر فتوحات کے بعد مشرق و مغرب کے تہذیبی عناصر اخذ کرنے کی کوشش کی تھی۔ امیر تیمور کی بڑی آرزو تھی کہ وہ اپنے دارالحکومت سمرقند کو مشرق کا تہذیبی مرکز بنا دے۔ اس مقصد کے لیے جہاں کہیں وہ جاتا اہل ہنر، اہل صنعت اور معماروں کو گرفتار کرکے اپنے ساتھ لے آتا۔ ان کی مدد سے سمرقند میں عالیشان، خوبصورت عمارتیں تعمیر ہوئیں اور شہر عروس البلاد بن گیا۔

تیمور کے وارث فتوحات ملکی میں تو اس کے مرتبہ کو نہیں پہنچے لیکن علم کی محبت اور تہذیب و ثقافت کی سرپرستی میں اس سے بہت بڑھ گئے۔ اس کی وفات کے جلد ہی بعد اس کی وسیع سلطنت محدود حکمرانیوں میں منقسم ہو گئی۔ لیکن اس کے جانشینوں نے انھی مختصر ریاستوں میں علم و ثقافت کو فروغ دیا۔ تیمور کا بیٹا شاہرخ خود شاعر اور عالم تھا۔ اس نے چین اور دوسرے دُور دراز ملکوں میں سفارتیں بھیجیں، جو وہاں سے تفصیلی حالات لے کر آئیں اور جن کے سفرنامے مورخین کے لیے معلومات کا بیش بہا ذخیرہ ہیں۔ اس کا ایک بیٹا الغ بیگ تھا جس نے اپنے دارالحکومت استرآباد میں ایک رصدگاہ تعمیر کرائی۔ دوسرے بیٹے بالسنقر نے کتابیں جمع کرنے میں ناموری حاصل کی۔ لیکن میرزایان تیموری میں سے جس حکمران نے علم و فن کی سرپرستی کو کمال تک پہنچایا وہ تیمور کے ایک بیٹے عمر شیخ کا پڑپوتا سلطان حسین مرزا تھا، جو ۱۴۶۸ء سے ۱۵۰۶ء تک خراسان کا حکمران رہا۔ اس کے دارالحکومت ہرات میں بہزاد جیسا مصوّر، جامی جیسا شاعر، میرخواند اور خواند میر جیسے مورخ اور میر علی شیر نوائی جیسے ہرفن مولا

درباری تھے۔

مغلیہ حکومت کا بانی بابر، حسین مرزا کا دوست اور مداح تھا لیکن وہ صرف ان عدیم النظیر ہستیوں ہی کا قدردان نہ تھا، جو حسین مرزا کے دربار میں جمع ہوگئی تھیں۔ بلکہ اسے وہ رُوح عزیز تھی، جو ان مشاہیر کی سرگرمیوں میں کارفرما تھی۔ یعنی جو کام ہاتھ میں لیا جائے، اسے کمال تک پہنچانے کی خواہش۔ بابر اپنی خود نوشت سوانحعمری میں کس حسرت اور کس فرطِ احترام سے لکھتا ہے:-

"زمان سلطان حسین مرزا عجب زمانے بود۔ از اہل فضل مردم بے نظیر خراسان، بخصوص شہر ہری مملو بود۔

ہر کس بہ کارے کہ مشغول بود۔ ہمت و غرض او آں بود کہ ہر کار را بکمال رسانند۔"

ان تہذیبی روایات کو بابر اور اس کے جانشینوں نے اپنی نئی سلطنت میں منتقل کیا لیکن مغلیہ تہذیب و تمدن کے سدا بہار باغ کی سیرابی دوسرے سرچشموں سے بھی ہوئی۔ جن میں ایران۔ جسے ایک مورخ نے "دبستانِ ہند" لکھا ہے، سب سے بڑھ گیا۔ بابر کے تعلقات صفوی خاندان کے بانی شاہ اسمٰعیل سے خوشگوار تھے۔ جب ہمایوں کو شیر شاہ افغان نے ہندوستان سے نکال دیا اور اسے دوبارہ تاج و تخت طہماسپ صفوی کی مدد سے ملا تو مملکت میں ایرانیوں کا عمل دخل بہت بڑھ گیا۔ اس نے جلاوطنی کے اٹھارہ مہینے زیادہ تر ایران میں گزارے تھے اس دوران میں ایرانی تہذیب و تمدن سے اسے گہرا لگاؤ پیدا ہوگیا اور جب وہ ہندوستان کو واپس لوٹا تو متعدد ایرانی شعرا۔ مصور۔ اہلِ قلم اس کے ساتھ تھے، جنھوں نے ایک نئے تہذیبی عمل کا آغاز کیا، جو آگے چل کر اور مستحکم ہوگیا۔

ان تہذیبی اثرات کے علاوہ ایک اہم حقیقت یہ ہے کہ اسلامی علوم کا بھی برِصغیر میں فروغ پہلی مرتبہ عہدِ مغلیہ میں ہُوا۔ اس کی ایک وجہ تو حکومت کا استحکام (اور علوم کی سرپرستی) تھا لیکن اس سے بھی بڑا سبب عرب اور بالخصوص حرمین سے شمالی ہندوستان کا تعلق تھا، جو اکبر کی فتح گجرات کے بعد

بقیہ حاشیہ

بحری راستے سے پیدا ہو گیا۔ اب علومِ اسلامی کے طالبین کو خطرناک صحرا و جنگل کے راستے غیر ممالک میں نہ کاٹنے پڑتے بلکہ سورت اور کھنبائت کی بندگاہوں سے جہازوں میں بیٹھ کر سیدھے حجاز جا پہنچتے اور علومِ اسلامی کے اصل سرچشموں سے اپنی پیاس بجھاتے۔ نتیجہ یہ تھا کہ اس دور میں شیخ عبدالحق محدث۔ شاہ ولی اللہ۔ علامہ وجیہہ الدین گجراتی۔ مولنا یعقوب صیرفی کشمیری [سیالکوٹی] جیسی کئی ہستیاں برسرِکار آئیں، جو حجاز میں تعلیم کی تکمیل کر کے اپنے اپنے علاقوں میں درس و تدریس کے مرکز بن گئے اور ان کے وجودہائے گرامی سے علومِ اسلامی، بالخصوص علمِ حدیث کو ایک بالکل نیا فروغ حاصل ہُوا۔ اور عام اسلامی مسائل کے متعلق بھی معلومات زیادہ صحیح اور نقطۂ نظر زیادہ راسخ العقیدانہ ہو گیا۔

ان کے علاوہ اور بھی اثرات تھے۔ فرنگی تاجر اور پادری، توپچی اور طبیب بھی اب ملک میں پہنچ رہے تھے۔ ہندوستان کی قدیم قوموں سے ربط و ضبط بڑھ رہا تھا اور ان کا ادب و فن بھی دربار میں عزت پاتا تھا۔ مختلف بلکہ مخالف اثرات کی موجودگی سے بعض اوقات تلخ کشمکش کے لمحے آئے اور ایک زمانے میں تو خطرناک صورت حالات پیدا ہو گئی لیکن خدا کا فضل شاملِ حال رہا۔ ارکینِ سلطنت اور اہل اللہ میں ایسے لوگ پیدا ہو گئے، جنھوں نے حالات پر قابو پا لیا۔ اسلامی اثرات بہر صورت غالب رہے اور ساتھ ساتھ مغلوں نے جنھیں اُس زمانے میں اہلِ مغرب Grand Moghals کہتے تھے، فنونِ لطیفہ۔ انتظامی معاملات سیاستِ مُدن۔ عام تہذیب و تمدن میں ایک ایسا معیار قائم کیا، جو نہ صرف برِ صغیر بلکہ بنی نوع انسان کی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

مغلیہ حکومت کی ابتدا

مغلیہ خاندان کی بنا سلطان ظہیر الدین بابر نے ڈالی، جو تیمور کی نسل سے تھا۔ گیارہ برس کی عمر میں وہ ترکستان کے شہر فرغانہ میں تخت نشین ہُوا لیکن مخالفوں سے ایک

طویل کشمکش کے بعد اسے موروثی وطن چھوڑنا پڑا۔ اس کے بعد اس نے پہلے کابل میں اپنی حکومت قائم کی اور پھر ہندوستان کے بعض امیروں کی دعوت پر جو حاکمِ وقت ابراہیم لودھی کے سلوک سے نالاں تھے، ہندوستان آیا اور ۱۵۲۶ء میں پانی پت کے میدان میں ابراہیم کو شکست دے کر دہلی پر قابض ہو گیا۔

بابر نے دہلی فتح کر لی لیکن دہلی کی فتح سے ہندوستان فتح نہ ہوا تھا۔ مرکزی حکومت کی کمزوری سے ہر طرف صوبیدار خود مختار ہو گئے تھے شمالی ہندوستان میں رانا سانگا نے بڑا اقتدار حاصل کر لیا تھا اور بابر کا سب سے بڑا معرکہ ۱۵۲۹ء میں اسی کے ساتھ ہوا۔ حکومت دہلی کے کمزور ہو جانے پر بہت سے ہندو راجاؤں نے سر اُٹھایا تھا۔ وہ بھی رانا سانگا کے ساتھ تھے۔ اس کا اپنا لشکر ایک لاکھ کا تھا۔ مارواڑ۔ چندیری اور دونگرپور کے راجاؤں اور دوسرے راجپوت رؤسا نے پچاس سٹھ ہزار سوار اس میں اور اضافہ کیے اور لودھیوں کو ملا کر قریب قریب پونے دو لاکھ فوج بابر کے مقابلے میں آئی۔ شروع شروع میں بابر نے مخالفوں کی پروا نہ کی لیکن جب شاہی فوج کے ہراولوں کو راجپوتوں نے شکست دی اور بیانہ کی فوج جو اُن کی مدد کو گئی تھی اُسے بھی شکست کھا کر محصور ہونا پڑا تو پھر شاہی لشکر پر فکر و ہراس طاری ہوا۔ بعض لوگوں نے کہا کہ بڑے قلعے معتمد سرداروں کے سپرد کر کے پنجاب لوٹ جانا چاہیے اور کسی لطیفۂ غیبی کا انتظار کرنا چاہیے۔ لیکن بابر نے ایک پُر جوش اور دلولہ انگیز تقریر کی اور کہا کہ اطراف و اکناف کے مسلمان بادشاہ ہم پر اظہارِ نفرت کریں گے اور کہیں گے کہ ہم زندگی کو عزیز سمجھ کر ایک بڑی سلطنت کو ہاتھ سے کھو بیٹھے۔ جوانمردی کا تقاضا ہے کہ ہم شہادت کے لیے تیار ہو جائیں اور جان توڑ کر لڑیں ؎

چوں جاں آخر از تن ضرورت رفد ۔۔۔ ہماں بہ کہ بارے بعزت رود
سرانجام گیتی ہمیں است و بس ۔۔۔ کہ نامے پس از مرگ ماند زکس

بابر کی اس تقریر سے بڑا جوش پیدا ہوا۔ سب نے الجہاد الجہاد کا نعرہ لگایا۔

اور قسمیں کھائیں کہ ہم میدانِ غزا سے مُنہ نہیں موڑیں گے ۔ مر گئے تو شہید اور کامیاب ہوئے تو غازی ۔ بابر نے بھی جو شراب کا بڑا دلدادہ تھا ، شراب نوشی اور دوسرے غیر مشروع احکام ، حتیٰ کہ ریش تراشی سے توبہ کی اور خدائے عزّوجل کی بارگاہ میں دُعا کر کے میدانِ جنگ میں آگے بڑھا ۔ معرکہ سارا دن جاری رہا ۔ راجپوت جانتے تھے کہ اس لڑائی سے شمالی ہند کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے ۔ جان توڑ کر لڑے لیکن فتح آخرکار بابر کی ہوئی ۔ "فتح بادشاہ اسلام" لڑائی کی تاریخ ہوئی اور اس کے بعد بابر نے غازی کا لقب اختیار کیا ۔

سیکری کی لڑائی میں جو راجپوت راجے رانا سانگا کی مدد کو آئے تھے ان میں چندیری کا راجا میدنی رائے بھی تھا ۔ رانا سانگا کو شکست دینے کے کچھ عرصہ بعد بابر نے چندیری کا رُخ کیا اور اسے فتح کر کے قدیمی قلعہ دار احمد شاہ بن ناصر الدین مندوی کے سپرد کیا ۔ بابر نے جب یہ علاقہ فتح کر کے چندیری ۔ سارنگپور اور رنتھمبور کی مسجدیں اور خانقاہیں دیکھیں تو معلوم ہوا کہ رائے سین نے جو مالوہ کا بااختیار وزیر تھا ، انھیں رانا سانگا اور میدنی رائے کے حکم سے حیوانات کا مسکن بنا کر فضلہ ، گوبر سے لیپ رکھا ہے ، شیخ زین الدین صدر کی کوشش سے یہ کثافت اور غلاظت دُور ہوئی اور مؤذن اور جاروب کش مقرر ہو کر پھر ان مسجدوں میں آوازِ اذان بلند ہونی شروع ہوئی ۔

مغلیہ خاندان نے بڑے بڑے نامور بادشاہ پیدا کیے ہیں لیکن بابر کی شخصیت میں ایک خاص دلکشی ہے ۔ اس کی ذات اسلامی تمدّن کی اس امتیازی خصوصیت کو نمایاں کرتی ہے کہ ہندوؤں کے برعکس جن میں کشتری فنونِ جنگ میں اور برہمن علم و ادب میں کمال حاصل کرتے ہیں ، اسلامی طرزِ معیشت میں ایک ہی شخص بیک وقت صاحبِ سیف و قلم ہو سکتا ہے ۔ بابر فقط ایک بہادر سپاہی اور قابل سپہ سالار ہی نہ تھا بلکہ وہ فارسی اور ترکی کا اچھا شاعر بھی تھا ۔ اس کی لکھی ہوئی تزکِ بابری اپنی قسم کی ایک بے نظیر کتاب ہے اور بابر کی جامع صفات شخصیت کا دلچسپ مُرقّع ہے ۔ اس میں لفاظی نہیں ۔ خلوص ہے ۔ اور سُنی سُنائی باتیں نہیں ۔ آنکھوں دیکھی اور مشاہدہ

کی ہوئی چیزوں کا بیان ہے ۔ مناظرِ فطرت ۔ درختوں اور پرندوں سے بابر کو جو دلچسپی تھی، اس کا تفصیلی اظہار ہے اور ترکستان ۔ افغانستان اور ہندوستان کے متعلق بڑے پتے کی اور پُرمغز باتیں درج ہیں ۔ تزکِ بابری کی تصنیف کے علاوہ بابر خطِ بابری کا موجد تھا اور اس طرزِ تحریر میں اُس نے کلام مجید کے کئی نسخے لکھ کر مکہ معظمہ بھجوائے ۔ اسے ہندوستان میں بہت عرصہ رہنے کا موقع نہیں ملا لیکن اپنی فطری ذہانت سے اس نے جلد ہی یہاں کی خصوصیات پالیں اور اُس نے ہمایوں کے لیے جو وصیت لکھی اُس سے اس کی سمجھ ۔ انصاف پسندی اور مدبّرانہ قابلیت کا پتا چلتا ہے ۔ وہ لکھتا ہے :-

" فرزندِ من! ہندوستان میں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی عنایت ہے کہ اس نے تمھیں اس ملک کا بادشاہ بنایا ہے ۔ اپنی بادشاہی میں تمھیں ذیل کی باتوں کا خیال رکھنا چاہیے :-

(۱) تم مذہبی تعصب کو اپنے دل میں ہرگز جگہ نہ دو اور لوگوں کے مذہبی جذبات اور مذہبی رسوم کا خیال رکھتے ہوئے رو رعایت کے بغیر سب لوگوں کے ساتھ پورا انصاف کرنا (۲) گاؤکشی سے بالخصوص پرہیز کرو تاکہ اس سے تمھیں لوگوں کے دل میں جگہ مل جائے اور اس طرح وہ احسان اور شکریے کی زنجیر سے تمھارے مطیع ہو جائیں ۔
(۳) تمھیں کسی قوم کی عبادتگاہ مسمار نہیں کرنی چاہیے اور ہمیشہ سب سے پورا انصاف کرنا چاہیے تاکہ بادشاہ اور رعیت کے تعلقات دوستانہ ہوں اور ملک میں امن و امان رہے
(۴) اسلام کی اشاعت ظلم و ستم کی تلوار کے مقابلے میں لطف و احسان کی تلوار سے بہتر ہو سکے گی (۵) شیعہ سُنّی اختلافات کو ہمیشہ نظرانداز کرتے رہو ۔ کیونکہ ان سے اسلام کمزور ہو جائے گا (۶) اپنی رعیت کے مختلف خصوصیات کو سال کے مختلف موسم سمجھو تاکہ حکومت بیماری اور ضعف سے محفوظ رہ سکے[1] ۔

---

[1] ترجمہ از "انڈین اسلام" (ٹائی ٹس) اس وصیت کی ایک نقل اسٹیٹ لائبریری بھوپال میں ہے ۔

بابر نے ۱۵۳۰ء میں وفات پائی اور اس کی جگہ ہمایوں تخت نشین ہوا۔ وہ ابھی تئیس سال کا نوجوان تھا اور ضرورت سے زیادہ نرم دل۔ شیر شاہ نے اسے شکست دے کر ۱۵۴۰ء میں ایران کی طرف بھگا دیا اور خاندان سور کی بنیاد ڈالی جو تقریباً پندرہ سال برسرِاقتدار رہا۔

شیر شاہ اور خاندان سور

شیر شاہ جس نے پانچ سال تک تختِ دہلی پر حکومت کی ایک غیر معمولی آدمی تھا۔ اس نے جونپور کے مدرسوں میں تعلیم پائی تھی۔ سکندر نامہ۔ گلستان۔ بوستان وغیرہ اسے زبانی یاد تھیں۔ فلسفے سے بھی واقف تھا اور عربی میں کافیہ۔ شرح کافیہ مصنفہ قاضی شہاب الدین پڑھ چکا تھا۔ وہ قدیم سلاطین کی تاریخ کا شائق تھا اور علما و فضلا کی بڑی قدر کرتا تھا۔ علم و فضل سے دلچسپی کے علاوہ بڑا منتظم اور قابل حاکم تھا اور اسی قابلیت کے زور سے ایک معمولی جاگیردار کے عہدے سے ترقی کرتا ہوا ہندوستان کا بادشاہ بن گیا۔

بدقسمتی سے اسے تختِ دہلی پر فقط پانچ سال بیٹھنا نصیب ہوا۔ اس عرصے میں بھی اسے لڑائیوں سے فرصت نہ ملی لیکن اس تھوڑی سی مدت ہی میں اس نے انتظامِ سلطنت میں نمایاں اصلاحیں کیں جنھیں شمالی ہندوستان میں اکبر اور دکن میں اورنگ زیب نے وسعت دے کر ملک کی خوشحالی کا انتظام کیا۔ عہدِ مغلیہ کے مورخین نے عام طور پر شیر شاہ سے انصاف نہیں کیا لیکن پھر بھی جو حالات ہم تک پہنچتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیر شاہ بڑا بیدار مغز بادشاہ تھا اور اگر موت اُسے کچھ مہلت دیتی تو شاید آج ہندوستان کا نقشہ کچھ اور ہوتا!

شیر شاہ ۱۵۴۵ء میں کالنجر کا محاصرہ کرتا ہوا مارا گیا اور اس کی جگہ اسلام شاہ سُوری تخت نشین ہوا۔ اس کا زمانہ مختلف جھگڑوں میں گزرا۔ اور جب ۱۵۵۴ء میں وہ مر گیا تو مغلوں نے اس کے جانشین سے تختِ دہلی چھین لیا اور ۱۵۵۵ء میں ہمایوں پھر دہلی اور آگرے پر قابض ہو گیا۔

مہدوی تحریک

اس زمانے میں اضلاعِ پُورب میں ایک تحریک شروع ہوئی۔

جس کا مقصد نہایت نیک تھا۔ یعنی تجدید دین اور احیائے ملت اور اس نے بعض مخلص اور قابل افراد کو متاثر کیا۔ لیکن اس قسم کی بہت سی دوسری کوششوں کی طرح یہ تحریک بھی بہت جلد بانیِ تحریک کے شخصی دعووں، جمہور امت کی مخالفت اور اصلاح کے چند نہایت خاص طریقوں تک محدود ہو گئی۔

اس تحریک کے بانی سید محمد جونپوری ۱۴۴۳ء میں پیدا ہوئے۔ دوست دشمن گواہ ہیں کہ وہ ظاہری اور باطنی علوم میں اپنی مثال آپ تھے۔ آپ کے مرشد شیخ دانیال چشتی جونپوری اور دوسرے علماء جونپور نے آپ کو نوجوانی میں ہی اسد العلما کا خطاب دے رکھا تھا۔ جونپور کا آخری بادشاہ سلطان حسین شرقی جو ۱۴۵۸ء میں تخت نشین ہوا اور ۱۴۸۰ء میں بہلول لودھی کے ہاتھوں تاج و تخت کھو بیٹھا اور بنگال میں پناہ گزیں ہو کر ۱۴۹۹ء میں فوت ہوا، اس وقت جونپور کے تخت پر قابض تھا۔ مہدویوں کی روایت ہے کہ وہ راؤ دلپت رائے والیِ گوڑ[۱] کا خراج گزار تھا اور سید محمد نے اُسے وعظ و نصیحت سے ایک غیر مسلم کو خراج دینے سے باز رکھا اور اس سے لڑنے کے لیے تیار کیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ نے سلطان کی مدد سے پندرہ سو جوان بیراگی ملازم رکھے۔ جب ہنگامہ کارزار گرم ہوا تو مسلمان فوج کے پاؤں اکھڑ گئے لیکن سید محمد جونپوری اپنے ساتھیوں کے ساتھ ڈٹے رہے بلکہ انھوں نے آگے بڑھ کر خود دلیپ رائے کو تہ تیغ کیا اور شکست کو فتح میں تبدیل کر دیا۔

مہدوی روایت ہے کہ جب آپ نے راجا پر زور کا وار کیا اور تلوار سر کاٹتی ہوئی سینہ تک جا پہنچی تو دلیپ رائے کا دل باہر نکل پڑا۔ آپ نے دیکھا

---

[۱] یہ گوڑ اسلامی بنگال کا قدیمی دار الخلافہ نہ تھا۔ وہ شہر مسلمانوں کے قبضے میں تھا۔ مولوی ابوظفر مہدوی کا خیال ہے کہ ترہٹ کے زمیندار (یا راجا) سے حسین شاہ کی جنگ ہوئی تھی کیونکہ اس نے جونپور کا خراج نہیں ادا کیا تھا اور اس جنگ میں اسد العلما بہ نظر ثواب جہاد میں شریک ہوئے۔

کہ جس بُت کی مقتول راجا پُوجا کرتا تھا، اس کی صورت دل پر کندہ ہے۔ یہ دیکھ کر آپ پر ایک جذبہ کی حالت طاری ہو گئی کہ اگر جھوٹے معبودوں کا اتنا اثر ہوتا ہے تو حقیقی معبود کا کتنا اثر ہو گا۔ یہ کیفیت آپ پر بارہ برس تک رہی۔ جب افاقہ ہُوا تو آپ نے چالیس برس کی عمر میں وطن سے ہجرت کی۔ پہلے جنگل کے راستے بہار میں داناپور گئے۔ وہاں سے کالپی، چاندیری، چانپانیر اور مانڈو ہوتے ہوئے دکن پہنچے۔ احمد نگر میں احمد نظام شاہ بن نظام الملک بحری کے اولاد نہ ہوتی تھی۔ خدا نے آپ کی دُعا قبول کی اور اس کے اولاد ہوئی۔ بیدر میں کئی علما آپ کے مرید ہو گئے۔ بیدر اور چانپانیر میں آپ نے ڈیڑھ ڈیڑھ سال قیام کیا۔ بالآخر گلبرگہ اور بیجا پور ہوتے ہوئے ڈابل بندر آئے اور اپنے تین سو ساٹھ ہمراہیوں کے ساتھ ۱۴۹۵ء میں جہاز کے راستے جدہ ہوتے ہوئے مکہ معظمہ پہنچے اور حج سے فارغ ہوئے۔ طواف کے بعد آپ نے حجرِ اسود اور رکن کے درمیان مہدی موعود ہونے کا دعوٰے کیا۔ واپسی پر آپ کھمبایت پہنچے، جہاں بہت سے لوگ آپ کے مرید ہو گئے۔ وہاں سے احمد آباد گئے، جہاں آپ نے کہا کہ میں اس دنیا میں مادی آنکھوں سے خدا دکھا سکتا ہوں[1]۔ اس پر علما نے مخالفت کی اور آپ کے اخراج کا حکم ہُوا۔ وہاں سے پٹن پہنچے۔ جہاں بہت سے معتقدوں کے باوجود یہی صورت پیش آئی۔ پٹن سے آپ بڑلی گئے جہاں آپ نے مہدی موعود ہونے کا پھر سے اعلان کیا اور مختلف حکمرانوں کو تبلیغی خطوط بھیجے۔ پھر جالور۔ ناگور۔ جیسلمیر ہوتے ہوئے ٹھٹھہ پہنچے، جو سندھ کا پایۂ تخت تھا۔ یہاں جام نظام الدین والیِ ٹھٹھہ کی مخالفت کے باوجود کئی اکابر

---

[1] آج کل کی مادی دُنیا اس روایت کو شاید ہی تسلیم کرے لیکن ان قدیم مہدوی روایات اور پندرہ سو بیراگیوں کی شیخ محمد جونپوری کی فوج میں شمولیت سے شیخ کے ہندو ماحول کا کچھ اندازہ ہو جاتا ہے۔ عجب نہیں کہ شیخ چیتانیہ کی تحریک سے باخبر ہوں اور انھیں خیال آیا ہو کہ اگر معبودِ باطل کے لیے یہ کچھ کیا جا سکتا ہے تو معبودِ حقیقی کے لیے کیا کچھ نہیں کرنا چاہیے!

اور قاضی قاضن قاضی سندھ آپ کے معتقد ہو گئے۔ ٹھٹھ میں ایک سال کے قیام کے بعد آپ خراسان کی طرف روانہ ہوئے۔ پہلے قندھار آئے اور وہاں سے فرہ پہنچے، جہاں ۲۳ اپریل ۱۵۰۵ء کو (بہ عارضۂ تپدق) آپ وفات پاگئے۔ مزار فرہ کے قریب ہے۔

مولوی ابوظفر ندوی کا خیال ہے کہ آپ نے مہدی موعود ہونے کا اعلان پہلی مرتبہ برسکی میں (نہروالہ پٹن کے قریب) کیا اور اس سے پہلے دعووں کی روایات خلافِ قیاس ہیں۔

سید محمد جونپوری کے دعوئے مہدویت کی کمزوری اور ضعیف بنیادی ظاہر ہے لیکن تمام معاصرین آپ کی علمیت، پرہیزگاری اور زہد و تقویٰ کی تعریف کرتے ہیں بدایونی آپ کو "اعظم اولیائے کبار" لکھتا ہے۔ آپ کے حالاتِ زندگی اور ابتدائی ماحول کے متعلق مزید تحقیق و تفتیش کی گنجائش ہے لیکن نویں اور دسویں صدی ہجری میں آپ اور آپ کی جاری کردہ تحریک کی بڑی اہمیت ہے۔

مہدویہ جماعت کی ایک خصوصیت تو سید محمد جونپوری کے دعاوی پر ایمان ہے۔ لیکن اس کے علاوہ بھی بعض چیزیں انھیں نمایاں کرتی ہیں۔ "مہدیوں کا عقیدہ ہے کہ فرائض و واجباتِ قرآنی دو قسم کے ہیں۔ پہلی قسم میں وہ احکام شامل ہیں، جن کا تعلق نبوت اور شریعت سے ہے۔ ان احکام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ لسانِ شریعت مفصل بیان فرمادیا۔ دوسری قسم میں وہ احکام ہیں، جن کا تعلق خاص ولایت محمدیہ سے ہے۔ اب مشیت الٰہی کو منظور ہوا کہ ان احکام کی بھی تبلیغ ہو جائے۔ لہٰذا حضرت سید محمد مہدی موعود مبعوث ہوئے جو دافع ہلاکتِ اُمتِ محمدیہ اور ناصر شریعت محمدی و مبلغ احکام ولایت محمدی ہیں۔ مقام ولایت میں جو امور فرض ہیں اور ارکان دین کا درجہ رکھتے ہیں۔ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) ترکِ دُنیا (۲) صحبتِ صادقین (۳) عزلت از خلق (۴) توکل (۵) طلب دیدارِ خدا (۶) عشر (۷) ذکر کثیر (۸) ہجرت "

ان اصولوں کی پیروی نے مہدویوں کی عملی زندگی کو ایک خاص رنگ دے دیا تھا اور انہی کی وجہ سے (جیسا کہ بانیٔ طریقہ کی زندگی میں ہوا اور شیخ علائی نے اسلام شاہ سوری کے عہد میں دیکھا) مہدویوں کی حکومتِ وقت سے بسا اوقات کشمکش ہوئی۔ شروع شروع میں یہ تحریک گجرات، خاندیش اور احمدنگر میں زوروں پر تھی اور بڑے قابل اور مخلص لوگ اس میں شامل تھے۔ لیکن شیخ علی متقی کی علمی مخالفت اور مخدوم الملک کی سیاسی کوششوں نے اسے شمالی ہند میں پھلنے پھولنے نہ دیا۔ گجرات سے یہ تحریک دکن میں منتقل ہوگئی۔ احمدنگر میں جہاں جمال خاں مہدوی نظام شاہی افواج کا ایک بااثر سپہ سالار تھا، اس فرقے کو ایک زمانے میں خاص اہمیت حاصل ہوگئی۔ جمال خاں نے اپنے ہم مشرب مہدویوں کو ذکر و فکر کے اشغال سے ہٹا کر سیاسیات اور عسکری زندگی کی طرف مائل کیا۔ اسی کے زیرِ اثر نظام شاہی خاندان کے چھٹے بادشاہ اسمٰعیل بن برہان نظام شاہ ثانی نے مہدوی عقائد اختیار کر لیے لیکن تخت نشینی کے دو ہی سال بعد وہ ۹۹۹ھ میں مارا گیا اور احمدنگر میں پھر اثنا عشری شیعہ اثرات غالب آگئے۔

اس کے بعد بھی مہدویوں نے دکن کی عسکری اور سیاسی زندگی میں حصّہ لیا۔ مہدوی سپاہی اور افسر بہادر اور وفادار، لیکن دوسرے تجدیدی گروہوں کی طرح جوشیلے اور سریع الغضب ہوتے تھے۔ حافظ محمود خاں شیرانی لکھتے ہیں: "شہزادہ اورنگ زیب کے ساتھ ایک مہدوی سردار مع اپنی جماعت کے متعین تھا۔ کسی مذہبی بحث کی بنا پر آپس میں فساد ہوگیا اور آخر شہزادہ کی فوج کے ہاتھ سے مع اپنے متبعین کی فوج کے مارا گیا۔ سلطان ٹیپو کے پاس بہت سے مہدوی افغان ملازم تھے۔ ایک بار عدول حکمی کی بنا پر کئی سو مارے گئے اور باقی کا اخراج کر دیا گیا۔ سردار نمڑے زئی مہدوی ملازم باجی راؤ والیٔ پونا نے اپنے آقا کی ممانعت کے باوجود انگریزی چھاؤنی پر حملہ کر دیا۔ جس سے باجی راؤ کا علاقہ ضبط ہوگیا اور باجی راؤ کو گرفتار کر کے بھٹور پہنچا دیا گیا۔

راجا چندو لال کے دَور میں حیدر آباد مہدوی گروہ کا مرکز بن گیا۔ وہ دس

بارہ ہزار کی تعداد میں بمشاہرہ بیش قرار ملازم رکھ لیے گئے۔ اور اتنا اقتدار حاصل کر لیا کہ بے باکانہ مذہبی جنگیں شروع کر دیتے۔ یہاں تک کہ ۱۲۳۸ھ میں مولوی عبدالکریم کو مذہبی بحث کی بنا پر میر عالم بہادر کی مسجد میں قتل کر دیا [1]۔ جس پر شہر میں فساد ہو گیا اور بہت سے سُنّی اور مہدوی مارے گئے۔ نواب سکندر جاہ نے انگریزی فوج کی امداد سے ان کو ملک سے نکالا۔

دورِ حاضر کے سب سے مشہور مہدوی نواب بہادر یار جنگ تھے، جنھیں مہدویوں ہی میں نہیں بلکہ عام مسلمانوں میں بھی بڑا اثر حاصل تھا۔ وہ جذباتی خطابت کے بادشاہ تھے۔

مہدوی مشاہیر میں سے شیخ علائی کا ذکر ہم خاندان سور کی تاریخ کے ضمن میں کریں گے۔ لیکن دسویں صدی ہجری میں مہدویت کی اہمیت فقط مہدوی اکابر کے ناموں سے جانچی نہیں جا سکتی۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب مہدی جونپوری کا نام تمام برِ صغیر میں گونج رہا تھا اور تمام اہل الرائے یا اس کے شدت سے مخالف تھے یا معتقد۔ کئی لوگ ایسے تھے جو مہدوی عقیدہ اختیار کیے بغیر احیاے دین کی اُس فضا سے متاثر ہوئے جو اس تحریک نے پیدا کی۔ بہت سے ایک مدت تک اس تحریک سے وابستہ رہے۔ مثلاً فیضی و ابوالفضل کے والد شیخ مبارک۔ بلکہ شیخ علی متقیؒ جنھوں نے بالآخر گجرات میں مہدویت اور دوسری غیر راسخ تحریکوں کے قلع قمع میں سب سے زیادہ گرمجوشی دکھائی۔ بعض روایات کے مطابق ایک زمانے میں مہدوی ہو گئے تھے لیکن جب مکہ معظمہ میں پہنچ کر انھوں نے زیادہ تحقیق کی تو ان خیالات کو ترک کیا اور ان کے خلاف ٹھوس مُدلّل کتابیں لکھیں۔

مہدویت کی تنظیم و اشاعت کا بڑا ذریعہ ان کے "دائرے" تھے جو مختلف مقامات پر

---

[1] اس کے بعد کا ایک واقعہ ۱۲۹۲ھ میں ہُوا۔ جب حیدر آباد کے ایک مشہور فاضل اور نظام سابق میر محبوب علی خاں کے اُستاد مولوی زمان خان شاہجہان پوری کو ہدیہ مہدویہ کی تالیف کی بنا پر ایک مہدوی نے مسجد میں شہید کیا (تذکرہ علماے ہند ص ۸۹)

قائم ہوئے۔ ان میں یہ لوگ مل کے رہتے۔ جو کچھ ایک کے پاس ہوتا، سب میں برابر برابر بانٹ دیا جاتا۔ شرع کی سختی سے پابندی ہوتی۔ سب مل کر ذکر میں شریک ہوتے جس پر بڑا زور دیا جاتا تھا۔ جماعت کا نظام بڑا سخت تھا۔ مولوی ابوظفر ندوی لکھتے ہیں کہ جب گجرات میں یہ جماعت طاقتور ہو گئی تو اس قدر غلو سے کام لیا گیا کہ منکرینِ مہدی کو کافر کہہ دیا۔ آخر میں جرأت اس قدر بڑھ گئی کہ جو اہلِ فہم اس کا انکار کرتا، اس کو قتل کر ڈالتے اور ہر ایک ان میں سے اپنی جان قربان کرنے کو مذہب کی خدمت اور کارِ ثواب سمجھتا تھا۔ سلطان محمود بن لطیف خاں (۹۴۴ھ) کے عہد میں ان کا حال بالکل اسماعیلیوں (فرقہ حسن بن صباح) کی طرح ہو گیا تھا۔ جس کے باعث گجرات میں فساد بڑھ گیا اور امن جاتا رہا۔ چنانچہ سنی حاکموں نے سختی اور حکمت عملی سے فرقے کو دبا دیا۔ اگرچہ اب بھی گجرات، جے پور، اور حیدرآباد میں یہ لوگ موجود ہیں اور کراچی میں بھی ایک "ذکری مہدوی انجمن" ہے۔

شاہانِ سور اور مہدویت

سید محمد جونپوری کی وفات ۹۱۰ھ میں ہوئی۔ لیکن ان کا اثر برقرار رہا اور کئی مشہور اور با اثر علماء نے مہدوی طریقہ اختیار کیا۔ مہدویوں کی خصوصیات سید محمد کے معتقد ہونے کے علاوہ یہ تھیں کہ وہ قیامت کا ہر وقت انتظار کرتے اور دنیا کی ناپائیداری پر زور دیتے۔ ان میں سے اکثر نے اپنا مال و اسباب غربا میں بانٹ کر بڑی توکل کی زندگی اختیار کر لی تھی۔ اس کے علاوہ وہ شرع کی پابندی پر بڑا زور دیتے۔ جہاں کوئی بات خلافِ شرع دیکھتے اسے روک دیتے اور حکام کی ذرا پروا نہ کرتے۔

مہدوی طریقے کو شیخ علائی کے قبولِ مہدویت سے بڑا فروغ ہوا۔ وہ بنگالہ کے مشہور عالم تھے۔ حج سے واپسی کے بعد بیانہ میں سکونت پذیر ہوئے اور یہیں میاں عبداللہ افغان نیازی کے زیر اثر مہدوی طریقہ اختیار کیا۔ شیخ علائی کی زبان میں خدا نے بڑی تاثیر دی تھی۔ ان کے دوست اور مرید مہدویت کی طرف رجوع ہو گئے اور بالآخر ہزاروں لوگوں نے یہ عقائد اختیار کر لیے۔

اُس زمانے میں شیر شاہ کا بیٹا اسلام شاہ المعروف سلیم شاہ بادشاہ تھا۔ اور اُس کے دربار میں مخدوم الملک مُلّا عبداللہ سلطانپوری کو اسی قسم کا رسوخ حاصل تھا۔ جو خلافتِ عثمانیہ میں شیخ الاسلام کا تھا۔ یہ زمانہ سیاسی بدنظمی اور عام مذہبی انتشار کا دور تھا۔ ہر طرف نئی نئی تحریکیں شروع تھیں۔ مخدوم الملک کی مسلسل پالیسی تھی کہ اقتدارِ حکومت کے زور سے اور حدِ شرعی جاری کر کے نئے فرقوں اور غیر راسخ طریقوں کو کچل دیا جائے۔ اس نے بادشاہ کے کان بھرنے شروع کیے کہ بہت سے لوگ شیخ علائی کے پیرو ہو گئے ہیں۔ اگر وہ بغاوت کر بیٹھا تو تدارک مشکل ہو گا۔ چنانچہ سلیم شاہ نے شیخ علائی کو بلا بھیجا۔ شیخ نے بادشاہ سے روکھا پھیکا سلوک کیا۔ دربار میں آئے تو رسوم دربار کا خیال نہ رکھا اور جب بادشاہ نے اپنے خاصے کا کھانا بھیجا تو بادشاہ کے خلاف اظہارِ ملامت کیا۔ بادشاہ کو اس رویے پر افسوس ہوا لیکن وہ خود شیخ علائی کے خلوص اور دینی جوش سے متاثر ہو چکا تھا۔ ان باتوں کو پی گیا اور مہدوی عقائد کے متعلق شرعی فیصلہ کرنے کے لیے علماء کی ایک مجلس منعقد کی۔ اس مجلس میں دربار اور شہر کے برگزیدہ عالم جمع ہوئے۔ سید رفیع الدین محدث اور ابوالفتح تھانیسری کے علاوہ ابوالفضل اور فیضی کے باپ شیخ مبارک بھی بلائے گئے۔ شیخ مبارک نے شیخ علائی کی طرفداری کی۔ اس مجلس کے مباحثے کئی روز تک جاری رہے لیکن قطعی فیصلہ کوئی نہ ہو سکا۔ بادشاہ نے شیخ سے عقیدہ مہدویہ ترک کرنے کو کہا اور یہ بھی کہا کہ اگر تم یہ عقیدہ ترک کر دو تو تمھیں اپنی کل مملکت کا محتسب بناتا ہوں۔ اب تک تم میرے اذن کے بغیر امر معروف کرتے رہے ہو پھر میری طرف سے اختیار لے کر کرنا۔ شیخ کے لیے اپنی اصلاحیں جاری کرنے کا یہ بڑا شاندار موقع تھا۔ لیکن پُرجوش تجدیدی اور احیائی طبیعتوں کو اصلاح کے عام عملی طریقے پسند نہیں آتے۔ اس نے بادشاہ کی تجویز قبول نہ کی اور بادشاہ نے اسے سرحد دکن کی طرف ملک بدر کیا۔ وہاں کا حاکم شیخ کا مرید ہو گیا۔ مخدوم الملک نے پھر نئے خطرات بادشاہ کے دل میں پیدا کیے۔ مخدوم تو شیخ کے قتل کا فتویٰ دے چکا تھا۔ لیکن

بادشاہ لیت و لعل کر رہا تھا۔ بالآخر بادشاہ نے شیخ علائی کو صوبہ بہار کے ایک جلیل القدر فاضل میاں بُڈھے کے پاس بھیجا تاکہ وہ شیخ کے عقائد کے متعلق تحقیق کریں۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ مہدویت کے متعلق میاں بڈھے نے سلیم شاہ کو ایک خط لکھا کہ یہ مسئلہ ایسا نہیں کہ ایمان اسی پر منحصر ہو اور علامات مہدی کے بارے میں بہت اختلاف ہے اور ان سے شیخ علائیؒ کے کفر یا ایمان کے متعلق فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن میاں بُڈھے کا یہ خط سلیم شاہ تک نہ پہنچا۔ ان کے لڑکوں نے یہ سمجھ کر کہ مخدوم الملک سے اختلاف مضر ثابت ہو گا۔ باپ کی طرف سے بادشاہ کے نام ایک گول مول خط لکھا کہ آج مخدوم الملک محققین میں سے ہیں جو فیصلہ وہ کریں وہی صحیح ہے۔ بادشاہ کے پاس جب یہ خط پہنچا تو اس نے شیخ کو مخدوم کے حوالے کر دیا اور کہا کہ "تو دانی و ایں"۔ چنانچہ مخدوم نے شیخ کو کوڑے مروا مروا کر شہید کروا دیا۔

یہ واقعہ ۹۵۶ھ کا ہے۔ مخدوم نے اس سے پہلے میاں عبداللہ نیازی کے خلاف بادشاہ کو اُکسا کر انھیں پٹوایا تھا اور یہ تشدد اُس نے فقط انھی دو بزرگوں کے خلاف روا نہیں رکھا بلکہ ہر اُس شخص کے ساتھ جس کے عقائد کے متعلق اُسے ذرا بھی شبہ ہوتا' یہی سلوک کیا جاتا۔ مخدوم الملک کی نیت پر شبہ کرنے کی ضرورت نہیں اور اس زمانے میں یہ طریقِ احتساب عام تھا۔ لیکن یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ اکبر کو علما' بلکہ اسلام سے بدظن کرنے میں ان لوگوں کا بڑا ہاتھ تھا جو مخدوم کے زخم خوردہ تھے۔ چاہیے اسے شدتِ احتساب کا نتیجہ سمجھ لیں' چاہے یہ خیال کریں کہ مخدوم نے ان لوگوں کے عقائد کی نسبت جو اندازہ لگایا تھا' وہ صحیح ثابت ہوا۔

ایرانی اور شیعہ اثرات

ہمایوں نے ۹۴۷ھ میں شیر شاہ سے شکست کھائی اور راجپوتانہ اور سندھ کے ریگستان میں پریشان پھرتا رہا یہاں عمر کوٹ کے مقام پر اکبر پیدا ہوا۔ جب ہمایوں ہندوستان کی طرف سے بالکل مایوس ہو گیا اور اس کے بھائیوں نے اس کی کوئی مدد نہ کی تو اس نے ایران کا رُخ کیا۔ ایران کا بادشاہ طہماسپ صفوی اس کے ساتھ بڑے حسن سلوک سے پیش آیا اور

جب ایک عرصہ قیام کے بعد ہمایوں نے واپسی کا ارادہ ظاہر کیا تو اسے فوج دی۔ جس کی مدد سے اس نے ۱۵۴۵ء میں قندھار اور ۱۵۵۰ء میں کابل فتح کر لیا۔ ۱۵۵۵ء میں ہندوستان آیا اور دہلی اور آگرے پہ قابض ہو گیا۔ لیکن ابھی اپنی حکومت مستحکم کرنے کا موقع نہ ملا تھا کہ وہ اپنے کتب خانے کی سیڑھیوں سے پھسلا اور گر کر مر گیا۔ حکومت کے استحکام کا کام اکبر اور اس کے لائق اتالیق بیرم خاں کو کرنا پڑا جنھوں نے عادل شاہ سُور کے ہندو وزیر ہیمو بقال کو شکست دے کر خاندان سُور کا خاتمہ کر دیا۔

جب ہمایوں سفرِ ایران کے بعد ہندوستان واپس آیا تو اس کے ساتھ بہت سے ایرانی سپاہی، امرار اور علما تھے اور اس وقت سے ایران اور ہندوستان کے زیادہ قریبی تعلقات کا آغاز ہُوا۔ جن کی وجہ سے ہندوستان کی اسلامی تہذیب میں ایرانی اثرات تورانی اور عرب اثرات سے بھی زیادہ نمایاں ہو گئے ہیں۔ اس سے پہلے بھی غزنویہ خاندان کے وقت سے ہندوستانی مسلمانوں کی ادبی اور درباری زبان فارسی تھی اور ایران سے قابل اور بہادر قسمت آزما ہندوستان آتے رہتے تھے لیکن ہمایوں کے بعد یہ سلسلہ بہت وسیع ہو گیا۔ ایران کے بڑے بڑے شاعر مثلاً عرفی۔ نظیری۔ مشہور مصوّر مثلاً خواجہ عبد الصمد۔ میر علی فرخ اور قابل مدبّر مثلاً علی مردان۔ آصف خاں وغیرہ ہمایوں کے جانشینوں کے عہد میں ہندوستان آئے اور علوم و فنون کی اشاعت اور اسلامی تہذیب و تمدن کی تشکیل میں بہت مفید ثابت ہوئے۔ بنابریں مآثرِ رحیمی کا مصنف ایران کو "دبستانِ ہند" کہتا ہے۔ مغلیہ حکومت کے استحکام اور قرار میں بھی ایرانی فراست اور تدبر کو بڑا دخل تھا۔

مورخ لکھتے ہیں کہ ہمایوں ایران جا کر شیعہ ہو گیا تھا اور اسے شاہ ایران سے مدد اس وعدہ پہ ملی تھی کہ وہ اپنی مملکت میں شیعہ عقائد کی ترویج کرے گا۔ یہ تو غالباً غلط ہے لیکن اتنا قرینِ قیاس ہے کہ ہمایوں حضرت علیؓ سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہوگا اور ذیل کی رباعی اس سے منسوب کی جاتی ہے ؎

ہستیم ز جاں بندۂ اولادِ علی   ہستیم ہمیشہ شاد با یادِ علی

چوں سِرِّ ولایت ز علی ظاہر شد　　کردیم ہمیشہ وردِ خود نادِ علی

اس کے علاوہ جب وہ ہندوستان واپس آیا تو شیعہ عمّال کا زیادہ عمل دخل ہو گیا اور انھیں اپنے مذہبی معاملات میں زیادہ آزادی مل گئی۔ ہمایوں کا وزیر باتدبیر بیرم خاں خود شیعہ تھا اور شیخ گدائی جنھیں عہدِ اکبری میں سب سے پہلے شیخ الاسلام کا عہدہ ملا۔ شیعہ عقائد کے تھے۔ حضرت علیؓ کی تعریف میں بیرم خاں کا ایک پُرجوش قصیدہ مآثر رحیمی میں نقل ہُوا ہے، جس کا مطلع ہے ؎

شہے کہ بگذرد از نہ سپہر افسرِ او　　اگر غلامِ علی نیست خاک بر سرِ او!

لیکن عام طور پر مُلکی، معاشرتی اور مذہبی معاملات میں بیرم خاں اس قدر محتاط اور مرنجاں مرنج تھا کہ اگرچہ شیخ گدائی کی تعیناتی کو کئی تورانی امراء نے ناپسند کیا لیکن مذہبی حلقوں میں اس کے خلاف شکایت کا ایک حرف نہیں ملتا۔ مُلّا عبدالقادر بدایونی جیسا بزرگ اس کی تعریف میں رطب اللسان ہے اور شیخ عبدالحق محدّث اس کی نسبت لکھتے ہیں :-

> خانخاناں محمد بیرم خان کہ باوجود علوِ منصب و جاہ و جلال زیادہ از ہمہ تصوّر تواں نمود۔ بسلوک طریقۂ درویشاں و اعتقاد محبت ایشاں بود و تواضع و رعایت طریقہ التعظیم الامر اللہ والشفقت علیٰ خلق اللہ اتصافے کامل و توفیقے شامل داشت و مصداق عاش سعیداً و مات شہیداً بود۔

ہمایوں کے بعد شیعہ حضرات کی ایک کثیر تعداد ایران سے اس زمانے میں آئی[۱] جب وہاں ۱۵۷۶ء میں شاہ اسمٰعیل ثانی نے اہلِ سنت والجماعت کا طریقہ اختیار کیا اور سُنّی عقائد کے عارضی فروغ کے دوران میں برگزیدہ شیعہ علماء اور اکابر پر سختی شروع ہوئی۔ شیعہ حضرات کی آمد کا سلسلہ اور وسیع ہو گیا اور شمالی ہند میں بھی شیعوں کی معقول تعداد ہو گئی۔ حتیٰ کہ ایک انگریز اہلِ قلم کے اندازے کے مطابق اورنگ زیب کے اُمراء میں اکثریت شیعوں کی تھی۔ ایرانی النسل افراد کے علاوہ سادات بارہہ شیعہ تھے۔

---

[۱] Hollister

اٹھارھویں صدی میں اودھ ۔ مرشد آباد وغیرہ میں شیعہ ریاستوں کا قیام بعض اوقات سیاسی اور مذہبی پیچیدگیوں کا باعث ہوا ہے، لیکن عام طور پر شیعوں نے ملی مفاد کو مدنظر رکھا اور اپنی ذہانت، بلند نظری اور قابلیت سے ہماری تمدنی اور ادبی تاریخ میں کئی رنگین باب اضافہ کیے ۔ اہلِ سنت حضرات نے بھی بالعموم اُن سے دوستی اور رواداری کا سلوک کیا ہے اور غالب کو اردو کا بہترین شاعر ۔ آزاد کو اردو کا بہترین نثر نگار اور رائٹ آنریبل سید امیر علی کو اسلام کا بلادِ مغرب میں بہترین ترجمان سمجھتے وقت کسی کو ایک لمحہ کے لیے خیال نہیں آتا کہ وہ شیعہ تھے یا سُنّی !

اسلامی ہند کی تاریخ میں شیعہ اور سُنّی شخصیتوں کو علیحدہ کرنا بڑا مشکل ہے ۔ کیونکہ ایک تو بعض شیعہ حضرات اخفائے مذہب کے معاملے میں تقیہ اور احتیاط کے قائل ہیں ۔ دوسرے پاکستانی ہندوستانی اہلِ سنت والجماعت میں بھی تفضیلیوں کی کوئی کمی نہیں ۔ چنانچہ متعدد ممتاز ہستیوں مثلاً میر سید علی ہمدانی ۔ خواجہ محمود گاوان اور حضرت گیسو دراز کی نسبت اختلاف ہے کہ وہ شیعہ تھے یا سُنّی ۔ عام طور پر اب مذہبی عقائد کی یہ حالت ہے کہ کسی بحث کے وقت یا ضد اور سینہ زوری کی وجہ سے کوئی اختلاف ظاہر ہو تو ہو ورنہ عموماً شیعہ و سُنّی شیر و شکر ہو کر رہتے ہیں اور انھیں ایک دوسرے سے تمیز کرنا مشکل ہے ۔

شطاری سلسلہ

عہدِ وسطیٰ میں شطاریہ طریقِ تصوف نے فروغ حاصل کیا ۔ اسے شیخ بایزید بسطامیؒ سے منسوب کیا جاتا ہے ۔ یہ لوگ اپنے آپ کو شطاری اس لیے کہتے ہیں کہ سلوک اور طریقت میں وہ دوسرے سلسلوں کے بزرگوں سے زیادہ تیز اور سرگرم (شطار) ہوتے ہیں ۔ یہ لوگ جنگلوں میں رہ کر سخت ریاضتیں کرتے تھے اور ان سے غیر معمولی افعال و تصرفات منسوب کیے جاتے تھے ۔ شمالی بہار میں جہاں شطاری سلسلے نے پہلے قدم جمائے، اس میں اور مدار یہ طریقہ میں کئی مقامی چیزیں داخل ہو گئیں ۔ سب سے پہلے شمالی ہندوستان میں جس بزرگ نے یہ طریقہ جاری کیا شیخ عبداللہ شطاری تھے، جو مرشد کے ایما پر

ایران سے ہندوستان وارد ہوئے ۔ شطاری روایات کے مطابق وہ پانچ واسطوں سے حضرت شہاب الدین سہروردی کی اولاد اور سات واسطوں سے حضرت بایزید بسطامی کے مرید تھے ۔ ہندوستان آکر انھوں نے کچھ وقت دیارِ پورب میں گزارا۔ نکپور میں شیخ حسام الدین مانکپوری سے ملاقاتیں کیں ۔ پھر جونپور گئے لیکن سلطان ابراہیم شرقی اور اس کے متشرع ارکین سے ان کی نہ بنی ۔ پھر وہ مالوہ گئے ۔ جہاں انھوں نے بڑا فروغ پایا اور ظاہری اور باطنی شان وشوکت حاصل کی ۔ کہتے ہیں کہ جب کوئی شخص ان کے پاس مرید ہونے کے لیے آتا تو وہ اسے کھانا اور سالن کھانے کو دیتے اور دیکھتے رہتے کہ دونوں کو ساتھ ساتھ ختم کرتا ہے یا کوئی چیز بچ جاتی ہے ۔ اگر دونوں کو ساتھ ساتھ ختم کرتا تو اسے سمجھدار اور قابلِ اعتماد انسان سمجھ کر شغلِ باطنی تعلیم کرتے اور اگر دونوں کو برابر برابر ختم نہ کرتا تو سمجھتے کہ اسے اپنے اوپر ضبط نہیں اور چیزوں کا صحیح اندازہ نہیں لگاتا ۔ پھر اس سے فقط ظاہری باتیں کرتے ۔ آپ کے طریقِ کار میں لوگوں کو مرغوب ومتاثر کرنے والی کئی باتیں تھیں ۔ مشہور ہے کہ آپ نقارہ بجواتے اور اعلان کرتے کہ ہے کوئی خدا کا طالب، جسے ہم راہِ خدا دکھائیں ۔ " سطوتِ شوکتِ ظاہر " بھی حاصل تھی ۔ بڑی شان سے ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے ۔ نقارہ بجواتے ۔ علم اٹھواتے ۔ خود سلطانی لباس اور ہمراہی صوفی فوجی وردی پہنتے ۔ مجلس میں بیٹھتے تو ہر طرف نگاہ دوڑاتے اور کہتے کہ کیا یہاں کوئی تختۂ سیاہ یعنی بے اعتقاد اور خشکی مزاج طالب علم ہے ۔ بعض لوگ تو ان طریقوں کو ناپسند کرتے لیکن بعض پر ان کا بڑا اثر ہوتا ۔ مشہور ہے کہ جب بہار میں پہنچے تو حسبِ معمول شیخ محمد علا کو جو اب شیخ قاضن شطاری کے نام سے مشہور ہیں، پیغام بھیجا کہ اس درویش نے اس خیال سے سیاحی اختیار کی ہے کہ اگر کلمۂ توحید کے معنی کوئی اس سے بہتر جانتا ہو تو وہ مسافر کو تعلیم دے اور اگر ایسا نہ ہو ۔ تو بے مشقت وہ گنجِ توحید مسافر سے حاصل کرے ۔ شیخ محمد علا نے جواب دیا کہ ایسے فضول گو اشخاص خراسان اور ایران سے بہت آتے ہیں ۔ شاہ صاحب نے

سُن کر فرمایا کہ شیخ محمد علا کے کمالات کا ظہور مجھ ہی فضول گو کی تلقین پر منحصر ہے۔
گلزارِ ابرار میں غوثی شطاری لکھتے ہیں کہ اس کے بعد شاہ عبداللہ تو مانڈو کی طرف روانہ ہو گئے لیکن شیخ محمد علا کو خواب میں اشارہ ہوا کہ تمھاری گرہ کشائی شاہ عبداللہ سے وابستہ ہے۔ چنانچہ وہ وطن چھوڑ کر مانڈو روانہ ہوئے۔ شاہ صاحب کے دروازے پر تین روز کھڑے رہے۔ چوتھے روز وہ باہر تشریف لائے۔ سرزنش کی۔ امتحان لیا اور بالآخر خلعتِ خلافت سے سرفراز کرکے واپس روانہ کیا۔

شاہ عبداللہ شطاری کی وفات ۱۴۸۵ء میں ہوئی۔ مزار مالوہ کے سابق دارالخلافہ مانڈو میں قلعہ کے اندر ہے۔ ان کے خلیفہ اعظم شیخ محمد علا المعروف شیخ محمد قاضن شطاری تھے۔ مرشد سے خرقۂ خلافت پانے کے بعد انھوں نے عمر کے باقی بیس سال ارشاد و ہدایت میں صرف کیے۔ آپ کی مساعی کا بڑا مرکز ضلع مظفر پور (بہار) کا جنوبی حصہ تھا اور وہ ایک قدیمی ہندو مرکز کے قریب بسر Basarh میں مدفون ہیں۔ آپ کے بڑے بیٹے مخدوم منصور حلاج شہید کا مزار بھی یہیں ہے۔ وہ ایک مسجد کی تعمیر کے وقت مقامی قبائل کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ دُوسرے بیٹے عبدالرحمٰن شطاری تھے۔ تیسرے بیٹے شیخ ابوالفتح ہدایت اللہ سرمست شطاری کا مزار حاجی پور (بہار) کے قریب ہے۔
ان کے خلیفہ شیخ ظہور حاجی حمید حضور گوالیاری (وفات ۱۵۲۳ء) بہار کے مقام رتن سرائے میں دفن ہیں۔ شیخ ظہور نے دو چھوٹے بچوں کو پالا۔ ان کے نام تو شیخ فریدالدین جہانگیری اور شیخ خطیرالدین تھے۔ لیکن تاریخ میں وہ بالترتیب شیخ بہلول یا شیخ پھول اور شیخ محمد غوث گوالیاری کے نام سے مشہور ہیں۔

شیخ محمد غوث گوالیاری شطاری

اس سلسلے کے دو اور بزرگوں شیخ بہاالدین شطاری اور شیخ بدھن شطاری جونپوری کا ذکر اخبارالاخیار میں ملتا ہے۔ موخرالذکر نے شاہ عبداللہ شطاری کے ایک خلیفہ سے ظاہری اور باطنی تعلیم حاصل کی اور سکندر لودھی کے زمانے میں شطاریہ سلسلے کی اشاعت کی۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے چچا شیخ رزق اللہ مشتاقی (مصنف واقعاتِ مشتاقی

نے انھیں سے شطاری اعمال و وظائف سیکھے۔ لیکن شطاری سلسلے میں سب سے زیادہ شہرت شیخ محمد غوث گوالیاری کو ہوئی۔ وہ شیخ فرید الدین عطار کی نسل سے تھے۔ شیخ ظہور حاجی حمید نے آپ اور آپ کے بھائی کو فرزندی میں لیا اور سلوک و باطن کی پوری تعلیم دی۔ "نامور خانوادوں کے مشائخ جو کمالات اور حالات رکھتے ہیں، ان کے اطوار اور اسرار۔ بالخصوص شطاریہ مشرب کی رفتار۔ دعوت کائن۔ افکار کی طرز اور اشغال و تصورات کی سندیں۔ غرض کہ کل چیزیں دو سال کے اندر تعلیم و تلقین فرمادیں۔" مزید فیضان کے لیے انھیں کوہ چنار کے جنگلات میں روانہ کیا۔ جہاں شیخ محمد غوث گوالیاری نے تیرہ برس تک بڑی ریاضتیں کیں اور درختوں کے پتے کھاکر یاد الٰہی کی۔

گلزار ابرار میں لکھا ہے کہ ہمایوں شیخ ابو الفتح سرمست شطاری کا معتقد تھا۔ شیخ بہلول سے اس کے اعتقاد و ارتباط کی کتب تاریخ سے بھی تائید ہوتی ہے۔ بلکہ وہ شیخ سے سیاسی معاملات میں مدد لیتا تھا اور اس لیے مرزا ہندال نے انھیں شہید کرادیا۔ (۱۵۳۸ء)۔

بدایونی ہمایوں کے ان دو بھائیوں سے تعلقات کی نسبت کہتا ہے:۔

"وہمایوں پادشاہ را بہ ہر دو ایں بزرگوار نسبت عقیدہ و اخلاص بکمال بود۔ چنانچہ بہ کم کسے دیگر آں جہت داشتہ باشند و طریق دعوت اسما ازیں اعزہ یاد مے گرفتند۔"

شیخ محمد غوث گوالیاریؒ نے شروع سے ہی مغل بادشاہوں سے روابط قائم کر لیے تھے۔ جب بابر بادشاہ نے قلعہ گوالیار فتح کرنے کے لیے فوج بھیجی تو شیخ ان دنوں قلعہ کے اندر تھے۔ انھوں نے مغل حملہ آوروں کو ایک ترکیب بتائی، جس سے قلعہ آسانی سے فتح ہوگیا۔ مغل سرداروں نے شیخ کے مشورے پر تاتار خاں والی قلعہ سے درخواست کی کہ ہمیں اجازت دیجیے کہ چند خدمت گاروں کے ساتھ قلعہ کے اندر رات گزاریں۔ تاتار خاں اس سے پہلے اطراف کے بعض سرداروں کے خلاف بابر سے مدد مانگ چکا تھا۔ اس نے نتائج کا صحیح اندازہ کیے بغیر اس کی

اجازت دے دی اور خود مزے سے لمبی تان کر سو گیا۔ جب صبح ہوئی تو دیکھا کہ بہت سے مغل سپاہی خدمت گار بن کر قلعہ کے اندر آ چکے ہیں۔ قلعہ کے دربان شیخ کے مُرید تھے۔ انھیں بھی شیخ کا حکم پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ تاتار خاں نے دیکھا کہ اب قلعہ مغلوں سے نہیں بچایا جا سکتا۔ ناچار اس نے قلعہ کو ان کے حوالے کیا اور خود بابر کی اطاعت اختیار کر لی۔

بابر کے ساتھ شیخ محمد غوث کے تعلقات تو استوار ہو ہی گئے تھے اور ہمایوں بھی ان کا معتقد تھا لیکن اب شیر شاہ کا دور دورہ تھا۔ وہ شیخ کے درپے ہوا۔ چنانچہ شیخ اہل و عیال۔ مُریدوں اور ساز و سامان کے ساتھ گجرات ہجرت کر گئے۔ قریباً اٹھارہ سال اس علاقے میں گزارے۔ کچھ وقت چانپانیر اور بھڑوچ اور باقی وقت احمد آباد صرف کیا۔ وہاں بھی انھوں نے بڑا اقتدار حاصل کیا۔ لیکن شیخ علی متقی نے جو بڑے پایہ کے عالم تھے، ان کی بعض تصانیف کی بنا پر ان کے خلاف کفر کا فتویٰ دیا۔ بادشاہِ وقت سلطان محمود گجراتی نے ایک دوسرے عالم شیخ وجیہہ الدین سے استصواب کیا لیکن وہ شیخ کی روحانیت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ خود ان کی بیعت کر لی اور شیخ علی متقی کے فتوے کو پارہ پارہ کر دیا۔ اس سے عوام کی نظروں میں شیخ کا اثر اور بھی بڑھ گیا اور کئی لوگ ان کے مرید ہو گئے۔ لیکن اب ایرانی فوج کی مدد سے پھر ہندوستان میں مغل حکومت قائم ہو گئی تھی۔ شیخ نے مغل دربار کا رُخ کیا۔ ہمایوں اس زمانے میں وفات پا چکا تھا اور اکبر اس کا جانشین تھا۔ امورِ مُلکی بیرم خاں کے سپرد تھے اور عہدِ اکبری کا پہلا صدر شیخ گدائی شیخ کے خلاف تھا۔ جب وہ آگرہ پہنچے تو اس نے بیرم خاں کے کان بھرے کہ رسالہ معراجیہ میں شیخ نے اپنی معراج کا دعوےٰ کیا ہے اور اپنے آپ کو بڑے پیغمبروں سے فضیلت دی ہے۔ ان سے پوچھنا چاہیے کہ یہ کہاں تک جائز ہے۔ چنانچہ علما و مشائخ کے جلسے ہوئے۔ جن میں اس رسالے پر بحث ہوئی اور شیخ پر اعتراض کیے گئے۔ آخر شیخ آزردہ دل ہو کر گوالیار چلے گئے۔

دربارِ اکبری میں شیخ کی حسب توقع قدردانی نہ ہوئی پھر بھی خاندانی تعلقات کو مدّنظر رکھتے ہوئے ان کے لیے گراں بہا جاگیر مقرر ہو گئی۔ مآثر الامرا میں لکھا ہے:-

"گزیدہ از جناب عرش آشیانی یک کرور درم وظیفہ مقرر بود"۔ پھر خود ہی کہتا ہے:-

"در ذخیرۃ الخوانین آوردہ کہ شیخ نہ لک روپیہ در جاگیر داشت و چہل فیل در فوج او مے رفت"

شیخ نے اس روپے سے گوالیار میں ایک عظیم الشان خانقاہ تعمیر کرائی۔ جہاں سماع و سرود اور وجد کا شغل رہتا۔ شیخ خود بھی معرفت کے گیت بنواتے اور گنواتے تھے۔ انھوں نے کئی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ رسالہ معراجیہ کے علاوہ جواہر خمسہ۔ کلید مخازن۔ کنز الوحدہ۔ ضمائر و بصائر آپ سے یادگار ہیں۔ بحر الحیوٰۃ میں ہندو یوگیوں اور سنیاسیوں کے اطوار و اشغال ہیں۔

شیخ محمد غوث گوالیاری نے بحر الحیوٰۃ میں ہندو یوگیوں اور سنیاسیوں کے اطوار و اشغال کو فارسی میں منتقل کیا اور اپنی ابتدائی تصنیف جواہر خمسہ میں بھی ان کی ایک آدھ جھلک دکھائی۔ اس سے شطاریہ طریقے کے اس ارتباط پر روشنی پڑتی ہے جو اس کا ہندو یوگ سے تھا۔ ازمنہ وسطیٰ میں مشرقی ہندوستان کے ہندوؤں میں دو تحریکوں نے جنم لیا (۱) وشنو مت میں چیتنیہ کی احیائے مذہب کی تحریک نے جس کا اگر ابتدائی ردِّ عمل جونپور سے اٹھنے والی مہدوی تحریک تھی تو آخری جواب حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تعلیمات تھیں (۲) شیو مت والوں میں تنترک طریقوں نے زور پکڑا۔ جس کی نچلی سطح پر خلافِ اخلاق مظاہرے اور آئین و رواج سے آزادی تھی اور اس سے بالا روحانی سطح پر ریاضتوں اور یوگ سے عناصر فطرت کو تسخیر کرنے کے ارمان تھے۔ عجب نہیں کہ اس تحریک کی بے آئینی نے مداری فرقے کو متاثر کیا ہو اور روحانی سطح پر تسخیرِ فطرت کے نیم روحانی طریقے انھی اثرات سے شطاری سلسلے میں آ گئے ہوں۔

شیخ محمد غوث گوالیاری نے ۹۷۰ھ میں ۸۰ سال کی عمر میں وفات پائی اور

٭ امرت کنڈ کا ترجمہ ہے۔

گوالیار میں اپنے عالیشان روضے میں دفن ہوئے۔ شیخ کو موسیقی سے بھی دلچسپی تھی "و بہ سماع و سرود وجد... اشتغال داشت و خود دراں وادی تصنیف مے کرد"۔ اور یہ ایک اتفاقی امر نہیں کہ ہندوستان کا سب سے بڑا گویا تان سین ان کے روضے کے احاطہ میں دفن ہے۔ شیخ محمد غوث گوالیاری سے شطاری طریقے کو بڑی وسعت ہوئی۔ ان کے ایک عالم مرید شاہ وجیہ الدین احمد آبادی تھے، جن کے ایک شاگرد شیخ صبغت اللہ بھڑوچی نے مدینہ منورہ میں بیٹھ کر اس طریقے کو عالم اسلام میں پھیلایا۔ ہم ان کا ذکر آئندہ صفحات میں کریں گے۔

مغلیہ حکومت کے استحکام کے ساتھ اسلامی علوم کی جو اشاعت ہوئی اور نقشبندیہ طریقے اور شیخ عبدالحق محدث جیسے بزرگوں نے پابندی شرع پر جو زور دیا۔ اس نے شطاری سلسلے کی مقبولیت پر اثر ڈالا لیکن سولھویں صدی میں ہندوستان بالخصوص بنگال۔ بہار۔ مالوہ اور گجرات میں اس طریقے کی اہمیت باقی مشہور قدیمی سلسلوں سے کم نہ تھی۔ اس نے غوثی منڈوی[1] جیسے باخبر اور متوازن الطبع تذکرہ نگار اور شیخ عبدالنبی شطاری اکبرآبادی (وفات ۱۰۶۱ھ) جیسے فاضل پیدا کیے۔ جن کی پچاس سے زاید کتابوں کی فہرست تذکرہ علمائے ہند میں درج ہے۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ امام الہند شاہ ولی اللہ اور ان کے محبوب استاد شیخ ابوطاہر مدنی نے شطاریہ اعمال و اشغال سیکھے تھے۔

سلسلہ مداریہ

اس زمانے میں ایک اور سلسلے نے اہمیت حاصل کی جو اپنی بے قاعدگیوں کی وجہ سے ثقہ حضرات کو ناگوار تھا لیکن ان پڑھ عوام میں اس کا خاصہ اثر تھا۔ اس کا انتساب شاہ بدیع الدین مدار سے کیا جاتا ہے جو نواح قنوج میں موضع مکن پور میں مدفون ہیں۔ اخبار الاخیار کے مطابق وہ ہرمز سے کالپی آئے۔ ان کا طریقہ جذب خلائق کا تھا اور عوام میں ان کی بڑی شہرت تھی۔ مشہور تھا کہ انھوں نے بارہ سال تک کھانا نہیں کھایا اور جو لباس ایک دفعہ پہنا۔ اس کے دھوبی کی ضرورت نہ پڑی۔ ان کی عمر کی نسبت عجیب عجیب

[1] مصنف گلزار ابرار

قصے مشہور تھے۔ کوئی دو سو کوئی تین سو بتاتا اور کہا جاتا تھا کہ صرف پانچ چھ واسطوں سے آپ کا سلسلہ رسالتمآبؐ تک پہنچتا ہے۔ کالپی کے حاکم قادر شاہ نے آپ کی شہرت سنی تو سوار ہو کر ملنے گیا۔ خادموں نے کہہ دیا کہ ایک جوگی آیا ہے شاہ مدار اس سے باتیں کر رہے ہیں، اس وقت نہیں مل سکتے اور نہ ہی ہمیں اجازت ہے کہ ان تک کسی کے آنے کی اس وقت خبر پہنچائیں۔ قادر شاہ نے حکم دیا کہ ان سے کہہ دو کہ ہمارے شہر میں نہ رہیں اور چلے جائیں۔ اخبار الاخیار میں لکھا ہے کہ چلتے وقت شاہ مدار نے بد دعا دی لیکن اس کا اثر مخدوم جہانیاں کے ایک مرید شیخ سراج سوختہ نے زائل کر دیا۔

گلزار ابرار میں جو عہد جہانگیری کی تصنیف ہے، لکھا ہے کہ مداری روایات کے مطابق آپ کا سلسلہ رسول اکرمؐ تک صرف چار واسطوں سے پہنچتا ہے۔ اس کتاب کے مصنف غوثی کا بیان ہے "برہنگی اور بے حجابی اس گروہ کے مشرب میں دسویں صدی کے آخری نصف میں جوش کے ساتھ پیدا ہو گئی ہے ورنہ بدیع الدین شاہ مدار کے پُر معرفت زمانے میں رازِ وحدت کے ظاہر کرنے سے نہایت روک ٹوک تھی اور ظاہر شریعت کی مخالفت سے غایت درجہ کا خوف دلوں میں سمایا ہوا تھا۔ ایک "تازہ بدعت" یہ تھی کہ اس سلسلے میں ظاہر تجرید ضروری قرار دی گئی تھی۔ اس خاندان کے بزرگ اپنے لیے صرف ستر عورت اور اسی قدر طعام کا انتظام کرتے جو اسی ایک روز کے اندر کھا لیا جائے۔ باقی پوشاک اور خوراک سے دستکش رہتے۔ انتہا پسندوں نے "مشروع ازار کو چار انگشت کی لنگوٹی سے بدل دیا، جس سے بمشکل فقط اندام نہانی چھپ سکتا ہے اور رات کے وقت پہاڑ کی طرح آگ مشتعل کی، جس سے سرما کے لحاف کا کام لیا۔ صبح کو لباس کی جگہ بدن پر راکھ مل لی۔ یہ شعار جو سراپا عار ہے، اختیار کر کے ادب کے دائرے سے ... نکل گئے۔" غوثی نے آپ کے آٹھ خلفاء کے نام لکھے ہیں، جن میں سید جمن بہاری سب سے پختہ کار تھے۔ باقی زیادہ تر نواح لکھنؤ، قنوج، بھرائچ سے تھے۔

روشنیہ فرقہ

ایک اور فرقہ، جس کے آغاز میں شطاریہ اور مداریہ سلسلوں کی طرح اس دور کے روحانی انتشار کی جھلک نظر آتی ہے۔ روشنیہ فرقہ تھا۔ جس نے افغان علاقے میں فروغ پایا اور جس کی مقبولیت میں شاید اس بے چینی اور ہلچل کو بھی دخل تھا، جو افغانوں میں اپنی حکومت کھونے پر پیدا ہوئی۔

پیر روشن میاں بایزید انصاریؒ

روشنیہ سلسلہ کے بانی میاں بایزید انصاری (المعروف پیر روشن یا پیر رد خاں) ۱۵۲۵ء میں مشرقی پنجاب کے قدیمی شہر جالندھر میں پیدا ہوئے۔ اور اس کے ایک سال بعد بابر نے پانی پت کے مقام پر ابراہیم لودھی کو شکست دی اور ہندوستان میں افغان حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

میاں بایزید ایک ممتاز اور اہل علم خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد عبداللہ کوہستان (وزیرستان) میں معتبر عالم اور قاضی تھے۔ خاندان کے کچھ لوگ تو افغان علاقے میں رہتے تھے اور ایک شاخ ہندوستان میں آباد تھی۔ بایزید کے باپ اور دادا بھی اس سلسلے میں ہندوستان آتے جاتے تھے اور جالندھر میں بایزید کے دادا کا ایک بھائی مقیم تھا۔ یہیں عبداللہ کی شادی ہوئی اور ۱۵۲۵ء میں بایزید پیدا ہوئے۔ اس کے بعد عبداللہ کوہستان چلے گئے۔ وہ بیوی کو جالندھر چھوڑ گئے اور وہیں نان و نفقہ بھیجتے رہے۔ اگلے سال بابر کے حملے سے افغانوں کے خاندان منتشر ہو گئے اور بڑی مشکلوں اور مصیبتوں کے بعد بایزید اور اس کی والدہ بایزید کے ایک چچا کے ساتھ کانی گرام عبداللہ کے

۵؎ یہ اندراج ڈاکٹر ظہور الدین احمد کی کتاب پاکستان میں فارسی ادب سے ماخوذ ہے۔ اور انھوں نے اس کی بنیاد حالنامہ پر رکھی ہے۔

پاس پہنچے۔

کانی گرام پہنچنے کے وقت بایزید کی عمر سات سال تھی۔ ان کے والد کی ایک افغان بیوی تھی، جس سے ان کے دو بچے تھے۔ بایزید کی والدہ کے لیے کوہستان کا ماحول نیا تھا۔ سوکن کی بدسلوکی اور خاوند کی بے رُخی نے اس کا دل اُچاٹ کر دیا۔ آخر طلاق ہوئی۔ وہ اپنے خاندان کے پاس چلی گئیں اور بایزید شفقتِ مادری سے محروم ہو گئے۔ معلوم ہوتا ہے، ان مناقشات کا بایزید کے دل پر بڑا اثر ہُوا۔ نہ صرف سوتیلی ماں کا ان سے سلوک بُرا تھا بلکہ والد کا رویّہ بھی ہمدردانہ نہ تھا۔ اور آگے چل کر ان میں اور بایزید میں سخت اختلافات پیدا ہو گئے۔

بایزید کے والد چاہتے تھے کہ وہ علم حاصل کرے اور خاندانی روایات کو برقرار رکھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے والد کے ایک خلیفہ کے پاس قرآن ختم کیا۔ اور فقہ و مسائل کی کتابیں مثلاً عمدۃ الاسلام اور منیر پڑھیں۔" وہ اپنے باپ سے قدوری اور لباب الاخبار کا سبق پڑھا کرتے تھے لیکن جب معلوم ہُوا کہ باپ نے جھوٹ کہا ہے تو پڑھنا چھوڑ دیا۔"

سوتیلی ماں کے سلوک اور والد سے اختلافات کی وجہ سے بایزید اپنے والد سے الگ ہو گئے۔ اپنے چچا کی بیٹی سے نکاح کیا اور زراعت و تجارت کے کاموں میں لگ گئے۔ لیکن وہ جوانی میں ہی تفکر و تدبّر کے عادی ہو گئے تھے۔ انھیں ظاہری عبادات میں ایمان کی چاشنی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ مُلا۔ قاضی اور صوفی کی ریاکاری اور عام مسلمانوں کی باہمی لڑائیاں ان کو مغموم رکھتی تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ انھیں کوئی ایسا شخص ملے، جو انھیں سیدھی اور سچی راہ دکھائے اور ان کے اطمینانِ قلب کا سبب بنے۔ اس لیے وہ مرشدِ کامل کی جستجو میں رہنے لگے۔ ان کے گاؤں میں ان کے چچازاد بھائی، خواجہ اسمٰعیل انصاری کی درویشی کا چرچا ہُوا اور میاں بایزید نے چاہا کہ ان کے مرید ہو جائیں، لیکن والد نے مخالفت کی۔ اور کہا کہ میں اپنے والد کا سب سے

قابل بیٹھا ہوں ۔ میرے لیے یہ باعثِ ننگ ہے کہ تم میرے بھائی کے بیٹے کے مرید ہو جاؤ۔ اگر مرید ہونا ہے تو شیخ بہاء الدین زکریا کے سلسلہ خاندان سے بیعت کر لو ۔ "ملتان جاؤ۔ میں توشہ راہ اور شکرانہ پیر دے دوں گا" لیکن بیٹے نے یہ قبول نہ کیا ۔ اور بالآخر خود ہی اپنا راستہ نکالا ۔ بڑی ریاضتیں اور عبادتیں کیں اور کلام الٰہی ۔احادیث نبوی (یا ان اقوال پر جو اس زمانے میں احادیث کے طور پر مشہور تھے) اور احکام شریعت پر غور و خوض کیا ۔ اور ان خیالات و عقائد کو پیش کیا ' جن کی اس علاقے کے علما اور سرداروں نے مخالفت کی ۔ جب کانی گرام والوں نے تنگ کیا تو بعض مریدوں کے مشورے سے منگ تری گئے ۔ وہاں بھی مخالفت ہوئی ۔ پھر کانی گرام آکر ' اپنے والد کا مکان چھوڑ کر دوسرے مکان میں چلے گئے ۔ مخالفت کے باوجود کئی لوگ ان کے مرید ہو گئے ۔ اس کے بعد وہ تیراہ کی طرف گئے ۔ وہاں بھی کئی قبیلوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی ۔ اب ان کے مخالفوں نے کابل کے بادشاہ مرزا محمد حکیم کے پاس شکایت کی ۔ اس نے حاکم پشاور کو حکم دیا کہ انھیں گرفتار کر کے کابل بھیج دو ۔ جب یہ وہاں پہنچے تو انھیں قاضی خان ' قاضی کابل کے پاس مذاکرہ کے لیے بھیجا گیا ۔ قاضی خاں نے بایزید سے پوچھا: "لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ تم اپنے آپ کو مہدی کہتے ہو؟" بایزید نے کہا " میں مہدی نہیں بلکہ ہادی ہوں اور گمراہوں کو راہِ راست کی طرف ہدایت کرتا ہوں ۔" دوسرا اعتراض تھا: "تم کہتے ہو ۔ مجھ پر وحی آتی ہے ۔" بایزید نے جواب دیا: " مجھ پر وحی نہیں آتی بلکہ الہام ہوتا ہے ۔" اور رسولِ خدا کی حدیث پیش کی ۔ "الالہام نور ینزل فی القلب یعرف بہا حقیقۃ الاشیا کما ھی" ۔ قاضی نے پوچھا: "ندائے رحمانی و شیطانی میں کیسے تمیز کرتے ہو؟" بایزید نے جواب دیا: "جو الہام قرآنی آیت و حدیث کے مطابق ہو ۔ صرف وہ قابلِ قبول ہے ۔" پھر قاضی نے پوچھا: "کس خاندان کے توسط سے تم نے یہ علم حاصل کیا ہے؟" بایزید نے جواب دیا کہ " ہمارا طریقہ اویسی ہے اور حضرت رسالت پناہ کے طفیل بے واسطہ خدا ئے تعالےٰ نے مجھے علمِ لدنی سے بہرہ مند کیا ہے ۔" قاضی اور حاضرین ان جوابات سے مطمئن ہو گئے ۔

اور حکیم مرزا کے پاس جاکر تفصیلات بیان کیں۔ اس نے ایک دو اور سوال کیے اور میاں بایزید کو اسپ و خلعت دے کر رخصت کیا۔

پیر روشن کابل سے پشاور پہنچے۔ وہاں اب نیا حاکم تھا، جو ان کا بہت مخالف ہوگیا۔ چنانچہ وہ پشاور چھوڑ کر علاقہ مہمند زئی میں چلے گئے اور دین کے پھیلانے پر کام شروع کیا۔ یہاں سے انھوں نے ایک خلیفہ کے ہاتھ اپنی کتاب صراط التوحید اکبر کے پاس بھیجی، جس نے خوشی کا اظہار کیا اور نذر و تحائف بھیجے۔ اسی طرح مرزا سلیمان کے پاس بدخشاں میں ایک خلیفہ کو بھیجا۔ اس نے گھوڑا اور پوستین دی۔ اور خدمت میں حاضر ہونے کی توقع ظاہر کی۔

اس کے جلد بعد مغلوں اور پیر روشن میں لڑائیاں شروع ہوگئیں۔ ابتدا ان کی اس طرح ہوئی، کہ پیر روشن کے مریدوں نے ایک قافلہ کو لوٹ لیا، جو مال لے کر ہندوستان سے کابل جارہا تھا۔ اب حکیم مرزا نے پشاور میں اپنے نائب کو لکھا کہ بایزید کے خلاف سخت اقدامات کیے جائیں۔ اس نے بایزید کو گرفتار کرنا چاہا۔ لیکن بایزید اور ان کے ہمراہیوں نے مقابلہ کی ٹھانی۔ چنانچہ زور کا معرکہ ہوا۔ جس میں مغل سپاہیوں کو شکست ہوئی۔ اس کے بعد یہ سلسلہ بڑھتا گیا۔ مغلوں اور ان قبائل کی جنھوں نے روشنیہ عقائد اختیار کرلیے تھے کشمکش جاری تھی کہ ۹۸۰ھ (۱۵۷۲ء) میں بایزید کی وفات ہوگئی۔

میاں بایزید کے پانچ بیٹے تھے۔ شیخ عمر۔ نورالدین۔ خیرالدین۔ کمال الدین۔ جلال الدین۔ ان میں سے شیخ عمر مسندِ خلافت پر بیٹھے۔ انھوں نے باپ کا سلسلہ جاری رکھا اور یوسف زئی افغانوں کے مال و اسباب میں دست درازی کرنی چاہی۔ لیکن سب یوسف زئی جمع ہوگئے اور شیخ عمر کو مع ان کے کئی ساتھیوں کے ہلاک کردیا۔ خیرالدین بھی اسی لڑائی میں مارے گئے۔ نورالدین نے راہِ فرار اختیار کی۔ لیکن اشنغر کے گوجروں نے انھیں بھی ہلاک کرڈالا۔ کمال الدین کو اکبر نے قید کرلیا اور بحالتِ قید ہی انھیں پیغامِ اجل آپہنچا۔ اب میاں جلال الدین اپنے باپ کے

جانشین تھے (جنھیں مغل مورخین جلالہ کہتے ہیں) ۔ ان کے شروع میں مغلیہ دربار سے اچھے مراسم تھے ۔ جب ۱۵۸۱ء میں حکیم مرزا کی بغاوت فرو کر کے اکبر کابل سے واپس آیا تو راستے میں میاں جلال الدین اس سے ملے اور سلکِ ملازمت میں داخل ہو گئے ۔ لیکن یہ پالیسی ان کے ساتھیوں کو ناگوار تھی ۔ چنانچہ کچھ دیر بعد وہ مغلیہ لشکر سے روپوش ہو گئے اور اپنا پرانا سلسلہ شروع کیا ۔ ۱۵۹۱ء میں جعفر بیگ قزوینی کو ان کی سرکوبی کے لیے بھیجا گیا ۔ یہ مہم ایک حد تک کامیاب رہی اور میاں جلال الدین کے اہل و عیال قید ہو کر دارالسلطنت بھیجے گئے لیکن میاں جلال الدین ہاتھ نہ آئے بلکہ وہ ترکستان چلے گئے تاکہ عبداللہ خاں ازبک سے مدد حاصل کریں لیکن اکبر کی حکمت عملی سے یہ سکیم کامیاب نہ ہوئی (اگرچہ اکبر کو شمال مغربی سرحد کی حفاظت کے لیے عبداللہ خاں ازبک کی وفات تک لاہور میں مقیم رہنا پڑا) ۔ ۱۵۹۹ء میں میاں جلال الدین نے غزنی پر یلغار کی اور اس مقام کو خوب لوٹا لیکن وہاں پاؤں نہ جما سکے ۔ اس زمانے میں افغانوں کی قبائلی لڑائیاں بھی جاری تھیں ۔ میاں جلال الدین ایک مخالف شاہ دمان ہزاروی کے ہاتھ سے زخمی ہوئے اور اسی سال وفات پا گئے ۔ ان کے بعد ان کے جانشینوں کی بھی مغلوں کے ساتھ کشمکش گاہے گاہے ہوتی رہی ۔

میاں جلال الدین کے بعد مسندِ خلافت پر شیخ عمر کا بیٹا احداد خاںؒ بیٹھا ۔ لیکن ۱۰۳۵ھ میں وہ جہانگیری لشکر کے ہاتھوں مارا گیا ۔ اس کا جانشین اس کا بیٹا عبدالقادر تھا جنھیں شاہجہان کے زمانے میں اعلیٰ منصب مل گیا اور وہ امرائے شاہی میں داخل ہوئے ۔ میاں جلال الدین کے بیٹے اللہ داد خاں کو رشید خاں کا خطاب اور چار ہزاری

---

[1] معلوم ہوتا ہے مغلوں سے کشمکش میں ادعائے سلطنت کو بھی دخل تھا بقول ڈاکٹر محمد جہانگیر خاں، "احداد نے جہانگیر کو ... لکھا کہ ذرا اپنا شاہنامہ کھول کر تو دیکھ ۔ تجھے معلوم ہو جائے گا کہ سلطان ابوسعید تیموریہ کی دختر کس صاحب حال سے بیاہی گئی تھی ۔ ہم اسی بزرگ کی اولاد میں ہیں اور اسی لیے وارثِ مملکت ہیں" (منقول در تذکرہ صوفیائے سرحد ص ۱۲۰ ۔ ۱۲۱ ۔)

عہدہ ملا۔ اور فرقہ روشنیہ اور مغل حکام کی کشمکش ختم ہوئی۔

فرقہ روشنیہ اور مغلوں کی کشمکش کا اُتار چڑھاؤ ہوتا رہا لیکن اس فرقے کے زوال کا اصل سبب وہ مسلسل مخالفت تھی جو ان کے عقائد و خیالات کی ان کے اپنے علاقے میں ہوئی۔ سرحد میں اس وقت کئی فاضل علماء ایسے تھے جو جانتے تھے کہ میاں بایزید کی قرآن و حدیث کی ترجمانی صحیح نہیں۔ انھوں نے میاں بایزید کی سخت مخالفت کی۔ ان میں اخوند درویزہ کو بڑی شہرت ہے، جن کا تفصیلی تذکرہ ہم آیندہ صفحات میں کریں گے۔

پیر روشن کے متعلق اختلافات

پیر روشن کے واقعاتِ زندگی بیان کرتے وقت ہم نے زیادہ تر انحصار ڈاکٹر ظہور الدین احمد صاحب کی کتاب پاکستان میں فارسی ادب پر کیا ہے۔ جس میں پیر روشن کے نقطۂ نظر کو اس کی تصانیف کی بنا پر (جس حالت میں وہ اب ملتی ہیں) نمایاں کیا گیا ہے۔ زمانۂ حال کے بعض دوسرے اہلِ علم نے بھی اسی نقطۂ نظر کا اظہار کیا ہے اور ان کے مخالفین کے بیانات کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ مسئلہ مزید تحقیق و تفکر کا محتاج ہے۔ روشنیہ سلسلے کے متعلق قریب قریب معاصر العہد بیانات ملتے ہیں۔ لیکن پھر بھی حقیقت الحال کو جاننا بڑا مشکل ہو گیا ہے۔ اس کے بانی نے حال نامہ کے نام سے اپنی خود نوشت سوانح عمری لکھی۔ جس میں اپنی تعلیمات کا خلاصہ دیا۔ اور اس نام کا ایک مخطوطہ علیگڑھ لائبریری میں ہے۔ جس کی نقلیں پنجاب یونیورسٹی لائبریری اور دوسرے اداروں میں بھی ہیں۔ لیکن خود اس مخطوطہ سے ظاہر ہے۔ کہ یہ اصل نسخے کی نقل نہیں بلکہ حالنامہ کا ایک بالکل نیا ایڈیشن ہے، جسے مصنف کی وفات کے ستر اسی سال بعد ان کے ایک معتقد نے عہدِ عالمگیری میں از سرِ نو ترتیب دیا۔ مولانا اعجاز الحق قدوسی نے مرتب کے متعلقہ الفاظ تذکرۂ صوفیائے سرحد میں مع ترجمہ دیے ہیں اور حسبِ ذیل ہیں:۔

بعد ازیں فقیرِ حقیر علی محمد بن ابابکر — اس کے بعد یہ فقیرِ حقیر علی محمد بن

قندھاری مرید و خادمِ خاندانِ بایزید انصاری
بگوید کہ بعضے از محبانِ مخلصان کہ رعایتِ خاطرِ خاطر
ایشان از جملۂ لوازمات و واجبات دانستہ بود
ازیں فقیر التماس داشتند کہ حالنامہ پیر دستگیر کہ
از تمادیٔ دوران و تسامحِ ناسخان تغیر و تبدل
بعبارتش رسیدہ راہ یافتہ و صحتش بسقامت
بدل گشتہ، و نیز سوانح و حقائق فرزندان و
احوال نبیرگانِ پیر دستگیر قدس سرہ و دیگر از
احوالاتے کہ در منصۂ ظہور جلوہ گر آمدہ، چنانچہ
شمشیر گرفتن و رفتن ایشاں بجانب پشاور و
تراہ و کابل و غیر از سوانحات کہ در انضباط
نیامدہ ازیں نسخۂ شریفہ زائل گشتہ و از طبع
زکی شما کہ مفتحِ ابوابِ معانی متعلقہ و کاشفِ
اسرار دفاترِ مسدودہ است، بعید نیست
کہ تعمیق و تطابق دادہ تصحیح نمایند، و ارادت و
تقاضاے ایشاں بسمعِ قبول و اصغا نمود
بموقفِ اجابت مقرون گشت، بامید توفیق
حق، و ما توفیقی الا باللہ العلی العظیم و
ھو حسبی و نعم الوکیل۔

و آنچہ از کتاب و ناقلانِ معتبر استماع
گشتہ بسمطِ تحریر و در نظمِ تقریر آوردہ شد،
معرا از زینتِ سخن پیرائی، مبرا از تکلیف
کلام آرائی و در حیزِ ارقام مرتسم گشت

ابا بکر قندھاری، جو بایزید کے خاندان کا
مُرید اور خاص خادم ہے، عرض کرتا ہے کہ
بعض مخلص دوستوں نے، جن کے پاسِ خاطر
کو میں واجبات میں سے جانتا ہوں، اس فقیر
سے کہا کہ پیرِ دستگیر (پیر روشان) کے
حالنامے کی عبارت میں زمانے کی طوالت
اور نقل کرنے والوں کے تسامح سے بہت
کچھ تبدل و تغیر ہو گیا ہے، اور اس کی صحت
سقم سے بدل گئی، اس کے علاوہ اس
میں ان کے فرزندوں اور ذریت کے
حالات، اور دوسرے واقعات جو ظہور پذیر
ہوئے جیسا کہ مسلح ہو کر پیرِ دستگیر کا پشاور،
تراہ اور کابل وغیرہ جانے کے واقعات تحریر
میں نہیں آئے اور جو اس نسخہ شریفہ سے زائل
(غائب) ہو گئے ہیں، آپ کی جودتِ طبع سے
جو متعلقہ ابواب کے معانی کو کھولنے والی
اور سربستہ دفاترِ اسرار کی کاشف ہے، بعید
نہیں ہے کہ فکرِ عمیق سے اس کا تطابق کر کے
اس کی تصحیح کریں، توفیقِ حق کی امید پر ان کی
ارادت مندی اور اُن کے تقاضے کو سامع
نے قبولیت کا درجہ دیا۔ و ما توفیقی الا باللہ
العلی العظیم و ھو حسبی و نعم الوکیل۔
اور میں نے جو کچھ کہ کتاب میں دیکھا تھا

تا بفہم مبتدیان و در ذہن متعلمان صورت معانی روشن و مبرہن نماید و بثواب آں ایں ناقل بہرہ مند گردد الثواب من عند اللہ واللہ عندہ من الثواب والسلام علی من اتبع الھدیٰ۔

اور معتبر ناقلوں سے سُنا تھا، اسے سادگی کے ساتھ تحریر میں لایا، جو بناوٹ اور عبارت آرائی سے بالکل پاک ہے۔ تاکہ مبتدیوں اور طالب علموں کے ذہنوں میں اس کے معانی و مطالب واضح طور پر آسکیں اور اس کے ثواب سے یہ نقل کرنے والا بہرہ مند ہو۔ الثواب من عند اللہ واللہ عندہ من الثواب والسلام علی من اتبع الھدیٰ۔

مندرجہ بالا اندراج سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ موجودہ حالنامہ پیر روشن کی خود نوشت سوانح عمری سے کافی مختلف ہے۔ اس کی تشکیل و ترتیب عہدِ عالمگیری میں ہوئی۔ جب افغان علاقے میں راسخ العقیدگی غالب آ چکی تھی اور خود پیر روشن کے پوتے اور دوسرے معتقد مغلوں کے منصبداروں میں شامل ہو گئے تھے۔

حالنامہ کے متعلق یہ حقیقت اس لیے اہم ہے کہ حالنامہ کے حوالے سے پیر روشن کے عقائد کا جو خلاصہ دبستانِ مذاہب میں دیا گیا ہے۔ وہ قلمی حالنامہ پر منطبق نہیں آتا۔ اس کی دو ہی وجہیں ہو سکتی ہیں کہ یا تو دبستانِ مذاہب کے مصنف نے غلط بیانی سے کام لیا ہے یا حالات کے تبدیل ہو جانے کی وجہ سے حالنامہ کے مرتب نے کتاب میں تغیر و تبدل کیا ہے۔ ممکن ہے آگے چل کر اصلی حالنامہ کا کوئی نسخہ مل جائے اور یہ عقدہ حل ہو جائے۔ لیکن مرتب کے[۱] اپنے بیان کے پیشِ نظر یہ امر زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ حالنامہ پیر روشن کی تالیف سے کافی مختلف ہے۔ اور اس سے دبستانِ مذاہب کے بیانات کی تردید نہیں ہوتی۔

جناب قدوسی صاحب نے، جنھوں نے اس مسئلے کا سب سے زیادہ تفصیلی مطالعہ کیا ہے،

---

[۱] حالنامہ، قلمی مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری۔ ص ۱-۲ [منقولہ در تذکرہ صوفیائے سرحد ص ۱۹۳-۱۹۴]

پیر روشن کے مشہور مخالف اخوند درویزہ پر کڑی نکتہ چینی کی ہے اور پیر روشن کی اہم تصنیف خیر البیان کی نسبت لکھا ہے: "ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ حضرت اخوند درویزا نے اس کتاب کو کن اسباب کی بنا پر اس قدر مطعون کیا ہے"۔ لیکن خیر البیان کے دیباچہ ہی سے انھوں نے جو حوالے دیے ہیں (باقی کتاب کا جو حصہ ملا ہے، وہ پشتو میں ہے، اس لیے موصوف نے اس کا بغور مطالعہ نہیں کیا) ان سے خیال ہوتا ہے کہ معترضین کے اعتراضات اس قدر بے بنیاد نہ تھے بلکہ اہل شریعت اس کتاب پر اعتراض نہ کرتے تو حیرت ہوتی۔ یہ کتاب کلام مجید کی طرز پر اس طرح لکھی گئی ہے کہ گویا پیر روشن پر وحی نازل ہو رہی ہے اور وہ ارشادات ربانی کو حرف بہ حرف سپرد قرطاس کر رہے ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

یا بایزید! بنویس آں حروفہا کہ بسانند بہر زباں برائے منفعت آدمیاں، [تو ئی دانا من نمیدانم بجز حروفہا قرآن، یا سبحان] یا بایزید نوشتن حروفہا بر تو آسان است، و نمودن و آموزانیدن ناموا و حرفہا بر من است۔ (منقولہ در تذکرہ صوفیائے سرحد ص ۱۸۶)۔

قدوسی صاحب نے تو اس طرز تحریر کو "ملہمانہ انداز" یا "القائی" طریق کہہ کر معاملے کو ختم کر دیا ہے لیکن اگر ایسی کتاب کو دیکھ کر اخوند درویزہ یہ کہیں کہ پیر روشن الہام یا وحی کے مدعی ہیں اور ان کے دعاوی کو فتنۂ عظیم سمجھیں، تو اس پر حیرت کیوں ہو؟ انھوں نے قلمی حالنامہ پیر پیر روشن کے ساتھ بعض علما [مثلاً مرزا حکیم کے دربار میں قاضی خان (تذکرۂ صوفیائے سرحد ص ۱۴۴-۱۴۵) یا مولانا زکریا (ص ۱۴۱-۱۴۳)] کے مباحثوں کی جو تفصیلات دی ہیں، ان سے صاف ظاہر ہے کہ دوسرے علما بھی پیر روشن پر وہی الزام لگاتے تھے، جو اخوند درویزہ نے لگائے۔ مثلاً الہام کا دعوے۔ نبوت کا ادعا وغیرہ۔ پیر روشن خیر البیان کے متعلقہ اندراجات کی تاویل کرتے تھے لیکن کم از کم ان مباحثوں سے ظاہر ہے کہ اخوند درویزہ جو کہتے تھے، وہ ان تک محدود نہ تھا۔ تاریخ مرصع اور خوشحال خاں خٹک کے بعض اشعار میں بھی اسی نقطۂ نظر کا اظہار ہے۔

اخوند درویزہ صاحب نے پیر روشن کی نسبت جو سخت الفاظ لکھے ہیں (ملعون وغیرہ) ان پر جتنا بھی افسوس کیا جائے بجا ہے۔ انھوں نے اس کے افعال کے متعلق جب وہ ان کا ہمحان تھا، جس طرح خفیہ طریقے سے خبر رکھی، وہ بھی کسی عالی خیالی کا مظہر نہ تھا۔ وہ پیر روشن کی ذہانت، قابلیت اور ذہانت کے قائل تھے، لیکن اس کے اہم مثبت پہلوؤں کا انھیں اندازہ نہ تھا۔ انھیں پیر روشن سے جو مذہبی عناد تھا، وہ ان کی کتابوں سے صاف عیاں ہے بلکہ ان کی مذہبی زندگی کا نمایاں جزو تھا، لیکن ابھی تک ایسے شواہد نہیں ملے جن کی بنا پر انھیں دروغ بیانی کا مجرم قرار دیا جا سکے۔

اس کے علاوہ ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ جس قسم کے اعتراضات اخوند درویزہ پیر روشن پر کرتے ہیں، حالنامہ کے بیانات کے مطابق دوسرے کئی معاصرین نے کیے۔ ان کے والد ان کے مخالف تھے۔ مرزا حکیم حکمران کابل کے ایما پر قاضی کابل نے ان پر اعتراضات کیے۔ اگرچہ پیر روشن نے تاویلات سے ان اعتراضات کا جواب دے دیا۔۔۔ لیکن اگر ان اعتراضات کو ہی دیکھا جائے، جو متعدد موقعوں پر حالنامہ کے بیان کے مطابق کیے گئے تو پیر روشن کی مخالفت میں اخوند درویزہ تنہا نظر نہیں آتے بلکہ اور کئی علما و فضلا تھے۔ خیر البیان کے اندازِ بیان سے یہ بات بھی بخوبی سمجھ میں آسکتی ہے کہ یہ اعتراضات کیوں ہوتے تھے۔ صراط التوحید، مسلمان حکمرانوں کو پیش کرنے کے لیے اس وقت لکھی گئی، جب کابل کا مباحثہ ہو چکا تھا اور پیر روشن کو معلوم تھا کہ ان پر کس قسم کے اعتراضات ہوتے تھے۔ چنانچہ قدرتی طور پر اس میں قابلِ اعتراض باتیں نہیں۔ (اگرچہ اس کا موجودہ نسخہ بھی بدیہی طور پر ترمیم شدہ ہے)۔ لیکن خیر البیان کو دیکھ کر پیر روشن کے مخالفین کے بیانات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور ہم ان کا خلاصہ درج ذیل کرتے ہیں۔

مخزن الاسلام کا اندماج

اخوند درویزہ صاحب نے اپنی تصانیف (بالخصوص اپنی پشتو کتاب مخزن الاسلام کے آخر) میں فرقہ روشنیہ اور اس کے بانی کی نسبت کئی ایسی معلومات جمع کی ہیں جو کہیں اور نہیں ملتیں۔ اخوند صاحب کی

میاں بایزید کے ساتھ سخت مخالفت تھی اور انھوں نے اس کے متعلق جابجا غیظ و غضب اور برہمی کا اظہار کیا ہے۔ میاں بایزید کے بعض کلمات (مثلاً اس کی دو تحریریں) سے جو نتائج وہ اخذ کرتے ہیں ان سے ہم متفق نہیں لیکن اخوند صاحب ایک برگزیدہ مذہبی عالم تھے۔ بلاشبہ وہ اپنے خیالات میں سخت تھے اور بعض جگہ معصوم یا قابلِ تاویل امور سے بھی بڑے مخالفانہ نتیجے اخذ کر لیتے تھے، لیکن یہ خیال کہ انھوں نے دانستہ دروغ بیانی سے کام لیا، قابلِ قبول نہیں معلوم ہوتا۔

اخوند درویزہ لکھتے ہیں کہ نواحِ قندھار کے موضع کانی گرم[1] میں عبداللہ نام کے ایک بزرگ رہتے تھے۔ وہ علما و صلحا کی اولاد میں سے تھے اور خود بھی زیورِ علم و صلاح سے آراستہ تھے۔ ان کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا، جس کا نام اس صلحا کے قدر دان نے بایزید رکھا۔ اسے بھی انھوں نے دولتِ علم سے بہرہ ور کرایا۔ کم عمر بایزید ریاضت و عبادت میں مشغول رہتا اور منہیات شرعی سے حتی الوسع مجتنب تھا، لیکن حصولِ تعلیم کے بعد وہ گھوڑوں کی سوداگری کے سلسلے میں ہندوستان گیا اور موضع کالنجر (جالندھر؟) میں مُلا سلیمان ملحد کی صحبت میں رہا۔ اس صحبت اور ہم نشینی سے بایزید کے دل میں خیالات فاسد جانشین ہوئے۔ حتیٰ کہ وہاں سے وہ ایک "کافرِ مطلق" اور "منکرِ دینِ برحق" ہو کر واپس ہُوا۔

جب کانی گرم میں بایزید نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تو اس کے والد سخت برہم ہوئے بلکہ بیٹے کو زدوکوب کیا۔ چنانچہ بایزید وہاں سے بھاگ کر ننگرہار چلا گیا۔ اور مہمند علاقے میں ملک سلطان احمد کے مکان پر ایک مدت تک مقیم رہا لیکن یہاں اہلِ سُنت اور علما کثرت سے تھے۔ انھوں نے اس کی بات نہ سُنی۔ وہاں سے وہ پرشور (پشاور) کے قریب غوریا خیل قبیلے کے درمیان آ مقیم ہُوا۔ یہاں کوئی

---

[1] یہ قصبہ جنوبی وزیرستان میں رزمک کی مشہور سابق چھاؤنی سے کوئی بیس میل اور ٹانک سے ۸۰ میل دُور ہے۔

زبردست اور متبحر عالم نہ تھا جو بایزید کے بیان کو کتاب و حدیث اور علم و اصول کی کسوٹی پر کستا۔ اس لیے عوام میں سے کئی لوگ اس کے معتقد ہوگئے۔

اخوند درویزہ نے میاں بایزید کے جو حالات لکھے ہیں، ان سے اور دوسرے ذرائع سے خیال ہوتا ہے کہ میاں بایزید پر ہندو اثر بھی کافی تھا۔ مشرقی پنجاب تو خیر ہندوؤں کی روحانی سرگرمیوں کا بڑا مرکز تھا، لیکن پشاور اور دوسرے افغان علاقوں میں ابھی ہندو موجود تھے۔ خود پیر روخاں کے مریدوں میں ہندو تھے اور اخوند درویزہ لکھتے ہیں کہ وہ انھیں "بزبان ہندوی" ذکر کی تعلیم دیتے۔ ہندوؤں کے عقیدہ تناسخ کو تو پیر روخاں نے اپنی تعلیمات کا جزو بنالیا تھا۔ اخوند درویزہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ میاں بایزید مردوں اور عورتوں کو یکجا بٹھاتے اور سرود و رقص اور دستک کا آغاز کرتے۔ شعر پڑھے جاتے اور ذکر ہوتا (پس مرداں را بازناں یکجا مے نشاندند۔ سرود و رقص و دستک مے وزیدند و بیت مے گفتند و ذکر مے گفتند) مردوں اور عورتوں کا اس طرح کا یکجا اجتماع اس برِ اعظم میں کسی اسلامی سلسلے میں پہلے رائج نہ تھا، لیکن اس کا رواج بعض ہندو فرقوں میں عام تھا۔

پیر روخاں پر دوسرے اثرات بھی کئی تھے (مثلاً "تخیلات فلسفہ و سوفسطائیہ بیان مے کردہ و مے نوشتہ") لیکن مقامی حالات و ضروریات کے اثر کے علاوہ جو چیز ان کی تحریک میں مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ صوفی عقیدہ وحدت الوجود کی غالی پیروی اور طریقت کی انتہائی مطلق العنانی ہے۔ ہندوستان کے چند ایک دوسرے صوفیہ میں بھی یہ رجحان نظر آتا ہے، لیکن میاں بایزید ایک تو پیدا اس زمانے میں ہوئے، جب شیخ علی متقی اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کی اصلاحی تحریکیں ابھی شروع نہ ہوئی تھیں۔ دوسرے اپنے خیالات کی تدوین انھوں نے اس علاقے میں کی، جہاں اہلِ علم کی روک ٹوک تھوڑی تھی۔ اس لیے ان کے خیالات میں وہ مطلق العنانی ہے، جس کی مثال اس برِ اعظم کے کسی دوسرے مشہور اور با اثر روحانی راہنما میں نہیں ملتی، لیکن ان کی تحریک کی بنیاد انھی رجحانات پر تھی جو وحدت الوجودیوں

میں عام ہیں[1]۔ مثلاً غالب کا یہ مشہور شعر ہے ؎

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

میاں بایزید نے اس خیال کو جس صورت میں پیش کیا، وہ (بقول اخوند درویزہ) یہ تھا: "چوں بجز وجودِ خدا چیزے دیگر در وجود نیست، پس حرام و حلال در روا و ناروا چہ معنی دارد"۔ اسی طرح بعض صوفیہ میں مرشد کو جو درجہ تعظیمی دیا جاتا ہے، اسے سب جانتے ہیں۔ بقول حافظ ؎

بہ مے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود زراہ و رسمِ منزلہا

میاں بایزید کی مطلق العنانی اور انتہا پسندی نے مرشد کو خدا اور پیغمبر کا ہم رتبہ بنا دیا اور کہنے لگے کہ پیرِ کامل کے بغیر خدا تک رسائی نہیں۔ وہ کلام مجید کی ایک آیت کا حوالہ دیتے وابتغوا الیہ الوسیلۃ اور کہتے کہ اس کے مطابق خدا تک پہنچنے کا وسیلہ پیر ہے۔ "و افغاناں از بے علمی تصدیق و باور کردند و ندانستند کہ در تفسیر بیضاوی وغیرہ آوردہ کہ وسیلہ بجائے ایشاں طاعات و ترک معاصی است۔ پس بے استقامت بر شریعت نبوی صلعم بہ خدا راہ نیست"۔ [اخوند درویزہ]

اسی طرح شریعت پر طریقت اور معرفت کو ترجیح دینے کا مسئلہ ہے۔ میاں بایزید کہتے کہ پہلی منزل شریعت ہے۔ جب تک شریعت سے نہ گزریں، طریقت تک رسائی نہ ہوگی اور جو شخص طریقت سے نہ گزرے گا وہ معرفت و حقیقت تک نہ پہنچے گا۔ اس خیال کا اظہار بھی صوفیوں میں عام ہے، لیکن اخوند درویزہ اور ان کے ہم خیال کہتے کہ جو کوئی شریعت سے گزر جاتا ہے، وہ کافر ہو جاتا ہے اور کافر کی

---

[1] پیر روشن کی تصنیف صراط التوحید میں جو بہت بعد کی تصنیف ہے اور اکبر اور دوسرے سلاطینِ وقت کے لیے لکھی گئی، زیادہ تر عام نقطۂ نظر کا اظہار ہے، لیکن حالنامہ میں جو تغیر و تبدل ہوا ہے اسے دیکھتے ہوئے پیر روشن کی تصانیف کے قریب العہد قلمی نسخوں کی تلاش جاری رہنی چاہیے۔

خدا تک رسائی نہیں۔ وہ کہتے کہ یہ خیال کہ شریعت کے علاوہ بھی کوئی دوسرا راستہ ہے جو خدا تک پہنچا دیتا ہے، سرے سے غلط ہے۔

غرضیکہ میاں بایزید کی تعلیمات کا سراغ دوسرے وحدت الوجودیوں کے ہاں مل جاتا ہے، لیکن انھوں نے ان چیزوں کو ایک نیا رنگ دیا اور ان خیالات میں اس طرح غلو کیا کہ ان کی کایا ہی پلٹ دی۔ شریعت پر طریقت کو اور طریقت پر معرفت کو اس طرح ترجیح دی کہ ایک طرح سے مریدوں کو شریعت سے بالکل آزاد کر دیا بلکہ بعض روایات کے مطابق ایک نئی شریعت کا آغاز کیا اور نماز روزہ وطہارت کے احکام میں بنیادی تبدیلیاں کیں۔ ہم ان کا ذکر دبستانِ مذاہب کے اندراج کے ضمن میں کریں گے۔

میاں بایزید کی افغان علاقے میں کامیابی کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے افغانی زبان میں اپنے خیالات کی اشاعت کی۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ اپنی تعلیمات کو افغانوں تک محدود رکھنا چاہتے تھے۔ میاں بایزید نے جس زمانے میں نشوونما پائی اس وقت (مثلاً بھگتی تحریک کے دوران میں) سنسکرت اور عربی کی جگہ عام فہم زبان میں تصنیف و تالیف کا رجحان عام تھا۔ چنانچہ اس کے مطابق میاں بایزید بھی مریدوں کی سمجھ اور زبان کے مطابق ذریعۂ تعلیم اختیار کرتے۔ اخوند درویزہ لکھتے ہیں:-

"القصہ ایں ملحد چوں مردم را بجود معتقد میکرد۔ ایشاں را خلوت مے فرمود و ذکر مے داد۔ اما ذکر او از ناحیۂ باری تعالیٰ نبودہ بلکہ افغاناں را بہ زبان افغانی یکاں سخنے موافق موزوں ساختہ مے دادہ۔ و بعضے جہلائے فارس را بہ زبان فارسی و ہندواں را بہ زبانِ ہندوی و بکفاشہ"

میاں بایزید کا دائرہ کار افغان علاقہ رہا، لیکن ان کی ذہنی ساخت میں فقط مقامی اثرات نہ تھے اور نہ ہی ان کا مطمحِ نظر محض مقامی تھا۔ وہ تو سارے ہندوستان اور خراسان کو مسخر کرنے کے خواب دیکھتے تھے۔ (ولا فہا زدہ کہ تمام ہندوستان و خراسان خواہم

ل یعنی بزبان عربی (مولف)

در تصرف خود آوردہ'، اور یہ ایک اہم حقیقت ہے کہ ان کے خیالات کا مجموعہ خیرالبیان فقط پشتو زبان میں نہیں لکھا گیا بلکہ میاں بایزید نے اسے چار زبانوں یعنی عربی، فارسی، پشتو اور ہندی میں لکھا تاکہ سب زبانوں میں اپنے خیالات کی ترویج کر سکیں۔

دبستانِ مذاہب کا اندراج

دبستانِ مذاہب سے جو غیر معروف فرقوں کے متعلق قابلِ اعتماد معلومات کا ایک بڑا ماخذ سمجھا جاتا ہے، خیال ہوتا ہے کہ میاں بایزید کی نجی مشکلات نے ان کی پریشانیوں میں بڑا اضافہ کیا۔ ان کے والد شیخ عبداللہ انصاری زیادہ تر سرحد کے افغان علاقے میں (مقام کانی گرم) رہتے تھے۔ جب ہندوستان پر مغلوں کا قبضہ ہو گیا تو اس کے ایک عرصہ بعد بایزید اور ان کی والدہ بھی ان کے پاس چلی گئیں، لیکن بیوی کی میاں سے نہ بنی۔ شیخ عبداللہ نے اسے طلاق دے دی اور خورد سال بایزید کو عام بے چینی کے علاوہ، سوتیلی ماں اور بے پروا باپ کے ظلم و ستم سہنے پڑے۔ انھیں شروع ہی سے روحانی اور مذہبی امور سے دلچسپی تھی۔ کھیتوں کی نگہبانی کے لیے جاتے تو دوسروں کی کھیتیوں کا بھی خیال رکھتے۔ چھوٹی عمر میں حقیقتِ اشیا اور مبدا و معاد کی نسبت سوال کرتے اور پوچھتے کہ زمین اور آسمان تو موجود ہیں لیکن خدا کہاں ہے؟ وہ چاہتے تھے کہ اپنے ایک قرابتدار خواجہ اسمٰعیل کے مرید ہو جائیں، لیکن والد مانع ہوئے اور کہا کہ یہ باعثِ شرم ہے کہ اپنے ایک معمولی قرابتدار کی مریدی کرو۔ مرید ہونا ہے تو شیخ بہاء الدین زکریا کی اولاد میں سے کسی کی بیعت کرو۔ بیٹے نے کہا۔ روحانی مرتبہ کوئی موروثی چیز تو نہیں، لیکن بالآخر بایزید کو خود ہی اپنا راستا بنانا پڑا۔ بڑی ریاضتیں اور عبادتیں کیں اور کلامِ الٰہی، احادیثِ نبوی اور احکامِ شریعت پر خود ہی غور و خوض کیا، لیکن ایسے ایسے معنی نکالے کہ حقیقت سے بہت دُور جا پڑے اور شریعت و طریقت کی خود رو ترجمانی سے ایک ایسا ملغوبہ تیار کیا جو مروجہ اسلام سے بالکل مختلف تھا۔ ان کے معتقد انھیں پیرِ روشن کہتے تھے، لیکن ان کے مخالف کثرت سے تھے۔ وہ انھیں پیرِ تاریک کہتے۔

میاں بایزید نے اپنے پیروؤں کے لیے نئے قواعد وضوابط بنائے۔ نماز کے لیے قبلہ رو ہونے کی شرط اڑا دی۔ غسل کے لیے پانی[1] کو غیر ضروری قرار دیا۔ مریدوں کو تعلیم دی کہ جو اُن کے پیر کا قائل نہ ہو اور وحدت وجود کے راستے پر نہ چلے اس کا ذبح کیا ہوا جانور حرام ہے بلکہ انھوں نے تو اپنے مخالفین کا قتل کرنا اور ان کا مال متاع لوٹ لینا جائز قرار دیا۔ وجہ یہ بتاتے کہ جو لوگ خود شناس نہیں وہ یا تو حیوان ہیں جنھیں دوسرے حیوانوں مثلاً بھیڑ بکری کی طرح ذبح کرنا اور سانپ بچھوؤں کی طرح ہلاک کرنا جائز ہے۔ یا حیاتِ ابدی سے محروم ہونے کی وجہ سے مُردے ہیں اور مُردوں کا مال زندوں کو پہنچتا ہے۔

"دگفت ہر کہ خدا را و خود را نشناسد آدمی نیست۔ اگر ادموذی است حکم گرگ و پلنگ و مار و کژدم دارد۔ پیغمبر عربی گفتہ اقتل المؤذی قبل الایذا۔ و اگر بیکار و نماز گزار است حکم گاؤ و گوسفند دارد۔ کشتن آں جائز است۔ بنابریں مخالفین خود شناسی را کشتن فرمود۔ چہ ایشاں حیوانند..... دگفت ہر کسے کہ خود را نشناسد و خبر از زندگی جاوید و حیاتِ ابدی ندارد مُردہ است و مالِ مُردہ کہ وارثش آں چنیں مُردہ باشند بہ زندگان رسد۔ بنابریں نیز حکم بر قتل ناداں کرد۔"[2]

اس فلسفہ پر وہ خود عامل تھے۔ چنانچہ دلبستانِ مذاہب میں جس کے مصنف نے میاں بایزید کے حالات ان کی خود نوشت سوانح عمری حال نامہ اور دوسرے مآخذ سے جمع کیے ہیں، لکھا ہے کہ میاں بایزید اپنے بیٹوں کے ساتھ مدتوں تک راستا چلنے والوں کو لوٹتے رہے۔ پانچواں حصہ اپنے قائم کردہ بیت المال میں جمع کرتے

---

[1] "او خود را نبی دانستے و مردم را بہ ریاضت فرمودے و نماز بگذاردے۔ اما تعین جہت را از میان برداشت فاینما تولوا فثم وجہ اللہ فرمود۔ غسل بآب واجب نیست چہ ہمیں کہ باد رسید تن پاک میشود۔ چہ چہار عنصر از مطہرات است۔" (دلبستانِ مذاہب ص ۳۰۸)

[2] دلبستانِ مذاہب ص ۳۰۸

اور بوقت ضرورت اہلِ استحقاق میں تقسیم کرتے ۔

پیر روشن کی اہمیت

پیر روشن کے خیالات کا جو خلاصہ ہم نے مخزن الاسلام اور دبستانِ مذاہب سے دیا ہے ۔ اس کی دلچسپی نظری اور تحقیقی ہے ۔ روشنیہ فرقہ کے اگر یہی عقائد ابتدا میں تھے، جن پر اعتراض کیے گئے، تب بھی وہ ترک ہو گئے ۔ پیر روشن کے خاندان کے کئی افراد اپنے عقائد سے تائب ہو گئے اور بہرکیف، جس علاقے سے اللہ تعالیٰ نے اسلام اور مسلمانوں کی اتنی خدمات لینی تھی، وہاں راسخ العقیدگی غالب آگئی، لیکن اگر مخزن الاسلام اور دبستانِ مذاہب کے اندراجات کو بالکل صحیح مانیں، تب بھی پیر روشن کی تاریخی اہمیت کم نہیں ہوتی ۔ انھوں نے اور ان کے جانشینوں نے کئی سال تک ایک اہم مذہبی، تمدنی، اور سیاسی تحریک کی رہنمائی کی ۔ پشتو ادب کے تو وہ بانیوں میں سے ہیں اور خیرالبیان پشتو نثر کی سب سے پہلی کتابوں میں سے ہے ۔

ایک ایسے بنجر پہاڑی علاقے میں جہاں جائز آمدنی کمانے کے ذریعے کم تھے، لیکن جہاں سے ہو کر ترکستان اور بلخ بخارا کے پُر اموال تجارت سے لدے ہوئے قافلے گزرتے تھے ۔ میاں بایزید کی تعلیمات کا مقبول ہونا قدرتی امر تھا (اور ایک حد تک یہ تعلیمات مقامی حالات اور اس علاقے کی اقتصادیات کا نتیجہ تھیں)، لیکن میاں بایزید کے وسیع اثر کی ایک وجہ ان کی اور ان کے مریدوں کی ادبی سرگرمیاں تھیں ۔ ادبیاتِ سرحد میں رضا ہمدانی لکھتے ہیں :-

> "پیر روشان بہت بڑی شخصیت کا مالک تھا ۔ ادب، فلسفہ، تبلیغ وارشاد اور قومیت سب میں ماہر تھا ۔ اگرچہ پیر روخان زندگی کے تمام شعبوں میں دسترس کامل رکھتا تھا، لیکن اس کی ادبی زندگی بہت نمایاں تھی بلکہ پشتو ادب کی ترقی کا باعث ہی پیر روخان تھا ۔ اس نے نثر کے ذریعے پشتو ادب کی بہت بڑی خدمت کی اور ایک نئے مکتبِ فکر کی بنیاد رکھی ۔ اس کی تصانیف میں خیرالبیان بڑی مشہور کتاب ہے ۔ کہتے ہیں کہ یہ کتاب پیر روخان نے چار زبانوں میں لکھی

پشتو۔ فارسی۔ عربی اور ہندی۔ یہ کتاب شریعت، طریقت اور دینی مسائل سے متعلق ہے۔ نیز اس میں پٹھانوں کے سیاسی، اجتماعی اور بین القبیلی اتحاد کا بیان ہے اور جابجا قرآن و احادیث کے ساتھ اپنے خیالات کو تطبیق دی گئی ہے......

رضا ہمدانی صاحب نے اپنے بیان کا ماخذ نہیں بتایا۔ پشتو ادب کے قدیم عالم پیر روخاں کو وہ درجہ نہیں دیتے جو رضا صاحب نے دیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ جب تک پیر روخاں کی تصانیف چھپ کر سامنے نہ آئیں، پشتو ادب میں ان کا مرتبہ معین کرنا مشکل ہے، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے پشتو زبان کی سرپرستی کی۔ پشتو شاعری بہت پرانی ہے اور پشتو نثر میں بھی پیر روشن سے پہلے تصنیف و تالیف ہو رہی تھی، لیکن انھوں نے جس مکتبِ فکر کا آغاز کیا، اس کے متعدد ممتاز ادبی ترجمان تھے۔ شعرا میں سے مخلص اور ارزانی ان کے معاونین خاص تھے۔ لیکن اس مکتبِ خیال کا سب سے بااثر نمائندہ (میاں بایزید انصاری کا پوتا؟) مرزا خاں انصاری تھا، جس نے پشتو میں پہلا دیوان مرتب کیا۔ وہ آخر میں روشنیہ عقائد سے تائب ہو گیا تھا۔ لیکن اس نے پہلی مرتبہ پشتو غزل کو صوفیانہ خیالات (بالخصوص نظریہ وحدت الوجود) کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور پشتو شعرا کے سرتاج رحمان بابا کے لیے راستا ہموار کیا۔

پیر روشن کے جو احسانات پشتو ادب پر ہیں اس سے زیادہ افغان موسیقی پر ہیں، اس سلسلے میں قدوسی صاحب نے قلمی حالنامہ سے طویل حوالے دیے ہیں اور ہم ان کے شکریے کے ساتھ ان کا تمام اندراج درج ذیل کرتے ہیں:۔

حالنامے کے بعض اندراجات سے معلوم ہوتا ہے کہ:

"پیر بایزید اور ان کے مریدوں نے اس علاقے کی موسیقی کے فروغ میں بھی بڑا حصہ لیا تھا۔ حالنامے میں ان دو خزانوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جو پیر بایزید کے ذریعے سے قوم کو ملے۔ حالنامے میں ہے کہ:۔

روزے ... بیابانِ خود منیر مود کہ   ایک روز اپنے دوستوں.... سے

دو گنج از افغاناں حق تعالیٰ پوشیدہ داشت،
بطفیل دو کس آں ہر دو گنج ظاہر ساخت،
یکے از آں گنج علم توحید است کہ از افغاناں
پوشیدہ بود، حق تعالیٰ از طفیل پیر روشاں
بر ایشاں مکشوف گردانید۔ سخن گنج دوم کہ
مذکور شدہ بود، آں گنج علم موسیقی است کہ
از طفیل حاجی محمد خلیفہ میر فضل اللہ دلی بر افغاناں
کشف نمود، زیرا کہ بیشتر در افغاناں بر غنگپیں
سہ تارا می نواختند، و بر رباب پنج تار یعنی
سرمد دو تار مینواختند و دو تارے گفتند،
واز تعلیم و طفیل حاجی محمد سازندہائے ایشاں
تارہائے بسیار بر سازہائے انداختند و
نغمہائے نو نو اختراع نمودند، اما اکثر نغمہائے
رقص و غیر ملائم می نواختند، چوں آں
سازندہائے در خدمت پیر دستگیر قدس سرہ
رسیدند، واز برکت صحبت و طفیل پیر
دستگیر سرود و سلوک و نغمہائے ملائم نواختند
و شش مقام بستند، یکے ناصری، دوم
پنج پردہ، سوم چہار پردہ، چہارم سہ پردہ،
پنجم پردۂ جنگ کہ در وقت جنگ مینواختند
ششم مقام شہادت است، و دریں مقام
بسیار بند ہا و نغمہا نواختہ می شود، و دیگر
بیشتر در افغاناں از دو سہ بیت شعر زیادہ

فرماتے تھے کہ دو خزانے حق تعالیٰ نے
افغانوں سے پوشیدہ رکھے تھے دو شخصوں
کے طفیل سے وہ دونوں خزانے افغانوں
پر ظاہر کیے۔ ایک خزانہ ان میں سے
علم توحید ہے، جس کو خدا تعالیٰ نے
پیر روشاں کے طفیل سے افغانوں پر ظاہر
کیا۔ دوسرا خزانہ جو ظاہر کیا گیا، وہ خزانہ
علم موسیقی کا ہے، جو حاجی محمد خلیفہ میر فضل اللہ دلی
(مرید پیر روشاں) کے طفیل سے افغانوں
پر ظاہر ہوا۔ اس لیے کہ پہلے افغان غنگپیں،
(ساز) پر اکتارہ بجاتے تھے اور پانچ تار
کے رباب یعنی سرمدہ پر دو تار بجاتے تھے
اور پانچ تار کے رباب یعنی سرمدہ پر دو تار
بجاتے تھے اور اسے دو تارہ کہتے تھے۔

حاجی محمد کی تعلیم اور طفیل سے ان کے
سازندوں نے کئی کئی تار سازوں میں ڈالے
اور نئے نئے نغمے نکالے لیکن وہ اکثر نغمے
غیر ملائم بجاتے تھے۔

جب یہ سازندے پیر دستگیر (پیر روشاں)
کی خدمت میں پہنچے تو پیر دستگیر کی صحبت و
برکت اور طفیل سے نغمۂ ملائم بجانے لگے
اور چھ نغمے ایجاد کیے۔ ایک ناصری، دوسرے
پنج پردہ، تیسرے چار پردہ، چوتھے تین پردہ،

نبود، و پیر دستگیر قدس سرہ بزبان افغانی قصیدہ ہا و غزلہا و رباعی ہا و قطعہا و مثنویہا ساختند، و از طفیل پیر دستگیر قدس سرہ، فرزندان و مریدانش دیوانہا گفتند

پانچویں پردہ جنگ ہو جنگ کے وقت بجاتے ہیں، چھٹے مقام شہادت اور اس نغمے میں بہت سے نغمے اور بند گائے جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ اس سے پہلے افغان (شاعری) میں شعر دو تین قسم سے زیادہ نہ تھے۔ پیر دستگیر نے افغانی زبان میں قصیدے، غزلیں، رباعیاں، قطعے اور مثنویاں کہیں اور پیر دستگیر کے طفیل سے ان کے فرزندوں اور مریدوں کے دیوان کہے۔

حالنامے[1] کے اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ "حاجی محمد مرید پیر فضل اللہ ولی متوفی ۷۹۲ھ (۱۳۹۳ء) نے رباب میں چند تاروں کا اضافہ کیا تھا اور ان کی اس ایجاد پر افغان موسیقاروں نے چند نئے نغمے اضافہ کیے تھے، لیکن موسیقاران نغموں کو غیر متوازن بجاتے تھے۔ پیر بایزید نے ان نغموں میں اصلاح کی۔ ان کی رہنمائی میں موسیقار اس قابل بنے کہ سرود و سلوک اور دوسرے حسب ذیل طربیہ نغمات کا سرود بنا سکیں۔

ناصری (دھناسری) پنج پردہ، چہار پردہ، سہ پردہ، جنگی آہنگ، مقام شہادت۔ سرود کا ذوق پیر بایزید میں شروع ہی سے تھا۔ جب سرود[2] ہوتا تو وہ وجد میں آجاتے تھے۔ ان کے بیٹے اور پوتے بھی ماہر موسیقار تھے۔"

---

[1] حالنامہ قلمی صفحہ ۴۵۳۔۴۵۴ [2] ملاحظہ ہو تذکرہ صوفیائے سرحد (مولانا اعجاز الحق قدوسی ص ۱۴۲۔۱۵۲)

قادریہ سلسلہ

زمانِ وسطیٰ کے ہندوستان میں مرکزی حکومت کی کمزوری کا آخری زمانہ مذہبی انتشار کا زمانہ بھی تھا، لیکن سیاسی استحکام اور علوم اسلامی کی اشاعت کے ساتھ حالات سدھر گئے۔ اس اصلاح حالت میں ایک نئے صوفیانہ سلسلے سے بھی مدد ملی۔ جس نے شمالی ہندوستان بالخصوص پنجاب اور سندھ میں بڑا اقتدار حاصل کیا اور جس کا اثر آج کسی دوسرے خانوادے کے اثر سے کم نہیں۔ یہ سلسلہ حضرت پیرانِ پیر غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ سے شروع ہوا جو ۵۶۱ھ میں بغداد میں فوت ہوئے اور جن کے نام پر یہ سلسلہ قادریہ کہلاتا ہے۔ اس وقت ہندوستان میں چشتیہ اور سہروردیہ سلسلوں کا زور کم ہو گیا تھا۔ ان خانوادوں میں سے اب بھی کئی پاک سیرت اور نیک نفس بزرگ پیدا ہو رہے تھے۔ جن کی زندگیاں عوام کے لیے چراغ ہدایت تھیں، لیکن ان میں سلطان المشائخ جیسی عظیم الشان شخصیتیں نہ تھیں۔ اس کے علاوہ مغلیہ حکومت کے استحکام اور بالخصوص حرمین کے لیے بحری راستا کھل جانے سے مُلک میں اسلامی علوم اور فقہ کی اشاعت بڑھ گئی۔ اس لیے بعض متشرع بزرگوں کو جو تصوف اور ذاتی روحانی تجربات کو بھی اہمیت دیتے تھے ایک ایسے صوفیانہ نظام کی تلاش تھی، جس کی کوئی بات شرع کی نظروں میں مشتبہ نہ ہو۔ بالآخر نقشبندیہ سلسلے نے اس رجحان کو پورا کیا لیکن اس کے فروغ سے پہلے اس بارے میں قادریہ سلسلے کو دوسرے قدیمی سلسلوں پر امتیاز حاصل تھا اور اس کی وجہ سے بڑے بڑے پرہیزگار علما مثلاً شیخ علی متقیؒ اور شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اس سلسلے میں بیعت کی اور اسے خواص و عوام میں بڑا فروغ حاصل ہوا۔

مخدوم محمد گیلانی حلبیؒ

سب سے پہلے طریقہ قادریہ کے جس بزرگ کا نام ملتا ہے۔ دکن کے شاہ نعمت اللہ قادری متوفی ۸۳۰ھ تھے۔ لیکن ان سے سلسلہ بہت پھیلا نہیں اور صحیح طور پر جس بزرگ نے ہندوستان میں

اس سلسلے کا آغاز کیا۔ وہ حضرت مخدوم محمد گیلانی قدس سرہٗ تھے۔ آپ حضرت غوث اعظم کی اولاد سے تھے، لیکن جب ہلاکو خاں نے بغداد کو تباہ و برباد کیا تو آپ کے بزرگ حلب چلے گئے۔ آپ وہیں پیدا ہوئے۔ آپ کو ظاہری جاہ و جلال بھی حاصل تھا اور علوم معقولی و منقولی بھی آپ نے پوری طرح حاصل کیے۔ ایک عرصہ ایران۔ خراسان اور دوسرے ملکوں کی سیر کی۔ پھر اپنے والد کی وفات کے بعد ہندوستان تشریف لائے اور مغربی پنجاب کے مشہور مقام اُچہ میں توطن اختیار کیا۔ سلطان سکندر لودھی آپ کا بڑا معتقد تھا۔ آپ شعر بھی کہتے تھے اور قادری تخلص کرتے تھے۔ اکثر اشعار حضرت غوث اعظم کی تعریف میں ہیں۔ لیکن ایک غزلوں کا دیوان بھی ہے جس میں کئی ترجیع بند ہیں۔ شیخ عبدالحق محدث نے ایک بند اخبار الاخیار میں درج کیا ہے۔ ہم بھی تبرکاً چند اشعار نقل کرتے ہیں ؎

رندیم و قلندریم و چالاک | مستیم و معربدیم و بے باک
جامیم و صراحئیم و بادہ | دُرد و صدفیم و بحر و خاشاک
والیٔ ولایتِ شش و پنج | حامیٔ بلا و فہم و ادراک
مجموعۂ رازِ عالمِ دل | منصوبہ کشائے سرِّ لولاک
بگذشتہ ز خویش بے کدورت | نگذشتہ ز عشق جوہر خاک

ما بلبل بوستان قدسیم
شہباز سفید دست انسیم!

مخدوم عبدالقادر ثانی

مخدوم محمد گیلانیؒ کی وفات ۹۲۳ھ میں ہوئی۔ آپ کے چار بیٹے تھے۔ سبھی اپنی جگہ بلند مرتبہ، لیکن جو مرتبہ مخدوم عبدالقادر ثانیؒ کا ہے، دوسروں کو حاصل نہیں ہوا۔ کہتے ہیں کہ جب حضرت مخدوم محمد گیلانی وفات پا گئے تو اگرچہ سجادہ نشینی کا حق شیخ عبدالقادر ثانی کا تھا، لیکن ان کے بھائی بادشاہ کے دربار میں تھے۔ انھیں خیال ہوا کہ ہم اپنے اثر و اقتدار سے سجادگی اپنے لیے حاصل کر لیں۔ آپ کو پتا چلا تو آپ نے جاگیر و املاک کے متعلق تمام اسناد

وفرامین بادشاہ کے پاس بھیج دیے کہ جو ان کے طالب ہیں انھی کو یہ دے دو۔ اس کے بعد متوکلانہ گزارہ کیا۔ ایک بار بادشاہ نے (غالباً ملتان کا حاکم ہوگا) ان سے اپنے دربار میں آنے کی درخواست کی اور گزشتہ اقدام کی تلافی چاہی، لیکن انھوں نے لکھ بھیجا ؎

به هیچ باب ازیں باب سوئے گشتن نیست — هر آنچه بر سر ما مے رود، مبارک باد
کسیکه خلعت سلطان عشق پوشیده است — بحله هائے بهشتی کجا شود دل شاد

کہتے ہیں کہ عنفوانِ شباب میں آپ بڑے عیش و آرام سے زندگی گزارتے تھے بلکہ جہاں آپ جاتے، باجوں اور دوسرے آلاتِ موسیقی سے لدے ہوئے اونٹ ہمراہ ہوتے۔ لیکن جب آپ پر دوسرا رنگ غالب آیا اور اپنے والد کے سجادہ نشین ہوئے تو ان سب باتوں سے مُنہ پھیر لیا۔ سماع سے قطعی پرہیز کرنے لگے اور اپنے مریدوں کو بھی سختی سے اس کی ممانعت کرتے۔ اس تبدیلی کا باعث تذکرہ نگار یوں بیان کرتے ہیں کہ آپ ایک دفعہ اُچ کے بیابان میں شکار کر رہے تھے کہ ایک تیتر نے بڑی دردناک آواز سے نالہ و فریاد شروع کیا۔ ایک درویش اس بیابان میں تھا۔ اُس نے کہا کہ سبحان اللہ ایک دن ایسا بھی ہوگا جب یہ جوان خدا کی محبت میں اسی طرح نالہ و فریاد کرے گا۔ یہ سُن کر آپ پر عجیب حالت طاری ہوئی۔ دُنیاوی چیزوں سے دل سرد ہوگیا اور روز بروز محبتِ الٰہی کے آثار زیادہ نمایاں ہونے شروع ہوئے حتیٰ کہ آخر میں ہر طرف سے دل ہٹ گیا اور فقط ذاتِ مولےٰ کا دھیان رہ گیا۔ آپ کو شیخ عبدالقادر ثانیؒ اس لیے کہتے ہیں کہ آپ کے کمالات حضرت غوثِ اعظم قدس سرہٗ کے تابع تھے اور آپ روحانیت میں انھیں کے وارثِ حقیقی تھے۔ آپ کی بڑی کرامات بیان کی جاتی ہیں اور تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ آپ کی نگاہ میں ایسی تاثیر تھی کہ جس پر نظر ڈالتے، اس کی کایا پلٹ جاتی۔ گنہگار ہوتا تو تائب ہو جاتا اور کافر ہوتا تو ایمان کی دولت سے مشرف یاب ہوتا۔ اخبار الاخیار کا بیان ہے: "بسیارے از عصاۃ و کفار بمشاہدۂ جمال و معائنۂ

کمالش بسعادت توبۂ نصوح مے رسیدند و بشرف ایمان مشرف مے شدند۔"

شیخ عبدالقادر ثانی کی وفات ۱۵۳۳ھ میں ہوئی۔ ان کے بعد قادریہ سلسلے میں کئی مشائخ کبار گزرے ہیں۔ آپ کے پوتے حضرت سید حامدؒ جو حامد گنج بخشؒ کے نام سے مشہور ہیں۔ اپنے زمانے میں شیخ زمانہ سمجھے جاتے تھے۔ اُن کے ایک صاحبزادے شیخ موسےٰ پاک شہیدؒ تھے جو ملتان میں پاک دروازہ کے اندر دفن ہیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے پہلے انھی سے قادریہ سلسلے میں بیعت کی تھی۔ شیخ موسےٰ بیشتر شاہی لشکر میں رہے۔ اُچہ میں ارشاد و ہدایت زیادہ تر ان کے بھائی کرتے۔ بدایونی لکھتا ہے کہ اگر شیخ موسےٰ بادشاہ (اکبر) کے حضور میں ہوتے اور نماز کا وقت آن پہنچتا تو عین دیوان خانے میں خود اذان دے کر باجماعت نماز شروع کر دیتے اور کوئی انھیں روک نہ سکتا۔ شیخ موسےٰ کا اپنے بھائی شیخ عبدالقادر سے سجّادہ نشینی کے سلسلے میں تنازعہ ہوا تھا اور شیخ عبدالقادر اس سلسلے میں فتح پور آئے تھے لیکن ایک بات پر ان کی اکبر سے چپقلش ہو گئی اور انھوں نے وراثت اور مدد معاش کا قضیہ ترک کر کے اُچہ میں واپس جا کر متوکلانہ زندگی شروع کر دی اور قبول عام حاصل کیا۔

شیخ داؤد کرمانی شیر گڑھی

شیخ حامد کے ان فرزندانِ گرامی کے علاوہ ان کے خلیفہ شیخ داؤد کرمانی جو ضلع منٹگمری (ساہیوال) کے قصبہ شیر گڑھ میں آرام فرما ہیں۔ ایک بڑے باکمال بزرگ ہوئے ہیں۔ ملا عبدالقادر بدایونی آپ کا ذکر اس عقیدت اور احترام سے کرتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے، لیکن دوسرے ہمعصر مورخین کے بیان سے بھی اس رائے کی تائید ہوتی ہے۔ شیخ عبدالحق محدث لکھتے ہیں۔ "صاحب حال صحیح و کشف صریح۔ در عین سلوک ریاضیات شاق و مجاہداتِ فوق الطاقہ کشیدہ" اور شیخ قطب عالم کا جو اس زمانے کے مشہور چشتی بزرگ تھے (ملاحظہ ہو ذکر حضرت خواجہ باقی باللہ) کا بیان نقل کرتے ہیں کہ جب میں شیخ داؤد کی خدمت میں پہنچا تو ان کے وعظ و نصیحت کے طریقے دیکھ کر

میرے دل میں خیال گزرا کہ کہیں شیخ مہدوی نہ ہوں، لیکن جونہی میرے دل میں یہ خیال گزرا شیخ نے بغیر میری طرف سے کسی اظہار کے یا کسی اور تقریب گفتگو کے فرمایا کہ مہدویہ فرقہ گمراہ ہے اور ان کے پاس اپنے طریقے کی کوئی صحیح سند نہیں۔

شیخ داؤد کے بزرگ عرب سے ہندوستان تشریف لائے تھے اور ملتان کے قریب ایک قصبے میں اقامت پذیر ہوئے۔ آپ کے والد آپ کی پیدائش سے پہلے، اور والدہ پیدائش سے تھوڑی دیر بعد انتقال کر گئیں اور آپ دُرِّ یتیم ہو کر رہ گئے۔ آپ نے علوم ظاہری مشہور شاعر اور عالم مولانا جامیؒ کے شاگرد مولانا اسمٰعیل اُچہ سے شہر لاہور میں حاصل کیے[1] لیکن جلد ہی جذبۂ الٰہی غالب آگیا اور آپ کی توجہ تمامتر ذاتِ واحد کی طرف منعطف ہو گئی۔ روحانیت آپ نے حضرت غوث اعظمؒ سے اویسی طریقے سے حاصل کی، لیکن "بہت نگاہداشت سلسلہ" شیخ حامد قادری کے مرید ہوئے۔ آپ نے بڑی ریاضتیں کیں۔ برہنہ سر و برہنہ پا آپ علاقہ دیپال پور کے صحرا میں پھرا کرتے تھے۔ اور جنگل کے جانوروں اور پرندوں کے سوا آپ کا کوئی رفیق نہ ہوتا۔ بالآخر آپ نے شیر گڑھ میں اقامت اختیار کی اور جلد ہی آپ کی شہرت سارے ہندوستان میں پھیل گئی۔ اس وقت سلیم شاہ سُوری کی بادشاہت تھی اور مُلّا مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری ردِّ بدعت کا دُرّہ ہاتھ میں لیے مصروفِ کار تھے۔ چنانچہ گوالیار سے فرمان جاری ہوا کہ شیخ داؤد دربار میں حاضر ہوں۔ آپ دو ایک رفیقوں کے ساتھ اس دُور دراز سفر پہ روانہ ہوئے۔ گوالیار کے باہر مخدوم الملک سے ملاقات ہوئی، لیکن شیخ کے تقدّس نے مخدوم الملک پر بھی اثر کیا اور ان کی ملاقات بڑی خوشگوار رہی۔ ابتدائی گفت و شنید کے بعد آپ نے مخدوم سے پوچھا کہ فقیر کی طلبی کس لیے ہوئی ہے؟ مخدوم نے کہا کہ سُنا ہے کہ آپ کے مُرید ذکر کرتے وقت "یا داؤد" "یا داؤد" کہتے ہیں۔ آپ نے کہا نہیں ممکن ہے سُننے والے کو غلطی ہوئی ہو۔ "یا ودود" "یا ودود" کہتے ہوں گے۔ قطع نظر اس جواب کے، مخدوم آپ کے ورع و تقوے کا قائل ہو گیا تھا۔ آپ نے اُسے چند نصیحتیں کیں اور شیر گڑھ کی راہ لی۔

[1] منتخب التواریخ (بدایونی)

آپ کا معمول تھا کہ سال میں ایک یا دو دفعہ جو کچھ آپ کے پاس نذر و فتوحات کی قسم سے آتا تقسیم کر دیتے اور اپنے گھر میں ایک مٹی کے کوزے کے سوا کچھ نہ رکھتے۔

جب حضرت غوث اعظم کا عرس میلاد آپ کی خانقاہ میں ہوتا تو بقول بدایونی ایک لاکھ کے قریب انسان جمع ہوتے اور ان سب کو لنگر میں کھانا ملتا۔ آپ اپنی مجلس میں اکثر اس طرح حیران و پریشان بیٹھے رہتے تھے جیسے کوئی چیز کھو گئی ہے یا کسی آنے والے کے منتظر ہیں کہ اتنے میں یکایک کوئی حالت طاری ہوتی اور آپ حقائق و معارف کا بیان شروع کر دیتے۔ کبھی کبھی کہتے کہ عراق کی طرف سے جو ہوا آتی ہے، اس کے ساتھ میرے دل پر فیضِ الٰہی کے جھونکے آتے ہیں۔

آپ بڑے پابندِ شریعت تھے اور کوئی امر خلاف حدیث شریف آپ سے صادر نہ ہوتا۔ مشہور مورخ ملا عبدالقادر بدایونی نے شیر گڑھ جا کر آپ کی زیارت کی۔ وہاں تین چار دن رہا اور شیخ کی روحانیت اور تقدس سے بڑا متاثر ہوا۔ وہ لکھتا ہے کہ شیخ کے جمال میں کوئی ایسی چیز نظر آتی تھی، جس سے دنیا کے سب صاحب جمال محروم ہیں اور تبسم اور تکلم کے وقت ان کے چہرے پر ایک ایسا نور چمک اٹھتا جس سے دلوں کی تاریکیاں دور ہو جاتیں اور "وجہ اللہ" کا بھید عیاں ہو جاتا تھا۔ ملاقات کے دوران میں شیخ نے بدایونی پر بڑی مہربانی کی۔ کئی نصائح بیش قیمت کیں اس کے مطلوبہ سوالات کا جواب دیا اور اپنی کلاہ بھی عنایت کی۔

بدایونی کی حضرت سے جو گفت و شنید ہوئی اس سے خیال ہوتا ہے کہ اس وقت حضرت امام مہدی کے ظہور کا عام طور پر انتظار ہو رہا تھا۔ بدایونی لکھتا ہے:-

"روزے در وقت وداع بوسیلہ میاں عبدالوہاب... عرض کردم کہ خبر در مشائخ ہند چنیں است کہ وقت خروج سید نزدیک است و اکثرے ازآں جماعت اتفاق بر یکے از سادات آں دیار کہ قبل ازیں بہ چندگاہ آباوٴ اجداد او بر سر سلطنت دہلی و بدایوں متمکن بودند نمودہ در تہیہ اسباب جہاد و استعداد و اسلحہ اند و میگویند کہ ما موریم بدیں امر از جناب حضرت غوث اعظم رضی اللہ عنہ و بعضے از امرائے سرحدی را نیز بخود متفق ساختہ

"وبعضی در مقامات و واقعات بشارتہا یافتہ مے خواہند۔ آں داعیہ را از قوت بفعل آورند۔"

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اولیاء و مشائخ کے تذکروں میں خارقِ عادت واقعات کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ مشنریوں کی طرح اشاعتِ مذہب کی منظم اور باقاعدہ کوششیں کہیں نظر نہیں آتیں۔ پھر کیسے ہو سکتا ہے کہ فقط خارق عادت واقعات سے جن کی صحت مشتبہ ہے یہ بزرگ اشاعتِ اسلام میں کامیاب ہوئے ہوں، لیکن نکتہ چین مشرقی مذاہب کی تاریخ کو نظر انداز کرتے ہیں۔ ہندو یوگیوں اور رشیوں کے تذکروں میں بھی خارقِ عادت واقعات کے سوا کچھ نہیں اور ایشیا میں مذہب پھیلانے کے لیے دوسرے مذاہب کی مذمت کے بجائے طریقِ کار یہی رہا ہے کہ داعیانِ مذہب اپنے رُوحانی کمالات اور اپنی خوبیوں کو نمایاں کریں اور عوام الناس عموماً خارق عادات واقعات یا مقدس رُوحانی زندگیوں سے ہی زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ شیخ داؤد کے عام صُوفیانہ تذکروں اور ملفوظات میں اشاعتِ اسلام کا کوئی ذکر نہیں، لیکن بدایونی جو تین چار دن ان کی خدمت میں رہا لکھتا ہے کہ شاید ہی کوئی دن ہوگا، جب سو سو پچاس پچاس ہندو مع اپنے اہل و عیال کے حاضرِ خدمت ہو کر مسلمان نہ ہوتے ہوں!

"وکم روزے بود کہ صد صد و پنجاہ پنجاہ ہندو کم و بیش با خیل و تبارِ خویش آمدہ در ملازمت آنحضرت بشرفِ اسلام نمے پیوستند و تلقین نمے گرفتند (منتخب التواریخ جلد سوم ۴۴)

ایک دفعہ اکبر بادشاہ نے جب وہ پنجاب میں تھا، شہباز خاں کو بھیج کر چاہا کہ شیخ اس کے پاس آئیں، لیکن انھوں نے عُذر کیا اور کہلا بھیجا کہ میں یہاں بیٹھا غائبانہ دعا دیتا ہوں۔ مجھ سے یہی کچھ ہو سکتا ہے۔

آپ کی وفات ۱۵۷۵ء میں ہوئی۔ آپ کے جانشین شیخ ابوالمعالی قادریؒ جن کا مزار لاہور میں ہے، صاحب التصانیف اور بڑے اہلِ دل بزرگ گزرے ہیں۔ آپ نے قادریہ سلسلے کا فیض لاہور اور وسطی پنجاب میں عام کیا اور ۱۶۱۵ء میں وفات پائی۔ شیخ عبدالحق محدثؒ آپ کے عقیدتمندوں میں سے تھے۔ ہم ان دو بزرگوں کے تعلقات کی تفصیل آیندہ صفحات میں دیں گے۔

چشتیہ سلسلہ

شیخ عبدالعزیز چشتی دہلویؒ

حضرت چراغ دہلیؒ کے بعد نظامی سلسلہ دہلی سے منتشر ہو گیا اور جونپور، کالپی، گلبرگہ، پٹن اور پنڈوہ ان بزرگوں کے قدوم سے فیض یاب ہوئے، لیکن اکبر کی تخت نشینی سے کچھ عرصہ پہلے دہلی میں اس خانوادہ کے ایک ایسے بزرگ نے ظہور کیا جنھوں نے پھر سے اولیائے کبار کی نیک نفسی اور پاک سیرتی کی یاد تازہ کر دی۔ یہ بزرگ شیخ عبدالعزیز دہلویؒ ہیں جنھیں عوام میں شہرت حاصل نہیں ہوئی، لیکن جن کا ذکر خواص کی رُوح کو تازگی بخشتا ہے۔ ان کے والد شیخ حسن طاہرؒ جونپور کے مشائخ کبار میں سے تھے۔ سکندر لودھی کی استدعا پر دہلی تشریف لائے۔

شیخ عبدالعزیزؒ اپنے والد کے خلیفہ، میاں قاضی ظفر آبادی کے مرید تھے۔ علوم ظاہری کی تکمیل سید راجو قتال کے خلیفہ حاجی عبدالوہاب بخاریؒ اور ان کے صاحبزادہ میر سید محمد سے کی اور ارشاد و ہدایت میں عمر صرف کر دی۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اخبار الاخیار میں لکھتے ہیں کہ شیخ اپنے زمانے میں مشائخِ چشت کی یادگار تھے اور اخلاقِ حسنہ مثلاً تواضع، حلم، صبر و رضا۔ خلقِ خدا پر شفقت اور عنایت فقرا میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔ شاہ ولی اللہ بھی لکھتے ہیں کہ شیخ عبدالعزیز محتاجوں کی حاجت روائی میں بڑی کوشش کرتے تھے۔ جب وہ شیخ قاضی خاں کے پاس پہنچے تو اپنا مال و متاع، گھوڑا، گاڑی جو کچھ اپنے پاس تھا، سارے کا سارا راہِ خدا میں تقسیم کر دیا۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ مثلاً شیخ امان پانی پتی کے رسالہ غیریہ کے جواب میں آپ نے رسالہ عینیہ تحریر کیا اور آداب السلوک بھی علمِ سلوک کے متعلق تصنیف کی۔ آپ کے والد شیخ حسن طاہر بھی مصنف تھے اور تذکروں میں ان کی کتاب مفتاح الفیض کا ذکر آتا ہے۔

اکبر کے ابتدائی زمانے میں شیخ عبدالعزیز چشتی کو بڑا قبولِ عام حاصل ہوا بیرم خاں

ان کا معتقد تھا اور دُوسرے امرائے اکبری بھی ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اخذِ فیض کرتے۔ وفات ۹۴۵ھ میں ہوئی۔ عوام میں آپ بحر المواج اور شکر بار کے عرف سے مشہور تھے۔

آپ کے فرزندِ ارجمند شیخ قطب عالم تھے۔ جن کی نسبت اخبار الاخیار میں لکھا ہے "عالم و فاضل و صاحب اخلاق حمیدہ و صفات پسندیدہ۔ قدم صفا و استقامت بر سجادۂ پدر نہادہ اوقات بطاعت و عبادت معمور دارد"۔ ان خوبیوں کے علاوہ شیخ قطب عالم دو اور اسباب کی بنا پر یاد کے مستحق ہیں۔ ایک تو ان کی پوتی حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کی دادی تھیں اور انھیں ایک ایسے خاندان سے تعلق تھا، جس کے احسان سے اسلامی ہندوستان کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ دوسرے حضرت خواجہ باقی باللہؒ نے ایک زمانے میں ان کی خانقاہ میں رہ کر ان سے فیض حاصل کیا تھا۔ تفصیل اس کی ہم انشاء اللہ حضرت خواجہ کے احوال میں پیش کریں گے۔

شیخ سلیم چشتیؒ

ایک اور چشتی بزرگ جنھوں نے اس زمانے میں بڑی شہرت حاصل کی۔ شیخ سلیم چشتیؒ تھے۔ جن کے نام پر اکبر کے بیٹے جہانگیر کا نام سلیم ہوا اور جن کی کشش سے اکبر نے ایک عرصہ تک فتح پور سیکری کو اپنا دار الخلافہ بنائے رکھا۔ آپ دہلی میں پیدا ہوئے، لیکن آپ کی ولادت کے بعد آپ کے والدین فتح پور سکونت پذیر ہو گئے۔ علوم ظاہری کی تکمیل آپ نے سرہند میں شیخ مجد الدین ملک العلماء سرہندیؒ سے کی۔ کئی حج کیے اور بلادِ اسلامی کی سیر و سیاحت کی۔ اس سیر و سیاحت کے دوران میں شیخ ابراہیم چشتی سے خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ عرب میں کئی لوگ آپ کے مُرید ہوئے۔ وہاں آپ کو شیخ الہند اور ہندوستان میں شیخ الاسلام کہتے تھے۔ ہندوستان واپس آکر فتح پور سیکری کی پہاڑی پر آپ نے بڑی ریاضتیں کیں۔ بالعموم روزہ سے رہتے اور ٹھنڈی اور مضعف چیزوں سے روزہ افطار کرتے۔ ہر روز ٹھنڈے پانی سے غسل کرتے اور کڑکتے جاڑوں میں ایک پیراہن کے سوا کچھ نہ پہنتے۔ آخر میں آپ نے شادی کی اور بادشاہ اور امراء کے اعتقاد کی وجہ سے آپ کی ظاہری حالت بہت بڑھ گئی۔ عمارتیں اور باغات اور چاہ تعمیر کروائے

بلکہ شیخ عبدالحق تو لکھتے ہیں کہ آپ کی مجلس امرار و اغنیا کی محفلوں کے مشابہ تھی۔ "بعضی عادات مخالف شریعت کہ متعارف عوام باشد نیز رو داد" ہمیوں کے ہاتھ سے آپ کو بہت پریشانیاں اٹھانی پڑیں اور اسی وجہ سے حرمین سے واپسی کے بعد آپ ۱۵۵۰ء میں پھر عرب واپس چلے گئے تھے، لیکن ۱۵۶۳ء میں واپس آئے اور اکبر نے سب کی تلافی کر دی۔ آپ کا روضہ بالخصوص اس کا بلند دروازہ ہندوستان کی بہترین عمارتوں میں سے ہے۔ آپ کی وفات ۱۵۷۲ء میں ہوئی۔

صابریہ سلسلہ

شیخ سلیم نے چشتیہ سلسلے میں بیعت شیخ ابراہیم چشتی سے کی تھی، جو بیرون ہند کے بزرگ تھے اور شیخ حسن طاہر کا سلسلہ بیعت راجی حامد شاہ اور شیخ حسام الدین مانکپوری کی وساطت سے بنگالہ کے مشہور نظامی بزرگ شیخ نور قطب عالم پنڈوی سے ملتا ہے لیکن اس زمانے میں شمالی ہندوستان میں چشتیہ خانوادہ کی ایک اور شاخ صابریہ نے فروغ حاصل کیا۔ ہم مخدوم احمد علاء الدین صابرؒ کا حضرت بابا فریدؒ کے خلفا کے ضمن میں ذکر کر چکے ہیں۔ ان کے اپنے حالات مستند معاصرانہ تذکروں میں نہ ہونے کے برابر ہیں لیکن مرآۃ الاسرار میں جو ۱۶۳۰ء کی تالیف ہے تفصیلی حالات و روایات درج ہیں۔ ان کے پر جوش معتقد اور مرید بے شمار ہیں۔ صابریہ سلسلے میں ذوق و شوق اور گرمجوشی کی فراوانی ہے۔ نظامی سلسلے کی شہرت نہیں۔ جب نظامیہ سلسلہ حکومت دہلی کے ضعف کے دوران میں اطراف ملک میں منتشر ہو گیا اور اس سلسلے کے بزرگوں نے شمالی ہندوستان کو چھوڑ کر گلبرگہ۔ جونپور۔ پنڈوہ۔ پٹن۔ کالپی وغیرہ میں ارشاد و ہدایت کے فرائض سنبھالے تو شمالی ہند میں صابریہ سلسلے کو فروغ ہوا۔ اور فیروز تغلق سے ہمایوں کے عہد حکومت تک جو پر شور زمانہ گزرا ہے۔ اس میں کئی صابری مشائخ کبار کی آتش نفسی نے مجالس ذکر و ارشاد کو حرارت دینی و روحانی عطا کی۔

مخدوم علاءالدین علی احمد صابر کلیریؒ کے ایک ہی خلیفہ شمس الدین ترک (وفات ۱۳۱۸ء) کا نام ملتا ہے۔ ان کے خلیفۂ اعظم شیخ جلال الدین کبیرالاولیا پانی پتی تھے۔ جن سے اس سلسلے کو صحیح طور پر وسعت اور رواج نصیب ہوا۔ اُن کی وفات ۱۳۶۴ء میں ہوئی۔ آپ کے خلفاء میں سرفہرست شیخ احمد عبدالحق توشہ رودلویؒ تھے۔ جنھوں نے رودولی (ضلع بارہ بنکی) میں ایک صابریہ خانقاہ قائم کی۔ وہ حضرت نور قطب عالم پنڈوی کے ہمعصر تھے۔ سیر و سیاحت کے دوران میں آپ نے بمقام پنڈوہ حضرت قطب عالم سے ملاقات کی، لیکن صحبت سازگار نہ آئی۔ روایت ہے کہ جب آپ حضرت کی خدمت میں تشریف لے گئے تو آپ کے پاس کوئی چیز نہ تھی۔ چنانچہ آپ نے ایک برگِ گیاہ حضرت کی خدمت میں پیش کیا اور کہا "یا باصفا است" حضرت نے جواب میں فرمایا "یا باعزت است" اس کے بعد تھوڑی دیر بیٹھ کر سلسلۂ سخن کو دوبارہ جنبش دیے بغیر آپ واپس تشریف لے گئے۔ آپ کے حالات و ارشادات شیخ عبدالقدوس گنگوہی نے انوار العیون کے نام سے مرتب کیے ہیں۔

شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ

شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ خود بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ انھوں نے کئی سلسلوں سے فیض حاصل کیا۔ لودھیوں کے عہد میں انھیں مرکزی حیثیت حاصل رہی اور صدہا لوگ آپ سے فیضیاب ہوئے۔ آپ کے خلفا میں سے حضرت مجدد الف ثانیؒ کے والد شیخ عبدالاحدؒ، شیخ جلال الدین تھانیسری اور شیخ عبدالغفور اعظم پوری خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں۔ "تزکِ جہانگیری" کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ جہانگیر نے خسرو کی حمایت کی بنا پر گورو ارجن دیو اور ایک مسلمان پیر سے مواخذہ کیا تھا۔ یہ مسلمان پیر شیخ نظام الدین بن عبدالشکور بلخی، شیخ جلال الدین تھانیسریؒ کے خلیفہ تھے۔ انھیں ہندوستان سے جلاوطن کیا گیا۔
شیخ جلال الدین تھانیسری خود بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ انھوں نے ۹۸۹ھ یعنی ۱۵۸۱ء میں وفات پائی۔ آپ علوم ظاہری اور باطنی میں کامل اور عہدِ اکبری کے علمائے کبار میں سے سمجھے جاتے تھے۔ اقبال نامہ جہانگیری کا بیان ہے کہ جب اکبر بادشاہ نے

اپنے بھائی محمد حکیم میرزا کے خلاف لشکر کشی کی تو راستے میں تھانیسر کے مقام پر شیخ جلال الدین کی زیارت کی۔ ملاقات کے دوران میں شیخ نے مسئلہ توحید کی وضاحت میں یہ رباعی پڑھی۔

آفتابے در ہزاراں آبگینہ تافتہ — پس بہ رنگ ہر یکے تاب عیاں انداختہ
جملہ یک نوراست اما رنگہائے مختلف — اختلافے در میانِ این و آں انداختہ

آپ کی ایک دلچسپ تالیف تحقیق اراضی الہند ہے۔ جس میں آپ نے اس خیال کی تردید کی ہے کہ اگر بادشاہ وقت کسی مسلمان کو ہندوستان میں کوئی زمین دیدے تو وہ شرعاً اس کا حق نہیں ہوتی۔ آپ نے ثابت کیا ہے کہ وہ زمین بیت المال کی ہے اور امام وقت جسے چاہے دے سکتا ہے۔

شیخ عبد النبی جو عہد اکبری میں صدر الصدور تھے اور جن کا نام اس زمانے کی مذہبی تاریخ میں کثرت سے آتا ہے۔ شیخ عبد القدوس گنگوہی کے پوتے تھے۔

ردولی ناگور اور اجمیر

شیخ عبد القدوس گنگوہی کے حالات اُن کے فرزند و سجادہ نشین شیخ رکن الدین نے لطائف قدوسی کے نام سے ترتیب دیے ہیں۔ یہ کتاب بیشتر حالات زندگی، ارشادات اور کرامات کا بیان ہے۔ لیکن کئی باتیں ایسی ہیں، جن سے اس زمانے کی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے۔ شروع شروع میں شیخ موصوف قصبہ ردولی میں رہتے تھے، لیکن جب سلطنت کی بدنظمی کے باعث یہاں پھر ہنود کا غلبہ ہو گیا تو شیخ نے ردولی سے ہجرت کی۔ "در طرفِ ہندوستان غلبۂ کافراں بود۔ در پرگنہ ردولی عمل کافراں شد۔ شعارِ اسلام مندرس شدند۔ در بازار گوشتِ خوک فروختہ مے شد۔ حضرت قطبی دلگیر شدہ بیروں آمدند۔" ردولی سے آپ ۱۴۹۰ء میں شاہ آباد اور وہاں سے طویل قیام کے بعد گنگوہ (ضلع سہارنپور) تشریف لے گئے اور وہیں آپ کا وصال ہوا۔

ضعفِ حکومت سے جو حالت اس وقت ردولی کی ہو گئی تھی وہی کیفیت کئی اور اسلامی شہروں کی تھی۔ مثلاً ناگور۔ سندھ اور گجرات کے درمیان راجپوتانے کی ایک قدیمی اسلامی بستی ہے، جو قاضی حمید الدین صوفی ناگوری (متوفی ۱۲۷۴ء) کے

وقت سے اہلِ علم کے لیے ممتاز رہی ہے۔ شیخ عبد الحق یہاں کے ایک بزرگ شیخ کبیر کی نسبت لکھتے ہیں: "بجہت تفرقہ کہ در ناگورؔ از دستِ کفارِ آن دیار واقع شدہ بجانب گجرات رفتہ، ہماں جا ساکن شدہ"۔ عجب نہیں کہ ابو الفضل اور فیضی کا باپ شیخ مبارک بھی اسی کشمکش میں ناگور سے گجرات گیا ہو۔

چندیری وغیرہ میں جو کچھ رائے سین کے ہاتھوں ہوا اس کا ذکر ہم بابر کے ضمن میں کر چکے ہیں۔ اجمیر کی حالت بھی چنداں بہتر نہ تھی۔ اخبار الاخیار میں درج ہے

"نقل است کہ چوں در اجمیر خلل شد و قلعہ را راناسانگا کہ گبرے عظیم بود از دستِ مسلماناں گرفت اکثر مسلماناں را شہید ساخت۔ شیخ احمد مجد پیش از یں حادثہ ہفت روز بحکم اشارت خواجہ بزرگ خواجہ معین الحق والدین از شہر برآمد و مسلماناں خبر کرد کہ یک چندے بریں شہر نظرِ جلال است۔ فرمانِ بندگی خواجہ بریں است کہ مسلماناں از شہر برآیند۔ دو شنبہ سنہ اثنیٰ و عشرین و تسعمائۃ با جماعہ از مسلماناں از اجمیر برآمد۔ دو شنبہ دیگر کافراں بر سر اجمیر آمدند و آں دیار را زیر و زبر ساختند"۔

یہ شیخ احمد شیبانی وہی بزرگ ہیں، جن کے مرشد خواجہ حسین ناگوری نے حضرت خواجہ بزرگ کی قبر پر پہلی شاندار عمارت تعمیر کرائی۔ مانڈو کا فرماں روا سلطان غیاث الدین ان کا

ؔ رائے بہادر گوری شنکر نے اپنی انگریزی کتاب ہسٹری آف اودے پور میں چتوڑ کے مشہور ستون کیرتی ستنبھا (Kirti Stambha) کے کتبے کا کچھ حصہ نقل کیا ہے جو ناگور کے متعلق ہے:۔

"راناکنبھو نے سلطان گجرات سے ناگور ایک ترکیب سے فتح کر لیا۔ اس نے فیروز خاں کی بلند مسجد کو جلا دیا اور قلعے کو ویران کر دیا۔ اس نے ہاتھیوں پر قبضہ کر لیا۔ اس نے مسلمان عورتوں کو قید کیا اور بہت سے مسلمانوں کو سزا دی۔۔۔۔ اس نے شہر کے ساتھ اس کی تمام مسجدوں کو آگ لگا دی اور شمس خاں کے خزانوں پر قبضہ کر لیا جس سے اس کے پاس بہت سا مال و زر جمع ہو گیا"۔

اگر چتوڑ کے اس ستون کے سارے کتبے تاریخی کتب میں جگہ پا جائیں تو اس سے راجپوتانہ کی تاریخ کے کئی تاریک گوشوں پر روشنی پڑے!!

ؔ یعنی ۱۵۱۶ء میں۔

عقیدت مند تھا اور چاہتا تھا کہ وہ کوئی نذر نیاز قبول کریں۔ وہ انکار کرتے رہے لیکن پھر بادشاہ کی درخواست قبول کی اور جو کچھ ملا۔ اُسے خواجہ بزرگ (اور شیخ حمید الدین ناگوری) کے مقبروں کی تعمیر میں صرف کیا۔ شیخ عبدالحق لکھتے ہیں: "دور ملا نسکہ اجمیر خراب بود و الّا اوبیشہ وحشیاں گشتہ۔ دراں زماں بر بالائے قبر شریف عمارت نہ بود۔ اوّل کسیکہ دراں بلدہ منبنیاد عمارت نہاد او بود"

مُغلوں کی مخالفت

لطائف قدوسی کے کئی اندراجات سے خیال ہوتا ہے کہ شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور ان کے اکثر مرید مغلوں سے خوش نہ تھے۔ جب ۱۵۲۶ء میں بابر اور ابراہیم لودھی کا میدانِ پانی پت میں معرکہ ہوا تو شیخ ابراہیم لودھی کے لشکر میں موجود تھے۔ وہ خود کہتے تھے کہ ابراہیم کی فتح بڑی مشتبہ ہے لیکن بادشاہ نے اصرار کیا کہ وہ شاہی لشکر کے ساتھ رہیں۔ چنانچہ جب بابر کو فتح ہوئی تو یہ بھی گرفتار ہوئے۔ ان کے ساتھ ان کے ایک دو مرید تھے۔ اُن کے گلے میں مرشد کی سیاہ پگڑی ڈال کر باندھ لیا گیا اور شیخ کو حکم ہُوا کہ پا پیادہ چلیں۔ چنانچہ وہ پیادہ پانی پت سے دہلی تشریف لائے۔ لیکن بعد میں رہائی مل گئی۔

شیخ عبدالقدوس گنگوہی کو لودھی افغانوں سے خاص تعلق خاطر تھا۔ انھوں نے دیکھا تھا کہ لودھیوں بالخصوص سکندر لودھی نے پھر سے شعائر اسلام کو بلند کیا۔ اس لیے وہ ان کی بڑی قدر کرتے تھے۔ سکندر لودھی کے نام ان کا ایک خط ہے، جس میں اسے غمخواری خلق، بالخصوص علما اور آئمہ کی تیمار داری پر توجہ دلائی ہے۔ جب تختِ دہلی پر مغل قابض ہوئے تو آپ نے بابر کو ایک خط میں تاکید کی کہ شرع محمدی کی ترویج کے لیے ضروری اقدامات عمل میں لائے۔

"باید دہمزد کہ برائے شکر نعمت منعم سایۂ عدل بر عالمیاں چناں کشدہ کہ ہیچ کس ظلم نہ کنند و ہمہ خلق و ہمہ سپاہ بہ اوامر و نواہی شرع مستقیم و مستدیم بودند۔ نماز بجماعت بگذارند و علم و علماء را دوست دانند۔ و در بازار ہر شہرے محتسباں بگمارند۔ تا شہر و بازار با جمال شرع محمدی بیارایند و روشن و منور گردانند۔۔ چنانچہ در عہد سلف و خلفائے راشدین با جمیع قرون اولیٰ بود۔

اسی طرح کے خط انھوں نے اپنے زمانے کے بعض امرا، مثلاً خواص خاں، ہیبت خاں شروانی، ابراہیم خاں شروانی وتردی بیگ وغیرہ کو لکھے اور انھیں اتباعِ شریعت کی تلقین کی۔ ان خطوط کو مجددِ الفِ ثانی کے زیادہ مشہور اور زیادہ اہم مکتوبات کا پیش رَو سمجھنا چاہیے۔

شیخ عبدالقدوس گنگوہی کی وفات ۱۵۳۷ء میں ہوئی، لیکن مغلوں اور افغانوں کی کشمکش اس کے بعد بھی جاری رہی اور اس میں شیخ کے بعد مریدوں نے حصہ لیا۔ لطائفِ قدوسی میں کئی ایسے واقعات درج ہیں، جن سے اس زمانے کے خیالات اور رجحانات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً لطائف کے مرتب نے ایک واقعہ لکھا ہے:-

"در مقام نندربار رسیدیم۔ در شب در خواب حضرت قطب اللہ قطابشیخ عبدالقدوس حاضر شدند فرمودند۔ اے رکنو بپیش بیا و پیغام گزاری ما با پیرانِ گجرات بکن۔ اے رکنو در گجرات بروو کل پیرانِ گجرات را اسلام ما برساں و بگو کہ ہمایوں بادشاہ اسلام را تاراج میکند و میانِ کفر واسلام فرق نمے کند۔ ہمہ را تاراج میکند۔ ما بمددِ اسلام و بمددِ شما آمدہ ایم اگر رضائے شما باشد۔ بیائیم و ما و شما یکجا شدہ ہمایوں بادشاہ را از گجرات دُور کنیم... تا اسلام را استے و قرارے باشد۔"

ہمایوں کی یہ مخالفت، مغلوں کے خلاف افغانوں سے ہمدردی کے علاوہ اس وجہ سے بھی تھی کہ اس نے گجرات کے اس بادشاہ (بہادر شاہ) کے خلاف چڑھائی کی تھی، جس نے چتوڑ فتح کر کے اسلام کو راجپوتانہ میں سربلند کیا تھا۔ چنانچہ جب شیر شاہ نے ہمایوں کو شکست دے کر ہندوستان سے نکال دیا تو بعض مذہبی حلقوں میں خوشی کا اظہار کیا گیا اور شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے مُرید اُن میں شامل تھے۔ لیکن یہ خوشی دیرپا ثابت نہ ہوئی۔ چند ہی سال بعد ہمایوں نے شاہ ایران کی مدد سے ہندوستان کو دوبارہ فتح کر لیا اور اس کے بیٹے اکبر نے مغلیہ حکومت کی بنیادیں اس مُلک میں اس طرح مستحکم کیں کہ صدیوں تک انھیں جنبش نہ ہوئی۔

عہدِ اکبری

اِسلامی حکومت کا استحکام

خاندانِ مغلیہ کی بُنیاد بوقلموں اور شگفتہ مزاج بابر نے رکھی، لیکن بابر کو اصل محبت ترکستان اور افغانستان کے اُونچے اُونچے پہاڑوں سے تھی اور اُس نے ہندوستان کا رُخ بالکل اخیر عمر میں کیا ع

عید ہوئی ذوق، ڈھلے شام کو!

دہلی کی فتح کو ابھی چار سال نہ گزرے تھے کہ ۱۵۳۰ء میں بابر کو موت کا پیغام آپہنچا اور دس سال بعد اس کے بیٹے اور جانشین ہمایوں کو شیر شاہ نے ہندوستان سے مار بھگایا۔ ہمایوں نے پندرہ سال جلاوطنی میں گزارے۔ لیکن عمر کے بالکل آخری سال میں شاہ ایران کی مدد سے اسے موقع ملا کر شیر شاہ کے پوتے سکندر سور کو شکست دے کر دہلی اور آگرہ پر پھر سے مغل پرچم لہرائے۔

ہمایوں کو ہندوستان میں دوبارہ آئے ہوئے چند مہینے گزرے تھے اور خاندان سور اور مغلوں میں کشمکش ابھی جاری تھی کہ بادشاہ ایک اتفاقی حادثے کا شکار ہوگیا اور دہلی اور آگرہ پھر خاندان سور کے ہاتھ میں چلے گئے۔ مغلیہ حکومت کا استحکام بلکہ اس کے اصل آغاز کا بارِ گراں اس کے سیزدہ سالہ بیٹے اکبر کے کندھوں پر آن پڑا۔

اکبر ۱۵۵۶ء میں تخت نشین ہوا اور اس کی تخت نشینی سے اسلامی ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ایک بالکل نئے دَور کا آغاز ہوتا ہے۔ اکبر سے پہلے ایک اسلامی حکمران خاندان کا زمانہ حکومت سو سال سے زیادہ نہ تھا اور باقاعدہ اور مستحکم حکومت تو کسی خاندان کو نصف صدی سے زیادہ نصیب نہ ہوئی۔ اکبر سے پہلے اسلامی ہندوستان میں سب سے زیادہ جاہ و جلال سلطان علاء الدین خلجی کے حصے میں آیا تھا۔ لیکن خلجیوں کی حکومت

کتنے دن رہی، فقط تیس پینتیس سال۔ خاندان غلاماں کے تحت کئی ایسے مختلف غلام خاندان جمع کر دیے جاتے ہیں، جن کا آپس میں برائے نام تعلق تھا، لیکن اگر مختلف خاندانوں کو علیحدہ کریں تو کسی کی حکومت پچاس سال سے زیادہ نہیں اور سب کی ملا کر سو سال نہ ہوگی۔ خاندان سادات اڑتیس سال برسرِ اقتدار یا برسر زوال رہا۔ لودھیوں کی حکومت پچھتر سال سے زیادہ نہیں۔ یہی حال تغلق خاندان کا تھا۔ نتیجہ اس کا یہ تھا کہ دس پندرہ سال تو ایک خاندان کو پاؤں جمانے میں لگتے اور ابھی انھیں حالات کو سمجھنے اور کوئی اصول جاری کرنے ہی کا موقع نہ ملتا تھا کہ سارا سلسلہ درہم برہم ہو جاتا اور پھر روزِ اول۔ یہی وجہ تھی کہ ابتدائی مسلمان خاندانوں کی حکومت نہایت سطحی تھی اور مرکزی نظم و نسق کے علاوہ باقی اختیار ہندو پنچایتوں اور زمینداروں کے ہاتھ میں تھا۔

اکبر کے زمانے میں اسلام کی کمزوری کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ اس سے پہلی دو صدیوں میں دہلی کی حکومت بجائے ترقی کے تنزل کر رہی تھی اور ہندو مذہب کا سیاسی اور روحانی احیا ہو رہا تھا۔ روحانی احیا نے بھگتی تحریک کی صورت اختیار کی۔ جس کے بعض راہنما مثلاً گورو نانک صلح کے حامی تھے۔ بعض (مثلاً تلسی داس) دوسرے مذاہب سے بے تعلق تھے۔ بعض (مثلاً چیتنیہ کے جانشین) مسلمانوں کے مخالف تھے۔ سیاسی احیا کا سب سے اہم واقعہ جنوبی ہند میں وجے نگر کی خود مختار اور وسیع ہندو سلطنت کا قیام ہے۔ جس نے جنوب میں اسلام کی توسیع ختم کر دی اور جس کی خشتِ اول ۱۳۳۶ء میں رکھی گئی۔ شمالی ہند میں ہندو راجاؤں اور مذہبی (مثلاً رانا کنبھ۔ رانا سانگا۔ جسرت کھوکھر۔ میدنی رائے۔ ہیموں) نے بڑا اقتدار حاصل کر لیا تھا۔ جب بابر آیا تو شمالی ہندوستان کا سب سے با اقتدار حاکم ابراہیم لودھی نہ تھا۔ رانا سانگا تھا جس سے مالوہ۔ گجرات خاندانِ لیش کے مسلمان بادشاہ جو دبدبے اور اقتدار میں شاہِ دہلی سے بڑھ کر تھے، ہزیمتیں کھاتے تھے اور شکستیں کھا چکے تھے۔ اس نے خود بادشاہ دہلی کے کچھ علاقے پر قبضہ کر لیا۔ ابراہیم لودھی نے فوجیں بھیجیں، لیکن وہ شکست کھا کر واپس آئیں اور بادشاہ کو لہو کے گھونٹ پی کر خاموش ہونا پڑا۔ پنجاب میں جسرت کھوکھر نے بڑا اقتدار پایا تھا۔ مالوہ میں میدنی رائے

بظاہر وزیر لیکن فی الواقع حکمران تھا۔ پانی پت کی دوسری لڑائی میں اکبر کا مدمقابل عادل شاہ سوری کا وزیر اور سپہ سالار ریواڑی کا ایک ہندو بنیا ہیموں تھا۔ اس طرح کے دوسرے با اثر ہندوؤں کے نام اس زمانے کی تاریخ میں کثرت سے ملیں گے۔ ضعفِ سلطنت کی وجہ سے سنبھل۔ ناگور۔ اجمیر۔ چندیری اور دوسری جگہوں میں مسلمانوں کی مسجدوں اور دیگر مقدس مقامات کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا، اس کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ بابر اور شیر شاہ نے ان حالات کی اصلاح کی اور دہلی کے مسلمان بادشاہ کا اقتدار وسیع کیا۔ لیکن وہ ہوا کے جھونکے تھے جو آئے اور نکل گئے۔ اسلامی حکومت کا اصل استحکام اکبر کو کرنا پڑا۔

فتوحاتِ اکبری

استحکام حکومت کے ضمن میں سب سے پہلے اکبر نے یہ کیا کہ ملک میں جو صوبے خود مختار ہو گئے تھے اور مدت مدید سے آزاد تھے، انھیں پھر حکومتِ دہلی کے تابع کیا۔ اکبر ۱۵۵۶ء میں تخت نشین اور ۱۵۶۰ء میں بیرم خاں کی معزولی کے بعد حاکم خود مختار ہوا۔ ۱۵۶۱ء میں مالوہ فتح ہوا۔ ۱۵۶۴ء میں گونڈوانہ مغلیہ سلطنت میں شامل ہوا۔ اس سے دو سال پہلے اکبر نے امبر (جے پور) کے راجا بہاری مل سے مصالحت کر لی تھی۔ راجا نے اکبر کی اطاعت قبول کی اور اپنے خاندان کی ایک کنواری بادشاہ سے بیاہ دی۔ راجا بہاری مل کے بیٹے راجا بھگوان داس اور پوتے مان سنگھ کو اعلےٰ منصب ملے۔ میواڑ کے راجا نے اس کی مخالفت کی۔ چنانچہ ۱۵۶۸ء میں چتوڑ اکبر کے ہاتھوں فتح ہوا۔ اگلے سال کالنجر اور رنتھنبور کے مشہور قلعے مغلوں کے قبضے میں آئے۔ ۱۵۷۰ء میں جیسلمیر اور بیکانیر کے راجاؤں نے اطاعت قبول کی۔ ۱۵۷۲ء میں گجرات فتح ہوا اور ۱۵۷۵ء میں ٹکرائی کی جنگ کے بعد بنگال پر مغلوں کا قبضہ ہو گیا۔ اگرچہ جولائی ۱۵۷۶ء تک داؤد خاں حاکم بنگالہ لڑتا رہا۔ اور اس کے بعد بھی بنگالہ میں امن و امان دیر تک قائم نہ ہوا۔

یہ فتوحاتِ اکبری کا پہلا دور تھا۔ دوسرا دور اس زمانے سے متعلق ہے جب ۱۵۸۵ء سے ۱۵۹۸ء تک اکبر لاہور میں مقیم رہا۔ اس دوران میں کشمیر جو کبھی بھی حکومتِ دہلی

کے تابع نہ تھا، فتح ہوا۔ (۱۵۸۶ء) ۔ ۱۵۹۱ء میں سندھ اور ۱۵۹۲ء میں اڑیسہ مقبوضات اکبری میں شامل ہوئے ۱۵۹۵ء میں بلوچستان فتح ہوا اور قندھار اکبر کے قبضے میں آیا۔ اب اکبر کو دکن کی طرف توجہ کرنے کی فرصت ملی۔ ۶ نومبر ۱۵۹۸ء کو اس نے لاہور کو خیرباد کہا اور چند مہینے آگرے میں قیام کے بعد اگلے سال دکن جا پہنچا۔ چنانچہ اسی سال احمد نگر کا قلعہ فتح ہوا اور ایک وسیع مملکت اکبر کے قبضے میں آئی۔ ۱۶۰۱ء میں خاندیش کا مضبوط قلعہ اسیر گڑھ سر ہوا اور احمد نگر اور خاندیش کے علاقے ایک وسیع مغل صوبے میں منتقل ہو گئے۔ اکبر مئی ۱۶۰۱ء میں آگرے واپس آیا اور چار سال بعد اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

مغلیہ نظام حکومت

اکبر کی مسلسل فتوحات اسے تاریخ میں ایک خاص درجہ دے دیتی ہیں، لیکن ملک گیری آسان، ملک رانی مشکل۔ اکبر کا اس سے بھی اہم کام اس وسیع سلطنت کا کامیاب نظم و نسق اور ملکی حکومت کے ایسے نظام مرتب کرنا تھا، جو معمولی تبدیلیوں کے ساتھ تمام مغلیہ دور میں برقرار رہا۔ اور کئی امور میں برطانوی نظامِ حکومت کی بنیاد بنا۔ جس پر بھارت اور پاکستان اب بھی عمل پیرا ہیں۔ مغلیہ نظامِ حکومت کا معمار اکبر تھا۔ عالمگیر نے اس کے نظامِ سلطنت میں بعض تبدیلیاں کیں، لیکن اس کا درباری مورخ بھی عالمگیر نامہ میں اکبر کی نسبت لکھتا ہے: "حضرت عرش آشیانی جلال الدین محمد اکبر بادشاہ طاب ثراہ کہ مجدد آئینِ جہانبانی و مشید قوانین آئینِ ایں سلطنتِ جاودانی اند (ص ۳۸۷)

اکبر کی مسلسل فتوحات اور اس کے کامیاب نظم و نسق کا راز، سب سے زیادہ، ان امرا و ارکینِ سلطنت کی قابلیت، فرض شناسی اور وفاداری میں پنہاں ہے جو اکبر نے اپنے گرد جمع کر لیے تھے۔ جیسا کہ عالمگیر نے اپنے بیٹے کو لکھا۔ "حضرت عرش آشیانی کہ نوکران خوب داشتند، ازہمیں جہت فتوحات متواترہ و مہمات متکاثرہ مے فرمودند۔" اکبر اس معاملے میں خوش قسمت تھا، لیکن "نوکرانِ خوب" کے حاصل کرنے، انھیں "خوب" سے "خوب تر" بنانے، ان کی "تربیت" اور ان کی

کی پُرامید نظریں وقت کی سب سے بڑی طاقت کو مفتوح اور اسلام کو فاتح کی حیثیت سے دیکھ رہی ہیں، نگاہ عزیمت کی یہ شان کہ کسریٰ کے کنگن ایک خانہ بدوش بدو کے ہاتھوں میں نظر آرہے ہیں۔

یہ ہے وہ رجائیت جس کی بنیاد پر تحریکیں وجود میں آتی ہیں؛ آگے بڑھتی ہیں اور اپنی منزل کو پالیتی ہیں۔

ایک بار کلید بردار کعبہ عثمان بن طلحہ سے حضورؐ نے کعبہ کا دروازہ کھولنے کے لیے کہا تو اس نے انکار کر دیا۔ غور کیجیے مکی دور میں حالات کتنے سخت اور ناسازگار تھے مگر آپ نے ان تاریک ترین حالات میں شمع امید کو ان الفاظ سے فروزاں کیا: "ایک دن آنے والا ہے جب یہ کنجی ہمارے ہاتھ میں ہوگی اور ہم جسے چاہیں گے اس کے حوالے کر دیں گے۔" (المواہب اللدنیہ)

آیئے غزوۂ خندق کے واقعہ پر بھی غور کرتے چلیں۔ اسلام دشمن طاقتوں نے متحدہ محاذ بنا کر اسلام اور مسلمانوں کو ختم کر دینے کا منصوبہ بنایا۔ تمام عرب قبائل اور یہودی طاقتوں نے مجتمع ہوکر مدینہ پر حملہ کی تیاری مکمل کر لی۔ ذرا غور کیجیے۔ مخالفین کا ٹڈی دل لشکر، خندق کی کھدائی کا مرحلہ، رفقاء کی قلت، بے سروسامانی کی انتہا، فاقہ کشی کا عالم، منافقین کے ہمت شکن عذرات، مدینہ میں یہودیوں کی سازشوں کے اندیشے، انسانی حوصلوں کو دبا دینے والی اس پیچیدہ صورتِ حال میں اللہ کا رسولؐ اپنے اصحاب کے ساتھ خندق کھودنے میں منہمک ہے مگر پھر بھی مایوسی و ناامیدی کا دور دور تک کوئی نشان نہیں۔ رسولِ خدا کی عزیمت و ہمت، نشاط و شگفتگی اور بلند ہمتی و بلند حوصلگی، صحابہ کرامؓ کے لیے مہمیز کا کام کر رہی ہے۔ خندق کی کھدائی کے دوران کچھ سخت چٹانیں صحابہ کرامؓ سے نہیں ٹوٹ پائیں۔ رسولِ خدا کدال سنبھال کر ضرب لگاتے ہیں۔ پہلی ضرب لگا کر فرمایا کہ مین میرے لیے فتح ہوگیا، دوسری ضرب لگا کر فرمایا شام اور المغرب میرے لیے سرنگوں ہوگئے۔ تیسری ضرب لگا کر فرمایا خطۂ مشرق (ایران) فتح ہوگیا۔ (محسنِ انسانیت)

غور کیجیے انتہائی ناسازگار حالات میں اللہ کے رسولؐ عظیم ملکوں اور شہروں کی فتح کی بشارت اپنے اصحابؓ کو سنا رہے ہیں۔ جن ناگفتہ بہ حالات میں بظاہر اپنا دفاع بھی مشکل نظر آرہا

ہے وہاں رسول خدا کی نظرِ دور رس، اور نگاہِ رجائیت ایران و شام کو فتح ہوتے ہوئے دیکھ رہی ہے۔ رجائیت کا یہی وہ پہلو تھا جو مکہ سے لے کر مدینہ تک اصحاب رسولؐ کو نیا حوصلہ اور نئی امنگ دیتا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رجائیت کا یہ نعرہ کہ اسلام کے سامنے عرب و عجم مفتوح ہوں گے تحریک اسلامی کا سلوگن ہے:

تعلیم و تربیت اور دعوت و تبلیغ کے سلسلہ میں امید و رجا کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑنا چاہیئے۔ حالات کتنے بھی ناسازگار ہوں، مایوسی و بددلی کا شکار نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ بلند حوصلگی اور عزم و یقین کی قوت کے ساتھ اپنے کام کو جاری رکھنا چاہیئے۔ جب تحریکیں رجاء و امید کا دامن تھامے بلند حوصلگی سے منزل کی طرف بڑھتی ہیں تو منزل خود ان سے قریب ہونے لگتی ہے اور جب کوئی تحریک مایوسی کا شکار ہو جاتی ہے تو اس کی منزل اس قدر دور ہو جاتی ہے کہ اسے پا لینا ناممکن ہو جاتا ہے۔

اکبر کے ادبی ذوق کا تھوڑا سا اندازہ بدایونی کے طرزِ تحریر کے متعلق اس کی رائے سے ہوتا ہے۔ بدایونی اکبر کا پیش امام تھا۔ اس نے اپنی منتخب التواریخ میں اکبر کی بدنامی کا جو سامان جمع کیا ہے۔ اس سے اہلِ علم واقف ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اکبر نے ایسے شخص کو اتنی مدت کیوں اپنے قریب رکھا؟ یہ صحیح ہے کہ بدایونی اپنی کتاب چھپ چھپا کر لکھتا تھا اور اس نے کسی فردِ بشر پر اس کا راز ظاہر نہ ہونے دیا۔ وہ شروع میں آزاد خیال گروہ کا ترجمان تھا۔ اس لیے اکبر کو کچھ عرصہ اس وجہ سے بھی غلط فہمی رہی ہوگی۔ یہ بھی درست ہے کہ بدایونی کا مزاج اپنا تھا۔ وہ اہلِ شرع سے زیادہ ادیب اور فنکار تھا۔ بین خوب بجاتا تھا' جو متشرع حلقوں میں شاید ہی پسند ہو۔ طبیعت میں ایک طرح کی وارفتگی اور بے نیازی تھی۔ لیکن بدایونی خود لکھتا ہے کہ کہ اکبر نے اس کی "فقاہت و تعصب" کا اندازہ لگالیا تھا۔ (مرا متہم بہ فقاہت و تعصب داشتند) بلکہ بادشاہ نے ابوالفضل سے کہا "کہ ما فلانے را کہ عبارت از فقیر باشد' جوانے صوفی مشربے خیال می کردم۔ اما او چناں فقیہِ متعصب ظاہر شد کہ ہیچ شمشیرے رگِ گردنِ تعصبِ او را نتواند برید۔" چنانچہ اس کے بعد طے ہوا کہ اسے اجمیر میں روضہ کا متولی بنا کر بھیج دیا جائے۔ بدایونی بہت خوش تھا۔ اس نے یاد دہانی بھی کرائی لیکن کچھ عرصے کے بعد بادشاہ نے ابوالفضل سے کہا۔ "اگرچہ از فلانے (بدایونی) خدمتِ اجمیر ہم خوب می آید۔ اما چوں چیزہا را باز ترجمہ میفرمائیم۔ بسیار خوب و خاطر خواہِ ما می نویسد نمے خواہیم کہ از ما جدا باشد۔"

یعنی اکبر بدایونی کو اس کے تعصب اور فقیہہ مشربی کے باوجود اس لیے اپنے سے جدا کرنے کے لیے تیار نہ تھا کہ وہ ترجمہ خوب اور خاطر خواہ کرتا تھا!!

اکبر نے صرف علوم و فنون کی سرپرستی نہیں کی بلکہ صنعت و حرفت کو ترقی دینے کی بھی پوری کوشش کی۔ ایران' کشمیر اور دوسرے ممالک کے کاریگروں کو لاہور' آگرہ' احمد آباد میں جمع کیا تاکہ وہ شال بافی' قالین سازی' ملبوسات کے کارخانے قائم کریں۔ عہدہ داروں کو مجبور کیا کہ وہ یہاں کی بنی ہوئی چیزیں پہنیں۔ نتیجہ یہ

تھا کہ بہت سی صنعتیں رائج ہو گئیں، جو اکبر کے بعد بھی جاری رہیں۔

طریقِ صُلحِ کُل

اکبر اپنے خاص دائرۂ عمل یعنی مُلک گیری اور ملک رانی میں بے نظیر تھا اور اسلامی حکومت کو جس طرح اُس نے مستحکم کیا، کسی اور ہندوستانی بادشاہ سے نہیں ہُوا، لیکن افسوس کہ اس نے اپنے صحیح دائرۂ عمل کو چھوڑ کر مذہبی معاملات میں بھی دخل دیا اور خوشامدی درباریوں کی واہ واہ میں بعض ایسی بوالفضولیاں کا مرتکب بھی ہُوا کہ آج اس کے سیاسی احسانات بھی فراموش ہو گئے ہیں۔ اکبر کی مذہبی بوالعجبیوں کو کوئی واقف کار پسند نہیں کرے گا، لیکن چونکہ جن منزلوں سے گزر کر اور جن وجوہات کی بنا پر اکبر نے مذہبی معاملات میں دخل اندازی کی ان کا مطالعہ بڑا عبرتناک اور سبق آموز ہے، اس لیے ہم انھیں کسی قدر تفصیل سے بیان کریں گے۔ لیکن اس سے پہلے ایک امر کی وضاحت ضروری ہے۔ اکبر کی مذہبی پالسی کے دو پہلو تھے ایک انتظامی اور سیاسی معاملات میں "صلحِ کل" کی پالسی۔ اور دوسرے مریدانِ شاہی اور دوسروں کے لیے قواعد و آئین کا وہ ملغوبہ جسے بسا اوقات "دینِ الٰہی" کہا جاتا ہے، لیکن جسے بدایونی اور ابوالفضل دونوں "آئینِ راہنموئی" یا "ارادت" یا "مریدی" کا نام دیتے ہیں۔ بسا اوقات ان چیزوں کو خلط ملط کر دیا جاتا ہے، لیکن فی الحقیقت ان کی حیثیت مختلف ہے اور ان کے آغاز میں کئی سال کا فرق تھا۔ "صلحِ کل" کی پالیسی جو فی الحقیقت ایک سیاسی اور انتظامی طریق کار ہے، اکبری حکومت کی بالکل ابتدا میں اختیار کر لی گئی۔ جہانگیر اپنے والد کی اس "صلحِ کل" پالسی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

> ارباب ملل مختلفہ را در وسعت آباد دولت بے بدلش جا، بخلاف سائر ولایاتِ عالم کہ شیعہ را بغیر از ایران و سُنی را دہ (بغیر از) روم و ہندوستان و توران جا نیست۔
>
> چنانچہ در دائرۂ وسیع الفضائے رحمتِ ایزدی جمیع طوائف و ارباب ملل را جاست بمقتضائے آنکہ سایہ می باید کہ پرتو ذات باشند۔ در ممالک محروسہ اش کہ بہر حدے بہ کنارِ دریائے شور منتہی گشتہ۔ ارباب ملتہائے مختلف و عقیدت ہائے صحیح و ناقص را جا بودہ راہِ تعرض بستہ گشتہ۔ سنی با شیعہ در یک مسجد و فرنگی با یہودی

نظر انداز فرما دیتے۔

آنحضورؐ جب فتح مکہ کی تیاری کر رہے تھے تو آپؐ کی کوشش تھی کہ اس تیاری کی کوئی خبر باہر نہ جانے پائے۔ اس دوران حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ سے ایک لغزش ہو گئی انھوں نے قریشِ مکہ کے نام ایک خط لکھ دیا جس میں فتح مکہ کی تیاری کی اطلاع دی گئی تھی۔ ظاہر ہے یہ لغزش خیانت کے مترادف تھی۔ اسی لیے جب یہ خط پکڑا گیا تو حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا:

"اے اللہ کے رسولؐ! مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس کی گردن اڑا دوں۔ یہ منافق ہو گیا ہے۔"

لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ کریمی سے جو جواب ملا وہ یہ تھا: "عمرؓ تمھیں کیا معلوم؟ اللہ بدر والوں کے حالات سے آگاہ ہے۔ تبھی تو خدا نے کہا ہے:

"میں نے تم لوگوں کو معاف کر دیا۔" (بخاری) (بحوالہ اسلامی بیداری ص ۲۳)

دیکھیے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم حضرت حاطبؓ کی کتنی بڑی غلطی کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ اس لیے کہ آنحضورؐ کے سامنے حضرت حاطبؓ کے سابقہ کارنامے ہیں۔ انھیں بدر میں شرکت کی فضیلت حاصل ہے، ہجرت کرنے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کا شرف حاصل ہے۔ ان تمام کارناموں کے مقابلہ میں جب حضرت حاطبؓ سخت قسم کی غلطی کر بیٹھتے ہیں تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اسے وقتی جذبات سے مغلوبیت سمجھ کر یا حضرت حاطبؓ کی اجتہادی غلطی سمجھ کر اور حسنِ ظن سے کام لے کر ان کو معاف کر دیتے ہیں۔ چنانچہ حضرت حاطبؓ نے اپنی صفائی میں یہی بات کہی کہ اے اللہ کے رسولؐ! فتح تو آپؐ کو ملنا ہی ہے خواہ قریشِ مکہ کو اطلاع ہو یا نہ ہو۔ میں نے یہ سوچا کہ مکہ میں میرے گھر والے گھرے ہوئے ہیں۔ اگر میں قریشِ مکہ کو اطلاع فراہم کر دوں گا تو ہو سکتا ہے وہ میرے احسان کے بدلے میں میرے گھر والوں کی حفاظت کریں۔

ایک اور مثال سنیے۔ ایک صحابی شراب پینے کے روگ میں مبتلا ہو گئے۔ ایک سے زائد بار شراب پینے کی حالت میں ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا۔ ہر بار ان پر

مار پڑتی، سزا دی جاتی، لیکن ہر بار شیطان شراب کی لت بن کر ان پر غالب آجاتا اور وہ پھر شراب پی لیتے۔ پھر آنحضورؐ کے پاس ان کو لایا جاتا انھیں سزا دی جاتی مگر وہ پھر شراب پی لیتے۔ ایسا کئی بار ہوا۔ ایک بار جب انھیں شراب پینے کی حالت میں پکڑ کر لایا گیا تو کسی صحابیؓ نے کہا:

"کیا بات ہے۔ اللہ کی اس پر لعنت ہو! بار بار اسے لایا جاتا ہے۔"

جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت بھیجتے ہوئے سنا تو لعنت کرنے والے سے کہا: "اس پر لعنت نہ بھیجو، یہ اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت رکھتا ہے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ" اپنے دینی بھائی کے مقابلے میں شیطان کی مدد نہ کرو۔

(الصحوۃ الاسلامیہ)

رسولِ خدا کی وسیع القلبی کو دیکھیے کہ کس طرح آپؐ نے اس انسان کو اپنی شفقتوں کے سائے میں لے لیا۔ شراب نوشی کے گناہ میں لت پت ہونے کے باوجود اس کے بارے میں حسنِ ظن کا اظہار کیا۔ اس موقع پر بھی اس کے اچھے پہلو کا تذکرہ کیا اور یہ واضح کیا کہ اگر شراب نوشی بدترین قسم کا گناہ ہے مگر اسلامی اخوت کا رشتہ اب بھی باقی ہے اس لیے لعنت کرنے سے روکا کیونکہ اس سے ایمانی بھائیوں کے درمیان خلیج حائل ہو جاتی ہے۔ اہلِ ایمان اس سے دور ہو جاتے ہیں اور وہ اہلِ ایمان سے دور ہو جاتا ہے۔ نتیجتہً وہ شیطان سے قریب ہو جاتا ہے اس لیے آپؐ نے فرمایا کہ" اپنے بھائی کے مقابلے میں شیطان کے مددگار نہ بنو۔"

یہاں ٹھہر کر ان لوگوں کو غور کرنا چاہیے جو خورد بین لیے دوسروں کے عیوب تلاش کرتے رہتے ہیں اور انھیں اپنے حساب سے ساقط کرتے رہتے ہیں۔ انھیں یہ واقعہ غور و فکر کی دعوت دیتا ہے کہ وہ رسولِ خدا کے بلند طریق تربیت اور دوررس نگاہ سے موعظت حاصل کریں۔

اس کے مشیر اور رکنِ سلطنت تھے۔ صدر الصدور شیخ عبدالنبی کا بھی وہ دل و جان سے معتقد تھا۔ کبھی کبھی حدیث سننے ان کے گھر جاتا۔ ایک دفعہ جوتے ان کے سامنے اُٹھا کر رکھے[1]۔ شہزادہ سلیم کو ان کی شاگردی میں داخل کیا تاکہ جامی کی چہل حدیث ان سے پڑھے۔ صدر الصدور شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے پوتے تھے اور تقویٰ و پرہیزگاری میں فرد تھے۔ ان کی تلقین و تعلیم اور فیضِ صحبت سے یہ حال ہوا کہ نماز باجماعت کی پابندی تو ایک طرف اکبر خود اذان دیتا۔ امامت کرتا اور مسجد میں اپنے ہاتھ سے جھاڑو دیتا[2]۔

اکبر کا جو اپنا رنگِ طبیعت تھا، وہ خانگی اثرات سے اور گہرا ہو گیا۔ ایک دفعہ اس کا عالمِ شباب تھا۔ جشنِ سالگرہ کی تقریب پر لباسِ زعفرانی پہن کر محلسرا سے باہر آیا۔ صدر الصدور شیخ عبدالنبی نے (جنھیں بعد میں شہادت نصیب ہوئی) سرِ دربار ٹوکا اور اس شدت کے ساتھ کہ عصا کا سرا بادشاہ کو جا لگا۔ اکبر چُپ ہو رہا۔ لیکن اندر جا کر ماں سے شکایت کی۔ ماں نے کہا کہ بیٹا یہ رنج کا مقام نہیں، باعثِ نجات ہے۔ کتابوں میں لکھا جائے گا کہ ایک بوڑھے عالم نے اتنے بڑے بادشاہ کو عصا مارا اور وہ فقط شرع کے ادب سے صبر کر کے برداشت کر گیا۔

ایک دفعہ سلطان الہند خواجہ اجمیری سے عقیدت پیدا ہو گئی اور پھر تو یہ حال ہوا کہ سال بسال اجمیر جاتا تھا۔ کوئی مہم یا خاص مراد ہو تو اس کے علاوہ بھی۔ ایک منزل سے پیادہ پا جاتا تھا اور بعض منتیں (مثلاً جہانگیر کے تولد سے پہلے) تو ایسی بھی ہوئیں کہ فتح پور یا آگرے سے اجمیر تک پا پیادہ گیا۔ وہاں ہزاروں لاکھوں روپے چڑھاوا چڑھاتا اور پہروں مراقبے میں بیٹھا رہتا۔ فوج کا نعرہ "یا ہادی یا معین" تھا اور علامہ شیرانی کا خیال ہے کہ حضرت خواجہ بزرگ کو دسویں صدی ہجری سے جو خاص شہرت حاصل ہوئی ہے، اس میں اکبر کی ارادتمندی کو بہت دخل تھا۔

---

[1] ملاحظہ ہو ذخیرۃ الخوانین (از معصوم بھکری) جلد اوّل۔ ص ۶۹ [2] ایضاً

عبادت خانہ

اکبر سلیم چشتیؒ کا بڑا معتقد تھا اور جب جہانگیر پیدا ہونے والا تھا تو حصولِ برکت کے لیے اس کی والدہ کو شیخ کے حجرے میں بھیج دیا اور انھی کی نسبت سے بیٹے کا نام سلیم رکھا۔ اس کے دو برس بعد اکبر نے فیصلہ کیا کہ جو جگہ اتنی روحانی برکتوں کا سرچشمہ ہے، وہاں ایک عظیم الشان شہر تعمیر ہونا چاہیے۔ چنانچہ ۱۵۷۱ء میں فتح پور سیکری کی شاندار عمارتیں بننی شروع ہوئیں اور یہ معمولی گاؤں شہنشاہِ ہند کا پایۂ تخت ہو گیا۔

یہاں اکبر ایک پرانے حجرے میں اکثر اپنا وقت مراقبوں، دعاؤں اور عبادتوں میں گزارتا۔ مذہبی امور میں بالآخر اس کی دلچسپی اتنی بڑھی کہ ۱۵۷۵ء میں اس نے شیخ سلیم چشتی کی نئی خانقاہ کے پاس ایک عظیم الشان عمارت تعمیر کرائی جس کا نام عبادت خانہ رکھا گیا۔ ہر جمعہ کی نماز کے بعد شیخ کی خانقاہ سے آ کر یہاں دربار خاص منعقد ہوتا تھا جس میں مشائخِ وقت، علما و فضلا اور چند مقرب درگاہ شریک ہوتے تھے اور خداشناسی اور حق پرستی کی حکایتیں اور روایتیں بیان ہوتی تھیں۔

اکبر نے عبادت خانے کی مجالس کا اہتمام خاص مذہبی ذوق سے کیا تھا لیکن بالآخر انھی نے اسے بدمذہبی کا رستا دکھایا اور ان کا ایک باعث ان علما و فضلا کی کمزوریاں تھیں، جو ان مجلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ پہلی ہی نشست میں جھگڑے شروع ہو گئے کہ فلاں آدمی صف میں مجھ سے اوپر کیوں بیٹھے اور میں اس سے نیچے کیوں رہوں۔ جب یہ قضیہ طے ہوا تو ہر شخص چاہتا تھا کہ اپنی فضیلت اور دوسرے کی جہالت دکھاؤں۔ بات بات پہ جھگڑا ہوتا تھا جس سے بادشاہ کا دل کھٹا ہو گیا اور اس نے کہا جو کوئی نامعقول باتیں کرے اسے محفل سے اٹھا دیا جائے۔ ملا بدایونی کو اس کام پر مامور کیا گیا۔ اس وقت آصف خاں پاس کھڑا تھا۔ ملا صاحب نے چپکے سے اس کے کان میں کہا کہ اگر یہی بات ہے تو بہتوں کو اٹھنا پڑے گا۔ بادشاہ نے سنا تو بہت خوش ہوئے اور دوسروں کو بدایونی کے الفاظ سنا دیئے۔[1]

---

[1] منتخب التواریخ جلد دوم صد ۲۰۲

لے آئے۔

ہجرت کا یہ مبارک سفر محض مجبوری و بے بسی کی وجہ سے نہیں کیا گیا تھا، محض مکہ والوں کے مظالم و مصائب سے تنگ آکر نہیں اختیار کیا گیا تھا بلکہ اس ہجرت کے پس منظر میں ایک عظیم مقصد پوشیدہ تھا اور وہ یہ تھا کہ تحریک اسلامی کامیابی کے آخری مرحلے تک پہنچانے اور اپنے اصحابؓ کو اقامتِ دین کے لیے مکمل طور پر تیار کرنے کے لیے ایسی جگہ کی ضرورت تھی جہاں کی اجتماعی فضا اس کے لیے سازگار ہوا اور یہ سعادت یثرب کے حصے میں آئی جسے بعد میں مدینۃ رسولؐ کے نام سے پکارا جانے لگا۔

تاریخ اسلامی میں ہجرت کا یہ واقعہ تحریکِ اسلامی کے لیے ایک نیا رُخ اور ایک نیا موڑ تھا۔ آنحضورؐ اپنے اصحابؓ کے لیے ایک ایسا مقام چاہتے تھے جہاں آپؐ ان کے اندر کردار کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کر سکیں، اور اسلامی حکومت سے متعلق تمام ذمہ داریوں کو ادا کرنے کی صلاحیتیں ان میں پیدا کر سکیں اور ان کو عملی تربیت دے سکیں۔

اپنے اصحابؓ کی تربیت کے سلسلہ میں آپ نے مقام و ماحول کی سازگاری کا کس قدر اہتمام کیا اس کا اندازہ کرنے کے لیے ہجرت کا واقعہ ہی کافی ہے۔

انسان کی اصلاح و تربیت میں مقام و ماحول کو کتنا دخل ہے اس کی وضاحت خود نبیِٔ کریمؐ نے ایک واقعہ سنا کر فرمائی۔

آپؐ نے فرمایا:

"تم سے پہلے لوگوں میں ایک شخص تھا۔ اس نے ننانوے آدمیوں کو قتل کر ڈالا۔ پھر اس نے پوچھا کہ زمین پر سب سے زیادہ علم رکھنے والا شخص کون ہے؟ چنانچہ اسے ایک راہب کا پتہ بتا دیا گیا۔ وہ راہب کے پاس گیا اور کہا کہ "میں ننانوے آدمیوں کو قتل کر چکا ہوں، کیا میرے لیے توبہ کی کوئی صورت ہے؟" راہب نے کہا: "نہیں۔" یہ سن کر اس شخص نے راہب کو بھی قتل کر دیا اور اس طرح سَو کا عدد پورا ہو گیا۔ اس نے پھر پوچھا کہ سب سے زیادہ علم رکھنے والا کون ہے؟ لوگوں نے اسے ایک عالم کا پتہ بتا دیا۔ وہ عالم کے پاس آیا اور بولا: "کہ میں سَو آدمیوں کو قتل کر چکا

ہوں، تو کیا میرے لیے توبہ کی کوئی شکل ہے؟" عالم نے کہا "ہاں! توبہ اور تمہارے درمیان کون حائل ہو سکتا ہے؟ تم ایسا کرو کہ فلاں بستی کی طرف جاؤ، کیوں کہ وہاں کچھ لوگ اللہ کی عبادت کرتے ہیں، تم ان کے ساتھ اللہ کی عبادت کرو۔ اور اپنی قوم کی بستی کی طرف نہ آنا کیونکہ یہ بری بستی ہے۔ چنانچہ وہ وہاں سے چل دیا۔ ابھی آدھا راستہ ہی طے کیا تھا کہ اسے موت آگئی اس کی روح قبض کرنے کے سلسلہ میں رحمت اور عذاب کے فرشتوں کے درمیان اختلاف ہو گیا! رحمت کے فرشتوں نے کہا "یہ شخص خلوصِ دل سے توبہ کر کے چلا ہے" عذاب کے فرشتوں نے کہا "اس نے آج تک ایک بھی اچھا عمل نہیں کیا!" اتنے میں ایک فرشتہ آدمی کی صورت میں نمودار ہوا۔ فرشتوں نے اس کو اپنا ثالث بنا لیا۔ اس نے کہا "دونوں بستیوں کے درمیان کی زمین ناپو، وہ جس بستی سے قریب ہو اس کو اسی میں شمار کر لو۔" چنانچہ انھوں نے زمین کو ناپا اور اس کو اس (نیک) بستی سے قریب پایا جس کا اس نے قصد کیا تھا۔ چنانچہ رحمت کے فرشتوں نے اس کی روح قبض کر لی۔" (مسلم)

اس حدیث سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ صالح معاشرہ اور اچھے ساتھی سیرت و کردار کی تعمیر میں بہت ہی اہم رول ادا کرتے ہیں اور بری بستی بگڑا ہوا ماحول، برے دوست انسانوں کو بگاڑنے میں ممد و معاون ہوتے ہیں۔

خدا سے دعا ہے کہ وہ ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم اپنے لیے بھی اور اپنے متعلقین کے لیے صالح لوگوں، نیک دوستوں اور پاکیزہ معاشرت کا انتخاب کر سکیں۔

در اختلافِ علما کہ یکے فعل را حرام میگفت و دیگرے بحیلہ ہماں را حلال می ساخت علاوۂ انکار گشت و چوں از علماے عہد خویش ہر کدام را بہ اعتبار جاہ و عظمت بہتر از امام غزالی و رازی تصور نمودہ بودند۔ رکاکتہاے ایشاں را دیدہ قیاس غائب بر شاہد کردہ سلف را نیز منکر شدند[۱]۔

ملا یزدی نے صحابہ کے خلاف کہا تو بادشاہ نے ابتدائی اسلام کی تاریخ پڑھوانی شروع کی۔ اس زمانے کے اختلافات اور صحابہ کبار کے متعلق معترضوں (مثلاً شیعہ اہلِ فکر) کے طعن و تشنیع دیکھ کر بادشاہ کا اعتقاد صحابہؓ میں بھی نہ رہا اور مذہب کی بنا صحابہؓ کی منقولہ روایات پر نہیں بلکہ عقل پر رکھی گئی۔ "چوں تاریخ خواندہ می شد روز بروز اعتقاد از اصحاب فاسد شدن گرفت و گام فراخ تر نہادند و نماز و روزہ و جمیع نبوات را تقلیدیات نام نہادند۔ یعنی غیر معقول و مدارِ دین بر عقل گزاشتند نہ نقل[۲]۔"

صوفی اہلِ فکر نے ان پریشانیوں میں اور اضافہ کیا۔ بدایونی ان میں سب سے زیادہ شیخ تاج الدین ولد شیخ زکریا اجودھنی کی شکایت کرتا ہے، جو کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ ممتاز صوفی تھے۔ تاج العارفین کہلاتے تھے اور بقول بدایونی علم توحید میں دوسرے شیخ ابن عربی تھے۔ (در علمِ توحید ثانی شیخ ابن عربی بود) انھوں نے وحدت الوجود کا راگ الاپا۔ ابن العربی کی تصانیف سے کئی ایسی چیزیں لائے، جن سے آزادی اور آزاد خیالی کا سبق ملتا تھا۔ آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی کی ایسی تاویل و ترجمانی کی کہ بادشاہ حیران رہ گیا۔ انھوں نے خلیفۃ الزمان کو انسانِ کامل کہا اور بادشاہ کو اس لقب کا مستحق قرار دیا اور بادشاہ کے لیے سجدہ تجویز کیا اور اس کی تائید میں بعض روایات اور اُن ہندوستانی صوفیانہ طریقوں کی مثال جن میں مُرید اپنے مُرشدوں کو سجدۂ تعظیمی کرتے ہیں، پیش کی۔

بادشاہ بقول بدایونی "جوہرے نفیس و طالب حق" لیکن "عامی محض" تھا اور اس کا

---

[۱] منتخب التواریخ جلد دوم صہ ۲۵۹ [۲] منتخب التواریخ جلد دوم صہ ۲۱۱

ابتدائی زمانہ پست خیال اور راسخ العقیدہ لوگوں میں گزرا تھا۔" اہل بدع واہوا" کی ان ترجمانیوں سے جو باطل کو بصورتِ حق اور حق کو بصورتِ باطل پیش کرتی تھیں۔ وہ اپنا توازن کھو بیٹھا اور حق و باطل کی تمیز سے عاری ہو گیا۔

عبادت خانہ کے مباحثوں کی زیادہ تفاصیل اور دلچسپ قصے بدایونی کی تاریخ میں ملتے ہیں۔ ابوالفضل نے بھی اکبر نامہ میں ایک باب ان کے متعلق لکھا ہے، لیکن زیادہ تر لفاظی۔ عبارت آرائی۔ عمومیات۔ البتہ بادشاہ کے خیالات کا خلاصہ اس کی زبان سے پڑھنا ضروری ہے۔ ابوالفضل کہتا ہے کہ بادشاہ فرماتے تھے کہ اس سے پہلے جب میں ظاہر بینوں کا ہم خیال تھا، میں سمجھتا تھا کہ ظاہر آرائی اور بغیر دلی قبول کے مسلمانی کا دعوےٰ کرنا فائدہ مند ہے۔ چنانچہ میں کئی ہندوؤں کو ڈرا دھمکا کر اپنے بزرگوں کے دین پر لایا لیکن اب شہرستان باطن کی حقیقت مجھ پر منکشف ہوئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس آشوبگاہِ اختلاف میں عقل سمجھ کا راستا اختیار کرنا چاہیے اور نہیب سلطانی سے زبان پر کلمہ شہادت نکلوانا، ختنہ کرانا اور ظاہری قسم سے سجدہ کرنا خدا طلبی نہیں ہے

طاعت آں نیست کہ بر خاک نہی پیشانی ۔ صدق پیش آر کہ اخلاص بر پیشانی نیست

ضرورت اس کی ہے کہ نفسِ خود آرا کو شکست دی جائے اور خواہش اور غصے کو سلطانِ عقل کے تابع کیا جائے۔

مختلف مذاہب کے متعلق بادشاہ نے بارہا کہا کہ آدمی وہ ہے جو انصاف کو اپنا راہنما بنائے اور ہر گروہ سے جو چیز عقل کے مطابق ہو اخذ کرلے۔ شاید اس طرح وہ قفل جس کی چابی گم ہو گئی ہے کھل جائے۔ اس سلسلے میں وہ اہل ہند کی حقیقت طلبی کی بڑی تعریف کرتے اور ان لوگوں کی شکست و ناکامی کے وقت وفاداری کے جھنڈے تلے رفاقت اور مال و جان و ناموس و دین (" کہ کالائے چہارسوئے دنیا ازیں برنگذرد") کی قربانی کا ذکر بڑی شیوہ زبانی سے کرتے[1]۔ ابوالفضل عبادت نامہ کے مباحثوں کی

---

[1] اکبر نامہ جلد سوم صر ۲۵۷-۲۵۶

بیمار پڑے تو حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ ان کی عیادت کے لیے بہت دور تک پیدل چل کر گئے پہنچے تو حضرت جابرؓ بے ہوش پڑے تھے۔ آپؐ نے وضو کیا، پانی کے چھینٹے دیئے اور مریض کے لیے دعا کی!

اگر کسی کے عالم نزع کے بارے میں معلوم ہو جاتا یا آپؐ کو اطلاع دی جاتی تو فوراً پہنچتے۔ توبہ الی اللہ کی ہدایت کرتے۔ کسی کی وفات کی اطلاع ملتی تو فوراً اس کے گھر پہنچتے۔ پس ماندگان کو صبر کی تلقین کرتے اور ان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار فرماتے۔ تجہیز و تکفین میں جلدی کراتے۔ جنازہ اٹھتا تو خود بھی جنازہ کے ساتھ ساتھ جاتے۔ مسلمان کا جنازہ خود پڑھاتے اور اس کے لیے دعائے مغفرت کرتے!

ضرورت پڑتی تو لوگوں کے بہت سے کام کر دیتے۔ عورتوں کا سودا سلف بازار سے لا دیتے۔ غریبوں کی مدد کرتے، گنجائش ہوتی تو لوگوں کو قرض دے دیتے یا قرض دلا دیتے۔ بھوکوں کو کھانا کھلاتے، غلاموں کی آزادی کا بندوبست فرماتے۔ یتیموں، بیواؤں، مسکینوں کی امداد فرماتے اور ان کی امداد پر ابھارتے۔ سماج کے کمزور طبقات کو اونچا اٹھانے کی کوشش کرتے۔

ہمیشہ خندہ پیشانی سے پیش آتے۔ اپنے اصحاب کے ساتھ مزاح و مذاق بھی کرتے ان کے ساتھ تیراکی اور تیر اندازی کے مقابلے میں بھی شریک ہوتے۔

مختصر یہ کہ نبی کریمؐ نے اپنے کو سماج سے اس قدر قریب کر رکھا تھا کہ سماج کا ہر فرد یہ سمجھتا تھا کہ اللہ کے رسولؐ سب سے زیادہ اسی سے قربت و محبت رکھتے ہیں۔ یہ برتاؤ اور سلوک صحابہ کرامؓ کے دلوں میں اپنا گھر بنا لیتا تھا۔ اور صحابہ کرامؓ آپؐ کے اس برتاؤ سے اپنے لیے غذا حاصل کرتے تھے۔

تربیت کے سلسلہ میں انسان کے ذاتی تعلقات اور سماجی روابط کا بڑا اثر پڑتا ہے۔ اصلاح و تربیت کا فریضہ انجام دینے والوں کی ذمہ داری قرار پاتی ہے کہ اپنے زیر تربیت افراد اور سماج کی اکائیوں سے زیادہ سے زیادہ گہرا تعلق پیدا کریں۔ غمزدوں کے زخموں پہ پھاہا رکھیں۔ گرتے ہوؤں کو سہارا دیں۔ قرض کے بوجھ کے نیچے دبنے والے

کو اس بوجھ سے نجات دلائیں غریب الدیار اور پردیسی کے لیے ٹھکانہ فراہم کریں۔ ناخواندہ کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کریں۔ کمزوروں اور زیردستوں کو اوپر اٹھانے کی کوشش کریں پھر دیکھیے یہ کردار کس طرح تربیت میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ نبی کریم ؐ نے ایسی ہی فضا قائم کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا :۔

"ہر روز جب سورج طلوع ہوتا ہے تو انسان کی انگلیوں کے ہر پورے پہ صدقہ واجب ہوتا ہے ۔ دو انسانوں کے درمیان انصاف کرنا صدقہ ہے ۔ جب کوئی انسان کسی انسان کے سوار ہونے میں مدد دیتا ہے' اس کے سامان کو لاد دیتا ہے یا اتار دیتا ہے تو یہ بھی صدقہ ہے ۔ کسی سے اچھی بات کہنا بھی صدقہ ہے ۔ ہر قدم جو نماز کے لیے اٹھتا ہے وہ بھی صدقہ ہے ۔ تکلیف دہ چیز کا راستہ سے ہٹا دینا بھی صدقہ ہے ۔"

(متفق علیہ)

شاکی ہے اور تذکرہ علمائے ہند میں بھی ان کی علمیت، «یگانۂ دوراں بود» اور ترویج شریعت کی تعریف کے ساتھ ساتھ انھیں "سُنی متعصب" کہا گیا ہے۔

شیخ عبد النبی صدر الصدور مشہور صابری بزرگ شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ کے پوتے تھے۔ حرمین میں جا کر علمِ حدیث کا مطالعہ کیا اور محدثین کی وضع اختیار کی۔ ان کے والد نے سماع کے جواز میں رسالہ لکھا تھا۔ انھوں نے تردید میں ایک رسالہ لکھا۔ اس آزادی اور شہرتِ دیانت نے ۱۵۶۳ء میں صدر کی مسند پر لا بٹھایا۔ وہ مخدوم الملک سے عمر میں چھوٹے تھے اور ان کی طرح غاصب اور ظالم نہ تھے۔ لیکن مسجدوں کے اماموں کو جاگیریں صدر الصدور کے دستخط سے ملتی تھیں اور کہا جاتا تھا کہ اس ضمن میں شیخ کے متوسلین رشوت لیتے ہیں، لیکن اس سے بھی زیادہ جس چیز نے انھیں نقصان پہنچایا وہ مخدوم الملک کا عناد اور دربار کا نیا رنگ تھا۔ مخدوم نے عبادت خانے کے مباحثوں میں ان پر نکتہ چینی شروع کی۔ ان کے خلاف ایک رسالہ لکھا، جس میں اس قسم کی باتیں تھیں کہ شیخ عبد النبی نے خضر خاں شروانی کو پیغمبر صاحب کو بُرا کہنے کی تہمت لگا کر اور میر حبش کو رفض کے الزام میں ناحق مروا ڈالا۔ اپنے والد سے حلتِ سماع کے متعلق شیخ عبد النبی کا اختلاف تھا اور شاید والد نے انھیں علٰحدہ بھی کر رکھا تھا۔ مخدوم الملک صاحب نے فتوے دیا کہ شیخ کے پیچھے نماز جائز نہیں کیونکہ اُسے باپ نے عاق کر دیا ہے اور اسے خونی بواسیر بھی ہے۔ جب مخدوم الملک نے اس طرح صدر الصدور کی مخالفت اور تضحیک شروع کی تو اُنھوں نے بھی مخدوم پر بے علمی اور گمراہی کے الزام لگائے اور علماء کے دو گروہ ہو گئے جو نئے نئے مسئلوں میں جھگڑتے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے بجائے ایک دوسرے کو ذلیل کرتے۔

بدایونی نے عہدِ اکبری کے جو حالات لکھے ہیں، ان سے خیال ہوتا ہے کہ اکبر نے علما کا اقتدار ان کی کج بحثیوں اور حماقتوں کی وجہ سے کم کیا۔ مولانا ابو الکلام آزاد نے بھی تذکرہ میں خرابیوں کا باعث مخدوم الملک اور صدر الصدور کی شخصی کوتاہیوں کو قرار دیا ہے اور اس سلسلے میں حضرت مجدد الف ثانی کی رائے نقل کی ہے: "ہر فتوے کہ

دریں زماں در ترویجِ ملت و دیں ظاہر گشتہ۔ از شومیٔ علمائے سو راست کہ فی الحقیقت شرار مردم و لصوصِ دین اند" اور ان دو بزرگوں کو اس بیان کا مصداق قرار دیا ہے۔ اور اب یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ "علماء سوء" سے مخدوم الملک اور شیخ عبد النبی مراد ہیں حضرت مجدد نے "علماء سوء" کی وضاحت نہیں کی، لیکن اس معاملے میں مولانا محمد ناظم ندوی کی رائے ہمیں زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ جنھوں نے تعلیماتِ مجددیہ کے پیش لفظ میں "علماء سوء" سے "مبارک ناگوری کے دونوں ذہین و طباع بیٹے ابو الفضل اور فیضی اور تاج الدین دہلوی (کذا)" مراد لیے ہیں۔ شاید ان کے علاوہ قاضی خاں بدخشی کی طرف بھی اشارہ ہو، جنھوں نے بادشاہ کے لیے سجدۂ تحیت جائز قرار دیا۔

بدایونی کے علاوہ عہدِ مغلیہ میں علما کے جتنے تذکرے لکھے گئے اور جن کا ماخذ منتخب التواریخ نہیں۔ ان میں بالعموم شیخ عبد النبی اور مخدوم الملک کی تعریف کی گئی ہے۔ مثلاً حضرت مجددؒ کے شاگرد اور خلیفہ (اور ان کی مشہور سوانح عمری حضرات القدس کے مصنف) جنھیں سترہ سال مرشد کی خدمت میں رہنا نصیب ہوا سلوات الاتقیا (قلمی) میں شیخ عبد النبی کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

"شیخ عبد النبی ابن شیخ احمد حنفی رضی اللہ عنہ عالم و محدث بود ..... تسرع بر کمال داشت۔ و در اتباعِ سنت و رفعِ بدعت رسوخِ تمام نصیبِ وقت او شدہ بود۔ و در امرِ معروف و نہی منکر بر سلاطین و امرا شدت کردے ... صاحب تصانیفِ شریفہ است۔ از انجملہ وظائف النبی است۔ در سنہ نہصد و نود و یک در عہدِ عرش آشیانی شہادت یافت صاحب فیض گفت سالش عقل[1]"

---

[1] ذرا اس تاریخ کا بدایونی کے بیان سے مقابلہ کریں "شبے او را خفہ کردند و بحق واصل شد و شیخ کبنی تاریخ یافتند کہ گرچہ الشیخ کالنبی گفتند کالنبی نیست شیخ ماکبنی است" دربارِ اکبری میں آزاد لکھتے ہیں "اس مرحوم کا دم نکل گیا۔ اور ان کا غصہ نہ نکل چکا .... کنب (بھنگ) اور بحق واصل شد کے لفظ کو دیکھو۔ اس میں کیا کام کر گئے۔ چاہو یہ سمجھ لو کہ ذاتِ حق کے ساتھ واصل ہو گئے۔ چاہو یہ کہو کہ امرحق کو پہنچ گئے"

اخبار الاصفیا (قلمی) میں جو ابوالفضل کے بھانجے عبدالصمد نے اسی زمانے میں لکھی، اسی طرح کا اظہارِ خیال ہے:۔

"شیخ عبدالنبی بن شیخ احمد بن شیخ عبدالقدوس چشتی گنگوہی ۔ بعنوان صحیفہ دین ودانش و فہرست جریدۂ علم و عمل بود ۔ در عنفوان برنائی ... بحرمین شریفین شتافت و مدتے دراں خیر البقاع نزد شیخ ابن حجر ... استماع نمودہ بوطن گاہ خرامید ۔ و ذکر اور در واعلاء ارکان شریعت غرا ربستہ ... آرامگاہ فتح پور ۔ کتاب سنن الھدایہ از وے یادگار است۔"

دُوسرے معاصرانہ تذکروں میں بھی (مثلاً مراۃ العالم میں) (سوائے ان کے جنھوں نے طبقات شاہجہانی کی طرح بدایونی پر انحصار کیا ہے) شیخ عبدالنبی بلکہ مخدوم الملک کا ذکر بھی تعریف کے ساتھ کیا گیا ہے اور بالخصوص حضرت مجددؒ کے شاگرد اور سوانح نگار خواجہ بدرالدین سرہندی کی شیخ عبدالنبی کی تعریف کے بعد یہ قیاس کہ حضرت مجدد نے انھیں "علمائے سُوء" میں سے شمار کیا ہوگا، صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

مخدوم الملک کی شخصی کوتاہیوں میں کلام نہیں اور عبادت خانہ کے مباحثوں میں علما نے بالعموم بڑی ناعاقبت اندیشی سے کام لیا، جس سے اکبر کے دل میں طبقۂ علما کے لیے کوئی احترام باقی نہ رہا۔ لیکن اکبر کے علما سے اختلاف کی وجہ فقط ان کی کوتاہیاں اور قابلِ اعتراض باتیں نہ تھیں بلکہ ان کی خوبیاں اور ترویج شرع کی کوششیں بھی وجۂ مخاصمت ہو گئیں۔ مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی کے ضمن میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ شیخ عبدالنبی پر کوئی جائز اور فنی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ ان کی ذاتی دیانتداری پر کسی نے شبہ ظاہر نہیں کیا۔ بے شک وہ احکام شرع کی پابندی میں سخت تھے، لیکن مذہبی نقطۂ نظر سے تو یہ کوئی اعتراض کی بات نہیں اور جس واقعہ (متھرا کے برہمن کو سزائے قتل پر) اکبر سے ان کا سخت اختلاف ہوا، اس میں نوّے فیصدی علما بلکہ زیادہ شیخ عبدالنبی کے ہم خیال ہوں گے۔ مخدوم میں شخصی کمزوریاں زیادہ تھیں، لیکن ان کی جس چیز کی شکایت کی جاتی ہے، یعنی شدتِ احتساب۔ وہ بھی شرعی نقطۂ نظر سے خوبی ہے بُرائی نہیں۔ انھوں نے (بقول بدایونی) شیخ ابوالفضل کی نسبت جو کہا تھا کہ بیتا نہیں،

اس شخص سے دین میں کیا کیا فتنے برپا ہوں گے ۔ اسے بھی واقعات نے درست ثابت کیا ۔ اور شیخ مبارک کی راسخ الاعتقادی کی نسبت انھیں جو شبہے تھے، وہ بھی بیجا نہ تھے ۔ شیعوں کے متعلق ان کا جو نقطہ نظر تھا، وہی حضرت مجدّد الف ثانیؒ کا تھا ۔

واقعہ یہ ہے کہ مہدویت کی مقبولیت، شیعیت کی اشاعت، شطاری اور دوسرے آزاد صوفیانہ طریقوں کی ترویج سے ملک میں جو روحانی انتشار رونما تھا، اس کے سد باب میں مخدوم الملک کی محتسبانہ کوششیں، شیخ مبارک کی علمیت و آزاد خیالی اور شیخ علائیؒ کی نیک نفسی اور خلوص سے زیادہ مفید تھیں ۔

علما اور اکبر کے درمیان جو اصل وجہ مخاصمت تھی، اسے خود اکبر نے عبداللہ خاں ازبک کے نام ایک خط میں واضح کر دیا ہے اور عقل و براہین کی اہمیت بتاتے ہوئے علما و ملا کی شکایت کی ہے ۔ "مے خواہند کہ در فرمانروائی و کارگزاری شریک بادشاہی باشند ۔"

اور یہ بیان غلط نہ تھا ۔ خاندان سور کے عہد حکومت اور اکبر کے ابتدائی ایام میں مخدوم الملک اور صدر الصدور کو بڑے اختیارات حاصل تھے ۔ شرع کی ترجمانی ان کا کام تھا اور ملک کا قانون ان کے ہاتھ میں تھا ۔ کئی باتوں میں بادشاہ کی کچھ مرضی ہوتی ہوگی اور ان بزرگوں کے فیصلے کچھ اور ۔ اکبر جیسے خود سر اور آزاد خیال بادشاہ کو جس نے چند سالوں میں بیرم خاں جیسے کارگزار اتالیق کا جوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکا تھا یہ کیسے گوارا ہو سکتا تھا کہ وہ کسی سے دب کر رہے[1] ۔ پھر وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ جن اصولوں پر مجھے ملک کا نظم و نسق کرنا ہے، وہ علما کے بڑھتے ہوئے اختیار کی موجودگی میں ناممکن ہے ۔ چنانچہ وہ علما کا زور توڑنے کے درپے ہوا ۔ اتفاق سے شیخ مبارک، ان کے بیٹے اور بدایونی آن پہنچے اور ان کی مدد سے یہ مشکل حل ہو گئی ۔

اکبر اور علما کی کشمکش فی الواقع (کلیسا یا ارباب شرع) Church اور

---

[1] "از بسکہ طالب جمع ریاست دین با ریاست دنیوی بودند ۔ و تبعیت دیگرے را تکلیف ما لایطاق می دانستند ۔" (منتخب التواریخ جلد دوم صہ ۲۶۸) ۔

(حکومت) علماء کی کشمکش تھی جس میں حکومت کا پلّہ بھاری رہا۔ بدقسمتی سے اکبر کی اپنی مذہبی طبیعت کی وجہ سے یہ کشمکش دنیوی امور تک محدود نہ رہی بلکہ مذہبی امور و عقائد پر بھی اس کا اثر ہُوا، لیکن اس کی تہ میں دنیوی اقتدار کا سوال تھا اور اکبر اور علمائے دربار کے درمیان اصلی وجہ مخاصمت یہ تھی کہ بادشاہ مختارِ کُل ہے یا علماء کے فتووں کے تابع۔ مخدوم الملک اور صدر الصدور کے نقائص ضمنی اور ثانوی چیزیں تھیں۔

عُلما کا زوال

جن دنوں عبادت خانے کے مباحثوں میں علما دُنیا کو عجیب تماشا دکھا رہے تھے۔ دربارِ شاہی میں ایک ایسا شخص آپہنچا جو علم و فضل میں یگانۂ روزگار تھا، جس نے تعلیم محقق دوانی کے شاگرد ابوالفضل گازرونی سے حاصل کی تھی اور جس کے فیض یافتگان میں ابوالفضل، فیضی اور خود عبدالقادر بدایونی تھے۔ لیکن جس نے مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی کے ہاتھوں بہت دُکھ اٹھایا تھا اور جو اصُولی طور پر بھی احتسابی کارروائیوں کا مخالف اور آزاد خیال تھا۔ یہ شخص ابوالفضل اور فیضی کا باپ شیخ مُبارک تھا۔ شیخ اور مخدوم کے اختلافات پُرانے تھے۔ جب سلیم شاہ کے سامنے شیخ علائی کے متعلق علما کا محضر جمع ہُوا تب بھی شیخ نے مخدوم سے اختلاف کیا تھا اور مہدوی مشہور ہوئے۔ اس کے بعد ایک عراقی سیّد زادہ کو بچانے کی کوشش میں شیعیت سے متہم ہوئے۔ عہدِ اکبری کے شروع میں شیخ کو علمائے دربار کے ہاتھوں جو مصیبتیں پہنچی تھیں، انھیں ابوالفضل نے بالتفصیل اکبر نامہ کے اخیر میں گنایا ہے اور بدایونی نے بھی مختصر مگر جامع الفاظ میں اس خاندان کی سرگزشت لکھی ہے۔ اُس کا بیان ہے کہ جن دنوں میر حبش اور دُوسرے اہلِ بدعت گرفتار اور قتل ہوئے ان دنوں شیخ عبدالنبی صدر الصدور اور مخدوم الملک وغیرہ نے مل کر بادشاہ کے حضور میں عرض کی کہ شیخ مُبارک مہدوی بھی ہے اور اہلِ بدعت (شیعہ) بھی، خود گمراہ ہے اور دوسروں کو گمراہ کرتا ہے۔ یہ کہہ کر برائے نام اجازت لی اور شیخ کا خاتمہ کرنے کے درپے ہوئے محتسبوں کو بھیجا کہ

شیخ کو حاضر کریں، لیکن شیخ بچوں سمیت روپوش ہو گیا۔ وہ ہاتھ نہ آیا اور محتسب اس کی مسجد کا منبر توڑ کر واپس آ گئے۔

شیخ مبارک کو جان بچانے کے لیے جا بجا خاک چھاننی پڑی۔ مدت دراز کی سرگردانی کے بعد ایک امیر (مرزا کوکہ) کی سفارش سے شیخ کی گلو خلاصی ہوئی۔ انھوں نے شیخ کی درویشی اور علم و فضل کی تعریف کی اور بادشاہ سے اُسے گھر جانے اور اپنا درس شروع کرنے کی اجازت دلوائی۔ شیخ کا بڑا بیٹا فیضی تھا۔ ۱۵۶۷ء میں شاعری کے ذریعے دربار میں پہنچا اور مارچ ۱۵۷۴ء میں ابو الفضل بھی دربار میں آ کر میر منشی ہو گیا۔ یعنی جب علماء دربار کا چراغ ٹمٹما رہا تھا، شیخ مبارک اور اُس کے بیٹوں کا آفتاب طلوع ہوا۔

۱۵۷۸ء میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے اختیارات علماء کے مسئلے کو نہایت نازک اور نمایاں صورت میں پیش کیا۔ ابتدا اس کی اس طرح ہوئی کہ متھرا کے قاضی عبدالرحیم نے ایک مسجد بنانے کے لیے مسالہ جمع کیا، لیکن ایک مقامی مالدار برہمن نے اس پر قبضہ کر لیا اور مسالے کو ایک مندر کی تعمیر میں صرف کیا۔ جب قاضی اور اس کے ساتھیوں نے اسے روکنا چاہا تو اس نے بانیِ اسلام کو گالیاں دیں اور اہل اسلام کی اہانت کی۔ قاضی یہ شکایت لے کر شیخ عبدالنبی صدر الصدور کے پاس پہنچا۔ شیخ نے برہمن کو بلا بھیجا۔ وہ نہ آیا۔ چنانچہ دربار سے ابو الفضل اور بیربر کو بھیجا گیا۔ وہ جا کر برہمن کو لے آئے۔ اصل وقوعہ کی نسبت ابو الفضل نے تصدیق کی کہ برہمن نے رسولِ اکرمؐ کی بے ادبی کی۔ اب سوال پیدا ہوا کہ اسے سزا کیا دی جائے۔ اس پر علما میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ بعض کہتے تھے کہ اہانت نبوی کی شرعی سزا موت ہے۔ دوسرے کہتے تھے کہ قتل کے علاوہ کوئی دوسری سزا بھی دی جا سکتی ہے۔ اور امام اعظمؒ کا فتوے سُناتے تھے کہ اگر ایک ذمی پیغمبرؐ کی شان میں بے ادبی کرے تو عہد شکنی اور ابراء ذمہ جائز نہیں ہوتا۔ شیخ نے بادشاہ سے استصواب کیا۔ بادشاہ ٹال مٹول کرتا رہا۔ صریحاً کچھ نہ کہتا، لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی کہتا رہا کہ سیاسیاتِ شرعی تمھارے متعلق ہیں مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ اس کشمکش میں معاملے نے بہت طول کھینچا۔ برہمن

دیر تک قید خانے میں رہا اور بادشاہ کی راجپوت بیویاں اس کی رہائی کے لیے کوشاں ہوئیں۔ شیخ نے بادشاہ سے پھر پوچھا اور جلد سے زیادہ اصرار کیا۔ بادشاہ نے کہا کہ میں اس معاملے میں اپنا خیال بتا چکا ہوں۔ اب تم جانو (اور یہ ملزم)۔ چنانچہ شیخ نے برہمن کو قتل کرا دیا۔ اس پر اندر رانیوں اور باہر راجا مصاحبوں نے کہنا شروع کیا کہ ان علما کو حضور نے اتنا سر پہ چڑھا رکھا ہے کہ اب آپ کی خوشی کا بھی خیال نہیں کرتے اور اپنی حکومت و جلال دکھانے کے لیے لوگوں کو بے حکم قتل کر دیتے ہیں۔ بادشاہ اس واقعہ پر بہت بگڑا۔ اتفاق سے ان دنوں شیخ مبارک کسی تقریب سے حضور میں آئے۔

علمار کے اختیارات کی وجہ سے جو دقتیں پیش آئی تھیں، اکبر نے ان کے سامنے بیان کیں۔ شیخ نے کہا کہ بادشاہ عادل خود امام وقت اور مجتہد روزگار ہے "احکام شرعی اور ملکی" کے اجرا میں وہ اس جماعت کا جنھیں علم سے جھوٹی شہرت کے سوا کوئی حصہ نہیں ملا۔ محتاج نہیں۔ شیخ مبارک نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ وہ اجتہاد کا دعوے کرے اور علما سے محضر طلب کرے۔ چنانچہ شیخ نے جو برسوں پہلے بادشاہ کو ریاست دنیوی و دینی کے اجتماع کا مشورہ دے چکا تھا۔ آیتوں اور روایتوں کی اسناد سے اس مضمون کا ایک محضر مرتب[1] کیا۔ علمار کا ایک جلسہ بلایا گیا، جس میں بحث و تمحیص کے بعد علمار کی مہریں ثبت ہوئیں۔ جن لوگوں نے مہریں لگائیں ان میں مخدوم الملک، شیخ عبدالنبی، قاضی جلال الدین، قاضی خاں بدخشی، میراں صدر جہاں تھے۔ یہ محضر حسب ذیل تھا۔

---

[1] یہ تمام تفصیلات بدایونی کی منتخب التواریخ جلد سوم صفحہ ۸۰ تا ۱۸۸ سے لی گئی ہیں۔ طبقات اکبری کے مطابق بھی شیخ مبارک دستخط کنندگان میں سے تھے۔ لیکن یہ امر قابل ذکر ہے کہ ابوالفضل جس نے محضر کے متعلق اکبر نامہ میں ایک طویل اندراج دیا ہے۔ اپنے والد شیخ مبارک کا بالکل ذکر نہیں کرتا بلکہ محضر پر دستخط کرنے والے جن علما کے اس نے نام لکھے ہیں، ان میں شیخ مبارک کا نام نہیں دیا گیا۔ کیا اس کی وجہ یہ تو نہ تھی کہ محضر اجتہاد پر جس طرح عمل کیا گیا، اسے دیکھتے ہوئے ابوالفضل اس سے اپنے والد کا انتساب نہ چاہتا تھا؟

مقصود از تشیید ایں مبانی و تمہید ایں معانی آنکہ چوں ہندوستان صینت عن الحدثان بمیامن معدلت سلطانی و تربیت جہانبانی مرکز امن وامان و دائرہ عدل و احسان شدہ۔ طوائف انام از خواص و عام خصوصاً علماے عرفان شعار و فضلاے دقائق آثار کہ ہادیان بادیۂ نجات و سالکان مسالک اوتوا العلم درجات اند از عرب و عجم رُو بدیں دیار نہادہ توطن اختیار نمودند۔ جمہور علماے فحول کہ جامع فروع و اصول و حاوی معقول و منقول اند و بدین و دیانت و صیانت اتصاف دارند۔ بعد از تدبر وافی و تامل کافی در غوامض معانی آیۂ کریمہ اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم و احادیث صحیح ان احب الناس الی اللہ یوم القیامۃ امام عادل من یطع الامیر فقد اطاعنی ومن یعص الامیر فقد عصانی وغیر ذالک من الشواہد العقلیہ والدلائل النقلیہ قرار دادہ حکم نمودند کہ مرتبہ سلطان عادل عنداللہ زیادہ از مرتبہ مجتہد است و حضرت سلطان الاسلام کہف الانام امیر المومنین ظل اللہ علی العالمین ابوالفتح جلال الدین محمد اکبر شاہ بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ ابداً اعدل و اعلم و اعقل باللہ اند۔

بنا بریں اگر در مسائل دین کہ بین المجتہدین مختلف فیہا است بذہن صائب و فکر ثاقب خود یک جانب را از اختلافات، بجہت تسہیل معیشت بنی آدم و مصلحت انتظام عالم اختیار نمودہ بہ آں جانب حکم فرمایند۔ متفق علیہ می شود و اتباع آں بر عموم برایا و کافہ رعایا لازم و متحتم است و ایضاً اگر بموجب رائے صواب نمائے خود حکمے را از احکام قرار دہند کہ مخالف نصے نباشد و سبب ترفیہ عالمیان بودہ باشد۔ عمل براں نمودن بر ہمہ کس لازم و متحتم است و مخالفت آں موجب سخط اُخروی و خسران دینی و دنیوی است۔ و ایں سطور صدق دفور حسبۃً للہ و اظہاراً لاجراء حقوق الاسلام بمحضر علماے دین و فقہاے مہدیین تحریر یافت وکان ذالک فی شہر رجب سنہ ۹۸۷ھ سبع و ثمانین و تسعمائۃ۔

یہ محضر اگست ۱۵۷۹ء میں مرتب ہوا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اس کا خلاصہ دے کر تذکرہ میں لکھتے ہیں:۔

اصلاً تو یہ بات ٹھیک تھی۔ فی الحقیقت خلیفۂ وقت و ارباب حل و عقد و اصحاب شوریٰ کو ہر عہد و دور میں حقِ اجتہاد حاصل ہے اور اس کے سدِّباب نے تاریخ اسلام کے تمام مصائب کی بنا ڈالی۔

مخالفت

محضر میں اس امر کی تصریح کر دی گئی ہے کہ امام عادل کو مجتہدین اور علما سے اونچی اختلافی امور میں زیادہ اختیارات ہوں گے جو نصِ شرعی کے مخالف نہ ہوں اور عوام کی خوشحالی کا باعث ہوں۔ لیکن عملی طور پر ان شرائط کی پابندی نہ ہوئی۔ خوشامدی درباری ہر نئی بات کی تائید میں کوئی روایت، کوئی قول شرعی نقل کر دیتے اور بہت سی ایسی باتیں اختیار ہو گئیں جو نہ نصِ شرعی کے موافق تھیں نہ "ترفہ عالمیان" کا ذریعہ۔ اس کے علاوہ چونکہ اب عبادت خانے کی محفلوں میں مسلمان علما کے ساتھ ساتھ پرتگیز پادری، پارسی دستور اور جین سادھو بھی شریک ہو گئے تھے اور ان میں سے پرتگیز پادری اسلام اور بانیٔ اسلام کے خلاف نہایت ناگوار باتیں کہتے تھے، اس لیے ملک میں دربار کی نئی روش کے خلاف بڑی بے چینی پھیل گئی۔ شیخ نور الحق محدث زبدۃ التواریخ میں لکھتے ہیں کہ عبادت خانے کے مباحثوں سے بادشاہ کا مقصد فقط تحقیقِ حق اور حصولِ ثواب تھا (در حقیقت مطمح و مقصود آنحضرت بجز طلبِ حق و اصابت ثواب نہ بود) لیکن اہلِ ہوا و نفس نے اس طرح بحثیں کیں اور قدیم کے پایۂ اعتبار میں اس طرح کمی آگئی کہ لوگوں میں غلط فہمیاں پھیل گئیں اور حقیقتِ حال سمجھے بغیر بادشاہ سے بدظن ہو گئے۔ (عامۂ خلق حقیقتِ حال را نفہمیدہ و بہ کنہہ سخن نرسیدہ در مقامِ تفرقہ و تنزلِ خیالات و اوہام افتادہ ساعت بساعت ایں اخبار نقل مجالس کامے (؟) دیگر افتادند"۔ یہ چیز بقول شیخ نور الحق "باعثِ نسلت اقدامِ عوام ضعیف الاعتقاد و نفرتِ خاطرِ اتراک سادہ لوح آمد"۔

اسی زمانے میں آئینِ دربار میں بھی ایسی جدتیں ہوئیں، جن سے ان بدگمانیوں کو

تقویت ہوئی اور بالآخر یہ حالت ہوئی کہ جونپور کے شیعہ قاضی القضاۃ ملا محمد یزدی نے علی الاعلان فتوے دیا کہ بادشاہ بدمذہب ہو گیا ہے اس پر جہاد واجب ہے۔ دربار میں قطب الدین خاں کوکہ اور شہباز خاں کنبوہ نے بڑی جرأت سے بادشاہ کو سمجھایا، لیکن حکومت اور اقتدار کا نشہ بُرا ہوتا ہے۔ بادشاہ اور بگڑا قطب الدین خاں اور شہباز خاں کو بُرا بھلا کہا۔ (منتخب التواریخ جلد دوم ص ۲۷۳) اور ملا محمد یزدی اور معز الملک قاضی القضاۃ بنگالہ، وغیرہ کو ایک بہانے سے بُلا بھیجا۔ جب وہ آگرے سے دس کوس پر فیروز آباد پہنچے تو حکم بھیجا گیا کہ ان دونوں کو الگ کر کے دریائے جون کے راستے گوالیار پہنچا دو۔ جہاں ملکی مجرموں کا جیل خانہ تھا۔ پھر حکم ہُوا کہ ان کا خاتمہ کر دو۔ چنانچہ پہرہ داروں نے ایک ٹوٹی کشتی میں ڈالا اور تھوڑی دور آگے جا کر گرداب کی گود میں دفن کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد سابق قاضی القضاۃ، قاضی یعقوب مانکپوری جنھوں نے متعہ کے خلاف فتوے دیا تھا اور اب بنگالہ میں قاضی تھے، بُلائے گئے۔ ان کے لیے بھی گوالیار کے قلعہ میں قید کرنے کا حکم ہُوا لیکن دوسروں کی طرح انھیں بھی رستے میں ہی عدم کے تہ خانے میں بھیج دیا گیا۔

مخدوم الملک اور صدر الصدور کو ۱۵۸۰ء کے شروع میں حج اور خیراتی کاموں کے بہانے حجاز میں جلاوطن کر دیا گیا اور حکم ہُوا کہ بلا اجازت نہ آئیں۔ انھیں جانا ناگوار تھا۔ جب ملک میں بادشاہ کے خلاف عام برہمی اور اضلاع شرقی میں بغاوت پھیلی تو وہ غلط امیدوں کے نشے میں سرشار بلا اجازت واپس آ گئے۔ لیکن ان کے یہاں پہنچنے تک مخالفت دبا دی گئی تھی۔ مخدوم الملک تو واپسی پر ڈر سے ہی احمد آباد گجرات میں[1] وفات پا گئے۔ (۱۵۸۲ء)۔

---

[1] ملا عبداللہ از بیمناکی قالب تہی کردہ بود۔ (اکبر نامہ جلد سوم ص ۳۸۰) مشہور یہ تھا کہ زہر دیا گیا۔ نعش خاموشی سے لیجا کر خاندانی قبرستان میں دفن کر دی گئی۔ اس کی نسبت معلومات نہیں ہیں لیکن مخدوم کے صاحبزادہ شیخ عبدالکریم چشتی جو حرمین میں والد کے ساتھ تھے۔ لاہور کے قریب نول کوٹ میں مدفون ہیں۔ ان کی وفات ۱۶۲۵ء میں ہوئی۔ انھوں نے فصوص الحکم کی شرح لکھی (بزرگان لاہور از نامی ص ۲۰۱)

شیخ عبدالنبی کا انجام زیادہ حسرتناک ہُوا۔ انھیں گرفتار کر کے فتح پور سیکری لایا گیا۔ بادشاہ نے سخت باتیں کہیں اور خود بھرے دربار میں ان کے مُنہ پر مُکا مارا۔ شیخ بھی ایک قاعدے، وقار اور جُرأت کے بزرگ تھے۔ جل کر کہنے لگے کہ چُھری سے کیوں نہیں مارتے؟ اس کا بھی سامان ہو گیا۔ انھیں دیر تک بندی خانے میں قید رکھا گیا۔ وقت رخصت خیرات کے لیے جو ستر ہزار روپیہ دیا گیا تھا۔ اس کا حساب کتاب ہوتا رہا اور اسی دوران میں انھیں گلا گھونٹ کر ختم کر دیا گیا۔

بدایونی کا غصہ اب بھی ختم نہ ہُوا۔ شیخ کی نئی تاریخ لکھی اور کہا "بحق واصل شد"۔ بقول آزاد "(کنب بھنگ) اور (بحق واصل شد) کے لفظ کو دیکھو کہ اس میں کیا کام کر گئے ہیں۔ چاہو یہ سمجھ لو کہ ذاتِ حق کے ساتھ واصل ہو گئے چاہو یہ کہو کہ امرِ حق کو پہنچ گئے"۔

مشہور مخالفوں کے شہید کرانے کے علاوہ اکبر نے پنجاب کے با اثر علما کو جن کا سرغنہ مخدوم الملک کو سمجھا جاتا تھا (علمائے پنجاب کہ عمدۂ ایشاں مخدوم الملک بود") اور جو غالباً مذہبی معاملات میں زیادہ راسخ الخیال تھے، ملک کے مختلف حصّوں میں منتشر کر دیا گیا۔ مثلاً بدایونی قاضی صدرالدین جالندھری لاہوری کی نسبت لکھتا ہے: "زمانیکہ اکابرِ لاہور را نامزد و باطراف کردہ، ہر یکے را در شہرے بر منصبے منصوب گردانیدند او را قاضی بندر بھروچ از ولایت گجرات ساختہ فرستادند"۔ وہ بھروچ میں فوت ہُوا۔ قاضی عبدالشکور کو "جلا وطن" کر کے جونپور کا قاضی مقرر کیا گیا، لیکن ابھی وہ الٰہ آباد پہنچے تھے کہ جونپور کی قضاۃ کسی اور کو مل گئی۔ قاضی عبدالشکور معزول ہو گئے اور چونکہ لاہور واپس جا نہیں سکتے تھے، اس لیے الٰہ آباد ہی میں تعلیم و تدریس میں مشغول ہو گئے۔

لاہور اُن دنوں علم و فضل کا بڑا مرکز تھا۔ ملتان اور تلنبہ کی ویرانی کے بعد وہاں کے بیشتر علما یہاں آئے اور ایران و ترکستان کے علما کی پہلی بڑی منزل بھی لاہور تھا۔ بدایونی نے پنجاب کے علما کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ لیکن کسی وجہ سے اس نے شیخ منوّر بنی اسرائیل کا تفصیلی ذکر نہیں کیا، جو ایک اہلِ علم خاندان کے چشم و چراغ،

کئی کتابوں کے مصنف اور اکبر کی تعزیری کوششوں کا نشانہ تھے ۔ ہم آب کوثر میں لکھ چکے ہیں کہ حضرت نور قطب عالم پنڈوی کے خلیفۂ اعظم شیخ حسام الدین مانکپوری کے ایک مرید حضرت شاہ کاکو نے موجودہ لنڈا بازار لاہور کے علاقے میں ایک مدرسہ اور خانقاہ قائم کی تھی ۔ عہدِ اکبری میں یہ مدرسہ عروج پر تھا اور صدر مدرس شیخ کاکو کے فرزند شیخ اسحٰق کاکو تھے ۔ اُنھوں نے طویل عمر پائی اور بقول بدایونی سو سال سے زیادہ عمر پا کر ۹۹۶ھ/۱۵۸۸ء میں انتقال کیا ۔ لاہور کے اکثر علماے مشہور ان کے شاگرد تھے ۔ ان میں سے شیخ سعد اللہ بنی اسرائیل خاص طور پر ممتاز تھے ۔ شیخ منور شیخ سعد اللہ کے بھانجے اور شاگرد تھے ۔ گلزارِ ابرار میں ان کے حالات بڑی تفصیل سے درج ہیں ۔ ان میں غلو اہر پسندی اور شان خود نمائی بہت تھی ۔ لیکن ان کی علمی خدمات بھی قابلِ قدر ہیں ۔ انھوں نے قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی بحرِ مواج کا عربی ترجمہ کیا ۔ تفسیر درالنظیم کے عنوان سے قرآن کریم کی آیتوں اور سورتوں کی ترتیب واضح کی ۔ طوالع ۔ بدیع البیان اور قصیدہ بردہ کی شرحیں لکھیں ۔ فقہ میں وہ مخدوم الملک سے بھی زیادہ کڑے تھے ۔ حق صریح کے عنوان سے ایک رسالہ لکھا جس میں مخدوم الملک کی اس تحریر کی تردید کی کہ سب کنندگان رسول اکرمؐ کی توبہ قبول ہو سکتی ہے ۔ (غالباً متھرا والے برہمن کے مقدمہ کے ضمن میں یہ چیزیں لکھی گئی ہوں گی) ۔ ۱۵۷۷ء میں مالوہ کے صدر مقرر ہوئے ۔ لیکن پھر معتوب ہو گئے ۔ پانچ سال گوالیار کے قلعے میں قید رہے ۔ آپ کی تمام کتابیں، جو کم و بیش ڈیڑھ ہزار جلدیں تھیں، شاہی کتب خانے میں داخل ہو گئیں ۔ بڑا ظلم یہ ہوا کہ ان کے ساتھ آپ کی تصانیف بھی ضائع ہو گئیں ۔ فقط درالنظیم بچ گئی، جو قید خانے میں مصنف کے پاس رہ گئی تھی ۔ قید خانے سے نکلنے کے بعد باقی وقت آگرے میں بڑی عسرت میں گزار کر ۱۶۰۲ء میں وفات پائی ۔ آپ کے صاحبزادے شیخ کبیر نے پھر سے خاندانی روایات کو

لہ اخبار الاصفیا میں جو ابوالفضل کے بھانجے عبدالصمد کی تالیف ہے، اسحٰق کاکو اور قاضی صدر الدین لاہوری کو مخدوم الملک مولانا عبداللہ سلطانپوری کا شاگرد لکھا ہے ۔

زندہ کر دیا اور بدایونی کی منتخب التواریخ میں ان کا ذکر ہے۔

اکبر نے کئی بزرگوں کو مکاری اور حیلہ سازی سے کسی مقدمے یا داد فریاد کے بغیر شہید کروا دیا، لیکن جن مشکلوں سے اسے سابقہ پڑا وہ ختم نہ ہوئیں۔ اس کے عقائد کے خلاف عام شورش پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ ونسنٹ سمتھ لکھتا ہے:۔

۱۵۸۱ء کا سال اکبر کی زندگی کا نازک ترین سال تھا۔ ملا محمد یزدیؒ نے ۱۵۸۰ء کے شروع میں اکبر کے خلاف فتوے دیا تھا اور اس زمانے میں بہار اور بنگال میں اس کے خلاف جو بغاوت ہو گئی تھی، وہ ابھی تک نہ تھمی تھی بلکہ ٹوڈر مل جو اسے مٹانے گیا تھا، خود منگھیر میں محصور ہو گیا۔

اس کے علاوہ جو لوگ اکبر کی بداعتقادی سے نالاں تھے، انھوں نے فقط صوبجاتی بغاوت پر اکتفا نہیں کی بلکہ عملی طور پر اس بات کی کوشش کی کہ کسی طرح اکبر کو تخت سے برطرف کر کے اس کی جگہ اس کے بھائی مرزا محمد حکیم حاکم کابل کو ہندوستان کا بادشاہ بنا دیں۔ اس تحریک کے محرک غالباً جونپور کے جاگیردار خان معصوم خاں تھے، جن کی خط و کتابت مرزا حکیم سے تھی۔

اکبر نے عملی بغاوت کا تو خاتمہ کر دیا، لیکن عبادت خانے کے مباحثوں کی جو خبریں باہر آ رہی تھیں، ان کے خلاف ایک عام برہمی جاری تھی۔

اسباب مخالفت

ابوالفضل نے اکبر نامہ کے ایک سیر حاصل باب میں بالتفصیل ان اعتراضات کو گنایا ہے جو بادشاہ کے متعلق لگائے جاتے تھے اور ان اسباب کا بھی ذکر کیا ہے، جن سے ان غلط فہمیوں کو سہارا ملتا تھا۔ اگر ابوالفضل کے عام انداز تحریر اور اس نقطۂ نظر کو جو ایک مشرقی مطلق العنان بادشاہ کے درباری مؤرخ کو اختیار کرنا پڑتا تھا، ذہن میں رکھیں تو غالباً اس موضوع پر سب سے جامع اور سب سے منصفانہ تبصرہ یہی ہے۔ ابوالفضل کو بہرکیف بادشاہ کا نقطۂ نظر پیش کرنا تھا، لیکن مخالفین پر لعن طعن کرنے کے باوجود اس نے ان کا نقطۂ نظر بھی پوری طرح پیش کیا ہے جس کی ایک درباری مورخ کو کوئی ضرورت نہ تھی اور ایک آدھ جگہ تو ایسا خیال ہوتا ہے کہ

آئینِ دربار کی پابندی کرتے ہوئے وہ طریقے سے شاہی روش سے اپنی علحدگی
ظاہر کر رہا ہے۔ مثلاً جہاں وہ بادشاہ سے دعوئے الوہیت منسوب ہونے کا ذکر کرتا
ہے، وہ اس غلط فہمی کی بنا یہ بتاتا ہے کہ جب نصیری اور حلولی طریقے کے بعض لوگوں نے
بادشاہ کو "مظہرِ حق" قرار دے کر گفتگو شروع کی تو بادشاہ نے طریقۂ صلحِ کل کی بنا پر ان
تبے سرفرگویانِ آشفتہ عقل و ہرزہ سرایانِ پریشان مغز" کو چنداں سرزنش نہ فرمائی۔
جس سے بے سمجھ۔ بدنہاد، بدخواہ غلطیوں میں مبتلا ہوئے اور ان کے کذب و افترا کو
عام شہرت ہوئی۔

بادشاہ پر دوسری تہمت دعوئے پیغمبری کی تھی کہ بادشاہ ہمیشہ نئے نئے آئین
وضع کرتا اور چہار چمن دین و دنیا کو سیراب کرتا اور مشکوک اور اختلافی معاملات کی گتھیاں
سلجھاتا تھا۔ اس کے علاوہ قدیمی روش کے خلاف اس کا خطبہ پڑھنا اور "منبرِ راہنمونی"
پر قدم رکھنا بھی غلط اندیشی میں تقویت کا باعث ہوا۔ جب بادشاہ کے پاس ان
غلط بیانیوں کا ذکر ہوتا تو وہ انھیں اہمیت نہ دیتا اور بارہا کہتا: "سبحان اللہ در تنگنائے
خاطرِ ناداں چگونہ مے درآید کہ امکانی حدوث آمود درماندہ طبائع نسبت الوہیت بجود
دہد" اور تہمت پیغمبری کی نسبت بھی کہتا کہ اتنے بڑے پیغمبر آئے ہیں جنھوں نے ہزاروں
معجزوں کے ساتھ اظہارِ نبوت کیا ہے۔ اس پر بہت زمانہ گزر گیا۔ ان کے ماننے والوں
کی تعداد بڑھتی گئی۔ لیکن انکار کرنے والے اب بھی انکاری ہیں۔ ان حالات میں مجھے
کیسے اس طرح کا خیال ہوسکتا ہے اور لوگوں کو اس کا کس طرح گمان ہوسکتا ہے۔
"مرا چنیں سگالش چساں در صفوتکدۂ ضمیر راہ یابد و ظاہر نگاہانِ صورت پرست را ایں
تبہ خیالی چرا سراسیمہ دارد" اس کے باوجود بادشاہ ان لوگوں کو اس خیال سے سرزنش
نہ کرتا۔ کہ ملامت اور الزام سے بھی صاف دلوں کی اصلاح ہوتی ہے۔ (از آنجا کہ
ملامت کشی دلفنر بندی در دلہائے صافی فروغِ دیگر بخشند۔ سرزنش آں تیرہ رایانِ
نور افزا نباید کرد)۔

بادشاہ پر تیسرا الزام یہ تھا کہ وہ دینِ احمدی کی قدر نہیں کرتا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ

بادشاہ دانا دل وسعت مشرب، عام شیوۂ کرم وشفقت اور وسیع سلطنت کی بنا پر گروہا گروہ انسانوں کو دوست بناتا تھا اور ہر دین ومذہب کے اہلِ تحقیق سے مطالب دینی اور مقاصدِ حقیقی کے متعلق گفتگو ہوتی تھی۔ لیکن بعضوں سے بیدانشی اور عدمِ تحقیق کی بنا پر مناسب جواب نہ ملتا تھا۔ بالخصوص اس دوران میں "فیلسوفانِ نصاریٰ" کی طرف سے ان مجالس میں متفقہا پر گرفت وگیر ہوئی اور بحث ومباحثہ برپا ہوا۔ جن لوگوں نے جھوٹی علمیت کے بڑے بڑے دعوے باندھ رکھے تھے۔ اُن سے ان علمی اور عقلی بحثوں میں تو کچھ بن نہ آئی لیکن انھوں نے لوگوں سے خفیہ خفیہ کہنا شروع کیا کہ ہمیں دین کا غم کھائے جارہا ہے اور بادشاہ نے جانبداری سے ہمارے جوابات کو قبول نہ کیا۔ ان لوگوں نے بے انصافی سے بادشاہ پر تہمتیں لگائیں اور یہ بھول گئے کہ بادشاہ خاندانِ نبوی کا کس قدر احترام کرتا ہے۔ سادات کو اس نے کیسے کیسے عہدے دے رکھے ہیں اور بوقتِ ملاقات کسی سیّد کے لیے روا نہیں رکھتا کہ وہ اس کے پاؤں پر سر رکھے۔

بعض کج بینوں نے بادشاہ کو شیعیّت سے مُتہم کیا۔ وجہ یہ تھی کہ جب مجالس شاہی میں دوسری قوموں کی طرح شیعہ سنی نقطہ نظر پیش کیا جاتا تو بادشاہ انصاف پسندی اور بے تعصبی سے جو رائے مضبوط ہوتی اُسے ترجیح دیتا۔

بیانے کہ باشد بہ حجت قوی   زنا فرخی باشد ار نشنوی

بادشاہ اس سلسلے میں فرقے کی قلت وکثرت اور اپنے بیگانے کا کوئی لحاظ نہ کرتا۔ لیکن کوتاہ بینوں نے بیہودہ گوئی شروع کی۔ انھوں نے ایرانیوں کی قدر ومنزلت کو (جو بیشتر شیعہ ہیں) بدگمانی کا سامان بنالیا اور تورانیوں کو جو درجہ حاصل ہے، اسے نظر انداز کر دیا۔

بعض ناپاک طینتوں نے بادشاہ کو "کیش برہمن" کا طعنہ دیا۔ وجہ یہ تھی کہ بادشاہ دیدہ ور اپنی فراخ حوصلگی سے دانشمند براہمنوں کو اپنے قریب جگہ دیتا اور "مصالح ملکی وافزونی حقیقت" کی بنا پر اس نے کئی ہندوؤں کا پایہ بلند کیا تھا۔ یاوہ گو لوگوں کے

جوش و غضب کا سرمایہ تین چیزیں تھیں۔ "نخستیں از فزونی شناسائی بارگاہ مقدس مجمع دانشوران ملل و نحل آمد و انساں جا کہ ہر آئین شائستگی چند باخود دارد۔ ہر کدام نصیبہ آفریں برگرفت و از فرطِ انصاف گزینی نکوہیدگی ہیچ طائفہ پردہ باف نیکوئی او نتوانست شد"۔ "دوم ہنگامہ صلح کل در پیشگاہ خلافت رونق پذیرفت و گروہا گروہ مردم باگوناگوں احوال کامروائے صورت و معنی گشتند"۔ "سوم تباہ سرشتی و کج گرائی فرومائگان روزگار"۔

اکبر نامہ کی ایک اور دلچسپ دستاویز اکبر کا وہ خط ہے جو اس نے اپنے خیالات کی توضیح میں ابوالفضل سے لکھوا کر عبداللہ خاں ازبک والئ ترکستان کو اگست ۱۵۸۶ء میں ارسال کیا۔ عبداللہ خاں نے ایک خط میں اکبر کو لکھا تھا کہ آپ کی نسبت پیغمبری بلکہ خدائی کے دعوے سننے میں آتے ہیں۔ اکبر نے جواب میں ایک طول طویل خط ارسال کر دیا جس کے دو مختلف مسودے اکبر نامہ اور انشائے ابوالفضل میں ہیں۔ اس خط میں بعض علماء سے دربار کی شکایت کی ہے کہ وہ نہ صرف عقل و خرد سے خالی تھے، بلکہ کلام مجید کی غلط ترجمانی کرتے تھے اور اس کی بنا پر شاہی اختیارات میں شرکت چاہتے تھے (وفرمانِ آسمانی و نامۂ جاودانی را کہ فرستادہ خدا و رسانیدہ پیغمبر است از شاہراہ گردانیدہ برنگِ دیگر وا مے نمایند و مجملاتِ نصوص را تاویلات و تسویلات نمودہ مے خواہند در فرمانروائی و کارگزاری شریکِ بادشاہی باشند) جب ان باتوں کی تحقیق اور اختلافی امور کی تفتیش کے دوران میں ظاہر بینوں کا پول کھلا اور وہ پایۂ اعتبار سے گر گئے تو انھوں نے حسد اور عداوت سے غلط افواہیں پھیلانی شروع کیں اور ہماری نسبت نبوت اور الوہیت کے دعوے منسوب کیے۔ ورنہ کہاں بندہ عاجز اور کہاں یہ دعوے!

عہدِ اکبری کے مذہبی مؤرخ

اکبر نے جب ۱۵۸۱ء میں مرزا حکیم کو شکست دے دی اور اضلاع مشرقی کی بغاوت فرو ہو گئی تو اس کے ارادوں اور منصوبوں کو روکنے والا کوئی نہ رہا۔ ان حالات میں اس نے جو طور طریقے شروع کیے اور احکام نافذ کیے وہ اکبر کی مذہبی تاریخ کا ایک رنج دہ حصہ ہیں لیکن

افسوس کہ معاصرانہ مؤرخین اور راویوں کے اختلافات کی وجہ سے حقیقت حال تک پہنچنا آسان نہیں۔ چونکہ ان مورخین کے بیانات پر ہی اس زمانے کی مذہبی تاریخ کا انحصار ہے، اس لیے ان کی تحریروں اور طریقِ کار کا جائزہ حقیقت حال کو پرکھنے کے لیے ضروری ہے۔

عہدِ اکبری کے واقعات کے عینی شاہد کئی تھے۔ مثلاً بخشی نظام الدین (مصنف طبقاتِ اکبری) ابوالفضل (مصنف اکبرنامہ و آئین اکبری) مُلّا عبدالقادر بدایونی (مصنف منتخب التواریخ) اسد بیگ (مصنف اکبرنامہ) شیخ عبدالحق محدث (مصنف تاریخ حقی) اور ان کے بیٹے شیخ نورالحق محدث (مصنف زبدۃ التواریخ) اور پرتگیز پادری جن کے تین وفود مختلف وقتوں میں آئے اور دربارِ اکبری سے مدتوں تک وابستہ رہے۔ ان میں سے مذہبی تاریخ کی تفاصیل کے راوی فقط تین ہیں۔ ابوالفضل۔ بدایونی اور پرتگیز پادری اور وہ اپنے بیان میں متفق نہیں۔ ابوالفضل اور دوسروں کے اندراجات میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اگرچہ ابوالفضل تقلیدی اسلام سے اختلاف ظاہر کرتا ہے (اور شیخ مبارک اور مخدوم الملک کے نقطہ نظر میں جو اختلاف تھا وہ محتاج بیان نہیں) لیکن وہ اکبر کے احکام اور اسلام میں کوئی تناقض نہیں بتاتا اور اس کی تصانیف میں بادشاہ کا کوئی ایسا حکم نہیں، جس سے اسلام کی مخالفت یا تحقیر ظاہر ہو۔ برخلاف اس کے بدایونی اور پرتگیز پادری یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اکبر مسلمان نہ رہا تھا بلکہ اسلام کا سخت دشمن تھا۔ مثلاً پرتگیز مشنری کہتے ہیں کہ بادشاہ نے یہ حکم دے دیا تھا کہ نئی مسجدیں تعمیر نہ ہوں۔ پرانی مسجدوں کی مرمت نہ ہو اور اس کے آخری ایام حکومت میں لاہور شہر میں کوئی مسجد نہ رہی تھی اور مسجدوں کو اصطبل بنا دیا گیا تھا۔ ایک اور صاحب لکھتے ہیں کہ اکبر نے عیسائی مذہب قبول کرنے کے لیے ایک کے سوا سب بیویاں اپنے درباریوں میں تقسیم کر دیں اور پرتگیز پادریوں سے وعدہ کیا کہ میں حج کے بہانے گوا آؤں گا اور وہاں عیسائی ہو جاؤں گا!

بدایونی میں اس طرح کی انتہائی بے سروپا باتیں نہیں، لیکن اکبر کے متعلق اس کا

نقطۂ نظر ابوالفضل کی نسبت پرتگیز پادریوں سے زیادہ قریب تھا ۔ اس نے دربار میں قدامت پسند گروہ کے مخالف کی حیثیت سے سر اُٹھایا تھا، لیکن جدت پسندوں نے جو تیز رفتاری اختیار کی، اس کا وہ ساتھ نہیں دے سکتا تھا ۔ ان کی قیادت کے لیے دوسرے لوگ آگئے، جو اختلافِ نقطۂ نظر کے علاوہ شاید ٹھوس علمیت میں بھی اس سے بڑھ کر تھے ۔ بدایونی کی اصل خوبیاں ادیبانہ تھیں ۔ عالمانہ نہ تھیں ۔ (وہ مذہبی طبقے کا ترجمان بنتا ہے، لیکن اصل روحانی خوبیوں یعنی تقویٰ، پرہیزگاری، مخالفوں سے انصاف، ظاہر اور باطن کی ہم آہنگی ۔ ان چیزوں کا تو اس نے دعوےٰ بھی نہیں کیا) دربار میں اس کے لیے جلنے اور کڑھنے کے سوا کچھ نہ تھا ۔ نئی صورتِ حالات سے اُسے اصولی اور ذاتی اختلاف تھا ۔ اس کی کتاب اکبر کے خلاف ایک چالاک بلکہ مکار وکیل استغاثہ کا بیان ہے ۔ غیر جانبدار منصف کا فیصلہ نہیں ۔ وہ ایک بلند پایہ ادیب، بے مثال نثر نگار اور نہایت ذہین انسان تھا ۔ بطور مورخ کے بھی (اس کی درشت کلامی اور واضح جانبداری کے باوجود) اس کا ایک خاص انداز اور خاص مرتبہ ہے ۔ اس کے ہاں صریح غلط بیانی کی شاید ہی کوئی مثال ملے ۔ لیکن معمولی حذف و اضافہ، قطع و برید، مواد کی ایک خاص ترتیب ۔ ذو معنی الفاظ کے استعمال (Passive Construction) ترکیب مجہولہ کی افراط، جس سے یہ پتا نہ چل سکے کہ کس سے کونسے خیالات یا حرکات منسوب ہیں ۔ مبہم اشارے کنایے ۔ ان سب کی مدد سے بدایونی نے ایک ایسی تصویر کھینچ دی ہے جو حقیقت کے مطابق نہیں ۔ اس نے بیسیوں ایسے احکام گنائے ہیں، جو اگر واقعی بادشاہ نے جاری کیے تو ان کا آئینِ سلطنت میں ذکر ہوتا ۔ اطرافِ مملکت میں ان کے اجرا کے احکام جاری ہوتے ۔ کوئی دُوسرا مورخ ان کا بیان کرتا ۔ غور کرنے سے خیال ہوتا ہے کہ ان میں کئی باتیں ایسی تھیں جو غالباً دربار میں گفت و شنید کی حد سے آگے نہ بڑھیں اور بعض فقط مریدانِ شاہی کی رہنمائی کے لیے تھیں ۔ کئی مذہبی اور تاریخی امور ایسے ہیں، جو عبادت خانے کے مباحثوں میں فریقین نے بیان کیے، لیکن بدایونی ان کا ذکر ایسے کرتا ہے گویا وہ

بادشاہ کے خیالات کا اظہار ہیں۔ اُن احکام کی جو واقعی جاری ہوئے، بدایونی اس طرح قطع و بُرید کر کے اور ایک خاص نقطۂ نظر کی تائید میں پیش کرتا ہے کہ اس کے باقی اندراجات کی صحت پر بھی شبہ ہونے لگتا ہے۔ مثلاً اکبر طریق تعلیم میں اصلاح کرنا چاہتا تھا اور ابوالفضل نے اس کی تفصیلات دی ہیں، جن کا مذہبی خیالات سے کوئی لگاؤ نہیں۔ لیکن بدایونی کے نزدیک وہ بھی اکبر کی اسلام دشمنی کا ایک کرشمہ ہے "عربی خواندن و دانستن آں شر و فقہ و تفسیر و حدیث و خواندن آں مطعون و مردود و نجوم و حکمت و طب و حساب و شعر و تاریخ و افسانہ رائج و مفروض"۔ بعض جگہ حقیقتِ حال واضح نہ کر کے اور صرف مبہم اور التزامی اشارے کنائے سے غلط فہمیوں کا سامان کیا ہے۔ بدایونی نے کئی اقوال کو شہرت دی۔ جن کی نسبت اسے پتا تھا کہ غلط ہیں، لیکن چونکہ وہ اس کے نظریے کی تائید کرتے تھے انھیں درجِ کتاب کیا اور جو حقیقی چیزیں اس کی نظریوں سے مخالف تھیں۔ انھیں یا تو نظر انداز کیا یا ان کی توجیہ و تاویل کی یا انھیں اس طرح توڑ مروڑ کر پیش کیا کہ مثبت کے بجائے منفی پہلو نمایاں ہو۔ مثلاً جہاں تک توجیہہ و تاویل کا تعلق ہے۔ فیضی کی تفسیر کلام مجید اور مثنوی نل دمن کا نعتیہ حصہ یہ دو چیزیں ایسی تھیں، جو چھپ نہ سکتی تھیں، اور فیضی کے خلاف بدایونی نے جو کچھ کہا تھا اس کی قطعی تردید کرتی تھیں اس لیے اُس نے تفسیر کے متعلق تو کہا کہ "یہ برائے شستن بدنامی کرتا روزِ جزا بصد آب شستہ نگردد" لکھی گئی اور نعت کے متعلق کہا کہ وہ "نزدیک بموت بہ مبالغہ و الحاح بعضے آشنایاں" درج ہوئی۔ جہاں تک مخالف مطلب واقعات نظر انداز کرنے کا تعلق ہے۔ ان کی تفصیل دینے میں یہ دشواری ہے کہ بدایونی کے سوا دُوسرے مؤرخین نے مذہبی تاریخ پر توجہ نہیں دی۔ مورخینِ عہد کی نظر عام دستور کے مطابق، سیاسی اور جنگی تاریخ پر رہی ہے ماسوائے ابوالفضل کے جو صلح کل کی اُونچی کرسی پر براجمان تھے۔ چنانچہ اکبر نے شعائر اسلامی کی جہاں پیروی کی ہے اس کی انھوں نے تفصیل نہیں دی، لیکن اس کے باوجود معاصرانہ تصانیف میں مذہبی تاریخ کی چند ایسی اہم جزئیات مل جاتی ہیں جو بدایونی جیسے مذہبی مورخ کو (اگر اس کا

ایک خاص نقطہ نظر نہ ہوتا) ضرور درج کتاب کرنی چاہیے تھیں، لیکن جنھیں اس نے مخالف مطلب سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ مثلاً محضر کے واقعہ اور زیارت اجمیر کے بعد ملا نظام الدین بخشی کا بیان ہے کہ واپسی پر بادشاہ نے حکم دیا کہ "ایک طولانی خیمہ (بارگاہ) مسجد کے نام سے دولت خانے کے پاس کھڑا کیا جائے اور اس میں وہ پانچ وقت با جماعت نماز ادا کرتے تھے"۔ اسی طرح ۱۵۸۶ء کے ضمن میں (یعنی محضر سے سات سال بعد) ملا نظام الدین لکھتے ہیں۔ "خود بدولت کوچ بکوچ تا دہلی در ہیچ جا مقام نفرمودند طواف مزار فائض الانوار پدر بزرگوار نمودہ تمامی مزارات بزرگواراں را زیارت فرمودہ فقراؤ صالحین دہلی را با انعام عام سرسبز و شاداب ساختند۔ ہمدریں در دہلی ہلالِ شوال نمایاں گشتہ، صباح پنج شنبہ لوازم عید بجا آوردہ از دہلی کوچ فرمودند"۔ یہ عید جس کے "لوازم" اکبر بجالایا۔ ۵ استمبر ۱۵۸۶ء کو تھی۔

سالِ محضر (۱۵۷۹ء) کے بعد جب بدایونی کہتا ہے کہ قیامت آگئی اور اکبر اسلام سے باغی ہو گیا۔ اس کا نماز پنجگانہ کے لیے بارگاہ (مسجد) کا قیام اور نمازِ با جماعت کی ادائگی، اور اس کے سات سال بعد بزرگانِ دہلی کی زیارت اور لوازم عید کی بجا آوری ایسی چیزیں نہ تھیں کہ ایک غیر جانبدار مورخ انھیں نظر انداز کر دیتا۔

اسی طرح پرتگیز مشنریوں کی تحریریں ہیں۔ وہ گوا سے اس امید پر آئے تھے (اور یہاں اکبر گوا اور لزبن میں مسلسل یہ اطلاعیں بھیج رہے تھے) کہ اکبر اسلام کا دشمن ہے اور بپتسمہ لینے کے لیے تیار۔ اس لیے ان کے خطوں میں اکبر کے موافقِ اسلام ہونے کی روئداد ڈھونڈنا بے کار ہے، لیکن ان رپورٹوں میں بھی ایک آدھ چیز ایسی مل جاتی ہے، جسے بدایونی نے نظر انداز کر دیا!

مثلاً جب اکبر ۱۵۸۱ء میں حکیم مرزا کے تعاقب میں کابل گیا تو پرتگیز مشنری ہمرکاب تھے۔ ان کا بیان ہے کہ اس سفر میں اکبر نے عیسائیت پر کئی اعتراض کیے۔ ابوالفضل نے بھی انجیل اور تورات کی نسبت ٹیڑھے سوال پوچھے اور جب ایک پرتگیز پادری نے کہا کہ انجیل میں غذائے روحانی ہے تو ابوالفضل نے

کہا کہ وہ تو قرآن شریف میں بھی ہے[۱]۔

جب کابل سے واپسی پر شاہی لشکر درہ خیبر کے قریب علی مسجد کے پاس پہنچا، جس کی نسبت بعضوں کا کہنا تھا کہ خلیفہ چہارم حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ وہاں تشریف لائے تو پرتگیز پادریوں کے بیان کے مطابق اکبر نے وہاں نماز ادا کی۔

جب سب لوگ دارالخلافہ میں واپس پہنچ گئے تو پادریوں نے علما کے ساتھ پھر مناظرہ کرنا چاہا۔ بادشاہ کو یہ بہت ناپسند تھا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ علما پھر ہار جائیں گے۔ بالآخر پادریوں کے اصرار پر ایک مباحثہ منعقد ہُوا۔ پادری کہتے ہیں کہ جب انھوں نے علما کو لاجواب کر دیا تو بادشاہ نے بحث میں قدم بڑھایا اور علما کی طرف سے ان کے اعتراضات کا جواب دیا۔ پادری بادشاہ سے اب اس قدر مایوس ہو گئے کہ انھوں نے واپسی کی اجازت چاہی۔ بادشاہ سیاسی مصلحتوں کی بنا پر انھیں روکنا چاہتا تھا، لیکن ایک پادری اپریل ۱۵۸۲ء میں اور دوسرا فروری ۱۵۸۳ء میں واپس چلا گیا۔

پرتگیز پادریوں کا دوسرا وفد ۱۵۹۲ء میں آیا۔ اس کے زیادہ حالات معلوم نہیں۔ لیکن اتنا یقینی ہے کہ اس وفد نے صورتِ حالات پہلے سے بہت بدتر پائی اور بہت جلد واپس بُلا لیا گیا۔

بدایونی اس مزاحمت کا کیسے ذکر کرتا جو پادریوں کے کام میں اکبر اور ابوالفضل کی طرف سے پیش آرہی تھی، لیکن شاید اس سے بھی زیادہ دلچسپ اس کا واقعات کو موڑ توڑ کر پیش کرنا ہے یا اکبر کے خلاف ایسی باتیں کہنا ہے، جن پر غور کیا جائے تو نظر آتا ہے کہ کسی اور چیز کی پردہ داری ہو رہی ہے۔

مُلّا صاحب ۹۸۹ھ کا ذکر کرتے ہیں۔ یعنی اس وقت جب اکبر بے راہروی کی قریباً ساری منزلیں طے کر چکا تھا۔ گاؤ کشی بند ہو چکی ہے۔ ریش تراشی عام ہے۔ بعض

---

[۱] Akbar and the Jesuits (Payne) P35

خوشامدی دنیادار "دینِ اسلام مجازی و تقلیدی" کو ترک کرنے کے عہد نامے لکھ رہے عوام میں مشہور ہوگیا ہے کہ بادشاہ نبوّت بلکہ الوہیت کا دعوےٰ دار ہے۔ مُلّا شیری کے اس شعر کو لکھے ہوئے ایک عرصہ گزر چکا ہے ؎

بادشاہ امسال دعویٰ نبوت کردہ است
گر خدا خواہد پس از سالے خدا خواہد شدن!

اور مُلّا صاحب اس سال کے ضمن میں لکھتے ہیں۔ "دریں ایام بجماعت نماز فرافان کہ ہر پنج وقت برائے خاطر جماعت در دربار می گفتند۔ برطرف شد"۔ یعنی کم از کم اس زمانے تک تو عین دربار میں پانچ وقت تک نماز باجماعت ادا ہوتی تھی!!

اسی طرح انھوں نے ایک جگہ حکیم مصری کا قطعہ نقل کیا ہے۔ جن دنوں اواخرِ حکومت میں اکبر دیر تک لاہور میں مقیم تھا تو اس نے قلعہ لاہور میں دیوانِ عام کے سامنے ایک مختصر سی مسجد بنوا دی تاکہ جو لوگ کارِ ضروری میں مشغول ہوں انھیں نماز کے لیے دُور نہ جانا پڑے۔ اس پر حکیم مصری نے ازراہِ تمسخر کہا ؎

شاہِ ما کرد مسجدے بنیاد	ایہا المومنین مُبارک باد
واندریں نیز مصلحت دارد	تا نمازاں گزاند بشمارد!

مُلّا صاحب اور حکیم صاحب جو چاہیں حاشیے چڑھائیں، لیکن خیر اُن کے اس بیان سے ضمناً اس بات کا پتا لگ گیا کہ اس زمانے میں جب عیسائی مؤرخین کہتے تھے کہ شہر لاہور میں کوئی مسجد نہیں رہی، اور سب مسجدیں ہاتھی گھوڑوں کے اصطبل بنا دیے گئے ہیں۔ اس وقت خود اکبر نے قلعہ شاہی میں ایک مسجد تعمیر کرائی تھی!!

بدایونی نے بیانِ واقعات میں اس طرح قطع و برید اور کج نگاہی سے کام لیا ہے کہ اس کی روئداد کو اکبر کی کامل اور صحیح مذہبی تاریخ سمجھنا انصاف کے خلاف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اکبر کے مذہبی آئین و احکام میں فقط وہی باتیں مستند اور اہم ہیں، جنھیں درباری مؤرخ نے آئینِ اکبری میں درج کیا۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو ویسے ہی ظاہر ہے کہ ان باتوں کو کیسے اہمیت دی جا سکتی ہے اور مستند

مانا جاسکتا ہے، جن کے ماننے والا ان کا اقرار نہ کرے۔ وہ آئین ہی کیا، جن کا اعلان نہ کیا جائے اور وہ احکام ہی کیا، جو نافذ نہ ہوں اور ملک کے دستور العمل میں درج ہو کر عمال و حکام کی راہنمائی کا ذریعہ نہ بنیں۔ دوسرے آئین اکبری کو بغور دیکھنے سے صاف نظر آجاتا ہے کہ اس میں حقیقت حال کو چھپانے کی کوئی کوشش نہیں ہوئی۔ اس میں مذہبی امور کے متعلق کئی مہمل، احمقانہ اور شعائر اسلامی کے مخالف احکام ہیں اور اکبر کو مورد اعتراض کرنے والی باتیں ہیں۔ اس کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہے کہ جن چیزوں کا اکبر قائل تھا اور انھیں جاری کرنا چاہتا تھا، وہ آئین اکبری میں موجود ہیں۔

اکبر کے مذہبی آئین و احکام کی نسبت معتبر معلومات تو آئین اکبری میں ملیں گی۔ ان کے علاوہ جو کچھ بدایونی کی تاریخ یا پرتگیز پادریوں کی تحریروں میں ملتا ہے وہ یا تو غلط بازاری افواہوں پر مبنی ہے یا ان نیم پختہ تجاویز کا رنگ آمیز بیان ہے جو بادشاہ یا اس کے معتمد درباریوں کے سامنے پیش ہوئیں، لیکن احکام کا درجہ نہ حاصل کر سکیں۔

مریدانِ شاہی

علما کے محضر نے اختلافی مسائل میں فیصلہ کرنے کا حق اکبر کو دے دیا تھا۔ جب ہندو، جینی اور پارسی، سادھو اور اہل علم مذہبی مجالس میں شریک ہوئے تو ان میں سے بعض نے بادشاہ کو جگت گرو کہنا شروع کیا اور اپنی کتابوں سے ثابت کیا کہ وہ اقوام و ادیان کے اختلافات مٹائے گا۔ خوشامدی درباریوں نے ہاں میں ہاں ملائی۔ اکبر کو یہ نظریہ ویسے بھی پسند ہو گا کہ دنیوی حکومت کے ساتھ ساتھ وہ روحانی راہنمائی بھی کرے۔ چنانچہ بالآخر اس نے لوگوں کو مرید کرنا اور ان کے لیے احکام جاری کرنا شروع کر دیا۔ مریدانِ شاہی کے اس نظام (سلسلہ) میں اکبر کا جو مقام تھا اور اس کی بنا پر جو افواہیں عوام الناس میں پھیلیں ان کی بنا پر مشہور ہو گیا کہ اکبر نبوت کا دعویٰ دار ہے اور شیری نے لکھا ہے

شاہِ ما امسال دعویٰ نبوت کردہ ست   گر خدا خواہد پس از سالے خدا خواہد شدن

یہی شیری بعد میں اکبر کے مرید ہوئے اور مثنوی ہزار شعاع بہ طریق نذر پیش

کی۔ شاید انھوں نے دیکھا ہو گا کہ اکبر نبوت کا دعویدار نہیں اور یہ مریدی کا سلسلہ محض عقیدت و خوشامد کا اظہار ہے۔ بدایونی بھی جو آخر عمر میں اکبر کے مذہبی خیالات کا سب سے بڑا مخالف ہو گیا تھا اکبر سے لفظی دعوئے نبوت منسوب نہیں کرتا بلکہ اکبر کے احکامات کا ذکر کر کے لکھتا ہے: "این ہمہ باعثِ نبوت شد اما بہ لفظِ نبوت"[1]۔

اکبر نے دعوئے نبوت سے ہمیشہ انکار کیا لیکن مریدانِ شاہی کا جو سلسلہ اس نے شروع کیا اور اس کے جو عجیب و غریب قواعد و ضوابط مقرر ہو گئے ان میں صدہا گمراہیاں اور ہزارہا غلط فہمیوں کی گنجائش تھی اور صرف اکبر ہی نہیں بلکہ اس کے مشیروں مثلاً علامی ابوالفضل کو تاریخ افسوس اور ملامت سے یاد کرتی ہے۔

اکبر (اور اس کے خوشامدی درباریوں) نے جو نظام ترتیب دیا تھا انگریز مورخین سے دین الٰہی کا نام دیتے ہیں لیکن ابوالفضل جو بدایونی کے بیان کے مطابق اس طریقے کا خلیفۂ اعظم تھا یہ نام استعمال نہیں کرتا اور اکبر کے روحانی کارناموں کو آئین اکبری میں "آئین رہنموئی" کے تحت درج کرتا ہے۔ ابوالفضل مختلف مذاہب کے بنیادی اتحاد کا ذکر کر کے لکھتا ہے کہ جب بنی نوع انسان کی خوش قسمتی سے ایسا وقت آ جاتا ہے کہ حق پرستی کا دور دورہ ہو تو بادشاہ دوراں ہی کو پیشوائی جہانِ معنی بخش دی جاتی ہے جو جلوہ زارِ کثرت میں وحدت کا سر رشتہ ڈھونڈ لیتا ہے۔ اکبر بادشاہ کو یہ "پرتو آگہی" میسر تھا۔ اور اگرچہ اس نے اپنے آپ کو ایک عرصہ تک اس کام سے علیحدہ رکھا۔ لیکن جو مشیتِ ایزدی ہو وہ پوری ہو کے رہتی ہے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ اب تو "راہنموئی" کو رضامندیِ ایزدی سمجھ کر ہدایت کا دروازہ کھول رکھا ہے اور تشنہ لبوں کو سیراب کرتا ہے۔ بہت سے اربابِ تجرد مثلاً سنیاسی، یوگی، صوفی اور حکیم اور اربابِ تعلق مثلاً سپاہی، سوداگر اس کی بدولت حقیقت سے ہمکنار ہیں۔ وہ اس کی نگاہ اور فیض انفاس سے وہ فیوض حاصل کرتے ہیں جو چلوں سے بھی حاصل نہیں ہوتے۔ بادشاہ لوگوں کو مرید ہونے سے روکتا ہے اور بارہا ان سے

---

[1] منتخب التاریخ جلد دوم ص۲۷۔

کہتا ہے کہ مجھے کیا حق حاصل ہے کہ خود کہیں پہنچے بغیر دوسروں کی رہنمائی کا دم بھروں، لیکن لوگ نہیں مانتے اور ہزاروں اس کی مُریدی میں داخل ہو گئے ہیں۔ جب کوئی بہت اصرار کرتا ہے اور بادشاہ اس کی پیشانی پر اخلاص و راستی کا نشان دیکھتا ہے تو اس کی بیعت قبول کرتا ہے۔ بیعت اتوار کے روز جب آفتاب نصف النہار پر پہنچ، لی جاتی ہے۔ مُرید اپنی دستار ہاتھ میں لیے بادشاہ کے قدموں پر سر رکھ دیتا ہے۔ گویا بزبانِ حال یہ کہتا ہے کہ میں نے خود آرائی اور خویشتن گزینی کو ترک کیا۔ عاجزی اختیار کی اور دارُو دے جاں بخش کی تلاش میں آیا ہوں۔ بادشاہ دستِ نوازش دراز کرکے طالب کو اُٹھاتا ہے۔ اس کی دستار کو اس کے سر پر رکھ دیتا ہے اور ایک شست خاص جس پر اسمِ اعظم "اللہ اکبر" کندہ ہے، اسے عطا کرتا ہے۔

بادشاہ نے اپنے مریدوں کے لیے جو آئین و اصُول وضع کیے تھے، وہ ابوالفضل کے بیان کے مطابق حسبِ ذیل تھے:-

"آئینِ ارادت گزیناں ہنگام دیدار ہم آنکہ یکے اللہ اکبر گوید و دیگرے جل جلالہٗ سراید۔ ہمگی قدسی بسیج آنست از سرچشمۂ ہستی فراموشی نیارند۔ بیاد کرد الٰہی سیراب دل و تر زبان و شیریں کام باشند و نیز بفرمائش آن پیشوائے آگاہ دلان ہشیار خرام آنشے کہ مردم پس از فرو شدن بکار گیرند در زندگی سرانجام دہند و توشۂ واپسیں سفر پیش رواں شود۔ ہر سال روزِ ولادت انجمن برسازند و خوان گوناگوں نعمت برکشند۔ دست نوال برکشایند و زادرہِ دراز آمادہ گردد و نیز بآئینِ مقدس در نا خوردن گوشت ہمت گمارند و بہ بعضے در ہماں ہنگام کہ ہمگنان را بار دارند دست بدنیا لائیند۔ لیکن در ماہ ولادت خود نزد آں نشوند و نیز پیرامونِ کشتۂ خود نگردند۔ در خوردن آں نشابند و با قصاب و ماہی شکار و گنجشک گیر ہم کاسگی نکنند۔ و آبستن و کہن سال و نازائی و نارس نپیوندند"

مُریدوں کی بیعت کا جو طریقہ تھا، اُسے ابوالفضل نے وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔ اس میں کسی تحریری بیعت نامہ کا کوئی ذکر نہیں، لیکن چونکہ سارا سلسلہ بادشاہ سے اظہارِ عقیدت کا تھا، آگے چل کر بعض وفا شعاروں نے اس میں نئی جدتیں پیدا کیں۔ بدایونی

سنہ ۱۵۸۹ء کے واقعات کا ذکر کرکے سندھ کے حاکم مرزا جانی کی نسبت، جسے عبدالرحیم خانخاناں نے شکست دی تھی۔ اور جو اب یہ علاقہ اکبر کے صوبہ دار کی حیثیت سے حاصل کرنا چاہتا تھا، لکھتا ہے، "تا کار بعد از دہ دوازدہ سال بجائے رسید کہ اکثر مخاذیل چوں مرزا جانی حاکمِ تتہ و دیگر اہلِ ارتداد بخط خود نوشتہ دادند باین مضمون ہذہ صورت۔ منکہ فلاں بن فلاں باشم۔ بطوع و رغبت و شوقِ قلبی از دینِ اسلام مجازی و تقلیدی کہ از پدران دیدہ و شنیدہ بودم۔ ابرا، و تبرّہ نمودم و در دینِ الٰہی اکبر شاہی در آمدم و مراتب چہار گانہ اخلاص کہ ترکِ مال و جان و ناموس و دین باشد قبول کردم و ایں خطوط کہ لعنت نامہ بیش نبود۔ بمجتہد شرع جدید سپردہ باعثِ اعتماد و تربیت ایشاں مے شد۔" لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ یہ خوشامد اور درباداری کے کرشمے تھے یا ممکن ہے کہ جانی خاں کو صحیح صورتِ حالات سے واقفیت نہ ہو اور اس نے عام افواہوں پر قیاس کرکے نئے گل بوٹے پیدا کیے ہوں، لیکن ابوالفضل کے تفصیلی بیان سے ظاہر ہے کہ بادشاہ کی طرف سے اس طرح کے بیعت نامہ کا کوئی طریقہ جاری نہ ہوا تھا۔

اکبر کے احکام عمومی

اکبری طریقہ اور مروجہ مذہب اسلام میں سب سے وسیع خلیج مریدان شاہی کے ان شعائر و اعمال میں نظر آتی ہے، جنھیں ہم نے گزشتہ اوراق میں آئین اکبری سے نقل کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بسا اوقات بعض معمولی پیر اور مرشد بھی اپنے مریدوں کو (کچھ وقت کے لیے یا دائمی طور پر) گوشت خوری ترک کرنے اور اس طرح کے دوسرے احکام دے دیتے ہیں یا طریقِ بیعت اور اظہارِ عقیدت کے مختلف آئین بنا لیتے ہیں اور انھیں کوئی اسلام سے باہر نہیں سمجھتا اور آج سے تین سو سال پہلے تو ان معاملات میں بہت آزادی تھی۔ ایک مسلمان بادشاہِ ملک کی طرف سے اس طرح کے احکام و آئین ضرور قابلِ اعتراض ہیں اور ضعفِ اسلام کا ذریعہ، لیکن بہر کیف وہ ایک مختصر طبقے کے لیے تھے۔ اکبر کے خلاف سب سے وزنی اعتراض یہ ہے کہ اس نے اس طرح کے احکام کو اپنے مریدوں کے لیے محدود نہیں رکھا اور صرف شخصی پسند اور عقیدہ پر اکتفا نہیں کی بلکہ شعائرِ اسلام

کے خلاف کئی احکام ایسے تھے، جن کی بجا آوری کے لیے سرکاری عمّال مثلاً کوتوال اور صوبیدار کی مدد لی جاتی۔ آئینِ اکبری میں صوبیدار (یا سپہ سالار) کے نام جو ہدایتیں ہیں، ان میں اس سے کہا گیا ہے:۔

"دیدبانی نماید کہ ارادت گزینان ہنگام درخور خرد "اللہ اکبر" گوید و بزرگ جل جلالہ برخوانند۔ کمتر از یک سالہ گوسفند و بُز را غذا انسازد و از روز زاد خویش یک ماہ از گوشت خوردن پرہیزد۔ کشتہ نخورد را نخورد۔ آبستے کہ مردم پس فروشندگان بکار بند۔ ہر سال روز زاد سامان نماید و تہیدستاں را کامیاب گرداند۔

برگ عیشے بگور خویش فرست   کس نیارد ز پس، تو پیش فرست

چوں آفتاب از بُرجے بہ بُرجے خرامد (یعنی آدھی رات اور دوپہر کے وقت) ہر سپاس گزاری برنشیند و برائے ہشیار نمودنِ غنودگانِ بےخبری توپ و بندوق را بہ خروش آورد عنفوانِ نور افروزی آفتابِ عالم تاب (یعنی علی الصبح) و نیم شب کہ آغاز بر شدن آں باشد نقارہ برنوازد و آگہی فزاید۔

صوبیدار کو یہ بھی حکم تھا کہ

و نیایش آفتاب و چراغ خورشید معبودی و آتش پرستی نداند۔

کوتوال کے نام جو ہدایتیں تھیں، اس میں کہا گیا تھا کہ گائے بھینس گھوڑے اور اونٹ کو ذبح نہ کیا جائے۔ بارہ سال سے کم عمر بچے کا ختنہ نہ ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔

و چناں کند کہ گاؤ و گاؤمیش و اسپ و شتر تسلیخ نہ شود.... و نگذارد کہ کم از دوازدہ سالہ را ختنہ کنند۔ چوں ازیں پایہ بگذرد دید و گذارد۔ ملنگاں و قلندراں و دکانداران ریاکار را بیروں کند یا از روش باز دارد و آگاہ باشد کہ دریں میاں گوشہ نشینے ایزد پرست آزردہ نگردد و سادہ برہنہ پایان بادیۂ طلب را گزندے نرسد۔ قصاب و صیاد و غسال و کناس را از مردم جدا بنگاہ دہد و مردم را از آمیزۂ ایں تلاں سیہ دل برکنار دارد۔ و ہر کہ با جلاد ہم کاسہ شود۔ بدستِ او آسیب رساند دا گر کوچ او بانگشت (؟) و گورستان بیرون شہر مغرب سویہ قرار دہد۔

> وارادت گزینان را در سوگواری از کبود پوشی باز دارد و به سُرخ پوشیدن کوشش نماید۔ فروردین ماہ تا شرف (یعنی فروردین کی اُنیسویں) ہمگی آبان ماہ، روز ہائے تحویل (یعنی غرۂ ماہ شمسی) شانزدہم آں، الٰہی جشنہا، روز گرفتگی آفتاب و ماہ، یکشنبہ آدم را از تسلیخ باز دارد۔ و شکاری جانور و بیمار را تا گزیر روا دارد۔ و جہانشکری بیرون شہر کشد۔ و الٰہی جشنہا را کار بندد۔ شب نوروز و شب شرف (یعنی نوزدہم فروردین) چراغاں افروزند۔ سر آغاز کہ آبستن عید باشد و بہ روز آں ہر پاسے کوس را بلند آوازہ گردانند و در تقویمات پارسی و ہندی تاریخ الٰہی را رواج دہد۔

بیاہ شادی کے معاملے میں اکبر کے بعض خیالات اسلامی طریقِ کار سے مختلف تھے۔ اس نے توی بیگی کا ایک محکمہ جاری کر کے دو ذمہ دار آدمیوں کو اس امر کے لیے متعین کیا تھا کہ وہ دولہا دُلہن کے متعلق معلومات حاصل کریں۔ ابوالفضل آئینِ کدخدائی کے ضمن میں لکھتا ہے :۔

> (و زناشوئی) در زن و مردِ نارسیدہ (نابالغ) نکوہیدہ شمارد..... و در خور شادولان نزدیک نامزاد داند و بہ زبان قدسی چناں رود۔ آنکہ در باستان دختر بتوام ندادے نقل بندگاں را زبان بند گرداند۔ تقلید پیشگان احمدی کیش را بیگانی بین اہمام بہ شورش در نیاورد۔ سر آغاز دیں بہ عنوان آفرینش مردم زاد ماند..... و افزوں از یک زن بہر کس نہ پسندد۔ و شورش طبیعت و آشوب خانہ اندیشد۔
>
> و دو فرہیدۂ کم آز برگزارد۔ یکے از حال مرداں پژوہش کند و دیگرے در کارِ زنان دیدبانی کند و ہر دو را توی بیگی نامند و بسے باشد کہ ایں شغل شگرف بیکے باز گردد۔

ان قواعد و آئین کے علاوہ اکبر کی اپنی زندگی میں کئی باتیں ایسی تھیں، جو مسلمانوں کو ضرور کھٹکتی ہوں گی۔ مثلاً اس کا گوشت خوری سے حتے الوسع اجتناب اس کے تورانی اور ایرانی درباریوں کو ضرور عجیب معلوم ہوتا ہو گا۔ خیر ترکِ گوشت خوری مذہبی نقطۂ نظر سے گناہ نہیں۔ لیکن سورج اور روشنی کے متعلق اکبر کے جو معمولات تھے، انھیں عام مسلمان آفتاب پرستی کہتے تھے۔ اور واقعی اکبری طریقِ کار میں اس غلط فہمی

کی بڑی گنجائش تھی۔ ابوالفضل آئینِ چراغ افروزی کے ضمن میں لکھتا ہے:۔

گیہاں فروز روشنِ دل نورد وستی را ایزد پرستی شمارد۔ وستائشِ الٰہی اندیشد۔ نادان تیرہ خاطر داور فراموشی و آذر پرستی خیال کند۔ خرد پژوہ ژرف بیں نیکو داند۔ چوں از روز یک گھڑی ماند۔ خدیو عالم اگر سوار باشد۔ فرود آید واگر غنودہ بیدار گردد و از سپہر نقاب جمال جہاں آرا یکسو شدہ ظاہر را ہم رنگ باطن گرداند۔ و چوں روشنی بخشِ جہان نور خویش برگیرد، خدمتگزاران سعادت گرائے در دوازدہ لگنہائے زریں و سیمیں کافوری شمعہا افروختہ، در پیشگاہ حضور آمدند و یکے از سرائندگانِ شیوا زبان شمع در دستِ ایزدی سپاس برگزارد۔ و گوناگوں نمط سراید۔ و سپس دعائے دولت روز افزوں بہ خواند۔ و انجام سخن بدان کند۔ گیتی خدیو نیایش و نیاز را پایہ برتر نہد۔ و تازہ فروغ دریوزہ کند۔

اکبر کو معلوم تھا کہ سورج اور روشنی کے متعلق اس کے جو معمولات تھے، ان کو آذر پرستی کہا جاتا تھا اور اس نے اپنے طریقِ کار کی توضیح کرنی چاہی بلکہ اس کی تائید میں کلام مجید کی سورۃ الشمس کا حوالہ دیا۔ آئینِ اکبری کے آخر میں اکبر کے جو کلمات ابوالفضل نے جمع کیے ہیں، اس میں لکھا ہے:

"مے فرمودند۔ خورشید والا را بہ فرمانروایان عنایتے است خاص وازیں رو نیایشگری بدو نمایند والٰہی پرستش برشمرند و کوتاہ بین بہ بدگمانی درافتند..... واز نابینائی در احترام ایں چشمۂ نور کوتہی رود۔ و بر نیایشگر زبانِ بیچارہ برکشایند۔ اگر خرد را آفتے نرسیدہ سورۂ والشمس چرا از یاد رفت؟

ابوالفضل نے بھی نور کے احترام میں شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کا قول نقل کیا۔ "ہر کرا آفتاب فرو شود، اگر با چراغ نسازد چہ کند" لیکن ظاہر ہے کہ (اس قول کی غلط توجیہ سے قطع نظر) عامۃ المسلمین اکبر کے خیالات سے متفق نہ ہو سکتے تھے۔ اکبر کی عبادت کے جو اوقات تھے وہ بھی نرالے تھے اور سب سورج کی گردش سے متعلق تھے۔ ابوالفضل آئینِ شبار وزی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ خدیوِ عالم اگرچہ وقت

عبادت اور محاسبۂ روحانی میں صرف کرتے ہیں۔ "خاصہ سحرگاں کہ دیباچہ بہروزی و عنوان نور پاشی است و نیمۂ روز کہ فروغ آفتاب عالمتاب بجہاں روا در گیرد و سرمایۂ نشاطِ گوناگوں مردم آید و شامگاہ کہ مایۂ دہ روشنی ہا از چشم خاکیان پنہاں شود و نورِ دوستاں را سراسیمگی در گیرد و نیم شباں کہ آں روشنی افزاے انجمنِ ہستی رو بفراز نہد و غمزدگان تیرہ شب را نوید خوش دلی رساند"۔

تعظیم آفتاب نور کے متعلق اکبر کے معمولات غالباً پارسی مذہب سے ماخوذ ہیں۔ ہندوؤں کی بھی کئی رسمیں اختیار ہو گئی تھیں۔ مثلاً تلا دان۔ اسی طرح دیوالی کے موقع پر ہندو گائے کی پرستش کرتے ہیں۔ اکبر نے اپنی ہندو رعایا کو خوش کرنے کے لیے یہ شروع کیا کہ دیوالی کے روز کئی گاؤں کو سجا کر منگواتا اور "صید دلہا" کا اہتمام کرتا۔ "و روزِ دیوالی کہ اندریں جشنہائے ایں مرز است و گروہا گروہ ہندی بوم دراں روز بدو (گاؤ) نیایش نمایند۔ و بزرگ داشت آں را عبادت اندیشند۔ بفرمائش شاہنشاہی لختے آراستہ بہ نظر ہمایوں در آوردند۔ و صید دلہا شود"۔

مندرجہ بالا طویل اقتباسات سے دو باتیں ظاہر ہیں۔ ایک تو یہ کہ آئین اکبری کے مطابق بھی جو اعمال و اشغال مریدانِ شاہی کے لیے مدوّن ہوئے تھے۔ وہ بھی اسلامی نقطۂ نظر سے، بلکہ عقلِ انسانی کی رُو سے قابلِ اعتراض تھے۔ دوسرے اس طویل اقتباس سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اکبری بدعتوں کی تفصیلات دینے میں ابوالفضل نے مداہنت سے کام نہیں لیا۔ اُس کے ہاں وہ غیر مصدقہ افواہیں نہیں جنھوں نے (بقول شیخ نور الحق محدث ابن شیخ عبدالحق محدثؒ) عوام میں شہرت حاصل کر لی تھی۔ لیکن جو قابلِ اعتراض، بلکہ مضحکہ خیز طریقے مریدانِ شاہی وغیرہ کے لیے مدوّن ہوئے اور "آئینِ راہنمونی" کا جزو بن گئے، وہ آئینِ اکبری میں موجود ہیں ان شاہی احکام کی ابوالفضل جو تاویل و توجیہ کرتا ہے، وہ اسلامی نقطۂ نظر سے قابلِ قبول نہیں لیکن یہ خیال صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ اس نے اکبرنامہ اور آئینِ اکبری میں حقیقتِ حال کو چھپایا ہے۔

اکبر کے جو معمولات شعائرِ اسلامی سے متناقض تھے، ان کی تشریح و تاویل ہوتی اور ان کی مصلحتیں بیان کی جاتیں۔ اکبر اور ابوالفضل کے بیانات میں اسلام کی شکایتیں نہیں صرف مسلمانوں کے ایک گروہ کا شکوہ ہے۔ دوسرے مذہبوں مثلاً ہنود کا اس سے زیادہ شکوہ ہے۔ مسلمانوں میں صرف اربابِ تقلید کا۔ اس کے علاوہ اکبر نے بعض تبدیلیاں جن کا وہ مذہب اسلام سے کوئی تعلق نہیں سمجھتا تھا۔ عام مسلمانوں کی تالیفِ قلوب کے لیے ترک کر دیں۔ (مثلاً ملاحظہ ہو تاریخِ الٰہی کے سلسلے میں ابوالفضل کا بیان) لیکن امورِ ملکی میں اکبر کا جو بنیادی طریقِ کار تھا، مسلمان اسے بھی ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ اکبر اور ابوالفضل اسے صلح کل کہتے تھے، لیکن یہ طریقہ فقط صلح کل اور رواداری کا نہ رہا۔ کئی مسلمان بادشاہوں (مثلاً کشمیر کے سلطان زین العابدین) نے مسلمان رہتے ہوئے کامل صلح کل اور رواداری کا طریقہ اختیار کیا۔ لیکن اکبر کا راستا دوسرا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ہندوستان کے مختلف الاقوام ملک میں بادشاہ ایسا ہونا چاہیے کہ ہندو اسے ہندو سمجھیں۔ مسلمان اسے مسلمان خیال کریں اور پارسی، جین اور عیسائی سب اپنا اپنا ہم عقیدہ تصور کریں۔ مسلمان امرا، علما اور عوام کو قدرتی طور پر یہ طریقِ کار ناپسند تھا۔ اس کے علاوہ اکبر نے آفتاب اور نور کی تعظیم و تکریم اور مریدوں کی معاشرت خوراک اور تدفین کے لیے جو انوکھے بلکہ مضحکہ خیز[1] طریقے اختیار کیے، انھوں نے بادشاہ سے

---

[1] ہمارا خیال ہے کہ ان مضحکہ خیز جدتوں میں سب سے زیادہ دخل بیربر کو تھا۔ یہ ایک قابلِ ذکر حقیقت ہے کہ بدایونی اس معاملے میں سب سے زیادہ ابوالفضل اور بیربر کو مطعون کرتا ہے، بلکہ بیربر کو خاص طور پر گالیاں دیتا ہے۔ ابوالفضل تو خیر اکبر کا خلیفۂ اعظم اور شاہی خیالات کا ترجمان تھا۔ لیکن بدایونی کا اکبر کے گمراہ کرنے والوں میں بیربر کو اس قدر اہمیت دینا بے وجہ نہیں۔ ہمارے خیال میں اکبر کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ اس نے بیربر کی شخصیت کا غلط اندازہ لگایا۔ اس برہمن کو جو ہندو بیانات کے مطابق، ایک کٹر ہندو تھا۔ ایک مخلص مریدِ شاہی سمجھا اور اس کے مشوروں اور رفاقت کو اہمیت دے کر یہ خیال کیا کہ ان کے اختیار کرنے سے سارے ہندو شاہی چیلے بن کر موحد

[باقی اگلے صفحے پر]

مسلمانوں کا دل کھٹا کر دیا اور بالآخر یہ حالت ہو گئی کہ جو خلافِ اسلام عمل و عقیدہ بادشاہ سے منسوب ہوتا اور جو کچھ بادشاہ کے خلاف کہا جاتا۔ عوام اسے درست تسلیم کر لیتے۔

کیا اکبر نے ایک نیا مذہب جاری کیا؟

اکبر کی مذہبی تاریخ کا اہم سوال یہ ہے کہ کیا اس نے ایک نیا مذہب جاری کیا؟ ہم نے اس کے جاری کردہ قواعد و آئین کو تفصیل سے منضبط کر دیا ہے اور قارئین خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ انھیں ایک مذہب کہا جائے یا ایک طریقہ۔ اس فیصلے میں اختلافِ رائے کی گنجائش ہے۔ شیخ عبدالحق محدث جیسے متقی اور محتاط بزرگ تو اسے نبوت کہتے تھے۔ لیکن اتنا یقینی ہے کہ اکبر نے کبھی نبوت کا دعوےٰ نہیں کیا۔ اکبری طریقے کا سب سے بڑا مخالف بدایونی ان احکام کا ذکر کر کے لکھتا ہے "ایں ہمہ باعثِ دعویٔ نبوت شُد۔ امّا نہ بہ لفظِ نبوت"۔ پرتگیز پادری ۱۵۹۴ء میں لکھتے ہیں کہ "بادشاہ سب مذہبوں سے کچھ نہ کچھ اخذ کرنا چاہتا ہے اور مشہور ہے کہ وہ اپنا مذہب جاری کرنے والا ہے"۔ یعنی کم از کم اس وقت تک اس نے ایک نیا مذہب جاری نہیں کیا تھا اور اس کے بعد تو یقیناً اکبر نے کوئی خاص نئی بات نہیں کی۔ حال کے مؤرخین اکبر کو ایک نئے مذہب دینِ الٰہی کا بانی سمجھتے ہیں۔ لیکن عہدِ اکبری کی تواریخ میں یہ نام اس صورت میں کہیں نہیں ملتا۔ بدایونی نے فقط مرزا جانی خاں حاکم تتہ کی ایک تحریر کی نقل کی ہے جس میں "دینِ الٰہی اکبرشاہی" کا ذکر ہے۔ لیکن یہ تحریر خوشامدی عہدہ داروں کی جدت طرازی تھی۔ اس امر کا کوئی ثبوت نہیں کہ اکبر کے مُرید عام طور پر اس طرح کی تحریر لکھ کر دیا کرتے تھے (ہمارے نزدیک یہ خیال ہی کہ خانِ اعظم یا میراں صدر جہاں یا حضرت موسےٰ پاک شہیدؒ نے جو بقول

[بقیہ فٹ نوٹ صہ ۱۲۱]

ہو جائیں گے۔ حالانکہ اس معاملے میں دیانتدار اور اکبر کے اصل بہی خواہ ہندوؤں کا جو طرزِ عمل تھا، اس کا ذکر ہم راجا بھگوان داس اور راجا مان سنگھ کے ضمن میں کریں گے۔ اکبر نے بیربر کی صلاحیتوں کا جو غلط اندازہ لگایا تھا' وہ اسی سے ظاہر ہے کہ اس نے اس مسخرے بھاٹ کو راجا کا خطاب دیا۔ اور اپنے دربار کا مہاکوی (ملک الشعرا) بنایا!

بدایونی حلقۂ ارادت شاہی میں داخل تھے، ایسی تحریر لکھ کر دی ہو گی کہ وہ رسمی اسلام کو ترک کر رہے ہیں، ناقابلِ قبول ہے)۔ یا اکبر یا ابوالفضل نے کہیں بھی شاہی احکام کو دینِ الٰہی کہا ہو۔ ابوالفضل نے سب احکام کے لیے "آئینِ رہنمونی" کی ترکیب استعمال کی ہے اور بدایونی بھی بالعموم مریدی ۔ ارادہ ۔ اخلاص اور روش اس طرح کے الفاظ استعمال کرتا ہے ۔ ہماری نظر سے بدایونی کی لکھی ہوئی کوئی عبارت ایسی نہیں گزری جس میں اس نے لفظ دینِ الٰہی اکبر یا ابوالفضل سے منسوب کیا ہو۔ زیادہ سے زیادہ اس نے یہ کہا ہے:

"درروشِ خود را بہ توحیدِ الٰہی موسوم ساختند۔" اور اس وقت بھی مریدانِ شاہی کا بہ صراحت ذکر تھا اور بتایا ہے کہ ان میں طبقۂ خواص کو "موافق اصطلاح جوگیاں" چیلہ کہتے تھے اور دوسرے (یعنی درشنیہ)، وہ تھے، جنھیں محل کے اندر بار نہ تھا۔ اور جو صبح کو جھروکے کے سامنے آکر کھڑے ہوتے تھےؔ۔ بدایونی یہ بھی کہتا ہے کہ مریدی کی اصل کشش منصب تھا اور اگرچہ بادشاہ اس خیال کو دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا تھا، لیکن کفارِ ہند کا معاملہ الگ تھا۔ ان میں زیادہ سے زیادہ مرید بنانے کی کوشش کرتے۔ دوسروں (مسلمانوں؟) میں سے جو اس کے خواہاں ہوتے، انھیں ڈانٹ ڈپٹ کرتے (وغیراز منصب وجز اخلاص کفایت دیگر منظور نبود۔ وہر چند بر رفع ایں قید مقید شدند با کفارِ ہند ۔۔۔۔ بس نتوانستند آمد و اقوام دیگر را ہر نوع کہ خواستند۔ مالش و کوشش دادند)۔

اکبری احکام کے لیے دینِ الٰہی کی ترکیب شاید پہلی مرتبہ دبستان مذاہب میں اکبر کی وفات سے کوئی ساٹھ ستر سال بعد استعمال ہوئی۔ سیر المتاخرین کے مصنف غلام حسین طباطبائی نے بھی بعد میں "مذہب الٰہی" کی ترکیب بے تعصبی اور طریقۂ صلح کل کے معنوں میں استعمال کی۔ (مذہبِ الٰہی کہ آسایشِ غیر متناہی خلق دراں بود تا عہدِ جہانگیر رواج داشت۔ باز از عہدِ شاہ جہان تعصب شروع شدہ در عہدِ عالمگیر شدت پذیرفت) لیکن جب اکبر کے متعلق معاصرانہ مواد اس قدر موجود ہے، اسے نظر انداز

---

[1] منتخب التواریخ جلد دوم صہ ۳۲۵ [2] ایضاً صہ ۳۳۹

کر کے بعد کے ایک اہل قلم کی تحریر کو جس کی اصل حال سے کوئی ذاتی واقفیت نہ تھی اہمیت دینا اصول فن کے خلاف ہے۔ بلاک مین نے سہو سے یا عیاری سے آئین اکبری کے پہلے انگریزی ایڈیشن میں "طریقہ" اور "روش" کا ترجمہ "دین الٰہی" کیا جو بعد کی درسی کتابوں میں رائج ہو کر مسلمات کی حیثیت اختیار کر گیا۔

ہمارے خیال میں کوئی وجہ نہیں کہ بلاک مین کی پیروی کی جائے اور ایک غلط فہمی یا غلط نمائی کو برقرار رکھا جائے۔ اکبر کے آئین و احکام کو اکبر اور ابوالفضل ہی نہیں، بدایونی بھی دین نہیں۔ روش یعنی طریقہ (cult) کہتا ہے۔ یہ ایک مذہب نہ تھا۔ ارادت و عقیدت کا سلسلہ تھا، جس کی بنیاد ماننے والوں کی کمزوریوں یعنی طمع اور خوشامد اور رائج کرنے والے کی خود فریبی و خود پسندی پر قائم تھی۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ مریدان شاہی، بالخصوص درشنیوں کا تھوڑا بہت سلسلہ اکبر کے بعد بھی جاری رہا اور فی الحقیقت جلال ملوکیت کا ایک کرشمہ تھا۔

اکبر نے مریدان شاہی کے طریقہ میں ہندوؤں کو پسند آنے والی کئی چیزیں داخل کیں۔ اور جیسا کہ بدایونی کہتا ہے، وہ اس طریقہ کو فقط "کفار ہند" میں رائج کرنے کے لیے کوشش کرتا۔ لیکن اگر برہمنوں اور سادھوؤں کے کہنے سے اکبر کو خیال ہو گیا تھا کہ ہندو زعماء و اکابر "جگت گرو" کے طریقے کو اختیار کر لیں گے تو اس میں اسے ناکامی ہوئی۔ کیونکہ شاہی درباریوں میں سے جن اٹھارہ آدمیوں نے یہ طریقہ اختیار کیا۔ ان میں فقط ایک ہندو تھا اور وہ بھی درباری مسخرہ بیربر! معاصرانہ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام سمجھ دار اور دیانتدار ہندوؤں نے اکبر کی خام خیالی کی مخالفت کی۔ ابوالفضل، راجا ٹوڈرمل کی جا بجا شکایت کرتا ہے کہ وہ مذہبی معاملات میں بڑا اکڑ تھا۔ راجپوت راجاؤں نے بھی جو مذہبی معاملات سے شاید اتنے واقف نہ تھے۔ اکبر کے نئے مذہب کو اختیار نہ کیا۔ جب اکبر نے اپنے طریقہ کے متعلق امرائے کبار سے مشورہ کیا۔ تو مخالفت کرنے والوں میں امیر الامرا راجا بھگوانداس پیش پیش تھا۔ اُس نے کہا کہ میں یہ ماننے کے لیے تیار ہوں کہ ہندو اور مسلمان دونوں مذہبوں میں خرابیاں موجود ہیں،

لیکن یہ تو بتایا جائے کہ ان سے بہتر فرقہ کونسا ہے تاکہ ہم اس کے قائل ہو سکیں۔ چنانچہ بدایونی، جس نے یہ گفتگو نقل کی ہے، لکھتا ہے کہ بادشاہ بھی لاجواب ہو گیا۔ (اللہ کے مستقول شدہ از شذرت گزشتند۱)۔

اس واقعہ کے چند سال بعد جب ۱۵۸۵ء میں راجا مان سنگھ بہار کا گورنر ہو کر جانے لگا اور اکبر نے خلوت میں خاص اظہار شفقت کر کے مریدی کا ذکر کیا تو اس نے صاف جواب دیا کہ حضور اگر مریدی سے مراد جاں نثاری ہے تو آپ دیکھتے ہیں کہ جان ہتھیلی پر لیے پھرتا ہوں۔ امتحان کی حاجت نہیں۔ اگر حضور کی مراد مذہب سے ہے تو ہندو ہوں۔ فرمائیے مسلمان ہو جاؤں۔ دُوسرا رستا مجھے معلوم نہیں کونسا ہے کہ اختیار کروں چنانچہ اکبر ٹال گیا۲۔

یہ سوال کہ اکبر کا جاری کردہ طریقہ ایک نیا مذہب تھا یا فقط ایک "روش" (ملاحظہ) اور "مریدی" "کا سلسلہ" اس لیے اہم ہے کہ اگر یہ ایک مذہب تھا تو نہ صرف اس کا بانی، بلکہ اس کے اختیار کرنے والے اپنے پُرانے مذاہب (مثلاً اسلام) سے خارج سمجھے جائیں گے۔ لیکن "مریدی" کے احکام اور ریاضتیں اصل مذہب پر مستزاد ہوتی ہیں۔ ان کے اختیار کرنے سے اصل مذہب۳ کا ترک لازم نہیں آتا۔ اگر اکبر کے جاری کردہ طریقے کو ایک علٰحدہ مذہب سمجھیں تو نہ صرف اکبر، بلکہ خانِ اعظم، میاں صدر جہاں اور کتنے دوسروں کی نسبت یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ دائرۂ اسلام سے نکل گئے تھے۔ یہ فیصلہ کرنا بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ اور بدایونی کے اندراجات بغور پڑھنے سے خیال ہوتا ہے کہ جو لوگ مریدوں میں داخل ہوئے تھے، انھوں نے ترکِ اسلام نہیں کیا تھا اور احکامِ اسلامی پر عامل تھے۔ مثلاً بدایونی تو لکھتا ہے کہ مُلتان کے مشہور

---

۱ منتخب التواریخ جلد دوم صہ ۳۱۳ ۲ منتخب التواریخ جلد دوم صہ ۳۶۴ ۳ مثلاً بیربر جیسے اکبری بدعتوں میں ابوالفضل سے کم دخل نہ تھا اور جو واحد ہندو درباری تھا جس نے مریدی کی سب منزلیں طے کی تھیں۔ اسے ہندو اپنے مذہب سے خارج نہیں سمجھتے۔

بزرگ حضرت موسےٰ پاک شہیدؒ بھی رسمی طور پر بادشاہ کے مریدوں میں شامل ہو گئے تھے

"و دریں ایام شیخ موسےٰ بعد از زہد و عبادت و وجاہت و مشیخت چندیں سالہ ارادت متعارف رسمی بہ پادشاہ آورد و شصتِ سپاہگری یافتہ و تسلیم نوکری کردہ داخل امرائے پانصدی شد۔ (منتخب التواریخ جلد سوم صہ ۹۲)

لیکن اسی صفحے پر بدایونی صاف لکھتا ہے کہ اگر شیخ موسےٰؒ بادشاہ کے حضور میں ہوتے اور نماز کا وقت ہو جاتا تو وہ دیوانخانۂ خاص و عام میں ہی اذان دے کر نماز شروع کر دیتے۔ اور کوئی انھیں کچھ نہ کہہ سکتا!

اسی طرح بدایونی کے بیان کے مطابق میراں صدر جہاں ۱۰۱۳ھ میں اپنے دو بیٹوں کے ساتھ "حلقۂ ارادت" میں داخل ہُوا، لیکن مکتوبات خواجہ باقی باللہ کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ اس سے پانچ چھ سال بعد یعنی اکبر کی زندگی میں، وہ حضرت خواجہؒ کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ اور انھوں نے اسے "ذکر" سکھانے کے بعد حضرت مجددؒ کے پاس "توجہ" کے لیے بھیجا۔

مندرجہ بالا مثالوں سے ہی ظاہر ہے کہ خواہ جانی بیگ جیسے مفتوح مخالف خوشامد کی خاطر کیا کہیں۔ مریدی اب عقیدت و وفاداری بتانے کا ذریعہ رہ گئی تھی اس سے ترکِ اسلام اخذ کرنا صحیح نہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ تمام سلسلہ اسلام کے ضعف کا باعث اور مسلمانوں کے لیے بڑا رنجدہ تھا۔ ملکی نقطۂ نظر سے بھی، سوائے اس کے کہ ایک باا‌ثر طبقہ کے دل مجروح ہوئے۔ اس سے کوئی نتیجہ مترتب نہیں ہُوا۔ حیرت ہے کہ اکبر جیسا بادشاہ جو اپنے دائرۂ عمل یعنی ملک گیری و ملک رانی میں اتنا سمجھدار اور فرض شناس تھا، خود پسندی اور خوشامد کا شکار ہو کر کیسی کیسی حماقتوں اور بوالعجبیوں کا مرتکب ہُوا۔ اور ابوالفضل کی نسبت کیا کہا جائے کہ عقل کے اتنے دعویٰ کے باوجود ان خام خیالیوں کی توجیہہ کرتا ہے اور ان کے لیے جواز فراہم کرتا ہے!

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی بالقابہ کا محاکمہ اکبر کے مذہبی خیالات کی نسبت اس کی

زندگی میں اختلاف رائے تھا اور عہدِ حاضر میں بھی یہ اختلاف باقی ہے۔ ہمارے خیال میں اس معاملے میں سب سے بچی تلی اور منصفانہ رائے پاکستان کے مشہور عالم اور مورخ ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی کی ہے، جنھوں نے اپنی کتاب The Muslim Community of the Indo-Pakistan Sub-continent میں اس موضوع پر تفصیلی تبصرہ کیا ہے۔ ہمیں ان کی رائے سے پورا پورا اتفاق ہے اور ہم متعلقہ اندراج کا ترجمہ اردو داں حضرات کی خاطر بپیشِ خدمت کرتے ہیں:۔

"دورِ حاضر کے مصنفوں نے اکبر کے مذہبی خیالات کی نسبت بہت کچھ لکھا ہے۔ بعض نے زیادہ تر بدایونی پر انحصار کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس نے اسلام بالکل ترک کر دیا اور ایک نئے مذہب کی بنا ڈالی۔ دوسروں کی رائے ہے کہ وہ مسلمان رہا۔ اور مذہب اسلام سے اس کا تجاوز (Deviation) اہم نہ تھا۔ یہ سچ ہے کہ بعض محققین نے بدایونی کے بیانات کو زیادہ وسیع مفہوم دیا ہے۔ اس کے لیے اس کے (مغربی) مترجمین ذمہ دار ہیں۔ بدایونی ایک ذہین اور چالاک (clever) اہلِ قلم تھا۔ اس میں اتنی قابلیت تھی کہ جو کچھ وہ کہے، اس سے زیادہ سمجھا دے۔ اس کے کئی اندراجات ذومعنی ہیں اور ان کا ترجمہ بڑا مشکل ہے۔ جہاں ایسی صورتِ حالات نہیں، وہاں بھی اس کی کتاب کے (انگریزی) ترجمے درست نہیں اور کئی اہم الفاظ، جن سے اس کے الزامی اندراجات میں کمی ہوتی ہے، چھوڑ گئے ہیں۔ بعض مصنفین نے پرتگیز پادریوں کے جن بیانات سے اپنی رائے کے لیے تائید حاصل کی ہے، ان بیانات کو غلط یا انتہائی طور پر مبالغہ آمیز ثابت کیا جا سکتا ہے لیکن یہ سب کچھ تسلیم کرنے کے بعد بھی، ان لوگوں کی رائے جو یہ سمجھتے ہیں کہ اکبر نے اسلام سے تجاوز نہیں کیا، صحیح نہیں۔ یہ سچ ہے کہ جان بوجھ کر ترکِ اسلام (کا اظہار) بہت خفیف ہے [It is true that of conscious abjuring of Islam there was very little.]

معلوم ہوتا ہے، اکبر کو یقین تھا کہ اسلام کا جو مفہوم اس کا تھا، وہ ان علما کی ترجمانی سے زیادہ معقول تھا۔ جن سے اس نے اختلاف کیا۔ عبداللہ خاں ازبک کے نام کے خط میں جب اس نے ترکِ اسلام کے الزام پر احتجاج کیا تو غالباً اس کا اظہار دیانتدارانہ تھا۔ اس کا ذہن پیچیدہ (Complex) تھا اور اس کی ذاتی تربیت نہ ہوئی تھی کہ وہ اپنے زاویہ ہائے نگاہ کے تناقض کو سمجھ سکتا۔ اس نے کئی ایسی چیزیں کیں بلکہ اس کے کئی معتقدات ایسے تھے، جن سے معمولاً آدمی دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ مثلاً آفتاب کے لیے اس کی تعظیم عقیدۂ توحید کے منافی ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے اس کا یہ خیال نہ تھا اور اس معاملے میں وہ اس ذہنی انتشار کو شاید انتہائی صورت میں پیش کرتا ہے، جو کئی مسلمانوں میں پایا جاتا ہے۔ (ص ۱۴۴۔ ۱۴۵)

اکبر کے آخری ایام

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی آگے چل کر لکھتے ہیں: "اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ۱۵۹۵ء کے بعد اکبر کی مذہبی بوالعجبیاں ٹھنڈی پڑ گئیں" (ص ۱۴۹)۔ مریدی کا سلسلہ غالباً آخر تک جاری رہا۔ لیکن اب یہ بادشاہ سے وفاداری اور عقیدت کا اظہار زیادہ تھا مذہبی عقائد اور طریقوں کا کم۔ پروفیسر چوہدری کا جنھوں نے دینِ الٰہی کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ خیال ہے کہ ۱۵۹۷ء میں جب قلعۂ لاہور میں نوروز کا جشن منایا جا رہا تھا آسمان سے آگ برسی (بجلی پڑی!) جس سے شاہی سائبان اور بہت سا ساز و سامان بھی جل گیا اور بڑا نقصان ہوا۔ اس صاعقۂ آسمانی کو بادشاہ کی خود پسندی اور غلط روی کی سزا سمجھا گیا۔ بادشاہ پر بھی اس کا بڑا اثر ہوا اور اس کی انانیت اور مطلق العنانی میں کمی آ گئی۔

فیضی کی تفسیر غیر منقوطہ (۱۵۹۳ء)

بظاہر ڈاکٹر قریشی اور پروفیسر رائے چوہدری کی رائے قیاس پر مبنی ہے، لیکن قرائن سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ اور متعدد شواہد ایسے ہیں، جن سے خیال ہوتا ہے کہ ہوا کا رُخ بدل چکا تھا۔ فیضی نے

۱۵۹۳ء میں کلام مجید کی تفسیر غیر منقوط مکمل کی ہے جس میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کی دو معاصرانہ سوانح عمریوں (زبدۃ المقامات اور حضرات القدس) کے مطابق حضرت مجدد نے فیضی کی مدد کی۔ حضرت مجدد کے استاد مولانا یعقوب صیرفی نے اس کی تقریظ لکھی۔ خود بدایونی کے بیان کے مطابق لاہور کے مشہور عالم "اعلم العلما" میاں جمال تلویؒ نے (جن کی استدعا پر حضرت مجدد الف ثانی نے وحدت الوجود کی وضاحت کی۔ اور وحدت الشہود کا فلسفہ پیش کیا) انہوں نے بھی تفسیر میں فیضی کا ہاتھ بٹایا۔ ("تفسیر شیخ فیضی را اکثرے اصلاح دادہ و مرتوجا ساختہ") یہ تمام تفسیر عامۃ المسلمین کے خیالات کے مطابق ہے۔ مقدمہ میں حمد الٰہی کے بعد رسولِ اکرمؐ کی تعریف ہے، جس کا اردو ترجمہ حسب ذیل ہے:-

"اصل مقصود و مراد صرف اللہ ہے۔ اس کے بعد رسول ہیں۔ جن کو اس نے عالم کی اصلاح کے لیے بھیجا ہے۔ وہ مراد تک پہنچانے والے ہیں۔ ان کی تعداد کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں سب سے پہلے آدم اور آخری محمد صلعم ہیں۔ جو رسولوں میں سب سے کامل، اسرار کے سب سے زیادہ جاننے والے، احوال میں سب سے زیادہ قابلِ تعریف، کمالات میں سب سے بلند، ولا میں سب سے اکرم، سب سے اونچے پرچم والے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ والسلام ہیں۔ آپ ہی کے لیے حمد کا لوا ہے۔ اور آپ کا مقام محمود ہے۔ اُن کا لوا اہلِ ولا کا کمال اور ان کی دعا آسماں کی الواح کا نقش ہے۔"

ناظرین اس اندراج کو پڑھیں۔ اور خیال کریں کہ یہ اس شخص کی تحریر ہے، جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ نبوت کا منکر تھا۔ جس کی وقتِ وفات کا بھی ذکر کرتے ہوئے بدایونی لکھتا ہے۔ "از بس تعصب کہ در وادیِ الحاد و انکار داشت"۔ اور یہ بھی یاد رکھیں کہ رسولِ اکرمؐ کے متعلق مندرجہ بالا عبارات اس وقت لکھی گئی۔ جب (بقول بدایونی) ان کا نام لینا جرم قرار دیا گیا تھا۔ اور یہ تفسیر اس زمانے کی یادگار ہے جب (بقول بدایونی) "فقہ و تفسیر و حدیث و خوانندۂ آں مطعون و مردود" قرار دیے جا چکے تھے!

ل ملاحظہ ہو معارف دسمبر ۱۹۶۵ء میں جناب محمد سالم قدوائی کا مضمون تفسیر سواطع الالہام۔

بدایونی کو نظر آرہا تھا کہ ان کے بیانات کی تردید کے لیے پیشتر جزو کی تحریری دستاویز موجود ہے۔ اس لیے وہ یہاں بھی چھری چبھوتے ہیں اور فیضی کے ذکر میں لکھتے ہیں:-

"و تفسیر بے نقط برائے سستی بدنامی کہ تار و جزء الصد آب دریا شستہ نگردد در عین حالت مستی و جنابت مے نوشت۔ و سگاں آں را از ہر طرف پائمال ساختند" اہل انصاف اس کا خود فیصلہ کر لیں کہ حضرت مجدد یا مولانا جمال تلوی اس تفسیر کی تیاری میں ہاتھ بٹاتے۔ یا شیخ یعقوب صیرفی اس کی تعریف کرتے۔ جو بقول بدایونی "حالت مستی و جنابت" میں لکھی گئی اور جسے "کتے ہر طرف پامال کرتے پھرتے تھے" لیکن بدایونی کے بیان سے کم از کم یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ اب "شستن بدنامی" کا وقت آگیا تھا۔ اور ہوا کا رُخ بدلا ہوا تھا!

تفسیر بے نقط ۱۵۹۳ء میں مکمل ہوئی۔ اگلے سال فیضی نے مثنوی نل دمن لکھی، جس میں "پونے دو سو شعر کی نعت مع کیفیت معراج اس نزاکت اور لطافت اور بلند پروازی کے ساتھ لکھی ہے کہ انشا پردازی اس کے قلم کو سجدہ کرتی ہے"۔

ابوالفضل اور اکبر کا بگاڑ (۱۵۹۷ء)

فیضی کی وفات ۵ اکتوبر ۱۵۹۵ء کو لاہور میں ہوئی۔ اکبری طریقے میں خلیفۂ اعظم ابوالفضل تھا۔ اس کے ساتھ بھی کچھ اس طرح کی واردات ہوئی جو بدلے ہوئے حالات پہ روشنی ڈالتی ہے۔ ابوالفضل اکبر کا شاید سب سے وفادار اور سب سے زیادہ معتمد علیہ ملازم تھا۔ وہ اکبر کو بے حد عزیز تھا، لیکن اب یکایک دونوں میں اس طرح کی بدگمانیاں اور ناچاقیاں پیدا ہوئیں کہ ابوالفضل نے دربار جانا بند کر دیا بلکہ وہ خود اکبر نامہ میں بتاتا ہے کہ ایک عرصے تک تو وہ سوچتا رہا کہ وہ خودکشی کر لے یا سب کچھ چھوڑ کر خانہ بدوش ہو جائے!

یہ صورتِ حالات اکبر کے قیام لاہور کے آخری سال میں رونما ہوئی اور ابوالفضل کے مخالفوں نے شہزادہ سلیم کو شکر رنجی کا ذریعہ بنایا۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ وہ وفاداری اور خاموشی سے خدماتِ شاہی میں اس طرح مگن تھا کہ اس سے شاہزادہ کی خدمت میں حاضر ہونے اور لوازماتِ ادب و ظاہرداری بجا لانے میں کچھ کوتاہی ہوئی۔ اس نے

اپنی کوتاہیوں کی جو وضاحت کی وہ قبول نہ ہوئی بلکہ بادشاہ نے بھی ان شکایتوں کو وزن دیا۔ حتیٰ کہ ۲۱ مئی ۱۵۹۵ء کو ابوالفضل اس حد تک گرفتہ خاطر تھا کہ اس نے دربار جانا بند کر دیا اور اپنے پرائے سے ملنا چھوڑ دیا۔ اکبر نے اسے بلایا، لیکن اس نے جلے کٹے جواب بھیجے اور اس بات کے لیے بھی آمادہ تھا کہ وہ اپنے الزام کنندہ کے ساتھ جلتی آگ میں کود پڑے۔ یہی وہ زمانہ تھا۔ جب ابوالفضل خودکشی یا خانہ بدوشی کی بھی سوچتا رہا۔

ابوالفضل نے اپنے مخالف مدعی کا نام نہیں لکھا اور نہ ہی کسی اور کتاب میں یہ وضاحت ہے۔ لیکن "اقبال نامۂ جہانگیری" (نولکشوری) کا مصنف جو ایک معاصر راوی ہے، لکھتا ہے کہ شیخ مبارک نے جب تفسیر لکھی، تو وہ بادشاہ کو نہ دکھائی۔ اور اس کی وفات کے بعد ابوالفضل نے "بے اجازت" اس کی بہت سی نقلیں کرا کے بلادِ اسلامی میں بھیجیں۔ ایک موقع پر اکبر کو اس کی اطلاع ہوئی۔ شہزادہ سلیم نے بھی بادشاہ کو بتایا کہ ابوالفضل کہتا کچھ ہے اور کرتا کچھ ہے۔ "و بہ دلائل و براہین خاطر نشاں نمودند۔ کہ آنچہ دریں مدت از اخلاص و یکرنگی خود لاف مے زد، از فروغِ صدق بہرہ نداشت۔ و زبانش بادِل آشنا نبود" (اقبال نامۂ جہانگیری جلد دوم ص ۴۵۷ - ۴۵۸) مآثر الامراء میں، جو بعد کی تالیف ہے، لکھا ہے۔ کہ ایک مرتبہ شہزادہ سلیم، ابوالفضل کے گھر آیا۔ دیکھا کہ چالیس کاتب قرآن و تفسیر لکھنے میں مصروف ہیں۔ وہ سب کو بادشاہ کے حضور میں لے گیا۔ "ہمہ را با جزائے کتب نزدِ بادشاہ بردہ بد ظنہ ساخت۔ کہ ما را بہ چیزہائے دیگر می نماید۔ و در خلوت می رود۔ آں کارِ دیگر می کند" (مآثر الامراء جلد دوم ص ۶۱۰)۔ کئی درباریوں ("بعضے از مقربانِ بساطِ عزت") نے، جو موقع کی تلاش میں تھے جلتی پر تیل ڈالا "از گوشہ و کنار بہ کنایہ و صریح مقدمات بعرض رسانیدند" [اقبال نامہ جہانگیری]

ابوالفضل نے بالآخر دربار آنا شروع کر دیا، لیکن اب اس کے دشمنوں نے زیادہ مؤثر حربے استعمال کیے۔ وہ اکبر نامہ میں لکھتا ہے کہ چونکہ وہ کسی کی پرواہ کیے بغیر اپنی رائے میں مستحکم رہتا تھا اور قوی دلائل سے وہی کہتا تھا، جس میں حکومت کی مصلحت ہو۔ اس لیے اس کے دشمنوں نے اس کے خلاف جھوٹی سچی باتیں کیں اور ان کی سازش کا

کی وجہ سے ۵ پانچ جنوری ۱۵۹۹ء کو) اسے دکن بھیج دیا گیا تاکہ شہزادہ مراد کو واپس بلائے۔ دکن میں ابوالفضل پر جو گزری اس کا ذکر آیندہ صفحات میں آئے گا۔ یہاں اتنا کہنا کافی ہے کہ دکن کی طرف ابوالفضل کی روانگی دربار کو آخری الوداع تھا پھر اسے دارالخلافہ میں دوہ قدم رکھنا نصیب نہیں ہوا!

ابوالفضل نے اپنے مخالفوں کے نام نہیں بتائے، لیکن اتنا یقینی ہے کہ وہ کافی باثر ہوں گے۔ اکبر کے رضاعی بھائی اور وکیلِ مطلق، خان اعظم کی ابوالفضل کی نسبت جو رائے تھی، اس کا اندازہ اس تاریخ سے ہو سکتا ہے، جو اس نے ابوالفضل کے قتل کی لکھی:-

تیغ اعجاز رسول اللہ سر باغی برید

دکن سے لکھے ہوئے ایک رقعہ میں بخشی الملک (شیخ فرید) کی بالوضاحت شکایت ہے۔ ان دنوں شیخ فرید نے بادشاہ پر کافی اثر حاصل کر لیا تھا۔ اکبر نامہ میں جہاں ابوالفضل کے خلاف سازشوں اور ان کی وجہ سے اس کے دکن بھیجے جانے کا ذکر ہے، اس سے ایک ہفتہ پہلے بادشاہ کا شیخ فرید کے ہاں جانے اور اس کے مہمان ہونے کا بھی بیان ہے۔ یہ شیخ فرید وہی ہیں، جو سلسلۂ نقشبندیہ کے بڑے قدردان تھے اور جنھوں نے حضرت خواجہ باقی باللہؒ کی خانقاہ کے تمام اخراجات اپنے ذمہ لے لیے تھے۔ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ ماوراء النہر میں مولانا خواجگیؒ سے (جن کا عبداللہ خاں ازبک بڑا معتقد تھا) بیعت کے بعد حضرت خواجہؒ اکبر کے قیام لاہور کے آخری سال میں واپس ہندوستان پہنچ گئے تھے۔ اور ان دنوں لاہور میں مقیم تھے۔

پرتگیز مشنری اور مسلمان اُمرا

خانِ اعظم اور شیخ فرید کی نسبت ہم آیندہ صفحات میں زیادہ تفصیلات دیں گے، لیکن پرتگیز مشنریوں کی تحریروں سے بھی ظاہر ہے کہ خواہ اکبر کے مذہبی خیالات کچھ ہی ہوں، آخری ایام میں دربار اور کاروبارِ سلطنت پر متشرع مسلمان اُمرا حاوی تھے اور وہ اسلامی مفاد کو محفوظ رکھنے کی پوری کوشش کرتے تھے۔

اکبر نے پرتگیز پادریوں کو تحریر و تقریر کی بڑی آزادی دے رکھی تھی اور انھوں نے

اس سے فائدہ اُٹھاتے وقت تہذیب اور خوش اخلاقی کے تمام اصول نظر انداز کر دیئے لیکن عام مسلمان اُمرا کا دل ان کی بدزبانی سے جس طرح کڑھتا تھا' اس کا اندازہ ایک مسلمان امیر کے اظہارِ خیال سے ہو سکتا ہے جو اس نے پادری زیوریر کی تقریر کے بعد کیا۔ مسٹر پین معاصرانہ بیان کا خلاصہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

بہت سے مسلمان درباری جو اس وقت بادشاہ کے ساتھ تھے' پادری کی تقریر پر بہت بگڑے اور ان میں سے ایک نے جو پادری کا دوست تھا' اسے سمجھایا کہ جب وہ شرع اسلامی کا ذکر کرے تو اسے زیادہ احتیاط اور ادب سے گفتگو کرنی چاہیے۔ اس درباری مسلمان نے کہا "یہاں مسلمانوں کے سوا کوئی نہیں اور جب تم شرع اسلامی کی مذمت کرتے ہو تو وہ تمھارے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں اور اگرچہ میں تمھارا دلی اور محکم دوست ہوں۔ جب تم ہمارے نبیؐ کی بے ادبی کرتے ہو تو میرا بھی جی چاہتا ہے کہ تمھارے جسم میں خنجر بھونک دوں[1]"۔

گو اسے اکبر کے دربار میں تین مرتبہ پادری بھیجے گئے۔ مندرجہ بالا اندراج تیسرے مشن کے متعلق ہے' جو ۱۵۹۵ء میں لاہور پہنچا اور اکبر کی وفات تک ملک میں موجود تھا۔ دُوسرا مشن ۱۵۹۱ء میں بھیجا گیا' لیکن اگلے سال واپس بلا لیا گیا۔ اس مشن کے ارکان کو بعض شاہزادوں اور امرا کے بیٹوں کو پرتگیزی زبان (بقول ابو الفضل لاطینی زبان) سکھانے پر لگایا گیا۔ اس مشن کی ناکامی کا ذکر کرتے ہوئے اور معاصرانہ رپورٹ کو' جو لاطینی زبان میں ہے' درج کرنے کے بعد مسٹر پین لکھتے ہیں:۔

"اس (رپورٹ) سے واضح ہوتا ہے کہ خواہ پادریوں کے متعلق اکبر کا اپنا طرزِ عمل کیا ہو' اس کے اُمرا یقیناً ان کے مخالف تھے۔ بہت ممکن ہے کہ پادریوں نے اس خوش اخلاقی اور تدبر کا ثبوت نہیں دیا' جس کی ضرورت حالات متقاضی تھی اور امرا کی مخالفت اس حد تک بڑھ گئی کہ مشن کو جاری رکھنا بے سود ہو گیا[2]"۔

---

[1] Akbar and the Jesuits by Payne P 84

[2] ایضاً P 31

اکبر کے آخری ایام میں خانِ اعظم وکیلِ مطلق اور امیر الامرا تھا۔ وہ دربار کا سب سے با اقتدار امیر تھا۔ بادشاہ کی مُہر اس کی تحویل میں تھی۔ دار الخلافے میں بخشی شیخ فرید نے بادشاہ کا بڑا اعتماد حاصل کر لیا تھا۔ لاہور کا گورنر قلیچ خاں جس کی بیٹی سے اکبر کا ایک بیٹا دانیال بیاہا ہُوا تھا، سخت متشرع مسلمان تھا۔ دکن میں مرزا عبدالرحیم خانخاناں کسی قدر آزاد خیال تھا، لیکن وہ بھی خواجہ باقی باللہ کا معترف اور عام طور پر اسی گروہ کے ساتھ تھا۔ ان امرا اور ان کے رفقائے کار نے مُلک کی فضا کو بگڑنے نہ دیا۔

حضرت خواجہ باقی باللہ کی ماوراء النہر سے واپسی (۱۵۹۷ء) کے بعد تو ملک بھر میں ایک نئی رُوحانی زندگی کے آثار نظر آتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک بند ٹوٹ چکا ہے اور فیضانِ رُوحانی کا دریا موجزن ہے۔

حضرت خواجہ کے تفصیلی حالات ہم آیندہ صفحات میں دیں گے۔ اکبر کے قیام لاہور کے آخری ایام میں وہ ماوراء النہر سے لاہور پہنچے۔ اس کے بعد انھوں نے دہلی کو اپنی دینی و روحانی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ اکبر اور اس کے امرا دکن میں کچھ عرصہ گزار کے آگرہ آ گئے۔ ان دنوں آگرے میں نقشبندیہ سلسلے کے ایک اور مشہور بزرگ تشریف لائے، جن کے حالات سے اُس زمانے کی روحانی فضا پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ بزرگ حضرت خواجہ خاوند محمود المعروف بہ حضرت ایشاں تھے۔ جن کا پُر شکوہ مقبرہ لاہور کی زیب و زینت ہے[1]۔ وہ بعد میں کشمیر چلے گئے اور وہاں سے

---

[1] لاہور میں نئی انجینیرنگ یونیورسٹی سے بالکل قریب ہے۔ اور فنِ تعمیر کے لحاظ سے بڑا دلچسپ ہے۔ اس علاقے میں (جو ایک زمانے میں مغلپورہ کہلاتا تھا) کئی تاریخی عمارتیں ہیں۔ مثلاً نواب عبدالصمد خاں دلیر جنگ، جنھوں نے بندہ بیراگی کا قلع قمع کیا تھا۔ اور ان کے بیٹے زکریا خاں حاکم پنجاب کی قبریں شرف النساء زوجۂ عبدالصمد خاں کا مقبرہ، جس کے متعلق اقبال نے قصرِ شرف النساء کے عنوان سے جاوید نامہ میں ایک پُر تاثیر نظم لکھی ہے۔ علی مردان خاں کا مقبرہ وغیرہ۔ شالامار باغ بھی یہاں سے دُور نہیں ہے۔

لاہور تشریف لائے، لیکن اکبر کے آخری ایام میں آگرہ میں تھے۔ ان کے حالات ان کے صاحبزادے خواجہ محمد معین الدین[1] نے مراۃ طیبہ میں مرتب کیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب حضرت ایشاں آگرے پہنچے تو کئی اُمرا، جن میں سے ایک خان اعظم تھا۔ اور شاہی خاندان کی کئی خواتین نے ان کی بیعت کر لی تھی۔ موخرالذکر میں سے ایک تو سلیمہ سلطان بیگم تھیں (جو اکبر کے حرم میں تھیں) دوسری گلرخ بیگم (جن کی بیٹی سے اکبر نے سلیم کی شادی کر دی تھی)۔ گلرخ بیگم نے تو فرطِ عقیدت سے حضرت ایشاں کے لیے ایک جامہ اس طرح سی کر دیا کہ ایک ایک ٹانکے پر کلمہ شریف پڑھا گیا۔ خواجہ معین الدین کے بیان کے مطابق اکبر نے حضرت ایشاں خواجہ خاوند محمود سے اپنی فلاح کے لیے دعائے خیر (فاتحہ) کی درخواست کی۔ اس سے اس زمانے کی رُوحانی فضا کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔

ابوالفضل کا انجام

ہم مخالفوں کی سازش کی بنا پر ۵ جنوری ۱۵۹۹ء میں ابوالفضل کے دکن بھیجے جانے کا ذکر کر چکے ہیں۔ چند مہینے بعد اکبر خود دکن پہنچا۔ ابوالفضل کی اس سے وہاں ملاقاتیں ہوئیں۔ سنہ ۱۶۰۱ء میں ابوالفضل

---

[1] وہ خود ایک بڑے عالم، مشہور صوفی اور صاحب تصانیف بزرگ تھے۔ شیخ عبدالحق محدث کے شاگرد تھے۔ جب ان کے والد کو عہدِ شاہجہانی میں لاہور آنا پڑا تو انھوں نے کشمیر میں ان کی جانشینی کی اور بڑا نام پیدا کیا۔ تاریخ کشمیر (اعظمی) میں تفصیلی حالات ہیں۔ ان کی تصانیف ہیں کنز السعادات مراۃ القلوب۔ سیر خیر البشر۔ مراۃ طیبہ کے نام تاریخ کشمیر اعظمی کے مصحح مفتی محمد شاہ صاحب نے اضافہ کیے ہیں۔ اور فتاوئے نقشبندیہ کا ذکر تاریخ کشمیر کے متن میں ہے۔ خزینۃ الاصفیا میں رسالہ رضوانی کا ذکر ہے۔ سعیدیہ لائبریری ٹونک میں ان کی دو ضخیم تفاسیر ہیں۔ زبدۃ التفاسیر عربی میں اور شرح القرآن فارسی میں ہیں، جن کی تفاصیل معارف مارچ ۱۹۶۷ء میں قاضی محمد عمران خاں صاحب کے ایک مضمون میں ملیں گی۔

بادشاہ کے ساتھ اسیر گڑھ کے محاصرے میں شریک تھا۔ جب اکبر شیر گڑھ کی فتح کے بعد شمال کو مُڑا تو خانخاناں نے جو اکبر کی طرف سے دکن کی فتح پر مامور تھا' بادشاہ سے درخواست کی ابوالفضل کو میری مدد کے لیے یہاں چھوڑ جائیے۔ چنانچہ بادشاہ نے ابوالفضل کو دکن میں چھوڑا اور خود آگرے روانہ ہُوا۔ بادشاہ کی واپسی کے بعد خانخاناں نے شیخ کو اس قدر دِق کیا کہ اُسے چھٹی کا دُودھ یاد آگیا۔ شیخ کے خط اس درد و اندوہ سے بھرے ہوئے ہیں جو اسے دکن کے قیام میں اٹھانے پڑے۔ ایک خط میں بادشاہ کی نسبت لکھا ہے :۔

"بخدمت دکن حسب الحکم ایشاں آمدم۔ اما چہ محنت ہائے کہ نکشیدم وچہ درشتیہائے کہ ندیدم۔ قبلۂ من عساکر بیجراں غلبہ نمودہ است وہجوم علی العموم فرمودہ و من بیکس بے یراق و سلاح درمیان ہموم و عرصۂ غموم فرو ماندہ۔ نہ یارائے گریختن دارم نہ قدرت آویختن"۔

ایک اور خط میں لکھا ہے کہ کاش میں پیدا نہ ہوتا! تاکہ دکن کا سفر اور اس کی مصیبتیں نہ اُٹھانی پڑتیں "از محنت ہائے چرخِ کج رفتار و کلفتہائے زمانہ غدار چہ گویم و چہ نویسم کہ پہانے بینم و نے کشم۔ حق علیم اعلام است کہ زندگی بر من گرانی کند۔ پیدا کنندۂ عالم و آدم کاش کہ مرا بوجود نمے آورد تا محنت ہائے دکن دامنگیر حیات نمے گردید"۔ یہ شیخ نے اس طرح کے کئی خط شاہزادوں' شاہزادیوں' بادشاہ کی ملکہ اور والدہ کے نام لکھے کہ بادشاہ سے کہہ کر مجھے واپس بُلوا لو۔ ایک خط میں لکھا ہے کہ میں کئی عرضیاں بادشاہ کی خدمت میں بھیج چکا ہوں' لیکن خانخاناں کے جو حامی دربار میں ہیں' وہ میری عرضیاں بادشاہ تک نہیں پہنچنے دیتے (جماعہ کہ اعوان و انصار او یند۔ عریضۂ مرا بنظر اقدس حضرت نمے آورند) ایک خط میں بالتصریح بخشی الملک شیخ فرید کی نسبت لکھا ہے کہ میں بادشاہ کو سپہ سالار اور سرداروں کے تبادلہ کی نسبت ہزار تاکید سے لکھتا ہوں لیکن بخشی الملک کی طرف سے کوئی اَور ہی مشورہ ملتا ہے (حرفے راکہ بہزار تاکید معقول حضرتِ اعلیٰ می سازم۔ ملازمان بخشی الملکی علی الرغم آں نوشتۂ دیگر بعرض اشرف

لہ رقعاتِ ابوالفضل' صر ۸۲۔۸۳

مے رسانند) ۔

ابوالفضل اس کشمکش میں گرفتار تھا کہ نیرنگیِ زمانہ نے ایک اَور کھیل کھیلا۔ جہانگیر نے الٰہ آباد میں اپنی بادشاہت کا ساز و سامان کر لیا ۔ دربار کے کئی با اثر امرار اکبری خیالات سے متنفر تھے ۔ انھیں جہانگیر سے ہمدردی تھی ۔ جہانگیر کے پاس الٰہ آباد میں اکبر کے نمائندے میراں صدر جہاں خود جہانگیر کے پرانے اُستاد اور دلی خیر خواہ تھے ۔ وہ بادشاہی مریدوں میں شامل ہو چکے تھے ۔ اور بدایونی نے ان کی کئی لغزشوں کا ذکر کیا ہے، لیکن اسے غالباً پورے حالات کا پتا نہ تھا ۔ صدر جہاں شیخ عبدالنبیؒ کے شاگرد تھے اور یا حضرت خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں پہنچ چکے تھے ۔ یا ایک دو سال میں (یعنی اکبر کی زندگی میں) حضرت خواجہ اور حضرت مجدد الف ثانی سے فیض یاب ہونے والے تھے ۔ نئے حالات میں اکبر کو اپنا دیرینہ خادم پھر یاد آیا ۔ ابوالفضل کو لکھا کہ اپنا کام اپنے بیٹے عبدالرحمٰن کے سپرد کر کے فوراً ادھر روانہ ہو جاؤ ۔ خبر دینے والوں نے جہانگیر کو خبر دی ۔ وہ ڈرا کہ اگر ابوالفضل دربار میں آن پہنچا تو اور الجھنیں پڑ جائیں گی ۔ اُس نے بندھیلہ کے راجا نرسنگھ دیو کو جس کے مُلک سے شیخ کو گزرنا تھا، لکھا ۔ کہ شیخ کا کام تمام کر دو ۔ بڑی رعائتیں پاؤ گے ۔ چنانچہ وہ تین چار ہزار فوج لے کر آ گیا ۔ شیخ کو ان باتوں کی خبر نہ تھی اور اس کے پاس مختصر سی جماعت تھی ۔ بڑی بہادری سے لڑا، لیکن معاملہ اس کے بس کا نہ تھا ۔ بارہ زخم کھائے اور میدانِ جنگ میں کھیت رہا[1] ۔ سر جہانگیر کو بھیجا گیا اور جسدِ بے سر گوالیار کے پاس انتری میں دفن ہُوا ۔

خانِ اعظم مرزا عزیز کوکہ

اکبر کے آخری ایام میں حالات کے سُدھارنے میں جن ارکینِ سلطنت کو دخل تھا، ان میں سب سے

---

[1] ابوالفضل کے بہنوئی خواجہ حسام الدین نے منصب ترک کر کے خواجہ باقی باللہ کی بیعت کر لی تھی ۔ ابوالفضل اس کے بہت خلاف تھا اور خواجہ حسام الدین کو بہت دِق کرتا تھا ۔ انھوں نے مرشد کے پاس شکایت کی تو انھوں نے فرمایا: خاطر جمع دار کہ کارِ او (ابوالفضل) دریں چند روز برہم شود ۔ چنانچہ الیساہی ہُوا ۔ (زبدۃ المقامات)

سر برآوردہ اکبر کا رضاعی بھائی اور وکیلِ مطلق مرزا عزیز کوکہ تھا۔ افسوس کہ اس کے ساتھ مورخین نے انصاف نہیں کیا۔ ابوالفضل کے متعلق اس کے جو خیالات تھے اور ابوالفضل کے عام زاویۂ نگاہ سے اسے جو اختلاف تھا، اس کے پیشِ نظر اکبر نامہ کے مصنف سے کسی ہمدردی کی توقع بے کار ہے۔ ملا عبدالقادر بدایونی سے یہ توقع ہو سکتی تھی، لیکن بدایونی کی طبیعت ایسی تھی کہ اسے قباحتیں اور برائیاں ڈھونڈھنے میں زیادہ مزا آتا تھا۔ (اس نے شیخ عبدالحق محدثؒ کی سندِ حدیث اور حضرت موسےٰ پاک شہیدؒ کے متعلق جس طرح طنز و تعریض کے تیر چلائے ہیں، ان کا ذکر شیخ محدثؒ کے حالات میں آئے گا) مثبت باتوں میں اس کا دل نہ لگتا تھا۔ اُس نے خانِ اعظم کے مُریدِ شاہی ہونے کا ذکر تو تفصیل سے اور مزے لے لے کر کیا ہے، لیکن خان نے ۱۵۹۴ء میں جو طویل خط اکبر کو اس کے مذہبی خیالات کے متعلق لکھا تھا، اُسے ایک سطر میں گول کر دیا۔ بلکہ اُس "عریضہ درشتے طویل الذیل" کا ذکر اس طرح کیا کہ گویا خانِ اعظم اپنے وہموں کا شکار تھا۔ اور اسے دین کا غم نہ تھا۔ شمس العلما آزاد نے بھی کچھ بدایونی کی مدد سے اور کچھ تزکِ جہانگیری کے مخالفانہ اندراجات کی بنا پر دربارِ اکبری میں خانِ اعظم کا اچھا خاصا کارٹون پیش کیا ہے اور اسے ایک اکھڑ سپاہی، بلکہ ایک احسان فراموش ملازمِ شاہی کے روپ میں دکھایا ہے۔ عہدِ جہانگیری میں بادشاہ کے باغی بیٹے خسرو سے قریبی تعلقات کی بنا پر) خان کا ستارہ گردش میں رہا۔ اس لیے اس زمانے کے مورخین نے بھی اس کی شکایتیں ہی لکھی ہیں۔ کسی نے یہ نہیں دیکھا کہ خانِ اعظم ایک بڑا مدبر، دیانتدار اور جراُت مند مشیر، اکبر کا سچا بہی خواہ، اکبری بدعتوں کا سخت مخالف اور ہر جگہ محمدانِ اسلام کا سربراہ تھا!

خوش قسمتی سے عہدِ عالمگیری میں خافی خاں نے اس خط کا خلاصہ دے دیا، جو اکبری بدعتوں کی نسبت اس جری دل مسلمان نے اکبر کو لکھا تھا۔ اور بعض ایسی تفاصیل دیں، جن سے خانِ اعظم اور ابوالفضل اور بیربر کی چپقلش واضح ہو جاتی ہے۔ پرتگیز مشنریوں کے بیانات میں بھی خانِ اعظم کے ایک اہم خط کا خلاصہ ملتا ہے، جو

اس نے حاکم خاندیش کو لکھا اور دربارِ اکبری کے تتمہ میں بھی آزاد نے ایک قدیم مجموعہ سے لے کر وہ عرضداشت درج کر دی ہے، جو خانِ اعظم نے مکہ معظمہ سے فرمانِ شاہی کے جواب میں لکھی تھی۔ تزکِ جہانگیری میں خانِ اعظم کے متعلق متعدد اندراجات ہیں اور ذخیرۃ الخوانین میں بھی اس کے متعلق ایک طویل باب ہے۔ ان سب کی روشنی میں حقیقتِ حال کو دیکھنا اور خانِ اعظم کی عظمت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔

خانِ اعظم مرزا عزیز کوکلتاش اکبر کا رضاعی بھائی تھا۔ اکبر ابھی پیدا نہیں ہوا تھا کہ بادشاہ بیگم (حمیدہ بانو) نے مرزا عزیز کی والدہ سے کہہ دیا کہ میرے ہاں لڑکا پیدا ہو گا تو اسے تم دودھ پلانا۔ اکبر کی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد ان کے ہاں بچہ پیدا ہوا، تو انھوں نے اکبر کو دودھ پلانا شروع کیا اور زیادہ تر انھی نے یہ خدمت انجام دی۔ اکبر کی پیدائش کے تھوڑی دیر بعد ہمایوں اور بادشاہ بیگم ایران چلے گئے۔ اور اکبر کی نگہداشت مرزا عزیز کی والدہ اور والد کے سپرد کر گئے۔ وہ اسے لے کر ہمایوں کے بھائی مرزا عسکری کے پاس پہنچے اور بچے کی خبر گیری کرتے رہے۔ دو ڈھائی سال بعد ہمایوں ایران سے افغانستان آیا اور کابل فتح کر لیا تو اکبر اپنی حقیقی ماں اور باپ سے ملا۔ لیکن بچے کی نگہداشت اب بھی مرزا عزیز کی والدہ کے سپرد تھی۔ اکبر پونے پانچ برس کا تھا، جب ہمایوں کے خلاف اس کے دوسرے بھائی کامران نے بغاوت کر دی۔ کامران اس وقت کابل کے اندر تھا اور ہمایوں باہر گھیرا ڈالے تھا۔ بے درد چچا نے یہ ظلم کیا کہ جس مورچے پر گولوں کا زور تھا، وہاں دیوار پر معصوم بچے کو بٹھا دیا۔ لیکن اس وقت بھی مرزا عزیز کی والدہ نے بڑی محبت اور وفاداری دکھائی۔ اس نے بچے کو گود میں لیا اور جدھر سے گولے آ رہے تھے، اُدھر کو پشت کر کے بیٹھ گئی تاکہ اگر گولہ لگے تو پہلے مجھے لگے اور پھر بچے کو لگے۔ اکبری اقبال سے یہ مرحلہ بھی گزر گیا۔ اکبر پیار سے مرزا عزیز کی ماں کو جی جی کہتا تھا۔ "اور بڑا ادب بلکہ ماں سے زیادہ خاطر کرتا تھا۔" (دربارِ اکبری)

اکبر اور مرزا عزیز ہم سن تھے اور بچپن میں اکٹھے کھیلے تھے۔ اکبر تخت نشین ہوا تو

اس نے اس خاندان سے یگانگت قائم رکھی۔ مرزا عزیز کے والد شمس الدین کو اتکہ (رضاعی باپ) کا خطاب دیا۔ اپنی والدہ اور دوسری بیگمات کو جو ابھی کابل میں تھیں لانے کے لیے بھیجا۔ پنجاب کا صوبیدار مقرر کیا۔ بیرم خاں کو شکست اسی نے دی۔ اس پر اکبر نے اسے خان اعظم کا خطاب دیا۔ اور جب وہ ۱۵۶۲ء میں ادہم خاں کے ہاتھوں مارا گیا تو اکبر نے مرزا عزیز کی بہت دلداری کی۔ چند روز بعد خانِ اعظم کا خطاب عطا کیا۔ ہمیشہ پیار سے اسے مرزا عزیز یا مرزا کوکہ کہا کرتا تھا۔ اسے ہر وقت مصاحبت میں رکھتا۔ ہاتھی پر سوار ہوتا تو اکثر اسی کو خواصی میں بٹھاتا۔ مرزا کوکہ بھی اپنے آپ کو بادشاہ کا عزیز بلکہ بھائی سمجھتے تھے۔ اکبر کے ساتھ کھیل کود کر جوان ہوئے تھے۔ صاف گوئی ان کا ترکانہ شیوہ تھا۔ جو سمجھ میں آتا، خواہ وہ آدابِ شاہی کے خلاف ہو یا موافق بیدھڑک کہہ دیتے۔ اکبر بھی اس سے بُرا نہ مانتا۔ بلکہ کہتا کہ "میرے اور مرزا عزیز کے درمیان دُودھ کا دریا بہہ رہا ہے۔ اگر وہ مجھ پر تلوار کھینچ کر بھی آئے، تو جب تک یہ وار نہ کرے۔ میرا ہاتھ اس پر نہ اُٹھے گا۔" [دربارِ اکبری]

خانِ اعظم کی تعلیم و تربیت توجہ سے ہوئی۔ وہ نہ صرف فنونِ سپاہگری سے پوری طرح واقف تھا بلکہ مورخین اس کی انشا پردازی اور لطیفہ گوئی کی بھی تعریف کرتے ہیں۔ بدایونی نے بھی زمرہ شعرا میں اس کی دل کھول کر تعریف کی ہے بلکہ لکھا ہے "و بفہم عالی و ادراک بلند او کسے دیگر را از امرائے انشاں نمے دہند"۔ اور کئی شعر درج کیے ہیں۔ جن میں سے دو نقل کرنے کو جی چاہتا ہے ؎

چوں نشد حاصل مرا کام دل از ناموس و ننگ
بعد ازیں خواہم زدن بر شیشۂ ناموس سنگ

اور ؎ گشت بیمار دل از درد و غم تنہائی — اے طبیبِ دلِ بیمار چہ مے فرمائی؟

علمِ سیر و تاریخ میں بھی اسے پورا دخل تھا، لیکن اس کا اصل مرتبہ بطور ایک سپہ سالار اور رکنِ سلطنت کے تھا۔ اس نے کئی لڑائیوں میں حصہ لیا اور کارہائے نمایاں کیے۔ گجرات کی فتح میں اس کا ہاتھ تھا۔ اور جب ایک زمانے میں وہ تھوڑی فوج کے ساتھ

غنیم کی بے شمار جمعیت کے ساتھ گھتم گھتا ہو گیا اور اسے پٹن میں محصور ہونا پڑا تو اکبر فتحپور سیکری سے مارا مار کرتا تین ہزار سوار فوج لے کر اس کی کمک کو پہنچا۔ اور ستائیس دن کی منزلیں اس طرح نو دن میں طے کیں کہ مورخین اسے عجائب روزگار میں شمار کرتے تھے۔ اس کے بعد جب طریقۂ داغ اور اکبر کی بدعتوں کی وجہ سے اس کے خلاف بہار و بنگال میں بغاوت ہو گئی تو باوجودیکہ خان اعظم نے داغ کی مخالفت کی تھی اور دربارِ اکبری کی نئی روش سے وہ متنفر تھا، اُس نے بطور ایک وفادار رکنِ سلطنت کے، جان کو خطرے میں ڈال کر اس بغاوت کو فرو کیا۔

تاریخ میں خانِ اعظم کا بلند مقام اس لیے ہے کہ اس نے عہدِ اکبری میں قریب قریب وہی دینی خدمت سرانجام دینے کی کوشش کی، جو علاء الدین خلجی کی محفل خاص میں علاء الملک کوتوال سے ظہور میں آئی۔ بظاہر وہ اس میں ناکام رہا۔ کیونکہ اکبر کے ساتھ ابوالفضل جیسے اہلِ علم تھے، لیکن اپنے فریضہ کی ادائگی میں اس نے علاء الملک سے کم جرأت نہیں دکھائی، اور زیادہ قربانیاں دیں اور بالآخر حالات کو بہت حد تک سدھارنے میں کامیاب ہو گیا۔

خانِ اعظم جب بنگالہ سے فتح پور واپس آیا تو مذہبی بحثیں زوروں پر تھیں۔ بدایونی لکھتا ہے:۔

درنہم محرم سنہ تسعین وتسعمایہ (۹۹۰ھ) اعظم خاں از بنگالہ آمد۔ و شبے در اثنائے محاورہ بادگفتند کہ ما دلائلِ قطعی بر حقیقت تناسخ یافتہ ایم۔ شیخ ابوالفضل خاطر نشان شما خواہد کرد۔ او ہم قبول نمود۔" (منتخب التواریخ جلد دوم ص ۳۰۰)

ممکن ہے، خان اعظم نے (دوسروں کے سامنے) بادشاہ کی تردید مناسب نہ سمجھی ہو۔ لیکن بدایونی کا یہ بیان کہ خانِ اعظم تناسخ کا قائل ہو گیا تھا، قرائن کے خلاف ہے۔ ذخیرۃ الخوانین کا مصنف، جو خانِ اعظم کا جاننے والا تھا۔ اس کی نسبت لکھتا ہے:۔

خانِ اعظم در رسوخ دین و اسلام و تعصب در مذہب اہلِ سنت بے نظیر بود۔

اس کے علاوہ خود بدایونی آگے چل کر خانِ اعظم کی نسبت لکھتا ہے کہ جب وہ

بنگالہ سے فتحپور آیا تو اس نے مذہبی معاملات کے متعلق "سخنان درشت" کہے - اور "متعصبانہ" (ذرا بدایونی کا انتخابِ الفاظ ملاحظہ ہو) شیخ ابوالفضل اور بیربر کو بادشاہ کے حضور میں گھسیٹ لایا۔ بدایونی کی اصل عبارت حسب ذیل ہے :-

"چوں در مرتبہ اخیر کہ از بنگالہ بہ فتحپور آمدہ۔ سخنانِ درشت در وادیِ مذہب و ملت گفتہ۔ متعصبانہ شیخ ابوالفضل و بیربر را بحضور بادشاہ پیش کشیدہ و سخنان بجائے عجب رسانیدہ، مخاطب خاص و عام بود۔" (ص ۳۸۷)

منتخب اللباب میں خافی خان، جس نے خانِ اعظم کی مکہ معظمہ والی عرضداشت کا پہلی مرتبہ خلاصہ پیش کیا۔ اور جس کے سامنے بعض ایسی تحریریں ہوں گی، جو اس وقت دستیاب نہیں ہیں۔ سنہ ۱۰۰۱ھ کے ضمن میں خان کی نسبت لکھتا ہے :-

"و در ریش تراشیدن و سجدہ نمودن خلاف امرائے دیگر کہ اطاعت امر مے نمودند بعمل نیاوردہ ریش را دراز گذاشتہ بود۔ و مدام با مقربانِ حضور خصوص با شیخ ابوالفضل و فیضی دریں مادہ نزاعِ دینی داشت۔ لہٰذا ہر دو برادر و مقربانِ دیگر مانعانِ او در حضور مصلحت ندانستہ، تجویز صوبہ داری احمد آباد بعد تسخیرِ آن بمیان آوردہ، او را از بادشاہ جدا ساختند۔"

خانِ اعظم کو بادشاہ سے جدا کرنے کے لیے جب اس کے مخالفوں نے اسے گجرات بھجوا دیا تو وہ چھ سال تک دارالسلطنت میں نہ آیا۔ حالانکہ قاعدہ تھا کہ اطراف کے گورنر گاہ بگاہ حضور میں آتے رہیں۔ اس کی طلب میں کئی فرمان گئے، لیکن وہ پھر بھی نہ آیا۔ ایک خط میں تو طنزاً یہ لکھا گیا "مگر ریش تو گرانی میکند کہ نمی آئی"۔ اس نے جواب میں ایک سخت خط لکھا (بقول بدایونی "او عریضہ درشتے طویل الذیل در جواب ارسال نمودہ")۔ افسوس کہ ملا صاحب نے یہ اہم خط نقل نہیں کیا۔ حالانکہ وہ اپنے متعلق معمولی خط (جتنے کہ فیضی کے نوشتے) بھی درجِ کتاب کرتے ہیں۔ ورنہ ان کے اس بیان کی قلعی کھل جاتی کہ "وہمے بخاطرش راہ یافت و بعضے از اہلِ نفاق نیز از بادشاہ نسبت باو سخنان گفتہ از جا بردند"۔ اس ضمن میں شمس العلما آزاد نے خانِ اعظم کی ایک ایسی عرضداشت کا خلاصہ

دیا ہے۔ (دربارِ اکبری صفحہ ۲۷۰) جو ان کے بیان کے مطابق اس نے مکہ معظمہ کو روانگی سے پہلے، بلکہ "عین روانگی کے وقت لکھی۔" لیکن فی الحقیقت یہ خلاصہ خافی خاں کی اس تلخیص کا ترجمہ ہے، جو اس نے مکہ معظمہ والی عرضداشت کی کی تھی۔ روانگی سے پہلے جو طویل الذیل "عریضہ درشتے" "لکھا گیا" اس کے مفہوم کے متعلق ہمیں فقط دو سطریں ماثر الامرا میں ملی ہیں۔ جہاں گرانی ریش والے فقرے کا ذکر کر کے لکھا ہے۔

"گویند مرزا ہم در متعدد مذہب حرفہائے پوست کندہ و تند نوشت، تا اینجا بجائے عثمان و علی فیضی و ابوالفضل را قرار دادہ اند۔ آیا بجائے شیخین کرامی گرفتہ اند۔" (جلد اول صفحہ ۶۸۳، ۶۸۴)

بادشاہ سے خانِ اعظم کی یہ خط و کتابت جاری تھی کہ اس نے جونا گڑھ پر چڑھائی کی۔ اسے فتح کر لیا اور قریب کے بعض ہندو راجاؤں کو شکست دے کر بڑا زر و مال جمع کیا اور تمام اہل و عیال کو لے کر دیو کی بندرگاہ سے مکہ معظمہ کو روانہ ہو گیا۔ بدایونی کے خانِ اعظم کے متعلق جو خیالات تھے، ان کا اندازہ ان الفاظ سے ہو سکتا ہے جو اس نے "عریضہ درشتے طویل الذیل" کی نسبت لکھے۔ لیکن چونکہ خان کی مکہ معظمہ کو روانگی سے اکبر پر چوٹ کرنے کا موقع ملتا تھا۔ تاریخ لکھی۔

بہ جائے راستاں شد خانِ اعظم ولے در زعم قاہنشاہ کج رفت
چو پرسیدم ز دل تاریخِ ایں سال بگفتا میرزا کوکہ بہ حج رفت

اور آگے ایک فقرہ بڑھا کر خانِ اعظم کے متعلق بھی اپنا ما فیہ ظاہر کر دیا۔ "وایں کار او را کہ انکار سلطان التارکین ابنِ ادہم مے شمردند، آخر رفتہ رفتہ مسادی بود"

(منتخب التواریخ جلد دوم صفحہ ۲۸۷)

خانِ اعظم مکہ معظمہ چلا گیا تو اکبر کو بڑا رنج ہوا۔ اس کی ماں، جو اکبر کی رضاعی والدہ تھی غم و فکر سے نیم جاں ہو گئی۔ اکبر کو اس وجہ سے بھی بڑی تشویش تھی، لیکن اس نے بڑے حوصلے اور تدبر سے کام لیا۔ خانِ اعظم کی تلخ کلامیوں کو بالکل پی گیا۔ بلا اجازت اور جن حالات میں وہ ملک سے چلا گیا تھا، اس پر بھی کسی خفگی کا اظہار نہ کیا۔ خانِ اعظم کے جو بیٹے اور عزیز دار السلطنت میں رہ گئے تھے، ان کے منصب بڑھا دیے۔

اور خانِ اعظم کو ایک بڑا محبت بھرا، برادرانہ خط بھیجا، جو انشائے ابوالفضل دفتر اول میں درج ہے۔ اس میں لکھا کہ ہم تمھاری آمد کے منتظر تھے۔ جب یہ پتا چلا کہ تم زیارتِ حرمین شریفین زادہما اللہ شرفاً کو چل دیے اور اس وحشتناک سمندر میں اپنے اہل و عیال کو بھی ساتھ لے گئے تو بڑا تعجب ہوا کہ ایسا مخلص اور "مستحسن الخدمت ملازم ہمارے حقوق نظر انداز کر کے ہم سے اجازت لیے بغیر رخصت ہو گیا۔ اور نہ ہی اس نے اپنی والدہ شریفہ کی رضامندی حاصل کی۔ حالانکہ سارے اہل اللہ نے جملہ معاملات، بالخصوص اس طرح کی عبادات میں ماں کی رضامندی کے بغیر کوئی کام نہیں کیا اور اس کی اجازت بغیر ان عبادات و طاعات کو باعثِ ثواب نہیں سمجھا۔ اگر اس مکانِ مقدس تک پہنچنے کا شوق دامنگیر تھا، تو چاہیے تھا کہ اجازت لیتے۔ اور اگر بہت جلدی تھی تو کم از کم اہل و عیال کو یہاں بھیج دیتے۔ خیر، اس خاندان کی "خدماتِ مستحسن" ایسی ہیں اور بالخصوص جی جی کی خاطر اشرف ہمیں اس طرح عزیز ہے کہ اگر ہمیں ملال ہوا تو وہ بھی عارضی تھا۔ ہم نہیں چاہتے کہ تم پردیس میں مارے مارے پھرو۔ اور خاص و عام کے طعنے سہو۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ چاہیے کہ تم یہاں پہنچنے کا قصد کر کے ہمیں اپنی آمد سے دلشاد کرو۔ اور جی جی کے زخمِ دل پر (جس کی تمھارے فراق میں یہ حالت ہے کہ خدا کسی کو نہ دکھائے) مرہم رکھو اور دنیوی و اخروی عقوبت و عذاب سے نجات حاصل کرو۔

اس کے جواب میں خانِ اعظم نے ایک طویل عرضداشت لکھی، جس کا بدایونی نے مطلق ذکر نہیں کیا، لیکن اس کا خلاصہ، بڑی معذرتوں کے ساتھ، خافی خاں نے دے دیا تھا اور اب "تتمہ، دربارِ اکبری" میں پوری عرضداشت چھپ چکی ہے۔ اس کی تاریخی اہمیت کے خیال سے ہم اسے درج ذیل کرتے ہیں:-

کمینہ فراشاں آستان کیوان مکان ملائک آشیاں خاقان جمشید نشان فریدوں فشان کیخسرو دستگاہ کیومرث بارگاہ سکندر جاہ عالم پناہ انجم سپاہ آسمان خرگاہ ظل سبحانی عزیز کوکہ بعرض می رساند کہ رائے انور بر طلب ایں غلام کمینہ فائض و صادر گشتہ بود

جان و دل را خلاصه آب و گل ست۔ با جمعی کثیر از روسائے اخلاص و ابتهال
بخدمت حجاب درگاه گیهان پناه که مبدائے سخا و منشاء عظمت و کبریائیت فرستادن
چوں منفی عقل و فتوے قاضی گمان بلکہ یقین بگل بحرماں مجبوری که در دلیست بے درماں
نوشته داده بود۔ برنا قابلی فرسوده دست ملالت در گردن کرده ماند چوں دانست
به یقین که احادیث تحریک اعدا موثر و کارگر افتاده مزاج اشرف را بغیبت و تهمتی
چند که بمسامع جاه و جلال رسانیده از کمینه درگاه منحرف ساخته اند و بادی اعلائے
عالم آرائے بساط بوسانِ آں درگاه به قتل و قمع ایں بے گناه راهنموں گشته بر
خاطر رسید که چشم خاکسار بے مقدار راکه در خدمت قابلانِ آں درکار آسمان نشان
پرورش یافته بمرتبهٔ اعظم خانی و عزیز کوکگی و حکومت گجرات سرافراز شده هم بواسطهٔ
ایں تشریفات بخاکِ مکه معظمه مقدسه منوّره رسانیده که باکافرانِ هندوستان جسمی را
که پرورده خوانِ الوانِ انعام و احسانِ بادشاه جهاں پناه باشد در یک خاک و
در یک محل مدفون سازد محض گستاخی و غایت بے ادبی است ولاجرم گجرات
را که آنکه معمورهٔ دار السلطنت بود به معتمدان سپرده غبارِ ملال و اختلالِ خویش را
از گوشهٔ خاطر خاکروبانِ آن آستانِ ملایک آشیان شسته دست از مطالبات آنجا
و پائے ادب را کوتاه ساخته مواشی که محض بسعی جاں سپاری خود از معارک کفار
جمع ساخته بود بدستِ عدل بیروں آورده از حلال ترین چیز دانسته سفر گزیده
آں قدر جمعیت از مکاسبات مذکور بدست آورده که اگر خواهند منصب اعظم خانی
را در بارگاه بادشاهِ روم که اشرف مکان ربع مسکون بتصرف ایشانست می تواند
خرید۔ اما خلاصه همت مصروف آنست که وظیفه بمردم مستحق مصالح پاک دین آں ملک
مقرر سازد و مدرسه بنام نامی حجابِ بارگاهِ بنده پرور حضرت خاقانی باتمام رساند که
تا انقراض عالم ورد زبان مورخانِ جهاں باشد و خود در آں مدرسه به بحث علوم دینی
و فکرِ شعر که عبارت از توحید و نعت و منقبتِ اصحاب بوده باشد و دعائے دولتِ
روز افزوں اشتغال می داشته باشد۔ امید آنست که از رطبِ ایں کمترین

غلامان بر حاشیہ ضمیر خاکروبان آستان غبارے نخواہد نشست بلکہ مطلب سخن چینان و عیب کنندگان کہ عدم بود ایں معدوم است بحصول نخواہد پیوست کہ منصب اعظم خانی و حکومت گجرات و عشرت عزیز کوکگی را بایں محروم نے شوند بناچار جمیع مذکورات را پیشکش مدعیان نمودہ کہ ایشاں را میسر نیست بدوں بندہ و تمکن کہ ایں کمینہ را میسر باشد بدوں ایشاں چوں آخر الامر نسیم لطف شامل حال بوستان مطالب و مقاصد دیگراں شد و نہال امید و حقوق بندہ را بسموم محرومی خشک سالی بخشیدند۔
بندہ از فدوی کہ نہاد عاقبت اندیشی بابستگان آستان چند کلمہ گستاخی نمودہ بعرض می رساند کہ جمعی خاطر اشرف را از دین محمد صلے اللہ علیہ وسلم بیگانہ و مجتنب می سازند حاشا کہ دوست باشند و کمینہ کہ نیک نامی دنیا و عقبےٰ می طلبد دشمن و واجب الاخراج باشم دالاکار دنیا بازیچہ الیست ناپائدار برجعت دو سہ خوش آمد گوئی آخرت بدنیا فروشی اعتماد نہ باید کرد۔ ہمہ عالم را گوش ہوش است پیش از یں سلاطین بودہ اند کہ ہمہ صاحب تمکین بودند، ہیچ بادشاہے را دغدغہ نہ شد کہ دعویٰ پیغمبری و نسخ دین محمدی نماید۔ بل مادلے کہ چوں مصحف اعجازی چوں چہار یار چند بار پسندیدہ باشند و خلق قرباشاں ایں چیزہا واقع نبود مردم میکنند یارب دغدغہ چہار یار بودن کدام جماعت رامی شدہ باشد۔ قلیج خاں کہ صفائی ظاہر و باطنی و عصمت جبلی دارد صادق خاں کہ شرف رکابداری از سیرم خال یافتہ یا ابوالفضل کہ شجاعت و حیائش بجائے علیؓ و عثمانؓ مے تواند بود۔ بخداوند بحا کیلئے بادشاہ قسم جز عزیز کسی کہ نیک نامی طلب باشد نیست و ہمہ مدار برخوش آمد و روزگذرانیدن دارندو آنکہ نیک نامی طلبد بندہ است کہ مکلوبہ جز سرف نیک نامی باشد

خلاف پیمبر کسے رہ گزید کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

فرقے کہ میان اکابر مجلس بہشت آئین و بندۂ کمترین است ہمیں است کہ ابوالغازی درفرمان بندہ اضافہ کردہ دیگر کا قراں را بر مسلماناں ترجیح دادند کہ بر مصحف لیل و نہار خواہد ماند۔ آنچہ بر بندہ واجب است درآں تقصیر نرفت والدعا۔

اس عرضداشت کی نسبت شمس العلما آزاد نے عجیب طرزِ عمل اختیار کیا ۔ یہ عرضداشت ان کے پاس تھی اور انھوں نے اسے شائع کرکے تاریخ دانوں کو زیر بار احسان کیا، لیکن انھوں نے اس کے اندراجات پر غور نہیں کیا بلکہ اس کے اندراجات کا اندازہ ابوالفضل کے اس طول طویل خط سے لگانا چاہا ہے، جو اس نے اکبر کی طرف سے اس عرضداشت کے جواب میں خانِ اعظم کو لکھا ۔ اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ خیال کہ یہ خورش اعتقاد امیر جوشِ دینداری میں ہندوستان چھوڑ کر چلا گیا ۔ غلط ہے ۔ فرماتے ہیں، "حقیقت میں کچھ بھی نہ تھا ۔ جہاں اور بچوں کی سی ضدیں تھیں، وہاں ایک یہ بھی تھی" ۔ اور اصل میں قلیچ خاں اور ٹوڈرمل کے ساتھ مسابقت کا جھگڑا تھا ۔

اس نقطۂ نظر کی، جسے پہلے بدایونی نے ہوا دی (حالانکہ شمس العلما، بالکل خلافِ واقعہ، یہ لکھتے ہیں ۔ "ملّا صاحب (بدایونی) نے تو اس کی دینداری پر اپنی انشاپردازی کے سہرے چڑھائے ہیں") مندرجہ بالا عرضداشت سے پوری پوری تردید ہوتی ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ خانِ اعظم نے یہ عرضداشت اچھی طرح سوچ سمجھ کر اور آدابِ درباداری کو پوری طرح ملحوظ رکھ کر لکھی ۔ لیکن اس کا عندیہ بالکل واضح ہے ۔ اس میں ایک تو اس امر کی شکایت ہے کہ ہندوؤں کو اعلےٰ منصب دیے گئے ۔ اور کہا کہ صفحاتِ تاریخ پر یہ بات ثبت رہ جائے گی اور بدنامی کا باعث ہوگی کہ کافروں کو مسلمانوں پر ترجیح دی گئی اور بڑے دلچسپ اور مدبّرانہ انداز میں لکھا کہ مجھ پر آپ نے اتنی عنائتیں کیں خانِ اعظم اور عزیز کوکہ بنایا ۔ گجرات کی حکومت سے سرفراز کیا اور اس طرح "مکّہ معظمہ مقدسہ منورہ" پہنچانے کا انتظام کیا ۔ میرے لیے تو حضور کے ساتھ یہ انتہائی گستاخی اور بےادبی ہے کہ وہ جسم جو آپ کے انعام واحسان سے پرورش یافتہ ہے، اسے "کافرانِ ہندوستان" کے ساتھ ایک ہی جگہ سپردِ خاک کیا جائے ! دوسرے یہ اور اس پر زیادہ زور دیا) کہ جو لوگ اعلےٰ حضرت کو دینِ محمدی سے بیگانہ اور مجتنب بناتے ہیں ۔ ہرگز ہرگز آپ کے خیرخواہ نہیں ۔ دُنیا ناپائدار ہے ۔ اور ان دو رخے "خوشامد گو آخرت بدُنیا فروش" لوگوں پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے ۔ اس سے پہلے بھی بادشاہ گزرے ہیں، جنھیں بڑا جاہ وجلال

حاصل تھا۔ کسی کے دل میں یہ "دغدغہ" نہ ہوا کہ وہ دینِ محمدی میں ترمیم اور دعوئ پیغمبری کا خیال کرے۔ اور سعدی کا یہ شعر نقل کیا۔

• خلافِ پیمبر کسے رہ گزید ۔ کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

اور قسم لے کر کہا کہ عزیز کے سوا آپ کی نیک نامی کا خواہاں کوئی نہیں۔ سب خوشامد گو اور اپنا الّو سیدھا کرنے والے ہیں۔ میں آپ کی نیک نامی کے سوا ایک لفظ زبان سے نہیں نکالتا[1] اور عرضداشت میں اس کی مثالیں دیں کہ میں تو اس دھن میں لگا ہوں کہ حجاز میں مستحق لوگوں کے وظیفے مقرر کروں اور حضور کے نام پر ایک ایسا مدرسہ قائم کروں، جس کی موٴرخانِ جہاں ہمیشہ تعریف کریں اور جس میں علومِ دینی کی تعلیم اور فکرِ شعر یعنی "توحید و نعت و منقبت" کے علاوہ حضور کی دولتِ روز افزوں کے لیے دعا ہوتی رہے۔

خانِ اعظم کا جو نقطۂ نظر تھا اور اکبر کو جس راستے پر وہ لانا چاہتا تھا، وہ اس کی تحریر سے ظاہر ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس میں اپنا اور دربار کے ایک گروہ کا موازنہ کیا گیا ہے اور اپنی خیرخواہی پر زور دیا ہے، لیکن یہ موازنہ کسی قرابت، خدمات یا دوسرے حقوق پر مبنی نہیں۔ دونوں کے طریقِ کار اور مذہب کے متعلق متضاد مشوروں کی بنا پر ہے۔ یہ ایک شخصی مسئلہ نہ تھا۔ اصول کا سوال تھا۔ بادشاہ کو طے کرنا تھا کہ اس کے اصل خیرخواہ کون ہیں اور اس کے لیے نیک نامی کا راستا کونسا ہے۔ بادشاہ نے جو فیصلہ کیا اس کا اندازہ اس منصب اور اقتدار سے ہو سکتا ہے جو خانِ اعظم کو واپسی پر ملا۔ لیکن ابوالفضل کا وہ خط جو دفترِ دوم میں خان کے نام ہے، بادشاہ کے نقطۂ نظر کا اظہار ہے۔ اس میں خانِ اعظم کو "دولتخواہِ حقیقی" کہا گیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ بادشاہ نے فرمایا کہ "اگر اعظم خاں در درخانہ (کذا) باشد و متوجہ ایں خدمت شود۔ اقل و اولیٰ است۔ چنانچہ امیرالامراست۔ امیر المعاملہ نیز بود و ہمہ اینہا تابع او خواہند بود" یعنی معاملات اسی کے سپرد کیے جائیں گے۔ اور اسی کا طریقِ کار چلے گا۔

---

[1] اس مدبرانہ طرزِ عمل اور اس کے نتائج کا مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی کے اس طریقِ کار سے مقابلہ کریں جو انھوں نے حجاز میں اکبر کے متعلق اختیار کیا۔

خانِ اعظم نے حجاز میں کارِ خیر کا ایک وسیع سلسلہ قائم کیا۔ ذخیرۃ الخوانین میں جو قریب العہد اور مستند تذکرہ ہے، لکھا ہے، کہ خانِ اعظم نے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں بڑا خرچ کیا۔ اور نام چھوڑا۔ روضہ نبوی کے متعلقہ اخراجات کا حساب بنوایا اور پچاس سال کا خرچ نذر کیا۔ اسی حساب سے (مسجد نبوی کے لیے؟) فرش (قالین؟) سائبان، پردے اور سراپردے بھی۔ متعدد حجرے خرید کر وقف کیے اور شریف مکہ اور اس کے اہل و عیال کو اس قدر زر و زیور دیا کہ اس کا حساب نہیں ہو سکتا۔ (ص ۸۰-۸۱)

خانِ اعظم کی شخصیت پر پردہ ڈالنے میں سب سے زیادہ بدایونی کی تحریروں کو دخل ہے۔ وہ ان نیک کاموں کے بارے میں جو حجاز میں ہوئے، بالکل خاموش ہے۔ اور نہ ہی اکبر اور خانِ اعظم کے درمیان جو خط و کتابت ہندوستان سے روانگی کے بعد ہوئی اور جس کی بنا پر وہ واپس آیا، اُس کا ذکر کرتا ہے۔ بلکہ لکھتا ہے کہ خانِ اعظم کو شرفائے مکہ سے بڑا آزار پہنچا۔ اس کا وہ استغنا جاتا رہا۔ اور وہ واپس آکر مریدوں میں داخل ہو گیا۔ سجدہ[1] اور دوسرے لوازمِ ارادت بجالایا بلکہ (بادشاہ کی) ہم زبانی میں سب سے آگے تھا۔ اس کی اصل عبارت درج ذیل ہے:-

دریں ایّام اعظم خاں کہ از شرفائے مکہ معظمہ آزار بسیار کشیدہ و آں استغنا بباد دادہ بود، از حج باز گشتہ، داخل سلسلہ مریدان گشت، ہم سجدہ و ہم سائر لوازم ارادت

---

[1] یہ نہ خیال کریں کہ بدایونی کبھی زمین بوس (سجدہ) جو آئینِ دربار ہو گیا تھا۔ (اور عہد جہانگیری وغیرہ میں بھی جاری رہا) بجا نہیں لایا۔ وہ بحر الاسمار کا ذکر کرتے ہوئے اکبر کی نسبت لکھتا ہے "مقارن ایں حال شبے در خوابگاہ خاصہ خویش نزدیک بہ پایہ تخت طلبیدہ تا بلاد حکایات از ہر باب پرسیدہ حکم فرمودند۔ کہ چوں در جلد اوّل بحر الاسمار کہ سلطان زین العابدین ترجمہ فرمودہ، فارسی قدیم غیر متعارف است آں را ہم از سر نو بہ عبارتے مانوس بنویس ... زمین بوس نمودہ بہ دل و جان قبول نمودم و شروع دراں کردم و بعد از التفاتِ بسیار دہ ہزار تنکہ مرادی انعام و اسپ بخشیدند"

(منتخب التواریخ جلد دوم ص ۴۰۴-۴۰۳)

بجا آوردہ، مداح محاسن گفت و در صحبتہا و ہم زبانیہا ہمہ جا پیش بود۔ و صوبہ
غازی پور و حاجی پور جاگیر یافت و احکام مذہب نو از خدمت علامی یاد می گرفت
دریں تعلیم شد عمر و ہنوز ابجد ہمی خوانم ندانم کے رقم آموز خواہم شد بدیوانش
مدفوع معانی راست آمد (کذا)" (منتخب التواریخ جلد دوم صہ ۳۹۸)

یہ ممکن ہے کہ خانِ اعظم نے آئین دربار کے مطابق سجدۂ زمین بوس کیا ہو، اور
یہ بھی غیر ممکن نہیں کہ بادشاہ کے وکیل ہونے کے لیے ارادت کی جو شرط تھی، اُسے بھی
اس نے پورا کیا۔ لیکن بدایونی کا یہ اظہار کہ شرفائے مکہ سے تنگ آ کر اس نے اپنا نقطۂ نظر
ترک کر دیا تھا اور اکبر اور ابوالفضل کا ہم خیال ہو گیا تھا، بہتان سے کم نہیں۔ یوں تو بدایونی
نے خان کے سفرِ حجاز کے متعلق تحریری دستاویزوں کو جس طرح نظر انداز کر دیا ہے،
اُس سے ہی اس کی صحتِ بیان کے متعلق شبہ پیدا ہوتا ہے، لیکن مندرجہ بالا سطور
سے جو تاثر پیدا ہوتا ہے (اور جسے ہم نے خود بدایونی کی تحریر کی بنا پر قبول کر لیا تھا)
اس کے خلاف شواہد موجود ہیں۔ ابوالفضل کی نسبت خانِ اعظم کے جو خیالات
تھے، ان کا اندازہ اس تاریخی مصرع سے ہوتا ہے، جو خان نے اس کے قتل پہ
(عہدِ اکبری میں) لکھا تھا ؎

تیغِ اعجازِ رسول اللہ سرِ باغی بُرید!

اس کے علاوہ خانِ اعظم (اور اُس کے حجاز سے واپس آنے کے بعد بیشتر مسلمان
عہدیداروں) کا جو طریقِ کار تھا، اُس پہ ایک دلچسپ واقعہ سے روشنی پڑتی ہے، جو
پرتگیز پادریوں کو پیش آیا اور جس کی تفصیلات C. H. Payne کی کتاب
Akbar and the Jesuits کے سولھویں باب میں بہ عنوان "ایک شاہی
فرمان" درج ہیں۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ پرتگیز مشنریوں نے جنھیں اکبر نے اپنی زندگی
کے آخری سالوں میں گوا سے پھر بُلایا تھا[1]۔ کچھ لوگوں (بیشتر اچھوت ہندوؤں) کو لاہور
میں تبدیلِ مذہب پہ آمادہ کیا تھا۔ جب ۱۶۰۱ء میں قلیچ خاں پنجاب کا حاکم ہو کر آیا تو

---

[1] یہ طلبی بظاہر طریقۂ صلحِ کل کا کرشمہ تھی، لیکن ان پادریوں کی تحریروں سے ظاہر ہے کہ پرتگیز پادریوں سے [باقی اگلے صفحے پر]

اس نے ان کاموں میں روڑے اٹکانے شروع کیے۔ اس پر جو پادری دارالحکومت میں تھے، اکبر کے پاس پہنچے۔ حاکمانِ گوا کی چند تصویریں نذر کیں اور جب بادشاہ نے انھیں خندہ پیشانی سے قبول کیا تو عرض کی کہ ایک فرمان جاری کیا جائے کہ اگر کوئی شخص عیسائی ہونا چاہے تو اس کی مزاحمت نہ کی جائے۔ بادشاہ نے یہ استدعا قبول کر لی اور ایک اہل کار سے کہا کہ پادریوں کے لیے فرمان تیار کیا جائے۔ اہل کار جب یہ فرمان تیار کرنے بیٹھا اور پادریوں نے کہا کہ اس کی ایک شق یہ ہونی چاہیے کہ جو کوئی عیسائی ہونا چاہے، وہ اس معاملے میں آزاد ہوگا۔ تو وہ اہل کار رک گیا اور کہنے لگا کہ جب تک بادشاہ سے اس بارے میں پوچھا نہ جائے، اسے درج نہیں کیا جا سکتا۔ جب چند روز بعد اس نے بادشاہ سے پوچھا تو بادشاہ نے کہا کہ جو وعدہ میں نے پادریوں سے کیا ہے میں اس کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا اور یہ شق فرمان میں درج کر دی جائے۔

چنانچہ اہل کار نے حسب الامر فرمان تیار کیا اور ایک اعلےٰ عہدیدار کے پاس لے گیا، جو مجوزہ فرامین دیکھا کرتا تھا۔ جب اس نے یہ شق دیکھی تو وہ بھی معترض ہوا۔ اور معاملے کو لٹکاتا رہا۔ جب پرتگیز پادری اس کے پاس پہنچے تو اُس نے کہا کہ اس

(بقیہ فٹ نوٹ صر ۱۴۹)

رابطہ ضبط قائم کرنے اور ان کا خاص خیال رکھنے میں سیاسی اور عسکری منصوبے بھی پیش نظر تھے۔ مثلاً قلعہ اسیر کے محاصرے کے وقت اکبر نے کوشش کی کہ پادری زیویر کے ذریعے پرتگیزوں سے بڑی توپیں اور گولہ بارود مل جائے۔ اس کے علاوہ یہی پادری لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں اکبر کا پکا ارادہ تھا کہ دکن کی فتح کے بعد پرتگیزوں کو ملک سے نکال دے۔ اور وہ اس ارادے کا اپنے رفقا کے ساتھ بار بار اظہار کرتا تھا۔ (صر ۱۱۲-۱۱۳) پرتگیز پادری یہ بھی لکھتے ہیں کہ اکبر نے کئی دفعہ اپنے آدمی گوا بھیجے۔ بظاہر تو وہ سفیر ہوتے ہیں لیکن "ان کا اصل کام یہ دیکھنا تھا کہ پرتگیزی کیا کر رہے ہیں۔ اور ان کی عسکری طاقت کتنی ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے کارندے اس وقت بھیجتا۔ جب پرتگال سے جہاز آنے والے ہوتے تاکہ معلوم ہو جائے کہ ان میں کیا سامان اور کتنے آدمی آئے ہیں (صر ۱۱۳-۱۱۴) غالباً ان منصوبوں میں خانِ اعظم اور قلیچ خاں کو دخل ہوگا، جو گجرات رہ چکے تھے اور پرتگیزی خطرے سے آگاہ تھے۔

شق میں بڑی دشواریاں ہیں۔ اس سے شرعِ اسلامی (Mohammadan Law)
کو ضعف پہنچتا ہے اور حاکم لاہور (قلیچ خاں) بھی اس کے خلاف ہوگا اس لیے جب تک
اس کے متعلق بادشاہ سے میں خود نہ پوچھ لوں' اسے درج نہیں کیا جاسکتا۔ اگلے روز
جب وہ عہدہ دار بادشاہ کے سامنے پیش ہوا اور پادریوں نے کہا کہ وہ بادشاہ سے
استفسار کرے۔ تو عہدے دار نے جواب دیا کہ یہ وقت اس کے لیے موزوں نہیں۔
میں بادشاہ سے علٰحدگی میں استفسار کروں گا۔ پادری کہتے ہیں کہ یہ وعدہ بالکل جھوٹا
تھا اور عہدے دار کی مرضی تھی کہ معاملے کو ٹال کر اس قصے کو ختم کردے۔

بالآخر پادری بادشاہ کے وعدے کے مطابق فرمان لینے میں کامیاب ہوگئے۔
اس کی صورت اس طرح ہوئی کہ انھیں ایک بااثر نوجوان ایسا مل گیا' جو کسی وقت ایک
پادری کا شاگرد رہ چکا تھا اور جس کی بادشاہ تک رسائی تھی۔ وہ تین مرتبہ بادشاہ کو
ملا۔ اور بالآخر یہ فرمان جاری ہوگیا۔ لیکن پرتگیز پادری اس بات کی وضاحت کرتے
ہیں کہ امرائے کبار' جو زیادہ تر مسلمان تھے' اس فرمان کو "شرع اسلام کے خلاف"
(م ۱۵۷۰) سمجھتے تھے۔ اور اس کے مخالف تھے۔ انھوں نے "بالخصوص (خانِ اعظم)
عزیز کوکہ نے "اس کی شدت سے مخالفت کی" اور اس کے اجرا پر بہت بگڑے۔

اس فرمان کے اجرا کے بعد بھی قلیچ خاں نے لاہور میں پادریوں کو جو ناک چنے
چبوائے۔ وہ ایک علٰحدہ داستان ہے (اس کے لیے مذکورہ بالا کتاب کا انیسواں
باب دیکھنا چاہیے) لیکن اس واقعہ کی جزئیات سے صاف نظر آجاتا ہے کہ اگرچہ
خاص اتفاقات اور خاص وجوہ کی بنا پر کبھی کبھار ایسے احکام جاری ہو جاتے تھے۔
جن میں شرع کی پابندی نہ تھی' لیکن خانِ اعظم کے زمانۂ اقتدار میں جو فضا دارالحکومت
اور اطراف ملک میں تھی' وہ اسلام کے حق میں تھی۔ جن امور پر بادشاہ احکام صادر
کرچکا تھا' ان پر شرعِ اسلام کی رو سے اعتراض ہوتے تھے۔ اور یہ خیال کہ خانِ اعظم
کے خیالات بدل گئے تھے اور وہ ابوالفضل کا ہم خیال بلکہ شاگرد رشید ہوگیا تھا۔
واقعات کے بالکل خلاف ہے۔

بدایونی نے شعرا کے ضمن میں بھی خانِ اعظم کا تعریف سے ذکر کیا ہے، لیکن وہ بھی نیش زنی سے خالی نہیں۔ لکھتے ہیں: "کارنامہ چند از و در عالم ماندہ۔ یکے ازاں عالی ہمتانہ بہ حج رفتن بود۔ اما آمدن نہ آنچناں"۔ لیکن ایک پُرمعنی فقرہ اور ہے۔ "وایں ہمہ مقتضائے زمان است"۔ حقیقت یہ ہے کہ خانِ اعظم کا مکہ معظمہ جانا بھی مُبارک اقدام تھا اور وہاں سے واپس آ کر اس نے ملک میں جو فضا پیدا کر دی، اس کے لحاظ سے واپس آنا بھی کارِ ثواب تھا۔

خانِ اعظم کا زمانۂ اقتدار اکبر کی وفات کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اس موقع پر اس سے ایک سخت غلطی یہ ہوئی کہ اس نے اکبر کا جانشین جہانگیر کے بیٹے خسرو کو بنانا چاہا، جس سے اس کی اپنی بیٹی بیاہی تھی۔ یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ جہانگیر کے بااثر طرفداروں (مثلاً شیخ فرید) سے اس کے اچھے تعلقات ہوں گے جو انھوں نے جہانگیر کی تخت نشینی سے پہلے اس سے وعدہ لیا کہ وہ خسرو کے طرفداروں کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی نہیں نہ کرے گا۔ جہانگیر نے اس کا ایفا کیا لیکن جب اس کے باوجود خسرو نے بغاوت کر دی تو خانِ اعظم کی طرف پھر شبہے پڑنے شروع ہو گئے۔ اس کے علاوہ ایرانی امرا جو عہدِ جہانگیری میں شروع سے (جہانگیر کے بچپن کے دوست شریف خاں کے امیر الامرا اور وکیلِ مطلق ہو جانے کے باعث[1]) بااثر تھے۔ اس کے سخت مخالف تھے۔ اور اس کے خلاف جہانگیر کو ابھارتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ تو اسے گوالیار کے قلعے میں قید کر لیا گیا۔ وہاں سے رہائی عجب دلچسپ طریقے سے ہوئی۔ جہانگیر اپنی تزک میں لکھتا ہے۔ کہ عرش آشیانی (اکبر) مجھے خواب میں ملے۔ اور کہا۔ "بابا۔ گناہِ عزیز خاں را کہ خانِ اعظم است، بجہت خاطرِ من بہ بخش"۔ چنانچہ جہانگیر نے اس خواب کے بعد اسے قلعہ سے بلایا، آزاد کر دیا اور تھوڑے عرصے کے بعد اس کا منصب بحال کر دیا۔

---

[1] بیماری کی وجہ سے شریف خاں کو زیادہ مدت امیر الامرا رہنا نصیب نہ ہوا۔ لیکن اس کا جانشین بھی ایک اور ایرانی (آصف خاں) بنا۔

عہدِ جہانگیری میں خانِ اعظم کا ستارہ گردش میں رہا۔ پھر بھی اس سے ایک ایسا کام سرانجام ہُوا جو یاد رکھنے کے قابل ہے۔ ایرانی اہلِ قلم تو اس معاملے میں خاموش ہیں، لیکن ذخیرۃ الخوانین میں شیخ فرید بھکری لکھتے ہیں۔ کہ جہانگیر کے پہلے سالِ جلوس میں امیر الامرا (شریف خاں) نے جو وکیلِ مطلق ہو گیا تھا، بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا۔ کہ قومِ افاغنہ خاندانِ مغلیہ کے خلاف ہے۔ چنانچہ عرش آشیانی (اکبر) بھی اِن کے خلاف کوشاں رہے۔ اور انھوں نے سپاہ گری چھوڑ کر سوداگری شروع کی۔ اب چاہیے کہ ملک سے ان کا اخراج کر کے انھیں اپنے وطن روہ میں واپس بھیج دیا جائے۔ چنانچہ اس بارے میں حکامِ اطراف کے لیے فرامین تیار ہوئے۔ لیکن خانِ اعظم نے خدمت میں عرض کیا۔ کہ اس اقدام سے مُلک میں ایک فتنۂ عظیم برپا ہو جائے گا۔ اس گروہ میں کئی مومن، موحد، خدا پرست اور سپاہی ہیں۔ یہ تدابیرِ انسانی سے ہر طرف نہیں ہو سکتے۔ ممالکِ محروسہ میں ان کی تعداد کم از کم ایک کروڑ ہو گی۔ اتنے قبیلہ دار انسانوں کو بے گناہ ملک بدر کرنا گناہِ عظیم ہے۔ اور خلقِ خدا میں بھی بدنامی کا باعث۔ بادشاہ نے خانِ اعظم کی عقل و دانش پہ آفرین کہی۔ اور ان فرامین کا اجرا روک دیا۔

(ذخیرۃ الخوانین حصہ اوّل ص ۹۸-۹۹)

خواجہ خاوند محمود (حضرت ایشاںؒ) نقشبندی کے جو حالات ان کے صاحبزادے نے مرتب کیے ہیں، ان میں لکھا ہے کہ خانِ اعظم نے ان سے نقشبندیہ سلسلہ میں بیعت کی تھی۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات میں دو خط خانِ اعظم کے نام ہیں۔ جن میں ایک خاص طور پر اہم ہے۔

خانِ اعظم کی وفات ۱۰۳۳ھ ہجری میں بمقام احمد آباد (گجرات) ہوئی۔ ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا!

اکبر کی وفات اور جہانگیر کی تخت نشینی

شیخ ابوالفضل ۱۶۰۲ء عیسوی میں قتل ہُوا۔ اکبر اس کے بعد تین سال تک بقیدِ حیات رہا۔ جہانگیر کی چھوٹی

تزک[1] میں لکھا ہے کہ اکبر نے مرتے وقت کلمۂ شہادت دُہرایا۔ سورۂ یٰسین پڑھوا کر سُنی اور بطور ایک راسخ الاعتقاد مسلمان کے مرا۔ اس اندراج کی صحت مشتبہ ہے لیکن سفیرِ انگلستان سر طامس راؤ بھی جو اس واقعہ کے پندرہ بیس سال بعد ہندوستان آیا اور جس نے مقامی حالات کے متعلق ایک تفصیلی خط انگلستان کے لاٹ پادری کو لشکرِ شاہی سے لکھا۔ اس کا خیال ہے کہ اکبر کی وفات بطور ایک مسلمان کے ہوئی۔ اسی طرح جب پرتگیز پادری بوشلو سے بیجاپور کے عادل شاہی بادشاہ نے پُوچھا کہ اکبر کس مذہب پر فوت ہُوا تو پادری صاحب نے بڑے افسوس سے کہا کہ میری تو خدا سے التجا تھی کہ ایسا نہ ہوتا۔ لیکن اکبر ہمیں غلط امیدیں دلاتا رہا اور بالآخر آپ کے دینِ محمّدی پر ہی مرا۔

اس وقت اسلام کے لیے اکبر کے عقاید سے بھی زیادہ اہم مسئلہ اس کے جانشین کے مذہب کا تھا۔ اکبر کا جانشین جہانگیر ہُوا اور اس نے عہدِ اکبری کے بیشتر قواعد جو شرع اور اسلام کے خلاف تھے، موقوف کر دیے۔ اکبر کی زندگی کے آخری ایّام میں کوشش ہو رہی تھی کہ جہانگیر کی بجائے اس کا بیٹا خسرو اکبر کا جانشین ہو۔ خسرو کی بیوی خانِ اعظم کی بیٹی تھی اور وہ راجا مان سنگھ کا بھی قرابت دار تھا۔ ان دونوں نے اس کے حق میں کوشش کی، لیکن شیخ فرید بخاری نے جنھیں بعد میں نواب مُرتضٰے خاں کا خطاب ملا اور دوسرے مسلمان امراء نے اس موقعہ پر بڑی قابلیت دکھائی۔ اُنھوں نے نہ صرف جہانگیر کی تخت نشینی کا انتظام کیا بلکہ نئے بادشاہ سے اس بات کا وعدہ بھی لیا کہ وہ قوانینِ اسلام کا احترام کرے گا!

پرتگیز پادری جو اس زمانے میں آگرہ میں موجود تھے اور اکبر کو مرتے وقت ہی بپتسمہ دینے کے لیے لحظہ لحظہ کی خبر منگاتے رہتے تھے، اس واقعہ کی نسبت لکھتے ہیں[2]۔

---

[1] اس نسخے کی تاریخی حیثیت مشتبہ ہے لیکن چھوٹی تزک ہے بہت پُرانی۔ اور اس کے عہدِ شاہجہانی کے متعدد قلمی نسخے ملتے ہیں۔ مآثر الامرا اور دربارِ اکبری کے مصنفین نے اس پر بڑا بھروسا کیا ہے۔

[2] ملاحظہ ہو Akbar and the Jesuits صہ ۲۰۴۔

"امرا نے بالآخر فیصلہ کیا کہ حکومت اُسی کو دینی چاہیے جو اس کا قانوناً حقدار ہے۔ چنانچہ ایک برگزیدہ امیر[1] جسے دوسروں نے اپنا نمایندہ چنا تھا۔ شاہزادہ جہانگیر کے پاس آیا اور امرا کی طرف سے اسے کہا کہ ہم سب آپ کی بادشاہت کی حمایت کریں گے۔ بشرطیکہ آپ اس بات کی قسم اُٹھائیں کہ آپ شرع محمدی کا تحفظ کریں گے اور اپنے بیٹے (خسرو) یا اس کے طرفداروں کو کوئی سزا نہ دیں گے۔ شاہزادے نے ان شرطوں کو پورا کرنے کی قسم اٹھائی اور بہت سے پہرداروں کے ساتھ اپنے باپ کی ملاقات کو چلا۔"

مقامی مورخین اس وعدے کا ذکر نہیں کرتے، لیکن جہانگیر نے تخت نشین ہوتے ہی جو احکام جاری کیے، ان سے شرع اسلام کی شروع سے پیروی ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً تو زک جہانگیری کے مطابق جہانگیر کا تیسرا حکم تھا کہ جو لوگ لاوارث مرجائیں، ان کی جائداد "بمصارفِ شرعی کہ ساختن مساجد و سرا ہا و مرمّت پلہائے شکستہ و احداث تالابہا و چاہ ہا باشند" صرف کی جائے۔ مساجد کی تعمیر اور "مصارفِ شرعی" کی تعیین سے ظاہر ہے کہ بالکل ابتدا سے شرع محمدی کو کیا مرتبہ حاصل تھا۔

جہانگیر نے بالعموم شرع اسلامی کی پاسداری کے وعدے کا ایفا کیا اور اگر اکبر کی مذہبی بوالعجبیوں کا کوئی اثر باقی تھا تو وہ عہدِ جہانگیری میں ناپید ہو گیا۔

عہدِ اکبری میں علم و فن!

اکبر کے دربار کے مذہبی قضیوں کا ذکر ہم نے کسی قدر تفصیل سے کر دیا ہے لیکن دربار میں جو مطلق العنانی اور بے قاعدگی شروع ہوئی تھی ملک پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ عام ملک میں اسلامی اعتقادات برقرار رہے بلکہ علوم اسلامی کی وسیع اشاعت کا آغاز اسی زمانے سے ہوتا ہے۔

---

[1] اس پر ایڈیٹر کا حاشیہ ہے۔ "یہ شیخ فرید تھا، جسے عام طور پر مرتضیٰ خاں کہتے ہیں"

اس وقت جونپور۔ دہلی۔ لاہور۔ سیالکوٹ۔ احمد آباد اور دُوسرے مرکزوں میں علوم اسلامی کی اشاعت بڑی باقاعدگی سے ہو رہی تھی اور قابل علما کی کمی نہ تھی۔ ظاہر ہے کہ دوسری ممتاز ہستیوں سے قطع نظر جس زمانے میں حضرت باقی باللہؒ۔ شیخ مجدد الف ثانیؒ اور شیخ عبدالحق محدثؒ ہندوستان کی سرزمین کو اپنے چشمۂ فیض سے سیراب کریں اُسے رُوحانی قحط کا زمانہ نہیں کہا جا سکتا!

اکبر کے زمانے میں درس و تدریس میں کئی نمایاں تبدیلیاں ہوئیں۔ خلجی اور تغلق خاندانوں کے زمانے میں علوم و فنون کی کتابیں ہندوستان میں کم تھیں اور فقہ اور اصول فقہ کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔ لودھیوں کے زمانے میں معقولات کی چند کتابیں بڑھیں لیکن اکبر کے عہد میں معقولات میں بہت اضافہ ہُوا۔ اس کی ایک وجہ ایران اور سمرقند سے بعض علما کی آمد تھی۔ جنھوں نے منطق اور فلسفے کو رواج دیا۔ ان میں شاہ فتح اللہ شیرازیؒ بہت ممتاز تھے جنھیں اکبر نے عضد الملک کا خطاب دیا تھا۔ ان کی نسبت میر غلام علی آزاد لکھتے ہیں "تصانیف علمائے متاخرین ولایت (ایران) مثل محقق دوانی و میر صدر الدین و میر غیاث الدین منصور و مرزا جان میر بہ ہندوستان آورد و در حلقۂ درس انداخت و جم غفیر از حاشیہ محفل میر استفادہ کردند از ان عہد معقولات را رواجے دیگر شُد۔"

شاہ سلیمان سجادہ نشین پھلواری شریف کا خیال ہے کہ درسِ نظامی کے اصلی بانی مُلّا فتح اللہ شیرازی تھے۔ وہ الندوہ کے ایک پرچے میں لکھتے ہیں:۔

> اسی کے قریب زمانے میں ملا فتح اللہ شیرازی کے درس و تدریس کا غلغلہ بلند ہُوا اور ہندوستانی علما عموماً اور اہلِ پورب خصوصاً انھیں اندازِ تعلیم پر چلنے لگے۔ ان کے وقت سے گویا ایک جدید نصاب تعلیم قائم ہُوا ..... میرا مقصود فقط یہ ہے کہ درسِ نظامی جس کا ہیولٰے مُلا فتح اللہ شیرازی سے ظہور میں آیا اور صورت نوعیہ اس کی روپ بدلا کی۔ یہاں تک کہ درس کا مروّجہ موجودہ حال پر استقرار ہُوا۔"

ا۔ اکبری دور کا سب سے بڑا فلسفی تھا لیکن اپنے عقیدے پر سختی سے قائم تھا۔ بدایونی لکھتا ہے کہ اکبر کے عین دیوان خانۂ خاص میں جہاں اور کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ علانیہ نماز پڑھے۔ وہ پورے اطمینان اور جمعیت خاطر کے ساتھ مذہب امامیہ کے مطابق نماز پڑھا کرتا تھا (منتخب التواریخ جلد دوم صہ ۳۱۵)

لیکن معقولات کے فروغ میں، جو بعد میں ایک علمی وبا کی حد تک پہنچ گیا۔ علمائے ماوراالنہر کو بھی خاصہ دخل تھا۔ بدایونی لکھتا ہے کہ جب منطق کا علم سمرقند اور بخارا میں پہنچا تو بڑا مقبول ہوا اور معاملہ کچھ ایسا تیز لگا کہ ہر شخص معقولی اور منطقی ہو گیا اور جب کسی نیک بخت صاحب دل کو دیکھتے تو اس کی ہنسی اڑاتے کہ گدھا ہے اور اپنے دعوے کے ثبوت میں منطقی دلیل یہ دیتے کہ یہ لاحیوان ہے اور حیوان عام ہے انسان خاص ہے۔ جب حیوانیت اس میں نہیں تو انسانیت جو اس سے بھی خاص ہے وہ بھی نہیں پھر گدھا بھی نہیں تو کیا ہے۔ جب[1] یہ بوالفضولیاں حد سے بڑھ گئیں تو مشائخ صوفیہ نے منطق کا پڑھنا پڑھانا حرام قرار دے دیا اور بادشاہِ وقت، عبداللہ خاں ازبک سے استدعا کی کہ اس فن کے استادوں کو ملک بدر کیا جائے۔ چنانچہ کئی معقولی مثلاً قاضی ابوالمعالی، مرزا جان، ملا عصام وغیرہ وہاں سے نکالے گئے۔ ان میں سے بعض نے ہندوستان کی راہ لی اور یہاں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ چنانچہ خود بدایونی نے قاضی ابوالمعالی سے چند سبق پڑھے تھے۔ یقین ہے کہ معقولات کی مقبولیت میں ان بزرگوں کو بھی دخل ہو گا۔

دہلی اور گجرات کے سیاسی تعلقات عہدِ اکبری میں پھر استوار ہوئے۔ گجرات اس زمانے میں اسلامی علوم کا بڑا مرکز تھا۔ ایک تو ساحلی علاقہ ہونے کی وجہ سے جو لوگ عرب سے آتے وہ پہلے یہیں قیام کرتے اور یہاں کے لوگوں کو عرب جانے میں آسانی تھی۔ دوسرے شاہانِ گجرات نے علوم و فنون کی سرپرستی کر کے انھیں بہت فروغ دیا۔ چنانچہ یہ کہنا صحیح ہے کہ عہدِ اکبری سے پہلے سو سال تک گجرات کو علم و فضل میں دہلی پر فوقیت تھی۔ لیکن جب اکبر نے گجرات فتح کر لیا اور دہلی کے گورنر وہاں جانے لگے اور وہاں کے لوگوں کو دہلی آنا پڑا۔ گجرات کے علما دہلی پہنچنے شروع ہوئے اور گجرات کی بندرگاہوں کے رستے عام ہندوستانی طلبا کو بھی مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ جا کر حصولِ علم کا موقع ملا۔

علومِ اسلامی کی اشاعت اور معقولات کی توسیع کے علاوہ اکبر کا زمانہ جس بات کے لیے نمایاں ہے، وہ فنونِ لطیفہ کی ترقی ہے۔ فنِ تعمیر، مصوری، موسیقی، شاعری، ان سب کو اکبر کے زمانے میں فروغ حاصل ہوا۔ اکبری عہد کے فنِ تعمیر کے بہترین نمونے فتح پور سیکری میں ہیں،

---

[1] ترجمہ (دربارِ اکبری)

جو مدّتوں اس کا دارالخلافہ رہا۔ اکثر عمارتیں سُرخ پتھر کی ہیں اور ان کو بالخصوص مزار شیخ سلیم چشتی کے بلند دروازے کو دیکھ کر حیرت اور مسّرت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ لاہور میں بھی، جہاں اکبر آخر میں کئی برس مقیم رہا، اس نے قلعہ تعمیر کرایا اور اٹک۔ آگرہ اور دوسرے کئی منتخب مقامات پر قلعے بنوائے، جن سے نہ صرف عسکری اور حفاظتی ضروریات کا انتظام ہُوا، بلکہ جو فنِ تعمیر کے بھی جاذبِ نظر نمونے ہیں۔ ہمایوں کا مقبرہ، جسے تاج محل کا نقشِ اوّلین سمجھا جاتا ہے، اسی زمانے میں تعمیر ہُوا۔ اس کے علاوہ مغلیہ مصوّری کا فروغ اکبر کے زمانے میں ہُوا۔ اس کا آغاز تو ہمایوں کے آخری سالوں میں ہُوا۔ جس نے اپنی بیابان نوردی کے دوران میں تبریز اور ہرات کے فنکاروں کے شاہکار دیکھے اور دو مصوّروں کو اپنے ساتھ لیتا آیا۔ اکبر کے زمانے میں بھی ایران سے کئی مصوّر آئے، جن سے ہندوستانی صنّاعوں نے مصوّری کی تکمیل کی اور رفتہ رفتہ یہاں بھی فنِ مصوّری اس عروج پر پہنچ گیا کہ ایران ہندوستان سے پیچھے رہ گیا۔ موسیقی میں تان سین بہت مشہور تھا، جو اکبر کے نو رتنوں میں سے تھا۔ اس کے علاوہ اکبر نے ادبیات کی سرپرستی کی سنسکرت۔ عربی۔ ترکی۔ یونانی سے فارسی میں کتابیں ترجمہ کرائیں۔ سنسکرت سے جو کتابیں ترجمہ ہوئیں۔ ان میں رامائن، مہابھارت، بھاگوت گیتا، اتھروید اور ریاضی کی ایک کتاب لیلاوتی مشہور ہیں۔ ہندی زبان نے بھی اس زمانے میں بڑا فروغ حاصل کیا اور ہندی کے دو بہترین شاعر سورداس اور تلسی داس اکبر کے ہمعصر تھے۔ بیرم خاں کا لڑکا عبدالرحیم خانخاناں خود ہندی زبان کا شاعر تھا۔ ملک الشعرا کا عہدہ بھی غالباً اکبر کے زمانے سے شروع ہُوا جس پر پہلے غزالی اور پھر فیضی مامور ہُوا جو ہندوستان کے بہترین فارسی شعرا میں گنا جاتا ہے۔ اس عہدہ پر جو شخص مامور ہوتا تھا، اس کا کافی وقت مدحیہ قصائد اور بادشاہ بادشاہزادوں کے کارنامے نظم کرنے میں صرف ہوتا تھا۔ لیکن بہرکیف اس سے حکومت کی طرف سے شعر و سخن میں دلچسپی کا اظہار ہوتا تھا اور بالواسطہ ادب کے فروغ کا سامان ہوتا۔ شعرا کی شاہی سرپرستی کی اراکینِ سلطنت تقلید کرتے۔ اور شعر و سخن کو رونق ہوتی چنانچہ عہدِ اکبری میں عبدالرحیم خانخاناں جیسے ادب نواز تھے۔ جس کی سرکار سے عُرفی شیرازی وابستہ تھا۔

مورخین میں مُلّا عبدالقادر بدایونی[1] مصنّف منتخب التواریخ مُلّا نظام الدین احمد مصنّف طبقاتِ اکبری

[1] بدایونی کے سالِ وفات کی نسبت عام طور پر بےخبری ہے۔ طبقاتِ شاہجہانی (قلمی) میں (باقی اگلے صفحے پر)

اور علامہ ابوالفضل مصنف آئینِ اکبری و اکبر نامہ مشہور ہیں۔ ان میں سے اکبر نامہ کی اہمیت اس لیے ہے کہ اس سے سرکاری واقعہ نویسوں کی رپورٹوں اور دوسرے مستند ذرائع سے ہر عہد کی تاریخ لکھنے کا آغاز ہوا جس کی تقلید میں جہانگیر نامہ۔ شاہجہاں نامہ۔ بادشاہ نامہ۔ عالمگیر نامہ وغیرہ لکھے گئے۔ ان میں سے جہانگیر نامہ کو تزکِ جہانگیری کی چمک دمک نے ماند کر دیا ہے۔ لیکن درباری مورخین کی لکھی ہوئی دوسری کتابیں اس زمانے کے حالات سمجھنے کے لیے ضروری ہیں۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ ایسی تالیفات میں بادشاہوں اور بادشاہزادوں کے کارنامے زیادہ ہوتے ہیں اور عام لوگوں کے حالات اور معاشی امور کا تذکرہ نہ ہونے کے برابر۔ آئینِ اکبری فی الحقیقت اکبر نامہ کی آخری جلد ہے لیکن اس کا موضوع خاص ہے۔ اکبر کے آئینِ حکومت دینے کے علاوہ اس میں ملک کے مختلف حصّوں کے متعلق بیش بہا معلومات جمع کی گئی ہیں۔ اور کتاب ایک طرح کا گزٹیئر بن گئی ہے۔ ان مورخین کے علاوہ اکبر کی پھوپھی گلبدن بیگم جس نے ہمایوں نامہ لکھا ہے، بڑی قابل اور عالم خاتون تھیں۔ عہدِ مغلیہ کی مشہور خواتین کا ممتاز سلسلہ انھی سے شروع ہوا اور جس طرح چاند بی بی نور جہاں، جہاں آرا اور زیب النساء کی قابلیت اور اثر و اقتدار سے عیسائی مورخین کا یہ اعتراض غلط ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں مستورات کو جائز درجہ نہیں دیا جاتا۔ اسی طرح گلبدن بیگم کی علمیت اور زہد و تقویٰ بھی قوم اور ملک کے لیے باعثِ فخر ہے۔

اس زمانے میں بہت سے قابل اطبا بھی ایران سے آئے تھے[1]

عہدِ اکبری کا ایک قابلِ ذکر واقعہ یہ ہے کہ تمباکو شمالی ہندوستان میں پہلی مرتبہ اسی زمانے میں آیا اور اسد بیگ نے اپنے اکبر نامہ میں اس دلچسپ اور سبق آموز مباحثہ کا تفصیلی ذکر کیا ہے جو تمباکو نوشی کے فوائد و نقصانات پر اکبر کے دربار میں ہوا۔

عہدِ اکبری کی محدود ترقیاں

عہدِ مغلیہ کا علمی، فنی اور انتظامی نظام اکبر کے عہد میں ایک سانچے میں ڈھالا گیا۔ عالمگیر نامہ جو عہدِ عالمگیری یعنی اس زمانے میں لکھی گئی، جب اکبری نظام کی ایک اہم شق یعنی مذہبی معاملات میں

(بقیہ فٹ نوٹ از صفحہ ۱۶۴)

جہاں اس کی بہت تعریف کی گئی ہے لکھا ہے: "در سنہ ہزار و بیست و چہار از عالم انتقال نمود در عہد جہانگیر بادشاہ"

[1] ملاحظہ ہو۔ اطبائے عہدِ مغلیہ (کوثر چاند پوری)

اکبری طریقِ کار کو بالکل بالائے طاق رکھ دیا گیا۔ عالمگیر کا درباری مؤرخ لکھتا ہے

"حضرت عرش آشیانی جلال الدین محمد اکبر بادشاہ طاب ثراہ کہ مجدد آئینِ جہانبانی و مشیدِ قوانینِ ایں سلطنتِ جاودانی اند"۔ (ص ۷، ۳۸)

مغلیہ نظام اور تہذیب و تمدن اپنے دور میں کسی دوسری مشرقی حکومت کے نظام سے پیچھے نہ تھا بلکہ روسی مورخ بارتولد لکھتا ہے "فقط ہندوستان میں مغلوں کے تابع حالات مختلف تھے۔ اور اس ملک کی اسلامی حکومت مال و ثروت اور مذہبی رواداری میں معاصرانہ یورپ سے بڑھ کر تھی"۔ "تمام یورپ میں مغلوں کو مغلانِ اعظم کہہ کر یاد کیا جاتا تھا" لیکن جب دو ڈھائی سو سال بعد مغلیہ حکومت کے خاتمے کا وقت آیا تھا تو نہ صرف یہ ہندوستان تنازع للبقا کی جنگ میں یورپ سے آگے یا اس کے برابر نہ رہا۔ بلکہ ایک یورپی طاقت کے زیرِ نگیں آگیا۔

اس سانحے کا سبب بھی عہدِ اکبری کے عوامل و رجحانات میں ڈھونڈنا پڑے گا۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے تجدید و احیائے دین میں مجددین اور اسلامی علما و زعما کے "اسبابِ ناکامی" کا تجزیہ کیا ہے۔ اور مغرب کے مقابلے میں مشرق کی ذہنی اور علمی پسماندگی کا نقشہ کھینچا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :۔

"جس دور میں ہمارے ہاں شاہ ولی اللہ صاحب، شاہ عبدالعزیز صاحب اور شاہ اسمٰعیل شہید پیدا ہوئے۔ اُسی دور میں یورپ قرونِ وسطیٰ کی نیند سے بیدار ہو کر نئی طاقت کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا اور وہاں علم و فن کے محققین، مکتشفین اور موجدین اس کثرت سے پیدا ہوئے کہ انھوں نے ایک دُنیا کی دُنیا بدل ڈالی"۔ اس کے بعد وہ آدھے پونے صفحے پر اٹھارویں، اُنیسویں صدی کے مشہور مغربی حکما، سائنسدانوں اور معاشیات وغیرہ کے ماہرین کے نام گنا کر کہتے ہیں کہ ان میں "ان جیسے لوگ پیدا ہوئے، جنھوں نے اخلاقیات، ادب، قانون، مذہب، سیاسیات اور تمام علومِ عمرانی پر زبردست اثر ڈالا۔ اور انتہائی جراُت و بے باکی کے ساتھ دنیائے قدیم پر تنقید کر کے نظریات و افکار کی ایک نئی دُنیا بنا ڈالی۔ پریس کے استعمال، اشاعت کی کثرت، اسالیبِ بیان کی ندرت اور مشکل اصطلاحی زبان کے بجائے عام فہم زبان کو ذریعہ اظہار بنانے کی وجہ سے ان لوگوں کے خیالات نہایت

وسیع پیمانے پر پھیلے۔ انھوں نے محدود افراد کو نہیں بلکہ قوموں کو بحیثیت مجموعی متاثر کیا۔ ذہنیتیں بدل دیں، اخلاق بدل دیے۔ نظامِ تعلیم بدل دیا نظریۂ حیات اور مقصد زندگی بدل دیا اور تمدن و سیاست کا پورا نظام بدل دیا......

اسی زمانے میں مشین کی ایجاد نے صنعتی انقلاب برپا کیا جس نے ایک نیا تمدن، نئی طاقت اور نئے مسائلِ زندگی کے ساتھ پیدا کیا۔ اسی زمانے میں انجینئرنگ کو غیر معمولی ترقی ہوئی جس سے یورپ کو وہ قوتیں حاصل ہوئیں کہ پہلے دنیا کی کسی قوم کو حاصل نہ تھیں۔ اسی زمانے میں قدیم فنِ جنگ کی جگہ نیا فنِ جنگ، نئے آلات اور نئی تدابیر کے ساتھ پیدا ہوا۔ باقاعدہ ڈرل کے ذریعہ سے فوجوں کو منظم کرنے کا سلسلہ شروع ہوا، جس کی وجہ سے میدانِ جنگ میں پلٹنیں مشین کی طرح حرکت کرنے لگیں۔ اور پرانے طرز کی فوجوں کا ان کے مقابلے میں ٹھیرنا مشکل ہو گیا۔" صفحہ ۷۶-۷۷

مولانا مودودی نے جو حقائق بیان کیے ہیں، ان کی صحت و اہمیت سے انکار نہیں ہو سکتا لیکن انھوں نے پکی ہوئی تیار شدہ فصل کی تفصیل دی ہے۔ یہ نہیں بتایا کہ اس کے لیے زمین کب تیار ہوئی اور بیج کب بوئے گئے؟

اٹھارویں، انیسویں صدی میں یورپ کی جن ترقیوں اور مشرق کی جس پس ماندگی کا مولانا نے ذکر کیا ہے، وہ ان عوامل و اثرات کا قدرتی نتیجہ تھیں، جو صدیوں سے کارفرما تھے۔ اور جنھوں نے عہدِ اکبری تک ایک واضح صورت اختیار کر لی تھی۔

جب ۱۱۸۷ء میں سلطان صلاح الدین نے بیت المقدس فتح کیا، اس وقت تک علمی، اخلاقی، روحانی اور عسکری اعتبار سے مسلمانوں کا پلہ اہلِ مغرب سے بھاری تھا۔ اس کے بعد اسلامی ممالک پر منگولوں کی یورش ہوئی۔ اور ۱۲۵۸ء میں سقوطِ بغداد کا سانحہ پیش آیا۔ اس سیلابِ بلا سے جو عظیم سیاسی اور دینی خطرات پیدا ہو گئے تھے۔ وہ تو اللہ کے فضل سے عارضی ثابت ہوئے اور اہلِ یورپ نے لامذہب منگولوں سے مل کر دنیا سے اسلام کے خلاف جو منصوبے بنانے چاہے، انھیں بعض باتدبیر مسلمان زعما نے ناکام بنا دیا لیکن "فتنۂ مغول" نے مسلمانوں کی علمی برتری کا خاتمہ کر دیا۔ خوارزم۔ بخارا۔ خراسان۔ ایران اور بغداد کے

علمی مرکزوں کی ویرانی، مکتب خانوں، مدرسوں اور تجربہ گاہوں کی تباہی اور علما کے قتل و انتشار سے علم کا شیرازہ اس طرح بکھرا کہ پھر اس کی بحالی نہ ہو سکی۔ بلکہ علم و تہذیب کے پرانے گہوارں میں اتنی دیر بربریت اور سفاکانہ جہالت کا دور دورہ رہا کہ ہمتیں پست ہو گئیں اور خیالات بدل گئے۔ مغلوں کی تباہ کاریوں سے پہلے اور بعد کے حالات پر غور کریں تو ایسا نظر آتا ہے کہ وہ سانچا، جس میں البیرونی جیسے محققین اور سائنس دانوں کے ذہن ڈھلتے تھے، ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گیا۔ واقعیت پسندی کی جگہ فراریت اور علم کی جگہ تصوّف کو فروغ ہوا۔ علم کا مفہوم بہت محدود ہو گیا۔ یعنی نئے علوم اخذ کرنا تو ایک طرف، زوالِ بغداد سے پہلے جو علوم رائج تھے، وہ بھی متروک و مردود ہو گئے۔ ذہن گویا مفلوج ہو گئے، اور جو لوگ اہلِ علم کہلاتے تھے، ان کا منتہائے مقصود حق کی تلاش نہ رہا۔ بلکہ ایک نقطۂ نظر کی ترویج۔

اس کے برعکس یورپ میں بالکل ایک نئی علمی زندگی کا آغاز ہوا۔ اور اُس تحریک کی ابتدا ہوئی، جسے یورپ کی نشاۃِ ثانیہ یا Renaisance کہتے ہیں۔ اس میں ایک حد تک ان اثرات کو دخل تھا، جو صقلیہ اور اندلس میں عربوں کے بلند علمی اور تدریسی معیار کی بدولت قریبی یورپی ممالک کے اہلِ علم پر پڑا۔ صلیبی جنگوں کے دوران میں عربوں کے تمدّن اور علم و فن سے اہلِ مغرب کو جو واقفیت ہوئی، اس سے بھی ان کا افقِ ذہنی وسیع اور معیارِ علمی بلند ہوا۔ لیکن یورپ کی علمی نشاۃِ ثانیہ کا اصل ذریعہ وہ یونیورسٹیاں تھیں، جو اس زمانے میں کثرت سے یورپ کے مرکزوں میں قائم ہوئیں۔ اس وقت وہاں بھی (عالمِ اسلام کی طرح) تعلیم و تدریس کی باگ علمائے مذہب کے ہاتھ میں تھی (مثلاً آکسفورڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹیاں بھی شروع میں دینی درس گاہیں تھیں) لیکن یورپ میں ضروریاتِ زمانہ کے لحاظ سے نصاب میں توسیع ہوتی رہی اور یہ یونیورسٹیاں دینی اور دنیوی، دونوں قسم کے علوم کا مرکز بن گئیں۔ اس زمانے میں یورپ میں چھاپہ خانہ کا آغاز ہوا، جس سے علم کی بے پناہ اشاعت ہوئی۔ کتابیں سستی ہو گئیں اور کتب خانے خاص خاص امرا یا اداروں کا اجارہ ہونے کی بجائے عوام کو بھی میسر ہونے لگے۔ اس کے علاوہ مغرب کی عسکری برتری کا، بالخصوص سمندروں پر اس کے بے روک ٹوک اقتدار کا آغاز بھی اس زمانے میں ہوا۔ اور اکبر کی تخت نشینی، بلکہ بابر کی فتح پانی پت سے پہلے

بحرِ ہند ایک "پرتگیزی جھیل" بن گیا تھا جس میں جہاز رانی پرتگیزی اجازت ناموں کے بغیر مخدوش بلکہ ناممکن تھی۔

اکبر نے جو انتظامی، عسکری، مالی، تہذیبی نظام قائم کیا، وہ مشرقی معیار کے مطابق خاصہ بلند تھا، لیکن چونکہ وہ اور اس کے رفقائے کار ترقی اور عقلیت کے دعویدار تھے، دیکھنا یہ ہے کہ مغرب میں جو ترقیاں ہوئیں، اور جن سے وہ بے خبر نہ تھا، ان کے مقابلے میں اس نے کیا کیا؟

اکبر کی سب سے بڑی حماقت امورِ مذہبی میں ہوئی۔ مغرب کی تمام ترقیاں علمائے مذہبی اور حکومت و عوام میں کشمکش اور اختلافات پیدا کیے بغیر رُونما ہوئیں۔ بلکہ بعض دنیوی ترقیوں (مثلاً مشرقی سمندروں میں اقتدار) کے حصول میں تو دنیوی فوائد سے زیادہ جذبۂ مذہبی یعنی عیسائیت کے مقابلے میں اسلام کو نیچا دکھانے کی خواہش کار فرما تھی۔ یونیورسٹیوں کی ابتدا اور توسیع میں بھی مذہبی علما اور حکومت کا پورا اشتراک کار تھا۔ یہاں معاملہ دُوسرا تھا۔ اکبر اور مذہبی علما کی کشمکش کی وجہ سے نہ صرف یہ اشتراکِ عمل ناپید تھا بلکہ ایک ایسی فضا پیدا ہو گئی کہ اکبر اور اس کے عقل پسند رفقائے کار جو تجاویز پیش کرتے، وہ بے ضرر بھی ہوتیں تو علما ان کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے۔ اور فی الحقیقت اکبر کی مذہبی خام خیالیوں نے ایک ایسی صورت اختیار کر لی تھی۔ [اور (ان کے مخالفین کے بیان کے مطابق) نام نہاد عقلیت کے دعویداروں نے انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام اور حکما، کو اس طرح ہم پایہ قرار دے دیا تھا] کہ عقلیت پسندی اور دنیوی علوم کے خلاف ایک زبردست ردِ عمل شروع ہُوا۔ اور وہ دنیوی علوم بھی جو دوسرے ملکوں میں علما گوارا کر لیتے تھے۔ وہ بھی یہاں متروک و مردُود ٹھہرائے گئے۔ اس کا سب سے موثر اظہار حضرت مجددالف ثانی کے مکتوبات میں ملے گا۔ یاد رکھنا چاہیے کہ حضرت مجدد نے علومِ دنیوی و معقولات کو پوری طرح حاصل کیا تھا۔ جس اُستاد (علامہ کمال الدین سیالکوٹیؒ) کے وہ شاگرد تھے وہ علامہ عبدالحکیم سیالکوٹیؒ کا بھی اُستاد تھا۔ انھوں نے خود ایک مدت تک ان علوم کا درس بھی دیا۔ وہ ایک جگہ ان علوم سے ذاتی طور پر روحانی فائدے اخذ کرنے کا ذکر کرتے ہیں:

بسیارے از تحقیقاتِ کلامی و فلسفی دریں سیر و سلوک مدد نمودہ است و واسطۂ معارف

الٰہی جل شانہ گشتہ۔ (۵۴)

لیکن جب علوم عقلیہ کا مرتبہ معین کرنے کا وقت آیا تو انھوں نے حکما و فلاسفہ کی نسبت لکھا:۔

یہ لوگ بہت ہی بے خرد اور بیوقوف ہیں۔ اور ان سے زیادہ کمینہ اور بیوقوف و احمق وہ شخص ہے جو ان کو دانا اور عقلمند جانتا ہے۔ ان کے منظم اور مرتبہ علوم میں ایک علم ہندسہ ہے جو محض لایعنی اور بیہودہ اور لاطائل ہے۔ بھلا مثلث کے تینوں زاویہ قائمہ کے ساتھ برابر ہوتا کس کام آئے گا اور شکل عروسی اور مامونی جو ان کے نزدیک بڑی مشکل اور جانکاہ ہے۔ کس غرض کے لیے ہے؟

علم طب و نجوم اور علم تہذیب الاخلاق جو ان کے تمام علوم میں سے بہتر علم ہیں گزشتہ انبیا کی کتابوں سے چرا کر اپنے باطل اور بیہودہ علوم کو رائج کیا ہے۔ جیسے کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ المنقذ عن الضلال میں اس امر کی تشریح و توضیح کی ہے۔

حضرت عیسیٰؑ کی دعوت جب افلاطون کو جو ان بدبختوں کا رئیس ہے، پہنچی تو اس نے کہا کہ ہم ہدایت یافتہ لوگ ہیں۔ ہم کو ایسے شخص کی حاجت نہیں ہے، جو ہم کو ہدایت دے۔

اس بیوقوف کو چاہیے تھا کہ ایسے شخص کو جو مُردوں کو زندہ کرتا اور مادر زاد اندھوں اور کوڑھیوں کو تندرست کرتا ہے، [جو ان (حکما) کے اصول و قوانین کے خلاف ہے] اُسے پہلے دیکھتا، اس کے حالات کو دریافت کرتا اور پھر اسے جواب دیتا۔ بغیر دیکھے اس کا یہ جواب دینا، اس کی کمال عداوت اور کمینہ پن ہے ؎

فلسفہ چوں اکثرش باشد سفہ / پس کُلِّ آں   ہم سفہ باشد، کہ حکمِ کُل، حکمِ اکثر است

.... فرزندی محمد معصوم نے انھی دنوں میں جواہر شرح مواقف کو تمام کیا ہے۔ آشنائے سبق میں ان بیوقوفوں کی بڑی بڑی قباحتیں ظاہر ہوئیں۔" (۱/۲۶۶)

یہ مواقف وہی کتاب ہے، جس کی مُلا عبدالحکیم سیالکوٹی سے لے کر اکثر فضلائے ہند نے شرحیں لکھیں اور جس کے مصنف قاضی عضدالدین شیرازی کی نسبت خواجہ حافظ نے کہا ؎

دگر شہنشہِ دانش عضد، کہ در تصنیف   بنائے کارِ مواقف بنامِ شاہ نہاد

اس زمانے میں تحقیقِ حالات میں جو دشواریاں تھیں، ان کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ حضرت مجدد کا یہ خیال کہ افلاطون نے حضرت عیسیٰؑ کا زمانہ پایا، صحیح نہیں۔ افلاطون (۴۲۷-۳۴۷ ق۔ م)

حضرت عیسیٰؑ کی ولادت سے کوئی تین ساڑھے تین سو سال پہلے وفات پا چکا تھا۔
حضرت مجددؒ نے دفتر سوم کے ایک خط میں بھی انھی امور سے بحث کی ہے۔ علوم فلسفہ کی نسبت لکھتے ہیں:
بعض لوگ جو علوم فلسفہ سے تعلق رکھتے ہیں[1] ۔ اور فلسفی تسویلات پر فریفتہ ہیں، ان کو حکما جان کر انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کے برابر سمجھتے ہیں، بلکہ ان کے جھوٹے علوم کو سچا جان کر انبیا کی شرائع پر مقدم سمجھتے ہیں۔ اعوذ باللہ سبحانہ عن الاعتقاد السوء۔ ہاں جب ان کو حکما کہتے ہیں۔ اور ان کے علم کو حکمت کہتے ہیں تو پھر کیونکر اس بلا میں مبتلا نہ ہوں۔ کیونکہ حکمت سے مراد کسی شے کا وہ علم ہے جو نفس الامر کے مطابق ہو لیکن وہ علوم جو ان کے مخالف ہوں۔ وہ نفس امر کے غیر مطابق ہوں گے۔ غرض ان کی اور ان کے علوم کی تصدیق سے انبیا اور ان کے علوم کی تکذیب لازم آتی ہے کیونکہ یہ دونوں علم ایک دوسرے کی نقیض ہیں۔ اب جو چاہے انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کے مذہب کو لازم پکڑ لے۔ اور حق تعالیٰ کے گروہ سے ہو جائے۔ اور نجات پا جائے۔ اور چاہے فلسفی بن جائے اور شیطان کے گروہ میں داخل ہو جائے اور ہمیشہ کے لیے زیاں کار اور ناامید بن جائے۔ (۳/۲۲)

حضرت مجددؒ حکما کے تو اس لیے خلاف تھے کہ ان کے خیال میں حکما کے علوم کی تصدیق سے انبیائے کرام کی تکذیب لازم آتی ہے۔ لیکن علم ہندسہ کے وہ اس لیے مخالف تھے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ اور اس سے وبال و عذاب آخرت سے بچنے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ فرماتے ہیں:۔

"باقی رہا، علم ہندسہ جو خاص طور پر ان کے ساتھ مخصوص ہے۔ اگر وہ منتظم یعنی کامل اور تمام بھی ہوگا تو کس کام آئے گا۔ اور آخرت کے کونسے عذاب وبال کو دُور کرے گا۔ بندہ کی حق تعالیٰ سے روگردانی کی علامت بندہ کا بیہودہ کاموں میں مشغول ہونا ہے۔

جو کچھ آخرت میں کام نہ آئے۔ وہ لایعنی اور بیہودہ ہے" (۳/۲۳)

حضرت مجددؒ کے علم ہندسہ کے متعلق مخالفانہ ارشادات پڑھتے وقت یہ خیال رکھنا چاہیے کہ انھوں نے علم ہندسہ کا اچھی طرح مطالعہ کیا تھا اور انھوں نے اپنی تصانیف میں بعض اہم امور کو علم ہندسہ سے

---

[1] غالباً ابوالفضل فیضی اور حکیم ابوالفتح کی طرف اشارہ ہوگا۔ ابوالفضل کی قریباً ساری تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں متعلقہ اندراج نظر سے نہیں گزرا۔ دوسروں کی تصانیف چھپ جائیں تو شاید حقیقت حال پر روشنی پڑے۔ ممکن ہے حضرت مجددؒ کا زبانی باتوں کی طرف اشارہ ہو۔

اصولوں سے ثابت کیا ہے۔ مثلاً معارف لدنیہ میں وجود باری تعالیٰ کے متعلق بعض لطیف و دقیق حقائق کے اثبات میں لکھتے ہیں:۔

"دوم۔ آنکہ بہ برہان ہندسی ثابت شدہ است کہ مرکز دائرہ نقطہ است کہ بہ ہیچ وجہ انقسام قبول نکند"
سوم۔ آنکہ نیز بہ برہان ہندسی ثابت شدہ است کہ ...... الخ" [رسائل مجددیہ ص ۱۵۳]

حضرت مجدد الف ثانی کی نسبت تو شاید یہ کہا جا سکے کہ عہدِ اکبری میں علوم عقلیہ کے تجاہلوں سے جو بے اعتدالیاں ہوئیں، ان کے ردِ عمل کے طور پر ان علوم کے متعلق ان کے خیالات مخالفانہ ہو گئے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ منگولوں کی تباہ کاریوں کے بعد علما کا نقطہ نظر علوم کی نسبت بڑا محدود ہو گیا۔ ظالم منگولوں نے اسلامی کتب خانے برباد کر کے اسلامی علوم کے آثار و نشانات اس طرح مٹائے کہ خود مسلمانوں کو یاد نہ رہا کہ انھوں نے اپنے عہدِ عروج میں علوم و معارف کو کتنی وسعت اور بلندی دی تھی؟ الجبرا کس نے ایجاد کیا تھا؟ یونانی علوم کو کس نے زندہ رکھا؟ اہلِ ہند کے علوم (مثلاً رقوم ہندیہ) کو کس نے دنیا میں عام کیا؟ طب، ہیئت، ریاضی، کیمیا، طبعیات میں مسلمانوں نے کیا کیا اضافے کیے اور ان ساری علمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ اسلام کی محبت، احکام اسلام کی متابعت اور عظیم ترین اخلاقی اور روحانی سربلندی سے کس طرح سرفراز رہے؟

دہلی میں اسلامی حکومت اس وقت قائم ہوئی، جب منگولوں کے سیلاب بلا کے بند ٹوٹ چکے تھے۔ ان درندوں سے جان بچا کر جو علما و صلحا بخارا، خوارزم، خراسان اور پھر ایران، عراق سے بھاگ کر ہندوستان میں پناہ گزین ہوئے۔ ان سے یہاں اشاعتِ اسلام، نئی حکومت کے استحکام اور اسلامی تہذیب و تمدن کی زیب و آرائش میں بڑی مدد ملی۔ لیکن جو افراد اس طرح جان بچا کر بھاگے تھے، وہ اپنے کتب خانے ساتھ نہ لا سکے تھے۔ تجربہ گاہوں اور علمی آلات کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں انھی چیزوں نے فروغ پایا، جن کے لیے صدیوں کے جمع کیے ہوئے علمی سرمایہ کی ضرورت نہ تھی۔ یعنی تصوف، شعر و شاعری، انشا، زیادہ سے زیادہ فقہ اور اصول حکومت پر چند کتابیں اور مقامی تاریخ نگاری۔

اسلامی ہندوستان میں بغداد اور غرناطہ بلکہ بخارا اور خوارزم کی بھی ٹھوس علمی روایات قائم نہ ہوئیں۔ اور دہلی کا علمی افق یہاں کی عسکری اور سیاسی سربلندیوں کے مقابلے میں پست

رہا لیکن ہندوستان سے باہر بھی جو انحطاط آچکا تھا۔ اور علم کا مفہوم اسلام کے عہدِ زریں کے مقابلے میں، جس طرح محدود ہو گیا تھا، اس کا اندازہ مقدمۂ ابن خلدون کے ایک فقرے سے ہوتا ہے۔ اس کتاب کو فلسفۂ تاریخ کے ارتقا میں جو مقام حاصل ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں۔ بلاشبہ علامہ ابنِ خلدون کی علمی حیثیت عالمِ اسلام کے لیے باعثِ فخر ہے۔ حکما اور انبیا کے طریقِ کار سے اس نے بھی بحث کی ہے۔ اور اس معاملے میں اس کے اور حضرت مجددؒ کے نقطۂ نظر میں ایک لطیف لیکن اہم فرق ہے۔ وہ نبوت اور حکمت کے بنیادی تخالف کا قائل نہیں۔ بلکہ نبوت کو حکمت سے بالا اور ماورا سمجھتا ہے۔ جس میں حکمت کی حقیقی خوبیاں بھی ہیں اور (وحی کے توسط کی وجہ سے) اس کے علاوہ بھی کئی چیزیں۔ احکامِ نبوت کو، بہرکیف حکیمانہ استدلال پر فوقیت رہے گی۔ یہ نقطۂ نظر ٹھیٹھ اسلامی ہے۔ اور حکمت کی بھی غیر ضروری نفی نہیں کرتا۔ لیکن علمِ طبعیات کے متعلق ایک ایسا فقرہ ہے، جو علمائے وقت کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتا ہے۔ اور قریب قریب اسی انداز میں، جو حضرت مجددؒ نے علمِ ہندسہ کے متعلق اختیار کیا:۔

طبعیات کے مسائل ہمارے دینی معاملات میں ہمارے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔

..... لہٰذا ہمیں ان سے کنارہ کش ہی رہنا چاہیے۔

مغرب کی علمی ترقیوں ہی نہیں مسلمانوں کے علمی عہدِ زریں کے مقابلے میں بھی اب علم کا مفہوم جس طرح محدود ہو گیا۔ اور بعض علوم کے دروازے جس طرح مقفل کر دیے گئے بلکہ صحیح علمی اندازِ فکر کو جس طرح خیرباد کہہ دیا گیا، اس میں عہدِ اکبری کی بے اعتدالیوں کے علاوہ دُوسرے اثرات کو بھی دخل تھا لیکن اسلامی ہندوستان کی روز افزوں علمی پسماندگی کے بعض اسباب ایسے تھے جن کے لیے اکبر کی کی اپنی کوتاہیاں ذمہ دار تھیں۔ اور اس باب میں، جہاں ہم نے عہدِ اکبری کی علمی ترقیوں کو گنایا ہے، مناسب ہے کہ ان کوتاہیوں کی بھی نشان دہی کر دی جائے۔

ہم مغرب کی علمی ترقیوں کے ضمن میں متعدد دنی یونیورسٹیوں کے قیام اور طباعت کی ترویج کا ذکر کر چکے ہیں۔ ان معاملات میں اکبر نے کیا کیا؟

اکبر علم کا مربی تھا۔ ایک زمانے میں علما و صلحا کی امداد و سرپرستی کے لیے صدر الصدور کو بڑے وسیع اختیارات دے رکھے تھے، جن کا بسا اوقات دل کھول کر استعمال کیا گیا۔ لیکن اس نے

یا ابوالفضل نے کتنی یونیورسٹیاں قائم کیں؟ ایک نہیں، بلکہ اس کے پچاس سالہ عہدِ حکومت میں اس کی طرف سے فیروز تغلق کے قائم کردہ مدرسہ فیروزی یا ابتدائی اسلامی حکومت کے مدرسہ معزیہ یا مدرسہ ناصریہ کے پایہ کی کسی علمی درسگاہ کے قیام کا کہیں ذکر نہیں (اور بعد میں تو اکبر نے علما اور عامۃ المسلمین سے اپنے آپ کو اس قدر دُور کر لیا تھا کہ اگر وہ کوئی مدرسہ قائم کرتا تو کوئی راسخ العقیدہ مسلمان وہاں پڑھنے پڑھانے کے لیے نہ آتا۔ یا وہ مدرسہ ہی ذہنی انتشار کا سرچشمہ بن جاتا!)

چھاپہ خانہ سے بے اعتنائی اسی طرح افسوسناک ہے۔ عہدِ اکبری سے بہت پہلے یورپ میں چھاپہ خانہ کی ایجاد ہو چکی تھی۔ اور اکبر کے زمانے میں ہندوستان کے مغربی ساحل پر پرتگیزوں نے چھاپہ خانے قائم کر رکھے تھے۔ اکبر کے سامنے یہ کتابیں پیش بھی ہوئیں لیکن اس نے انھیں (خوشنما خطاطی کے مقابلے میں ابتدائی عہد کی بُری چھپائی کو دیکھ کر؟) پسند نہ کیا۔ اور علم کی وسیع اشاعت کا سب سے کارآمد ذریعہ ہاتھ سے کھو دیا۔[1]

علم کی توسیع کے ان بنیادی ذرائع کو نظر انداز کرنے کے علاوہ اکبری علم نوازی کی کمزوریاں اور کوتاہیاں اس وقت ظاہر ہوتی ہیں، جب ہم ان کتابوں کا جو شاہی سرپرستی میں ترجمہ ہوئیں ان علمی کتب سے مقابلہ کریں جو دورِ عباسیہ میں یونانی یا سنسکرت سے عربی میں منتقل ہوئیں۔ اکبر نے تالیف و ترجمہ کا انتظام کر کے یقیناً علمی خدمت کی۔ اور اس معاملے میں اپنے پیشرو شاہانِ دہلی پر اسے فوقیت حاصل ہے لیکن اس کی سرپرستی میں کتنی اور کس قسم کی کتابیں ترجمہ ہوئیں؟ تعداد کے لحاظ سے ان کو ان کتب سے کوئی نسبت نہیں۔ جو اتنی ہی مدت میں بغداد کے دار الحکمت میں ترجمہ کی گئیں۔ تعداد سے بھی زیادہ اہم کتب کی نوعیت ہے۔ عہدِ اکبری میں جو کتابیں ترجمہ ہوئیں یا لکھی گئیں۔ ان کے موضوع کیا تھے۔ اور ان میں علمی کتابیں کتنی تھیں؟ ان میں سے بعض کتابیں تو ہنود کی مذہبی کتابوں کا ترجمہ تھیں۔ جن کا مقصد ظاہر ہے، سیاسی تھا۔ بعض داستانیں اور افسانے تھے۔ جن کے ترجمہ سے بادشاہ اور بیگمات کی ضیافت طبع کا اہتمام مقصود تھا۔ چند کتابیں تاریخ کی تھیں۔ اس ساری فہرست پر غور کریں تو خالص علمی کتابیں فقط دو یا تین نظر آتی ہیں۔ ایک ریاضی میں لیلاوتی

---

[1] عہدِ عالمگیری کا ایک سیاح (Manucci) لکھتا ہے کہ کاتبوں کے اقتصادی مفاد کی خاطر مغلوں نے چھاپہ خانہ کو رواج نہ دیا۔

کا ترجمہ، دوسری علم ہیئت میں۔

عہدِ اکبری کی علم نوازی کا اگر مغرب کی معاصرانہ علمی ترقیوں سے نہیں، عہدِ عباسی کے علمی کارناموں سے مقابلہ کریں جنھوں نے ہر طرف سے اخذِ فیض کر کے، عربی میں متعدد نئے، مستقل علوم کی مستحکم بنیادیں قائم کر دیں۔ تو پتا چلتا ہے کہ مسلمانوں کی علمی سطح کس حد تک گر گئی تھی۔ بلکہ ذہن کس طرح بدل گئے تھے!

حقیقت یہ ہے کہ اکبر اور اس کے رفقائے کار کے سامنے زیادہ سے زیادہ ہرات کے سلطان حسین مرزا جیسے مربیانِ ادب و فن کی مثالیں تھیں۔ بغداد اور غرناطہ کی علمی سرگرمیوں سے وہ بے خبر تھے۔ اور اس زمانے میں علم نہیں، ادب و فنونِ لطیفہ کو عروج ہُوا۔

ملکی اور عسکری معاملات کو دیکھیں تو یہاں بھی کئی کمزوریاں نظر آتی ہیں۔ عہدِ اکبری میں پرتگیز بحرِ ہند پر مسلط تھے۔ بیگماتِ شاہی کے جہاز بھی پرتگیزوں کے اجازت نامے لے کر سفر کرتے تھے۔ اکبر نے اس صورتِ حالات کا کیا مداوا کیا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ پرتگیزوں کو سواحلِ ہند سے نکالنے کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ (اور یہ خواب تو شیر شاہ سوری بھی دیکھتا تھا) لیکن عملاً اس نے کیا کیا۔ پرتگیزوں کو ان علاقوں سے نکالنا تو بعد کی بات تھی۔ وہ کوئی قابلِ ذکر بحری بیڑہ بھی تیار نہ کر سکا۔

غرضیکہ عہدِ اکبری میں توسیعِ مملکت اور بڑی ترقی و تنظیم کے باوجود ایسی کمزوریاں تھیں جو آگے چل کر مہلک ثابت ہوئیں اور جن کی وجہ سے مغرب کا پلّہ روز بروز زیادہ بھاری ہو گیا۔ لیکن ان کوتاہیوں کا سبب فقط اکبر اور اس کے مشیروں کو قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جب ایک معاشرہ میں جمود یا انحطاط آتا ہے تو اس سے فقط ایک طبقہ متاثر نہیں ہوتا۔ زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی یہی عمل کارفرما ہوتا ہے۔

عہدِ اکبری صحیح معنوں میں جمود یا انحطاط کا دور نہ تھا۔ سیاسی اور انتظامی معاملات میں یہ ٹھوس ترقی کا دَور تھا، لیکن اگر اس ترقی کا مغرب کی معاصرانہ ترقیوں سے مقابلہ کریں تو رفتار سست اور ترقی محدود نظر آتی ہے۔ کچھ اسی طرح کا عمل علما اور صوفیہ کے ضمن میں کارفرما تھا۔ پہلے علما کو لیجیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس عہد میں تعلیم و تعلّم میں بنیادی اضافے ہوئے۔ گجرات کی ساحلی بندرگاہوں کے ایک مدت مدید کے بعد دہلی

کے تابع آجانے سے علما کو حج و زیارت کے لیے ہی نہیں' اعلیٰ دینی تعلیم کے لیے بھی حجاز جانے کا موقع ملا۔ چنانچہ علمِ حدیث کو شمالی ہند میں ایک نیا فروغ ہُوا۔ جس میں سب سے روشن نام شیخ عبدالحق محدثؒ کا تھا۔ کچھ اسی طرح کا معاملہ معقولات میں ہُوا۔ ایک وسیع سلطنت کے قیام اور اکبر کی علمی سرپرستی کا شہرہ سُن کر ایران و توران سے جو علما اور دانشور آئے' انھوں نے معقولات کو رواج دیا۔ اور علمِ حدیث کی طرح (حضرت مجدد الف ثانیؒ جیسے بزرگوں کی مخالفت کے باوجود) ان علوم نے بھی ہمارے درس میں ایک مستقل جگہ حاصل کر لی۔ لیکن اس وقت تو علمی ترقی کی رفتار کا مغربی ترقیوں سے مقابلہ ہو رہا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھیں تو رفتار بہت سُست اور ترقی بہت محدود نظر آتی ہے۔ امیر فتح اللہ شیرازی جیسے بزرگ چاہتے تو یہاں بھی کم از کم منتخب اداروں میں' سائنس کی تعلیم کا آغاز ہو سکتا تھا۔ مغرب میں اس وقت گلیلیو پیدا ہو چکا تھا' جس نے نئی ایجاد شدہ دُوربین کی مدد سے علمِ ہیئت اور فلکیات میں بُنیادی تبدیلیاں کیں اور فی الحقیقت سائنس میں مغربی ترقیوں کے نئے دَور کا آغاز کیا۔ لیکن ہمارے ہاں یہ سلسلہ قائم نہ ہُوا' بلکہ امیر فتح اللہ شیرازی نے جو کلیں اور مشینیں ایجاد کیں۔ ان کا سلسلہ بھی انفرادی نمود و نمائش کے کھیل سے آگے نہ بڑھا۔ اور یہ سلسلہ بھی امیر کے ساتھ ختم ہو گیا۔

محدود بلکہ ظاہری ترقی کا یہی عمل صوفیہ کے باب میں کارفرما تھا۔ عہدِ اکبری کے آخر میں سلسلہ نقشبندیہ کا آغاز ہُوا' جو شرع سے قریب تھا۔ اور جس کی تعلیم زیادہ مدوّن اور تنظیم زیادہ پختہ تھی۔ اس سے متعدد اہم فوائد رونما ہوئے۔ لیکن سوال تو معاصرانہ مغربی ترقیوں سے موازنہ کا ہے۔ یورپ میں اُس وقت اللہ سے لو لگانے اور دُنیا پر آخرت کے ترجیح دینے والوں کے طریقِ کار میں ایک بُنیادی انقلاب رونما تھا۔ رضائے الٰہی کے لیے اب عبادتوں' ریاضتوں اور اشغالِ روحانی میں غلو کی بجائے خدمتِ خلق کو راہِ نجات سمجھا گیا۔ متعدد ایسے سلسلے قائم ہوئے' جو محدود مسیحی عبادتوں اور روزوں اور اس طرح کے احکامِ مذہبی کی بجا آوری میں کوتاہی نہ کرتے۔

لیکن جن کا اصل زور خدمتِ خلق یعنی تبلیغِ مذہب، توسیعِ تعلیم، غریبوں، بیماروں اور دوسرے حاجت مندوں کی خدمت اور اصلاحِ معاشرہ پر تھا۔ افسوس کہ ہمارے ہاں اس جذبے کی نشو و نما نہ ہوئی۔ اللہ سے محبت کرنے والوں نے خلق اللہ سے محبت اور مخلوق کی عملی خدمت کا راستا اختیار نہ کیا، بلکہ زیادہ تر ریاضتوں اور مجاہدوں میں مستغرق رہے۔ اور آج بھی خدمتِ خلق کے معاملے میں مسلمان، اہلِ مغرب سے ہی نہیں، بلکہ ہندوؤں اور بودھوں سے بھی پیچھے ہیں!

ہم اپنی تاریخ اور عہدِ اکبری کے حالات پر غور کریں تو ظاہری ٹیپ ٹاپ میں اضافے ظواہر میں زیادہ احتیاط اور اشغال و اعمال کی بہتر تدوین کے باوجود، روحانی امور میں ایک "ترقیِ معکوس" نظر آتی ہے۔ ہمارے قدیمی صوفیائے کبار کی نسبت مستند مواد کم ہے۔ ملفوظات کے اکثر مجموعے جعلی ہیں۔ لیکن فوائد الفواد کی صحت میں کلام نہیں۔ اسے بغور پڑھیں تو پتا چلتا ہے۔ کہ کس پُر اثر طریقے سے اور کتنے تواتر کے ساتھ حضرت نظام الدین اولیاؒ اخلاقی پاکیزگی و بلندی اور بہتر انسان بننے کا سبق دیتے تھے۔ فوائد الفواد کا عہدِ مغلیہ کے صوفی شاہکاروں سے موازنہ کریں تو اوصاف نظر آتا ہے کہ اگرچہ شرع کی پابندی پر زیادہ زور ہے۔ نادر اور لطیف "معارفِ عالیہ" کی افراط ہے۔ "واقعات" کا کثرت سے بیان ہے۔ (فی الحقیقت "متخیلات" کو "واقعات" کا نام دینا ہی ایک افسوسناک رجحان کی نشاندہی کرتا ہے)۔ نئے نئے اور مسمریزم جیسا اثر رکھنے والے اشغال و اعمال کا سبق ہے۔ لیکن اخلاقی پاکیزگی اور باطنی سربلندی (یعنی بقول سلطان باہو "دِل دا گوڑ" دُور کرنے) سے وہ شغف، جو حضرت نظام الدین اولیاؒ کے ملفوظات میں نظر آتا ہے، موجود نہیں۔ گویا پابندِ شرع اور جوشیلے مسلمان بنانے کا سامان تو ہو رہا ہے۔ لیکن بہتر انسان بننے پر، جو سچا مسلمان ہونے کے لیے اتنا ہی (یا شاید زیادہ) ضروری ہے۔ پہلی سی توجہ نہیں رہی!

مولانا مودودی نے تو مغرب کے مقابلے میں اسلامی ممالک کی فقط عقلی اور علمی پسماندگی کا ذکر کیا ہے لیکن فی الحقیقت اس پسماندگی کا دائرہ بڑا وسیع تھا۔ اور اس کا آغاز اٹھارویں صدی سے بہت پہلے۔ عہدِ اکبری میں، بلکہ اس سے بھی پہلے ہو چکا تھا۔

رُکن السلطنت نواب مُرتضٰے خاں شیخ فریدؒ

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کار مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است!

علما اور مشائخ نے عہدِ اکبری کی مذہبی کشمکش میں جو حصّہ لیا، اس کا ذکر ہم کر چکے لیکن اسلام میں مذہب کی حمایت کسی ایک خاص طبقے کا فرض یا اجارہ نہیں۔ اسلام میں بعض دوسرے مذہبوں کی طرح پروہتوں یا پجاریوں کا کوئی علیحدہ طبقہ نہیں۔ جن کے بغیر مذہبی رسوم ادا ہی نہیں ہو سکتیں۔ ہر ایک مسلمان بطور خود نماز پڑھ سکتا ہے۔ عبادت کے لیے اسے کسی پجاری کے واسطے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ انسانی فطرت کے اس راز دار (بانیٔ اسلامؐ) نے تو ہدایت کی تھی کہ نمازِ جمعہ کا خطبہ بجائے قاضی یا خطیب کے مسلمان حاکم پڑھے۔ دین کو کسی خاص طبقے کا اجارہ نہ بنانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب اسلام پر جب کوئی کشمکش کا زمانہ آیا تو اسلام کی حفاظت کے لیے فقط مذہبی جماعتیں نہ اُٹھیں بلکہ دُنیا دار مسلمانوں نے بھی اس میں اپنی بساط کے موافق حصّہ لیا۔ ہندوستان میں یہ رجحان دوسرے اسلامی ملکوں سے بھی زیادہ ہے۔ جب خلجیوں کے زوال کے بعد ایک نیم مسلم غلام خسرو تختِ دہلی پر بیٹھا اور مسجدوں اور قرآنوں کی بے حرمتی ہونے لگی تو جس شخص نے اس صورتِ حالات کو ختم کیا۔ وہ دیپالپور کا حاکم غیاث الدین تغلق تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد اسلام پر مشنریوں کے حملے ہوئے تو ان کے جواب کے لیے فقط مولٰنا محمد قاسمؒ۔ مولٰنا رحمت اللہ اور دوسرے علمائے کرام ہی نہ اُٹھے، بلکہ سرسید احمد خاں۔ سید امیر علی اور خواجہ کمال الدین نے بھی اس بارے میں کچھ کم کام نہ کیا۔

عہدِ اکبری میں بھی یہی ہُوا۔ اکبر کے خیالات بگاڑنے میں جتنا دخل بعض علما و مشائخ (مثلاً شیخ مبارک۔ ابوالفضل۔ حاجی ابراہیم سرہندی۔ شیخ امان پانی پتی کے بھتیجے مُلّا ابوسعید) کو تھا۔ امرا کو نہ تھا، لیکن علما میں ہی بعض بزرگوں نے حالات کو

سنوارنے کے لیے بڑی قربانیاں کیں۔ امرا کا معاملہ بھی اسی طرح تھا۔ انھوں نے دربار کے قواعد و آئین تسلیم کر لیے، لیکن بعضوں (مثلاً شہباز خاں کنبوہ۔ قطب الدین کوکہ۔ خان اعظم) نے بڑی جرأت سے بادشاہ کو سمجھایا اور جب یہ کوشش ناکام رہی تو اپنے اثر و رسوخ سے اکبری بے قاعدگی کو دربار اور محل سے باہر عام ہونے سے روکا۔

عہدِ اکبری کے متدین امرا میں خان اعظم۔ قلیج خاں اور دوسرے نام آتے ہیں، لیکن ان میں جو خاص مرتبہ شیخ فرید کا ہے کسی اور کا نہ تھا اور چونکہ انھوں نے دوسرے نیک اور برگزیدہ کاموں کے علاوہ طریقۂ نقشبندیہ کو غیر معمولی مدد دے کر اسلامی ہندوستان کی مذہبی تاریخ پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ اس لیے ان کے حالات تفصیل سے لکھے جانے کے مستحق ہیں۔ افسوس ہے کہ اس زمانے کے مؤرخین سے اس کام میں بہت تھوڑی مدد ملتی ہے۔ شیخ فرید کا ستارہ اس وقت چمکا۔ جب عہدِ اکبری کے مشہور مؤرخ مثلاً بدایونی اور خواجہ نظام الدین احمد مصنف طبقاتِ اکبری، وفات پا چکے تھے اور عہدِ جہانگیری کے مؤرخین بیشتر ان کی ملکی خدمات کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کے سارے کارنامے کسی نے نہیں گنوائے۔ شیخ کے اپنے ایما پر دو تاریخیں لکھی گئیں۔ ایک شیخ عبدالحق محدثؒ کے صاحبزادے شیخ نورالحق نے، جن کی شادی شیخ فرید کے گھرانے میں ہوئی تھی۔ شیخ کے ایما پر اپنے والد کی تالیف تاریخ حقی کو اضافہ کے بعد زبدۃ التواریخ کے نام سے مرتب کیا۔ دوسری کتاب اکبرنامہ ہے، جسے شیخ الہداد فیضی سرہندی ابن ملا علی شیر نے لکھا، جو شیخ کی ملازمت میں تھا اور جس کے والد کے شاگردوں میں طبقاتِ اکبری کے مؤلف بخشی نظام الدین احمد کا نام لیا جاتا ہے۔ ان دونوں کتابوں میں بھی بہ تقاضائے موضوع فقط ملکی خدمات کا ذکر ہے۔ شیخ فرید کے باقی کارنامے کسی میں نہیں۔ ہم کچھ حضرت مجددؒ اور حضرت خواجہ باقی باللہؒ کے مکتوبات اور ملفوظات سے اور کچھ مآثر الامرا اور دوسری تاریخی کتب سے پھول پتی جمع کر کے اس فخرِ روزگار کے مزار پر اعتراف و عقیدت کا گلدستہ پیش کرتے ہیں۔

شیخ فرید بخاری سید تھے۔ حکومت اسلامی کے دوران میں سادات و مشائخ کی

قدر ہوتی تھی۔ چنانچہ ان کے آباؤ اجداد کو بھی مدد معاش ملتی تھی اور اسی پر ان کی گزر تھی۔ شیخ کے جد چہارم سید عبدالغفار دہلوی کو خیال ہوا کہ یہ طریقہ ٹھیک نہیں۔ انھوں نے اپنی اولاد کو وصیت کی کہ مددِ معاش ترک کر دینی چاہیے۔ اور نوکری سپاہ گری اختیار کرنی چاہیے۔ چنانچہ اسی پر ان کی اولاد کا عمل رہا۔

شیخ فرید کے والد کا نام احمد بخاری تھا۔ ان کے ایک بھائی محمد بخاری تھے جو شیخ فرید کے بھائی سید جعفر کے ساتھ گجرات کے ایک معرکے میں ۱۵۷۳ء میں کام آئے تھے۔ احمد بخاری کے تو کوئی حالات نہیں ملتے لیکن شیخ محمد کا ذکر تواریخ کی کتب میں آتا ہے۔ اکبر کو ان کی وفاداری اور عقل پر بڑا بھروسا تھا اور چنار کا قلعہ اسے شیخ کی کوششوں ہی سے ملا تھا۔ وہ ایک عرصہ تک اجمیر میں حضرت خواجہ کی درگاہ کے مہتمم رہے۔

شیخ فرید جن کا پورا نام ان کے لوحِ مزار پر شیخ فریدالدین لکھا ہے' دہلی میں پیدا ہوئے۔ صغر سنی میں ہی اکبر کے ملازم ہوئے اور اپنی معاملہ فہمی' ذہانت' دیانتداری اور بہادری کی وجہ سے جلد شہرت حاصل کر لی۔ چنانچہ اکبر نے انھیں کئی اہم کام سرانجام دینے پر مامور کیا۔ ۱۰۰۴ھ ۱۵۹۵-۹۶ء میں جب ہندوستان میں سخت قحط پڑا تو لوگوں میں روپیہ اور اشیائے ضروری تقسیم کرنے کے لیے بادشاہ نے انھیں مقرر کیا اور سرکاری مدد کے علاوہ انھوں نے اپنے پاس سے بھی غریبوں اور محتاجوں کی بے انتہا مدد کی۔ اس کے بعد جب ۱۶۰۰ء میں اسیر گڑھ کے معرکے کے وقت حاکمِ خاندیش سے اکبر کے نمائندوں کی گفت وشنید تو شیخ فرید نے ہی اس موقع پر شہنشاہ کی نمائندگی کی۔ شیخ فرید کا منصب بہت بڑا نہ تھا۔ (اکبر کے چالیسویں سال جلوس تک وہ ابھی ڈیڑھ ہزاری تھے) لیکن چونکہ دیانتداری اور کارگزاری مسلمہ تھی۔ اس لیے انھیں اکثر ذمہ داری کے کام سونپے جاتے۔ جب انھیں میر بخشی بنایا گیا تو ان کا اثر و اقتدار اور بھی بڑھ گیا بلکہ دیوان تن[1] کے بھی

---

[1] دیوان تن دیوان تنخواہ کو کہتے تھے۔ سلطنت مغلیہ میں دیوان کل (وزیر اعظم) کے دو نائب تھے۔ ایک دیوان تن اور دوسرا دیوان خالصہ۔ پہلے کے متعلق تمام ممالک محروسہ کے ملازمان اور جاگیرداروں کی

[باقی اگلے صفحے پر]

کئی اختیارات ان سے متعلق ہو گئے ۔ (اقبال نامہ جہانگیری)

شیخ فرید نے عہدِ اکبری کی مہموں میں حصہ لیا۔ ۹۸۳ھ میں جب بنگالہ میں افغانوں نے بغاوت کر رکھی تھی اور سپہ سالارِ جنگ خانِ اعظم اپنے جانشین کا انتظار کیے بغیر اپنی جاگیر پر حاجی پور (بہار) چلا گیا تو شیخ نے ہی ایک اور رفیق کے ساتھ معاملے کو ہاتھ میں لیا۔ بلکہ افغانوں کے سرگروہ قتلو کی غدّاری کی وجہ سے مرتے مرتے بمشکل بچا۔ کشمیر کی مہم میں بھی شیخ فرید نے نمایاں حصہ لیا۔ (۹۸۶ھ) اس کے پانچ سال بعد مرزا یادگار نے اکبر کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا تو اکبر نے جن امرا کو بطورِ ہراول کے بغاوت فرو کرنے کے لیے بھیجا۔ ان میں خواجہ محمد اعظم مصنف تاریخِ کشمیر "امیرالامرا شیخ فرید بخاری میر بخشی" کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ (ص ۱۱۷) ان کے پاس مختصر فوج تھی، لیکن لوگوں نے ان کا استقبال کیا اور ساتھ دیا۔ حتیٰ کہ مرزا یادگار کا سر کٹ کر اکبر کے پیش ہُوا۔ اسیر گڑھ کے محاصرے میں شیخ نے ۱۶۰۰ء میں جو کچھ کیا، ابوالفضل اس کی جا بجا تعریف کرتا ہے۔ تتمہ اکبر نامہ کے مطابق ۱۰۱۳ھ / ۱۶۰۴ء میں شیخ کا منصب بڑھا کر "چہار ہزاری دو ہزار سوار" علم اور نقارے کے ساتھ کر دیا گیا لیکن شیخ کی اہمیت اور اکبر کے دل میں اس کی قدر و منزلت کا اس سے بھی اندازہ نہیں ہوتا۔ اس کے لیے دوسرے قرائن پر نظر ڈالنی پڑتی ہے۔ ایشیائی ملکوں میں ایک بادشاہ کا کسی امیر کے گھر جا کر قیام کرنا جس احترام اور اختلاط کا پتا دیتا ہے، وہ ظاہر ہے۔ آئینِ اکبری اور تُوزکِ جہانگیری سے پتا چلتا ہے کہ اکبر (اور پھر جہانگیر) نے کئی مرتبہ دہلی میں شیخ فرید کے ہاں قیام کیا۔ دہلی میں لال قلعہ کے قریب سلیم گڑھ ایک قلعہ نما عمارت ہے۔ عہدِ اکبری میں اس کے سب طرف جمنا بہتی تھی۔ اکبر نے یہ عمارت شیخ فرید کو عطا کی ہوئی تھی اور وہ کئی مرتبہ اس میں شیخ فرید کا مہمان ہُوا۔ آئینِ اکبری میں ۹۸۵ھ / ۱۵۷۷ء

(بقیہ فٹ نوٹ ص ۱۵۶)

تنخواہ کا حساب کتاب تھا۔ دوسرے کے متعلق خالصہ شریفہ کا دفتر رہتا تھا۔ وزیرِ اعظم کے بعد یہ دونوں عہدے بہت معزز سمجھے جاتے تھے۔

کے ذکر میں ہے :۔

"دار الملک دہلی بقدوم شاہنشہی فروغ سعادت یافت .... منازل شیخ فرید بخشی بیگی بمقتضائے التماس آں اخلاص گزیں خدمت گزار از پر تو نیہان خدیو نور آگیں شد"۔

توزک جہانگیری میں جہانگیر سلیم گڑھ میں اپنے قیام کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے :۔

"روز پنجشنبہ، سیزدہم، دہلی محل نزول گردید و در منزلے کہ سلیم خاں افغان در ایام حکومت خود در میانِ آبِ جمن ساختہ بود و سلیم گڑھ نام نہادہ و والد بزرگوارم آنجا را بہ مرتضےٰ خاں (شیخ فرید) کہ دہلی وطن اصلی اوست دادہ بودند فرود آمدم۔ خان مذکور بر در یا صفہ از سنگ ساختہ در غایت لطافت ... در ایامیکہ حضرت جنت آشیانی در دہلی تشریف داشتند۔ اکثر اوقات آنجا نشستہ با مصاحبان و مجلسیان بخود صحبت میداشتند"

شیخ فرید کا عہدہ میر بخشی کا تھا، لیکن جب ابوالفضل دکن کو رخصت ہوا اور پھر مارا گیا تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد بادشاہ کے سب سے زیادہ حاضر باش اور معتمد افسر شیخ فرید ہی تھے اور انھیں ہر قسم کے فرائض سپرد ہوتے تھے۔ مثلاً آئینِ اکبری میں لکھا ہے کہ جب اکبر کی ماں مریم مکانی وفات پا گئیں اور دربار میں ماتمی رسوم و آئین جاری تھے تو اس دوران میں دسہرہ کا تہوار آ گیا۔ بادشاہ نے چاہا کہ ہندوؤں کو یہ خوشی کا تہوار منانے کا موقع دینا چاہیے اور ماتم کی میعاد ختم کرنی چاہیے۔ چنانچہ شیخ فرید کو اس قسم کا فرمان جاری کرنے کا حکم ہوا۔ حالانکہ میر بخشی کا ان معاملات سے کوئی تعلق نہ تھا۔

اس کے علاوہ اور کئی اہم موقعوں پر شیخ فرید کو پیچیدہ معاملات ہاتھ میں لینے پڑے۔ اکبر نامہ کے تتمہ میں جو ابوالفضل کی وفات کے بعد لکھا گیا، درج ہے کہ جب ابوالفضل کے قتل کی خبر دار الخلافہ میں پہنچی تو کسی کو ہمت نہ پڑتی تھی کہ بادشاہ سے جا کر حقیقت حال کہے۔ آخر میں شیخ فرید کو یہ فرض ادا کرنا پڑا۔ اسی طرح جب اکبر کے مرض الموت میں حکیم علی گیلانی کے معالجے سے تمام بیگمات ناراض تھیں بلکہ جہانگیر بھی کہتا تھا کہ میرے باپ کو حکیم علی نے غلط علاج سے ہلاک کر دیا تو

حکیم نے شیخ فرید کے گھر جا کر پناہ لی۔ اکبر نامہ کا تتمہ نگار شیخ کے اس فعل کی شکایت کرتا ہے کہ انھوں نے کیوں حکیم علی کو امان دی۔ لیکن شیخ کے اثر و رسوخ کا اس بات سے ہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ تمام بیگمات اور نئے بادشاہ کے غیظ و غضب کے باوجود انھوں نے حکیم کو کوئی آزار نہ پہنچنے دیا۔

عہدِ جہانگیری میں شیخ کا مرتبہ بڑھ گیا بلکہ مآثر الامرا میں لکھا ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں بلکہ تمام اعیانِ سلطنت سے بازی لے گئے[1] (اختبار و رتبہ او از اقران و امثال بلکہ جمیع اعیان و ارکانِ سلطنت برگزشت) اس کا باعث ان کے دو اہم کام تھے جو انھوں نے بڑی خوبی سے سرانجام دیے۔ ایک تو جہانگیر کی تخت نشینی کا اہتمام جس سے خوش ہو کر جہانگیر نے "صاحبِ سیف و قلم" کا خطاب دیا اور ان کا منصب بڑھا کر پانچ ہزاری کر دیا۔ دوسرا اہم کام خسرو کی شکست تھا، جس پر اظہارِ خوشنودی کے لیے بادشاہ خود شیخ کے خیمے میں گیا۔ اس سے بغل گیر ہوا اور شیخ کو نواب مرتضیٰ خاں کا خطاب دے کر گجرات کا صوبیدار مقرر کیا۔ یہ واقعہ جہانگیر کے پہلے سالِ جلوس میں ہوا۔ اس کے چار سال بعد شیخ کو پنجاب کا گورنر مقرر کیا گیا اور اسی عہدے پر انھوں نے ۱۰۲۵ھ (۱۶۱۶ء) میں وفات پائی۔ بادشاہ نے انھیں قلعہ کانگڑہ کی فتح پر مامور کیا تھا، کہ پٹھان کوٹ میں انھیں موت کا بلاوا آن پہنچا۔ حسبِ وصیت نعش کو دہلی میں لا کر ان کے بزرگوں کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔

---

[1] لیکن یہ صورتِ حالات عارضی ثابت ہوئی۔ جہانگیر نے امیر الامرا اور وکیلِ مطلق اپنے بچپن کے دوست شریف خاں (ابن عبد الصمد خاں مصور) کو کیا اور آہستہ آہستہ ایرانی امرا دربار پر چھا گئے۔ شریف خاں شیخ فرید کا شروع سے بدخواہ تھا۔ چنانچہ جب شیخ فرید خسرو کے تعاقب میں گئے تو شریف خاں نے کہنا شروع کیا کہ شیخ دانستہ معاملے کو طول دے رہا ہے اور اس کی نیت نیک نہیں ہے۔ (جہانگیر نامہ)۔ جہانگیر آخر تک ان کا معترف رہا، لیکن ایسا نظر آتا ہے کہ جو وسیع اثر و اقتدار شیخ فرید کو اکبر کے آخری سالوں میں حاصل تھا پھر نصیب نہیں ہوا۔

نواب مرتضیٰ خاں شیخ فرید کی اسلامی ہندوستان کے امرا میں ایک عدیم النظیر حیثیت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے وجیہ شخصیت دی تھی۔ "بسیار خوش قد، بالا بلند خوش محاورہ بُود"[1] لیکن ان کا اصل مرتبہ ان کے کاموں کی وجہ سے ہے۔ ان کے نیک کاموں کا سلسلہ بڑا وسیع تھا اور بزرگانِ کبار ان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ حضرت مجددؒ ایک خط میں ان کی تعمیر مسجد کا ذکر کرتے ہوئے ان کو لکھتے ہیں:

"ایک درویش لاہور کی طرف سے آیا ہوا تھا اس نے بیان کیا کہ شیخ جیو پرانی منڈی کی جامع مسجد میں نماز جمعہ کے لیے حاضر ہوئے تھے اور میاں رفیع الدین نے آپ کی التفات کے اظہار کے بعد کہا کہ نواب شیخ جیو نے اپنی حویلی میں جامع مسجد بنائی تھی (یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب نواب شیخ فرید لاہور کے گورنر تھے)۔ الحمد للہ علےٰ ذالک۔ حق تعالیٰ آپ کو زیادہ توفیق عنایت فرمائے مخلصوں اور یاروں کی اس قسم کی باتیں سن کر بہت ہی خوشی حاصل ہوتی ہے۔"

شاہ ولی اللہؒ نے انفاس العارفین میں ایک ضیافت کا ذکر کیا ہے، جو نواب شیخ نے کسی رفاہ عام کی عمارت بنانے کے سلسلے میں منعقد کی تھی اور جس میں شہر کے سارے مشائخ کو دعوت دی تھی۔ اس سلسلے میں کہتے ہیں:۔

"شیخ فرید بخاری کہ از اعاظم امرائے آں زماں بود و جامع بود در میان نجابت وصلاح و اعتقاد مشائخ صوفیہ عمارتے تعمیر داد۔ کاروانسرائے مشہور یا دیگرے۔"

مآثر الامرا میں ان کی داد و دہش کی داستان تفصیل سے لکھی ہے، جسے دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ شاید اسلامی ہندوستان کی ساری تاریخ میں اس پایہ کا سخی اور عالی حوصلہ امیر کوئی نہیں ہوا[2]۔ نواب شاہنواز لکھتے ہیں:۔

---

[1] ذخیرۃ الخوانین صفحہ ۱۳۱۔ ہم نے اسلامی حکومت کی جو تاریخ انگریزی میں لکھی ہے، اس میں شیخ فرید کی تصویر ایک معاصرانہ مرقع سے لے کر پیش کی ہے۔

[2] اقبال نامہ جہانگیری میں شیخ کی نسبت لکھا ہے: "اگرچہ اسمت بخشی داخت لیکن بخشی و بود وزیر نشان و چند سال دفتر تن را، کہ لازمہ خدمت دیوانی است از بے رشتی دیوان بجانب خود کشیدہ، محال جاگیر را بار بابِ طلب تنخواہ مے نمود۔ ظاہر و باطن شیخ بعنایت آراستہ و

[باقی اگلے صفحے پر]

"شیخ ظاہر و باطن آراستہ داشت۔ شجاعت را با سخاوت جمع نمودہ بخشش عام او در فیض بر روئے خلق باز کردہ۔ ہر کہ بادر سیدے۔ چہرۂ ناکامی در آئینۂ خیال ندیدے۔"

آگے چل کر ان کی فیاضی کی تفصیلات دی ہیں۔ لکھا ہے کہ وہ دربار پہنچنے تک قبا اور کمبل اور چادر اور با اقرار راستے کے درویشوں میں تقسیم کرتے اور اشرفیوں اور روپوں کی ریزگاری اپنے ہاتھ سے خیرات کرتے۔ ایک دفعہ ایک درویش نے سات مرتبہ آن کر اُن سے خیرات لی۔ آٹھویں بار پھر آیا۔ اس وقت شیخ نے اس کے کان میں کہا کہ سات دفعہ جو کچھ لے گئے ہو اُسے چھپا کر رکھنا۔ کہیں دوسرے درویش تم سے چھین نہ لیں۔ شیخ نے بیواؤں اور اہلِ خانقاہ اور ارباب توکل و احتیاج کا سالانہ مقرر کر رکھا تھا، جو خواہ وہ حاضر ہوں یا غیر حاضر، انھیں باقاعدہ پہنچتا تھا۔ جو لوگ ان کی ملازمت میں وفات پا گئے تھے، ان کے بچوں کے لیے شیخ نے مناسب ماہانہ مقرر کر رکھا تھا اور اُستاد مقرر کر کے ان کی تربیت کا انتظام کیا تھا۔ یہ بچے شیخ کی گود میں اس طرح کھیلتے کہ گویا ان کے اپنے بچے ہیں۔ گجرات میں اُنھوں نے سادات کی فہرست بنا کر ان کے بچوں کے لیے شادی کے اخراجات اپنی سرکار سے مقرر کیے تھے، لیکن شیخ بھاٹوں اور میراثیوں کو جو امرا کی تعریف میں کبت پڑھ کر اُن سے روپیہ بٹورتے تھے کچھ نہ دیتے۔ انھوں نے کئی مسافر خانے اور سرائیں تعمیر کرائیں۔ احمد آباد میں ایک محلہ تعمیر کیا، جو ان کے نام پر بخاری محلہ کہلاتا ہے۔ مشہور احمد آبادی عالم، شاہ وجیہ الدین کا روضہ اور مسجد بھی انھی کی تعمیر کی ہوئی ہیں۔ دہلی کے قریب فرید آباد اور اس کی عمارتیں اور تالاب شیخ کی یادگار ہیں۔ حضرت سلطان المشائخ کے مزار پر انھوں نے صندل کا چھپر کھٹ بنوایا تھا اور اس پر سیپ کی جڑکاری کرائی تھی۔ لاہور میں بھی ایک محلہ انھوں نے بنوایا۔ لیکن اپنے لیے کبھی کوئی مکان یا

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۹۰)

سنجیدہ بود۔ بزرگی و دولت از و قدر و شرف داشت، نہ او از بزرگی و دولت۔ شجاعت را بہ سخاوت فراہم آوردہ خیر بالذات بود۔"

حویلی تعمیر نہیں کرائی۔ ہمیشہ اس طرح قیام کرتے کہ گویا کوچ پر ہیں۔ سپاہ کی تنخواہ اپنے روبرو تقسیم کرواتے۔ ہر روز ایک ہزار آدمی کو ان کی سرکار سے کھانا ملتا۔ پانسو کا کھانا تو ان کے گھر پر بھجوایا جاتا اور بانسو کے ساتھ شیخ خود بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ لوگ کتنا بھی شور مچاتے، لیکن شیخ کی پیشانی پر شکن نہ آتا۔

نواب شاہنواز مصنف مآثر الامرا نے بڑے بڑے امرا دیکھے تھے۔ وہ خود نظام الملک آصف جاہ کے زمانے میں برار کے دیوان اور پھر نواب ناصر جنگ کے وزیر رہ چکے تھے۔ سادات بارہہ اور دوسرے عظیم الشان امرا کی فیاضیوں سے واقف تھے، لیکن وہ افسوس کرتے ہیں کہ شیخ فرید کے پائے کا انسان اس زمانے میں نہیں ملتا۔ وہ شیخ کا ذکر کر کے کہتے ہیں کہ وہی دن ہے اور وہی رات اور وہی ستاروں کی گردش، لیکن ملک اس قسم کے انسانوں سے خالی ہو گیا ہے۔ شاید وہ لوگ کہیں دوسری جگہ چلے گئے ہیں "سبحان اللہ! اگرچہ ہماں تقلب لیل و نہار است و سیر کواکب و دورِ سپہر۔ لیکن دریں جزو زماں ایں ولایت ازیں مردم خالی است۔ شاید کہ بحصہ دیگر مملکتے رفتہ اند" نواب شیخ فرید فوت ہوئے تو ان کی تاریخ ہوئی داد۔ خورد۔ بُرد یعنی اس نے لوگوں میں اپنا مال و زر تقسیم کر دیا۔ خود خرچ کیا اور دارین کی سعادتیں ساتھ لے گیا۔ جب وفات کے بعد اس امیر کبیر کا اثاثہ گنا جانے لگا تو معلوم ہوا کہ چونکہ اس حاتمِ ثانی[1] نے اپنی زندگی میں ہی اپنا سب کچھ لوگوں کی حاجت روائی میں خرچ کر دیا تھا۔ اثاثہ میں ایک ہزار اشرفی کے سوا کچھ نہیں۔

عدیم النظیر فیاضی اور خدماتِ ملی کے علاوہ شیخ فرید کا بڑا کام طریقہ نقشبندیہ کی حمایت اور سرپرستی ہے۔ ہندوستان میں اس سلسلے کا صحیح آغاز حضرت مجدد الف ثانی کے مرشد حضرت خواجہ محمد باقی باللہؒ نے کیا جو اپنی وفات سے چار پانچ سال پہلے اس کام پر مامور ہوئے۔ اس قلیل مدت میں ان کا سلسلہ بڑا وسیع نہ ہوتا، لیکن شیخ فرید نے

---

[1] حضرت مجددؒ کی سوانح عمری حضرات القدس میں شیخ فرید کا ذکر حاتمِ وقت کہہ کر کیا گیا ہے (ص ۱۰۱)

ان کی اور ان کے سلسلے والوں کی کمال خدمت کی۔ خانقاہ کے سارے اخراجات اپنے ذمے لیے اور درویشوں اور دوسرے متعلقین کے لیے معقول وظیفے مقرر کر دیے تاکہ وہ یکسوئی سے اللہ اللہ کریں اور ارشاد و ہدایت میں مشغول رہیں۔ شیخ فریدؒ اور خواجہؒ کے تعلقات کچھ اس قسم کے تھے کہ حضرت خواجہؒ کی زندگی میں ہی نکتہ چین کہتے تھے کہ حضرت خواجہؒ کی کامیابی شیخ فرید کی وجہ سے ہے۔ یہ اعتراض کسی نے حضرت خواجہؒ تک بھی پہنچایا، لیکن آپ شیخ فریدؒ کی عظمت و فضیلت سے واقف تھے۔ آپ نے اس پر کوئی دھیان نہ دیا بلکہ شیخ فرید کی خوبیوں کی طرف اشارہ کیا۔ آپ کے ملفوظات میں لکھا ہے:۔

ایک عزیز نے حضور کی خدمتِ اقدس میں بیان کیا کہ بعض کوتاہ بین سیاہ دل کہتے ہیں کہ حضورؒ کی مشیخت کا مدار (یگانۂ زمانہ مرجع خلق) نواب قدس القاب شیخ فرید سلمہ اللہ تعالےٰ کی دوستی پر ہے اور ہمیشہ رقعات میں جو شیخ کی طرف لکھتے ہیں ان کا سر نامہ قبلہ گاہی سلامت باشند۔ تحریر فرماتے ہیں۔ فقرا سے اس قسم کی خوشامد اچھی نہیں۔ حضور نے اس کے جواب میں فرمایا کہ ہم پر شیخ کے بہت حق ہیں۔ اور ان کے وجود کی برکت سے

لہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے بعض مکتوبات سے، جو حضرت خواجہؒ کے نام لکھے گئے، خیال ہوتا ہے کہ نہ صرف خانقاہ باقویہ کے درویشوں کا ذمہ شیخ فرید نے لیا تھا۔ بلکہ دوسرے فقرا، علما اور مستحقین کو جو کچھ شیخ فرید کی سرکار سے ملتا۔ وہ حضرت خواجہؒ کی وساطت سے تقسیم ہوتا تھا۔ حضرت مجددؒ ایک خط میں مرشد کو لکھتے ہیں "لشکر سے ایک شخص نے آکر بیان کیا کہ دہلی اور سرہند کے وظیفہ دار فقرا کا روپیہ گزشتہ خریف کی بابت حضور کی بلند درگاہ کے خادموں کے حوالے ہوا ہے تاکہ حق ثابت کرنے کے بعد حق داروں کو پہنچا دیں.... ہزار تنکہ فصلانہ شیخ ابوالحسن حافظ و اہلِ علم کے نام اور ہزار تنکہ فصلانہ شیخ شاہ محمد حافظ کے نام نواب شیخ کی سرکار سے مقرر ہے۔ دونوں مذکورہ بالا شخص زندہ ہیں..... ان دونوں... کا روپیہ حامل عریضہ ہذا کے حوالے کر دیں۔" اس سے اگلا خط "حبیب اللہ سرہندی کی والدہ اور اس کی بیوی اور دوسرے بزرگوں کے وظائف کی ادائگی کے متعلق ہے۔

ہم نے بڑی فتوحات اور کشائش دیکھی ہیں۔ اب بھی ہمیں کوئی ایسی وجہ شرعی معلوم نہیں ہوتی جس کے باعث شیخ موصوف سے دوستی کا تعلق قطع کریں۔

حضرت مجدد الف ثانی بھی ایک خط میں شیخ فرید کو لکھتے ہیں "حضرت قبلہ گاہی قدس سرہ (یعنی حضرت خواجہ باقی باللہؒ) فرمایا کرتے تھے کہ شیخ جیو (شیخ فرید) کے حقوق تم سب پر ثابت اور مقرر ہیں۔ اس جمعیت کا باعث آپ ہی ہیں"۔ یہ مکتوب حضرت مجددؒ نے شیخ موصوف کو مرشد کی وفات پر لکھا تھا۔ اس میں حضرت خواجہ کی وفات پر اظہار کر کے لکھتے ہیں:-

"لیکن اللہ تعالیٰ کی حمد اور احسان ہے کہ اس ہولناک حادثہ اور وحشتناک واقعہ کے باوجود ان بے سروسامان فقرا کا مربی اور مددگار بھی دین و دنیا کے سردار صلی اللہ علیہ وسلم کی اہل بیت سے مقرر ہوا ہے۔ (شیخ فرید کی سیادت کی طرف اشارہ ہے) جو اس سلسلہ علیہ کے انتظام اور نسبت نقشبندیہ کی جمعیت کا وسیلہ ہے۔

ہاں یہ نسبت علیہ بھی، جو اس ملک میں بہت غریب ہے اور اس نسبت والے لوگ ان ملکوں میں بہت تھوڑے ہیں۔ چونکہ اہلِ بیت کی نسبت کی طرح ہے تو اس کا مربی بھی اہلِ بیت ہی سے ہونا مناسب ہے۔ اس کی تقویت کے لیے بھی انھی نسبت والوں سے ہونا بہتر ہے تاکہ اس بڑی دولت کی تکمیل غیروں کے حوالے نہ کی جائے۔ جس طرح اس بڑی نعمت کا شکر فقرا پر واجب ہے، اسی طرح اس دولت کا شکر بھی ان کے ذمے لازم ہے۔ انسان جس طرح باطنی جمعیت کا محتاج ہے، اسی طرح ظاہری جمعیت کی بھی اس کو احتیاج ہے..... اس میں شک نہیں کہ خدائے تعالیٰ کی توفیق سے ان فقرا کی ظاہری جمعیت کے ضامن اور کفیل آپ ہی ہیں۔

ایک اور خط میں حضرت مجددؒ لکھتے ہیں:-

"ہر کسے کہ شکرِ آدمی بجا نیارد۔ شکرِ خدائے عزّ وجل بجا نیارد۔ پس بر ما فقیران ذکر احسان شما لازم است۔ اولاً سبب جمعیت خاطر حضرت خواجہ ما (حضرت

خواجہ باقی باللہ) شما بودہ اید۔ بطفیل شما دراں جمعیت طلب حق سبحانہ و تعالیٰ کردیم وحظہائے وافر بردیم و ثانیاً چوں بحکم کبرت یموت اکبو اءنوبت باین طبقہ رسید۔ واسطۂ اجتماع فقرا و باعثِ انتظام طالبان نیز شما ئید جزاکم اللہ

گر بر تنِ من زباں شود ہر موئے
یک شکرِ تو از ہزار نتواں کرد

شیخ فرید کے حسنِ عقیدت اور دستِ کرم نے بہت سے مزارات کی شان و شوکت بڑھائی، لیکن ان کا اپنا مزار کس مپرسی کی حالت میں ہے[1]۔ دہلی سے قطب کو جو راستا جاتا ہے، اس پر ایک سڑک حضرت چراغ دہلی کو مڑتی ہے، اس سڑک پر ایک سرخ گنبد کے سامنے ایک قبرستان میں شکستہ چاردیواری کے اندر بہت سی قبریں ہیں ان کے درمیان لوہے کے ایک مختصر کٹہرے کے اندر سنگ مرمر کی ایک چھوٹی سی قبر ہے۔ سرہانے قدِ آدم کتبہ سنگ مرمر کا لگا ہوا ہے۔ اس کی عبارت یہ ہے :۔

یا اللہ

سُبحان الملک الحیّ الذی لا یموت ولا یفوت

در زمان دولت حضرت عرش آشیانی جلال الدین اکبر بادشاہ غازی شیخ فرید الدین سید احمد بخاری بعنایات آنحضرت ممتاز بود و در عہدِ عدالت نورالدین جہانگیر بادشاہ ابن اکبر بادشاہ بخطاب مرتضیٰ خاں سرفراز گردید بتاریخ ۹ سنہ جلوس مطابق ۱۰۲۵ سنہ ہجری برحمت الٰہی پیوست۔

مرتضیٰ خاں چوں بحق واصل شد | گشت اقلیم بقا مفتوحش
بہرِ تاریخ ملائک گفتند | باد پر نورِ الٰہی روحش

---

[1] ذخیرۃ الخوانین سے پتا چلا۔ کہ یہ شیخ کی اپنی مرضی کے مطابق تھا۔ "چوں شیخ بعزیمت مہم کانگرہ بدہلی رسید، بطواف پدر و اجداد بزرگوار خود رفت۔ جائے قبر خود را در تحت اقدام بزرگان خود نشان داد کہ در آنجا مدفون سازند۔ وزنہار عمارت بر سر قبرم نکنند۔ در رنگِ قبر غریباں باشد۔" (ص ۱۲۸)

حضرت خواجہ محمد باقی باللہ قدس سرہٗ

خواجہ باقی باللہؒ عہدِ اکبری میں علماء و عُلما کی کوئی کمی نہ تھی۔ مورخین عہد نے ان کی جو طویل فہرستیں دی ہیں، ان سے خیال ہوتا ہے کہ اس دَور کو علم اور تصوف کا عہدِ زرّیں سمجھنا چاہیئے، لیکن عام طور پر ان بزرگوں نے عہدِ اکبری کی مذہبی بوالعجبیوں کو روکنے کے لیے کوئی مؤثر کوشش نہ کی۔ ان میں سے جو غالی وحدت الوجودی خیالات کے تھے (مثلاً شیخ امان پانی پتی کے قبیلہ دار) وہ تو اکبر کی مذہبی اختراعوں میں اس کے شریکِ کار ہو گئے۔ جو شیخ عبدالحق محدث کی طرح ان اختراعوں سے متنفر تھے، وہ دربار سے کنارہ کش رہے اور گوشہ تنہائی میں اللہ اللہ یا درس و تدریس کرنے لگے۔ مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی صدر الصدور کو آپس کی مخالفتوں اور دوسری کمزوریوں نے بے اثر کر دیا تھا۔ جونپور کے مُلا محمد یزدیؒ اور پنجاب کے علما اکبر کی تعزیری کوششوں کا شکار ہو گئے۔ فتنے کا سدِّباب اور حالات کی اصلاح کسی سے نہ ہو سکی۔ دربارِ اکبری کے مذہبی رجحانات کے خلاف مستحکم محاذ ایک ایسے بزرگ نے قائم کیا جنھوں نے حصُولِ فیض اور ارشاد و ہدایت کے لیے ایک زمانہ ہندوستان میں گزارا تھا، لیکن وہ پھر ماوراء النہر گئے اور نقشبندیہ سلسلے میں منسلک ہونے کے بعد عہدِ اکبری کے آخر میں دوبارہ ہندوستان آئے۔ اس کے بعد انھیں چار پانچ سال سے زیادہ کام کرنا نصیب نہیں ہُوا، لیکن اپنی رُوحانی پاکیزگی اور سربلندی سے انھوں نے اکبر کے ارکین سلطنت (مثلاً شیخ فرید۔ قلیج خاں۔ صدرِ جہاں) اور علماء و مشائخ (مثلاً حضرت مجدد الف ثانیؒ۔ شیخ عبدالحق محدثؒ) کو اس طرح مسخر کیا۔ اور بالجملہ ملک میں اسلامی رُوحانیت کی ایک ایسی زبردست لہر دوڑا دی اور (اکبر کی براہِ راست مخالفت کیے بغیر) اس طرح ایک نئی دینی زندگی کا آغاز کیا کہ اس فضا میں اکبری رجحانات کا فروغ پانا ناممکن ہو گیا۔

خواجہ باقی باللہ کا طریقِ کار وقت کی ضرورت کے لیے خاص طور پر موزوں تھا

عام طور پر ہمارے اہل اللہ ارباب اقتدار سے الگ تھلگ رہے ہیں۔ چشتی، سہروردی، قادری سلسلوں کی تمام روایات گوشۂ تنہائی میں یادِ خدا کرنے کی ہیں، لیکن اس وقت دربار شاہی سے بدعت و تجدد کی لہریں آرہی تھیں اور اگرچہ ان سے عوام پر کوئی اثر نہ ہوا تھا، بعض درباریوں کے طور طریقے بگڑ گئے تھے۔ اس وقت ضرورت اس امر کی تھی کہ اربابِ فیض دربارِ شاہی اور اربابِ اقتدار سے الگ تھلگ رہنے کی بجائے ان سے ربط و ضبط پیدا کریں اور ان خرابیوں کی اصلاح کریں جو اکبر کی مذہبی اور معاشرتی بدعتوں نے پیدا کر دی تھیں۔ صوفیہ میں اس طریقہ کار کے سب سے پُر زور ترجمان نقشبندی حضرات ہیں، جن کے ایک مشہور بزرگ خواجہ عبید اللہ احرارؒ کا ایک قول حضرت مجدد الف ثانیؒ کے کئی مکتوبات میں نقل ہوا ہے :۔

"اگر ما شیخی مے کردیم۔ دریں روزگار ہیچ شیخ مریدے نمے یافت لیکن ما را کارِ دیگر فرمودہ اند کہ مسلماناں را از شرِ ظلم نگاہ داریم۔ بواسطۂ ایں بپادشاہان بایست اختلاط کردن و نفوس ایشاں را مسخر گردانیدن و بتوسط ایں عمل مقصود مسلمین برآوردن"

ہندوستان میں جس بزرگ نے اس اصول پر سب سے پہلے کثرت سے عمل کیا اور نہ صرف ہندوستان میں نقشبندی سلسلے کی مستحکم بنیاد رکھی بلکہ امرا و اکابر سے اختلاط پیدا کر کے نہایت خاموشی سے درباری بدعتوں کے خلاف متشرع اور دیندار امراء کا محاذ قائم کیا، وہ حضرت خواجہ محمد باقی باللہ بیرنگ تھے، جنھیں حضرت خواجہ عبید اللہ احرار سے خاص طور پر تعلقِ خاطر تھا۔ انھوں نے سلسلۃ الاحرار کے نام سے جو رُباعیات لکھیں، ان میں سے ایک یہ ہے :۔

ایں سکہ کہ من زدم، بنامِ فقر است ۔۔۔ ویں روشنی از نورِ تمامِ فقر است
برخیز و رہِ خواجۂ احرار بگیر ۔۔۔ کاں راہ ز سر حدِ مقامِ فقر است

حضرت خواجہ باقی باللہؒ ۵ ذی الحجہ ۱۰۰۷ھ یعنی ۱۵ جولائی ۱۵۹۹ء[1] کو بمقام کابل

---

[1] یہ تاریخ حافظ عزیز حسن بقائی نقشبندی کی تالیف سیرتِ باقی میں درج ہے۔ اس کتاب میں اسماء و سنین کی بعض غلطیاں ہیں، لیکن چونکہ مصنف حضرت خواجہ کی اولاد سے تھے، اس لیے ہم نے

[باقی اگلے صفحہ پر]

پیدا ہوئے۔ اسم مُبارک محمّد رضی الدین تھا، لیکن زیادہ تر باقی باللہ یا محمّد باقی باللہ یا عبدالباقی کے نام سے مشہوُر ہیں۔ آپ کے والد قاضی عبدالسلام خود اہلِ علم تھے۔ انھوں نے شروع سے آپ کی تعلیم و تدریس پر نظر رکھی۔ جب ابتدائی مراحل طے ہوگئے تو آپ ملّا صادق حلوائی کی خدمت میں پہنچے جو اس زمانے کے ایک مشہوُر فاضل اور ایک خوش گو شاعر تھے۔ ان کا وطن سمرقند تھا، لیکن جب وہ ۱۵۷۱ء میں حج سے واپس آئے تو اکبر کے چھوٹے بھائی مرزا حکیم نے جو کابل کا حکمران تھا، انھیں آمادہ کیا کہ وہ کابل میں کچھ عرصہ قیام فرما کے وہاں سلسلۂ تدریس شروع کریں۔ خواجہ باقی اللہ وہاں ان کے حلقۂ شاگردی میں داخل ہوئے اور جب وہ کابل چھوڑ کر ماوراُالنہر چلے گئے تو خواجہ بھی ساتھ تھے۔

خواجہ صاحب نے علوم متداول بڑی تیزی سے حاصل کرنے شروع کیے۔ آپ کے عزیز و اقارب اعلےٰ عہدوں پر ممتاز تھے اور ان کی خواہش تھی کہ آپ بھی تکمیلِ تعلیم کے بعد اسی سلسلے میں منسلک ہوجائیں۔ لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ تحصیلِ علوم کا ابھی کچھ حصّہ باقی تھا کہ آپ کو بعض ایسے معاملات پیش آئے کہ آپ کی توجہ حقیقت و معرفت کی طرف منعطف ہوگئی اور مُرشدِ راہ نما کی تلاش شروع ہوئی۔ پہلے اپنے گرد و نواح میں نظر دوڑائی اور ماوراء النہر اور افغانستان میں جو صوفی اور مشائخ تھے، ان کی خدمت میں حاضر ہوکر تزکیۂ نفس کی کوشش شروع کی، لیکن دل کا مقصوُد حاصل نہ ہُوا۔ حضرت خواجہ کی جو رُوحانی سرگزشت ان کے ملفوظات میں ان کے ایک خط سے ماخوذ ہے، اس سے خیال ہوتا ہے کہ نگاہ بڑی اونچی تھی۔ اس لیے خاطر خواہ صفائیٔ قلب اور تسکین میسر نہ آتی تھی۔ پہلے خواجہ عبیدؒ کی خدمت میں حاضر ہوکر گناہوں سے توبہ کی لیکن اس پر اپنے کڑے معیار کے مطابق قائم نہ رہ سکے پھر حضرت شیخ افتخار کی خدمت میں حاضر

[بقیہ صفحۂ گزشتہ] اختیار کرلیا۔ نبدۃ المقامات میں ماہ دیوم نہیں۔ سالِ ولادت باختلافِ قولین ۹۷۱ھ یا ۹۷۲ھ ہجری لکھا ہے۔ حیاتِ باقیہ میں اس اختلاف کا حل یہ بتایا گیا ہے کہ آپ ۹۷۱ھ ہجری کی اخیر تاریخوں یا ۹۷۲ھ ہجری کے ابتدائی ایّام میں پیدا ہوئے۔ سیرتِ باقی کی درج کردہ تاریخ اس قیاس پر پوری اترتی ہے۔

ہوکر اصلاحِ حال کی کوشش کی۔ وہ بزرگ راضی نہ تھے اور فرماتے تھے کہ تم جوان ہو لیکن چونکہ حضرت کا ارادہ پکا تھا اس لیے چار و ناچار فاتحہ پڑھا اور دُعا فرمائی کہ خدا تعالیٰ استقامت بخشے، لیکن یہ کوشش بھی کامیاب نہ ہوئی اور طرح طرح کی خرابیاں آپڑیں۔"
اس کے بعد آپ نے امیر عبداللہ بلخی کی خدمتِ عالیہ میں حاضر ہو کر از سرِ نو توبہ کی۔ اب طبیعت کو استقامت حاصل ہوئی۔ آئینۂ طبیعت صاف ہو گیا اور مدارجِ رُوحانی میں ترقی شروع ہوئی لیکن ہمت غضب کی تھی، اس بلندی پہ پہنچنے کے بعد بھی دل نہ مانتا تھا کہ فیض کے کسی سرچشمے سے محروم رہ جائیں ؎

ہیچ گر ذوقِ طلب از جستجو بازم نداشت
دانہ مے چیدم دراں روزے کہ خرمن داشتم

زبدۃ المقامات میں آپ کی نسبت لکھا ہے:-

"و تقریبِ ایشاں دراں پایہ بود کہ از بدایت تا نہایت ہیچ یک از احوال بلند و مکاشف ارجمند سرِ صحبتِ ایشاں فرود نمے آمد۔ در عین بحر یافت دم از نا یافت زدہ خشک لب بودند۔ ایں رباعیہ شریفہ نیز دلالت بر حال ایشاں نماید۔ رباعی

در راہِ خدا جملہ ادب باید بُود	تا جاں باقیست در طلب باید بُود
دریا دریا اگر بکامت ریزند	کم باید کرد و خشک لب باید بُود

چنانچہ پیرانِ کامل کی تلاش جاری رہی۔ اس سلسلے میں آپ عنفوانِ شباب میں ہی (در آغازِ برنائی) برِکوچک ہند و پاکستان میں آگئے اور مختلف بزرگوں سے فیض حاصل کیا۔ آپ کے ملفوظات میں کشمیر جاکر شیخ بابا دالی سے فیض حاصل کرنے کا ذکر بھی ملتا ہے۔

لہ شیعہ چکوں کی حکومت پر کشمیر کے سنی اکبری کی حکومت کو اس طرح ترجیح دیتے تھے کہ بابا داؤد خاکی اور شیخ یعقوب صیرفی کشمیری نے اکبر کے پاس حاضر ہو کر اسے کشمیر فتح کرنے کی ترغیب دی اور جب مرزا یادگار نے اکبر کے خلاف بغاوت شروع کر کے عوام کو اکبری حکام کے خلاف ورغلانا چاہا تو شیخ بابا دالی نے عوام کی تسکین کی اور اس کوشش میں جان دی۔ بغاوت فرو کرنے کے لیے اکبر نے جو امرا بھیجے ان میں شیخ فرید سر فہرست تھے۔ اس وقت خواجہ باقی باللہ شیخ بابا دالی کی درگاہ میں تھے۔ کیا شیخ فرید اور حضرت خواجہ کے تعلقات پہلی مرتبہ اس زمانے میں استوار ہوئے؟ (ملاحظہ ہو تاریخ اعظمی)

وہ ترکستان کے رہنے والے تھے۔ شیخ حسین خوارزمی کے خلیفۂ خاص تھے ۹۹۹ھ میں کشمیر تشریف لائے، لیکن دو سال بعد مرزا یادگار نے جس نے اکبر کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا تھا، انھیں زہر دلا دیا۔ تفصیل اس کی تاریخِ کشمیر (اعظمی) میں بدیں الفاظ درج ہے: "در ہنگامۂ مرزا یادگار کہ میانِ مردمِ کشمیر و کسانِ اکبر بادشاہ نفاق شدہ، کار بہ فتنۂ عظیمہ انجامیدہ بود۔ جنابِ شیخ خود توجہ فرمودہ رفع نزاع کردند۔ بہ ہماں قضیہ مخالفانِ دین و دولت شربتِ مسموم بہ شیخ رسانیدہ، شہید ساختند" (ص ۱۰۹)۔ حضرت خواجہ اس دوران میں کشمیر میں آکران سے مستفید ہوئے۔ خواجہ محمد اعظم لکھتے ہیں کہ خواجہ دو سال تک شیخ بابا والی کی صحبت میں رہے۔ انھیں سلسلۂ نقشبندیہ میں بھی تعلیم کی اجازت تھی[۱] اور طالب کی استعداد بھی اپنے بزرگوں کی طرف لگی ہوئی تھی"۔ اس لیے اس سلسلہ سے تعلقِ خاطر ہو گیا۔

پیروانِ طریقت سے فیض حاصل کرنے کے لیے اور مرشد کی تلاش میں خواجہ باقی باللہ جا بجا گئے۔ سنبھل میں شیخ الٰہ بخش سنبھلی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ خواجہ خرد کے رسالہ رباعیات و شرح رباعیات میں سید علی لودیانہ (؟) اور شیخ الٰہ بخش گڑھ مکتیسری کے بھی نام اس سلسلے میں آتے ہیں۔ ایک تذکرے میں آپ کے سفر سرہند اور وہاں کے قیام کے دوران حضرت مجدد الف ثانی کے والد شیخ عبدالاحد کے متعلق استفسار کرنے کا بھی ذکر ملتا ہے۔ وہ ان دنوں سرہند سے باہر تھے۔ آخر میں آپ دہلی آئے اور چشتیہ سلسلہ کے نامور بزرگ شیخ عبدالعزیز کی خانقاہ میں مقیم ہوئے۔ اور ان کے صاحبزادے شیخ قطب العالم کی خدمت میں رہ کر یادِ حق کرنے لگے۔ شاہ ولی اللہ انفاس العارفین میں لکھتے ہیں کہ ایک رات شیخ قطب العالم پر منکشف ہوا کہ حضرت خواجہ کا حصہ بخارا میں ہے۔ وہ اسی وقت باہر آئے۔ اور حضرت خواجہ سے کہا

---

[۱] شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں: "بعد ازانکہ خواجہ محمد باقی بر نشرِ طریقۂ نقشبندیہ مشغول شدند قطب العالم بسیار بخدمت مے رسید۔ و فیضِ صحبت کہ عمدۂ دریں طریقہ ہماں است حاصل مے کرد۔ اگرچہ در مبادیٔ حال بخدمتِ شیخ تلمذ کردہ اند۔ و در خانقاہِ ایشاں مدتے مجاورت نمودند"۔

کہ آپ کو مشائخ بخارا بلاتے ہیں۔ روانہ ہو جائیے۔ اس وقت خرقہ موجود نہ تھا۔ فقط ایک انار تھی۔ شیخ نے وہ عنایت کی۔ حضرت خواجہ نے اسی کو بطور دستار کے لپیٹا اور بخارا روانہ ہو گئے۔ شاہ صاحب نے یہ روایت اپنے بزرگوں سے یا دہلی میں خانقاہ باقویہ کے کسی بزرگ سے سنی ہوگی۔ اسے لفظ بلفظ صحیح ماننا ضروری نہیں۔ حضرت خواجہ کو سلسلۂ نقشبندیہ سے تعلقِ خاطر پہلے سے تھا۔ یہ بہت ممکن ہے کہ آپ کا میلان دیکھ کر یا اپنے کشف سے اندازہ لگا کر شیخ قطب العالم نے آپ کو بخارا جانے کا مشورہ دیا ہو۔ لیکن حضرت خواجہ کے ایک رقعہ سے، جسے ہم آگے چل کر نقل کریں گے۔ یہ خیال ہوتا ہے کہ ماوراء النہر کا سفر بغیر کسی تیاری یا سوچ کے، اضطراری حالت میں نہیں ہوا۔ اس رقعہ میں وہ لکھتے ہیں: "دریں روزہا داعیۂ سیرِ ولائت قوی گشتہ۔ امیداست کہ بعد از چند روز دیگر متوجہ شویم"۔

ماوراء النہر میں آپ امکنہ (مضافاتِ سمرقند) کے مولانا خواجگی کی خدمت میں پہنچے جن کا عبداللہ خاں ازبک والیِ توران بڑا معتقد تھا[1] اور جنھوں نے عزلت گزینی اور سترِ احوال کے باوجود ملکی معاملات میں نتیجہ خیز حصہ لیا تھا۔ انھوں نے کمال محبت سے آپ کو نقشبندی سلسلے میں تعلیم دی۔ خلافت عطا کی اور ہندوستان کو واپسی کا حکم دیا۔

مولانا ہاشم کشمی زبدۃ المقامات میں مولانا خواجگی امکنگی کے بعض عزیزوں کی زبانی لکھتے ہیں کہ جب حضرت خواجہ کو چند روز کی حاضری کے بعد خلافت مل گئی تو مولانا کے قدیمی دوستوں نے شکائت کی۔ لیکن مولانا نے فرمایا کہ اس کا معاملہ تربیت کمال کو پہنچا ہوا تھا۔ فقط تصحیح احوال کی ضرورت تھی۔ حقیقت بھی یہی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ابھی حضرت خواجہ نے اپنی ہمتِ بلند کی وجہ سے ارشاد کا وسیع سلسلہ شروع نہ کیا تھا لیکن وہ مقاماتِ عالیہ تک پہنچے ہوئے تھے۔ اور سفرِ ماوراء النہر سے پہلے ہی اہلِ نظر ان کے پاس کھنچ کر آتے تھے۔ ان کے برگزیدہ خلفا میں سے کم از کم تین اس سفر سے پہلے ان کی

---

[1] حضرات القدس (اردو ترجمہ) حصہ اول ص ۲۱۱ تا ۲۱۳

خدمت میں حاضر ہو چکے تھے۔ ایک تو [ابوالفضل کے بہنوئی] خواجہ حسام الدین تھے جنھوں نے بیعت تو سفرِ ماوراء النہر کے بعد کی، لیکن اس سے پہلے وہ آپ کی صحبت میں رہ چکے تھے (زبدۃ المقامات)۔ دوسرے آپ کے اوّلین مُرید شیخ تاج الدین سنبھلی تھے اور تیسرے شیخ الہ داد، جنھیں آپ نے اپنی غیرحاضری میں اپنے رفقا کی خبرگیری سپرد کی چنانچہ ایک مخلص کے نام اس زمانے کا ایک خط ہے:۔

"دریں روزہا داعیہ سیرِ ولائت قوی گشتہ۔ امیداست کہ بعد از چند روز دیگر متوجہ شویم۔ در خدمت شیخ الہ داد، خویشتن داری کردہ خود را بہ بودن و ماندن قرار دادند۔"

داغِ بے یاری و دردِ بیدلی

اینہمہ برخود پسندیدیم ورفت

بارے ہر کرا ملازمت ایشاں میسّر شود۔ غنیمت است ....۔

دادیم ترا ز گنجِ مقصود نشاں   گر مانہ رسیدیم، تو شاید برسی

ماوراء النہر سے واپسی کے بعد حضرت خواجہ پہلے لاہور آئے۔ لاہور میں آپ کی آمد کا سال تذکروں میں نہیں ملتا۔ لیکن لاہور سے آپ دہلی آئے اور یہاں کچھ عرصے کے بعد حضرت مجدّدؒ نے آپ سے بیعت کی۔ اس بیعت کا سال زبدۃ المقامات میں ۱۰۰۸ھ ہجری (جس کا آغاز ۲۴ جولائی ۱۵۹۹ء کو ہُوا) درج ہے۔ قرینِ قیاس ہے کہ اس بیعت سے پہلے حضرت خواجہ کو دہلی میں قیام کرتے اتنا عرصہ گزر گیا ہوگا کہ ان کا بلند مرتبہ روحانی حلقوں میں مسلّم ہو جائے۔ ورنہ حضرت مجدّدؒ جو حج کے ارادے سے گھر سے نکلے تھے، علم و عرفان کی اتنی منزلیں طے کر چکے تھے اور عمر میں بھی حضرت خواجہ سے کم نہ تھے، شاید ہی ان کی طرف متوجہ ہوتے۔ اگر یہ خیال کیا جائے کہ اس بیعت سے پہلے دہلی میں حضرت خواجہ کو قیام فرمائے کم از کم ایک سال ہو گیا ہوگا۔ اور یہ امر بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ دہلی آنے سے پہلے آپ نے زبدۃ المقامات کے ایک اندراج کے مطابق لاہور میں ایک سال گزارا۔ (ممکن ہے مدتِ قیام کچھ اس سے زیادہ ہو) تو قرینِ قیاس یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ۱۵۹۷ء میں (یا شاید اس سے پہلے) لاہور پہنچ گئے

ہوں گے۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب اکبر اپنے درباریوں کے ساتھ لاہور میں مقیم تھا گلزار ابرار میں جو آپ کی وفات کے دس سال بعد مکمل ہوئی، لکھا ہے "جب آپ دار السلطنت لاہور میں پہنچے تو شیخ فرید بخاری اکبر شاہ کے بخشی بیگی جو نہایت غریب دوست شخص تھے۔ انھوں نے آپ کے روزینہ مصارف کی ذمہ داری اپنے اوپر لازم کر لی۔" اس عبارت میں اس انتظام کی طرف اشارہ ہے، جس کے تحت شیخ فرید نے آپ کی خانقاہ کے اخراجات اپنے ذمہ لے رکھے تھے۔ اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ آپ لاہور اس زمانے میں تشریف لائے جب شیخ فرید (اور اکبر اور اس کے دوسرے درباری) ابھی لاہور میں تھے۔ اس امر کی تائید ایک اور بات سے ہوتی ہے۔ زبدۃ المقامات میں حضرت خواجہ کی نسبت لکھا ہے۔ "آپ کی شفقت و رحمدلی کی یہ حالت تھی کہ ایک دفعہ شہر لاہور میں سخت قحط سالی واقع ہوئی۔ اس زمانے میں آپ شہر لاہور میں تشریف رکھتے تھے۔ مدتکئی روز تک آپ نے کھانا نہیں کھایا۔ جب آپ کے سامنے کھانا لایا جاتا۔ فرماتے، انصاف سے بعید ہے کہ کوئی بھوکا پیاسا گلی کوچوں میں جان دے اور ہم کھانا کھائیں۔ جس قدر کھانا ہوتا۔ سب آپ بھوکوں کے لیے بھجوا دیتے" (زبدۃ المقامات ص۱۰) اس اندراج میں یقیناً اس عظیم قحط کی طرف اشارہ ہے، جو شمالی ہندوستان میں ۱۵۹۵ء سے ۱۵۹۸ء تک جاری رہا۔ اور جس میں اکبر نے لوگوں میں روپیہ اور اشیا سے ضروری کی تقسیم کا کام شیخ فرید کے سپرد کر رکھا تھا۔

اکبر نے ۱۵۸۵ء سے ۱۵۹۸ء تک لاہور کو اپنا دار السلطنت بنائے رکھا۔ وہ بالآخر یہاں سے ۱۰ نومبر ۱۵۹۸ء کو آگرے کی طرف روانہ ہوا۔ اکبر کے قیام لاہور کے آخری دو سال اس لیے اہم ہیں کہ اس دوران میں ابو الفضل کا ستارہ گردش میں آگیا۔ اور شیخ فرید کا معاملات ملکی میں عمل دخل بہت بڑھ گیا۔ ہم لکھ چکے ہیں کہ مئی ۱۵۹۷ء میں ابو الفضل کی یہ حالت تھی کہ اس نے دربار جانا ترک کر دیا۔ بلکہ خودکشی یا خانہ بدوشی کے ارادے بھی اس کے ذہن میں آئے۔ پھر جنوری ۱۵۹۹ء میں اس کے مخالفوں نے اسے دکن بھجوا دیا۔ جہاں سے اسے آگرے واپس آنا نصیب نہ ہوا۔ (اکبر نامہ)

لاہور سے حضرت خواجہ دہلی تشریف لے گئے۔ قلعۂ فیروزی میں قیام فرمایا اور ہدایتِ خلق میں مشغول ہوئے۔ یہاں آپ کو بڑا عروج ہوا اور حضرت مجدد الف ثانیؒ اور شیخ عبدالحق محدثؒ جیسی ہستیاں آپ کے حلقۂ عقیدت میں داخل ہوئیں، لیکن افسوس کہ آپ کو طویل عمر نصیب نہیں ہوئی۔ دہلی میں آپ کا قیام تین چار سال سے زیادہ نہیں رہا۔ اور آپ نے ابھی عمر کے چالیس سال ہی ختم کیے تھے کہ تیس دسمبر ۱۶۰۳ء کو روح مبارک قیدِ جسم سے آزاد ہو گئی۔

حضرت خواجہ کے واقعاتِ زندگی کہیں تفصیل سے جمع نہیں ہوئے۔ فقط ان کے چند روز کے ملفوظات اور مختصر حالات ایک ایسے بزرگ کی بدولت جمع ہو گئے ہیں، جنھوں نے اپنا نام نہیں بتایا۔ لیکن جن کی نسبت ایک اندراج سے خیال ہوتا ہے کہ وہ "استاذی" میاں شیخ احمد سرہندیؒ (حضرت مجدد الف ثانی) کے شاگرد تھے۔ زبدۃ المقامات اور حضرات القدس میں بھی حالات ہیں، لیکن معاصرانہ تذکروں کو بغور پڑھیں تو پتا چلتا ہے کہ یہ حالات بالکل نامکمل ہیں۔ اور ان سے حضرت خواجہ کے کام اور ان کے فیض یافتگان کی تفصیل کا بالکل اندازہ نہیں ہو سکتا۔ معاصرانہ اور قریب العہد تذکروں مثلاً طبقاتِ شاہجہانی میں متعدد ایسے بزرگوں کے نام آتے ہیں جنھوں نے آپ سے فیض پایا یا جنھیں آپ نے تھوڑی سی تعلیم دے کر مزید تربیت کے لیے حضرت مجددؒ کے سپرد کیا۔ لیکن آپ کے حالات میں ان کا بالکل ذکر نہیں۔ ان منتشر بیانات پر غور کریں اور دیکھیں کہ آپ کے فیض یافتگان ملک کے کس کس حصے سے تھے تو خواجہ بدرالدین سرہندی (مرید حضرت مجدد الف ثانی) کے بیان کی حقیقت سمجھ میں آتی ہے اور خیال آتا ہے کہ آپ نے مختصر مدت میں ایک زبردست روحانی تحریک جاری کر دی تھی۔ اور ملک کے گوشے گوشے سے علما و فضلا، اور مشائخ و سجادہ نشین بزرگ "چوں مور و ملخ" پروانہ وار آپ سے فیض حاصل کرنے کے لیے آتے تھے۔ خواجہ بدرالدین سنوات الاتقیا میں حضرت خواجہ کی نسبت، لکھتے ہیں:-

"رواج سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ و اشتہار و انتشارِ ایں طائفہ، ایسقہ در دیارِ ہندوستان

از آنحضرت است۔ قطبِ وقت بودند۔ علما و فضلا و مشائخ و سجادہ نشیناں از
راہِ دُور و نزدیک بہ درگاہِ ولایت پناہِ او چوں مورو ملخ مے ریختند۔ و عرفاو صلحا
از کنارِ زمیں بجنابِ عرفاں مآب او چوں پروانہ بر شمع گرد مے آمدند۔"

دوسرے ذرائع سے بھی خواجہ بدرالدین کے بیان کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً
زبدۃ المقامات میں لکھا ہے:۔

بعض طلاب دُور دراز جگہوں سے آپ کی خدمت میں پہنچے۔ اور بہتوں کو تو اثنائے
راہ میں آپ کے انتقال کی خبر ملی (ترجمہ)

اسی کتاب میں خواجہ ہاشم کشمی لکھتے ہیں کہ آپ کی تشریف آوری کے بعد شہر
دہلی کے بعض مشائخ کبار آپ سے رشک و غیرت کرنے لگے۔ انھوں نے آپ کے
خلاف توجہ اور کوشش کی۔ لیکن نقصان اُٹھایا۔ اور بالآخر آپ کے مخلصین میں
داخل ہوئے۔

آپ سے فیض حاصل کرنے کے لیے لوگ دُور دُور سے جس طرح کھچ کر آرہے تھے،
اس کا اندازہ آپ کی مختصر سوانح عمری سے اتنا نہیں ہوتا' جتنا حضرت مجدد کے تفصیلی تذکروں
سے۔ حضرات القدس میں حضرت مجدد کے خلفائے کبار کے حالات غور سے پڑھیں تو
نظر آتا ہے کہ ان میں سے خاصی تعداد ان کی تھی' جو پہلے حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضر
ہوئے اور پھر حضرت مجدد کے سپرد ہوئے یا حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضری کے لیے
گھر سے نکلے، لیکن چونکہ ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ حضرت مجدد کے پاس سرہند جا کر فیض
حاصل کیا۔ حضرت مجدد کے صاحبزادہ بزرگ (خواجہ محمد صادق' جو تکمیلِ علوم اور
راہِ سلوک کی بہت سی منزلیں طے کرنے کے بعد عین جوانی میں وفات پا گئے) آٹھ
برس کی عمر سے حضرت خواجہ کے مُرید تھے۔ ان کے اور حضرت خواجہ کے درمیان جو
گہرا قلبی تعلق تھا' اس کے لیے زبدۃ المقامات اور حضرات القدس کا مطالعہ کرنا چاہیے
باقی اوّلین خلفا میں سے سرفہرست میر محمد نعمان برہانپوری تھے۔ جن کا مرتبہ اتنا تھا کہ
جب ایک دفعہ حضرت مجدد سخت بیمار ہوئے اور خیال ہوا کہ شاید ہماری وفات اس

بیماری میں ہو جائے" تو حضرات خواجگان قدس اللہ تعالیٰ نفسا سرار کی "امانت کا متحمل حضرت خواجہ محمد صادق اور حضرت میر (محمد نعمان) کے سوا کسی کو نہ پایا۔ پس امانت ان دونوں کے سپرد فرمائی"۔ (حضرات القدس ص ۲۶۹)۔ میر محمد نعمان بھی پہلے حضرت خواجہ کی خدمت میں پہنچے تھے اور انھوں نے تربیتِ باطنی کے لیے حضرت مجدد کے سپرد کیا تھا۔ اسی طرح حضرات القدس کے بیان کے مطابق مولانا یوسف (ص ۱۳۶)۔ شیخ نور محمد پٹنی (ص ۲۷۹) اور مولانا عبدالہادی بدایونی (ص ۳۱۴) پہلے حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور ذکر وغیرہ کی تعلیم کے بعد تکمیل کے لیے حضرت مجدد کی خدمت میں بھیجے گئے۔ خواجہ محمد صادق کابلی حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضری کے لیے گھر سے نکلے تھے، لیکن ان کی وفات کے بعد دہلی پہنچے۔ انھیں خواجہ حسام الدین نے سرہند بھیجا (ص ۲۱۵)

خواجہ محمد صدیق کشمی کا معاملہ خاص طور پر دلچسپ ہے۔ وہ بدخشاں کے قریب کشم کے رہنے والے تھے۔ عنفوانِ شباب میں ہندوستان آئے اور "محب الفقرا عبدالرحیم خانخاناں" کی صحبت اختیار کی۔ شاعر تھے۔ ہدایت تخلص کرتے تھے۔ کئی مثنویاں اور غزلیں لکھیں۔ ایک غزل کے چند شعر بڑے پُراثر ہیں ؎

خوش وقت آں بدلے کہ بکاسے رسیدہ است	خوش روز شہر وسے کہ بیارے رسیدہ است
از فرق تا قدم ہمہ عطرم عجب مدار	دستم بچینِ زلفِ نگارے رسیدہ است
خوش روزگارِ عیش ہدایت کہ در خزاں	رخشش بہ تازہ رنگِ بہارے رسیدہ است

حضرت خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں پہنچے۔ ان سے ذکر سیکھا۔ حضرت خواجہ بہت مہربانی کرتے تھے۔ لیکن "بنابر اقتضائے جوانی و شغفِ شعر خوانی و کامرانی" بہت ترقی نہ کی۔ حضرت خواجہ نے انھیں سرہند میں حضرت مجدد کے پاس جانے کے لیے کہا۔ یہ آمادہ نہ ہوئے۔ وہ اس دوران میں وفات پا گئے۔ خواب میں نظر آئے اور سخت تاکید کی کہ سرہند جا کے فیض حاصل کرو۔ چنانچہ یہ وہاں پہنچے۔ حضرت مجدد سے بے حد متاثر ہوئے ("نوعے را بحضرت ایشاں اخلاص و عشق فراواں")۔ کئی مکاتیب ان کے نام

ہیں۔ مبدا، و معاد میں حضرت مجدد کے ارشادات ان کی بیاضوں سے نقل کر کے مرتب کیے۔
اکثر سفر میں رہتے تھے۔ جس سال مبدا، و معاد مرتب ہوئی (۱۰۱۹ ہجری) اس سے ایک
سال پہلے حضرت خواجہ باقی باللہ کے مرید ظہیر الدین حسن کے ساتھ دکن پہنچے۔ مانڈو
میں گلزار ابرار کے مؤلف غوثی سے ملے۔ اس نے ان سے لے کر حضرت مجدد کے
ایک رسالے کا ملخص درج کتاب کیا۔ جس کے اکثر اندراجات مبدا، و معاد میں ملتے
ہیں۔ گلزارِ ابرار میں حضرت خواجہ باقی باللہ کا تذکرہ "صوفی محمد صدیق ہدایت تخلص" کا
لکھا ہوا ہے۔ اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ حضرت مجدد کی شخصیت سے کس طرح
متاثر ہو چکا تھا۔

زبدۃ المقامات میں حضرت مجددؒ کے کئی دوسرے خلفائے کبار کے حالات
درج ہیں، جنھیں حضرت خواجہ باقی باللہ نے سرہند بھیجا۔ یا جنھوں نے حضرت خواجہ
کی خدمت میں حاضری کے لیے دہلی کا قصد کیا اور ان کی وفات کی بنا پر حضرت مجددؒ
کی خدمت میں پہنچے۔ مثلاً شیخ طاہر بدخشی (ص ۳۵۲) مولانا یوسف سمرقندی (۳۵۱)
مولانا قاسم علی (۳۶۶) مولانا عبدالواحد لاہوری (ص ۳۷۶)

طبقاتِ شاہجہانی میں سید مصطفےٰ باغپت کا ذکر ہے، جنھوں نے مدتوں
بزرگوں کی مسندِ مشیخت پر بیٹھ کر سجادہ نشینی کی۔ لیکن جب خواجہ باقی باللہ کی ارشاد
و ہدایت کا شہرہ سُنا، تو سب کچھ چھوڑ کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلسلۂ نقشبندیہ
میں ان سے بیعت کی۔ "سالہا بر مسندِ مشیخت قیام داشت۔ و صاحب سجادہ پدران
خود بود و مردم را ہدایت می کرد۔ از انجا کہ صدق و راستی تمام داشت، چوں آوازہ
ارشاد و ہدایت حضرت خواجہ، ما خواجہ محمد باقی قدس سرہ شنیدہ، ترکِ مشیخت کردہ
پیش آنحضرت آمدہ و در اندک مدت طریقہ نقشبندیہ از وے در گرفت و رخصت یافتہ
بوطنِ اصلی رفت (ورق ۳۶۸ ب)

حضرات القدس میں میر نعمان کی زبانی لکھا ہے کہ انھوں نے آگرہ کے شفاخانہ
میں خراسان کے ایک نوجوان کو بیمار دیکھا۔ حال و احوال پوچھا تو پتا چلا کہ وہ دکن میں تھا۔

حضرت خواجہؒ کو خواب میں دیکھا اور ان کے اشتیاق میں وہاں سے روانہ ہُوا۔ یہاں پہنچ کر ان کے انتقال کی خبر ملی۔ اسے اتنا صدمہ ہُوا کہ بیمار ہو گیا۔ وہ اپنا حال بیان کرتا تھا اور زار زار روتا تھا۔

طبقاتِ شاہجہانی کا مطالعہ کریں تو حضرت خواجہ کے بعض ایسے مریدوں کے نام ملتے ہیں، جن کا اُن کی سوانح عمری اور نقشبندیہ تذکروں میں ذکر نہیں۔ مثلاً شیخ احمد بکری (م ۱۰۴۳ھ) شیخ مرتضےٰ اسنبھلی (ایضاً) شیخ نعمت اللہ جونپوری (م ۱۰۰۶ھ) شیخ نور الحق ابن مولانا عبدالحق (م ۱۰۷۳ھ)

ہم شیخ قطب عالم کا ذکر کر چکے ہیں، جن کی خانقاہ میں کچھ عرصہ حضرت نے یادِ خدا فرمائی۔ اُن کے بیٹے شیخ رفیع الدین محمد کی شادی تھی اور وہ مُصر ہوئے کہ حضرت خواجہ بھی شرکت کریں۔ آپ کی طبیعت ناساز تھی اور شادی ہو بھی رہی تھی دہلی سے بہت دُور اعظم پور میں۔ آپ نے ضعف و علالت کی بنا پر معذرت چاہی۔ لیکن شیخ نہ مانے۔ بلکہ کہا کہ اگر آپ نہیں آتے تو مَیں بھی شادی کے لیے نہیں جاؤں گا۔ حضرت خواجہ نے شیخ کے والد سے فیض حاصل کیا تھا۔ ان کے اصرار کو رد نہ کر سکے۔ اس پر شاہ ولی اللہ انفاس العارفین میں لکھتے ہیں کہ جب صوفیہ کو معلوم ہُوا کہ حضرت خواجہ اس تقریب پر آ رہے ہیں تو اہل اللہ کا بڑا ہجوم ہُوا اور سو سو کوس تک کوئی مشہور صوفی نہ تھا، جو حضرت خواجہ کی زیارت کے لیے اس تقریب میں شریک نہ ہُوا ہو۔

> صوفیۂ آں ناحیہ چوں مقدمِ خواجہ شنیدند۔ ہمہ جمع آمدند و در نواحی صد کروہ کم کسے باشد از صوفیہ کہ در آں صحبت حاضر نہ شد۔ مجلسِ عجیب کہ ہرگز مثل آں مسموع نہ شدہ، منعقد گشت۔

خدائے تعالےٰ نے اس شادی کو اسلامی ہندوستان کے لیے بڑا مبارک بنایا اور شیخ رفیع الدین محمد کے ہاں اس زوجہ سے جو بیٹی ہوئی اسے شاہ ولی اللہ جیسا یگانۂ روزگار پوتا عطا ہُوا۔

حضرت خواجہ کی ہمّت اور کار شناسی کی داد دینی چاہیے کہ اگرچہ طریقۂ نقشبندیہ میں منسلک ہونے کے بعد انھیں ہندوستان میں چار پانچ سال سے زیادہ رہنا نصیب نہیں ہُوا اور اس مُدّت میں طبیعت نحیف ہی رہی، لیکن اس قلیل عرصے میں

انھوں نے نقشبندیہ سلسلے کی بنیاد مستحکم طریقے سے اس ملک میں رکھ دی۔ آپ کو خوش قسمتی سے ایک تو مرید، حضرت مجدد الف ثانی جیسا میسر آیا۔ جس کے فیض سے اس سلسلے کا مستحکم ہو جانا لازمی تھا، لیکن ان کے علاوہ آپ نے دوسرے کئی ایسے بزرگوں کو متاثر کیا، جن کے ذریعے سے نہ صرف اس سلسلے کی بقا کا سامان ہوا بلکہ ملک میں اسلام کو تقویت ہوئی اور جو پراگندگی اکبری بے اعتدالیوں کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی، اس کا ازالہ ہوا۔

ہم لکھ چکے ہیں کہ خواجہ عبید اللہ احرارؒ کا اصول تھا کہ بادشاہوں اور امیروں کا قرب ترک کرنے کے بجائے، ان سے ربط بڑھاتے اور انھیں مسخر کر کے اسلام کی رونق اور مسلمانوں کے آرام کا انتظام کرتے۔ خواجہ محمد باقی باللہ بیرنگؒ اس اصول اور اس اصول کی مصلحت سے خوب واقف تھے اور جب وہ ہندوستان تشریف لائے تو اس اصول پر عمل کرنے کی ضرورت خاص طور پر تھی۔ اکبری بدعتوں نے اگرچہ عام مسلمانوں کو متاثر نہ کیا تھا، لیکن اونچے طبقوں میں جو دربار سے قریب تھے، خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں، اس لیے اس طبقے کو اسلام سے قریب لانے کی بڑی ضرورت تھی۔ حضرت خواجہ نے ادھر خاص طور پر دھیان رکھا اور خدا نے ان کی کوششوں میں بڑی برکت دی۔ بدقسمتی سے ان کے تفصیلی حالات صحیح طور پر جمع نہیں ہوسکے[1]۔ ان کے جو مکتوبات موجود ہیں، ان میں سے اکثر کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس کی طرف لکھے گئے۔ مطبوعہ نسخوں سے اتنا پتا چلتا ہے کہ "کسی امیر کے نام" یا "کسی مخلص کے نام" لکھے گئے

---

[1] جب حضرت خواجہ باقی باللہؒ باسدوم دہلی تشریف لائے تو اس وقت عہد اکبری کے تمام مشہور مؤرخین مثلاً میر نظام الدین مصنف طبقات اکبری، ملا عبدالقادر بدایونی وفات پا چکے تھے۔ اس لیے ان کے حالات کتب تواریخ میں پورے طور پر درج نہیں۔ خافی خاں آپ کی نسبت لکھتا ہے "دیگر از واصلان حضرت خواجہ باقی باللہ دراں عہد مقتدائے زماں بود۔ صفات ذاتی و کسبی و خوارق ایشاں زیادہ ازاں ست کہ زبان قلم والہ شود۔ اکثر در دانش و گوہر بانندہ با خلائق کم میخیسند۔ و انا اکثر علوم عقلی و نقلی بہرہ تمام داشتند۔"

(صرف شیخ احمد سرہندیؒ یا بعض دوسرے خلفا کے نام کے خطوں میں وضاحت سے مکتوب الیہ کا نام درج ہے) ۔ لیکن اس کے باوجود یہ پتا لگانا دشوار نہیں کہ حضرت خواجہ کے عقیدت مندوں میں عہدِ اکبری کے بڑے بڑے سردار اور امرا شامل تھے، بالخصوص نواب مرتضیٰ خاں جن کی مدد سے جہانگیر کی تخت نشینی کے کٹھن مراحل طے ہوئے اور جنھوں نے جہانگیر سے پاسِ شریعت کا عہد لیا۔ حضرت خواجہ کا بڑا معتقد تھا۔

ہم حضرت خواجہ اور نواب مرتضیٰ خاں کے تعلقات کا ذکر کر چکے ہیں، لیکن حضرت خواجہ کے تعلقات فقط نواب مرتضیٰ خاں تک محدود نہ تھے۔ معاصرانہ تذکروں (مثلاً زبدۃ المقامات) کا بیان ہے کہ طبقۂ اُمرا میں ان کے کئی معتقد ("امرائے مخلص") تھے جو انھیں زر و سیم بھیجتے رہتے اور حضرت خواجہ اسے محتاجوں میں تقسیم کر دیتے۔ ایک خاص معتقد عبدالرحیم خانخاناں تھا ("بہ حضرت خواجہ عقیدت و ارادت تمام داشت") جس نے یہ سُن کر کہ حضرت خواجہ کو حج پہ جانے کی خواہش ہے ان کی خدمت میں ایک لاکھ روپیہ بھجوایا۔ لیکن آپ نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ اس طرح دوسروں سے پیسے لے کر حج پر جانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ آپ کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ صدر جہاں بھی آپ کا عقیدت مند تھا۔ حضرت مجددؒ کو ایک خط میں لکھا ہے:۔

"جناب صدر جہاں نے ذکر و مراقبہ سیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ ذکر تو بتلا دیا گیا لیکن چونکہ اس گروہ کا خاص مراقبہ درس اور بیان کی قسم سے نہیں ہے اور ان کا ارادہ بھی یہی تھا۔ اس لیے یہی مناسب دیکھا گیا کہ آپ کی خدمت میں اس کی صحت کرے ... اب فقیر پر ضعف بہت غالب ہے۔ صحبت کی فرصت اور توجہ کی طاقت نہیں رہی۔"

قلیج خاں عہدِ اکبری کا ایک سربرآوردہ سردار تھا۔ اکبر کا بڑا بیٹا دانیال اس کی بیٹی سے بیاہا تھا۔ وہ خود مختلف علاقوں کی صوبیداری پر مامور رہا اور اکبر کے آخری ایام میں کئی سال تک پنجاب کا گورنر تھا۔ وہ ایک دلیر، متدین، اسلام کا درد رکھنے والا مسلمان تھا۔ ماثر الامرا میں لکھا ہے کہ وہ لاہور کی گورنری کے دوران میں ہر روز مدرسہ میں جا کر

تین گھنٹے تک فقہ و تفسیر و حدیث کا درس دیتا۔ علوم شرعی کی ترویج کرتا اور لاہور کے بہت سے لوگ اس کی خوشنودی اور اپنے (دینوی!) مقاصد کے حصول کے لیے ان علوم میں زیادہ دلچسپی لینے لگے!

قلیچ خاں صلاح و تقوے بسیار داشت و در تسنن متعصب بود۔ وہمیشہ بدرسِ علوم و افادۂ طلب اشتغال مے نمود۔ گویند در صوبہ داری[۲] در یک پاس بدرس فقہ و تفسیر و حدیث در مدرسہ قیام مے ورزید و باقصٰے غایت در ترویج علوم شرعیہ مے کوشید۔ مردم آنجا بامید روشناسی و انجاح مطالب خاطر تمام بہ تحصیل علوم کردند

پرتگیز مشنری بھی لکھتے ہیں کہ وہ بڑا پکا مسلمان تھا۔ پرتگیز مشنری اس کے ڈر سے لرزہ بر اندام رہتے تھے۔ اس نے لاہور کے ہندوؤں کی شکایت پر جس گھر میں عیسائی پادری رہتے تھے' وہ ان سے خالی کرالیا اور مشنریوں سے وہ تمام مراعات چھین لیں' جن کی اکبر نے سیاسی مصلحتوں یا مذہبی رواداری سے اجازت دے رکھی تھی۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ بھی اسے مخاطب کر کے لکھتے ہیں:۔

"ثانیاً اظہار محبت گزاری ایشاں مے نماید کہ در بلدۂ معظمہ لاہور بہ وجود ایشاں بسیارے از احکام شرعیہ دریں طور زمانہ رواجے پیدا کردہ است۔ و تقویت دین و ترویج ملت دراں بقعہ حاصل گشتہ است۔

حضرت خواجہ باقی باللہ کے تذکروں میں تو قلیچ خاں کا کہیں ذکر نہیں (!) لیکن حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات سے پتا چلتا ہے کہ اس امیر کے تعلقات بھی حضرت خواجہ باقی باللہ سے بڑے گہرے تھے اور چونکہ اس کی گورنری کے زمانے میں حضرت خواجہ ایک سال سے زیادہ لاہور میں مقیم رہے۔ قرین قیاس ہے کہ قلیچ خاں کی کوششوں میں حضرات خواجہ کے فیضِ صحبت کو بھی دخل ہوگا۔ حضرت مجدد الف ثانی کا قلیچ خاں سے تعارف نہیں۔ لیکن اسے ایک سفارشی خط لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ چونکہ میرے مرشد اور آپ کے درمیان بڑی گہری محبت تھی' اس لیے آپ کو یہ چند سطور

لکھنے کی جرأت ہوئی ہے۔

چوں ایشاں را رشتہ ارتباط محبتی بہ حضرت معرفت پناہی قبلہ گاہی خواجہ با حکم بود۔
بنا برآں بہ تسوید چند کلمہ محرک آں نسبت گشت۔

حضرت خواجہ کے ایک خط (رقعہ ۴۲) میں "مرزا کوکہ (خانِ اعظم)[1] اور اس کی والدہ" کا ذکر ہے۔ مطبوعہ مکتوبات میں ایسے رقعے کئی ہیں۔ جن کے متعلق لکھا ہے۔ "ایک امیر کی طرف لکھا" "ایک عالیشان امیر کی طرف لکھا"۔ بعض میں حاجتمندوں کی سفارشیں ہیں بعض میں فقط ارشاد و ہدایت۔ ان کا ایک دلچسپ رقعہ ہے "ایک دوست کے نام" اس کے نصف اوّل سے (جو حضرت مجدد کے تذکروں میں عام طور پر نقل ہوتا ہے) ایک تو حضرت مجدد کی عظمت و فضیلت کا اندازہ ہوتا ہے اور دوسرے اُس مرد بزرگ کی فہم و فراست سے واقفیت ہوتی ہے، جس کی نگاہِ دُور بین نے اپنے مُرید کی آیندہ عظمت کا صحیح اندازہ لگایا تھا۔ نصفِ ثانی سے (جو ان تذکروں میں نہیں ملتا) خواجہ صاحب کی اس کوشش کا پتا لگتا ہے جو وہ اپنے مریدوں مثلاً حضرت مجددؒ کی اصلاح و امداد کے لیے ہر پہلو میں کرتے تھے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

سرہند میں شیخ احمد نام ایک آدمی بڑے علم والا اور قوی عمل والا ہے چند دن فقیر کی مجلس میں رہا۔ فقیر نے اس کے روزگار اور اوقات سے بہت عجیب عجیب باتیں مشاہدہ کیں۔ امید ہے کہ وہ ایسا چراغ ہوگا جس سے تمام جہاں منور ہو جائے گا۔ اس کے احوال کاملہ یقینی ہیں۔ اس کے کامل احوال دیکھ کر میرا پختہ یقین ہے کہ وہ ایسا ہی ہوگا۔ الحمد للہ شیخ مذکور کے جتنے بھائی اور قریبی رشتہ دار ہیں، سب کے سب نیک اور عالم آدمی ہیں۔ اس دعاگو نے بعض سے ملاقات کی ہے۔ سب بیش قیمت موتی

---

[1] یہ رقعہ آخری سفر ماوراء النہر سے پہلے لکھا گیا اور خانِ اعظم نے عہدِ اکبری کے اواخر میں خواجہ خاوند محمود نقشبندیؒ سے بیعت کی۔ لیکن اس رقعے سے پتا چلتا ہے کہ اس سفر ماوراء النہر سے پہلے ہی باا‌ثر لوگوں سے حضرت کے روابط تھے۔ اور ان میں سے بعض آپ کے مخلصوں میں داخل تھے۔

ہیں اور بڑی عجیب استعداد رکھتے ہیں۔ اس شیخ کے فرزند جو اپنے بچے ہیں، اللہ تعالٰی کے اسرار ہیں۔

غرض سب کے سب شجرہ طیبہ یعنی پاک درخت کی طرح ہیں۔ جس سے پاک ہی شاخیں نکلی ہیں۔ لیکن عیال کی کثرت اور فقر و تنگدستی کی زیادتی اور وجہ معاش کے نہ ہونے کے باعث ان سب کے اوقات میں پراگندگی آ رہی ہے۔ اگر ہر سال زکوٰۃ کے طور پر ان لوگوں کے لیے کچھ معین ہو جائے اور تقسیم کرنے والا منتظم ان کے درمیان مناسب طور پر بانٹ دیا کرے تو بہت ہی اچھا ہے۔ اور بہت ہی نیکی اور اجر کا باعث ہے۔ تھوڑا بہت جس قدر بھی مقرر ہو جائے۔ خیرات اور نیکیوں کا رکن عظیم ہوگا۔ فقرا اللہ تعالٰی کے دروازے ہوتے ہیں اور بہت ہی عجیب دل رکھتے ہیں۔ زیادہ لکھنا بے ادبی ہے۔

(مکتوبات خواجہ باقی باللہؒ رقعہ ۶۱)

خواجہ باقی باللہ کے متعلق منتشر اور نامکمل اندراجات بھی دیکھیں تو پتا چلتا ہے کہ ان کے عقیدت مند امرا میں بخشی الملک شیخ فرید۔ قلیج خاں حاکم پنجاب۔ (خان اعظم) مرزا کوکہ۔ امیر الامرا مرزا عبد الرحیم خانخاناں سپہ سالار دکن۔ صدر جہاں صدر الصدور اور ابوالفضل کا بہنوئی خواجہ حسام الدین شامل تھے۔ علما میں شیخ عبد الحق محدث کو ان کے ساتھ بڑی عقیدت تھی اور حضرت مجدد الف ثانی تو ان کے مرید اور خلیفہ تھے۔ اگر یہ بات دھیان میں رکھیں کہ یہی وہ مبارک ہستیاں تھیں، جنھوں نے اکبری خیالات کا قلع قمع کیا تو حضرت خواجہ باقی باللہ کی تاریخی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، جو ان بزرگوں کے درمیان رشتہ تنظیم کی حیثیت رکھتے تھے۔

مولانا عبید اللہ سندھی نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ اکبر بادشاہ خواجہ باقی باللہ کا مرید ہو گیا تھا[1]۔ اس کی تائید میں کوئی قابلِ اعتماد شہادت ہماری نظر سے نہیں گزری لیکن

---

[1] خطباتِ عبید اللہ سندھی ص ۱۶۹ - ۱۷۰

آپ کے رقعات میں ایک فقرہ ہے جس کا سببِ ارشاد پوری طرح روشن نہیں، لیکن اس کے واضح مفہوم سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بے جا نہیں کہ آپ نے حالات پر پوری طرح قابو پالیا تھا۔ اور آپ بادشاہ کے خیالات و افعال سے بے پروا تھے۔ یہ فقرہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے نام کے ایک رقعہ میں ہے۔ اور اس کے الفاظ حسبِ ذیل ہیں:-

"اندیشۂ بادشاہ را در خاطر نیارند۔" [رقعہ ۱۷]

حضرت خواجہ کے حالات پڑھنے سے خیال ہوتا ہے کہ طبیعت میں مسکنت بے حد تھی اور تالیفِ قلوب کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ وہ ایک اہم خط کے آخر میں جس کا ایک حصہ ان کے ملفوظات میں نقل ہوا ہے، فرماتے ہیں: "اے اللہ! تو مجھے مسکین ہی زندہ رکھ اور مسکین ہی مار اور مسکینوں کے گروہ میں اُٹھا۔" فروتنی اور کسرِ نفسی ان کی رگ رگ میں تھی۔ انھوں نے حضرت مجدد الف ثانیؒ کی اتنی تعریف کی ہے کہ بعض کوتاہ فہم سخت غلطی، بلکہ بے انصافی اور بے ادبی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اگر حضرت خواجہ کے ان ارشادات سے جو انھوں نے حضرت مجددؒ کی نسبت فرمائے ہیں، اس قدر و منزلت کا اندازہ ہوتا ہے جو ان کے دل میں اپنے مُرید کی تھی تو اس بلند ہمت مُرشد کی بھی تعریف کرنی چاہیے، جس نے یہ خوبیاں دیکھ لیں اور انھیں اس طرح سراہنے سے نہ ہچکچایا۔

بعض مجددی تذکرہ نگاروں (مثلاً مناقب الحضرات اور روضۃ القیومیہ کے مصنفین) نے احوال و مکاشفات کے اظہار کے متعلق جو نقطۂ نظر اختیار کیا ہے۔ اس کا ذکر ہم آیندہ صفحات میں کریں گے۔ اس معاملے میں حضرت خواجہ باقی باللہؒ ان کی عین ضد تھے۔ وہ ہمیشہ اپنے واقعات اور روحانی مدارج کو چھپاتے اور انتہائی روحانی سربلندیوں پر پہنچ کر بھی ان کی عالی ظرفی "ہل من مزید" کا نعرہ لگاتی۔ ان کے سب سے قدیمی تذکرے میں ان کی جس خصوصیت پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے وہ "سترِ احوال" اور "غایت انکسار" ہے۔ زبدۃ المقامات میں لکھا ہے:-

"شیوۂ مرضیہ حضرت خواجۂ ما قدس سرہ ہمگی سترِ احوال و اخفاء و خمول و انزوا بود و از

غایت انکسار ہمیشہ دید قصور احوال و متہم داشتن نیات نصب عین ایشاں"۔

حضرت خواجہؒ عجز و انکسار میں اتنا غلو کرتے کہ جب کوئی طالب ان کے پاس بیعت کی غرض سے آتا تو وہ کسرِ نفسی سے یہی کہتے کہ میں اس کارِ عظیم کے لائق نہیں ہوں کہیں دوسری جگہ طلب کا دامن بڑھاؤ اور اگر مرد کامل کا پتا ملے تو مجھے بھی خبر دینا تاکہ اس کی خدمت میں پہنچوں۔ خواجہ حسام الدین کے ساتھ یہی ماجرا پیش آیا اور وہ آپ کی عذر و معذرت سے مجبور ہو کر مرشد کی تلاش میں آگے سے گئے۔ وہاں سراسیمہ اور حیران پھر رہے تھے کہ ایک جگہ سے قوالی کی آواز آئی۔ انھوں نے کان لگا کر سنا تو قوال یہ گا رہے تھے ؎

تو خواہی آستیں افشاں و خواہی دامن اندر کش
مگس ہرگز نخواہد رفت از دکانِ حلوائی

چنانچہ آپ پھر حضرت خواجہ کی خدمت میں واپس آگئے اور بڑے اصرار کے بعد ان کے حلقۂ بیعت میں داخل ہوئے۔ اسی طرح کا واقعہ ایک خراسانی نوجوان کو پیش آیا جو حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مزار پر معتکف تھا اور کسی زندہ مرشد کے ملنے کا طالب تھا۔ اسے خواب میں اشارہ ہوا کہ نقشبندیہ سلسلہ کے ایک مردِ کامل اس شہر میں آئے ہیں تو جا کر ان کی خدمت میں حاضر ہو۔ وہ پوچھتا پوچھتا خواجہ صاحب کی خدمت میں پہنچا اور اپنے خواب کا ماجرا بیان کیا۔ آپ نے کہا کہ میں مردِ کامل کہاں؟ وہ کوئی اور بزرگ ہوں گے! یہ کہا اور کثرت انکسار سے اس طرح معذرت کی کہ وہ نوجوان بھی پلٹ گیا۔ دوسری رات اسے پھر اشارہ ہوا کہ وہ بزرگ وہی ہیں، جن کی خدمت میں تم پہنچے تھے۔ اور ان کی عاجزی تو ان کا زیور ہے۔ چنانچہ وہ نوجوان پھر واپس آیا اور جب تک آپ نے اس کی رہنمائی قبول نہ کر لی۔ اپنی جگہ سے نہ ہلا۔

"غایت انکسار" کے علاوہ تذکرہ نگار آپ کی جس صفت پر زور دیتے ہیں، وہ "شفقت و ترحم" ہے۔ لاہور میں قحط سالی کے دوران میں آپ نے جو طریق کار اختیار کیا تھا؛ اس کے بارے میں زبدۃ المقامات کا بیان نقل ہو چکا ہے۔ فی الواقع

آپ کے ترحم اور تحمل و بُردباری کی اتنی مثالیں تذکروں میں ملتی ہیں کہ اگر ہم چند مستند واقعات کو ہی جمع کرنا شروع کریں تو ایک دفتر کی ضرورت ہو ؎

غمِ زلف ورُخت را شرح دادن
شبے باید دراز و ماہتابے!

آپ کی غیر معمولی فہم و فراست کی بھی قدیم تذکروں میں بڑی تعریف ہے۔ مثلاً زبدۃ المقامات میں لکھا ہے کہ اگرچہ آپ نے علومِ ظاہری پوری طرح نہیں حاصل کیے، لیکن "ذکائے فطرت" اور "صفائے نسبت" سے آپ کی عقل سمجھ کا پایہ بلند تھا ("دانش الیشاں پایۂ بلند داشتہ")۔

آپ کا اصل جوہر آپ کی اخلاقی پاکیزگی تھی، جسے دیکھنے والے "نفسِ ملکی" (زبدۃ المقامات) کے نام سے موسوم کرتے۔ آپ کو شروع میں ہی استخارہ میں بتادیا گیا تھا کہ "حاصلِ سلوک تہذیب الاخلاق" ہے۔ چنانچہ آپ نے اپنی تمام کوششیں تزکیۂ نفس اور رُوحانی پاکیزگی پر مبذول رکھیں۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ آپ کی خوبیاں فقط منفیانہ قسم کی تھیں۔ آپ کو علمی دنیا میں وہ پایہ حاصل نہیں جو آپ کے ایک معتقد شیخ عبدالحق محدث کو میسر تھا اور نہ ہی آپ کو اپنے دوسرے جلیل القدر مرید حضرت مجددؒ کا زورِ قلم نصیب ہوا، لیکن جہاں تک اصل کام یعنی ارشاد و ہدایت کا تعلق ہے، آپ اپنے زمانے میں منفرد تھے اور ہندوستان کی تاریخ تصوف میں آپ کی جگہ حضرت خواجہ بزرگؒ۔ حضرت سلطان المشائخؒ اور حضرت مجددؒ کے ساتھ ساتھ ہے جو اس مُلک میں اہم نئے سلسلوں کے موسّس ہوئے۔

جس سُرعت سے آپ نے تین چار سال کے قلیل عرصے میں نقشبندیہ سلسلے کی بُنیادیں مستحکم طور پر اس ملک میں رکھ دیں، وہی آپ کی رُوحانی عظمت کا بیّن ثبوت ہے اور شروع سے تذکرہ نگار اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مرید خواجہ محمد ہاشم کشمی لکھتے ہیں:-

"شاہدِ عظیم بر علو رتبۂ الیشاں ہمیں بس۔ کہ دو سہ سال بر مسندِ مشیخت بودند دریں

مدتِ قلیلہ چہ مردم کہ از خوانِ دولتِ ایشاں روزی مند گردیدند۔ وچہ برکات و آثار کہ در کشورِ وسیع ہندوستان از ایشاں انبساط گرفت وایں سلسلۂ طریقۂ نقشبندیہ کہ دریں دیارِ غریب بود، ترویج تمام یافت۔ باآنکہ بسیار دراں دیار ماندہ بودند۔ امّا برکات ایں دوسہ سالہ درآں سالہا کجا بود؟"

حضرت خواجہؒ کے مُرشدِ کامل ہونے کا اندازہ لگانے کے لیے کوئی ثانوی دلائل درکار نہیں۔ ان کے سب سے نامور مُرید نے اپنی ایک تصنیف میں اس پر روشنی ڈالی ہے اور حضرت کے طریقۂ تعلیم اور مرشدانہ شان کی اس پُرزور انداز سے تعریف کی ہے کہ ایک مسلمان کے قلم سے اس سے زیادہ زوردار اظہار تصوّر میں نہیں آسکتا۔ حضرت مجدّد الف ثانی مبداء و معاد میں لکھتے ہیں:۔

"ما چہار کسے بودیم در ملازمت حضرت خواجہ خود کہ بیش مردم درمیان سائر یاراں امتیاز داشتیم۔ و ہر کدام مارا نسبت بحضرت خواجہ قدس سرہٗ اعتقاد علٰحدہ و معاملہ جدا بود۔ ایں فقیر بہ یقین میدانست کہ مثل ایں صحبت اجتماع ومانند آں تربیت وارشاد بعد از زمان آں سرور علیہ وعلٰے آلہ الصلوٰت والتسلیمات ہرگز بوجود نیامدہ است۔ وشکر ایں نعمت بجامی باید آورد کہ اگرچہ بشرفِ صحبت خیر البشر علیہ وعلٰے آلہ الصلوٰۃ والسلام مشرف نشدیم۔ بارے از سعادت ایں صحبت محروم نماندیم۔"

خواجہ کلاںؒ

حضرت خواجہ باقی باللہ کی وفات سے کوئی دو سال پہلے، قریباً چار مہینوں کے تفاوت سے، ان کے دو بیٹے دو بیویوں سے پیدا ہوئے۔ وہ ابھی خردسال اور اناؤں کی گود میں تھے کہ حضرت خواجہ نے حضرت مجدّد سے انھیں توجہ دلائی۔ اور اپنے بلند مرتبہ مرید سے فرمایا کہ ضعفِ بدن مجھ پر غالب ہوگیا ہے اور امیدِ حیات کم رہ گئی ہے۔ آپ ان بچّوں کے حال کی خبرگیری رکھیں۔ ان دو میں سے بڑے کا نام، جو غرہ ربیع الاوّل ۱۰۱۰ھ یعنی ۱۳ اگست ۱۶۰۱ء کو پیدا ہوئے سلسلۂ نقشبندیہ کے مشہور بزرگ خواجہ عبید اللہ احرار کے نام پر عبید اللہ رکھا گیا، لیکن وہ زیادہ تر خواجہ کلاں کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کی

ولادت کی حضرت کو بڑی خوشی تھی۔ چنانچہ آپ نے ان کی ولادت، اذان و اقامت اور تسمیہ کی نسبت کئی اشعار لکھے۔ انھوں نے بڑے ہو کر طریقۂ نقشبندیہ کے اشغال شیخ الہ داد سے اخذ کیے۔ (زبدۃ المقامات) اور تکمیل حضرت مجدد کے زیر ہدایت کی۔ اور کئی مکتوبات ان کے نام ایسے لکھے جن میں بڑی نیازمندی کا اظہار ہے۔

خواجہ کلاں نے علوم ظاہری کی بھی (شیخ عبدالحق محدث کی نگرانی میں؟) تکمیل کی۔ حضرات القدس میں جو زبدۃ المقامات کے کچھ سال بعد مکمل ہوئی، آپ کی نسبت لکھا ہے: "آپ علم تاریخ اور انساب میں حصۂ کامل رکھتے ہیں اور تصوف میں آپ کو شغفِ خاص اور علمِ انشا میں قدرتِ کاملہ حاصل ہے اور مطالعۂ کتب آپ کا انیس و رفیق ہے۔ آپ کے اکثر اوقات تصنیف میں صرف ہوتے ہیں۔ تذکرۂ مشائخ بقدر ایک لاکھ اشعار (سطور؟) یا کم و بیش آپ نے تصنیف فرمایا ہے۔ اس کے سوا بھی آپ کی کئی تصانیف ہیں" (ص ۲۶۱)۔ اسی کتاب میں ایک اور جگہ خواجہ حسام الدین کے مقامات کے بیان میں آپ کی ایک علحدہ کتاب کا ذکر ہے۔ (ص ۲۷۵)۔ روضۃ القیومیہ میں (رکنِ اول ص ۲۱۱ پر) "حضرت خواجہ کلاں کے کلیات" کا ذکر ہے، جس میں بظاہر وہ مکتوبات بھی ہیں، جو خواجہ حسام الدین کی طرف مختلف اشخاص نے لکھے۔ اور شیخ عبدالحق محدث کا وہ خط دیا ہے، جو انھوں نے خواجہ حسام الدین کو حضرت مجدد سے غایت محبت کا اظہار کرتے ہوئے لکھا۔ اسی طرح طبقاتِ شاہجہانی میں آپ کی "تصنیفاتِ نافع" کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "احوالِ صحابہ و تابعین و تبع تابعین و مشائخ دین تا وقت خود نوشتہ" (شاید یہ وہی کتاب ہو، جسے حضرات القدس میں تذکرۃ المشائخ کہا گیا ہے)۔

افسوس کہ ان کتابوں میں سے ہمیں ایک بھی دستیاب نہیں ہوئی۔ لیکن انڈیا آفس لائبریری (ذخیرۂ دہلی) میں خواجہ کلاں کی ایک اہم تصنیف مبلغ الرجال پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ چھوٹے سائز کے ۱۱۸ اوراق ہیں۔ اس کا مقصدِ تصنیف اس اختصار کو

رفع کرنا تھا۔ جو "آرا ر اہلِ فکر و نظر و اقوالِ اربابِ کشف و شہود" کی وجہ سے "معرفتِ حقیقت عالم" کے متعلق پیدا ہو گئی تھی۔ کتابچہ کا کافی حصہ قرامسلہ اور ملاحدہ کے بیان میں ہے۔ اکبر، ابوالفضل اور شیخ مبارک پر بڑی نکتہ چینی کی ہے۔ بعض صوفی تصانیف اور ان صوفیوں کی جو علتِ ادراک کی وجہ سے غلط فہمیوں میں مبتلا ہو گئے، شکایت کی ہے۔ اور حضرت مجددؒ کا ذکر اپنے والد کے "اعظم الخلفا" کہہ کر کیا ہے۔

حضرت مجددؒ کے خانوادۂ باقویہ سے قریبی تعلقات کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ خواجہ کلاں کی صاحبزادی حضرت مجددؒ کے سب سے چھوٹے صاحبزادے جو والد کی وفات کے وقت خردسال تھے، بیاہی گئیں۔

خواجہ خردؒ

حضرت خواجہ کے دوسرے صاحبزادے ۶ رجب سنہ ۱۰۱۰ھ یعنی ۴ فروری سنہ ۱۶۰۲ء کو پیدا ہوئے۔ ان کا اسمِ گرامی خواجہ عبداللہ تھا۔ لیکن خواجہ خرد کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ ان کی ولادت پر بھی حضرت خواجہ نے زوردار شعر کہے ؎

یارب کہ طلسمِ خود کشائی	ایں طفلکِ ما باد نمائی
خود را بتمام خود گزارد	چوں نخل زدانہ سر برآرد
چندیں ہمہ آفتاب رفتند	در بحر تو چوں حباب رفتند
ایں قطرہ ہم از شمار ایشاں	در موج خودش بکن پریشاں
باشد کاکم از و بر آید	چوں ہیمتش از تو یادم آید
ہر جا کہ ترشح تو بینیم	در العطش آیم و نشینیم
اے بحرِ طرب بکامِ من شو	امروز یکے بہ جامِ من شو
من جام چہ مے کنم گدایم	مشتاقِ تو ام دہن کشایم

خواجہ خُردؒ کو خواجہ کلاں کی نسبت حضرت مجددؒ سے زیادہ فیضیاب ہونے کا موقع ملا۔ وہ کئی مرتبہ ان کی خدمت میں سرہند اور ایک مرتبہ لاہور پہنچے اور دیر تک وہاں قیام کیا۔ زبدۃ المقامات کے بیان کے مطابق آپ نے حضرت مجددؒ سے بعض

کتب علمِ کلام جیسے شرح مواقف وغیرہ یا بعض رسائل صوفیہ" بھی پڑھے۔
خواجہ خرد رباعیات و شرح رباعیات میں لکھتے ہیں کہ آپ کو حضرت مجددؒ سے "اجازتِ عمل طریقہ و اجازتِ تعلیم ہا" حاصل تھی۔

"ایں فقیر چند مرتبہ از وطنِ مالوف بخدمت ایشاں در سرہند و یکبار در لاہور مشرف شدہ و ہر بار چند گاہ در خدمت بسر بردہ۔ الطافِ بسیار مے فرمودند۔ و امیدواری چناں است کہ آں الطاف سببِ نجاتِ اخروی گردد۔ اجازتِ عمل طریقہ و اجازت تعلیم ہا نیز فرمودند۔ و بشارتہا میدادند"

حضرات القدس سے اس کی تائید ہوتی ہے "... چند بار پیادہ و سوار نہایت مسکنت و انکساری اور تجرید و تفرید کے ساتھ دہلی سے سرہند تک آنحضرت قدس سرہ کی عتبہ بوسی کے لیے آئے۔ اور مدتِ طویل تک آنحضرت کی خدمت میں بسر کی اور فیض و برکات پائے۔ اور آنحضرت کی خلافت و اجازت سے سعادت گیر ہوئے "
خواجہ خردؒ کے مزاج میں کسی قدر وارستگی تھی۔ حضرت مجددؒ اس خواجہ زادہ کے وسعتِ مشرب سے ہمیشہ ہراساں رہتے تھے کہ ان تمام تعینات کے ساتھ اپنے والد ماجد کے مسندِ ارشاد اور سجادہ پر جانشین ہو سکیں گے یا نہیں۔ اور طالبوں کو فائدہ رسانی میں دماغ سوزی اور سرگرمی دکھا سکیں گے یا نہیں چنانچہ اسی طرح واقعہ ہوا۔ کہ دو ایک شخصوں کو حکم حضرت کی تعمیل کے لیے طریقہ کی تعلیم دی اور حضرت وارستگی اور بے تعینی سے اس امر جلیل القدر کی پابندی نہ کر سکے"
حضرات القدس کے اس اندراج کی شاہ ولی اللہؒ کے بیان سے تائید ہوتی ہے۔ ان کے والد شاہ عبدالرحیم خواجہ خرد کی خدمت میں رہا کرتے تھے۔ اور وہ بھی ان کے جد شیخ قطب عالم اور سید شیخ رفیع الدین کے اپنے والد بزرگوار سے تعلقات کی وجہ سے انھیں بڑا عزیز رکھتے تھے۔ شاہ عبدالرحیم نے خواجہ خرد سے حاشیۂ خیالی کے چند سبق بھی پڑھے تھے۔ لیکن جب انھوں نے بیعت کے لیے کہا تو خواجہ صاحب نے ٹال دیا۔ اور کہا کہ چونکہ مجھ سے بعض بے قاعدگیاں ہوئی ہیں، میں نہیں چاہتا

کہ علاقۂ بیعت کی وجہ سے تم کو کوئی ضرر پہنچے۔ اور مشورہ دیا کہ حضرت آدم بنوری کے کسی خلیفہ سے بیعت کریں۔

خواجہ خرد نے کئی صوفیانہ رسائل لکھے اور اتفاق سے وہ قریباً سارے کے سارے محفوظ ہیں۔ ان میں سے دو ایک تو چھپ چکے ہیں، لیکن شاید ان کا سب سے مکمل مجموعہ انڈیا آفس لائبریری (ذخیرۂ دہلی) میں ہے۔ ان میں بیان احوال و ملفوظات خواجہ خرد (جس میں آپ کے بعض مکتوبات بھی ہیں) کے علاوہ رسالہ سماع۔ رسالہ خواجہ خرد (توحید وجودی کے متعلق) رسالہ فوائح۔ پردہ برانداخت و پردہ کر شناخت۔ پرتو عشق۔ رسالہ سید اور شرح تسویہ کے علاوہ ایک دلچسپ تصنیف رباعیات و شرح رباعیات ہے۔ موخر الذکر میں بعض معاصرانہ بزرگوں کی نسبت مدحیہ رباعیات لکھ کر ان کے متعلق واقعات اور اپنے تاثرات دیے ہیں، جو حضرت باقی باللہؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے حالات کے طالبین کے لیے دلچسپی کا باعث ہیں۔

خواجہ حسام الدینؒ

حضرت خواجہ باقی باللہؒ کے خلیفۂ اعظم حضرت مجدد الف ثانیؒ تھے۔ ان کا تفصیلی ذکر علیحدہ آئے گا۔ ان کے علاوہ آپ کے کئی اور خلفا تھے، جن میں سے شیخ تاج الدین سنبھلی۔ شیخ الہداد۔ خواجہ محمد نور اور مرزا حسام الدین احمد زیادہ مشہور ہیں۔ ان میں سے مرزا حسام الدین کے حالات بڑے دلچسپ ہیں۔ وہ ۹۷۷ھ ہجری (۷۰-۱۵۶۹ء) میں بلاد بدخشاں کے قصبہ قندوز میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد قاضی نظام الدین بدخشی مخاطب بہ غازیخاں اکبر کے مقربین میں سے تھے۔ بلکہ بدایونی کہتا ہے کہ سجدۂ زمین بوس" کی تجویز انھی نے پیش کی[۱]۔ مرزا حسام الدین خود شیخ مبارک کے داماد تھے اور ابوالفضل اور فیضی کی بہن ان سے بیاہی تھی۔ باپ کی وفات پر موروثی منصب انھیں ملا اور خانخاناں

---

[۱] چشتی (کم از کم نظامی) حضرات مرشد کو سجدۂ تعظیمی جائز قرار دیتے ہیں۔ (خواجہ حسن نظامی نے اس موضوع پر ایک رسالہ بھی لکھا تھا) اور قدیم سلاطین میں بلبن نے اسے شروع کیا تھا۔

کے ساتھ دکن کی مہم کو گئے۔ اس اثنا میں فقرا سے ملتے رہے۔ اور محبت الٰہی کا جذبہ ایسا غالب ہُوا کہ ترکِ دُنیا کا فیصلہ کیا۔ خانخاناں نے، جو آپ کے والد کا شاگرد تھا۔ مخالفت کی۔ آپ نے اس سے کہا کہ اگر ترکِ منصب کی درخواست دوں گا تو منظور نہ ہو گی۔ مَیں دیوانہ ہو جاتا ہوں اور قیود دنیوی سے رہائی پا کر باقی عمر سلطان المشائخ کے مزار پر گزار دوں گا۔ خانخاناں نے منتیں کیں، لیکن آپ نہ مانے۔ دوسرے دن کپڑے پھاڑ کر پھینک دیے۔ بدن کو کیچڑ ملا اور دیوانوں کی طرح گلی کوچوں میں پھرنے لگے۔ خانخاناں نے اب بھی انھیں روکنا چاہا۔ دوسرے امرا کو ساتھ لے کر بڑے اعزاز سے انھیں اپنی قیام گاہ پر لایا اور پھر وعظ و نصیحت شروع کی۔ انھوں نے جواب تک نہ دیا۔ ناچار خانخاناں نے ان کی عرضی بادشاہ کے پاس بھیجی۔ وہاں سے دلّی آنے کی اجازت ہوئی۔ یہاں پہنچے تو خواجہ باقی باللہ کے مُرید ہوئے اور اتنی خدمت کرنے کا موقع ملا کہ جب مُرشد دم توڑ رہا تھا تو مرزا حسام الدین کے سوا کوئی دُوسرا خدمت میں موجود نہ تھا۔

جب حضرت خواجہ نے وفات پائی تو ان کے دونوں بیٹے خورد سال تھے۔ ان کی عمر دو دو سال سے زیادہ نہ تھی۔ انھوں نے حضرت مجدّدؒ سے کئی طرح کے رُوحانی فیوض حاصل کیے۔ لیکن ان کی عام خبرگیری کی سعادت مرزا حسام الدین کے حصّے میں آئی۔ حضرت مجدّد خود ایک خط میں اپنے مرشد کے احسانات کا ذکر کر کے اپنے مُرشد زادوں کو لکھتے ہیں :-

"ہرگاہ ایں دولت رفیع القدر از حضرتِ ایشاں بدیں فقیر رسیدہ باشد۔ اگر مدتِ عمر سر خود را پامالِ اقدام خدمۂ عتبۂ عالیہ شما کردہ باشد۔ ہیچ نکردہ باشد۔ از تقصیرات خود چہ عرض کند و از شرمندگیہائے خود چہ اظہار نماید۔ امّا معارف آگاہ خواجہ حسام الدین را حق سبحانہ‘ از ما جزائے خیر دہاد کہ معونت ما قاصران بر خود التزام نمودہ کمرِ ہمّت را در خدمتِ عتبۂ عالیہ بستہ اند و ما دور افتادگاں را فارغ ساختہ۔"

شاہ ولی اللہ انفاس العارفین میں لکھتے ہیں :-

"مخفی نماند کہ خواجہ حسام الدین در اوائل حال در سلک امرائے وقت انتظام داشتند والد ایشاں از اعاظم امرائے زماں بود۔ چوں بصحبت خواجہ رسیدند و جذب طریقہ بلند ایشاں تاثیر کرد۔ ہمہ را ترک کردند۔ وطوعاً و رغبتہً از ہمہ برآمدند۔ چوں آقارب ایشاں نمی گذاشتند کہ وضع فقرائے بخود قرار دہند۔ خود را بدیوانگی انداختند و در مجمع بر مزبلہ نشستند و خود را ملوث ساختند۔ ازاں باز دستِ تشویش آں جماعہ از ایشاں کوتاہ شد۔ آنقدر مراعات جانب خواجہ دربارۂ اولاد ایشاں و اتباعِ ایشاں و طریقۂ ایشاں و اشتغال ایشاں کہ ازیں دو عزیز (خواجہ حسام الدین و شیخ الہداد) بظہور پیوست۔ از دیگراں بوقوع نیامد"

خواجہ حسام الدین کی مفصل سوانح عمری حضرت خواجہ باقی باللہ کے صاحبزادے خواجہ کلاں نے لکھی۔ وہ اب دستیاب نہیں ہوتی لیکن منتشر حالات معاصرانہ کتابوں میں ملتے ہیں۔ ان سے پتا چلتا ہے کہ آپ کی طبیعت میں مسکنت بے حد تھی بلکہ خواجہ خرد، جو آپ کو "افضل و اکمل اصحاب حضرت خواجہ ما" اور ان کے "جانشین حقیقی" کہتے ہیں۔ رباعیات و شرح رباعیات (قلمی) میں لکھتے ہیں کہ اگرچہ آپ کو حضرت خواجہ سے خلافت عطا ہوئی تھی اور آپ ارشاد و ہدایت کے مجاز تھے، لیکن آپ یہ کہتے رہے کہ میں اس اہم ذمہ داری کے قابل نہیں۔ اور سلسلۂ ارشاد شروع نہ کیا:۔

در مقام عبودیت کہ نہایت مقامات ولایت است مستقر داشتند۔ باآنکہ از حضرت خواجہ مجاز و از غیب باذوق بودند۔ بہ مشیخت و ارشاد متوجہ نشدند و از کمال علو ہمت و نہایت تجرید طریقۂ شیخی اختیار نہ فرمودند۔

خاکساری و انکسار و انزوا کے باوجود آپ کا اپنے زمانے میں بڑا اثر تھا۔ شیخ عبدالحق محدث سے، جو حضرت خواجہ کے عقیدت مندوں میں سے تھے، آپ کے بڑے روابط تھے۔ بلکہ سفینۃ الاولیا میں دارا شکوہ لکھتا ہے۔ کہ بعض "سخنانِ غیر واقع" کی بنا پر جہانگیر نے، جب وہ کشمیر میں تھا۔ آپ کو اور شیخ محدث کو دہلی سے چلے جانے کا حکم دیا۔ اس روایت میں بعض غلطیاں ہیں (مثلاً آپ کو از مریدان باکمال

شیخ احمد سرہندیؒ لکھا ہے)۔ لیکن اگر نفسِ مضمون میں کچھ صحت ہے تو غالباً اس کی وجہ یہ ہوگی کہ آپ (اور شیخ محدّث) شہزادہ خرّم (شاہجہان) کے طرفدار سمجھے جاتے ہوں گے۔ جو ایک زمانے میں نورجہاں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے اپنے والد جہانگیر کے خلاف بغاوت پر مجبور ہو گیا تھا۔ مثلاً طبقاتِ شاہجہانی کا مصنف بڑی تفصیل سے لکھتا ہے کہ خواجہ حسام الدین کی بڑی خواہش تھی کہ خرّم (شاہجہان) بادشاہ ہو۔ مخفی اور علانیہ اس خواہش کا اظہار کرتے۔ خود اس کے لیے دعا کرتے اور درویشوں اور گوشہ نشینوں سے اس مقصد کے لیے دعا کی درخواست کرتے۔ طبقات کا متعلقہ اندراج حسبِ ذیل ہے:۔

> با وجود کمالِ اجتناب و احتراز حضرت حسام اولیا (خواجہ حسام الدین) از دُنیا و اہلِ دُنیا و ملاقاتِ ملوک و سلاطین، چوں دینداری و دین پروری حضرت صاحبقرانِ ثانی در خاطرِ شریف وے متمکن بودہ۔ ہمیشہ بدعا و زاری از درگاہ حضرتِ قادر باری سلطنت او میخواستہ در سرّ و علانیہ طالبِ آں بود کہ لوائے سلطنت حضرت بادشاہ دین پناہ شاہجہان مرتفع شود۔ و شب و روز بجہت رفاہیت خلق اللہ از درویشاں و گوشہ نشیناں التماس فاتحہ برائے بر آمدن ایں مطلب میکردہ تا آنکہ حضرت صاحبقرانِ ثانی نیز چوں از زمانِ شاہزادگی سوابق دوستداری و دولت خواہی وے میدیدند۔ حسنِ عقیدۂ تام بوے داشتند۔ بعد از وفاتِ آنجناب چنانچہ باید بر احوال فرزنداں بر داشتند۔ خلد اللہ۔

خواجہ حسام الدین کا ذکر حضرت مجدد الف ثانیؒ کے دونوں قریب العہد تذکروں (زبدۃ المقامات، حضرات القدس) میں بڑی تفصیل اور تعریف کے ساتھ ہوا ہے۔ دونوں [illegible] لکھتے ہیں کہ اگرچہ آپ عزلت گزیں تھے۔ اور امرا و روسا سے اختلاط [illegible] بچتے۔ لیکن محتاجوں کی حاجت روائی میں بڑے حریص تھے۔ [illegible] ان [illegible] سفارش کے لیے ہمیشہ مستعد رہتے۔ بلکہ کبھی ایسے ایسے اُمرا سے بھی سفارش کرتے کہ آپ کے مخلصین کو ناگوار ہوتا۔ اور آپ کے فرزند اعتراض

کرتے، لیکن آپ نے اس طریقِ کار کو نہ چھوڑا۔

آپ نے مرشد کے مزار کے گرد ایک باغیچہ لگوایا تھا۔ بقول خواجہ ہاشم کشمی "امروز بہ یمن سعی خدمت خواجہ حسام الدین احمد سلمہ اللہ تعالٰی حوالی آں مزار از آبشار و اشجار و انہار بہشتے شدہ بزار و بتبرک و بتقع"۔ آپ دن کا زیادہ حصہ وہاں گزارتے اور تلاوت قرآن شریف اور نماز اور مراقبہ میں مشغول رہتے۔ آپ کی وفات اگست ۱۶۳۳ء کو آگرہ میں ہوئی۔ کچھ دیر کے بعد جسدِ خاکی کو وہاں سے دہلی لاکر مرشد کے بائیں مزار دفن کیا گیا۔ خواجہ حسام الدین کی وفات کے بعد ان کی بی بی نے ان کے نیک کام جاری رکھے۔ اپنے بھائیوں اور خویشوں سے منہ موڑ لیا اور جب تک جیتی رہی، ۱۲ ہزار روپے سالانہ جو خانخاناں کی دی ہوئی جاگیر سے آتا تھا حضرت خواجہ کی خانقاہ کے خرچ کے لیے بھیجتی رہی۔ خواجہ حسام الدین کی وفات پر طبقاتِ شاہجہانی کے مصنف[1] نے جو پُراثر قطعہ لکھا۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

چوں حسام الحق از جہاں بگزشت حصنِ دیں را اساسِ محکم رفت
بایزیدؒ و جنیدؒ دوراں شد شبلیِ وقت و ابنِ ادہم رفت
یارِ بیچارگانِ خستہ نماند اہلِ دیں را انیس و ہمدم رفت

شیخ تاج الدین سنبھلیؒ

خواجہ خورد سے شاہ ولی اللہ کے والد شاہ عبدالرحیم نے چند سبق پڑھے اور اُن کی صحبت سے فیض حاصل کیا تھا۔ شاہ عبدالرحیم، خواجہ محمد باقی کے بڑے مدّاح اور ان کے خاص طریقے کے

---

[1] محمد صالح نام۔ شیخ عبدالحق محدّث سے ان کے بڑے روابط تھے۔ ان کی بڑی تعریف لکھی ہے۔ وہ بھی بڑی شفقت فرماتے تھے۔ یہ ایک دفعہ بیمار ہوئے اور علالت نے طول کھینچا۔ شیخ ہر روز بیمار پُرسی اور تسلّی کے لیے رقعہ لکھتے۔ کبھی دن میں دوبار۔ "قریب صد و پنجاہ رقعہ آنحضرت بیشِ فقیر کہ ہمہ بدستخطِ خاص نوشتہ اند۔ جمع شدہ"۔ طبقات شاہجہانی میں شیخ عبدالحق محدّث کے کئی رقعات نقل ہوئے ہیں۔

پَیرو تھے۔ وہ اسے نقشبندیہ طریقہ کے دوسرے شعبوں پر فضیلت دیتے تھے۔ شاہ ولی اللہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:۔

"مخفی نماند کہ حضرت ایشاں (شاہ عبدالرحیم) از شعبات طریقۂ نقشبندیہ آں قدر شعبۂ حضرت خواجہ محمد باقی را پسند میکردند و میل میفرمودند کہ مثل ایں میل بدیگر شعب نبود۔ ہمہ ارشاد و تربیت ایشاں بایں شعبہ بود است۔ شیخ تاج الدین سنبھلی کہ از اول خلفائے حضرت خواجہ بودند و در آخر بمکہ اقامت اختیار کردہ ہمانجا مدفون شدند و ایں فقیر از مشائخان مشائخ اہلِ ہند ہیچ کس را ندیدہ کہ اہلِ مکہ زیادہ از شیخ تاج معتقد او باشند۔ کراماتِ وے روایت کنند۔ در بیان اشتغال شعبِ باقویہ کہ ہماں طریقۂ نقشبندیہ است بے افراط و تفریط۔ رسالہ عربیہ دارند و حضرتِ ایشاں (والدِ من) ترجمہ آں رسالہ فارسیہ نوشتند ملتقط از عباراتِ سلف۔ ایں فقیر ایں ہر دو را بخدمتِ حضرتِ ایشاں گزراندہ والحمد للہ"

شیخ تاج الدین سنبھلی، جن کے اشتغال نقشبندیہ کے متعلق عربی رسالے کا فارسی ترجمہ شاہ عبدالرحیم نے کیا تھا، خواجہ باقی باللہ کے سب سے پہلے مرید تھے۔ (زبدۃ المقامات) وہ غالباً اُن کے حلقۂ ارادت میں اس وقت داخل ہوئے، جب حضرت خواجہ بندگوں کی تلاش میں سنبھل آئے تھے۔ حضرت خواجہ کی وفات کے جلد بعد وہ بلادِ عرب میں چلے گئے تھے۔ ان کی نسبت علامہ مرتضےٰ زبیدی نے جن کی عمر کا بیشتر حصہ یمن، حجاز اور مصر میں گزرا، نفحۃ القدسیہ میں لکھا ہے کہ شیخ تاج الدین نے بصرہ۔ یمن۔ احسا۔ نجد اور خود حجاز میں طریقۂ نقشبندیہ کو پھیلایا، اور ان علاقوں میں ان کے مریدوں کی ایک بڑی جماعت تھی۔ انھوں نے عربی میں متعدد کتابیں تصنیف اور ترجمہ کیں۔ اور اہلِ عرب کو نقشبندیہ سلسلے سے روشناس کردیا۔ اس سلسلے کے متعلق آپ کی مشہور تصنیف الرسالہ فی سلوک خلاصۃ السادات نقشبندیہ ہے۔ جس کی علامہ عبدالغنی النابلوسی نے تفصیل شرح "مفتاح المعیت فی طریقۃ النقشبندیہ" کے نام سے لکھی ہے۔ آپ نے ایک عربی رسالہ پیری مریدی

کے جواز میں منکرین کو قائل کرنے کے لیے لکھا۔ تصوف کی کئی مشہور کتب (مثلاً جامی کی نفحات الانس اور مُلا واعظ کاشفی کی رشحات) کا عربی میں ترجمہ کیا۔ نفحات الانس کے اس عربی ترجمے کا ایک نسخہ کتب خانۂ رام پور میں ہے۔

حجاز میں شیخ تاج الدین کو غیر معمولی کامیابی کچھ اس وجہ سے ہوئی کہ شیخ محمد علان جو اعیان و اکابرِ حرم میں سے تھے اور جنھیں طریقۂ نقشبندیہ سے پہلے سے دلچسپی تھی، آپ کے حلقۂ ارادت میں آ گئے اور دیارِ عرب میں آپ کو شیخ الشیخ علان کہا جانے لگا۔

حجاز میں کچھ عرصہ قیام کے بعد آپ ہندوستان تشریف لائے۔ لیکن پھر واپس چلے گئے۔ اور اپنی طویل عمر کا کافی حصہ حجاز اور عربستان گزارا۔ آپ کو وہاں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ آخری دفعہ بصرہ و کوفہ کی طرف گئے تو حاکم بصرہ آپ کے مخلصین میں داخل ہُوا (زبدہ)۔ بالآخر آپ نے بیت اللہ شریف کے قریب زمین خریدی اور وہاں سکونت اختیار کی۔ آپ کی وفات ننانوے برس کی عُمر میں ۱۰۵۰ھ ہجری میں ہوئی اور مکّہ معظمہ میں مدفون ہوئے۔ آپ کے حالات میں ایک مستقل عربی کتاب بانکے پور لائبریری میں ہے۔

اب ہم حضرت خواجہ کے سب سے نامور خلیفہ اور ہندوستان کے بطلِ عظیم حضرت مجدّد الف ثانی کا ذکرِ خیر کریں گے۔

حضرت مجدّد الف ثانی شیخ احمد سرہندی قدس سرہٗ

حضرت مجدد الف ثانی ۱۴ شوال ۹۷۱ھ یعنی ۲۶ جون ۱۵۶۴ء کو بمقام سرہند پیدا ہوئے۔ آپ کا اسمِ گرامی احمد تھا۔ لقب بدرالدین اور کنیت ابوالبرکات۔ آپ خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروقؓ کی اولاد سے تھے۔ اور آپ کا سلسلۂ نسب کابل کے ایک ممتاز خاندان سے ملتا ہے۔ خاندانی روایات کے مطابق آپ مغربی پاکستان کے مشہور بزرگ حضرت بابا فرید گنج شکر کے ہم جد تھے۔ کیونکہ دونوں کا سلسلۂ نسب شیخ شہاب الدین علی المعروف بہ فرخ شاہ الفاروقی الکابلی سے ملتا ہے۔

تعلیم حضرت مجدّد الف ثانی نے ابتدائی تعلیم اپنے والد مخدوم عبدالاحدؒ اور سرہند کے دوسرے علماء سے حاصل کی۔ اس کے بعد مُلک کے بعض بہترین علماء سے فیض حاصل کیا۔ سیالکوٹ میں آپ نے علامہ کمال الدین کشمیری سے جن کے حلقۂ درس سے ملّا عبدالحکیم سیالکوٹی جیسے فاضلِ روزگار اُٹھے۔ عضدی اور اس قسم کی دوسری مشکل کتابیں پڑھیں۔ حدیث میں آپ کے سب سے مشہور اُستاد شیخ یعقوب صرفی کشمیریؒ تھے، جن کا ذکر آئندہ سطور میں آئے گا۔ ان کے علاوہ قاضی بہلول بدخشانیؒ سے تفسیر واحدی مع دیگر مؤلفات واحدی (مثلاً بسیط و وسیط و اسبابِ نزول)، تفسیر بیضاوی مع دیگر مصنفات قاضی بیضاوی (مثلاً منہاج الوصول و غایت القصویٰ)، صحیح بخاری اور امام بخاریؒ کی دوسری تالیفات (مثلاً ثلاثیات و ادب المفرد و افعال العباد و تاریخ وغیرہ)۔ مشکوٰۃ مصابیح۔ شمائل ترمذی۔ جامع صغیر سیوطی اور قصیدہ بردہ و حدیث مسلسل کی اجازت حاصل کی) افسوس کہ قاضی بہلول بدخشانی کے متعلق تفاصیل نہیں ملیں۔ لیکن زبدۃ المقامات میں جہاں ان کی اسناد حدیث درج ہیں، یہ وضاحت کی گئی ہے کہ حدیث میں ان کے استادِ معظم شیخ عبدالرحمان بن فہد تھے، جو حجاز کے ایک مشہور محدث خاندان کے چشم و چراغ تھے۔

مخدوم عبدالاحدؒ مخدوم عبدالاحدؒ جو حضرت مجددؒ کے والد، اُستاد اور پیر و مُرشد تھے۔ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے صاحبزادہ شیخ رکن الدین کے ممتاز خلیفہ اور بڑے صاحب علم بزرگ تھے۔ آپ کئی صوفیانہ کتب مثلاً کنوز الحقائق اور رسالہ تشہد کے مصنف اور بڑے سیاح تھے۔ چنانچہ زبدۃ المقامات میں آپ کے بنگالہ۔ جونپور۔ رہتاس وغیرہ کے سفر اور اثنائے سفر میں اولیاے اور علماے کرام سے ملاقات کا ذکر ملتا ہے۔

آپ نے شیخ اکبر محی الدین ابن العربی اور شیخ شہاب الدین سہروردی کی کتابوں کا غائر مطالعہ کیا تھا اور فصوص الحکم اور تصوف کی دوسری اہم کتابوں مثلاً عوارف المعارف کا درس دیا کرتے تھے۔ بلکہ زبدۃ المقامات کے ایک اندراج سے خیال ہوتا ہے کہ حضرت میاں میر لاہوری نے فصوص الحکم آپ سے پڑھی تھی) مولانا ہاشم کشمی لکھتے ہیں "قدوۃ المشائخ جناب شیخ میرؒ جو آج کل شہر لاہور میں سکونت فرما اور نہایت عزلت پسند ہیں۔ آپ کے تلامذہ فصوص الحکم سے ہیں"۔

سب والدین کو اپنی اولاد عزیز ہوتی ہے، لیکن تذکرہ نگار بالصراحت اور بالتفصیل لکھتے ہیں کہ مخدوم صاحب کو اپنے بلند اقبال صاحبزادے سے غیر معمولی محبت تھی:۔

> والد ماجد ایشاں را با ایشاں الفتِ تمام بودہ و از جانِ عزیز خود عزیز تر مے داشتند۔ و ہمیشہ بصحبتِ ایشاں مشغوف بودند۔ و اندقائق علوم دینی و اسرارِ یقینی درمیان مے آوردند۔ (زبدۃ المقامات ص ۱۳۳)

ور حضرت مجددؒ نے بھی ان سے پوری طرح اخذِ فیض کیا:۔

> ملتزم خدمت و صحبتِ والا بزرگوار شدہ و ہمگی اقتباس انوار آں بزرگِ عالیمقدار گردیدہ و فوائد باطنیہ کثیرہ از ایشاں دیدہ (ایضاً)

یہ صرف ایک شفیق باپ اور سعادت مند صاحبزادے کا تعلق نہ تھا بلکہ مخدوم صاحب ان کے اُستاد اور پیر و مرشد بھی تھے۔ حضرت مجددؒ نے شروع میں اکثر علوم انہی سے پڑھے۔ چشتیہ اور قادریہ سلسلے میں ان کے مرید ہوئے۔ اور جیسا کہ انھوں نے

مبدا و معاد میں لکھا ہے۔ منسبت فردیت" ان سے حاصل کی حقیقت یہ ہے کہ حضرت مجددؒ کی اکثر صلاحیتیں خداداد تھیں' اور ان کے جوہر نقشبندیہ سلسلے میں بیعت اور حضرت باقی باللہ کی خدمت میں پہنچنے کے بعد کھلے۔ لیکن شاید ان کے خیالات کی ساخت میں سب سے زیادہ دخل ان کے شفیق باپ کی صحبت اور ابتدائی ماحول کو تھا۔ (مخدوم عبدالاحد کو شیخ ابن العربی کے خیالات سے بڑا شغف تھا۔ اس کا اثر ان کے فرزند صاحبزادہ پر بڑا گہرا اور وسیع ہوا۔ حضرت مجدد الف ثانی ایک خط میں لکھتے ہیں :-

> مکرما! معتقد فقیر از خردی بامشرب اہل توحید بود۔ والد فقیر قدس سرہ بظاہر برہمیں مشرب بودند۔ و بر سبیل دوام بہ ہمیں طریقہ اشتغال داشتہ اند......
>
> بحکم ابن الفقیہ نصف الفقیہ فقیر را ازیں مشرب از روئے علم حظ وافر بود و لذت عظیم داشت۔

نقشبندیہ سلسلے میں داخل ہونے کے بعد بھی مدت تک یہی حالت رہی۔ اس کے بعد حضرت مجدد پر وحدت شہود کی کیفیت منکشف ہوئی۔ اس زمانے میں انھوں نے شیخ ابن العربی اور ان کی تصانیف کے متعلق بعض مخالفانہ فقرے لکھے۔ شیخ کی مخالف شرع باتوں سے اختلاف ظاہر کیا۔ لیکن شیخ کی عظمت و بزرگی کے ہمیشہ معترف رہے۔ بقول خواجہ ہاشم کشمی "شیخ محی الدین ابن العربی قدس سرہ را بس بزرگ مے دانستند و نیک یاد مے کردند"۔ انھوں نے توحید وجودی کی پوری نفی نہیں کی۔ بلکہ اسے توحید شہودی سے نیچے ایک مقام قرار دیا۔ اور "توحید وغیرہ امور خلافیہ" کے متعلق کہا۔ "علما ان امور کی قباحت کے قائل ہیں۔ اور فقیر شرط عبور ان امور کے حسن کا" (دفتر دوم ۴۲) قطب۔ ابدال۔ اوتاد کے جس باطنی نظام کو شیخ ابن العربی نے تصوف میں داخل کیا تھا' اسے آپ نے ترقی اور تقویت دی اور طریقہ مجددیہ کے قیوم کو شیخ ابن العربی کے قطب کی اگلی منزل سمجھنا چاہیے۔

شیخ یعقوب صرفی کشمیریؒ حضرت مجدد کے دوسرے باثر استاد شیخ

یعقوب صرفی کشمیریؒ تھے، جن سے انھوں نے حدیث کی بعض کتابیں پڑھیں اور سلسلۂ کبرویہ میں بیعت کی (حضرات القدس)۔ برصغیر کی روحانی، ادبی اور سیاسی زندگی میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ ۹۲۸ھ میں پیدا ہوئے۔ کشمیر کے ایک معزز خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ تعلیم ظاہری کے بعد سمرقند جاکر شیخ حسین خوارزمیؒ کے مُرید ہوئے۔ مُرشد نے خاص توجہ اور مہربانی کی۔ واپس کشمیر آئے تو خلقت کے ٹھٹ کے ٹھٹ فیض کے لیے حاضر ہوئے۔ انھوں نے کچھ عرصے کے بعد خراسان کے رستے حجاز کا رُخ کیا۔ شیخ ابنِ حجرؒ سے حدیث پڑھی اور سند لی۔ بڑے سفر کیے اور کئی اولیاے اللہ سے مُلاقات کی۔ واپس کشمیر پہنچے تو یہاں شیعہ سنی جھگڑے زوروں پر تھے۔ جب یعقوب چک نے قاضی موسےٰ کو شیعہ طریقے سے خطبہ نہ پڑھنے پر شہید کرا دیا اور اہلِ سنّت کے لیے حالات بہت ناسازگار ہوگئے تو شیخ یعقوب، بابا داؤد خاکی کو ساتھ لے کر اکبر کے پاس لاہور پہنچے اور کشمیری عوام کی طرف سے دعوت دی۔ اکبر تو اس موقع کا پہلے سے منتظر تھا۔ اس نے اپنی فوجیں بھیجیں اور اکتوبر ۱۵۸۶ء میں کشمیر مملکتِ مُغلیہ کا حصّہ ہوگیا۔

اس واقعہ کے بعد اکبر اور شیخ کے درمیان خاص روابط ہو جانا عجب نہیں۔ لیکن بدایونی کے بیان سے خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ روابط پہلے سے تھے۔ بلکہ وہ تو کہتا ہے کہ ہمایوںؒ کو بھی شیخ سے غیر معمولی اعتقاد تھا:۔

> وہم بادشاہِ مغفرت پناہ (ہمایوں) و ہم شاہنشاہی (اکبر) را نسبت وے اعتقادِ غریب بود۔ بشرفِ صحبت اختصاص داشتہ و منظورِ نظرِ شفقت اثر گشتہ معزز و مکرم و محترم بود۔

شیعہ سنی مسئلے پر شیخ یعقوب کے جو شدید احساسات تھے، اس کا اندازہ ان اقدامات سے ہوسکتا ہے، جو انھوں نے قاضی موسےٰ کی شہادت پر شروع کیے۔ لیکن ان کی

ؔ تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ شیخ یعقوبؒ اثنائے سفر میں شاہ طہماسپ کے ایّامِ حکومت میں ایران پہنچے تھے۔ غالباً یہ وہ زمانہ تھا جب ہمایوں بھی وہاں مقیم تھا۔ شاید ان ایّام میں ہمایوں سے روابط قائم ہوئے ہوں۔

مثالیں اس سے پہلے بھی ملتی ہیں۔ ڈاکٹر ظہورالدین احمد اپنی کتاب پاکستان میں فارسی ادب (جلد اوّل) میں لکھتے ہیں کہ شیخ یعقوب صرفی کا سرینگر میں ایک اُستاد تھے۔ اخوند ملا بصیر۔ بڑے بڑے صاحب عظمت بزرگ ان کے حلقۂ تلمذ میں شریک تھے۔ مثلاً شیخ داؤد خاکی۔ لوگوں نے مشہور کیا کہ ملا بصیر بھی مائل بہ تشیع ہیں تو شیخ صرفی ان کے مدرسے سے اُٹھ آئے۔

حضرت مجدّدؒ کا شیعیت کی نسبت ایک خاص نقطۂ نظر تھا۔ اور ان کی ابتدائی تصانیف میں ایک رسالہ تھا ردِّ روافض۔ کیا اس نقطۂ نظر کے پیدا کرنے یا اسے تقویت دینے میں ان کے مُرشد اور اُستاد شیخ یعقوب صرفی کا اثر بھی کارفرما تھا؟

شیخ یعقوب کی ہستی جامع صفات تھی۔ وہ عالم اور شیخ ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھے۔ خمسہ کا جواب لکھا۔ پاکستان میں فارسی ادب میں ان کا تذکرہ ساٹھ صفحوں پر محیط ہے۔ بدایونی نے ان کے متعلق جو طویل اندراج دیا ہے' اس سے پتا چلتا ہے کہ ان کے فیضی سے بڑے مراسم تھے۔ اس کی علمی اور ادبی صحبتوں میں وہ اکثر شریک ہوتے۔ ان کی لکھی ہوئی "تفسیرِ فیضی" کی تکمیل کی تاریخ اکثر مورخین نے نقل کی ہے۔ حضرت مجدّدؒ کی بھی فیضی اور ابوالفضل کے ہاں کافی آمد و رفت تھی۔ اور ان کے تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ انھوں نے تفسیرِ بے نقط کی تکمیل میں فیضی کا ہاتھ بٹایا۔ کیا فیضی (اور ابوالفضل) سے ان تعلقات کی استواری میں ان کے اُستاد کو بھی دخل تھا؟

شیعہ سُنّی مسئلے پر شیخ یعقوب اور حضرت مجدد کے اشتراکِ احساسات اور فیضی سے دونوں کے قریبی تعلقات کی بنا پر بعض سوالات ان کے سوانح نگار کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں، لیکن ان کا یقینی جواب نہیں دیا جا سکتا ہے۔ اتنا یقینی ہے کہ حضرت مجدد اپنی تمام عمر میں تین بزرگوں کے حلقۂ بیعت میں داخل ہوئے۔ ایک ان کے والد بزرگوار تھے۔ دوسرے حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہٗ۔ تیسرے شیخ یعقوب صرفی کشمیریؒ۔ مؤخر الذکر کا بھی ان کی علمی اور رُوحانی زندگی میں ایک اہم مقام ہے۔

جب حضرت مجدّد علوم عقلیہ ونقلیہ سے استفادہ کر چکے تو آپ نے سرہند[1] میں درسِ علوم کا سلسلہ شروع کیا اور مدت تک طالبانِ علوم کو فیوض و برکات سے بہرہ ور کرتے رہے۔ اس کے بعد آپ (بیس سال کی عمر میں؟) اکبر آباد تشریف لے گئے اور ایک مدت تک وہاں قیام کیا۔

قیامِ اکبر آباد

سوانح نگار لکھتے ہیں کہ قیامِ اکبر آباد کے دوران میں آپ کو ابوالفضل اور فیضی سے کئی بار ملنے کا موقع ہوا اور بعض اختلافات کے باوجود دونوں بھائی آپ کے علم و فضل کے بڑے معترف ہو گئے۔ آپ کے مشہور خلیفہ خواجہ محمد ہاشم کشمی نے زبدۃ المقامات میں لکھا ہے :- (ترجمہ)

چونکہ ابوالفضل اہلِ علم کی قدر کرتا تھا اور اہلِ علم کو بھی بعض مجبوریوں کی بنا پر اس سے ملنا پڑتا تھا۔ اس لیے حضرت مجدّد کئی بار اس کی مجلس میں آئے۔ اور چونکہ وہ بھی آپ کی متعدد خوبیوں سے واقف تھا اس لیے وہ آپ کا خاص پاس کرتا۔ چنانچہ اس کے ایک شاگرد نے راقم الحروف سے بیان کیا کہ ایک دفعہ ابوالفضل کسی دوست کو چند باتیں لکھ رہا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے ایک واقعہ درج کیا' جو اس نے حضرت شیخ (مجدّد) سے سُنا تھا اور اس ضمن میں حضرت کی بڑی تعریف لکھی۔

ابوالفضل کا ایک اور مصاحب مجھ سے کہتا تھا کہ ایک دفعہ تمہارے مرشد ابوالفضل کی مجلس میں حاضر تھے۔ اس وقت ابوالفضل نے فلسفیوں اور ان کے علوم کی تعریف شروع کی اور اس میں اس طرح مبالغہ کیا کہ علمائے اسلام کی توہین مفہوم ہوتی تھی حضرت شیخ سلمہ اللہ تعالیٰ سے نہ رہا گیا اور انھوں نے فرمایا کہ امام غزالی قدس سرہٗ نے رسالہ شریف

---

[1] حضرات القدس میں لکھا ہے "تحصیل علوم سے فارغ ہونے کے بعد اپنے والد ماجد کے حضور میں درس علوم میں مشغول ہوئے"۔ زبدۃ المقامات میں "والد ماجد کے حضور" کا ذکر نہیں "چوں حضرت ایشاں از استفادہ علوم معقول و منقول و فروع و اصول فارغ شدہ اند۔ رخت بمسند افادہ کشیدہ اند۔ و مدتہا طلبۂ علوم را از برکاتِ خویش بہرہ ور گردانیدہ"۔ ممکن ہے اکبر آباد میں بھی یہ سلسلہ قائم رہا ہو۔

منقذ عن الضلال میں لکھا ہے کہ جن علوم کی ایجاد کا فلسفی دعویٰ کرتے ہیں ان میں سے جو کام کے ہیں، مثلاً ہیئت۔ نجوم۔ ہیئت۔ طب۔ وہ انھوں نے قدیم انبیا کی کتابوں اور ان کے کلام سے چرائے ہیں۔ اور جو ان کی اپنی ایجاد ہیں مثلاً ریاضی وغیرہ۔ وہ کسی دینی کام کے نہیں۔ ابوالفضل یہ سن کر جوش میں آگیا اور کہنے لگا کہ غزالی نے نامعقول بات کہی ہے۔ حضرت شیخ نے اس بات سے بڑا بُرا مانا۔ فوراً ابوالفضل کی مجلس سے اُٹھے اور فرمایا کہ اگر اہلِ علم کی صحبت کا شوق ہے تو اس طرح بے ادبی کے الفاظ زبان سے نہیں نکالنے چاہئیں۔

یہ کہہ کر وہ مجلس سے باہر چلے گئے اور پھر کئی روز تک ابوالفضل کے پاس نہ گئے۔ حتیٰ کہ اس نے آدمی بھیج کر معذرت چاہی اور انھیں بُلا بھیجا۔

ایک روز حضرت (مجددؒ) ابوالفضل کے بھائی ابوالفیض [فیضی][1] کے مکان پر گئے وہ تفسیر غیر معجمہ کے لکھنے میں مشغول تھا۔ جب آپ کو دیکھا تو بڑا خوش ہوا اور کہا کہ آپ اچھے وقت آئے۔ اس وقت میں تفسیر کے لیے ایک ایسی بات لکھنا چاہتا ہوں جس کے لیے غیر منقوط الفاظ نہیں ملتے۔ بہت دماغ سوزی کی لیکن خاطر خواہ عبارت نہیں لکھ سکا۔ آپ نے اسی وقت، باوجودیکہ آپ کو غیر منقوط عبارت لکھنے کا محاورہ نہ تھا، اس مقام کی تفسیر اس طرح فصاحت و بلاغت سے لکھ دی کہ فیضی حیران رہ گیا۔[2]"

حضرات القدس میں بھی جو حضرت مجددؒ کی دوسری قریب العہد سوانح عمری ہے، آپ کے خلیفہ اور شاگرد مولانا بدرالدین سرہندی نے لکھا ہے کہ آپ نے تفسیر غیر منقوط کی تحریر میں (فیضی کو) بڑی مدد دی تھی۔ اور تفسیر کا ایک حصّہ لکھ کر دیا تھا۔ (ص۱۱)

تفسیر کے مقام تصنیف کے متعلق ہم آیندہ سطور میں اظہارِ خیال کریں گے۔

---

[1] ترجمہ از زبدۃ المقامات (نولکشور) ص ۱۳۱-۱۳۲ [2] اُردو ترجمہ میں ابوالفضل چھپا ہے، جو صحیح نہیں۔ شاید اصل میں ابوالفیض ہو۔ یا چونکہ اس سے پہلے ابوالفضل کا ذکر تھا، کسی نقل کرنے والے نے ابوالفضل لکھ دیا۔

لیکن اتنا یقینی ہے کہ آگرہ (یا فتح پور سیکری) میں حضرت مجددؒ کا ابوالفضل اور فیضی کے ہاں آنا جانا تھا۔ اور یہ وہی زمانہ تھا، جب وہ درس و تدریس اور افاضۂ طلبا میں مشغول تھے۔

عجب نہیں کہ ابوالفضل نے آئینِ اکبری کے آخر میں جن فضلائے عصر کا ذکر کیا ہے، ان میں شمارہ ۱۳۸ پر شیخ احمد آپ کا اسم گرامی ہو۔ اکبر نے اپنے دارالحکومت کو علمی اور ادبی سرگرمیوں کا ایک بڑا مرکز بنا دیا تھا۔ فیضی اور ابوالفضل دونوں بڑے عالم اور صاحب طرز ادیب تھے۔ اور ان کے ہاں اہلِ علم کا جمگھٹا رہتا تھا۔ یقین ہے کہ وہاں کتابوں کی، علم و حکمت کی باتیں ہوتی ہوں گی۔ کئی کتابیں، جو عام اہلِ مدرسہ کو میسر نہ تھیں۔ ان کا ذکر ہوتا ہوگا مصنفوں کے اندازِ بیان پر تبصرے ہوتے ہوں گے اور عبارت آرائی اور زورِ بیان کے طریقے سوچے جاتے ہوں گے۔ یہ صحیح ہے کہ اہلِ دین کے لیے ان محفلوں میں دماغی کوفت کا بڑا اسامان تھا۔ لیکن شاید یہ محض اتفاق نہیں کہ طبقۂ علما کے دو سب سے بڑے نثر نگار (حضرت مجدد اور شیخ عبدالحق محدث) اور خود بدایونی ان مجلسوں میں بیٹھنے والے تھے۔ ان تینوں (بلکہ ابوالفضل۔ فیضی کو ملا کر پانچوں) کا طرزِ تحریر جُدا گانہ ہے۔ اس میں ان کی اپنی اپنی شخصیت جھلکتی ہے۔ بدایونی کی نثر میں ایک موسیقی کے رسیا، خوش الحان قاری کی شعری دلآویزی ہے۔ حضرت مجدد کی شخصیت جامع صفات تھی۔ ان کے طرزِ تحریر میں قوسِ قزح کے سارے رنگ ہیں۔ کہیں زورِ خطابت ہے، کہیں متکلمانہ موشگافی اور کہیں علمی متانت۔ اور ان سب میں اعلیٰ درجے کی فصاحت و بلاغت ہے۔ شیخ عبدالحق حقی کے ہاں عالمانہ وقار کے ساتھ دلِی کی شستگی و نفاست ہے۔ علامی ابوالفضل کا طرزِ تحریر ہمیں زیادہ پسند نہیں۔ لیکن اُس کی عربیت، علم و فضل اور شکوہِ سلطانی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح فیضی کے ہاں زورِ کلام، جوش، علمیت اور شعروں کی فراوانی ہے۔ ان سب کا رنگ اپنا اپنا ہے۔ "ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است"۔ لیکن ان میں ایک چیز مشترک ہے اور وہ ہے اندازِ بیان کی اہمیت کا احساس۔ دوسرے علما (حتیٰ کہ شاہ ولی اللہ) بالعموم

اس بات پر قانع ہیں کہ ان کا مافی الضمیر موزوں الفاظ میں ادا ہو جائے۔ لیکن عہدِ اکبری کے اہلِ علم، بالخصوص جو لوگ فیضی۔ ابوالفضل کی مجلسوں میں آتے جاتے تھے، طرزِ ادا کی خوبیوں کا بھی خیال رکھتے تھے۔ اور عبارت کی نوک پلک سنوارنے پر بھی توجہ دیتے تھے۔

قیامِ اکبرآباد میں حضرت مجدّد کو اپنی معلومات بڑھانے، علمی اور فکری مسائل پر مختلف نقطہ نظر جاننے اور اندازِ بیان کی پختگی کا موقع ملا ہوگا۔ لیکن آپ کا زاویہ نگاہ فیضی۔ ابوالفضل سے بالکل مختلف تھا۔ اس کا اندازہ آپ کے رسالہ اثبات النبوت سے ہوتا ہے۔ جس کی ضرورت، ممکن ہے، آپ نے ابوالفضل سے اس زبانی بحث کے بعد محسوس کی ہو۔ جس کا ذکر زبدۃ المقامات میں ہے۔ اور جس میں غزالی کی منقذ من الضلال کے طویل اندراجات ہیں۔

رسالہ اثبات النبوۃ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مجددؒ کی موجودہ تصانیف میں سب سے قدیم اثبات النبوۃ ہے۔ اس کے ابھی تک نامکمل نسخے ہی ملے ہیں، جنھیں پہلے ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب نے اُردو ترجمہ کے ساتھ اور اب مولوی محبوب الٰہی صاحب نے رسائل مجددیہ میں شامل کرکے شائع کر دیا ہے۔

رسالہ اثبات النبوۃ جس کا بعض نسخوں میں تحقیق النبوۃ نام لکھا ہے۔ چھوٹے سائز کا چوالیس ۴۴ صفحے کا رسالہ ہے۔ اس میں تمہیدی عبارت کے بعد دو بحثیں ہیں۔ ایک نبوۃ کے معنی کی تحقیق میں۔ دوسری معجزہ کے بارے میں۔ اس کے بعد ایک طویل مقالہ ہے، جس کا "پہلا مسلک بعثت اور نبوّت کی حقیقت" اور اس کی ضرورت کے بیان میں اور دوسرا مسلک خاتم الانبیاؐ کی نبوت کے اثبات میں ہے۔

دوسرا مقالہ "فلاسفہ کی مذمت میں اور ان کے علوم کی ممارست اور ان کی کتابوں کے مطالعہ سے جو ضرر ہوتا ہے، اس کے بیان میں ہے"۔ لیکن ابھی تک جو تین قلمی نسخے ملے ہیں، ان میں سے کسی میں بھی یہ مقالہ موجود نہیں۔ پتا نہیں،

اس کا کیا سبب ہے۔ ممکن ہے کسی وجہ سے یہ رسالہ مکمل نہ ہو سکا ہو۔ یا شاید موجودہ نسخے کسی ابتدائی، غیر مکمل نسخے کی نقلیں ہوں۔

اثبات النبوت کے ابتدائی صفحات تمہیدی ہیں، جن میں اختصار اور جامعیت کے ساتھ عہدِ اکبری کی مذہبی بدعنوانیوں کا ذکر ہے۔ اس اندراج سے بدایونی کے بیانات کی تائید ہوتی ہے، لیکن رسالہ کو بغور پڑھیں تو اس عظیم بُعد و تفاوت کا اندازہ بھی ہوتا ہے، جو حضرت مجددؒ اور بدایونی کی اخلاقی اور ذہنی سطح میں تھا۔

اثبات النبوت ایک اہم مسئلے کا ایک نہایت بلند پایہ تجزیہ ہے۔ اس کا موضوع بحث و مناظرے کا ہے، لیکن اس میں ایک لفظ ایسا نہیں، جو نہایت اونچے درجے کی علمی ثقاہت و متانت کے خلاف ہو۔ یا جس سے مخالفین کے ساتھ خوش اخلاقی میں ذرہ بھر کمی محسوس ہو۔ ان کا نقطۂ نظر بڑی احتیاط اور بڑے انصاف سے پیش کیا گیا ہے۔ اگرچہ نفسِ مضمون ایسا تھا، جس کے متعلق مصنّف کے احساسات شدید تھے، لیکن انھوں نے کہیں اپنے جذبات کو غالب آنے نہیں دیا اور نہایت بلند علمی اور فکری سطح برقرار رکھی ہے۔

رسالے کی تصنیف کے محرکات مقامی اور معاصرانہ تھے، لیکن تمہیدی عبارت کے سوا اس میں فقط انھی امور سے بحث ہے، جو اصولی اور دوامی ہیں۔ اور اگرچہ یہ رسالہ (غالباً) ابوالفضل سے ایک بحث سے متاثر ہو کر لکھا گیا۔ لیکن فی الحقیقت اس میں ایک ایسے سوال (کیا انسانی راہنمائی کے لیے عقل کافی ہے یا نبوت کی بھی ضرورت ہے؟) کا عالمانہ، بلکہ محققانہ جواب ہے، جو صرف اہلِ اسلام کے لیے ہی نہیں، بلکہ دوسرے مذاہب والوں کے لیے بھی اہمیت رکھتا ہے۔

تمہیدی عبارت کے بعد آپ فرماتے ہیں:۔ (ترجمہ)

"میں نے بعض لوگوں سے مناظرہ کیا۔ جنھوں نے علمِ فلسفہ پڑھا تھا اور کافروں کی کتابوں سے بہرہ یاب ہو کر فضل و فضیلت کے مدعی ہو گئے تھے اور لوگوں کو گمراہ کیا۔ اور اصل نبوت کے تحقق اور ایک خاص شخص کے لیے اس کے ثبوت میں خود بھی گمراہ ہوئے

اور یہاں تک کہنے لگے کہ نبوت کا حاصل حکمت اور مصلحت ہے۔ خلق کے ظاہری حالات کی اصلاح ہے اور عوام کو شہوات میں آزادروی، باہمی نزاع اور اختلاف سے محفوظ رکھنا ہے۔ اور اس کا نجاتِ اُخرویہ سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ اس کا تعلق صرف تہذیبِ اخلاق اور قلبی اعمال کے ان فضائل کی تحصیل سے ہے جنھیں حکماء نے اپنی کتابوں میں بیان کیا ہے۔"

مخالفین کے نقطۂ نظر کی توضیح اور ان کے بعض اعتراضات کا جواب دے کر آپ لکھتے ہیں "میرے دل میں یہ بات بیٹھ گئی۔ اور میرے سینے میں جم گئی کہ میں ان کے لیے ایسی تقریر کروں، جو ان کے شکوک دُور کر دے۔ اور ان کے لیے ایسی بات لکھوں، جو ان کے شبہ کو زائل کر دے۔"

اثبات النبوت اسی ارادے کی تکمیل ہے۔ یہ تمام کا تمام رسالہ مطالعہ اور غور و خوض کا مستحق ہے، لیکن اس کے متعلق چند باتیں خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔ ایک تو بلند علمی معیار، جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ دوسری قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ چونکہ اس رسالے کا مقصد عقل کے دعویداروں کے شبہات و شکوک رفع کرنا تھا اس لیے اپنے نقطۂ نظر (یعنی نبوت کی ضرورت اور عقل کی واماندگی) کو مضبوط عقلی دلائل کی مدد سے واضح کیا ہے۔ اور مخالفین کے اعتراضات کو سلسلہ وار گنا کر ان کا نہایت خوش اسلوبی اور وضاحت سے جواب دیا ہے۔ رسالہ کی تیسری خصوصیت اس کا فصیح و بلیغ اندازِ بیان ہے، جو حضرت مجددؒ کی تمام تحریروں کا زیور ہے اور جس نے انھیں مذہبی مسائل پر اسلامی ہندوستان کا سب سے قادرالکلام اہلِ قلم بنا دیا تھا۔

ابتدائی حالات کے متعلق دشواریاں

حضرت مجدد الف ثانیؒ کے احوالِ زندگی کے کئی معاصرانہ مآخذ ہیں، لیکن ابتدائی حالات کے متعلق کئی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ آپ کے حالات و تعلیمات کا مستند مخزن تو آپ کے اپنے مکتوبات ہیں، لیکن وہ اس زمانے سے شروع ہوتے ہیں، جب آپ حضرت خواجہ باقی باللہ کی صحبت میں پہنچے۔ ابتدائی چھتیس ۳۶ سالوں کے لیے

ہمیں زبدۃ المقامات اور حضرات القدس پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ یہ دونوں تذکرے بے حد کار آمد ہیں۔ لیکن شاید وہ بھی الحاقی عبارتوں سے پوری طرح محفوظ نہیں رہے[1] اس کے علاوہ آغاز ارشاد سے پہلے کے واقعات کے متعلق ان تذکروں میں' جو ان واقعات کے وقوع کے کافی بعد لکھے گئے' سہو کا امکان رہتا ہے۔

اس سہو کی ایک نمایاں مثال حضرت مجدد کے ابتدائی رسائل کے زمانِ تالیف کے متعلق نظر آتی ہے۔ حضرات القدس کے (اردو ترجمہ) کی متعلقہ عبارت ہے۔ "اثنائے تحصیل علوم ظاہر میں آپ نے عربی و فارسی میں متعدد رسالے نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ تحریر فرمائے۔ چنانچہ رسالہ تہلیلیہ اور رسالہ اثبات نبوت اور رسالہ ردِ شیعہ انھی رسائل میں سے ہیں۔" حضرات القدس کا یہ اندراج کہ رسائل مذکورہ بالا "اثنائے تحصیل علوم ظاہر میں" (جس سے آپ سترہ سال کی عمر میں ... فارغ ہو گئے"۔ حضرات القدس) یقیناً صحیح نہیں۔ زبدۃ المقامات میں صرف دو رسائل کے نام لیے گئے ہیں (رسالہ تہلیلیہ اور رسالہ ردِ شیعہ) اور ان کا ذکر درس و تدریس کے دور میں' بلکہ اس کے بعد کیا گیا ہے۔ یہ بیان زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ خوش قسمتی سے حال ہی میں اثبات النبوت اور رسالہ تہلیلیہ شائع ہو گئے ہیں۔ (تیسرا رسالہ ان سے پہلے مکتوبات کے ساتھ نولکشور پریس والوں نے شائع کر دیا تھا)۔ اور اب حضرات القدس وغیرہ کے بیان کی صحت کا بہتر اندازہ ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں صاحب نے نشان دہی کی ہے۔ رسالہ تہلیلیہ میں حضرت مجدد کے والد ماجد کے ساتھ قدس سرہ لکھا ہے۔ اس لیے اس کی تصنیف مخدوم صاحب کے سالِ وفات (۱۰۰۷ ہجری) کے بعد ہوئی ہو گی۔ اس میں اثبات النبوت کی تائید میں ایک رسالہ کا

---

[1] زبدۃ المقامات بوجوہ' حضرت مجدد کا بہترین تذکرہ ہے' لیکن اس میں بھی ایک دو الجھنیں ہیں' مثلاً اس کی تاریخ تکمیل ۱۰۳۷ھ ہے' لیکن ایک جگہ شاہ محمد یحییٰ صاحب (ولادت ۱۰۲۷ھ) کے متعلق لکھا ہے۔ "امروز کہ سالِ عمر آں برخوردار بہ پانزدہ رسیدہ"۔

ذکر ہے۔ اس لیے وہ رسالہ تہلیلیہ سے پہلے کا ہوگا۔ اثبات النبوت کے مقدمہ میں ڈاکٹر صاحب نے اس رسالے کی تصنیف "۹۹۰ھ کے قریب" قرار دی ہے۔ اور زبدۃ المقامات کے اندراج کی بنا پر اس سال کے متعلق فٹ نوٹ دیا ہے کہ "اسی عمر میں ردّ شیعہ وغیرہ رسائل بھی لکھ چکے تھے"۔ محترمی ڈاکٹر صاحب نے ایک اور جگہ اثبات النبوت کے ۹۹۸ھ کی تصنیف ہونے کا امکان بھی ظاہر کیا ہے۔ دونوں بیانات قیاسی ہیں۔ اور رسالہ اثبات النبوت کے سالِ تصنیف کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ (سوائے اس کے کہ اس کی تصنیف رسالہ تہلیلیہ سے پہلے ہوئی تھی۔ اور غالباً حضرت مجدد کی سب سے پہلی تصنیف یہی رسالہ تھا)۔

رسالہ ردِّ روافض بھی ابتدائی تصانیف میں سے ہے، لیکن اس میں اس خط کا ذکر ہے، جو علمائے مشہد نے علمائے ماوراء النہر کو لکھا۔ اور جیسا کہ ڈاکٹر اطہر عباس رضوی نے وضاحت کی ہے۔ یہ خط شاہ عباس صفوی کے دوسرے سالِ جلوس یعنی ۹۹۷ھ - ۱۵۸۸ء میں لکھا گیا۔ اس لیے حضرت مجدد کا رسالہ بھی اس کے بعد کا ہوگا۔

مندرجہ بالا مثالوں سے ظاہر ہے کہ اگرچہ حضرات القدس اور زبدۃ المقامات کی تاریخی اہمیت بہت ہے۔ ان کے مصنفین کو تلاشِ واقعات کی بڑی سہولتیں حاصل تھیں اور ان کے بیانات کی عمومی صحت پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ لیکن ابتدائی حالات کی جزئیات کے متعلق ان کے لفظ لفظ کا پابند ہونا یا اسے متعلقہ واقعات کا مکمل بیان سمجھنا خطرے سے خالی نہیں۔

اسی طرح کی الجھنیں حضرت مجدد کے سفروں کے متعلق ہیں۔ زبدۃ المقامات میں آپ کے آگرہ جانے کا تو ذکر نہیں، لیکن ابوالفضل کی مجلس میں آنے جانے اور اس سے مقامِ نبوت پر ایک بحث اور مخدوم صاحب کے آگرے آ کر آپ کو سرہند لیجانے کی تفصیلات درج ہیں۔ زبدۃ المقامات کا بیان آگرے کے متعلق ہے۔ لیکن ابوالفضل تو غالباً ان دنوں فتح پور سیکری میں تھا۔ یہ دونوں مقامات ایک دوسرے سے بہت دور نہیں۔ اس لیے عمومی طور پر آگرے کا نام لیا گیا۔ لیکن زیادہ الجھن

موارد الفیض فیضی کی تفسیر کے متعلق ہے۔ زبدۃ المقامات اور حضرات القدس دونوں میں حضرت مجدد کی شرکت کا ذکر ہے۔ یہ تفسیر ۱۰۰۲ھ میں لاہور میں ختم ہوئی۔ اکبر اور اس کے ساتھ فیضی وغیرہ ۹۹۴ھ سے لاہور میں تھے۔ ان حالات میں فیضی کی تفسیر کے متعلق حضرات القدس اور زبدۃ المقامات کے اندراجات قبول کرنے میں بعض الجنیں ہیں کیا کرغلام مصطفےٰ خاں صاحب کا ارشاد ہے۔ "حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ ... قریب ۲۰ - ۲۲ سال کی عمر میں آگرہ تشریف لے گئے تھے۔ وہیں فیضی اپنی بے نقط تفسیر سواطع الالہام کی تیاری میں مصروف تھا۔ اس لیے حضرت علیہ الرحمۃ نے برجستہ ایک بے نقط عبارت مرحمت فرمائی تھی۔ وہ تفسیر نظر ثانی کے بعد (بدایونی ص ۳۸۹) ۱۰۰۲ھ میں مکمل ہوئی"۔ تفسیر غیر منقوط کا آگرے میں شروع ہونا ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ شاید زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ اگرچہ حضرت مجددؒ آگرہ سے تشریف لے آئے، جس کے بعد ان کی شادی ہوگئی۔ اور وہ کافی دیر سرہند مقیم رہے۔ لیکن اس کے بعد وہ کچھ عرصے کے لیے لاہور تشریف لے گئے۔ جہاں انھوں نے (علمائے مشہد کے ۹۹۷ھ-۱۵۸۸ء والے خط کے ہندوستان پہنچنے اور یہاں اس کے مضامین عام ہونے کے بعد) "مجالس امرا و سلاطین" میں شیعہ اہلِ علم سے بحث و مباحثہ کیا۔ فیضی کو تفسیر غیر منقوط میں مدد دی اور رسالہ ردِّ روافض تحریر کیا۔

یہ صحیح ہے کہ معاصرانہ تذکرہ نگار اس سفرِ لاہور کا ذکر نہیں کرتے، لیکن ان سے آپ کے تمام سفروں کا ذکر متوقع نہیں۔ مثلاً حضرت مجدد نے ایک مکتوب (دفترِ اوّل شمارہ ۲۱۲) میں پرگنہ بنارس کے سفر کا ذکر کیا ہے، لیکن اس کے بارے میں تذکرہ نگار بالکل خاموش ہیں۔ اسی طرح تذکروں میں حضرت باقی باللہ کی وفات کے بعد کسی وقت حضرت مجدد کے سفرِ لاہور کا ذکر ہماری نظر سے نہیں گزرا بلکہ سوائے واقعہ گوالیار اور لشکر کی نظربندی کے، سرہند میں ہی قیام کی صراحت ہے، لیکن خواجہ خردؒ کی رباعیات و شرح رباعیات سے پتا چلتا ہے کہ وہ حضرت مجددؒ کی خدمت میں تین مرتبہ بمقام سرہند اور ایک مرتبہ لاہور حاضر ہوئے۔ چونکہ خواجہ خردؒ اپنے والد کی وفات کے وقت دو سال کے تھے،

اس لیے ظاہر ہے کہ لاہور کا سفر اس کے بہت بعد ہوا ہوگا اور وہاں حضرت مجدد کا قیام خاصہ طویل ہوگا کہ خواجہ خورد نے نزدیکی مقام سرہند میں ان کا انتظار کرنے کی بجائے لاہور حاضری دی۔

اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ تذکرہ نگاروں نے عمومی طور پر اکبر آباد سے دارالحکومت مراد لیا ہو۔ نہ ہی فتح پور سیکری کی وضاحت کی اور نہ ہی یہ خیال کیا کہ اکبر اور اس کے امراء ۹۹۴ھ سے ۱۰۰۶ھ تک لاہور میں مقیم تھے۔

اگر ۱۰۰۶ھ میں یا اس کے جلد بعد کچھ عرصے کے لیے حضرت مجدد کا سفر لاہور تسلیم کر لیا جائے تو نہ صرف تفسیر بے نقط کے متعلق زبدۃ المقامات اور حضرات القدس کے اندراجات بلکہ رسالہ ردِ روافض کی بعض الجھنیں دور ہو جاتی ہیں۔ لیکن بہرحال یہ معاملہ قیاسی ہے۔۔۔۔۔۔۔ ممکن ہے۔ نئی شہادت یا مزید غور و خوض کی روشنی میں صورتِ حالات زیادہ صحت کے ساتھ واضح ہو جائے۔

شادی خانہ آبادی

زبدۃ المقامات میں اس امر کی وضاحت ہے کہ جب حضرت مجدد کو اکبر آباد رہتے ایک مدت گزر گئی تو ان کے والد ماجد فرطِ محبت سے مجبور ہو کر بُعدِ مسافت اور کبر سنی کے باوجود ان کے پاس پہنچے۔ اور حضرت مجدد نے وطن کو مراجعت فرمائی۔ اور بعد میں والد ماجد کی خدمت میں رہے۔

واپسی کے سفر کے متعلق مولٰنا احسان اللہ گورکھپوری سوانح عمری حضرت مجدد الف ثانی سرہندی میں لکھتے ہیں:-

> حضرت مجدد عرصے تک اکبر آباد میں رہے۔ آپ کے والد مخدوم عبدالاحد آئے اور اپنے ساتھ سرہند واپس لے گئے۔ واپسی پر شیخ سلطان ایک مقرب شاہ ہند کی لڑکی سے حضرت مجدد کا عقد ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اس عقد کی بابت حضرت محمد صلعم سے شیخ سلطان کو خواب میں علم ہوا تھا۔ اس عقد سے حضرت مجدد کی مالی حالت بہت درست ہوئی اور ایک نئی حویلی حضرت مجدد نے اپنے لیے سرہند میں بنوائی۔
> (ص ۷)

مولانا احسان اللہ کا بیان روضۃ القیومیہ پر مبنی معلوم ہوتا ہے جو بیانِ واقعات میں محتاط نہیں۔ لیکن چونکہ مصنف خاندانِ مجددیہ سے تھا' اس لیے اس کی کتاب خاندانی روایات کا ایک کارآمد ذخیرہ ہے۔ وہ اس شادی کا ذکر کر کے لکھتا ہے۔" اس شادی کے بعد حضرت قیوم اول (حضرت مجدد الف ثانی) کے پاس ظاہری مال و دولت بکثرت ہوگیا۔ اپنے والد بزرگوار کی حویلی چھوڑ کر ایک نئی حویلی بنوائی۔ جہاں پر آج کل آنجناب کا روضۂ مبارک اور آنجناب کی اولاد کا محلہ ہے۔ حویلی کے قریب ہی ایک مسجد بنوائی"۔ آپ کے دوسرے بھائی پرانی حویلی میں رہتے رہے اس لیے ان کی اولاد کا لقب پرانی حویلی والے پڑ گیا۔ (صر ۶۸ - ۶۹)

حضرت مجدد کی زندگی میں اس شادی کی بڑی اہمیت ہے۔ ایک تو آپ کی اہلیہ محترمہ کے درجۂ عالی کی بنا پر' دوسرے ان کے والد شیخ سلطان کی وجہ سے' جو ایک ممتاز عالم' ادیب' اور حاکم علاقہ تھے۔ اکبر سے قریب رہنے کے باوجود اس کی مذہبی پالسی کے سخت مخالف تھے۔ اور قرینِ قیاس نہیں کہ ان کے خیالات اور واقعاتِ زندگی کا ذہین اور قابل داماد پر کوئی اثر نہ ہوا ہو۔

حضرت مجدد کی شادی کی تاریخ نہیں ملتی۔ لیکن آپ کے بڑے صاحبزادے شیخ محمد صادق کی' جو چوبیس' پچیس برس کی عمر میں وفات پا گئے' تاریخ ولادت ۱۰۰۰ھ ہے۔ ان سے پہلے کسی اولاد کا ذکر نہیں ملتا۔ قرینِ قیاس ہے کہ شادی اور اکبر آباد سے واپسی کا زمانہ دسویں صدی ہجری کے آخری سال ۹۹۹ھ سے بہت پہلے نہ ہوگا۔

حاجی سلطان تھانیسری

روضۃ القیومیہ میں شیخ سلطان کے متعلق عجیب گل افشانیاں ہوئی ہیں۔ ان کے حالاتِ زندگی کو الف لیلہ کے قصے بنا دیا گیا ہے حالانکہ ان بیانات کے پس پشت حقیقت کا ایک عنصر موجود ہے' جو خود داستاں دلچسپ ہے کہ اگر تاریخی کتب سے ہی صحیح حالات کو جمع کر دیا جائے تو ایک غیر معمولی شخصیت کا عبرتناک مرقع تیار ہوتا ہے۔

روضۃ القیومیہ میں لکھا ہے کہ شیخ سلطان کو اکبر کے ہاں بڑا قرب و اقتدار حاصل تھا

بادشاہ نے ان سے کہا ۔ ہم ہمارے لیے قرآن لکھو ۔ انھوں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ اور پوچھنے پر کہا کہ آسمان سے جبریئل تمھارے لیے قرآن شریف لائے تو میں بھی لکھوں بادشاہ نے شرمندہ ہو کر انھیں اپنے ہاں سے دُور کرنے کا فیصلہ کیا ۔ اور لاہور اور دہلی کے درمیانی علاقے کی حکومت ان کے سپرد کی ۔ وہ وہاں پہنچے تو سرکاری لگان علما و فقرا میں تقسیم کرنا شروع کیا ۔ بارہ برس تک یہی کیا ۔ بادشاہ کو ایک پیسا نہ بھیجا ۔ جب وہ کسی تقریب سے ادھر سے گزرا اور بارہ سالہ خراج کی نسبت پوچھا تو شیخ صاحب نے کہا ۔ تو مُرتد ہو گیا ہے ۔ اور مُرتد کا مال اُڑا نا جائز ہے ۔ اس لیے مَیں نے اسے فقرا و مساکین میں تقسیم کر دیا ۔" یہ کہہ کر بغل سے ایک پتھر نکال کر بادشاہ کے چہرہ پہ ایسا تاک کر مارا کہ پیشانی سے خون بہنے لگا ۔ شیخ صاحب کو سُولی چڑھایا گیا۔" (ص ۳۶)

حقیقتِ حال یہ ہے کہ شیخ سلطان جو تھانیسر کے رہنے والے تھے اور کتبِ تاریخ میں حاجی سلطان تھانیسری کے نام سے معروف ہیں ۔ ایک عالم فاضل بزرگ تھے ۔ ("علوم نقلیہ را خوب ورزیدہ") حج و زیارت سے مشرف ہوئے ۔ مقاربتِ شاہی میں رہے ۔ چار سال تک مہابھارت کے ترجمے پر' جو رزم نامہ کے نام سے تیار ہُوا' مامور رہے ۔ ابوالفضل اور بدایونی کے ہاں ان کی آمد و رفت تھی ۔ اور بدایونی کے وہ دلی خیر خواہ تھے ۔ چنانچہ جب بدایونی مخدوم الملک سے' ان کے زمانۂ اقتدار میں ملنے گیا تو ابوالفضل اور شیخ سلطان اس کے ساتھ تھے ۔ بدایونی کی مخدوم سے روضۃ الاحباب کے متعلق ناخوشگوار بحث شروع ہو گئی تو وہ اشاروں سے بدایونی کو منع کرتے رہے کہ احتیاط کرے اور سمجھ سے کام لے ۔ یہ ابتدائی ایام کا واقعہ ہے ۔ جب ابوالفضل دربار میں پہنچ گیا تھا لیکن اسے کوئی منصب نہ ملا تھا ۔

شیخ سلطان سے بادشاہ کی ناچاقی اس وقت شروع ہوئی جب تھانیسر کے ہندوؤں نے ان کے خلاف گاؤ کشی کی شکایت کی ۔ انھیں بھکر جلاوطن کر دیا گیا ۔ اتفاقاً خانخاناں اس علاقے کی حکومت پہ مامور ہُوا ۔ وہ اہلِ علم کا ہوا خواہ تھا ۔ شیخ سلطان سے

بڑے التفات سے پیش آیا۔ ان کے زخموں پر مرہم رکھا اور فتح سندھ کے بعد انھیں اپنے ساتھ واپس لایا۔ شیخ مخفی طور پر اپنے وطن چلے گئے۔ لیکن خانخاناں نے دکن سے ان کی سفارش کی۔ اور جلاوطنی کے حکم کی تنسیخ کی درخواست کی۔ یہ سفارش منظور ہوئی۔ شیخ سلطان کا کام بن گیا۔ بادشاہ نے، غائبانہ حکم دیا کہ انھیں تھانیسر و کرنال کا کروڑی بنا دیا جائے۔ چنانچہ جب بدایونی نے اپنی تاریخ لکھی (جس سے یہ حالات ماخوذ ہیں)۔ اس وقت وہ اس خدمت پر مامور تھے۔

شیخ سلطان کا عتاب شاہی کے بعد تھانیسر کا کروڑی ہو جانا حیرت انگیز تھا۔ [بدایونی نے بھی ایک عربی شعر درج کر کے (کسی قدر رشک کے ساتھ) اس امر کا اظہار کیا ہے کہ لبسا اوقات' عنایت الٰہی سے اس طرح کام بن جاتے ہیں کہ عقل ان کے سمجھنے میں حیران رہتی ہے]۔ لیکن بالآخر یہی تقرر ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔ تھانیسر ہندوؤں کا ایک مقدس مقام اور ان کی احیائیت کا ایک گڑھ تھا۔ ان لوگوں سے شیخ کی پہلے بھی کشمکش ہو چکی تھی، جس کی وجہ سے وہ بھکر جلاوطن ہوئے۔ یہ کشمکش پھر تازہ ہوگئی۔ اور اس دفعہ ان کے دشمنوں کا وار بڑا کاری تھا۔

اکبر ۱۵۹۸ء کے آخر میں لاہور کے طویل قیام کے بعد جنوب کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں کوکبۂ شاہی تھانیسر میں مقیم ہوا تو لوگوں (مقامی ہندوؤں؟) نے شیخ کے ظلم و ستم اور خلقت آزاری کی شکایت کی اور بادشاہ کو اس کا قائل کر دیا۔ اکبر ان دنوں ان کروڑیوں کے ساتھ، جن کے خلاف شکایات ثابت ہوتی تھیں۔ خاص طور پر سختی کر رہا تھا[۱]۔ اس نے سزائے موت کا حکم دیا۔ چنانچہ یکم جنوری ۱۵۹۹ء کو شیخ سلطان کو پھانسی دی گئی۔

---

[۱] اس سے چند مہینے پہلے، جب اکبر کشمیر سے واپس آ رہا تھا تو الور اور تج (کنجاہ) کی رعایا نے محمد بیگ کروڑی کے ظلم و ستم کی فریاد کی۔ دریں اس ستم پیشہ کے گلے پر چھری پھروا دی تاکہ ظالم حاکم عبرت پکڑیں"۔ (خلاصۃ التواریخ صر ۴۲۶)

اس سلسلے میں اکبر نامہ میں حسب ذیل اندراج ہے :۔

دریں روز شیخ سلطان را از حلق کشیدند۔ در گروہ عمامہ داراں مے زیست۔ آرزوئے عمل گذاری اورا کالیوہ ساخت۔ تھانیسر (کہ بنگاہ او بود) بدو سپردند۔ از بدمستی دُنیا کہن ہا را تازہ بر ساخت۔ و بہ جاں گزائی نیکواں برخاست۔ چوں او خدا را بداں شہر گذار شد۔ و نخستے ستمگاری او خاطر نشین گشت۔ بسزائے کردار خود رسید۔"

(اکبر نامہ۔ جلد سوم ص ۴۸۶)

اقبال نامہ جہانگیری میں اس سانحہ کا ذکر بدیں الفاظ ہے :۔

چوں موکب اقبال بنواحی تھانیسر رسید۔ خلق انبوہ از بیدادِ سلطان کروڑی آنجا دادخواہ شدند۔ و بعد از تحقیق بظہور پیوست کہ دریں ملک تظلم و بیداد ازو بفعل آمد۔ حکم شد کہ ہماں جا از حلق برکشند۔ کہ عبرت دیگراں شود۔

(اقبال نامہ جہانگیری (نولکشور) جلد دوم ص ۲۵۹)

روضۃ القیومیہ میں لکھا ہے کہ شیخ سلطان محاصل شاہی کو فقرا و مساکین میں بانٹ دیتے تھے۔ ممکن ہے۔ اس میں صداقت کا کوئی عنصر ہو۔ شیخ صاحب کی سخاوت کا تذکرہ نگار بالصراحت ذکر کرتے ہیں۔ حضرات القدس میں انھیں "عالم و فاضل اور پرہیزگار و سخی بزرگ" (ص ۲۶) کہا گیا ہے لیکن ابوالفضل کے الفاظ "کہن کہن ہا را تازہ ساخت" کو بدایونی کے بیان کی روشنی میں دیکھیں تو خیال ہوتا ہے کہ یہ پُرانے گاؤکشی والے جھگڑے کا شاخسانہ تھا۔ شاید شیخ نے اپنے قدیمی دشمنوں کے خلاف کوئی قدم اُٹھایا ہو۔ جن کے طرفدار ہندوؤں نے موقع مل جانے پر، اکٹھے ہوکر، بادشاہ سے شکایت کی۔

واقعہ کی جزئیات پُوری طرح واضح نہیں، لیکن یہ تو ظاہر ہے کہ شیخ سلطان کا کربناک انجام ایسا نہ تھا کہ اس سے ان کے اقربا کو (جن میں ان کی صاحبزادی اور حضرت مجدد الف ثانی خود تھے) اکبر یا اس کی پالیسی یا ہنود سے شکایت نہ ہوتی اور حقیقت یہ ہے کہ اس سانحہ نے اکبر کے احکام اور ہندوؤں کے اثر کا مسئلہ ایک

ایسی بھیانک صورت میں پیش کر دیا جس کا پورا اندازہ دار الحکومت میں نہ ہو سکتا تھا۔
شیخ سلطان کا نقطۂ نظر دکھانے کے لیے ہم ان کے حالات کو ان کی وفات تک لے آئے ہیں، لیکن اس سے پہلے انھوں نے بڑی شان کی زندگی بسر کی تھی۔ وہ برسوں ایک اہم علاقے کے کروڑی رہے، جو اس زمانے میں بڑے رتبہ اور اقتدار کا عہدہ تھا۔ علمی اور ادبی حلقوں میں بھی ان کا اپنا مقام تھا۔ اہلِ دربار سے ان کے پرانے مراسم تھے۔ قرینِ قیاس ہے کہ ان سے قریبی تعلق قائم ہونے سے حضرت مجددؒ کا حلقۂ اثر بھی وسیع تر ہو گیا ہو گا۔

اس سے بھی اہم معاملہ نقطۂ نظر کا ہے۔ معاصرانہ مسائل پر حضرت مجددؒ کا جو زاویۂ نگاہ شروع سے تھا۔ وہ اثبات النبوت سے واضح ہے، لیکن اگر اس کا مقابلہ ردِّ روافض سے کریں تو اندازِ بیان میں ایک لطیف فرق نظر آتا ہے۔ اثبات النبوت کا طرزِ اظہار عالمانہ بلکہ محققانہ ہے۔ دوسرے رسالے میں بھی علمیت کی کمی نہیں۔ لیکن لہجے میں ایک نئی گرمی اور تیزی ہے۔ "رگِ فاروقیم" کی جو ترکیب پہلی مرتبہ اس رسالے میں استعمال ہوئی ہے، وہ اس کا مابہ الامتیاز ہے۔ اس رگِ فاروقیم سے، جیسا کہ ان کے واقعاتِ زندگی گواہ ہیں، شیخ سلطان کو بھی وافر حصہ ملا تھا۔ اور کیا یہ خیال بے جا ہے کہ ان کے ساتھ ربط و ضبط بڑھنے اور ان کے خیالات و احساسات جاننے سے حضرت مجدد کی شخصیت کے اس پہلو کو تقویت پہنچی؟

شیخ سلطان ایک سخی انسان تھے۔ اپنے پسماندگان کے لیے انھوں نے بہت کچھ نہ چھوڑا۔ (ممکن ہے، جائداد ضبط ہو گئی ہو۔ جیسا کہ معتوب کروڑیوں کے ساتھ اکثر ہوتا تھا)۔ حضرت مجدد کا ایک بالکل ابتدائی عربی خط ہے۔ خواجہ جہاں کے نام۔ اس میں غالباً شیخ کے بیٹوں کا ذکر ہے۔ "بقیہ مضمون یہ ہے کہ شیخ سلطان مرحوم کے دونوں بیٹوں کے لیے گزارہ و معیشت کی بہت تنگی و ناچاری ہے۔ اس واسطے آنجناب سے التماس ہے کہ ان کی ہر طرح مدد و اعانت کریں۔ کیونکہ آپ اس بات کے لائق ہیں۔" (دفتر اول۔ مکتوب ۲۵)۔

شیخ سلطان کے ایک بھائی تھے، شیخ زکریا۔ (حضرات القدس ص ۴۲۶) حضرت مجدد کے مکتوبات میں کسی شیخ زکریا کا بار بار ذکر ہے، جو کسی پرگنہ کے کروڑی تھے۔ ان کے حضرت مجدد پر بہت حقوق ہوں گے۔ کیونکہ ایک نہیں، تین مکتوبات ان کی سفارش اور حاجت براری کے لیے لکھے گئے۔ اور شیخ زکریا یہ توقع کرتے تھے کہ حضرت مجدد ان کی خاطر، بُعدِ مسافت کے باوجود، (شاہی) لشکر میں جا کر ان کی مخلصی کے لیے کوشش کریں۔ (دفترِ اوّل مکتوب ۱۲۷) کیا یہ شیخ زکریا، شیخ سلطان مرحوم کے بھائی نہ تھے؟

معلوم ہوتا ہے۔ شیخ زکریا کو عہدہ شیخ فرید کی سفارش سے ملا تھا۔ پہلے سفارشی خط میں انھیں لکھا ہے۔ "ہمچناں کہ ایشاں را نواختہ اند۔ تا آخر دستگیری فرمایند و از گرگانِ حوادث محفوظ دارند"۔ (دفترِ اوّل مکتوب ۱۳۳)۔ دوسرے خط میں شیخ فرید کو لکھا ہے کہ نئے دیوان پر بھی یہ ظاہر کر دیا جائے کہ شیخ زکریا آپ کے آدمی ہیں۔ "بہ دیوانِ جدید نیز ظاہر شود کہ ایشاں از خادمانِ آں درگاہِ عالی اند"۔ (دفترِ اوّل مکتوب ۵۳)

حاجی سلطان تھانیسری کے حالات کی نشان دہی میں بدایونی[1] سے بیش بہا مدد ملتی ہے لیکن اس سے دو ایک الجھنیں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ اس کے بیان سے خیال ہوتا ہے کہ خانخاناں نے "بعد فتح ولایت آسیر و برہان پور" حاجی صاحب کے متعلق ایک سفارشی عرضداشت بھیجی۔ اس سے عتابِ شاہی دُور ہوا۔ اور کچھ عرصہ بعد بادشاہ نے انھیں کروڑی مقرر کیا لیکن اکبری فوجیں ۲۵ رمضان ۱۰۰۸ھ کو برہان پور میں داخل ہوئیں اور اکبر نے قلعہ اسیر ۲۲ رجب ۱۰۰۹ھ میں اس وقت فتح کیا جب حاجی سلطان کو پھانسی دی جا چکی تھی[1]۔

---

[1] بدایونی کے بیان میں ایک الجھن یہ ہے کہ عام خیال کے مطابق اس نے ۱۰۰۴ھ تک کے واقعات لکھے ہیں۔ یہ اندازہ دوسری جلد کے متعلق جس میں سیاسی حالات اور اکبری احکام کا خلاصہ ہے، صحیح ہے۔ لیکن شاید تیسری جلد کا ایک حصہ بعد میں لکھا گیا۔ اور بہرکیف چونکہ بدایونی نے ۱۰۰۴ھ تک کے تذکرے دیے ہیں، ان سے سن تکمیل کتاب کے بعد کا اضافہ دیکھیں۔

بدایونی کو اس معاملے میں کچھ تسامح ہوا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس نے اسیر اور برہانپور کے قلعوں کا نہیں "ولائت" کا ذکر کیا ہے' لیکن فتح سندھ کے بعد پہلی مرتبہ خانخاناں دکن کو سنہ ۱۰۰۳ھ میں گیا۔ اور حاجی سلطان کی صاحبزادی کی شادی ۹۹۹ھ کے آخر تک ہو چکی ہوگی۔ شاید یہ شادی اس وقت ہوئی' جب حاجی سلطان بھکر سے مخفی طور پر واپس آچکے تھے' لیکن ابھی کروڑی مقرر نہیں ہوئے تھے۔

رسالہ ردِّ روافض

شادی کے بعد کچھ عرصہ حضرت مجدّد الف ثانی سرہند میں مقیم رہے۔ جہاں سنہ ۱۰۰۰ھ میں آپ کے بڑے صاحبزادے خواجہ محمد صادق پیدا ہوئے۔ (ان کا سالِ وفات زبدۃ المقامات میں درج ہے۔ تاریخِ ولادت نہیں۔ لیکن چونکہ تاریخِ وفات ۹ ربیع الاوّل ۱۰۲۵ھ ہے' جب آپ کی عمر چوبیس سال سے کسی قدر زیادہ تھی۔ اس لیے تاریخِ ولادت سنہ ۱۰۰۰ھ کے اواخر میں ہوگی)۔

ہم یہ خیال ظاہر کر چکے ہیں کہ شاید حضرت مجدّد کا رسالہ ردِّ روافض شادی کے بعد کی تصنیف اور غالباً سفرِ لاہور کی یادگار ہے۔ یہ رسالہ اصل میں اس رسالے کا جواب ہے جو علمائے شیعہ نے علمائے ماوراء النہر کو اس وقت بھیجا۔ جب عبداللہ خاں ازبک نے ۹۹۷ھ (۱۵۸۸-۸۹ء) میں مشہد کا محاصرہ کر رکھا تھا' لیکن اس کی تصنیف کی فوری وجہ یہ تھی' کہ ہندوستان میں کئی شیعہ علمائے مشہد کے مضامین دُہراتے اور امرا و سلاطین کی مجلسوں میں انھیں بڑے فخر سے بیان کرتے۔ حضرت مجدّد ان محفلوں میں ان کی تردید کرتے' لیکن انھیں خیال ہوا کہ اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ سپردِ قلم ہونا چاہیے تاکہ عوام النّاس میں بھی غلط فہمیوں کی گنجائش نہ رہے۔ چنانچہ وہ اس رسالے کے آغاز میں تحریر فرماتے ہیں:-

بعضے از طلبہ شیعہ کہ متردد ایں حدود بودند۔ بایں مقدمات افتخار و مباہات مینمودند و در مجالس امرا و سلاطین ایں مغالطات شہرت می دادند۔ و ایں حقیر در ہر مجلس و معرکہ مشافہہ بمقدمات معقولہ و منقولہ ردِّ آنہا می کرد۔ و غلطہای صریح ایشاں را اطلاع

می داد۔ اما حمیت اسلام و رگ فاروقیم بایں قدر ردّ و الزام کفایت نمی کرد و شورش سینۂ بے کینہ تشفی نیافت۔ و بخاطر فاتر قرار یافت کہ اظہار مفاسد ایشاں تا زمانے کہ در قید کتابت نہ آید ..... نفع عام نہ بخشد"۔

اس رسالے میں شیعوں کی نسبت وہی نقطۂ نظر ہے۔ جس سے مکتوبات امام ربانی اور مکتوبات خواجہ محمد معصوم کے پڑھنے والے واقف ہیں۔ یعنی یہ کہ وہ کافر ہیں۔ اور واجب القتل۔ یہ رسالہ (اثبات النبوت اور رسالہ تہلیلیہ کے برعکس جو عربی زبان میں ہیں) فارسی میں لکھا گیا۔ لیکن اپنے نقطہ نظر کی تائید میں کثرت سے روایات و احادیث دی ہیں، جو عربی میں ہیں۔

رسالہ ردِ روافض مکتوبات کے نولکشوری ایڈیشن کے ساتھ شائع ہو گیا ہے۔ لیکن مطبوعہ رسالہ اور اس قلمی نسخہ میں جو خانقاہ کندیاں شریف میں ہے۔ کسی قدر فرق ہے

رسالہ تہلیلیہ حضرت مجدد الف ثانی کا ایک اور رسالہ، جو انھوں نے خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں پہنچنے سے پہلے لکھا۔ اور اب ڈاکٹر غلام مصطفےٰ صاحب کی بدولت پہلی مرتبہ منظر عام پر آیا، رسالہ تہلیلیہ ہے۔ بیس بائیس صفحے کا چھوٹی تقطیع کا مختصر رسالہ ہے۔ جس کے ساتھ حافظ رشید احمد صاحب ارشد کا سلیس، با محاورہ اردو ترجمہ بھی شامل ہے۔

چونکہ اس میں حضرت مجدد نے "شیخی و والدی" (مخدوم عبدالاحد) کے ساتھ "قدس سرہ" لکھا ہے۔ اس سے ڈاکٹر صاحب موصوف نے استنباط کیا ہے۔ کہ یہ رسالہ مخدوم صاحبؒ کی وفات کے بعد لکھا گیا۔ انھوں نے "محض اندازے سے" عام اور نفس مضمون کی مناسبت سے اس کا تاریخی نام "معارف لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" (۱۰۰۷ھ) رکھا ہے۔ مولوی محبوب الٰہی مرتب رسائل مجددیہ ۱۰۰۷ھ کے بعد والے استنباط سے متفق ہیں۔ لیکن اس خیال سے کہ اس کا ذکر زبدۃ المقامات میں ان رسائل کے ضمن میں ہوا ہے، جو حضرت خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں حاضری (ربیع الآخر ۱۰۰۸ھ) سے پہلے لکھے گئے۔ اس لیے انھوں نے اس کا زمانِ تصنیف ۱۰۰۷ھ کا آخر یا ۱۰۰۸ھ کا

آغاز قرار دیا ہے۔

ہم زبدۃ المقامات اور حضرات القدس کی نسبت یہ رائے درج کر چکے ہیں۔ کہ ابتدائی ایام کے متعلق ان کے اندراجات کو تخمینی اور عمومی سمجھنا چاہیے لیکن مولوی صاحب کا اندازہ قرین صحت معلوم ہوتا ہے۔ اس کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ رسالے میں حضرات چشت مثلاً مخدوم عبدالاحدؒ اور شیخ عبدالقدوسؒ[1] (؟) اور وحدت الوجودی میل کے صوفیہ (مثلاً شیخ ابن العربیؒ اور شیخ صدر الدین قونویؒ) کی تصانیف سے طویل اقتباسات ہیں، لیکن بزرگانِ نقشبندیہ میں سے کسی کا ذکر نہیں۔ حضرت خواجہؒ سے بیعت کے بعد حضرت مجدد کی ابتدائی تصانیف میں ان کا ذکر اکثر آجاتا ہے۔ وہ بھی نہیں۔ اس لیے یہ خیال، کہ یہ رسالہ حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضری سے پہلے لکھا گیا، مستبعد نہیں۔

رسالہ تہلیلیہ میں کلمہ طیبہ کے متعلق مختلف امور سے بحث ہے۔ ابتدا لا کی بحث سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد لفظ اللہ کی حقیقت اور اس کے اشتقاق کے متعلق نحوی علما اور مفسرین کے اقوال کی روشنی میں بحث کی ہے۔ پھر لفظ اللہ کے لطائف، وحدانیت الٰہی کی دلائل اور کلمہ طیبہ کے فضائل بیان ہوئے ہیں۔ اس کے بعد ایک طویل اندراج ہے، جس کا عنوان حافظ رشید احمد صاحب ارشد نے "توحید صوفیا" اور مولوی محبوب الٰہی صاحب نے "توحید العوام و توحید الخواص" دیا ہے۔ پھر ایک مختصر اندراج میں وجودِ باری کے عین ذات ہونے میں فلاسفہ کے دلائل دیے ہیں۔ اور اس معاملے میں فلاسفہ اور صوفیائے کرام کے اتفاق رائے کا ذکر ہے۔ آخری حصّہ (بلکہ باب (کلمہ طیبہ کے جزوِ ثانی (یعنی رسالتِ محمدیہ) کے متعلق ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل، معجزات اور اخلاقِ کریمہ و اوصافِ عظیمہ کا

---

[1] مطبوعہ رسالے میں "الشیخ العارف عبداللہ القدوس الحنفی" لکھا ہے۔ اور ان کے فارسی مکتوبات سے اقتباس دیا ہے۔ چونکہ شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے فارسی مکتوبات مشہور ہیں۔ اس لیے ہمارا خیال ہے کہ شاید ان کی طرف اشارہ ہے۔ اور سہو کتابت سے نام میں ذرا تبدیلی ہو گئی۔

ذکر ہے۔

اثبات النبوت اور رسالۂ تہلیلیہ ایک ہی صاحبِ نظر کا عطیہ ہیں۔ ایک ہی دَور کے متعلق ہیں۔ رسالۂ تہلیلیہ کے آخری حصّہ کا تو موضوع بھی وہی ہے، جو اثبات النبوت کے ایک جزو کا ہے۔ چنانچہ اخلاق نبویؐ کے متعلق بعض عبارتیں (خفیف اختلافات کے ساتھ[1]) رسالۂ تہلیلیہ میں وہی ہیں، جو اثبات النبوۃ میں تھیں۔

اثبات النبوت اور رسالۂ تہلیلیہ میں کئی چیزیں مشترک ہیں، لیکن اگر ان کا غور سے مطالعہ کریں تو ان میں ایک لطیف فرق نظر آتا ہے۔ یہ دونوں رسالے ایک بلند پایہ عالم اور سچے محبِ اسلام کے لکھے ہوئے ہیں اور دونوں کی سطح بہت بلند ہے۔ لیکن اثبات النبوت میں صوفیانہ رنگ بہت ہلکا ہے۔ اور رسالۂ تہلیلیہ میں بڑا نمایاں ہے۔ اس امتیاز کی ایک وجہ تو اختلافِ مباحث ہے۔ اور دوسری یہ کہ اثبات النبوت میں روئے سخن ان لوگوں کی طرف تھا، جو عقل کے ترجمان بنتے تھے۔ اس لیے حوالے بھی زیادہ تر ان مفکرین و علما کے ہیں جنھیں وہ مانتے تھے (مثلاً جالینوس۔ امام رازی۔ امام غزالی۔ معتزلہ میں سے جاحظ اور النظام)۔ رسالۂ تہلیلیہ عام مسلمانوں کے لیے لکھا گیا۔ اس لیے اس میں اندازِ بیان مختلف اختیار کیا گیا۔ یہ دونوں اسبابِ امتیاز تو مسلّم ہیں، لیکن دوسرے رسالے میں صوفیانہ عنصر کا اس شدت سے اضافہ ہے کہ خیال ہوتا ہے کہ اس کا ہیولے اس زمانے میں تیار ہُوا، جب تکمیلِ علوم اور درس و تدریس علومِ ظاہرہ کے بعد (شاید اثبات النبوۃ زمانِ درس و تدریس کی یادگار ہے۔ زبدۃ المقامات کے مطابق ابوالفضل سے نبوت کے متعلق بحث اس زمانے میں ہوئی تھی) آپ کو والد ماجد کی خدمت میں پھر سے زیادہ رہنے کا موقع

---

[1] مثلاً رسولِ اکرمؐ کے احوال "قبل النبوت و حال الدعوت و بعد اتمامھا" کے الفاظ مشترک ہیں، کے ضمن میں اثبات النبوت میں اخلاق العقلیہ و احکام الحکمیہ کا ذکر ہے لیکن رسالۂ تہلیلیہ میں اخلاق الکریمہ و احکام الحکیمہ لکھا ہے۔ یہ تغیر صوتی اعتبار سے بھی بہتر ہے اور معنوی لحاظ سے بھی زیادہ روحانی سربلندی کا مظہر ہے۔

ملا اور تصوف کی منتہیانہ تصانیف کا گہرا مطالعہ ہوا۔

رسالہ تہلیلیہ میں نہ صرف صوفیاے کبار کی مشہور تصانیف سے طویل اقتباسات ہیں بلکہ صوفیاے کرام اور قطب و اوتاد کے متعلق آپ نے اسی نقطۂ نظر کا اظہار کیا ہے، جو شیخ محی الدین ابنِ عربی کا تھا۔ متعلقہ عبارت کا حسب ذیل ترجمہ حافظ رشید احمد صاحب ارشد نے کیا ہے:-

> وہ صوفیاے کرام جو خدا پرست، صاحب کشف اور شمعِ نبوت سے نور حاصل کرتے ہیں۔ زمین ان کے سہارے قائم ہے۔ اور انھیں کے فیض و برکات سے اہلِ زمین پر نزولِ رحمت ہوتا ہے۔ انھیں کی وجہ سے لوگوں پر بارش برسائی جاتی ہے۔ اور انھیں کی بدولت ان کو رزق دیا جاتا ہے۔ (رسالہ تہلیلیہ ص ۲۰)

رسالہ تہلیلیہ کی تالیف کے بعد حضرت مجدد نے سلسلۂ نقشبندیہ میں بیعت کی۔ جس میں شرع کی پابندی ہے۔ اس بیعت کے بعد آپ نے وحدت الشہود کی توضیح کی۔ اور ابن العربی سے بعض باتوں میں اختلاف کیا۔ لیکن ابتدائی اثرات کو جڑ سے اکھیڑ دینا آسان نہیں ہوتا۔ ابن العربی نے قطب۔ ابدال۔ اوتاد کا جو باطنی نظام پیش کیا تھا۔ اور جس کا پرتو رسالہ تہلیلیہ کی مندرجہ بالا عبارت میں نظر آتا ہے، اس کا اثر آپ پر تمام عمر رہا۔ بلکہ آپ نے اس میں اضافہ کر کے (اور قرآن مجید کی ایک آیت کی تاویل کر کے) قیومیت کا نظریہ پیش کیا۔ جسے بعد والوں نے بہت وسعت دی۔ اور بے حد غلو کیا۔ یہ نظریہ فی الحقیقت ابن العربی کے ان اثرات کا ماحصل ہے، جن کا بیج مخدوم صاحب کی صحبت اور تعلیم باطنی کے زمانے میں بویا گیا۔

حضرت خواجہ باقی باللہ سے بیعت

۱۰۰۷ھ کا سال، حضرت مجدد کے لیے بڑا رنج و الم کا زمانہ تھا۔ اس سال ۲ جمادی الآخر کو آپ کے خسر شیخ سلطان کے حسرت ناک انجام کا سانحہ پیش آیا۔ پچیس۲۵ روز بعد یعنی ۲۷ جمادی الآخر ۱۰۰۷ھ کو (روضۃ القیومیہ ص ۲۳) آپ کے والد ماجد جو آپ کو بے حد عزیز تھے، وفات پا گئے۔ ان دونوں سانحوں کا آپ کو بڑا صدمہ ہوا؛

ہوگا۔ لیکن الفرج بعد الشدۃ بسا اوقات رنج والم ہی رحمتِ الٰہی کا پیش خیمہ بن جاتے ہیں۔ اگلے ہی سال خوبیِ قسمت آپ کو حضرت خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں لے گئی۔ جن کے فیضِ صحبت سے آپ کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

حضرت خواجہ محمد باقی باللہ کی خدمت میں آپ اواخر ربیع الثانی ۱۰۰۸ھ یعنی نومبر ۱۵۹۹ء کے وسط میں پہنچے[1]۔ تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ آپ والد کی وفات کے بعد حج کے ارادے سے گھر سے نکلے تھے۔ راستے میں دہلی تھی۔ جب آپ وہاں پہنچے تو مولانا حسن کشمیری[2] کے ایک شاگرد نے جو آپ کے دوستوں اور حضرت خواجہ کے مخلصوں میں سے تھے، آپ سے حضرت خواجہ کے کمالات کا اظہار کر کے ملاقات کی تحریک کی اور آپ ان کے ہمراہ خدمت عالیہ میں پہنچے۔ حضرت خواجہ صاحب کی یہ عادت نہ تھی کہ کسی سے کوئی اپنی خواہش ظاہر فرماتے۔ البتہ آپ سے حضرت خواجہ صاحب نے خلافِ عادت خانقاہ شریف میں چند یوم قیام کرنے کے لیے ارشاد فرمایا۔ آپ نے ایک ہفتہ قیام کا وعدہ کیا، لیکن رفتہ رفتہ دو ڈھائی مہینے کی نوبت پہنچ گئی اور رجب کا مہینا آگیا[3]۔ لیکن اس سے بہت پہلے آثارِ تصرف و کشش حضرت خواجہ صاحب علیہ الرحمۃ کے نمودار ہو چکے تھے[4]۔ اور آپ پر شوقِ انابت و اخذ طریقہ خواجگان علیہ الرحمۃ نے غلبہ کیا۔ یہاں تک کہ آپ نے حضرت خواجہ علیہ الرحمۃ سے بیعت کے لیے درخواست کی۔ بجرد عرض کرنے کے بلا استخارہ (خلافِ عادت)

---

[1] مبدا و معاد (رسائل مجددیہ ص ۴۷) [2] حضرت مجدد نے ایک خط میں ملا حسن کاشمیری کا زوردار لفظوں میں شکریہ ادا کیا ہے (دفتر اول مکتوب ۲۷۹) [3] مبدا و معاد [4] حضرت خواجہ باقی باللہ کے صاحبزادے خواجہ محمد رباعیات در شرح رباعیات میں لکھتے ہیں: "حضرت مخدومی قبلہ گاہی شیخ احمد در دہلی بخدمت حضرت خواجہ بیرنگ قدس سرہ رسیدند۔ و در اندک مدت فتحہائے عظیم روئے نمودہ۔ سرفراز شدند۔ اول نفی و اثبات تعلیم کردند۔ چنداں در نگرفت۔ بعد از سہ چہار روز بآستانۂ حضرت خواجہ قطب الدین تشریف بردہ بودند۔ آنجا طلبیدند۔ و ذکر اسم ذات تلقین کردند۔ فی الفور اثرے عظیم پیدا شد۔"

حضرت خواجہ نے آپ کو خلوت میں طلب کر کے ذکر قلبی تعلیم فرمایا۔ آپ کامل فوراً ذاکر ہو گیا اور آرام و حلاوت ذکر قلبی و التذاذ تمام حاصل ہُوا۔ یوماً فیوماً ترقیاتِ عالیہ و عروجاتِ متعالیہ ظاہر ہوتے رہے[1]۔ حضرت خواجہ صاحب کی توجہ اور اپنی استعدادِ عالی کی بدولت آپ نے طریقت کی بہت سی منزلیں تھوڑے ہی عرصے میں طے کر لیں۔ آپ کی علمی قابلیت، حوصلہ اور روحانی استعداد نے خواجہ صاحب کو قائل کر لیا۔ چنانچہ خواجہ صاحب نے اپنے خطوں میں آپ کا ذکر بڑے احترام سے کیا ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"شیخ احمد نام مردیست از سرہند کثیر العلم و قوی العمل۔ روزے چند فقیر با او نشست و برخاست کرد۔ عجائب بسیار از روزگار اوقات او مشاہدہ نمود۔ بآں ماند کہ چراغے شود کہ عالمہا ازو روشن گردد۔"

حضرت خواجہ باقی باللہ آپ کا بڑا پاس کرتے۔ آپ سن و سال میں عین ان کے ہم عمر تھے۔ علوم ظاہری میں ان سے بڑھے ہوئے تھے اور تقریر و تحریر میں آپ کو ایک غیر معمولی ملکہ تھا۔ لیکن بالغ نظر مرشد نے آپ کی غلطیاں جتانے سے بھی گریز کیا۔ اور آپ کی تعلیم و تربیت میں پوری کوشش کی۔ مثلاً ایک زمانے میں آپ پر وحدت الوجود کا رنگ غالب تھا۔ ان دنوں آپ نے ایک رباعی لکھی ؎

اے دریغا کیں شریعت ملتِ آبائی است ۔۔۔ ملتِ ما کافری و ملتِ ترسائی ست
کفر و ایماں ہر دو زلف و روئے آں زیبائی است ۔۔۔ کفر و ایماں ہر دو اندر راہِ ما یکتائی است

تو مرشد نے فوراً انھیں ٹوکا اور ایک خط میں اس پر سختی سے تنبیہ کی فرماتے ہیں (ترجمہ)

"اور وہ رباعی ملحدانہ، جو آپ نے لکھی تھی۔ بہت ہی بے سمجھی اور کم عقل ہے۔ ایسی رباعی کے کہنے والا ہر گز مقبول نہیں ہو سکتا۔ ادب کو نگاہ رکھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ بڑا غنی اور غیرت مند ہے۔"

---

[1] ملخص از زبدۃ المقامات۔

اسی طرح حضرت کے کشفی واقعات اور مقاماتِ عروج کے اظہار کا مسئلہ ہے۔ ان کے متعلق بھی حضرت خواجہ باقی باللہ کی مسلسل ہدایت تھی کہ ان کے بارے میں اخفا سے کام لیا جائے۔ مثلاً جب حضرت مجدد نے ایک خط (مکتوب ہفتم) میں اپنے مقاماتِ عروج کا ذکر کیا تو حضرت خواجہ نے ایک طویل خط (رقعہ ہفتم) میں ان کی نسبت اپنی رائے ظاہر کی اور آخر میں لکھا۔ (ترجمہ)

"... اسرار کو محفوظ رکھیں یعنی حضرت ختم الخلافت کے ساتھ اس مقامات کی جو نسبت رکھتے وہ ظاہر نہ کریں۔ ایسا نہ ہو۔ لوگ غلطی میں پڑ جائیں اور ان کے عقیدے بگڑ جائیں۔"

حضرت خواجہ کے ملفوظات میں بھی لکھا ہے :- (ترجمہ)

ایک دن میاں شیخ احمد سرہندی کو جو حضور کے جلیل القدر اور ممتاز رفقا میں سے تھے، سرہند کی طرف رخصت کر رہے تھے۔ انھیں فرمایا کہ نسبت کو حتی المقدور پوشیدہ رکھنا صبح کی نماز سے لے کر اشراق تک جائے نماز پر بیٹھنا لیکن حلقہ نہ کرنا۔ اس کے بعد علوم دینی کا درس دینا ... اکثر اوقات تصحیح کتب اور مطالعہ میں مشغول رہنا۔ اگر سخن کا اتفاق ہو تو بطور علما کے کہنا بطور صوفیا کے نہیں اور اگر احیاناً بطور صوفیہ کچھ کہا جائے تو اجمال اور اخلاق کے ساتھ کہو تاکہ جسے خطاب کرنا منظور ہو۔ وہی سمجھے اور دوسرا اس سے کوئی ایسی چیز جو اس کی لغزش کا باعث ہو[1]۔ اخذ نہ کرے۔"

---

[1] ایک بزرگوار نے ان اقتباسات پر جو ہم نے حضرت خواجہ کے ارشادات سے دیئے ہیں اعتراض کیا ہے اور لکھا ہے "اس کے بعد محترم صاحب نے نہیں معلوم کس مقصد سے وہ نصائح بھی درج کر دیئے ہیں جو حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کو تحریر فرمائی تھیں۔ اور جو اس سلسلے میں تصوف و ترقی کے باب خصوصی طور پر کی جاتی ہیں" گزارش ہے کہ مندرجہ بالا اقتباسات درج کرنے سے راقم السطور کا مقصد حقیقتِ حال کو پیش کرنا اور یہ دکھانا ہے کہ حضرت خواجہ اور حضرت مجدد کے تعلقات کے متعلق متداول نقطۂ نظر حقیقت سے کس قدر بعید ہے۔ اس نقطۂ نظر کی ایک واضح مثال احسان اللہ صاحب گورکھپوری کی اس سوانح عمری حضرت مجدد الف ثانی میں ملتی ہے۔

[باقی اگلے صفحے پر]

حضرت خواجہ باقی اللہ نے حضرت مجدد کی تعلیم و تربیت میں پوری کوشش کی۔ جس چیز کو قابلِ اصلاح سمجھتے تھے، اس کی نشان دہی کی، لیکن آپ کے مراتبِ عالیہ کی دل کھول کر تعریف کی۔ پہلی مرتبہ حضرت مجدد دو ڈھائی مہینے دہلی مقیم رہے۔ اس کے بعد آپ دو مرتبہ اور مرشد کی زندگی میں دہلی تشریف لائے۔ اب حضرت خواجہ کی عنایات آپ پر بہت بڑھ گئی تھیں۔ جب آپ دوسری دفعہ دہلی تشریف لائے[1] تو حضرت خواجہ نے نہ صرف خلعتِ خلافت عطا کر کے اجازتِ ارشاد عطا فرمائی بلکہ چند منتخب حضرات، جن کی تعلیم و تربیت خاص طور پر منظور تھی، انھیں آپ کے سپرد کیا۔ "اس وقت آپ کو اپنے کمال و تکمیل میں تردد تھا۔ حضرت خواجہؒ نے اپنی صفائیٔ باطن سے اس تردد کو معلوم کر کے فرمایا کہ تردد نہیں کرنا چاہیے کہ اس سے شیخ کے کمال میں تردد لازم آتا ہے۔" چنانچہ آپ سرہند شریف واپس پہنچے۔ اور طالبانِ راہِ ہدایت کی تربیت میں مصروف ہو گئے۔ دہلی کا تیسرا سفر آپ نے حضرت خواجہ کے ایک خط سے متاثر ہو کر کیا۔ مرشد نے بڑی محبت و تپاک کا اظہار کیا۔ بسا مرتبہ

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۵۰)

جس کے متعلق خود مرحوم فرماتے ہیں "حضرت مجددؒ کے متعلق صرف یہی ایک ایسی کتاب ہے، جسے ہمارے دور میں بڑی ممتاز حیثیت حاصل ہے" اور جس میں حضرت مجددؒ کے متعلق لکھا ہے "کہ حضرت خواجہ باقی باللہؒ بظاہر آپ کے پیر اور در پردہ مرید تھے" (ص ۹۲)

[1] غالباً دوسرا سفر رمضان ۱۰۰۹ھ ہجری (اپریل ۱۶۰۱ء) میں کیا گیا۔ حضرت خواجہ کے ملفوظات کا مرتب لکھتا ہے کہ اس نے دو تین مجالس (بابت یکم صفر، دوم صفر، ششم صفر ۱۰۰۹ھ) کے ارشادات بغیر اجازت لکھ لیے تھے۔ لیکن جب انھیں حضرت خواجہ کو سنایا۔ تو انھوں نے منع کر دیا۔ لیکن کوئی آٹھ مہینے کے بعد قسمت نے یاوری کی۔ "یعنی حضرت شیخ احمد سرہندی جو حضور کے مقربوں اور مقبولوں میں سے ہیں، کسی تقریب پر حاضر ہوئے اور دوبارہ اس ضروری کام کے قبول کرنے کی درخواست کی۔ شیخ کی سفارش سے یہ درخواست منظور ہوئی۔ اس کے بعد ۱۱ رمضان ۱۰۰۹ھ یعنی ۱۶ اپریل ۱۶۰۱ء کے واقعات لکھے ہیں

آپ کو سرِ حلقہ بنایا ۔ ایک آدھ چھوڑ کر نئے طالبوں کی تعلیم و تربیت آپ کے سپرد کی۔ اور اپنے شیر خوار بیٹوں کو بلا کر اپنے عالی مرتبہ مرید سے توجہ دلائی۔ اور حضرت مجدد کے متعلق مختلف مواقع پر اتنے پُر جوش فقرات مدحیہ کہے کہ "احاطۂ تحریر میں نہیں آسکتے" (زبدۃ المقامات)۔

لاہور میں پہنچ — قطبُ الارشاد است

اس ملاقات کے بعد آپ سرہند تشریف لے گئے ۔ لیکن چند روز کے قیام کے بعد، مرشد کے ایما کے مطابق، لاہور تشریف لے گئے ۔ یہاں آپ کو بڑی کامیابی ہوئی ۔ کئی لوگ حلقۂ عقیدت میں داخل ہوئے اور علما و فضلا نے بھی آپ کی بڑی قدر کی، بالخصوص مولانا جمال تلوی، جنھیں بدایونی "اعلم العلما" کہتا ہے ۔ اور جن سے غالباً آپ کا تعارف فیضی کی تفسیر نویسی کے زمانے میں ہو چکا تھا ۔ آپ کا اتنا احترام کرتے تھے کہ ان کے شاگرد حیران، بلکہ معترض ہوتے ۔ مولانا جمال نے ہی ان ملاقاتوں کے دوران مسئلۂ وحدت الوجود کے متعلق اپنے شبہات بیان کیے اور اس کے حل کی خواہش ظاہر کی ۔ حضرت مجدد نے اس وقت تو مختصراً ان کے کان میں چند کلمات کہے، لیکن پھر اس مسئلے پر تفصیل سے اپنے رسالوں اور مکتوبات میں لکھا ۔ اور وحدت الوجود سے بالا وحدت الشہود کا مقام متعین کیا ۔

حضرت مجدد کی لاہور پر خاص نگہِ التفات تھی ۔ اس زمانے میں اس شہر نے، (جو ابتدائی دور میں قبۃ الاسلام کہلاتا تھا، لیکن مغلوں کی تباہ کاریوں کے بعد، عرصہ تک نیم ویران حالت میں رہا) قلعۂ اکبری اور دوسری عمارتوں کی تعمیر سے نئی رونق پائی تھی اور آگرہ اور سیکری کے مقابلے میں یہاں اسلامی اثرات زیادہ زوروں پر تھے ۔ قلیج خاں، جس نے اپنے زمانۂ حکومت میں یہاں تقویتِ دین اور ترویجِ علوم اسلامی کی بڑی کوشش کی ۔ اس وقت برسرِ اقتدار تھا[1] ۔ حضرت مجدد ایک خط میں جو

---

[1] قلیج خاں ۱۶۰۲ء سے ۱۶۰۵ء تک حاکم پنجاب تھا ۔ اس کے علاوہ بھی اس عہدے پر مامور رہا۔

جو خواجہ باقی باللہ کی وفات کے بعد لیکن اکبر کی زندگی میں "دریں طورِ زمانہ" لکھا گیا، اسے تحریر فرماتے ہیں :-

"در بلدۂ معظم لاہور بہ وجودِ ایشاں بسیارے از احکام شرعیہ دریں طورِ زمانہ رواج پیدا کردہ است و تقویتِ دین و ترویجِ ملت دراں بقعہ حاصل گشتہ است و آں بلدہ نزدِ فقیر ہمچو قطبِ ارشاد ست نسبت بہ سائر بلادِ ہندوستان - خیر و برکت آں بلدہ بہ جمیع بلادِ ہندوستان سارلیست - اگر آنجا ترویجِ دین است در ہمہ جا نحوے از رواج متحقق است - حق سبحانہ تعالیٰ مؤید و ناصر ایشاں باد" (دفتر اوّل مکتوب ۷۶)

حضرت مجدد لاہور میں تھے - جب ۳۰ نومبر ۱۶۰۳ء کو آپ کے مرشد نے وصال فرمایا - آپ فوراً دہلی کے لیے روانہ ہوئے - سرہند راستے میں تھا، لیکن آپ وہاں نہیں رُکے، بلکہ مکان کی شکل تک نہ دیکھی اور شبانہ روز چل کر دہلی پہنچے - اور مُرشد کے مزارِ پُرانوار کی زیارت کی -

خانقاہِ باقویہ

دہلی میں بدقسمتی سے آپ کے اپنے پیر بھائیوں سے بعض اختلافات ہو گئے - شاید ان میں سے بعض کی محدود صلاحیتوں کی نسبت آپ نے مرشد کی زندگی میں ہی اظہارِ خیال کیا تھا - دفتر اول کے مکتوب سوم میں حضرت خواجہ باقی باللہ کو سرہند سے لکھتے ہیں :-

"دیگر بعضے از یارانِ آنجائی (دہلی؟) بطریق مقربین مناسبت ندارند - موافق حال آنہا طریق ابرار است - فی الجملہ یقینے کہ حاصل کردہ اند - ہم غنیمت است ہماں طریق امر باید فرمود ؎

ہر کسے را بہر کارے ساختند

در تفصیل اسامی آنہا جرات نمود - کہ از ایشاں مخفی نخواہد بود - زیادہ گستاخی نمود -

اس عبارت کا مفہوم یقینی نہیں، لیکن حضرت خواجہؒ کی وفات کے بعد جو اختلافات ان کے دہلوی مریدوں اور حضرت مجددؒ میں رُونما ہوئے، وہ واضح ہیں - ان پر تذکرہ نویسوں نے بہت حاشیے چڑھائے ہیں - لیکن اصل معتبر بیان حضرت مجددؒ کا اپنا ہے -

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت خواجہؒ کے سب سے برگزیدہ خلیفہ وہی تھے انکی شان میں مرشد نے جو تعریفی کلمات کہے اور معترفانہ برتاؤ رکھا۔ اس کا عشر عشیر بھی دوسرں کو نصیب نہ ہُوا۔ خواجہ خرد رباعیات دشرحِ رباعیات میں لکھتے ہیں :۔ مے فرمودند کہ حضرت خواجہ جیو فرمودند۔ کہ بر ما ظاہر شدہ است۔ کہ از شما (حضرت مجددؒ) سلسلۂ ما باقی خواہد ماند۔"
لیکن حضرت مجددؒ زیادہ تر سرہند (یا لاہور) میں رہے۔ مرشد کی زندگی میں وہ فقط تین مرتبہ دہلی گئے۔ اس کے علاوہ جب حضرت خواجہ ماوراء النہر گئے تھے تو مریدوں کی دیکھ بھال شیخ الہ داد کے سپرد کر گئے تھے۔ اپنی بیماری کے دوران میں بھی انھوں نے شیخ الہ داد کے ذمے بعض خدمتیں کی تھیں۔ چنانچہ حضرت مجدد لکھتے ہیں :۔

آخری ملاقات کے وقت حضور قدس سرہ نے فقیر کو فرمایا تھا۔ کہ تم تجویز کرو۔ کہ شیخ الہ داد ہماری طرف سے جا کر بعض طالبوں کو مشغولی یعنی ذکر کے لیے کہے۔ اور بعض کے احوال ہم تک پہنچائے۔ کیونکہ حضور میں بلانے اور ذکر بتلانے اور احوال پوچھنے کی طاقت اب ہم میں نہیں رہی۔

فقیر اس بارے میں بھی متردد تھا۔ لیکن ضروری معلوم ہُوا تو فقیر نے بھی اس تجویز کو پسند کیا۔ (دفتر اوّل۔ مکتوب ۳۲)

حضرت مجدد فرماتے تھے کہ جو خدمت شیخ الہ داد کو سپرد ہوئی تھی، "وہ محض ایلچی گری کی قسم سے ہے.... یہ سفارت بھی حضور قدس سرہ کی زندگی تک مخصوص ہوگی" لیکن جو لوگ خانقاہ باقویہ میں مقیم تھے، ان کا خیال تھا کہ اس انتظام سے مستنبط ہوتا تھا۔ کہ حضرت خواجہ یہ مقام شیخ الہ داد کو سپرد کر گئے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ اختلاف محض شخصی نہ تھا۔ بلکہ نقطۂ نظر کا بھی تھا۔ خانقاہ والے حضرت خواجہ کے طریقے کو بغیر کسی کمی بیشی کے جاری رکھنا چاہتے تھے، لیکن حضرت مجدد کی نگاہ بلند تھی۔ وہ اس میں مزید تکمیل و ترقی کے قائل اور اس کے لیے کوشاں تھے۔ وہ اسی خط میں خواجہ حسام الدین کو لکھتے ہیں :۔

"آپ نے لکھا تھا کہ پیر دستگیر خواجہ باقی باللہ صاحب کی نسبت باقی رہتی ہے

یعنی زیادتی اور نقصان قبول نہیں کرتی ۔ میرے مخدوم! ہر فن کی تکمیل بہت سے فکروں کے ملنے سے ہوتی ہے ۔ جو نحو کہ سیبویہ نے وضع کیا تھا ۔ متاخرین کی فکروں نے اس کو دس گنا زیادہ کر دیا ہے ۔ اس کا اصلی حالت میں رہنا عین نقصان ہے ۔ وہ نسبت جو حضرت خواجہ نقشبند قدس سرہ رکھتے تھے ۔ حضرت خواجہ عبدالخالق قدس سرہ کے زمانے میں نہ تھی ۔ علیٰ ہذا القیاس

خاص کر ہمارے حضرت خواجہ قدس سرہ اس نسبت کو کامل کرنے کے درپے رہتے تھے ۔ اور اس کو (ابھی) تمام و کمال نہیں سمجھتے تھے ۔ اگر زندگی وفا کرتی ۔ خدا تعالیٰ کے ارادے سے، معلوم نہیں، اس نسبت کو کہاں تک لے جاتے اس نسبت کے زیادہ ہونے میں کوشش نہ کرنا مناسب نہیں" (دفتر اول مکتوب ۲۳۴)

حضرت مجدد و شیخ الہداد کو اس اہم کام کا اہل نہیں سمجھتے تھے ۔ ان کے دہلوی پیر بھائی اپنے خیال پر قائم رہے ۔ لیکن حضرت مجدد نے حسبِ معمول بلند ہمتی سے کام لیا ۔ ان اختلافات کو قطع تعلق کا باعث نہ ہونے دیا ۔ اسی خط میں خواجہ حسام الدین کو لکھتے ہیں: " سرہند کو اپنا گھر تصور فرمائیں ۔ محبت کا علاقہ اور پیر بھائی ہونے کی نسبت اس قسم کی نہیں ہے کہ ایسی عارضی باتوں سے ٹوٹ جائے " چنانچہ خواجہ حسام الدین سے ان کی خط و کتابت آخر تک جاری رہی ۔ شیخ تاج الدین سنبھلی سے بھی، جو شاید جانشینی کے مسئلے میں پیش پیش تھے ۔ آپ کا دل صاف ہو گیا ۔ چنانچہ جب وہ حجاز سے کچھ عرصے کے لیے وطن واپس آئے تو آپ نے بڑا محبت بھرا خط لکھا ۔ " آپ نے قدم رنجہ فرمایا ہے تو جلدی تشریف لائیں، کیونکہ مشتاق مدت سے منتظر ہیں ۔ اور بیت اللہ کی خبریں سننے کی آرزو رکھتے ہیں "

حضرت مجدد کے اپنے پیر بھائیوں سے جو شخصی اختلافات حضرت خواجہ کی وفات کے بعد پیدا ہو گئے تھے، وہ تو رفع ہو گئے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ طریقہ باقویہ سے کمی بیشی کے متعلق جو اصولی اختلاف تھا، وہ ختم نہ ہوا ۔ اور حضرت مجدد اور خواجہ حسام الدین کے درمیان دوستانہ شکائت و تردد کے ایسے خطوط لکھے گئے ۔

جن کی تہہ میں یہی اصولی مسئلہ تھا۔ مثلاً مکتوبات امام ربانی کے دفتر اوّل میں بعد کا ایک خط ہے۔ (شمارہ ۲۲۹) جو خواجہ صاحب کے "شبہات و تردیدات" کو رفع کرنے کے لیے لکھا گیا۔ حضرت مجدد نے اپنے پیر بھائی کو لقیو، دلایا کہ میرا طریقہ وہی ہے جو حضرت خواجہ قدس سرہ کا تھا۔ روز مرہ اور نشست و برخاست میں اس طریق کے آداب و لوازم کی پوری رعایت کی جاتی ہے وغیرہ۔

اسی طرح جب ایک مرتبہ حضرت مجدد کو ان کے پیر بھائیوں کے مولود سننے کی اطلاع موصول ہوئی تو انھوں نے اس پر اعتراض کیا۔ اور جب خواجہ حسام الدین نے لکھا کہ میر محمد نعمان نے رسالت مآب کو واقعہ میں دیکھا کہ اس مجلس سے خوش ہیں۔ اور حضرت خواجہ باقی باللہ کے "مشربِ قوی العذب" کا ذکر کیا تو حضرت مجدد نے ایک زور دار خط میں اس سے اختلاف کیا۔

حضرت مجدد اور خانقاہ باقویہ والے بعض امور میں پوری طرح ہم خیال نہ تھے۔ لیکن چونکہ یہ اختلافات دیانتدارانہ تھے اور ان کے اظہار میں پورا ادب بلکہ دوستانہ طرزِ بیان ملحوظ رکھا گیا۔ اس لیے ان اختلافات نے ذاتی تعلقات اور عقیدت و احترام کو متاثر نہ کیا۔ خواجہ حسام الدین نے (دوسرے طالبین کے علاوہ) اپنے بڑے بیٹے کو تکمیل طریقہ کے لیے سرہند بھیجا۔ حضرت خواجہ کے صاحبزادوں کو انھوں نے دو برس کی عمر سے پالا پوسا اور بے انتہا خدمت کی۔ وہ بھی ان سے بڑے وابستہ تھے، لیکن حضرت مجدد سے انھوں نے جس طرح فیض حاصل کیا، اس کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ خواجہ کلاں کی صاحبزادی تو حضرت مجدد کے چھوٹے صاحبزادہ، خواجہ محمد یحیٰ سے بیاہی گئیں۔ ان قریبی تعلقات میں حضرت مجدد کی بلند حوصلگی اور فرض شناسی کو بڑا دخل تھا۔ وہ مرشد زادوں کی بہترین تعلیم و تربیت کے لیے جس طرح بے قرار تھے اس کا اندازہ مکتوبات سے ہوتا ہے۔ خانقاہ باقویہ سے بھی ان کی دلی وابستگی تھی۔ اور وہ مرشد کی وفات کے بعد عرس میں باقاعدہ شرکت کرتے۔

رسالہ معارف لدنیہ رسالہ مبداء و معاد وغیرہ

سرہند میں حضرت مجدد نے ابتداءً ان طالبین کی تعلیم و تربیت سے کی، جنھیں حضرت خواجہ نے آپ کے پاس بھیجا تھا یا جو خود بخود آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ لیکن اس شخصی ارشاد و ہدایت کے علاوہ آپ کو اپنے زورِ قلم کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اور آپ نے ان تحریری صلاحیتوں کو بڑی قابلیت سے تقویتِ دین اور ترویج سلسلہ کے لیے استعمال کیا۔ اس میدان میں آپ کا اصل شاہکار تو مکتوبات کی تین جلدیں ہیں، جن کا ہم آگے چل کر تفصیلی ذکر کریں گے۔ لیکن آپ نے اس زمانے میں بعض رسائل بھی لکھے، جن کا مجمل ذکر یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ہم آپ کے تین رسائل کا ذکر کر چکے ہیں، جو آپ نے حضرت خواجہ کی خدمت میں پہنچنے سے پہلے لکھے تھے۔ ان میں سے پہلے دو (اثبات النبوت اور ردِّ روافض) معاصرانہ ضروریات کو ملحوظ رکھ کر لکھے گئے اور ان کا اندازِ بیان علماء سے ظاہر کا ہے۔ تیسرے رسالہ (تہلیلیہ) پر صوفیہ کا رنگ غالب ہے۔ بعد کے رسائل میں یہ رنگ اور گہرا ہو گیا ہے بلکہ وہ تمام تر صوفیہ مسائل یا اپنے احوال و مقامات کے متعلق ہیں۔ بعد کے رسائل میں سے شاید معارف لدنیہ پہلے لکھا گیا۔ کیونکہ اس کا ذکر مبداء و معاد میں ہے۔ جس کی تاریخ تکمیل ۱۰۱۹ھ ہے۔ اس میں زیادہ تر معرفت الٰہی کے مختلف پہلوؤں کا بیان ہے۔ شریعت و طریقت کی ہم آہنگی پر زور دیا ہے اور ان نام نہاد صوفیہ کی مذمت کی ہے، جو شریعت کے مخالف باتیں کہتے ہیں۔

"و عجب است از بعضے درویشانِ خام ناتمام کہ کشف خیالی خود را اعتبار نمودہ بانکار و مخالفت ایں شریعتِ باہرہ اقدام می نمایند۔ و حال آنکہ موسےٰ علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام بایں کلیمی و قرب، اگر زندہ مے بود، غیر از متابعتِ ایں شریعت امرِ دیگر نمے نمود۔"

مبداء و معاد میں حضرت مجدد کے خلیفہ خواجہ محمد صدیق بدخشی نے ان کی مباحث سے بعض عبارتیں جمع کی ہیں۔ مختلف صوفیانہ مسائل کا بیان ہے۔ لیکن کئی اندراجات سے حضرت مجدد کی اپنی روحانی زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔

رسالے کے آخر میں خواجہ محمد صدیق نے اس کی تاریخ تکمیل ۱۰۱۹ھ دی ہے لیکن اصل اندراجات اس سے پہلے کے تھے۔ اگرچہ ان میں اصلاح و ترمیم ہوتی رہی۔ ۱۰۲۰ھ میں خواجہ محمد صدیق (اور ظہیر الدین حسن مرید مولانا خواجہ باقی نقشبندی اویسی) اثنائے سفر میں مانڈو پہنچے اور گلزارِ ابرار کے مصنف غوثی سے ملے۔ اس وقت (خواجہ محمد صدیق کے پاس) ایک رسالہ تھا۔ جس سے غوثی نے کچھ عبارت نقل کی ہے۔ یہ عبارت مبدا و معاد کی ہے۔ اگرچہ مطبوعہ نسخوں سے قدرے مختلف ہے۔ غوثی نے "معارف لدنیہ کہ از جملہ مصنفات او (شیخ احمد سرہندی) است" کا بھی ذکر کیا ہے اور اس کا اقتباس درج کتاب کیا ہے۔

علاوہ ازیں ایک مختصر رسالہ تعلیقات بر شرح رباعیات خواجہ باقی باللہ میں آپ نے حضرت خواجہ کی رباعیات کی اُس شرح پر اضافے کیے، جو حضرت خواجہ نے خود ان رباعیات کی وضاحت کے لیے لکھی تھی۔ یہ رباعیات وجود واجب تعالےٰ اور ربط حادث بالقدیم کے دقیق مسئلے سے متعلق تھیں اور حضرت مجدد نے ان کی وضاحت اپنے معارفِ خاصہ اور حضرت خواجہ کے بعد کے خیالات کی روشنی میں کی ہے۔ یہ رسالہ "رسائل مجددیہ" میں شامل ہے۔

حضرت مجدد کے ایک اور رسالہ تعلیقات عوارف کا نام بھی تذکروں میں آتا ہے لیکن ابھی حلیۂ طبع سے آراستہ نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ رسالہ ارشاد المریدین کا نام بھی لیا جاتا ہے، لیکن یہ بھی نہیں چھپا۔ حال میں مکاشفات عینیۂ مجددیہ کے تاریخی نام سے ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب نے ایک رسالہ شائع کیا ہے، جسے زبدۃ المقامات کے مصنف اور مکتوبات کے دفتر سوم کے مرتب، مولنا ہاشم کشمی نے حضرت مجدد کی وفات کے بعد ان کے ایسے مسودات سے ترتیب دیا، جو بعض خلفا نے محفوظ کر لیے تھے۔ متفرق صوفیانہ مسائل اور مکاشفات کا بیان ہے۔ جن میں سے بعض اندراجات پُرانے ہوں گے۔ مثلاً مکاشفہ ۳۳ کی عبارت سے خیال ہوتا ہے کہ یہ اندراج حضرت خواجہ باقی باللہؒ کی زندگی میں کیا گیا۔

ارشاد و ہدائت

حضرت خواجہ باقی باللہ رح کی وفات ۳۰ نومبر ۱۶۰۳ء کو ہوئی۔ اس کے قریباً دو سال بعد ۱۷۔ اکتوبر ۱۶۰۵ء کو اکبر انتقال کر گیا اور اس کی جگہ جہانگیر تخت نشین ہوا۔ اسے باپ کی طرح جگت گورو بننے کا خبط نہ تھا۔ لیکن اس کے عہدِ حکومت میں حضرت مجدد کو ایک اَور مشکل کا سامنا کرنا پڑا' جس کا (بقول بعض تذکرہ نگاروں کے) ان کی اسیری میں بھی دخل تھا۔ جہانگیر کے دربار پر پہلے سال سے' شریف خاں کے امیر الامرا اور وکیل مطلق ہو جانے سے' ایرانی چھائے ہوئے تھے اور ان کا اقتدار کسی نہ کسی صورت میں آخر تک قائم رہا۔ ان میں سے کئی شیعہ یا مائل بہ شیعیت تھے۔ شیعوں کی نسبت حضرت مجدد کا جو نقطۂ نظر تھا' وہ پوشیدہ نہیں۔ انھوں نے نہ صرف ان کے خلاف رسالہ ردِّ روافض لکھا تھا بلکہ "امرا و سلاطین" کی مجلسوں میں بھی انھوں نے شیعہ اہلِ علم سے بحثیں کیں۔ اور مکتوبات میں بھی کئی جگہ اظہارِ خیال کیا۔ ایرانی امرا سے روابط پیدا کرنا اور انھیں متاثر کرنا' ان کے لیے بڑا مشکل تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اس کے باوجود وہ اصلاحِ حال کی ہر ممکن کوشش کرتے رہے۔ جہانگیر کی تخت نشینی کے فوراً بعد' بالمخصوص انھوں نے بڑی سرگرم کوشش کی۔ کہ آغازِ کار ٹھیک طرح سے ہو' اور ان تمام امرا کو' جنھیں وہ خواجہ باقی باللہ کے ذریعے سے' یا کسی اَور وجہ سے جانتے تھے' پُرزور خط لکھے۔ لیکن اب ان اُمرا ہی کو وہ اثر و اقتدار میسر نہ تھا' جو انھیں اواخر عہدِ اکبری میں حاصل تھا۔ خانِ اعظم پر خسرو کی وجہ سے اعتماد نہ کیا جاتا۔ اور ایک زمانے میں تو اسے قلعہ گوالیار میں قید کر لیا گیا۔ شیخ فرید کی عظیم خدمات کی وجہ سے جہانگیر ان کا معترف تھا' لیکن اب انھیں مرکز سے دور رکھا گیا۔ اور انھیں وہ اثر و اقتدار حاصل نہ ہُوا' جو عہدِ اکبری میں تھا۔

حضرت مجدد کے لیے عہدِ جہانگیری میں کئی مشکلیں تھیں' لیکن ان برگزیدہ ہستیوں کے لیے مشکلوں کے خاطر میں لانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دربارِ جہانگیری میں ان کے مخالف امرا برسرِ اقتدار تھے۔ لیکن اب انھوں نے عوام

سے رشتہ جوڑا اور اپنی رُوحانی عظمت، علم و فضل، قوتِ تحریر و تقریر اور انتظامی قابلیت سے نقشبندیہ سلسلے کو ملک میں بے انتہا وسعت دی۔ ہم خیال امرا کو وہ ترویجِ شریعت کی مسلسل تلقین کرتے رہے۔ جہاں طریقۂ اہلِ سُنت سے انحراف دیکھتے (مثلاً جب سامانہ کے ایک خطیب نے خطبہ میں چاروں خلفا کا نام نہ لیا) تو اصلاحِ حالت کے لیے متعلقہ افراد کو پُرزور طریقے سے ہدایت کرتے۔ اس کے ساتھ ساتھ عام ہدایت و ارشاد کا سلسلہ جاری رکھا۔ سلسلۂ نقشبندیہ کی بڑی باقاعدگی سے تنظیم کی۔ ملک کے تمام بڑے بڑے مرکزوں میں ان کے منتخب خلفا تھے، جو آپ کے خیالات کی ترویج کرتے۔ وہ اپنے مریدوں کی جس طرح خبرگیری کیا کرتے تھے۔ اس کا اندازہ دو معمولی مثالوں سے ہو سکتا ہے۔ ان کے ایک بنگالی خلیفہ تھے، مولنا حمید دانشمند وہ وطن واپس گئے تو دیر تک ان کی طرف سے اطلاع نہ آئی۔ حضرت مجدد نے پہلے تو انھیں محبت بھرے خط لکھے۔ اور جب پھر بھی خاطر خواہ جواب نہ آیا تو اپنے پٹنہ کے خلیفہ شیخ عبدالحی شادمانی کو ان کے پاس بنگال بھیجا تاکہ ان کے احوال سے آگہی اور جماعت سے ان کا ربط قائم رہے جہاں تک مریدوں کی انفرادی تعلیم و تربیت کا تعلق ہے خواجہ بدرالدین سرہندی کا تفصیلی بیان پڑھنے کے لائق ہے۔ (حضرات القدس صفحہ ۱۲۹)۔ وہ کہتے ہیں "کہ ہر روز کم و بیش دس مرتبہ حضرت میرے احوالِ باطنی کو دریافت فرماتے تھے" یا خود اندازہ لگاتے۔ اور مسلسل بہتر سے بہتر صورتِ حال پیدا کرنے کی کوشش فرماتے۔

مُرشد کی وفات کے بعد حضرت مجدد زیادہ تر سرہند میں مقیم رہے۔ لیکن ان کے مزار کی زیارت کے لیے جمادی الثانی میں جو حضرت خواجہ کی وفات کا مہینا ہے، دہلی تشریف لاتے اور دو تین مرتبہ آگرے تشریف لے گئے۔

خانگی صدمات اور حضرت مجدد کی عالی حوصلگی اور تسلیم و رضا

مارچ سنہ ۱۶۱۶ء کے آخری ہفتے میں آپ کو پے در پے کئی صدمات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس زمانے میں طاعون زوروں پر تھی۔ اور آپ کا خاندان اس سے خاص طور پر متاثر ہُوا۔ تین

چار روز کے اندر آپ کے گھر سے کئی جنازے نکلے ۔ جن میں آپ کے بڑے صاحبزادے خواجہ محمدؐ صادق (عمر ۲۴-۲۵ سال) دو کم عمر صاحبزادوں (محمدؐ فرخ اور محمدؐ عیسےٰ) ایک صاحبزادی (ام کلثوم) اور دوسرے افرادِ خاندان کی میتیں شامل تھیں۔ ان اندوہناک بلکہ ہمت شکن حالات میں آپ نے جو صبر و سکون دکھایا اور جس عالی حوصلگی اور تسلیم و رضا کا ثبوت دیا، وہ آپ کی بزرگی اور خدا رسیدگی کی بین دلیل ہے۔

ملا بدرالدین سرہندی نے حضرات القدس میں ان حوادث کی چند کربناک جزئیات محفوظ کر دی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ چھوٹے صاحبزادے محمدؐ فرخ اور محمدؐ عیسےٰ بیک وقت بیمار ہوئے ۔ لوگوں نے کہا کہ دونوں کو الگ الگ رکھنا چاہیے تاکہ ایک دوسرے سے متاثر نہ ہوں۔ چنانچہ جماعت خانہ کے حجرہ میں صاحبزادہ محمدؐ فرخ کو اور زنانہ میں محمدؐ عیسےٰ کو رکھا گیا ۔ پہلے رحلت موخرالذکر کی ہوئی۔ بیمار بھائی کو اطلاع نہ دی گئی، لیکن انھیں خود بخود اس کی خبر ہوگئی اور انھوں نے کہنا شروع کیا ۔ کہ محمدؐ عیسےٰ رحلت میں مجھ سے سبقت لے گئے ۔ شام کو انھوں نے خود انتقال کیا۔

بڑے مخدوم زادہ کا انتقال اور بھی حسرت ناک تھا ۔ وہ بڑے عالم اور برگزیدہ حال صوفی تھے ۔ مشکل کتب کا درس دیتے تھے ۔ مثلاً مطول مع حاشیہ میر، شرح عقائد مع حاشیہ خیالی ۔ تحریر اقلیدس آپ سے ملا بدرالدینؒ نے پڑھی تھیں ۔ آپ اپنے چھوٹے بھائی محمدؐ عیسےٰ کے جنازے کے ہمراہ پیادہ پا مقبرہ جدِ بزرگوار تک گئے ۔ واپسی میں طاعون کی گلٹی نمودار ہوئی۔ چنانچہ بیرون مکان حجرۂ خانقاہ میں آپ کو لٹا دیا گیا ۔ آپ کی والدہ ماجدہ کی جو حالت ہوئی ہوگی، اس کے قیاس سے ہی کلیجہ شق ہوتا ہے ۔ انھوں نے آپ کے دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ "بدقت تمام دو شخصوں کی گردن میں ہاتھ ڈال کر گئے ۔ اور والدہ ماجدہ اور تمام ارباب حقوق سے پوری طرح سے رخصت ہو کر حجرۂ مذکور میں واپس آئے ۔" اور دوسرے روز رحلت فرمائی ۔

صاحبزادہ محمدؐ صادق کی وفات کا جو آپ کے مرشد خواجہ باقی باللہ کو بڑے عزیز

تھے۔ اور بڑے عالم فاضل تھے۔ حضرت مجدد کو بڑا صدمہ تھا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "مفارقت اعزی قدس سرہ از اعظم مصائب است۔ معلوم نیست کہ کسے بمثل ایں مصیبت مصاب شدہ باشد" معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کی تیمارداریوں اور افراطِ غم نے آپ کی اپنی صحت پر اثر ڈالا۔ اس زمانے کا ایک خط ہے "چند روز است۔ کہ بلغم وسر فرزلوں ساختہ است۔ وضعفِ بدن بہم رسیدہ" لیکن جس ہمت اور صبر و رضا سے آپ نے یہ صدمے برداشت کیے۔ اس پر آپ کے وہ مکاتیب گواہ ہیں، جو آپ نے خطوطِ تعزیت کے جواب میں لکھے۔ ایسے مکتوبات (دفترِ اول کے آخر اور دفترِ دوم کے شروع میں) آئی ہیں۔ ایک خط میں خواجہ حسام الدین کو لکھتے ہیں:۔

"یہ مصیبتیں بظاہر جراحت نظر آتی ہیں۔ مگر حقیقت میں ترقیات اور مرہم ہیں۔ وہ صبر و شکر جو حق تعالٰے نے اس مصیبت میں اس ضعیف القلب کو کرامت فرمایا ہے۔ بڑی اعلٰے نعمت اور اعظم انعام ہے (دنیا اور آخرت اللہ تعالٰے ہی کے لیے ہے)"۔

اس خط میں "تسلیم و رضا" کا ذکر ہے، لیکن متعدد خطوط ایسے ہیں، جن سے خیال ہوتا ہے کہ معاملہ تسلیم و رضا سے بہت آگے بڑھ چکا تھا۔ کئی خطوط میں یہ اظہار ہے کہ تسلیم و رضا اچھی چیز ہے۔ لیکن اگر محبوبِ حقیقی سے سچی محبت ہے تو اس کے ہر فعل سے محبت ہونی چاہیے۔ اور بظاہر ناخوشگوار واقعات پر نہ صرف تسلیم و رضا بلکہ خوشی اور "التذاذ" محسوس ہونا چاہیے۔ چنانچہ ایک مکتوب نگار (خواجہ محمد طالب بدخشی) سے تلقینِ صبر اور تسلیم آموزی کی شکایت کی ہے۔ اور لکھا ہے:۔

"میرے برادرِ عزیز! حق تعالٰے مومنوں کے نزدیک ان کے مالوں۔ جانوں اور تمام اشیا سے زیادہ عزیز اور محبوب ہے۔ زندہ کرنا اور مارنا اسی کا فعل ہے۔ اس میں کسی اور کا دخل نہیں۔ اس لیے اس کا فعل بھی زیادہ عزیز اور محبوب ہوگا۔ محب اپنے محبوب کے فعل سے لذت پاتے اور خوش ہوتے ہیں۔ ان کو صبر کی ترغیب دینی مکروہ اور نامناسب ہے۔ مقامِ رضا اگرچہ رغبت و سرور

کی خبر دیتا ہے۔ لیکن التذاذ کا مرتبہ امرِ دیگر ہے۔"

ایسے مکاتیب کئی ہیں، جن میں یہ اظہار ہے کہ محبوب کی سختی اور جور و جفا اس کی مہربانیوں سے زیادہ عزیز ہے۔ ایک خط شیخ عبدالحق محدث کے نام ہے اور سارے کا سارا نقل کرنے کے لائق ہے:۔

"میرے مخدوم و مکرم۔ مصائب میں اگرچہ بڑی تکلیف و ایذا برداشت کرنی پڑتی ہے، لیکن ان پر بڑی کرامت اور مہربانی کی امید ہے۔ اس جہاں کا بہتر اسباب حزن و اندوہ ہے۔ اور اس دسترخوان کی خوشگوار نعمت الم و مصیبت ہے۔ ان شکر پاروں پر دارُوئے تلخ کا رقیق غلاف چڑھایا ہوا ہے اور اس حیلہ سے ابتلا و آزمائش کا راستا کھولا ہے۔ سعادت مند لوگ ان کی شیرینی پر نظر کر کے تلخی کو شکر کی طرح چبا جاتے ہیں اور کڑواہٹ کو صفرا کے برعکس شیریں معلوم کرتے ہیں۔ کیوں شیریں معلوم نہ کریں۔ جبکہ محبوب کے افعال سب شیریں ہوتے ہیں علتی اور بیمار شاید ان کو کڑوا معلوم کرے تو کرے، جو ماسوا میں گرفتار ہے۔ دولت مند محبوب کے ایلام و رنج میں اس قدر حلاوت اور لذت پاتے ہیں جو اس کے انعام میں ہرگز متصور نہیں۔ اگرچہ دونوں محبوب کی طرف سے ہیں لیکن ایلام میں محب کے نفس کا دخل نہیں ہوتا۔ اور انعام میں اپنے نفس کی مراد پر قیام ہوتا ہے۔

هَنِیئًا لِاَرْبَابِ النَّعِیْمِ نَعِیْمُهَا
وَلِلْعَاشِقِ الْمِسْكِیْنِ مَا یَتَجَرَّعُ

ترجمہ: مبارک منعموں کو اپنی دولت مبارک عاشقوں کو داد و کلفت

اَللّٰهُمَّ لَا تَحْرِمْنَا اَجْرَهُمْ وَلَا تَفْتِنَّا بَعْدَهُمْ (یا اللہ! تو ہم کو ان کے اجر سے محروم نہ رکھ۔ اور ان کے بعد ہم کو فتنہ میں نہ ڈال) اس غربتِ اسلام کے زمانے میں آپ کا وجود شریف اہل اسلام کے لیے غنیمت ہے۔ سَلَّمَکُمُ اللّٰهُ تَعَالٰی وَاَبْقَاکُمْ (اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت و باقی رکھے)۔ والسلام۔"

شیخ بدیع الدین

خانگی حوادث سے حضرت مجدد نے ارشاد و ہدایت میں ذرا ضعف نہ آنے دیا۔

۱۶۱۹ء میں جب آپ کی مجددانہ مساعی کو کئی سال ہو چکے تھے اور آپ کے مرید اور خلفا تمام ہندوستان میں بلکہ ہندوستان سے باہر بھی (مثلاً ممالک افغانستان و ترکستان) میں پھیل چکے تھے۔ آپ نے ایک پُرجوش مرید شیخ بدیع الدین کو جہانگیر کے دارالحکومت آگرہ میں ارشاد و ہدایت کے لیے بھیجا۔ شیخ بدیع الدین میں جوش اور جذبہ زیادہ تھا۔ احتیاط اور توازن کم۔ وہ اس سے پہلے عشقِ مجازی میں مبتلا ہوئے تھے تو ارکانِ اسلام کو ہی جواب دے بیٹھے۔ جب اس سے نجات پائی اور سلوک کی طرف توجہ کی تو اپنے فطری ذوق و شوق کی مدد سے بڑی ترقی حاصل کی، لیکن کئی الجھنوں کا سامان بھی کیا۔ آگرے میں انھیں بڑی کامیابی حاصل ہوئی اور بہت سے آدمی آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے لیکن مخالفت کا بازار بھی خوب گرم ہوا۔ شیخ بدیع الدین اپنے مرشد کو ایک خط میں اپنے احوال بلند اور اپنے مریدوں کی عقیدت کا ذکر کر کے لکھتے ہیں:-

> بعضے از طلبہ از کثرتِ التذاذ ترک خاں و ماں می کنند۔ اقربائے آنہا ایں فقیر را بسیار آزار می رہند و آنہا را تکلیف بوضع سابق می نمایند۔ بعضے مردم اینجا کہ در سلاسل دیگر شغل کردہ اند۔ الحال کہ دریں طریقہ علیہ داخل شدہ تجلے متلذذ اند۔ و بر عمر گزشتہ متاسف۔ ازیں جہت یکے از مشائخ اینجا غایت عداوت گرفتہ تا بجائے کہ بایں طریقہ و اعزہ آں سخنان بیہودہ می گوید۔ روزے جمعے از مریدانش را فرستاد۔ تا بہ حضرت خواجہ بزرگ و حضرت مخدومی خواجہ باقی قدس سرہما و سائر اعزہ دشنام ہا دادند۔ (زبدۃ المقامات)

شیخ بدیع الدین نے مرشد کی بھی نافرمانی کی اور ان کے حکم کے خلاف آگرہ چھوڑ کر اپنے وطن کو واپس چلے گئے۔ یہ امر حضرت مجدد کو بہت ناگوار گزرا۔ اور جب شیخ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ اس پر شیخ نے معافی چاہی اور تلافیٔ مافات کے طور پر پھر سے جا کر پہلے سے بھی زیادہ زور شور سے اپنا

کام شروع کیا لیکن اسی زور سے مخالفت ہوئی اور اس ضمن میں حضرت مجدد کو بھی بادشاہ کے دربار میں حاضر اور زندانِ شاہی میں محبوس ہونا پڑا۔ اس واقعہ کے متعلق حضرت مجدد کی سب سے قدیمی سوانح عمری میں جو اس واقعہ کے دس بارہ سال بعد ان کے صاحبزادوں کے ایما پر ان کے ایک ممتاز خلیفہ نے لکھی، ذیل کا اندراج ہے:۔

شیخ (بدیع الدین) باضطراب متوجہ دار الخلافت شد بامید آنکہ خاطر مبارک کہ غبار یافتہ است، مصفا شود۔ چوں رسید۔ اوّل آں مقام گرمی ہا و فیضہا بخلائق رسید۔ لیکن چوں آں شہر دار الامارت بود و مجمع عسکریاں ہنگامہ طلب دور از اخلاص و ادب۔ ازاں گروہ جمعے کہ بخدمتش رسیدند۔ باآنہا نصائح خشونت آمیز درمیاں نہاد و احوالات بلند خویش بر زبان آورد۔ بلکہ بعض وقائع و کشوف کہ اظہار آنہا ایقاظ فتنہ مے نمود۔ بگوشِ منکراں رسانید تا بجائے رسید کہ دراں شہر بودن نتوانست بلکہ آں شور و شر بہ پیر بزرگوار او قدس سرہ العزیز سرایت نمود و سلطانِ آں وقت کہ بایں طائفہ بے مناسبتی تمام داشت، حضرت ایشاں را طلب نمودہ، ایذا نمود و حبس فرمود۔ اگرچہ بعد ازاں سلطان ازیں امر نادم و پشیمان شد و عذرہا خواست۔ امّا وے را ایں سوءِ ادب نامبارک آمد۔ شورہا و فتورہا در مملکتش پیدا شد و بر بعضے دیارِ معتبرہ او ایرانیاں غلبہ نمودہ در تصرفِ خود آوردند و خودش بضعفہار مہلک مبتلا گشت تا بجہاں رفت۔ (زبدۃ المقامات)

مکتوب یازدہم کی مخالفت

شیخ بدیع الدین کے طریقِ کار سے جو شور و شر پیدا ہوا۔ اس کا اثر ان کے مرشدِ عالی مقام کو بھی پہنچا اور مکتوبات کے بعض اندراجات پر اعتراض شروع ہوئے جس بیان پر اس زمانے میں زیادہ حرف گیری کی گئی، وہ دفترِ اوّل کے مکتوب یازدہم میں درج ہے اور اس میں حضرت مجدد نے اپنے عروج روحانی کا ذکر کیا ہے۔ زیادہ اعتراض ذیل کی عبارت پر تھا:۔ (ترجمہ)

دوسری عرض یہ ہے کہ اس مقام کے ملاحظہ کے وقت اور رجعت سے مقام

ایک دوسرے کے اوپر ظاہر ہوئے۔ نیاز و عاجزی سے توجہ کرنے کے بعد جب اس پہلے مقام سے اوپر کے مقام میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ حضرت ذی النورین کا مقام ہے اور دوسرے خلفا کا بھی اس مقام میں عبور واقع ہوا ہے۔ اور یہ مقام بھی تکمیل و ارشاد کا مقام ہے اور ایسے ہی اس مقام سے اوپر کے دو مقام بھی جن کا اب ذکر ہوتا ہے تکمیل و ارشاد کے مقام ہیں۔ اور اس مقام کے اوپر ایک اور مقام نظر آیا۔ جب اس مقام میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ یہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا مقام ہے اور دوسرے خلفار کا بھی وہاں عبور واقع ہوا ہے۔ اور اس مقام سے اوپر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا مقام ظاہر ہوا۔ بندہ اس مقام پر بھی پہنچا۔ اور اپنے مشائخ میں حضرت خواجہ نقشبند قدس سرہ کو ہر مقام میں اپنے ہمراہ پاتا تھا اور دوسرے خلفار کا بھی اس مقام میں عبور واقع ہوا ہے۔ سوائے عبور اور مقام اور مرور اور اثبات کے کچھ فرق نہیں ہے اور اس مقام کے اوپر سوائے آنحضرت صلعم کے اور کوئی مقام معلوم نہیں ہوتا۔ اور حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے مقابل ایک اور نہایت عمدہ نورانی مقام کہ اس جیسا کبھی نظر میں نہ آیا تھا ظاہر ہوا۔ اور وہ مقام اس مقام سے تھوڑا سا بلند تھا جس طرح کہ صفہ کو سطح زمین سے ذرا بلند بناتے ہیں۔ اور معلوم ہوا کہ وہ مقام محبوبیت کا مقام ہے اور وہ مقام رنگین اور منقش تھا۔ اپنے آپ کو بھی اس مقام کے عکس سے رنگین معلوم کیا۔"

شیخ بدیع الدین تک بھی یہ اعتراض پہنچائے گئے اور کہا گیا کہ تمھارا پیر تو اپنے آپ کو صدیق اکبر سے بھی افضل سمجھتا ہے۔ انھوں نے ایک عریضہ مرشد کی خدمت میں ارسال کر کے عبارت کی توضیح چاہی۔ چنانچہ دفترِ اول کا ایک مکتوب (شمارہ ۲۲) اسی خط کے جواب میں ہے۔ اس میں حضرت مجدد لکھتے ہیں کہ میں نے اصل خط اپنے مرشد کے نام لکھا تھا۔ اور اس سلسلے کا یہ اصول ہے کہ مرید کو جتنے بھی واقعات پیش آئیں۔ صحیح ہوں یا سقیم۔ بے تحاشا انھیں اپنے مرشد کے حضور میں عرض کر دینا

چاہیے تاکہ غیر صحیح ہونے کی صورت میں ان کی تعبیر ہو سکے۔ معلوم ہوتا ہے کہ معترضین کی اس سے تشفی نہ ہوئی۔ اور آپ کے کئی مریدیلا (مثلاً مرزا فتح اللہ گیلانی اور قاضی سنام) نے مکتوب یازدہم کی بنا پر آپ کے طریقہ سے علحدگی اختیار کر لی۔ اس پر آپ نے ایک مفصل مکتوب مرزا فتح اللہ کو لکھا، جس میں ظاہر کیا کہ میں قطعاً اپنے تئیں حضرت صدیق اکبرؓ سے افضل نہیں سمجھتا۔

"وہ شخص جو اپنے آپ کو حضرت صدیقؓ سے افضل جانے، اس کا حال دو امر سے خالی نہیں ہے۔ یا وہ زندیق محض ہے یا جاہل ... وہ شخص جو حضرت امیرؓ کو حضرت صدیقؓ سے افضل کہے۔ اہلِ سنت والجماعت کے گروہ سے نکل جاتا ہے تو پھر اس شخص کا کیا حال ہے جو اپنے آپ کو افضل جانے؟"

حضرت مجدّد دربارِ جہانگیر میں

حضرت مجدد کی تشریح سے معترضین کی تسلی ہو جانی چاہیے تھی، لیکن پتا نہیں یہ تشریح بھنوں تک پہنچی یا نہ۔ بہر کیف "علمائے ظاہر بیں"[۱] نے جہانگیر کے حضور میں شکایت کی کہ سرہند کا ایک مشائخ زادہ اپنے تئیں حضرت صدیق اکبرؓ سے افضل سمجھتا ہے اور ایسے دعوے کرتا ہے، جن سے کفر لازم آتا ہے۔ اس کے علاوہ شیعہ اُمرا اور دوسرے مخالفوں نے نمک مرچ لگائی ہو گی کہ شیخ احمد نے مجددیت کا دعویٰ کیا ہے۔ ہزاروں آدمی اس کے حلقہ بگوش ہیں۔ عجب نہیں کہ اس کا اثر حکومت کے لیے مضر ثابت ہو۔ چنانچہ جہانگیر نے حاکم سرہند کی معرفت حضرت مجدد کو بُلا بھیجا۔

---

[۱] تذکرۂ علمائے ہند ص ۱۱

اپنی عربی تصنیف سبحۃ المرجان میں مولانا غلام علی آزاد بلگرامی مکتوب یازدہم کا خلاصہ دے کر لکھتے ہیں کہ بعض علما نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ حضرت مجدد اس بات کا دعوے کرتے ہیں کہ ان کا مقام صدیق اکبر سے بلند تر ہے۔ پس وہ مناظرہ کے لیے کمربستہ ہو گئے وغیرہ (ص ۴۸)

جہانگیر نے اس واقعہ کی نسبت تزکِ جہانگیری میں کسی قدر تفصیل سے اظہارِ خیالات کیا ہے۔ بدقسمتی سے اسے اس قدر بہکایا گیا تھا کہ اس نے اپنی رائے بڑی بے ادبی سے ظاہر کی ہے۔ حضرت مجدد کی نسبت اس نے جو خیالات ظاہر کیے ہیں وہ حضرت مجدد کے تمام معتقدوں بلکہ تاریخ کے غیر جانبدار ناظرین کو بھی معیوب معلوم ہوں گے۔ لیکن چونکہ جہانگیر کے بیان کی تاریخی اہمیت بہت ہے، اس لیے ہم اس کے وہ الفاظ حذف کر کے جو خاص طور پر قابلِ اعتراض ہیں، ذیل میں اس کا بیان درج کرتے ہیں

جہانگیر چہاردہم سالِ جلوس کے ضمن میں لکھتا ہے:۔

"دریں ایام بعرض رسید کہ شیخ احمد...... کتابے فراہم آوردہ مکتوبات نام کردہ.... از انجملہ در مکتوبے نوشتہ کہ در اثنائے سلوک گزارم بمقام ذی النورینؓ افتاد مقامے دیدم بغایت عالی و خوش صفا۔ از انجا درگزشتم بمقام فاروقؓ پیوستم و از مقام فاروق بمقام صدیقؓ عبور کردم۔ و ہر کدام را تعریفے در خور آں نوشتہ و از آنجا بمقام محبوبیت واصل شدہ، مقامے مشاہدہ افتاد بغایت منور و ملون۔ خود را بانواعِ انوار و الوان منعکس یافتم۔ یعنی استغفر اللہ از مقام خلفا درگزشتہ بعالی مرتبت رجوع نمودم و دیگر گستاخی ہا کردہ کہ نوشتن آں طولے دارد و از ادب دور است۔ بنا بریں حکم فرمودم کہ بدرگاہِ عدالت آئین حاضر سازند۔ حسب الحکم بملازمت پیوست و از ہر چہ پرسیدم جواب معقول نتوانست سامان نمود و باعدم خرد و دانش، بغایت مغرور و خود پسند ظاہر شد۔ صلاحِ حالِ او منحصر دریں دیدم کہ روزے چند در زندانِ ادب محبوس باشد تا شوریدگی مزاج و آشفتگی دماغش قدرے تسکین پذیرد و شورش عوام نیز فرو نشیند۔ لاجرم براۓ رائے سنگدلن حوالہ شد کہ در قلعہ گوالیار مقید دارد۔"

(تزکِ جہانگیری صـ ۲۷۵)

حضرات القدس میں جسے آپ کے خلیفہ مولانا بدرالدین سرہندی نے ترتیب دیا، اس واقعہ کے متعلق ذیل کا اندراج ہے:۔

"جبکہ آنجناب قدس سرہٗ کو اس کلام کے باعث جہانگیر بادشاہ کے پاس لے گئے۔

بادشاہ نے آپ سے پوچھا کہ ہم نے سُنا ہے کہ آپؒ نے لکھا ہے کہ میرا مرتبہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے بلند تر ہے۔ آپؒ نے یہی جواب[۱] دیا۔ اور ایک مثال بھی بیان کی کہ مثلاً آپ کسی ایک ادنےٰ آدمی کو خدمت کے لیے بُلائیں اور اس سے ازراہِ نوازش اسرار کی باتیں کریں تو وہ لامحالہ پنج ہزاری اُمرا کے مقام کو طے کر کے پیشی تک پہنچے گا۔ اور پھر اپنے مقام پر واپس جا کر کھڑا ہو جائے گا۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کا مرتبہ امراء پنج ہزاری سے زیادہ ہو جائے۔ اس جواب کو سُن کر بادشاہ کا عتاب دُور ہو گیا۔

اسی اثنار میں ایک شخص نے جو خدا شناسی سے دُور تھا، بادشاہ سے کہا کہ اس شیخ کا حال دیکھیے کہ آپ ظلِ اللہ اور خلیفۃ اللہ ہیں۔ آپ کو سجدہ نہیں کیا بلکہ معمولی تواضع بھی بجا نہیں لایا۔ بادشاہ اِس کلام کے سننے سے خفا ہُوا اور گوالیار میں حضرت کو قید کرنے کا حکم دیا۔ اس واقعہ سے پہلے شہزادہ دین پناہ شاہجہاں کہ آنجناب سے خلوصِ کامل رکھتا تھا۔ علماء سے مقامی افضل خاں اور خواجہ عبدالرحمٰن مفتی کو کتبِ فقہ کے ساتھ حضرت کی خدمت میں بھیج چکا تھا کہ سجدۂ تحیت سلاطین کے لیے آیا ہے۔ اگر آپ سجدہ کر لیں تو کوئی گزند بادشاہ سے آپ کو نہ پہنچے گا۔ مَیں ضامن اور ذمہ دار ہوتا ہُوں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ مسئلہ ضعیف حکمِ رخصت ہے۔ اور مسئلہ قوی عزیمت یہ ہے کہ غیر حق کو کبھی سجدہ نہ کریں۔"
(حضرات القدس دفتر دوم صر ۸۹ - ۹۰)

حضرت مجددؒ کی محبوسی جہانگیر کا ایک ایسا فعل ہے، جس کا کوئی جواز نہیں اور ان کے متعلق جہانگیر یا اس کے درباری مؤرخ نے جو بے ادبانہ الفاظ استعمال کیے وہ تو بہر صورت قابلِ مذمت ہیں۔ لیکن انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اس امر کا اظہار کر دیا جائے کہ حضرت مجددؒ کو جہانگیر نے اس لیے طلب نہیں کیا تھا کہ اسے حضرت سے

---

[۱] یعنی عبور و مرور اور اثبات کے فرق کے متعلق

کوئی ذاتی عناد تھا بلکہ اس طلبی کی اگر ایک وجہ ملکی مصلحتیں[1] تھیں تو دوسری وجہ مذہبی تھی۔ مکتوبات کے جن اندراجات کی تزک جہانگیری میں شکایت کی گئی ہے۔ ان پر کئی دُوسرے ہمعصر معترض تھے۔ بلکہ خزینۃ الاصفیا میں تو لکھا ہے کہ علما نے حضرت مجدد کے قتل کا فتویٰ دے دیا تھا۔ (پس ہمہ علما بخاطرداری امراے دربار فتویٰ بر قتل شیخ نوشتند) خزینہ میں حضرت مجدد کے متعلق جو طویل اندراج ہے، اس کا ایک اہم ماخذ (روضۃ السلام) ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ لیکن سبحۃ المرجان میں بھی میر غلام علی آزاد بلگرامی لکھتے ہیں کہ جہانگیر کے پاس مکتوب یازدہم کی شکایت علمانے کی تھی (ص ۴۸)۔ اس کے علاوہ خیال ہوتا ہے کہ حضرت مجدد کے خلاف ایک عام شورش کی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ جہانگیر حضرت مجدد کی قید کا ایک مقصد یہ بھی بتاتا ہے کہ "شورشِ عوام ٹھنڈی پڑ جائے"۔ اور زبدۃ المقامات میں بھی لکھا ہے کہ شورش کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ شیخ بدیع الدین کے لیے اکبر آباد میں رہنا ناممکن ہو گیا۔ بلکہ اس شورش کی

---

[1] شاید مغل بادشاہ سیاسی مصلحتوں کی بنا پر نہ چاہتے تھے کہ مذہبی راہنماؤں کا اثر بہت بڑھ جائے۔ تزک جہانگیری میں ایک جگہ لکھا ہے "بمن خبر رسید کہ شیخ ابراہیم بابا افغانی دُکانِ شیخی و مریدی در یکے پرگنہ از پرگناتِ لاہور ترتیب دادہ، چنانچہ طریقہ او باش است جمع کثیرے از افغانان وغیرہ بہ گرد آمدہ اند۔ فرمودم کہ او را حاضر آوردہ بہ پرویز سپارند کہ در قلعہ چنار نگاہ دارد۔ تا ایں ہنگامۂ باطل برہم خورد"۔ گلزار ابرار میں بھی سید احمد افغانی کے ذکر میں لکھا ہے کہ جس سال خسرو نے جہانگیر کے خلاف بغاوت کی، ان دنوں ایک مجلس میں سادات صفوی کے ایران پر قبضہ پانے کا ذکر ہو رہا تھا تو کسی نے کہا کہ اس وقت بھی کئی درویش صورت اشخاص ایسے ہیں، جن کے فرمانبردار معتقدین کی تعداد ایک ولایت کی فوج سے کم نہیں اور اس سلسلے میں باجواڑہ کے سید احمد افغانی کا نام لیا۔ وہ بُلائے گئے۔ آداب ملازمت بجانہ لائے اور تین سال تک گوالیار میں قید رہے۔ وہ بھی وحدت الوجود کے خلاف تھے۔ شاہجہان نے بھی حضرت مجدد کے خلیفہ اعظم شیخ آدم بنوری کو حج پر جانے کے لیے مجبور کیا تھا۔ (سید احمد افغان کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو ص ۳۵۴)

انچ پیرِ بزرگوار تک پہنچی۔

سُنّتِ یُوسفی

حضرت مجدّد تقریباً ایک سال گوالیار کے قلعے میں قید رہے جب یہ واقعہ پیش آیا تو شیخ بدیع الدین کا ذوق و شوق بالکل مُردہ ہوگیا (نوشتہ بودند کہ از وقتِ ظہورِ فتنہ نہ ذوق مانده است و نہ حال) لیکن حضرت مجدّد کے ذوق و شوق میں اور اضافہ ہُوا۔ انھوں نے دفترِ سوم میں کئی جگہ اس بات کا ذکر کیا ہے کہ محبوب کی جفا اس کی مہربانی سے زیادہ دلآویز ہوتی ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض لحاظ سے واقعۂ قید حضرت مجدّد کے لیے زیادہ ترقیات اور رُوحانی اصلاح کا باعث ہُوا۔ قید کے فوراً بعد آپ نے صاحبزادگان کو جو پہلا خط لکھا۔ (دفترِ سوم، مکتوب دوم) وہ بھی کامل تسلیم و رضا، فصاحت و بلاغت اور شفقت و محبت کا ایک دلآویز مرقع ہے۔

جہانگیر پندرھویں سالِ جلوس کے ضمن میں لکھتا ہے:۔

"دریں ایام شیخ احمد سرہندی را کہ بجہت دکان آرائی و خود فروشی و بےصرفہ گوئی روزے چند در زندانِ ادب محبوس بود۔ بحضور طلب داشتہ خلاص ساختم خلعت و ہزار روپیہ خرچ عنایت نموده در رفتن و بودن مختار گردانیدم۔ واز روئے انصاف معروض داشت کہ ایں تنبیہ و تادیب در حقیقت ہدایتے و کفایتے بود"

جہانگیر نے حضرت مجدّد کے مرتبہ اور ظرف کا صحیح اندازہ لگایا ہو یا نہ۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ اُنھوں نے واقعۂ قید سے بھی مزید روحانی ترقی کا سامان کیا۔ اس آزمائش میں انھوں نے جس وقار، استقلال اور علوِ ہمت کا مظاہرہ کیا۔ وہ ہماری روحانی تاریخ کا ایک درخشاں باب ہے۔ تذکرہ نگار تو نہیں لکھتے لیکن پروفیسر محمد فرمان نے ایک مکتوب سے قیاس لگایا ہے کہ معاملہ صرف قید و بند کا نہ تھا، بلکہ جائداد بھی ضبط کی گئی۔ اور انھیں اور ان کے خاندان کو "حویلی و سرا و چاہ و باغ و کتب و اشیائے دیگر" سے محروم ہونا پڑا۔ لیکن اس پیکرِ تسلیم و رضا پر ذرہ بھر اثر نہ ہُوا۔ صاحبزادگان گرامی قدر، خواجہ محمد سعید اور محمد معصوم کو لکھتے ہیں کہ ان چیزوں کی پرواہ نہیں۔ "باید کہ ہیچ چیز مزاحمِ وقت شما نشود۔ و غیر از مرضیات حق

جلاو علا مراد و مرضی شما نباشد۔ اگر ما مے مردیم ۔ ایں ہمہ اشیاء رفت گہ در حیات ما رفتہ باشد۔ ہیچ فکر نہ کنند . . . . والدہ خود را تسلی دہند "

قید خانے میں اس نئی صورتِ حالات کو آپ جس نظر سے دیکھتے تھے، اس کا تفصیلی اظہار، میر محمد نعمان کے نام ایک خط میں ہے :۔ (ترجمہ)

"پوشیدہ نہ رہے کہ جب تک اللہ تعالٰی کی عنایت سے اس عنایت نے حق تعالٰی کے جلال و غضب کی صورت میں تجلی نہ فرمائی اور قید خانے کے قفس میں قید نہ ہوا۔ تب تک ایمان شہودی کے تنگ کوچے سے کلی طور پر نہ نکلا۔ اور ظلال و خیال و مثال کے کوچوں میں سرگرداں رہا۔ ایمان بالغیب کی شاہراہ میں مطلق العنان ہو کر نہ دوڑا۔ اور حضور سے غیب کے ساتھ اور عین سے علم کے ساتھ اور شہود سے استدلال کے ساتھ کامل طور پر نہ ملا اور ذوق کامل اور وجدانِ بالغ کے ساتھ دوسروں کے ہنر کو عیب اور ان کے عیب کو ہنر نہ معلوم کیا۔ بے ننگی اور بے ناموسی کے خوشگوار شربت اور رسوائی اور خواری کے مزے دار مربے نہ چکھے اور خلق کے طعن و ملامت کے جمال سے حظ نہ پایا۔ اور لوگوں کے بلا و جفا کے حسن سے محظوظ نہ ہوا اور کلی طور پر اپنے ارادہ و اختیار کو ترک نہ کیا اور آفاقی اور نفسی تعلقات کے رشتہ کو کامل طور پر نہ توڑا اور تضرع و التجا، انابت و استغفار اور ذلت و انکسار کی حقیقت حاصل نہ ہوئی اور حق تعالٰی کے استغنا کی رفیع الشان بارگاہ کو جس کے گرد عظمت و کبریا کے پردے تنے ہوئے ہیں، مشاہدہ نہ کیا اور اپنے آپ کو بندۂ خوار و زار و ذلیل و بے اعتبار و بے ہنر و بے طاقت اور کامل محتاج اور فقیر معلوم نہ کیا۔"

ہم جہانگیر کا بیان نقل کر چکے ہیں کہ قید خانے سے رہائی کے بعد اس نے حضرت مجدد کو اجازت دی تھی کہ وہ چاہیں تو لشکر کے ساتھ رہیں اور چاہیں تو گھر چلے جائیں۔ آپ نے لشکر کے ساتھ رہنا قبول کیا[1]۔ اس طرح آپ کو سارے لشکر میں، بلکہ ساری

---

[1] پروفیسر محمد فرمان کا خیال ہے کہ جہانگیر کا حضرت مجدد کی نسبت یہ لکھنا کہ "در رفتن و ماندن مختار گردانیدم" جھوٹ اور ڈپلومیسی کا اظہار ہے۔ اور اس نے "حضرت مجدد کو آخر وقت تک نظر بند

[باقی اگلے صفحے پر]

مملکت میں جہاں جہاں لشکر جاتا، تلقین و ہدایت کا موقع ملتا۔ اس سے پہلے بھی جب آپ جیل خانے میں محبوس تھے تو آپ نے اپنے رفقائے زنداں میں سے کئی بت پرستوں کو اسلام کا حلقہ بگوش بنایا تھا۔ لشکر کے ساتھ قیام کے دوران میں آپ کو بادشاہ کو تلقین کرنے کا بھی موقع ملتا۔ چنانچہ دفترِ سوم میں ایک خط بادشاہ کے نام ہے اور ایک اور خط میں اس گفتگو کا ذکر ہے جو آپ نے مجلسِ شاہی میں کی تھی۔ لکھتے ہیں (ترجمہ)

"عجیب و غریب صحبتیں گزر رہی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان گفتگوؤں سے امورِ دینیہ اور اصولِ اسلامیہ میں سرِ مو سستی اور مداہنت دخل نہیں پاتی اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان محفلوں میں بھی وہی باتیں ہوتی ہیں جو خاص خلوتوں اور مجلسوں میں بیان ہوا کرتی ہیں۔ اگر ایک مجلس کا حال لکھا جائے تو دفتر ہو جائے۔ خاص کر آج ماہ رمضان کی سترھویں رات کو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بعثت اور عقل کے عدمِ استقلال اور آخرت کے ایمان اور اس کے عذاب و ثواب اور رویتِ دیدار کے اثبات اور حضرت خاتم الرسل کی نبوت کی خاتمیت اور ہر صدی کے مجدد اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی اقتدار اور تراویح کی سنت اور تناسخ کے باطل ہونے اور جنوں اور جنیوں کے احوال اور ان کے عذاب و ثواب کی نسبت بہت کچھ مذکور ہوا۔ بادشاہ بڑی خوشی سے سنتا رہا۔ اس اثنا میں اور بھی بہت سی چیزوں کا ذکر ہوا اور اقطاب و اوتاد اور ابدال کے احوال اور ان کی خصوصیتوں وغیرہ کا بیان ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ سب کچھ قبول کرتے رہے اور کوئی تغیر ظاہر نہ ہوا۔ ان واقعات اور ملاقات میں شاید کوئی اللہ کی پوشیدہ حکمت اور خفیہ راز ہوگا"...

(بقیہ نوٹ از صفحہ ۲۷۲)

رکھا" (حیاتِ مجدد ص ۲۰۵) یہ خیال بے بنیاد نہیں۔ مکتوباتِ امام ربانی کا بغور مطالعہ کریں تو اس کی تائید ہوتی ہے لشکر سے جب حضرت مجدد جاتے تھے تو رخصت لے کر جاتے تھے ان کا طریقہ انتہائی تسلیم و رضا کا تھا لیکن خواجہ حسام الدین کے نام بھی ان کا خط پڑھیں تو عینِ بلا اور عینِ تفرقہ کا جس طرح ذکر ہے اور جو دوسرے پڑھ چکے ہیں (دفتر دوم ص ۲) ان سے پروفیسر محمد فرمان کے موقف کی تائید ہوتی ہے۔

جہانگیر آپ کی قید خانے سے رہائی کے تین سال بعد اپنی سالگرہ کے ذکر میں لکھتا ہے :-

"بدستور ہر سال خود را بہ طلا و اجناس وزن فرمودہ وردوجہ مستحقاں مقرر فرمودم۔ از آں جملہ شیخ احمد سرہندی را دو ہزار روپیہ عنایت شد۔"

حضرت مجدد قلعہ گوالیار سے واپسی کے بعد تقریباً تین چار سال تک بادشاہ کے لشکر میں رہے۔ اس دوران میں انھوں نے کئی خط لکھے جو جلد سوم میں موجود ہیں لیکن ان میں سوانحی واقعات بہت تھوڑے ہیں۔ یہ معلوم نہیں کہ آیا حضرت مجدد بادشاہ کے ساتھ کشمیر اور کانگڑہ بھی گئے۔ لیکن تزکِ جہانگیری کے مطالعہ سے خیال ہوتا ہے کہ ان تین چار سالوں میں جہانگیر کو ترویجِ شریعت کا خاص خیال رہتا تھا اور اس کے دل میں مذہب کا بڑا جوش تھا۔ عجیب نہیں کہ اس میں حضرت کی تعلیمات کو بھی دخل ہو۔ جہانگیر پندرھویں سالِ جلوس کے واقعات میں یعنی جس سال حضرت کو رہائی ملی علاقہ راجوری (کشمیر) کے بعض مسلمان راجپوتوں کی نسبت لکھتا ہے :-

"زمینداران ایں جارا راجا می گفتند۔ سلطان فیروز مسلمان کردہ۔ و مع ذالک خود را راجا می گویانند و ہنوز بدعت ہائے ایامِ جہالت در میان آنہا مستمر است از جملہ چنانچہ بعضے از زنان ہندو با شوہر خود سے سوزند۔ ایںہارا زندہ با شوہر بہ گور می آرند شنیدہ شد کہ دریں ایام دخترے دہ دوازدہ سال باشوہر خود کہ ہمسال با و بود زندہ بقبر در آوردند دیگر آنکہ بعضے از مردمِ بے بضاعت راکہ دختر تولد می آید خفہ کردہ می کشند۔ با ہنود پیوند خویشی سے کنند۔ دختر می دہند و می گیرند۔ گرفتن خود خوب۔ اما دادن! نعوذ باللہ فرمان شد کہ بعد ازیں پیرامونِ ایں امور نگردند۔ و ہر کس کہ مرتکب ایں بدعتہا شود۔ اور ا سیاست کنند" (تزکِ جہانگیری ص ۳۲۳)

پھر اگلے سال فتح کانگڑہ [1] کے ذکر میں لکھتا ہے :-

---

[1] جہانگیر کے بیان سے خیال ہوتا ہے کہ اس زمانے میں مسلمان عوام جوالا مکھی کی پرستش کرتے تھے "قطع نظر از کفار کہ بت پرستی آئین آنہاست۔ گروہ گروہ از اہلِ اسلام مسافتِ بعیدہ طے نمودہ نذورات می آرند۔ و پرستش ایں سنگِ سیاہ می نمایند" (تزکِ جہانگیری ص ۳۴۴)

"متوجہ سیرِ قلعہ کانگڑہ شدم و حکم کردم کہ قاضی و میرِ عدل و دیگر علماء اسلام کہ در رکاب بودہ۔ آنچہ شعارِ اسلام و شرائط دینِ محمدی است در قلعہ مذکور بعمل آورند۔ بتوفیقِ ایزدی بجا آوردن بانگِ نماز و خواندنِ خطبہ و کشتنِ گاؤ وغیرہ کہ از ابتدائے بناء ایں قلعہ تا حال نشدہ بود۔ ہمراہِ در حضور خود بعمل آوردم۔ سجداتِ شکر ایں موہبتِ عظمیٰ کہ ہیچ بادشاہے توفیق براں نیافتہ بود بتقدیم رسانیدہ، حکم فرمودم کہ مسجدِ عالی درونِ قلعہ بنا نہند۔"

(توزک جہانگیری ص ۳۴۶)

یہ امر غیر اغلب نہیں کہ "دیگر علمائے اسلام" جو بادشاہ کے ساتھ تھے، ان میں حضرت مجدد بھی ہوں[1]!

جہانگیر کی حکومت میں نورجہاں کے شیعہ بھائی اور وزیرِ سلطنت آصف کو بڑا دخل تھا اور حضرت مجدد کو ان کا طریقِ کار ضرور ناگوار ہوتا ہوگا۔ لیکن قیامِ سلطنت کے دوران میں کئی الجھنوں کے باوجود حضرت مجددؒ نے اپنی جمعیتِ خاطر اور رُوحانی مشاغل میں فرق نہیں آنے دیا۔ ایک خط میں خواجہ حسام الدین احمد کو لکھتے ہیں:۔

"اس طرف کے فقرا کے احوال و اوضاع حمد کے لائق ہیں کہ عینِ بلا میں عافیت اور عینِ تفرقہ میں جمعیت حاصل ہے۔ وہ فرزند و دوست جو ہمراہ ہیں۔ ان کے اوقات بھی جمعیت سے گزر رہے ہیں۔ اور ان کے احوال میں ترقی ہو رہی ہے.... الحمدللہ۔ باوجودیکہ اربابِ تفرقہ سے بہت میل جول ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے کرم سے ہم ایسوں میں سے کسی کو ابھی تک تفرقہ کی نوبت نہیں پہنچی اور مطلب سے نہیں روکا۔" (دفتر سوم مکتوب ۱۲)

---

[1] ہم نے اپنے زعم میں بڑی محنت کی۔ اور مجددی تذکرہ نگاروں کی تائید میں تزکِ جہانگیری سے جو کچھ مل سکا اسے جمع کیا۔ اور حضرت مجددؒ کے اثرات کے ثبوت میں پیش کیا لیکن چونکہ ہم نے تزکِ جہانگیری کی عبارات کے لحاظ سے حضرت مجدد کے ساتھ دوسروں کو بھی شامل کر لیا تھا۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ ہم نے حضرت مجدد کی خدمات پر پردہ "ڈالنا چاہا ہے۔ خیر خبیر و علیم اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ ہمیں شکایت نہیں۔ لیکن پروفیسر محمد فرمان نے جو کچھ لکھا ہے اس کی روشنی میں جہانگیر اور حضرت مجددؒ کے تعلقات کا نئے سرے سے مطالعہ مناسب ہے۔

لشکر کے ساتھ ہی آپ ۱۰۳۳ھ میں اجمیر تشریف لے گئے۔ جہاں آپ نے حضرت خواجہ بزرگ قدس سرہ کے مزار کی زیارت کی۔ دیر تک وہاں مراقبہ کیا اور بڑا فیض حاصل کیا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ خواجہ صاحب نے حق مہمانی ادا کیا۔ طرح طرح کی ضیافتیں کیں اور بہت سی اسرار کی باتوں کا ذکر ہوا۔ اسی جگہ مزار کے خادموں نے حاضر ہو کر حضرت خواجہ کے مزار کا قبر پوش آپ کی خدمت میں پیش کیا جسے آپ نے ادب کے ہاتھوں سے لے لیا۔ اور فرمایا کہ چونکہ یہ لباس حضرت خواجہ سے بہت نزدیک رہا ہے۔ اس لیے اسے میرے کفن کے لیے سنبھال رکھا جائے۔

مکتوبات سے خیال ہوتا ہے کہ آپ کبھی کبھی رخصت لے کر سرہند تشریف لے جاتے اور مدتِ رخصت کے اختتام پر واپس تشریف لے آتے۔ خواجہ زادگان میں سے بھی کبھی کبھی کوئی ملشکر میں ساتھ ہوتا۔ ایک زمانہ میں فقط خواجہ محمد ہاشم کشمی ساتھ تھے اور وہ بھی سفرِ اجمیر کی صعوبتوں سے گھبرا گئے تھے (جلد سوم مکتوب ۸۲)

اب آپ کی عمر زیادہ ہو رہی تھی۔ سفر میں تکلیف ہوتی تھی۔ ضعفِ جسمانی غالب آ رہا تھا اور سمجھتے تھے کہ رحلت کا وقت قریب آ رہا ہے۔ چنانچہ بادشاہ سے اجازت ملی تو آپ سرہند تشریف لے گئے۔ جہاں پہنچ کر آپ نے خلوت اختیار کی۔ ان ایام میں کئی دفعہ آپ اپنی موت کا ذکر کرتے تھے۔ کئی دوستوں کے نام خط میں " استعفٰے دے چلے" کا فقرہ لکھا اور بعض کو تو بالصراحت بتایا کہ عمر کا اخیر ہے۔ اس دوران میں آپ پر دمے کا بڑا سخت حملہ ہوا۔ پھر طبیعت بحال ہو گئی لیکن آپ موت کا اکثر ذکر کرتے رہے۔ اس زمانے میں کثرت سے خیرات دی۔ کسی نے سمجھا کہ دفعِ بلیات کا صدقہ ہے۔ تو آپ نے ہندی کا یہ مصرع پڑھ کر حقیقتِ حال واضح کی ؎

آج ملاوا کنت سوں، سکھی، سب جگ ٹیواں وار

یعنی آج وصال کا دن ہے اے سکھی۔ میں اس خوشی پر تمام دنیا کو نثار کر دوں۔

تھوڑے ہی عرصے بعد موت کا پیغام آن پہنچا۔ اور آپ ۲۸ صفر ۱۰۳۴ سنہ ہجری

مطابق ۱۰ دسمبر ۱۶۲۴ء کو انتقال فرما گئے۔

کیا حضرت مجدد (اور تن تنہا حضرت مجدد) نے اکبری "الحاد" کا قلع قمع کیا؟

حضرت مجدد کی مذہبی خدمات پر تبصرہ کرنے سے پہلے اس سوال کا جواب دینا ضروری ہے کہ حضرت مجدد کا اکبری الحاد کے خاتمہ میں کس قدر حصہ تھا؟

آج سے تیس چالیس سال پہلے سوائے مجددیہ حضرات کے کوئی اہلِ علم اس امر کا قائل نہ تھا کہ حضرت نے عہدِ اکبری کی بد مذاہبی کا خاتمہ کیا۔ یہ صحیح ہے کہ روضۃ القیومیہ اور حضرت مجدد کی بعض سوانحمریوں میں، جو ان کی وفات کے بہت مدت بعد، ان کے غالی معتقدوں نے لکھیں۔ اس امر کا دعویٰ کیا گیا تھا۔ لیکن علمی حلقوں میں اس خوش اعتقادی کو اسی قدر اہمیت دی جاتی۔ جس قدر علاء الدین خلجی کے متعلق نظامی حضرات کے اس دعوے کو، کہ اس کی فتوحات سلطان المشائخ کی مرہونِ منت تھیں یا مغلوں کے متعلق شطاریوں کے اس بیان کو، کہ خاندان تیمور پر انھیں فتح حضرت غوث گوالیاری کی مدد سے ہوئی۔

حضرت مجدد کے متعلق ان کے بعد ہمارے بہترین علماء و صلحا مثلاً شاہ ولی اللہ شیخ نور الحق ابن شیخ عبد الحق محدث اور مرزا جانجاناں مظہر نے اپنے خیالات قلمبند کیے ہیں۔ اور یہ خیالات عقیدت مندانہ تھے، لیکن ان میں کسی نے حضرت مجدد کو اکبری الحاد کا قاطع قرار نہیں دیا۔ علمی حلقوں میں یہ دعویٰ سب سے پہلے آج سے تیس سال قبل، مولانا ابو الکلام آزاد نے کیا۔ انھوں نے تذکرہ میں لکھا ہے۔

> "شہنشاہ اکبر کے عہد کے اختتام اور عہدِ جہانگیری کے اوائل میں کیا ہندوستان علما و مشائخ حق سے بالکل خالی ہو گیا تھا؟ کیسے کیسے اکابر موجود تھے؟ لیکن مفاسدِ وقت کی اصلاح و تجدید کا معاملہ کسی سے بھی بن نہ آیا۔ صرف مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کا وجودِ گرامی ہی تن تنہا" اس کار دبار کا کفیل ہوا۔"
>
> (تذکرہ صفحہ ۲۳۸)

پھر فٹ نوٹ میں اس عبارت پر مزید اضافہ کیا:۔

"عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ ان (حضرت مجددؒ) کی تجدید محض سدِّ بدعات جہال صوفیہ و تحقیق بعض معارفِ تصوف و اعلان و اشتہار توحیدِ شہودی میں منحصر ہے۔ حالانکہ معاملہ اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔"

مولانا لکھتے ہیں کہ حضرت مجدد کے کاموں کی تفصیل کے لیے انھوں نے "متوسط تقطیع کے ۱۷۰۰ صفحوں پر سیرت حضرت مجدد لکھی۔ اس کتاب کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ لیکن مولانا نے تذکرہ میں جو ولولہ انگیز مبہم اشارے کیے تھے اور حضرت مجددؒ کے مقابلے میں جس طرح انھوں نے نام لے کر شیخ عبدالحق محدثؒ کی "لغزش" اور حضرت خواجہ باقی باللہ کی ناتمامی کا ذکر کیا۔ اس سے روضۃ القیومیہ اور اس قسم کے مبالغانہ مجددی تذکرہ نگاروں کے اس نظریہ کو بڑی تقویت ملی کہ اکبری دور کی خرابیوں کو دور کرنے والے حضرت مجددؒ اور "تنہا" حضرت مجددؒ تھے۔

اس کے بعد کسی مورخ نے اس مسئلے پر محققانہ نظر نہیں ڈالی اور چونکہ اقبال کے فلسفہ اور ہماری روحانی زندگی کے موجودہ رجحانات کی وجہ سے' تمام وہ حضرات جنھوں نے اخلاقی جرأت اور جلال شان دکھائی' خاص و عام میں مقبول ہیں۔ اس لیے مولانا ابوالکلام آزاد کے نقطہ منظر کی بڑی خوشی سے پیروی ہوئی' اور آج عوام الناس ہی نہیں' بلکہ اہلِ علم حضرات بھی اکبری الحاد کا قاطع فقط حضرت مجددؒ کو قرار دیتے ہیں۔ لیکن کئی قوی قیاسات اور شواہد ایسے ہیں' جن کی بنا پر ہمارا خیال ہے کہ حضرت مجددؒ کے متعلق یہ دعوے محلِ نظر ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلی قابلِ ذکر حقیقت یہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ یا شیخ عبدالحق محدث یا شیخ نورالحق جو حضرت مجددؒ کے ہمعصر یا قریب العہد تھے' وہ حضرت مجددؒ کو اکبری الحاد کا قاطع نہیں سمجھتے۔ وہ حضرت سرہندی کی دوسری خوبیوں اور کارناموں کا ذکر کرتے ہیں' لیکن ایک ایسا امر جو اگر امرِ واقعی ہو تو حضرت سرہندی کی دوسری سب خوبیوں سے اہم ہوگا۔ اس کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔

حضرت شاہ ولی اللہ نے حضرت مجدد کے رسالہ رد روافض کا عربی میں ترجمہ کیا ہے۔ اس ترجمے کے شروع میں عہد اکبری کے مذہبی رجحانات پر تبصرہ ہے۔ اور حضرت مجدد کے تمام احسانات و کارنامے ایک ایک کر کے تفصیل سے گنائے گئے ہیں۔ اس بحث میں شاہ صاحب نے رسالہ اثبات النبوت اور ان مکتوبات کا ذکر کیا ہے۔ جن کی بنا پر معتقدین، حضرت مجدد کو اکبری الحاد کا قاطع قرار دیتے ہیں، لیکن شاہ صاحب نے ان چیزوں کی جتنی اہمیت تھی وہ بتادی ہے۔ نہ زیادہ نہ کم۔ اور حضرت مجدد کے تمام کارنامے گنانے کے باوجود کہیں یہ نہیں کہا کہ انھوں نے اکبری الحاد کا قلع قمع کیا۔

یہی نہیں بلکہ حضرت مجدد کی وفات کے فوراً بعد دو مبسوط تذکرے ان کے خلفا نے لکھے۔ ایک (زبدۃ المقامات) ان کے صاحبزادوں کے ایما پر ان کے خلیفۂ اعظم خواجہ محمد ہاشم کشمی نے لکھا۔ دوسرا (حضرات القدس) مولانا بدرالدین سرہندی کی تصنیف ہے، جو آپ کے شاگرد اور خلیفہ تھے۔ سترہ برس آپ کی خدمت میں رہے۔ ان دونوں میں حضرت مجدد کے اس کارنامے کا کہیں ذکر نہیں۔

اگر حضرت مجدد نے واقعی اکبری بدمذہبی کا ازالہ کیا تو کیا یہ امر تعجب انگیز نہیں کہ یہ سب بزرگ اس مسئلہ میں خاموش ہیں۔ آخر انھیں آج کے مصنفین کی نسبت واقعات کو جاننے کا زیادہ موقع تھا۔

لیکن لطف یہ ہے کہ نہ صرف کوئی ہمعصر یا قریب العہد مستند عالم حضرت مجدد کے اس تجدیدی کارنامے کا ذکر نہیں کرتا، بلکہ ان کے زمانے کا سب سے بڑا عالم ان کی سخت مخالفت کرتا ہے۔ شیخ عبدالحق محدث کے اکبری بدمذہبی کی نسبت جو خیالات ہوں گے، ان کا اندازہ لگانا دشوار نہیں۔ ان کا تھوڑا بہت اظہار انھوں نے شیخ فرید کے نام ایک خط میں کیا ہے۔ فیضی ان کا بڑا قدر دان تھا۔ لیکن وہ اس کے اور اکبر کے مذہبی خیالات سے برگشتہ ہو کر فتح پور سیکری چھوڑ گئے۔ اب اگر کوئی شخص اس بدمذہبی کا ازالہ کرتا تو کیا شیخ عبدالحق محدث اس کے سامنے سر عقیدت نہ جھکاتے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ مکتوبات کے بعض اندراجات کی بنا پر حضرت مجدد کے مخالفین میں

پیش پیش تھے اور انھوں نے ایک مستقل رسالہ حضرت مجدد کے بعض بیانات کی تردید میں لکھا۔

جہانگیر اکبر کا جانشین تھا، لیکن اکبر کے مذہبی منصوبوں سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ابوالفضل کا وہ سخت مخالف تھا۔ تخت نشینی کے بعد اس نے جو احکام جاری کیے، ان سے شرع کا احترام ٹپکتا ہے۔ پرتگیز مشنری کہتے ہیں کہ اس نے احترام شرع کا وعدہ کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ الحاد کا مخالف ہوگا۔ اب اگر حضرت مجدد نے اکبری الحاد کا قلع قمع کیا تو کیا یہ امر عجیب نہیں کہ جہانگیر نہ صرف ان کے کارناموں سے ناواقف ہے اور ان کا خاص احترام نہیں کرتا، بلکہ اُلٹا انھیں قید کر لیتا ہے۔

جہانگیر نے حضرت مجدد کی طلبی اور قید کا واقعہ بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ حضرت کی حراست کی ایک وجہ ان کا غرور و تفاخر تھی۔ (یعنی غالباً یہ کہ انھوں نے سجدہ کورنش بار نہ کیا) اور دوسری وجہ یہ تھی کہ انھیں چند دن قید میں رکھنے سے ان کے خلاف جو عوام کی شورش تھی وہ ختم ہو جائے (شورش عوام فرو نشیند)۔ عوام کی اس شورش سے ہی اندازہ ہو سکتا ہے کہ معاصرین کی رائے حضرت مجدد کے متعلق کیا تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ کسی معاصرانہ اور مستند تاریخ یا تذکرہ میں اس امر کا ذکر نہیں کہ حضرت مجدد نے اکبری بدمذہبی کا قلع قمع کیا اور مولانا ابوالکلام آزاد کا وہ نظریہ جو تذکرہ سے اخذ کیا جاتا ہے، مستبعد بلکہ ناقابلِ قبول معلوم ہوتا ہے لیکن مولانا غالباً ان مکتوبات سے متاثر ہوئے ہیں، جن میں حضرت مجدد نے اکابرِ عہد کو شرع کے استحکام اور مذہب کی اُستواری کی تلقین کی ہے۔ اس لیے واقعات کو پرکھنے کے لیے ان مکتوبات پر نظر ڈالنی پڑے گی۔

ان مکتوبات کی نسبت ایک قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ اگر ان کی بنا پر یہ تسلیم کیا جائے کہ شیخ فرید، خانِ اعظم اور دوسرے اکابر کو حضرت مجدد کی یاد دہانی اور وعظ و تلقین کی وجہ سے حفاظتِ مذہب کا خیال پیدا ہوا۔ اور پھر انھوں نے اس امر کے لیے کوششیں

لیکن۔ تب بھی بہ نظرِ انصاف ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ وعظ و نصیحت آسان ہوتی ہے اور اس پر عمل پیرائی کہیں زیادہ مشکل[1]۔ اس وعظ و نصیحت کی وجہ سے ہمیں شیخ فرید اور دوسرے اکابر عہد کے ساتھ بے انصافی نہیں کرنی چاہیے جنھیں بادشاہ کو قائل کرنے میں جو عملی مشکلات تھیں ان کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان مکتوبات کے بغیر ہی مسلمان امراء کو اپنے فرض کا احساس تھا بلکہ جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں، ان مکتوبات کے لکھے جانے سے پہلے ہی اصل مراحل طے ہو گئے تھے اور اکبری الحاد کا قلع قمع ہو چکا تھا۔

ان مکتوبات میں سب سے زیادہ شیخ فرید کے نام ہیں۔ ہم شیخ فرید کے حالات ذرا تفصیل سے لکھ چکے ہیں اور ان کی نسبت مجدّد الف ثانی کے مرشد خواجہ باقی باللہ اور خود حضرت مجدّد کے جو عقیدت مندانہ خیالات تھے، وہ نقل کر چکے ہیں۔ حضرت خواجہ باقی باللہ کے ساتھ ان کا جو یگانگت کا رشتہ تھا، وہ بیان ہو چکا۔ اسے دیکھ کر کوئی با انصاف انسان نہیں کہے گا کہ شیخ فرید کو اسلام سے یا طریقۂ نقشبندیہ سے دلی لگاؤ نہ تھا۔ یا یہ کہ حضرت مجدّد کی یاد دہانی کے بغیر شیخ فرید کو اپنے فرائض کا خیال نہ ہوتا۔

لیکن حضرت مجدّد کے مکتوبات سے ہی خود اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ وہ اس وقت لکھے گئے جب اکبر کے ساتھ اس کی مذہبی بوالفضولیاں ختم ہو چکی

---

[1] حضرت مجدّد اس اہم فرق کو خوب سمجھتے تھے۔ خان جہاں کو ایک خط میں شرعِ مُبیں کی تابعداری اور دشمنانِ دین کی مخالفت کی تلقین کر کے لکھتے ہیں: "یہی خدمت جو اب آپ کر رہے ہیں۔ اگر اس کو شریعت کی بجا آوری کے ساتھ جمع کریں تو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا سا کام کریں گے۔ جس سے دین منور و معمور ہو جائے گا۔ ہم فقیر اگر سالوں تک اس عمل میں جان سے کوشش کریں۔ تب بھی آپ جیسے بہادروں کی گرد تک نہیں پہنچ سکتے۔" ایسا اظہارِ خیال کئی خطوط میں ہے۔

تھیں۔ جہانگیر مذہبی اُمور میں اکبر کا ہم خیال نہ تھا اور پرتگیز مشنری باکراہ تسلیم کرتے ہیں کہ جہانگیر نے تخت نشین ہونے سے پہلے اس امر کا وعدہ کیا تھا کہ وہ شعائرِ اسلامی کی پابندی کرے گا۔

یہ سب مرحلے طے ہو گئے ہیں، جہانگیر تخت نشین ہو چکا ہے اور وہ ابتدائی احکام جن میں ایک تعمیر مساجد کے متعلق ہے، جاری ہو چکے ہیں۔ اس وقت حضرت مجدد سرہند سے شیخ فرید کے نام خط لکھتے ہیں:۔

"امروز کہ نوید زوالِ مانع دولتِ اسلام وبشارت جلوسِ بادشاہِ اسلام بگوشِ خاص وعام رسید۔ اہلِ اسلام برخود لازم دانستند کہ ممد ومعاونِ بادشاہ باشند و بر تمدید شریعت و تقویتِ ملت دلالت نمائند"

اس کے بعد، بادشاہوں کو علماءِ سُو سے بچانے کی ضرورت کا ذکر کر کے لکھتے ہیں (ترجمہ)

"یہ فقیر بے سروسامان بھی چاہتا ہے کہ اپنے آپ کو اسلام کے مددگار گروہ میں داخل کرے (کہ خود را در جرگہ ممدانِ اسلام اندازد) اور اس بارے میں کوشش کرے من کثّر سواد قوم فھو منھم کے موافق ہو سکتا ہے کہ (آپ) اس فقیر کو ان بزرگوں کی جماعت میں داخل کر لیں۔ فقیر اپنے آپ کو اس بڑھیا کی طرح خیال کرتا ہے جو اپنا تھوڑا سا سُوت لے کر حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خریداروں میں شامل ہو گئی تھی۔

اس خط کے الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ جرگہ ممدانِ اسلام پہلے سے موجود تھا اور حضرت مجدد اپنے مقابلے میں دوسرے اہلِ دل مسلمانوں کے کام کی قدر و قیمت بھی سمجھتے تھے۔

مکاتیب کے متعلق یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ان میں بظاہر کوئی ایسا نہیں، جو حضرت مجدد نے حضرت خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں پہنچنے سے پہلے لکھا ہو۔ اور تذکرہ نگار بھی حضرت کا آغازِ ارشاد نقشبندی سلسلہ سے بیعت کے بعد شروع کرتے ہیں۔ مرشد کی زندگی میں بہرکیف حضرت مجدد کی حیثیت ثانوی تھی۔ اور

مرشد کی وفات کو دو سال نہ ہوئے تھے کہ اکبر مر گیا۔ اور جہانگیر تخت نشین ہوا۔ اس دوران میں آپ کے پیر بھائیوں سے اختلافات رونما ہوئے۔ اور آپ سرہند میں مقیم ہو گئے۔ اکبر کے طور طریقے یقیناً آپ کو ناپسند تھے۔ اور رسالہ اثبات النبوت معاصرانہ خیالات کی اصلاح کے لیے لکھا گیا، لیکن اس ایک رسالہ سے (جس کے فقط نا تمام مخطوطے ملتے ہیں اور جو بظاہر کبھی مکمل نہ ہوا)۔ اکبری خیالات کا کس طرح قلع قمع ہو سکتا تھا؟

مولانا ابوالکلام آزاد (اور عام مجددی تذکرہ نگاروں) کے بیان کا سب سے قابلِ افسوس پہلو یہ ہے کہ انھوں نے تمام صورتِ حالات کو ذہن میں رکھنے کی بجائے حضرت خواجہ باقی باللہ کے چند ارشادات سے، جو انھوں نے اپنے بلند مرتبہ مُرید کی تعریف میں کہے، مرشد کے کام کی اہمیت کو کم کرنا چاہا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں "اصحابِ طریقت میں حضرت خواجہ باقی باللہ جیسے عارفِ کامل خود دہلی میں بعہدِ اکبری مقیم رہے، لیکن وہ خود کہتے تھے کہ میں چراغ نہیں، چقماق ہوں۔ آگ نکال دوں گا۔ چراغ شیخ احمد سرہندی ہیں"۔ حضرت خواجہ کا کوئی بیان بدیں الفاظ خاص ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ لیکن حضرت کا طریقہ درویشی اور انتہائی مسکنت کا تھا۔ وہ شیخ عبدالحق محدث سے بھی اس طرح برتاؤ کرتے۔ گویا وہ اُستاد ہیں اور حضرت خواجہ شاگرد۔ حضرت مجدد کے تو وہ خاص طور پر قدر دان تھے۔ اور ان کی انھوں نے دل کھول کر تعریف کی۔ جس سے مجددی تذکرہ نگاروں اور مولانا ابوالکلام آزاد نے غلط نتائج اخذ کر لیے، لیکن صحیح صورتِ حالات جاننے کے لیے فقط حضرت خواجہ کے مدحیہ ارشادات پر انحصار نہیں کرنا چاہیے۔ حضرت مجدد کے ان بیانات کو بھی دیکھنا چاہیے، جو انھوں نے مبدا و معاد میں اور دوسری جگہ مرشد کے احسانات کا ذکر کرتے ہوئے لکھے۔ اور بالخصوص وہ مکاتیب ملحوظِ خاطر رہنے چاہئیں، جو انھوں نے حضرت خواجہ کو لکھے۔ یا مرشد نے بلند پایہ مرید کی اصلاح و ہدایت کے لیے تحریر کیے۔ ان کے مطالعہ کے بعد یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ان دونوں کے درمیان

مرشد اور سعادت مند مرید کا رشتہ تھا۔ حضرت مجدد کے خطوط خاص طور پر دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ اپنے مقاماتِ عروج کا ذکر کرتے ہیں۔ اور بار بار لکھتے ہیں کہ یہ سب آپ کا فیض ہے، ورنہ ع

من ہماں احمدِ پارینہ کہ ہستم ہستم!

حضرت مجددؒ کی مذہبی خدمات

مولانا ابوالکلام آزاد اور عام مجددی تذکرہ نگاروں نے جس طرح حضرت خواجہ باقی باللہ کے ساتھ بے انصافی کی ہے اور مفاسدِ وقت کی اصلاح کا کفیل تن تنہا" حضرت مجدد الف ثانی کو قرار دیا ہے۔ اس کی تصحیح کے لیے ہمیں مندرجہ بالا سطور لکھنی پڑیں، لیکن اس اختلاف سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اس ضمن میں ہمیں حضرت مجدد کے کام کی اہمیت سے انکار ہے۔ یا ان کے علوِ مرتبہ کے اعتراف میں ہم کسی سے پیچھے ہیں۔ (عبادت خانہ کی تلخ اور ناعاقبت اندیشانہ بحثوں نے جو ناگوار صورت اختیار کر لی، اور درباری خوشامدیوں اور علما سوء کی جدت طرازیوں نے جو انتشار پیدا کر دیا، اسے روکنے کے لیے متعدد مسلمان امرا و علما نے کوشش کی اور بعضوں نے بڑی قربانیاں دیں۔ اس کے کامیاب سدِ باب میں جن محبانِ اسلام نے اواخر عہدِ اکبری میں حصہ لیا ان میں مرکزی حیثیت حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ کی تھی، جن کے دست راست دو شخص تھے۔ امرا میں سے شیخ فرید اور اہلِ باطن میں شیخ احمد سرہندیؒ۔ موخر الذکر کا مرتبہ بہرکیف بلند ہے، لیکن معاملہ صرف ان خرابیوں کا نہ تھا جو عبادت خانہ اور دربارِ شاہی کی بحثوں سے پیدا ہوئی تھیں۔ اطرافِ ملک میں جن حقیقی مشکلوں سے مسلمان دوچار تھے، وہ ہندومت کی جارحانہ احیائیت کی پیدا کردہ تھیں۔ ان کا تو دارالخلافہ میں پورا احساس ہی نہ تھا۔ ان کی طرف حضرت مجدد نے توجہ دلائی۔ اُمرا و ارکینِ سلطنت کو ان کے فرائض یاد دلائے اور شعائرِ اسلام کی بجاآوری اور اسلام کی سربلندی پر زور دیا۔ لیکن حضرت مجدد کی کوششیں صرف مسلمانوں کے بااثر طبقے کو اپنے فرائض یاد دلانے اور امرا کے خیالات کی اصلاح تک محدود نہ تھیں

انھوں نے عامۃ المسلمین بلکہ جمہور علما اور صوفیہ کے خیالات کی بھی اصلاح کی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ عہد اکبری کی مذہبی بے اعتدالیوں کے خلاف جو رد عمل ہوا اور شرع و دین نے جو بتدریج دوبارہ فروغ حاصل کیا۔ اُسے حضرت مجدد کی دستر والا صفات سے بڑی تقویت ملی۔

حضرت مجدد کی ایک اہم اسلامی خدمت یہ ہے کہ آپ نے اس سلسلۂ تصوف کی اشاعت کی جو ہندوستانی طریقوں میں شریعت سے قریب ترین ہے۔ ہندوستان میں شروع ہی سے اسلام پر تصوف کا رنگ اس قدر چڑھا ہوا ہے کہ بیسویں صدی کے شروع تک کسی کو یہ خیال بھی نہ ہوتا تھا کہ کسی صوفیانہ سلسلے میں داخل ہوئے بغیر انسان اسلام کی برکات سے مستفید ہو سکتا ہے۔ ایسی حالت میں اسلام کی بڑی خدمت اسی میں تھی کہ ایک ایسے صوفیانہ سلسلے کو ترقی دی جائے جو بعض دوسرے سلسلوں کی طرح شرع سے آزاد نہ ہو۔ حضرت مجدد نے یہی کیا اور ہندوستان کے مشہور اور پرانے سلسلوں کو چھوڑ کر ایک ایسے طریق کی اشاعت کی، جس میں شرع اسلام کی پیروی پر بڑا زور ہے۔ جواہر مجددیہ کے مصنف لکھتے ہیں کہ "اس طریقے کے تمامی اصول اور فروع میں اتباع سنّتِ سنیہ اور اجتناب بدعتِ نامرضیہ بدرجۂ کمال ہے۔ یعنی اصحابِ کبار کا سا لباس مشروط ہے۔ انھی کی سی معاشرت، ویسے ہی کم ریاضتیں اور فیضانِ کثیر اور کمالاتِ ولایت کے علاوہ کمالاتِ نبوت کی بھی تعلیم ہے۔ نہ اس میں چلّہ کشی کی ضرورت ہے نہ ذکر بالجہر کی اجازت ہے۔ نہ سماع بالمزامیر ہے[1] نہ قبور پر روشنی۔ نہ غلاف و چادر اندازی۔ نہ ہجوم عورات۔ نہ سجدۂ تعظیمی نہ سر کا جھکانا۔ نہ بوسہ دینا۔ نہ توحیدِ وجودی و دعوئے انا الحق و ہمہ اوست۔ نہ مریدوں کو پیروں کی قدمبوسی کا حکم۔ نہ مرید عورتوں کی ان کے پیروں سے بے پردگی۔"[۲]

---

[1] یہ نہ سمجھا جائے کہ نقشبندیہ طریقے کی کسی بات پر اہلِ شرع یا دوسرے سلسلوں کے ماننے والے اعتراض نہیں کرتے۔ مثلاً تصورِ شیخ کے متعلق ترجمان القرآن بابت مئی ۱۹۵۱ء وغیرہ ملاحظہ ہو۔ اسی طرح بعض نقشبندی اشغال کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ یوگیوں میں بھی رائج ہیں

اس کے علاوہ نہ صرف آپ نے طریقت کا وہ سلسلہ اختیار کیا جس میں احکامِ شرعی کا سب سے زیادہ پاس تھا۔ اور اس سلسلے کو ترقی دی بلکہ طریقت کے مقابلے میں شرع کی اہمیت و ضح کر دی۔ آپ کے کئی ارشادات ایسے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ تعلیمِ دینی کو تعلیمِ سلوک پر مقدم رکھتے تھے اور صحابۂ کرام کو تمام اولیاء سے بزرگ تر مانتے تھے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ حال تابع شریعت ہے نہ شریعت تابع احوال جب آپ نے دیکھا کہ صوفیائے متقدمین کے کلام کی خلافِ شرع ترجمانیاں ہوتی ہیں تو اپنے مکتوبات میں تشریح اور تاویل کر کے انھیں شرع کے مطابق ثابت کیا۔ مشائخ متاخرین بعض خلافِ شرع امور کو روا رکھتے تھے۔ آپ فرماتے تھے کہ وہ لازم الاتباع نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ ایک قابل، عالم، شیخ طریقت تھے جو تاویل و تشریح سے اور مخالفِ شرع اقوال و احوال سے علٰحدگی اختیار کر کے تصوف کو احکام شرعی کی حدود میں لے آئے۔ اس سے تصوف کی بنیادیں زیادہ مستحکم ہوئیں اور طریقت و شریعت کے اختلافات بھی کم ہوئے۔

آپ نے عقیدۂ وحدت الوجود کی نئی توجیہ کی اور وحدت الشہود کا نظریہ قائم کر کے مسلمان صوفیاء اور علماء کے اختلافات رفع کر دیے۔ آپ خود ایک طویل مدت تک وحدت الوجود کی منزل میں سرگرداں رہے تھے (ملاحظہ ہو دفترِ اول مکتوب[۳۱]) لیکن عالم اور محبِ شرع ہونے کی وجہ سے اس اختلاف سے بھی واقف تھے، جو وحدت الوجود کی بعض ترجمانیوں سے اہلِ شرع کو تھا۔ چنانچہ آپ نے مکتوبات میں اس گتھی کو سلجھایا۔ آپ کا قول ہے کہ مقامِ وحدت الوجود سالک کو ابتدائے سلوک میں

لے لیکن آپ بنیادی طور پر ایک شیخِ طریقت تھے۔ آپ کے ہاں "کشف و شہود" کی افراط ہے۔ اور بعض جگہ اپنے طریقِ کار کو علماء کے طریقِ کار سے جو "نظر و استدلال" پر مبنی ہے، مختلف بتلایا ہے۔ (مثلاً ملاحظہ ہو دفترِ دوم مکتوب ۴۲)

پیش آتا ہے، جس سے اسے گزر جانا چاہیئے اور جو شخص اس سے بالاتر مقام پر عروج کرتا ہے، اس پر مقام وحدت الشہود منکشف ہوتا ہے، جو شرع کے عین مطابق ہے۔

شرع کی حمایت اور ترجمانی کے علاوہ آپ کا ایک بڑا کام ردِّ بدعت تھا۔ نئے فرقوں اور نئے طریقوں سے نہ صرف دین میں رخنے پیدا ہوتے تھے بلکہ اسلامیانِ ہند کے اجتماعی نظام میں بھی انتشار پیدا ہوتا تھا۔ آپ نے ردِّ بدعت کی پوری کوشش کی۔ جن نئے فرقوں سے قومی نظام میں خلل کا اندیشہ تھا۔ ان کی ہر طرح مخالفت کی۔ اس زمانے میں صفویوں کی وجہ سے شیعیت ایران میں عروج پر آئی۔ اور چونکہ ایران سے عہدِ مغلیہ میں گہرے روابط قائم ہو گئے تھے۔ ہندوستان میں بھی شیعہ اثرات بڑھنے لگے۔ آپ نے انھیں روکنے کے لیے زبان اور قلم سے کام لیا۔ امرا و سلاطین کی محفلوں میں اس کی مخالفت کی۔ شیعہ خیالات کی تردید میں ایک پُرزور رسالہ لکھا۔ جب کہیں شیعہ طریقوں کو فروغ پاتا دیکھتے۔ ذمہ دار حضرات کو ان کے خطرات سے آگاہ کرتے۔ مہدویت کی بھی آپ نے مخالفت کی اور تصوف میں بھی بدعتوں کے خلاف آواز اٹھائی۔

شرع کی ترویج۔ طریقۂ نقشبندیہ کی اشاعت۔ شریعت اور طریقت کی تطبیق اور بدعت کی مخالفت کے علاوہ شیخ مجددؒ نے جو اہم کام کیا۔ وہ اسلام کا عام احیاء تھا۔ اس زمانے میں جب ایک طرف اکبر کے "صلح کل" طریقے نے اسلام کو اُس حمایت و دین پناہی سے محروم کر دیا تھا، جو اسلامی حکومت کی ابتدا سے اُسے حاصل تھی۔ اور

لہ آپ کے رسالہ ردِّ روافض کا جو نسخہ خانقاہ سراجیہ کندیاں شریف میں ہے، اس میں امیر خسروؔ کی متعدد ابیات بدیں مضمون نقل کی ہیں (۱۴) کہ ہندوستان میں اسلام کو رونق اور یکجہتی حاصل ہے اور لکھا ہے کہ تمام سکان آں از اہلِ اسلام بر عقیدۂ حقیۂ اہلِ سنت و جماعت اند۔ و نشانے از اہلِ بدعت و ضلالت درآں دیار پیدا نیست"۔ لیکن اب شیعوں کی آمد سے یہ فضیلت و یکجہتی جاتی رہی ہے۔

دوسری طرف ہندو احیائیت نے مسلمانوں کے لیے (جیسا کہ ہم تفصیل سے آگے چل کر بتائیں گے) طرح طرح کی مشکلات پیدا کر دی تھیں۔ آپ نے شعائرِ اسلام کے احترام پر زور دیا۔ امراء و ارکینِ سلطنت کو اس کی تلقین کی۔ خود اپنی زندگی میں اسلامی نقطۂ نظر کے احترام کی بڑی جرأتمندانہ مثال قائم کی۔ آپ نے جہانگیر کے سامنے سجدہ نہ کر کے قید و بند کی سختیاں جھیلیں اور اپنی جرأت اور احترامِ دین سے خلافِ شرع احکام کی عملی مخالفت کی۔ آپ کی اس نیک مثال نے لوگوں کو جرأت دلائی، جو دبے بیٹھے تھے وہ دلیر ہو گئے۔ حکمران طبقے میں جو اسلام پسند گروہ تھا، اسے تقویت ملی۔ اور جو غیر اسلامی آداب و رسوم دربارِ شاہی میں عجمی ملوکیت کی تقلید میں یا ہندو اثرات کی وجہ سے رائج ہو گئی تھیں، ان کے ازالے کا سامان ہوا۔ اور شعائرِ اسلامی کے احترام کا پھر سے خیال کیا جانے لگا۔[1]

حضرت مجدد نے خود احیاءِ اسلام کی کوشش کی اور اس کے علاوہ ایک ایسا وسیع نظام قائم کر دیا۔ جس سے آپ کے مقاصد کی تکمیل ہوئی۔ آپ کے صدہا خلفا تھے، جو ہندوستان کے کونے کونے میں، بلکہ ہندوستان سے باہر بھی آپ کے خیالات کی اشاعت کر رہے تھے۔ آپ کے بعد آپ کے فرزندانِ ارجمند نے آپ کا کام جاری رکھا۔ آج بھی آپ کے سلسلے کا فیض جاری ہے اور نقشبندیہ مجددیہ سلسلے میں

---

[1] بعض تذکرہ نگاروں کا یہ خیال، کہ جہانگیر حضرت کا مرید ہو گیا تھا اور اُس نے آپ کے حسب الحکم تمام شرعی احکام جاری کرائے، قابلِ قبول نہیں۔ شیخ مجدد کے ان مکتوبات سے جو آخری سالوں میں لکھے گئے، یہ خیال ہوتا ہے کہ آپ اس زمانے کے حالات سے بھی مایوس تھے اور شاید سمجھتے تھے کہ ظہورِ قیامت کا زمانہ قریب ہے۔ ایک خط میں صاحبزادگان کو لکھتے ہیں "قیامت قریب ہے اور ظلمتوں کی گھٹائیں چھا رہی ہیں۔ کہاں خیریت اور کہاں نورانیت۔ شاید حضرت مہدی علیہ الرضوان خلافتِ ظاہری کی تائید پا کر اس کو رواج دیں گے"۔ (دفتر سوم مکتوب ۱۰۱) اسی زمانے کا ایک اور خط ہے "... یہی باعث ہے کہ ہزار سال کے بعد اندھیرا غالب آ گیا ہے اور سنت و اسلام کا نور ماند پڑ گیا ہے" (دفتر سوم مکتوب ۹۶)

اتباعِ شریعت اور ترویجِ سُنّت کا جوش دُوسرے سلسلوں سے زیادہ ہے[۱]۔
نقشبندیہ (مجددیہ) سلسلہ کے کامیاب طریقۂ اشاعت اور اس سلسلے کے مشائخ
کبیر کے خلفا کی کثرت کا ایک مُبارک نتیجہ یہ ہُوا کہ ملک کے سارے حصّوں میں اہلِ ذوق
اس سے مُنسلک ہو گئے اور ایک روحانی یکسانیت اور تنظیم کے آثار نمایاں ہوئے۔
نظامی سلسلے کی اشاعت کے بعد (شطاری سلسلے کو چھوڑ کر جس نے قوم کے مرکزی روحانی
نظام میں جگہ حاصل نہ کی) یہ غالباً پہلا موقعہ تھا کہ سارے ملک میں ایک رُوحانی نظام
نے اقتدار حاصل کر لیا۔ بنگال میں حضرت مجدّد الف ثانی کے محبوب خلیفہ شیخ حمید
دانشمند بنگالی ارشاد و ہدایت کے بڑے مرکز تھے۔ سندھ میں ان کے پوتے شیخ
سیف الدینؒ کے ایک خلیفہ مخدوم ابوالقاسم نے اس طریقہ کی اشاعت کی اور
ان کی کوششوں کو خدا نے اس طرح مقبولیت دی کہ اب اس علاقے میں یہ سلسلہ
اگر سہروردی اور قادری سلسلوں[۲] پر غالب نہیں تو ان سے کسی طرح پیچھے بھی نہیں۔

---

[۱] اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ دوسرے سلسلے اتباعِ شریعت سے عاری تھے۔ یا ان کی جو
خاص خوبیاں تھیں، ان کی رُوحانی اور اخلاقی سربلندی کے لیے ضرورت نہ تھی۔ بلکہ بسا اوقات تو خیال ہوتا
ہے کہ اگرچہ بعض دوسرے سلسلوں (مثلاً چشتیہ) میں ظواہر شرعی کی پابندی پر اتنا زور نہیں، لیکن ان کی مستند
کتابیں پڑھیں تو جتنا زور باطنی اصلاح اور اخلاقی پاکیزگی پر ان میں نظر آتا ہے، سلسلۂ مجددیہ کی کتابوں میں
نہیں ملتا۔ مثلاً اگرچہ فوائد الفواد میں وہ معارفِ عالیہ اور علمی مسائل نہیں جو طریقۂ مجددیہ کے شاہکاروں میں
ہیں لیکن اخلاقی پاکیزگی اور سربلندی پر جو جگہ جگہ زور دیا گیا ہے (خواہ وہ حضرت بایزید بسطامی کے یہودی
دوست کے بیانات کو دُہرا کر ہو۔ یا لاہور کی تباہی کو وہاں کے تاجروں کے ضعفِ دیانت سے متعلق کر کے ہو)
مجددیہ سلسلے کی کتابوں میں (اس موثر انداز سے اور اس تکرار کے ساتھ) شاید ہی ملے اور قومی اور
انفرادی بلندی کے لیے اس کی بھی بڑی ضرورت ہے، بلکہ حاصل سلوک تہذیب الاخلاق کی اصل
تشریح ہے۔ [۲] سندھ پر پرانے بااثر سلسلے یہی دو تھے۔ چشتیہ سلسلے کو سندھ میں کبھی فروغ
نہیں ہُوا۔ (تکملہ مقالات الشعراء ص ۱۸۴)

مخدوم صاحب کو مرشد نے نور الحق کا خطاب دیا تھا، لیکن چونکہ اس سلسلے میں نقشبندی سلسلے کی اصل اشاعت انھوں نے کی اس لیے سندھ میں انھیں حضرت نقشبندی صاحب کہا جاتا ہے۔ ان سے پہلے مخدوم آدم صاحب بھی نقشبندی سلسلے میں منسلک تھے اور مخدوم ابو القاسم نے سرہند جانے سے پہلے ان سے کسب فیض بھی کیا، لیکن مخدوم آدم سے سلسلہ بہت چلا نہیں اور مخدوم ابو القاسم کے پاس تو لوگ ٹھٹ کے ٹھٹ آنے لگے۔ اور نقشبندیہ سلسلہ نے اس ملک میں جڑ پکڑ لی۔ آپ کے عقیدتمندوں میں سورت اور دوسرے علاقوں کے لوگ بھی تھے، لیکن آپ کا اصل کام سندھ میں نقشبندیہ سلسلے کی اشاعت ہے۔ آپ کے ماننے والوں میں "حضرت عمدۃ العلماء الربانیۃ وقدوۃ المفسرین والمحدثین مخدوم محمد معین" سندھی ہیں، جنھوں نے شاہ ولی اللہ سے درس حدیث حاصل کیا، بلکہ تکملہ مقالات الشعرا میں مخدوم خلیل تتوی نقشبندی لکھتے ہیں کہ جب مخدوم محمد معین نے مخدوم ابو القاسم کی تعریف میں رسالہ لکھنا چاہا تو انھوں نے اجازت نہ دی۔ مخدوم ابو القاسم کی وفات ۱۱۳۸ھ میں ہوئی۔[1]

سابق پنجاب اور افغان علاقے میں تو مجددی سلسلہ کو اس سے بھی بڑھ کر فروغ ہوا۔ اس کا زور دار آغاز حضرت مجدد کی زندگی میں ہی ہو گیا تھا، لیکن آپ کے صاحبزادے خواجہ محمد معصوم اور خلیفہ شیخ آدم بنوری نے کام کو بڑی وسعت دی۔ جنوب میں برہان پور مجددیہ نقشبندیہ طریقے کا ایک بڑا مرکز تھا، جس کی سربراہی میر محمد نعمان اور خواجہ ہاشم کشمی جیسے بزرگوں نے کی۔ غرضیکہ تمام ملک میں ایک منظم طریقے سے سلسلہ مجددیہ نقشبندیہ چھایا ہوا تھا۔

جو اثرات حضرت مجدد الف ثانی کی بدولت اسلامی ہندوستان میں عام ہوئے، انھی کا فیض یہاں کی سرحدوں سے گزر کر باقی عالم اسلام کو پہنچا۔ ہم لکھ چکے ہیں کہ حضرت خواجہ باقی باللہ کے قدیمی خلیفہ تاج الدین سنبھلی نقشبندیہ طریقہ لے کر حجاز پہنچے اور وہاں کثرت سے اس سلسلے کی اشاعت کی، لیکن شیخ تاج الدین کا طریقہ تھا

---

[1] تکملہ مقالات الشعرا صفحہ ۱۸۵

نقشبندیہ باقویہ۔ اس میں جمالی رنگ زیادہ نمایاں تھا۔ اور اصل زور تزکیۂ نفس اور اصلاحِ حال پر تھا۔ سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ میں جلالی شان غالب تھی۔ اس کا طریقِ کار احیائی تھا۔ اس کی اشاعت کا ایک اہم ذریعہ مکتوباتِ امام ربانی تھے، جن کا جلد ہی عربی میں ترجمہ ہو گیا۔ اور دوسرا ذریعہ خلفا و مرید۔ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی سبحۃ المرجان میں حضرت مجدد کی نسبت لکھتے ہیں: "سلسلہ اُن کا ہند سے ماوراء النہر اور روم، شام و عرب تک پہنچا۔ تصنیفات میں ان کی مکتوبات تین جلدوں میں ہیں .... میں نے سنا ہے کہ بعض علماء نے ان کے مکتوبات کا عربی میں ترجمہ کیا ہے۔ اگرچہ میں نے یہ عربی ترجمہ نہیں دیکھا۔" حضرت خواجہ باقی باللہ خود کابل کے رہنے والے تھے اور انھوں نے تعلیم ماوراء النہر میں پائی تھی۔ اس لیے ان کے خلیفۂ اعظم کے طریقِ کار کی افغانستان اور ترکستان میں اشاعت قدرتی تھی۔ چنانچہ ان کے ماننے والے ان علاقوں میں بہت ہیں۔ مثلاً موجودہ افغانستان کے سب سے بڑے روحانی بزرگ حضرت نور المشائخ اسی سلسلے سے متعلق ہیں۔ حجاز اور خلافتِ عثمانیہ میں اس سلسلے کی اشاعت کو حضرت مجدد کے صاحبزادے خواجہ محمد معصومؒ کے سفرِ حج سے بہت تقویت حاصل ہوئی ہوگی۔ لیکن خلافتِ عثمانیہ میں طریقۂ مجددیہ کی سب سے وسیع اشاعت انیسویں صدی میں ہوئی۔ جب حضرت خالد کردیؒ نے دہلی میں ایک سال رہ کر شاہ غلام علی قدس سرہ سے یہ طریقہ اخذ کیا۔ اور واپس جا کر عراق، شام، اناطولیہ میں اس کی بڑے زور اور کامیابی سے اشاعت کی۔ حضرت خالد کردیؒ خلافتِ عثمانیہ کے آخری دور کے بہت بڑے بزرگ تھے اور انھوں نے (اہلِ شرع کی مدد سے) طریقہ نقشبندیہ مجددیہ کو سلطنت کا سب سے بااثر صوفی طریقہ بنا دیا۔

خاص طریقہ نقشبندیہ مجددیہ کی اشاعت کے علاوہ حضرت مجدد کی تعلیمات عام ہونے کا ایک بڑا نتیجہ احیائی اور شرعی رنگ کا غلبہ تھا جو آہستہ آہستہ عالمِ اسلام میں ظاہر ہوا۔ اس میں متعدد اثرات کو دخل تھا اور ابھی اس مسئلے میں مزید تحقیق کی ضرورت ہے، لیکن بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ احیائی رنگ کی مقبولیت اور وہابی

تحریک کے لیے مختلف اسلامی علاقوں میں زمین کو ہموار کرنے میں شیخ احمد سرہندی کی تجدیدی تحریک کا بڑا دخل تھا۔

صوفیانہ احوال اور نظریہ قیومیت

حضرت مجدد الف ثانی کی مذہبی خدمات مسلمہ ہیں۔ لیکن ان کے مخالفوں اور نکتہ چینوں کی بھی کمی نہیں اور ان میں بڑے بڑے متقی پرہیزگار اور قابلِ عزت بزرگ شامل ہیں۔ ان کی اپنی زندگی ہی میں مکتوبات کی وجہ سے علماء نے ان کے خلاف جہانگیر کے پاس شکایت کی تھی اور ان کے معترضوں میں شیخ عبد الحق محدث جیسے فاضل اور دیندار بزرگ[۱] تھے، لیکن یہ سلسلہ اس پر ختم نہیں ہوا۔ ان کے بعد بھی کئی اور بزرگوں نے مکتوبات کے اندراجات اور مجددی بزرگوں کے دعاوی پر اعتراض کیے ہیں اور حضرت مجدد کے مشہور معتقدوں نے ان اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ مرزا مظہر جانجاناں کے کئی خطوط ان شبہات کے ازالہ کے لیے لکھے گئے۔ اور شاہ ولی اللہؒ کا ایک اہم خط بھی جو انھوں نے اپنے ایک عزیز نیازمند خواجہ محمد امین کی تشفی کے لیے لکھا۔ اسی مسئلے کے متعلق ہے۔

صوفیہ کے اختلاف تو ایک حد تک حضرت سرہندی کے نظریۂ وحدت الشہود

---

[۱] مکتوبات کے بعض اندراجات پر عہدِ عالمگیری میں بھی اعتراض ہوئے تھے، بلکہ عالمگیر کی طرف سے بعض ایسے خط حضرت قیوم ثالث وغیرہ کو لکھے گئے جنھیں مجددی حضرات جعلی بتاتے تھے اور جن میں لکھا تھا کہ حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات کی بعض عبارتیں بظاہر خلافِ شرع ہیں اور تمام علماء نے متفق ہو کر اس بات کا فتویٰ دیا ہے کہ مکتوبات کا پڑھنا بند کر دیا جائے۔ چنانچہ عہدِ عالمگیری میں علماء کا ایک محضر بھی بلایا گیا جس میں مکتوبات پر بحث ہوئی۔ (روضۃ القیومیہ رکن سوم صفحہ ۲۳، ۴۰۰)

معارج الولایت میں قاضی شیخ الاسلام کا وہ مراسلہ درج ہے۔ جس میں اورنگ زیب کے حسب الحکم مکتوبات کا پڑھنا بند کر دیا گیا تھا۔ اس لیے یہ خط جعلی نہ تھے۔ لیکن عالمگیر اس کے بعد بھی سلسلۂ مجددیہ کا بڑا معتقد نظر آتا ہے۔ جیسا کہ خواجہ نقشبند ثانی کے خطوط سے ظاہر ہے۔

کی وجہ سے ہے، جس کی مدد سے آپ نے ابن العربی کے نظریۂ وحدت الوجود کو اسلامی عقائد سے تطبیق دینے کی کوشش کی۔ لیکن علما کو زیادہ اعتراض ان دعووں پر ہے جو آپ کے بعض واقعات اور احوال سے اخذ ہوتے ہیں۔ ہم مکتوب یازدہم کی اس عبارت کو نقل کر چکے ہیں۔ جس کی بنا پر عہدِ جہانگیری میں شور و غوغا بلند ہوا تھا اور جس کی تشریح و توضیح حضرت سرہندی نے کئی جگہ کی ہے۔ لیکن معترضین اس عبارت کے علاوہ اور بھی کئی اندراجات کی شکایت کرتے ہیں۔ خواجہ محمد امین نے مکتوبات کی اس عبارت کی توضیح چاہی تھی، جس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ (استغفر اللہ) رسولِ اکرمؐ اپنی وفات سے ایک ہزار سال بعد ایک فردِ امت (حضرت مجدد) کی وجہ سے مقامِ خلیل سے مستجاب ہوئے۔

شاہ صاحب لکھتے ہیں:۔

"بلادر عزیز القدر خواجہ محمد امین اکرمہ تعالیٰ بشہودہ سوال کردہ بودند کہ حضرت شیخ مجدد قدس اللہ تعالیٰ سرہ العزیز در مکتوب نود و چہارم از جلد ثالث وغیر آں نیز تصریح کردہ اند۔ بآنکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم را بعد ہزار سال بواسطہ بعض افرادِ امت مقامِ خلت حاصل شد و دعائے اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ مستجاب گشت۔ و باشارہ مفہوم میگردد کہ مراد ازاں فرد ذاتِ حضرت مجدد است وایں مقدمہ بظاہر مورد اشکالات کثیرہ است۔ ازاں جملہ آنکہ توسط فردے از افرادِ امت در حصولِ مقامِ خلت کہ از اعلیٰ مقامات است مستلزم فضل او بر ذاتِ حضرت خاتم الانبیا ست علیہ الصلوٰت والتسلیمات۔

حضرت مجدد نے اس خیال کا اظہار تیسری جلد میں ہی نہیں، بلکہ دوسری جلد کے چھٹے مکتوب میں بھی کیا تھا اور ان کی زندگی میں ہی پڑھنے والوں کو عجیب معلوم ہوا تھا۔ ان کے مشہور خلیفہ اور سوانح نگار ہاشم کشمی نے اس کی توضیح چاہی تھی اور اسی جلد کے ستانویں (۹۷) مکتوب میں حضرت مجدد نے جواب لکھا تھا "آپنے پوچھا تھا کہ اس عبارت کے کیا معنی ہیں، جو چھٹے مکتوب میں واقع ہے کہ میں خیال کرتا ہوں کہ

میری پیدائش سے مقصود یہ ہے کہ ولایت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم، ولایت ابراہیمی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے رنگ میں رنگی جائے اور ولایتِ محمدی کا حسنِ ملاحت، ولایت ابراہیمی کے جمالِ صباحت کے ساتھ مل جائے اور اس انصباغ اور امتزاج سے محبوبیت محمدیہ کا مقام ورجہ بلند تک پہنچ جائے۔" اپنے دعوے کے جواز میں حضرت مجدد نے کہا تھا: "وہ انتفاع و استفادہ جو صاحب دولتوں کو غلاموں اور خادموں کی جہت سے میسر ہوتا ہے۔ کوئی ممنوع و محذور نہیں اور نہ ہی اس میں ان کا کسی قسم کا قصور و نقصان ہے، بلکہ صاحب دولتوں کا کمال غلاموں اور خادموں کی خدمت ہی میں ہے۔"

شاہ ولی اللہؒ نے زیادہ ملائم اور قابلِ فہم طریقے سے اس کی تاویل کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"غرضِ شیخ اثباتِ اصل خلقت است آنحضرت را صلی اللہ علیہ وسلم در اوّل امر بتوسط و اثبات خود در فیضانِ خلقت بر بنی آدم بآں معنی کہ بتوسطِ او بعد ہزار سال مرہائی حصہ ازاں خلقت یافتند۔"

اس طرح کے کئی اندراجات، حضرت مجدد کی تصانیف اور سوانح میں ملتے ہیں، جنھیں بغیر تشریح و تاویل کے قبول کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اور جن کی نسبت خود انھوں نے کہا: "مخدوما۔ ہر کہ ایں قسم سخناں نوشتہ است۔ منشاء آں سُکر است۔ و بے مزیجِ سُکر دریں باب دست بقلم نبردہ۔"

واقعہ یہ ہے کہ صوفیوں کے احوال و مقامات کا عجیب معاملہ ہے۔ یہ بزرگ صبح و شام اُن خیالات میں مستغرق رہتے ہیں۔ جن سے عوام کو برائے نام دلچسپی ہوتی ہے۔ وہ غذا فقط اتنی کھاتے ہیں، جس سے جان سلامت رہے۔ زیادہ وقت تنہائی و خلوت اور ذکر و فکر میں گزرتا ہے۔ مراقبے اور دُوسرے اشغال اتنے سخت ہوتے کہ دل و دماغ پہ ایک خاص رنگ غالب آجاتا ہے۔ نفسیات کا اصول ہے کہ جو دھن سر پہ سوار ہو، وہی عالمِ خواب یا عالمِ انجذاب میں نظر آجاتی ہے۔ چنانچہ انھیں بھی جذب و بے خودی یا واقعات کے عالم میں ایسی ایسی باتیں نظر آتی ہیں کہ عوام، جن کی

دُنیا ہی ان سے مختلف ہوتی ہے، سمجھ نہیں سکتے اور معترض ہوتے ہیں۔ لیکن ان سے انکار کرنا، جب تک کہ صاحبِ احوال ہی اس انکار کا مستحق ہو صحیح نہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ تمام محتاط صوفیہ ان احوال کو، جو شرع اور عقل کے موافق نہ ہوں اور جن کی مناسب تاویل نہ ہو سکے، فاسد سمجھتے ہیں۔ مُرشد کو ان احوال کا من وعن بتانا ضروری ہے تاکہ وہ اس بات سے واقف رہے کہ مرید کے دل و دماغ پر کونسا رنگ غالب ہے اور اس کے تحت الشعور کا کیا حال ہے، لیکن اس سے زیادہ ان کی اہمیت نہیں۔

حضرت مجدّد بھی اس نکتے سے خوب واقف تھے اور انھوں نے کئی خطوط میں ان احوال پر بھروسا نہ کرنے کی تلقین کی ہے۔ ایک خط (جلد اوّل شمار ۲۰۷) میں مرزا حسام الدین کو لکھتے ہیں :۔

> صوفیوں کی بیہودہ باتوں سے کیا حاصل ہوتا ہے۔ اور ان کے احوال سے کیا بڑھتا ہے "وہاں" وجد و حال جب تک شرع کی میزان پر نہ تولیں سیم جلیل سے نہیں خریدتے اور کشف اور الہاموں کو جب تک کتاب و سُنّت کی کسوٹی پر نہ پرکھ لیں۔ نیم جَو کے برابر پسند نہیں کرتے "

شیخ حمید بنگالی کے نام ایک خط (جلد اوّل ۲۲۱) میں تفصیل سے ان غلط فہمیوں کی تشریح و اصلاح کی کوشش کی ہے، جو مقاماتِ عروج میں اپنی فضیلت کے متعلق پیدا ہو جاتی ہیں، اس میں اپنی نسبت لکھتے ہیں کہ مَیں "توبہ و استغفار و انابت سے التجا کرتا تھا اور عاجزی و زاری سے دُعا کرتا تھا کہ اس قسم کے کشف ظاہر نہ ہوں اور اہلِ سُنّت و جماعت کے معتقدات کے خلاف سر مو منکشف نہ ہو" حضرت مجدّد اس نکتے کو خوب سمجھتے تھے۔ کہ اگر احوال اور غیر معمولی نفسیاتی مشاہدات کو اہمیت دی جائے تو چونکہ ہر ایک انسان کے مشاہدات مختلف ہوتے ہیں، اس لیے ہر ایک اپنے ہی مشاہدات کو حق ملنے گا اور شرع و سُنّت کی پیروی کی ضرورت نہ سمجھے گا، جس سے رُوحانی اور مذہبی معاملات میں بڑی بدنظمی پیدا ہو گی۔ اس کی ایک دلچسپ مثال ان کے اپنے مکتوبات میں ہی ملتی ہے (جلد اوّل شمارہ ۲۷۳) ان کے نامور خلیفہ میر محمد نعمان اور

بعض دوسرے بزرگوں نے خواب میں دیکھا تھا کہ رسولِ اکرم مجلسِ مولود خوانی کے انعقاد سے خوش ہیں۔ چنانچہ وہ انھیں ترک کرنا نہ چاہتے تھے۔ حضرت مجددؒ اس بارے میں مرزا حسام الدین احمد کو لکھتے ہیں :۔

"آپ نے لکھا تھا کہ اگر سماع کے منع ہونے کا مبالغہ مولود کے منع ہونے کو بھی شامل ہے جو نعتیہ قصیدوں اور غیر نعتیہ شعروں کے پڑھنے سے مراد ہے تو برادرِ عزیز میر محمد نعمان اور بعض اس جگہ کے یار جنہوں نے واقعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ اس مجلس مولود خوانی سے بہت خوش ہیں۔ ان پر مولود کا سننا اور ترک کرنا بہت مشکل ہے۔

میرے مخدوم! اگر واقعات کا کچھ اعتبار ہوتا اور منامات اور خوابوں کا کچھ بھروسا ہوتا تو مریدوں کو پیروں کی حاجت نہ رہتی۔ اور طریق میں سے کسی ایک طریقے کا لازم پکڑنا عبث معلوم ہوتا کیونکہ ہر ایک مرید اپنے واقعات کے موافق عمل کر لیتا اور اپنی خوابوں کے مطابق زندگی بسر کر لیتا.... اس طرح سلسلہ پیری و مریدی کا درہم برہم ہو جاتا اور ہر بوالہوس اپنی وضع پر مستقل اور برقرار ہو جاتا ہے"

یہ خیال کرنے کی قطعاً کوئی وجہ نہیں کہ جن احوال و مقامات کا ذکر حضرت مجددؒ کے مکتوبات میں ہے وہ انہیں پیش نہ آئے تھے، جو شخص ٹھنڈے دل سے ان کی تصانیف اور حالات پر نظر کرے گا، وہ ان کی بزرگی، علم و فضل اور راست گوئی کا قائل ہو جائے گا۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ ان مقامات کو بڑی اہمیت نہیں دی جا سکتی اور نہ ہی ان کی نسبت کہا جا سکتا ہے کہ ان میں غلطی کا امکان نہ تھا (شیخ عبدالحق محدثؒ نے تو بعض کا شرع اور سلوک کی رُو سے انکار کر کے یہاں تک لکھا ہے "ظاہر آن است کہ شما دغا خوردہ اید"[1]) لیکن اس سے اس مقام میں کمی نہیں ہوتی۔ جو حضرت مجددؒ کو ہماری رُوحانی، دینی اور سیاسی تاریخ میں حاصل ہے۔ ان کی بزرگی ان کے کاموں میں، ان کی تعلیمات میں، ان کے کردار میں اور ان کی بلند پایہ تصانیف میں ہے۔ ان

---

[1] حیاتِ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۳۲۵

مقامات اور احوال میں نہیں، جن پر وہ خود اعتماد نہ کرتے تھے اور اعتماد نہ کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ افسوس ہے کہ ان کے عقیدت مندوں نے بالعموم یہ نکتہ نہیں سمجھا۔ ان کی تعلیمات کو ترتیب دے کر پوری طرح سمجھنے کی کوشش نہیں ہوئی۔ ان کے حالاتِ زندگی بھی صحیح طور پر مرتب نہیں ہوئے۔ زیادہ تر توجہ ان کے مقامات و احوال پر رہی ہے۔ اور خود بھی ماشاء اللہ مجددیوں نے اپنی طرف سے ایسے واقعات کا اشتہار دیا ہے کہ عقل حیران ہوتی ہے اور خیال آتا ہے کہ اگر ان بزرگوں نے پرانے صوفیوں کی بعض غلطیوں کی اصلاح کی ہے تو کیا انھوں نے مبتدیوں اور خوش اعتقادوں کو الجھانے کا اس سے زیادہ سامان تو نہیں پیدا کر دیا!

احوال و مقامات پر بھروسا رکھنے سے انسان جن خام خیالیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، اس کا اندازہ اس خط سے ہو سکتا ہے جو حضرت مجدد کے جانشین خواجہ محمد معصوم نے اپنے چھوٹے بھائی کو اپنے والد کے ایک مشہور خلیفہ شیخ آدم بنوری کی نسبت لکھا۔

> بعض ناقص اور نامقصود سالک اپنے خواب اور واقعات پر گمان کر کے اکابر دین کی برابری کرتے ہیں، لیکن برابری کہاں۔ ان سے برابری کی خواہش ایک خیال محال ہے جو محض نادانی اور خام خیالی ہے۔ بہت سے ناداں از روئے جہل مرکب اپنے واقعات پر بھروسا کر کے خیالات فاسدہ میں خود بھی مبتلا ہیں اور اوروں کو گمراہ کر رکھا ہے۔ ایسے لوگ گمراہ ہیں۔ انھوں نے ضائع کیا کھویا اور گنوایا۔ اصل تو دور کنار ابھی شاخ کے خیال تک کو نہیں پہنچے۔ محض خواب میں ہیں۔ ان کی مثال چوہے کی سی ہے جو ہلدی کی گانٹھ پر پنساری بن بیٹھتا ہے[1]۔

قیومیت کا نظریہ[2] جس کے متعلق مکتوبات امام ربانی میں کوئی واضح اندراج ہمیں نہیں ملا، لیکن جسے حضرت مجدد کے بعض عقیدتمندوں نے بڑی تفصیل سے منقول کیا ہے شامی ذہنیت کا ایک کرشمہ تھا۔ قیوم کون ہوتا ہے؟

---

[1] روضۃ القیومیہ۔ جلد ثانی ص ۴۳   [2] ملاحظہ ہو استدراک۔

قیوم اس شخص کو کہتے ہیں کہ جس کے ماتحت تمام اسماء وصفات، شیونات، اعتبارات اور اصول ہوں اور تمام گزشتہ و آئندہ مخلوقات کے عالم موجودات انسان۔ وحوش۔ پرند۔ نبات۔ ہر ذی روح۔ حجر۔ درخت۔ بحر و بر کی ہر شے۔ عرش۔ کرسی۔ لوح۔ قلم۔ ستارہ۔ ثوابت۔ سورج۔ چاند۔ آسمان۔ بروج سب اس کے سائے میں ہوں۔ افلاک و بروج کی حرکت و سکون۔ سمندروں کی لہروں کی حرکت، درختوں کے پتوں کا ہلنا۔ بارش کے قطروں کا گرنا۔ پھلوں کا پکنا۔ پرندوں کا چونچ پھیلانا۔ دن رات کا پیدا ہونا اور گردش کنندہ آسمان کی موافق یا ناموافق رفتار۔ سب کچھ اسی کے حکم سے ہوتا ہے۔ بارش کا ایک قطرہ ایسا نہیں جو اس کی اطلاع کے بغیر گرتا ہو۔ زمین پر حرکت و سکون اس کی مرضی کے بغیر نہیں۔ جو آرام و خوشی اور بے چینی اور رنج اہل زمین کو ہوتا ہے اس کے حکم کے بغیر نہیں ہوتا۔ کوئی گھڑی کوئی دن، کوئی ہفتہ کوئی مہینا، کوئی سال ایسا نہیں جو اس کے حکم کے بغیر اپنے آپ میں نیکی بدی کا تصرف کر سکے۔ غلہ کی پیدائش۔ نباتات کا اُگنا غرض جو جو کچھ بھی خیال میں آسکتا ہے وہ اس کی مرضی اور حکم کے بغیر ظہور میں نہیں آتا۔

روئے زمین پر جس قدر زاہد، عابد، ابرار و مقرب، تسبیح، ذکر، فکر، تقدیس اور تذویر میں عبادت گاہوں، جھونپڑوں۔ گوشوں، پہاڑ اور دریا کے کنارے، زبان، قلب۔ روح۔ سری، خفی اور نفسی سے شاغل اور معتکف ہیں اور حق تعالیٰ کی راہ میں مشغول ہیں۔ سب اسی کی مرضی سے مشغول ہیں۔ گو انھیں اس بات کا علم نہ ہو۔ اور جب تک ان کی عبادت قیوم کے ہاں قبول نہ ہو، اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول نہیں ہوتی۔ (روضۃ القیومیہ جلد اول ص ۹۴)

حضرات مجددیہ چار بزرگوں کی قیومیت کے قائل ہیں۔ قیوم اول حضرت مجدد الف ثانیؒ۔ قیوم ثانی خواجہ محمد معصومؒ۔ قیوم ثالث خواجہ محمد نقشبندؒ۔ قیوم رابع خواجہ محمد زبیرؒ اور ان کے بعد بھی بعض بزرگوں (مثلاً شاہ ابوسعیدؒ) کے حالات میں تفویض قیومیت کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ باوجودیکہ قیوم کو صفات نبوی سے نہیں صفات الٰہیہ

سے متصف کیا جاتا ہے۔ کوئی آیت یا کوئی حدیث اس نظریے کی قطعی تائید میں پیش نہیں کی جاتی۔ عقل اس بات کو قبول نہیں کرتی، لیکن کشف اور صوفیانہ احوال کے زور پر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے اور عقیدت مند مان لیتے ہیں۔

حالی نے کیا خوب کہا ہے ؎

کرے غیر گر بت کی پوجا تو کافر جو ٹھہرائے بیٹا خدا کا تو کافر
کہے آگ کو اپنا قبلہ تو کافر کواکب میں مانے کرشمہ تو کافر

مگر مومنوں پر کشادہ ہیں راہیں
پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں

نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھائیں
مزاروں پہ دن رات نذریں چڑھائیں شہیدوں سے جا جا کے مانگیں دعائیں

نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے
نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے

اِستدراک

رودِ کوثر کی تیسری اشاعت کے بعد مجددی سلسلہ کے دو فاضل بزرگوں نے قیومیت کے موضوع پر اظہارِ خیال کیا ہے، جس سے اس مسئلہ کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔

ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں صاحب جنھیں ہمارے مندرجہ بالا اظہارِ خیال سے شدید اختلاف ہے۔ تحریر فرماتے ہیں :-

"یہ قیومیت، مقاماتِ عروج سے متعلق ہے۔ اور سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ جو حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے تک لطائفِ سبعہ، نفی اثبات، تہلیل لسانی، مراقبۂ احدیت، پھر مراقباتِ مشارب اور مراقبۂ معیت تک محدود تھا وہ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کی برکت سے ولایتِ کبریٰ، مراقباتِ کمالاتِ نبوت و رسالت و اولوالعزم، مراقبۂ حقیقتِ کعبہ، حقیقتِ قرآن، حقیقتِ صلوٰۃ، معبودیتِ صرفہ، حقیقتِ

ابراہیمی، حقیقتِ موسوی، حقیقتِ محمدی، حقیقتِ احمدی، حُبِّ صرفہ اور لاتعین کے مقامات تک وابستہ ہوگیا ہے۔ یہ چیزیں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے طفیل میں اُن کے وابستگان تک پہنچی ہوئی ہیں۔ اور ان کے متعلق کسی نظریاتی بحث و تمحیص کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ ان چیزوں کا ذکر بھی اس مضمون میں نہیں ہونا چاہیے۔

محترمی ڈاکٹر صاحب کا اپنا اندازِ خیال تو مندرجہ بالا اندراج سے ظاہر ہے، لیکن شاید ان سطور کے لکھنے کے بعد انھیں احساس ہُوا کہ مسئلہ قیومیت پر نظریاتی بحث و تمحیص اتنی غیر ضروری نہیں۔ چنانچہ انھوں نے اس موضوع کی وضاحت کے لیے حضرت مولانا زید ابوالحسن فاروقی مدظلہ کو زحمت دی۔ جو نہ صرف دہلی کی مشہور تاریخی خانقاہ (خانقاہ شاہ غلام علیؒ[1]) کے سجادہ نشین ہیں۔ بلکہ بھارت کے اہلِ علم میں بھی ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے اس مسئلے پر ایک مفصّل، مدلّل اور منصفانہ مضمون لکھا۔ جسے محترمی ڈاکٹر صاحب نے اپنے رسالے کے ساتھ بطور ضمیمہ کے شائع کر دیا۔

مولانا زید صاحب کے مضمون کا لبِ لباب یہ ہے کہ قیومیت ولایت کا ایک بلند مرتبہ ہے۔ "ہمارے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم ہوئی۔ اور ضرورت پیدا ہوئی کہ مراتبِ عالیہ کا علٰحدہ علٰحدہ ظہور ہو۔ چنانچہ جب بھی جس عہدہ کے ظہور کا وقت آیا، وہ عہدہ ظاہر ہُوا۔ یعنی قطب، غوث وغیرہ اور قیومیت کا ظہور حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی قدس اللہ سرہ السامی کی مُبارک ذات سے ہُوا۔"

محترم مضمون نگار نے جن تفصیلی دلائل سے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے، اُن سب کو یہاں دُہرانا مشکل ہے، لیکن انھوں نے اس مضمون میں روضۃ القیومیہ اور بالخصوص اس اندراج پر جو ہم اُوپر درج کر چکے، سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ اسے نقل کرنا غلط فہمیوں کو دُور کرنے کے لیے ضروری ہے۔ اس کتاب کی عمومی صحت کے

---

[1] اب اسے خانقاہ مظہریہ کہتے ہیں لیکن یہ وہی بابرکت مقام ہے جو تاریخ میں خانقاہ شاہ غلام علیؒ یا صرف خانقاہ کے نام سے معروف ہے۔

متعلق وہ لکھتے ہیں :-

"مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کتاب روضۂ قیومیہ کا ذکر کر دیا جائے۔ کیونکہ قیومیت کے سلسلے میں بعض افراد اس کتاب کی عبارت سے تحیر زدہ گئے ہیں۔ اور ان کا متحیر ہونا اپنی جگہ صحیح ہے۔ یہ کتاب جناب محمد احسان مجددی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ہے۔ یہ حضرت خواجہ محمد زبیر کے خلیفہ تھے۔ اور وہ اپنے دادا حضرت خواجہ محمد نقشبند حجۃ اللہ کے اور وہ اپنے پدر بزرگوار حضرت خواجہ محمد معصوم قدس اللہ اسرارہم کے۔ ان کو اپنے پیر و مرشد سے کامل عقیدت تھی۔ دقائق علمیہ سے پوری طرح باخبر نہ تھے۔ حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں قدس اللہ سرہٗ نے ان کو ایک خط لکھا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں "آنچہ از احوالِ شہود نوشتہ اند کہ ہر ذرّہ ظہور ذاتِ اللہ تعالیٰ وتقدس معلوم می شود۔ وایں را توحید متعارف دانستہ اند غلط است" روضۂ قیومیہ میں بھی ان سے لغزشیں ہوئی ہیں۔ بعض واقعات بھی صرف افواہ بر سماع قلمبند کر دیے ہیں، حالانکہ وہ صحیح نہیں ہیں۔ بنابریں حضرات عالی قدر نے اس کتاب کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا ہے۔ قیومیت کے سلسلے میں ان کا مسلک جادۂ صواب سے ہٹا ہوا ہے۔"

اس کے بعد قیوم کے متعلق روضۃ القیومیہ کی اس عبارت سے جسے ہم نے اوپر نقل کیا ہے، کچھ اقتباس دے کر مولانا زید صاحب فرماتے ہیں :-

"محمد احسان صاحب بموجب اس اُردو ترجمہ کے جو پیشِ نظر ہے" نہ حضرات جلالِ قدر کے کلام کو سمجھے ہیں اور نہ قیوم کے مرتبہ کو۔ انھوں نے اسمار، صفات، شیونات، اصول اور تمام گزشتہ اور آئندہ مخلوقات کے متعلق لکھ دیا کہ سب اُس کے سایے میں رہیں۔ العیاذ باللہ من ھذا القول الفاسد۔ بھلا اسماو باری تعالےٰ اور اس کی صفات و شیونات کس کے سایہ میں آ سکتے ہیں۔ اصل کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ انبیار اور ملائکہ کے لیے تجلّیِ صفات اصل ہے۔ باقی افراد کونی کے لیے تجلّیِ صفات کا ظلِ اصل ہے۔ بھلا تجلیاتِ صفات یا ظلالِ تجلیاتِ صفات پر کون حاوی ہو سکتا ہے۔ استغفر اللہ۔ اور لکھا ہے تمام گزشتہ اور آئندہ مخلوقات الخ

یہ اللہ کے بندے اتنا نہ سمجھے کہ تمام گزشتہ مخلوقات میں صحابہ کرام، انبیاء عظام، ملائکہ عالی مقام اور سردار دوجہاں محبوب کبریا جناب محمد مصطفےٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وعلیٰ جمیع انبیاء والملائکہ و جمیع عباد اللہ الصالحین و بارک وسلم بھی شامل ہیں۔ حالانکہ بڑے سے بڑا ولی بھی صحابی رضوان اللہ علیہم کے خاک پا کی برابری نہیں کرسکتا، چہ جائیکہ انبیاء علیہم السلام (کی)

ہم نے سطور بالا میں لکھا تھا۔ کہ نظریہ قیومیت کے متعلق ہمیں مکتوبات امام ربانی میں کوئی واضح اندراج نہیں ملا۔ اور کوئی آیت، کوئی حدیث اس نظریے کی قطعی تائید میں پیش نہیں کی جاتی۔ کتاب کی اشاعت کے بعد ہمیں دفتر دوم کے مکتوب ۴ اور دفتر سوم کے مکتوب ۱۰۴ کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ موخر الذکر میں حضرت مجدد کی خلعت قیومیت خواجہ محمد معصوم کو منتقل ہونے کا بیان ہے۔ اور پہلے مکتوب میں دو آیاتِ قرآنی کی تاویل و تشریح سے قیومیت کا نظریہ مستنبط ہوتا ہے۔ ان دو آیات میں سے زیادہ متعلقہ وہ مشہور آیت ہے جس کا اردو ترجمہ ہے: "ہم نے اپنی امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے پیش کی لیکن انھوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا۔ اور اس سے ڈر گئے۔ اور انسان نے اس کو اٹھالیا۔ یہ بڑا ہی ظالم اور جاہل ہے"۔ اس آیت کی توضیح کرتے ہوئے حضرت مجدد قیوم کے متعلق لکھتے ہیں:-

"آں امانت بزعم ایں حقیر قیومیت جمیع اشیاست۔ بر سبیلِ نیابت کہ مخصوص بکمل افرادِ انسان است۔ یعنی معاملۂ انسانِ کامل تا بجائے میرسد کہ اورا قیوم جمیع اشیا بحکم خلافت می سازند۔ و ہمہ را افاضہ وجود و بقا و سائر کمالاتِ ظاہری و باطنی بتوسط او میرسانند۔ اگر ملک است باو متوسل است۔ و اگر انس و جن است باو متشبث"

(دفتر دوم مکتوب ۴)

آگے چل کر فرماتے ہیں:-

— عارفے کہ بہ منصب قیومیت اشیا مشرف گشتہ است، حکم وزیر دارد کہ مہمات مخلوقات را باو مرجوع داشتہ اند۔ ہر چند انعامات از سلطان است، اما وصول آنہا

بتوسط وزیر ست (ایضاً)

ان اندراجات سے بظاہر ہمارے اس بیان کی کہ نظریہ قیومیت کی تائید میں کوئی آیت پیش نہیں کی جاتی۔ تغلیط ہوتی ہے (اور یہ صحیح ہے کہ اصل تحریر کے وقت ہماری نظر میں یہ مکاتیب نہ تھے)۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ آیات قرآنی کی اس تاویل و تشریح کو پڑھتے وقت وہ عربی جملے ذہن نشین رکھنے چاہئیں، جو حضرت مجدد نے اس سے پہلے حقیقتِ حال کو واضح کرنے کے لیے لکھے۔ ان کا اردو ترجمہ حسبِ ذیل ہے :۔

ان دونوں آیتوں کی مراد اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ لیکن ہم تاویل بیان کرتے ہیں، جو ہم پر ظاہر ہو گئی ہے۔ یا اللہ تو ہماری بھول چوک پر مواخذہ نہ کر۔

[اردو ترجمہ مکتوباتِ امام ربانی جلد دوم صفحہ ۴۲]

کیا اس ابتدائی عبارت سے یہ امر واضح نہیں کہ حضرت مجدد کو اس ترجمانی پر (جسے وہ تاویل کہتے ہیں) یقین نہ تھا۔ اور وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ اگر اس معاملے میں ان سے کوئی بھول چوک ہوئی ہے تو اس پر ان سے مواخذہ نہ کیا جائے؟

روضۃ القیومیہ کی عبارت پر مولانا زید ابوالحسن صاحب مدظلہ نے جو تبصرہ کیا ہے اس سے ایک حد تک صورتِ حالات کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ لیکن کیا یہ بہتر نہ ہو کہ حضرت مجدد نے ابتدائی عربی عبارت میں جو وضاحت کی ہے، اسے زیادہ اہمیت دی جائے۔ اور یہ خیال کر کے کہ مفسرین میں سے کسی (یا کم از کم سوادِ اعظم) نے متعلقہ آیت کریمہ کی یہ تاویل نہیں کی۔ قیومیت کو امورِ مشتبہ میں شمار کیا جائے؟ ہماری حقیر رائے میں یہ اندازِ فکر حضرت مجدد کی ابتدائی عربی عبارت کے مطابق ہو گا۔ روضۃ القیومیہ میں خواجہ محمد معصوم کو قیومِ ثانی قرار دیا ہے۔ اور ان کے ایک مکتوب (دفترِ اول ۸۶) میں خلعتِ قیومیت کے حصول اور اس مرتبہ کے متعلق ایک تفصیلی بیان ہے۔ لیکن ان کے آخری ایام کا ایک خط ہے (دفترِ سوم ۱۹۵) جس میں اس قسم کے خطاب پر اظہارِ ناراضگی فرمایا ہے۔ یہ شیخ محمد خلیل اللہ کو لکھتے ہیں :۔

.... دیگر نوشتہ بودند "اگرچہ ایں حکم بباریافتگان جناب قیومیت بے ادبی است الخ"

فقیر باین قسم عبارات کہ در بارۂ ایں فقیر از کار برمیستند راضی نیست۔ اگر نوشتہ آنچہ گزشت۔ من بعد نخواہند نوشت۔۔۔

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ اپنی زندگی کے آخری سالوں میں خواجہ محمد معصومؒ قیومیت سے اپنی نسبت کے اظہار کرنا پسند کرتے تھے۔ افسوس کہ متاخرین نے یہ طریق کار اختیار نہ کیا۔ بعد میں قیومیت کے نظریے کو جس طرح وسعت دی گئی۔ وہ روضۃ القیومیہ سے ظاہر ہے۔ قدرتی طور پر یہ طریق کار علما کو کھٹکتا ہے۔ قیومیت کے مسئلے پر علما کی (آپ انھیں علماے ظاہر کہہ لیجیے) جو رائے ہے، اس کا اندازہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے ایک جملہ سے ہو سکتا ہے۔ "معاذ اللہ"۔

وہ رسالہ تجدید و احیاے دین (اشاعت اوّل) کے ص ۷۷ پر لکھتے ہیں "حضرت مجدد صاحب کی وفات پر کچھ زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ ان کے حلقے کے لوگوں نے ان کو قیوم اوّل اور ان کے خلفا کو قیوم ثانی کا خطاب عطا کر دیا۔ معاذ اللہ"

روضۃ القیومیہ

جناب مولانا زید ابوالحسن فاروقی صاحب مدظلہ نے اپنے ارشادات میں روضۃ القیومیہ کے مصنف جناب محمد احسان مجددی کی لغزشوں کا ذکر کیا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ انھوں نے "بعض واقعات بھی سرف از وجہ سماع قلمبند کر دیے ہیں۔ حالانکہ وہ صحیح نہیں۔ بنابریں حضرات عالی قدر نے اس کتاب کو قابل اعتنا نہیں سمجھا ہے۔" جہاں تک اہل نظر خواص کا تعلق ہے ان کا فرمانا بجا ہے، لیکن سطحیت اور جذباتیت کے اس دور میں اہل نظر کتنے ہیں؟ عام طور پر اس کتاب کو "قابل اعتنا ہی نہیں سمجھا گیا" بلکہ بعد کے تذکرہ نگاروں نے تو زبدۃ المقامات اور حضرات القدس جیسے معاصرانہ اور حضرت مجدد الف ثانی کے خلفاے کبار کے لکھے ہوئے تذکروں کو چھوڑ کر جمع حالات اور نقطۂ نظر میں روضۃ القیومیہ کو چراغ راہ بنایا ہے۔ پروفیسر محمد فرمان صاحب (جنھوں نے حضرت مجدد کے حالات و خیالات کو زیادہ تر مکتوبات کی روشنی میں جمع کیا ہے) روضۃ القیومیہ کی نسبت لکھتے ہیں "اسی کتاب پر حضرت مجدد الف ثانی کے اکثر

سوانح نگاروں نے انحصار کیا ہے ..... نقشبندی حضرات کے ہاں اس کتاب کو بڑی مقبولیت حاصل ہے" (حیاتِ مجدد ص ۲۹۱) بعض بلند پایہ اور اہلِ علم مجددی بزرگوں کو بھی اس کتاب کا نقطۂ نظر اور اس کی روایات جس قدر عزیز ہیں، اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ اس عہد کے ایک مشہور و معروف فاضل "علامہ ابو الفضل محمد احسان اللہ عباسی گورکھپوریؒ" کی سوانح عمری حضرت مجدد الف ثانی سرہندی کی نسبت، جس کا سوانحی حصہ روضۃ القیومیہ کا ملخص ہے، لکھتے ہیں۔

"حضرت مجدد کے متعلق صرف یہی ایک ایسی کتاب ہے، جسے ہمارے دور میں بڑی ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ مولانا مرحوم نے حضرت مجدد کے حالات بڑی تحقیق سے لکھے ہیں[۲]۔ مولانا احسان اللہ نے اپنی کتاب کے ابواب و اندراجات کی ترتیب جدید طریقے سے اور "مذاقِ حال کے موافق" کی۔ ایک اہم کام یہ کیا کہ مکتوباتِ امامِ ربانی کے تینوں دفتروں کے ایک ایک مکتوب کا حوالہ اور اس کا عنوان اردو میں دیا ہے[۳]۔ دو رسائل (یعنی مبداء و معاد اور معارف لدنیہ) کا بھی کار آمد خلاصہ درج کتاب کیا، لیکن جہاں تک "حضرت مجدد کے حالات" کا تعلق ہے، مولانا احسان اللہ کی کتاب روضۃ القیومیہ

---

[۱] کتاب کے سرورق پر مصنف کا نام اس طرح لکھا ہے۔ سب ٹائیٹل پر موضوعِ کتاب کی توضیح ہے: "حضرت شیخ احمد سرہندی ملقب (کذا) بہ قیوم اوّل و مشہور بہ مجدد الف ثانی کے حالات"۔

[۲] ملاحظہ ہو تحریر و تقریر (شائع کردہ حکیم محمود الزمان بی۔اے۔ نعلیت آباد۔ حیدر آباد) ص ۱۵۹

[۳] ایضاً۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کا یہ خیال کہ "پروفیسر (محمد فرمان) صاحب نے (حیاتِ مجدد میں) صرف یہ کیا ہے کہ (مولانا احسان اللہ عباسی کے) انھی عنوانات کو یکجا کر دیا ہے۔" صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ مولانا احسان اللہ نے فقط عام فہم اندراجات لیے تھے۔ اور اقتباسات کے مطابق عنوانات دے دیے۔ بعض اقتباسات بڑے مختصر ہیں۔ پروفیسر محمد فرمان نے بطورِ خود مکتوبات کا بڑا غائر مطالعہ کیا ہے۔ اور اس مطالعہ میں حضرت مجدد کی تعلیمات اور مذہبی احساسات کے جو اہم پہلو نظر آئے۔ انھیں گیارہ بارہ عنوانات کے تحت طویل اقتباسات دے کر ان کی وضاحت کی ہے۔

کی صدائے بازگشت ہے۔ وہ خود کتاب کے شروع میں لکھتے ہیں" روضۃ القیومیہ ہر چہار جلد اور مکتوبات کے ہر سہ دفتر دیکھ کر پورے دو ماہ میں مَیں نے سوانح عمری حضرت مجددؒ کی تیار کر لی" (ص ۱۳) ممکن ہے نظر ثانی کے وقت اَور کتابوں سے بھی افادہ کیا ہو لیکن اس میں جو حالات سال بسال درج ہیں، ان کا روضۃ القیومیہ سے موازنہ کرنے سے صاف نظر آتا ہے کہ مولنا کی کتاب کا سوانحی حصہ موخر الذکر کی تلخیص ہے۔ اب اگر ایک مشہور مجددی بزرگ اور نامور اہل علم ایسی تالیف کو حضرت مجددؒ کے حالات" کا ایک محققانہ بیان سمجھیں۔ تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عوام الناس میں روضۃ القیومیہ کے قصّے کہانیاں کیسے مقبول ہوں گے۔

چونکہ روضۃ القیومیہ کے اندراجات پر پہلی مرتبہ کڑی تنقید رودِ کوثر میں ہوئی، اس لیے شاید بیجا نہ ہو۔ اگر راقم السطور ایک دو امور کی وضاحت کر دے۔ اس کتاب کے متعلق بڑی دشواری یہ ہے کہ فقط اس کا اُردو ترجمہ دستیاب ہوتا ہے۔ اصل کتاب کا ایک قلمی مخطوطہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانہ میں ہے لیکن وہاں سے اس کی نقل حاصل کرنا بے حد مشکل ہے۔ اس لیے اس کے متعلق جو کچھ لکھا جا سکتا ہے، وہ اس اُردو ترجمہ کے متعلق ہے، جو لاہور سے شائع ہُوا۔ اور عام طور پر متداول ہے۔

روضۃ القیومیہ کے اندراجات کثیرہ سے شدید اختلاف کے باوجود یہ اظہار ضروری ہے کہ اگر یہ کتاب احتیاط سے مطالعہ کی جائے۔ اور ان بیانات کو، جو مستند تاریخی شواہد یا شرعی اعتراضات کی بنا پر قابلِ قبول نہیں، نظر انداز کر دیا جائے تو اس سے بڑے فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔ مصنف خاندانِ مجددیہ سے تھے۔ انھوں نے چار قیومیوں کے حالات دیتے ہوئے، ان کے تمام بیٹوں بیٹیوں اور خلفا بلکہ بعض معاصرین کے حالات لکھے ہیں۔ جن کے جاننے کا دُوسرا کوئی ذریعہ نہیں اور اس طرح سے اُس خاندانِ عالی کا، جس کے متعلق حضرت خواجہ باقی باللہؒ نے لکھا تھا۔ "یہ سب شجرۂ طیبہ یعنی پاک درخت کی طرح ہیں، جس سے پاک ہی شاخیں نکلی ہیں۔" (ترجمہ)

اس طرح حال بیان کیا ہے کہ اس شجرۂ طیبہ کی ٹہنی ٹہنی، بلکہ پتا پتا نظر کے سامنے آجاتا ہے۔ یہ ایک احسانِ عظیم ہے۔ خدا انھیں اس کی جزائے خیر دے اور فرو گذاشتیں درگزر فرمائے۔

مولانا زید ابوالحسن صاحب نے روضۃ القیومیہ کے غیر صحیح اندراجات کی نسبت تحریر فرمایا ہے کہ وہ بغیر قوی شہادت کے "از وجہ سماع" قلمبند کر دیے گئے۔ عجب نہیں کہ اس میں مؤلف یا ان کے ماخذ کی "تاریخ سازی" کو دخل ہو۔ ہمیں کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ شاید یہ کتاب مناقب الحضرات کے جواب میں لکھی گئی، جو اس کی تالیف سے چند سال پیشتر شیخ آدم بنوریؒ کے سلسلے کے ایک اہلِ قلم نے لکھی تھی۔ اس میں حضرت مجددؒ کے اجمالی ذکر کے بعد شیخ آدم بنوریؒ اور ان کے سلسلے کے بعض بزرگوں کے حالات میں اسی قسم کے قصے بیان کیے ہیں، جو روضۃ القیومیہ میں قیومانِ اربعہ کے متعلق ملتے ہیں۔ مناقب الحضرات کا جو اندازِ فکر اور "بنیادی نظریہ" ہے، وہ ایک اقتباس سے ظاہر ہو جائے گا۔

"بعد از رحلتِ جہانگیر بادشاہ یک پسرِ وے بر تختِ سلطنت نشست۔ محمد خرم شاہ جہاں پسرِ دیگرِ وے در دکن بود۔ حضرتِ خضرؑ نزد حضرت سیدنا و مولانا قدس سرہٗ آمد و گفت کہ ایں خدمت بر تو مقرر شدہ و حضرت افضل المخلوقات صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وسلم مرا نزدِ تو فرستادہ اند کہ ہر کرا او تجویز کند، پادشاہ باشد۔ ایشاں متوجہ شدند مرضیِ مالکِ حقیقی جل شانہٗ، و رسولِ او صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم شاہجہاں دیدند۔ بحضرت خضرؑ گفتند۔ کہ مرضی چنانست۔ وے گفت۔ موقوف بر تجویز تست۔ ایشاں شاہجہاں را مقرر کردند۔ و در پاسبانی میبودند۔ ظاہرا ہیچ آشنائی با او نداشتند"

(مناقبِ آدمیہ قلمی ورق ۲۰۲)

"حضرت سیدنا و مولانا قدس سرہ" سے، جنھوں نے (مصنف کے بیان کے مطابق) شاہجہاں کو بادشاہ "مقرر" کیا۔ شیخ احمد بنوریؒ مراد ہیں، جنھیں شاہ جہاں نے سعد اللہ خاں اور ملا عبدالحکیم کے مشورے پر، ایک طرح سے ملک بدر کیا اور مکہ معظمہ

روانہ کر دیا۔

مناقب الحضرات کے آخر میں اظہارِ احوال کا تفصیلی جواز پیش کیا گیا ہے۔ بالجملہ مصنف کا نقطۂ نظر ہے "اظہارِ احوال مناقب و افشاء نعم و فضلِ الٰہی سکر است و خطلے او مکر۔" اس عبادت اور بالخصوص آخری جملے سے اندازہ لگائیے کہ اندازِ خیال حضرت خواجہ باقی باللہ کے نقطۂ نظر سے کتنی دور تھا!

مناقب الحضرات جس کا پورا نام ہے مناقب آدمیہ و حضرات احمدیہ نہم محرم سنہ ۱۱۴۰ھ کو مکمل ہوئی۔ روضۃ القیومیہ اس کے بارہ سال بعد ۱۱۵۲ھ (۱۷۳۹ء) میں یعنی حملۂ نادری کے زمانے میں شروع ہوئی، لیکن اس کی تکمیل میں کئی سال لگے۔ دونوں کتابوں کے زمانہ تالیف اور موضوع سے خیال ہوتا ہے کہ شاید روضۃ القیومیہ اکابرِ سلسلۂ آدمیہ کے مقابلے میں بزرگانِ سرہند کے تصرفات نمایاں کرنے کے لیے لکھی گئی۔

روضۃ القیومیہ کے مؤلف خواجہ ابوالفیض کمال الدین محمد احسان کی نسبت حیاتِ مجدد میں پروفیسر محمد فرمان لکھتے ہیں "مؤلف کے خلوص پر کسی قسم کا شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اس خلوص نے غلو کر کے تصوف کی خدمت سے کہیں زیادہ اسے نقصان پہنچایا ہے۔" (ص ۲۹۱) ہمیں اس سے اتفاق ہے۔ لیکن وہ پہلے صوفی تذکرہ نگار نہیں جن کے غلو سے نقصان زیادہ پہنچا ہے۔ فایدہ کم۔ یہ سلسلہ اس سے بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔ شیخ عبدالحق محدث نے بھی حضرت مجدد کی زندگی میں ان کے بعض معتقدین کی غیر مستند حکایات کا ذکر کیا تھا "... گفت و گوئے مریدان ایشاں کہ در نقلِ اقوال و ذکرِ حکایات بے صرفہ و بے احتیاط۔" (حیاتِ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۳۱۴)۔

روضۃ القیومیہ نے اس عمل کو انتہا تک پہنچا دیا۔ اس کا آغاز نہیں کیا۔

وحدت الشہود

خواجہ باقی باللہ رحمہ اللہ کی آمد سے پہلے جو صوفی سلسلے ہندوستان میں برسرِ فروغ تھے، وہ تمام کے تمام ایران اور ایران کی عِلمی سرحد عراق کی پیداوار تھے۔ قادریہ سلسلہ کے بانی شیخ عبدالقادر جیلانی بغداد کے رہنے والے تھے۔ سہروردی سلسلہ سہرورد سے متعلق ہے جو بغداد سے چند میل کے

فاصلے پر ایک قریہ تھا۔ چشت بھی خراسان کی ایک بستی ہے۔

ان تینوں سلسلوں میں جزوی اور فروعی اختلافات تھے لیکن ان کا روحانی پس منظر ایک تھا۔ اور ان سب میں وہ جامعیت، جو دورِ عباسیہ کو دورِ اموی سے، اور بغداد کے متکلمین اور فلسفیوں کو مدینہ منورہ کے محدثین و فقہا سے منفرد کرتی ہے۔ موجود تھی۔ تینوں میں وہ "صلح کل" کا طریقہ مقبول تھا۔ جس کے تحت غیر مروجہ بلکہ غیر اسلامی طریقوں سے کلی پرہیز نہ کیا جاتا۔ تینوں میں شرع کے معاملے میں تھوڑی بہت آزادی تھی اور تینوں میں وحدت الوجود کا طریق رائج ہو گیا تھا۔

حضرت خواجہ باقی باللہ جس سلسلے کو لے کر ہندوستان آئے، وہ ایران نہیں توران کا تحفہ تھا اور ماوراءالنہر[1] کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ نقشبندیہ سلسلے میں شرع کی پابندی پر بڑا زور تھا۔ سماع کی ممانعت تھی۔ ذکرِ خفی کی تلقین تھی اور فرائض شرعی کو نوافل پر واضح ترجیح تھی۔

نقشبندیہ سلسلہ، حضرت مجدد کے ظہور سے پہلے ہی کئی اہم امور میں قدیم صوفیہ سلسلوں سے ممتاز تھا۔ اور شرع سے بہت قریب تھا۔ لیکن اس کا بنیادی فلسفہ دوسرے سلسلوں سے مختلف نہ تھا۔ جو فرق تھا، وہ خواجگان بخارا و سمرقند کی آئین پسندی، ذہنیت اور شرعی جوش و خروش کی وجہ سے تھا۔ اور ابھی تک کوئی ایسا صاحب فکر پیدا نہ ہوا

---

[1] مرزا غالب نے ایک دفعہ بہادر شاہ کے دربار میں ایک رباعی پڑھی تھی ؎

جن لوگوں کو مجھ سے ہے عداوت گہری — کہتے ہیں وہ مجھے رافضی اور دہری
دہری کیونکر ہو جو کہ ہووے صوفی — شیعی کیونکر ہو ماوراءالنہری

آخری مصرع پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا حالی فرماتے ہیں: "چوتھے مصرعہ کا یہ مطلب ہے کہ ماوراءالنہر یعنی ترکستان کے لوگ متعصب سنی ہونے میں ضرب المثل ہیں۔ یہاں تک کہ شیعہ ان کو ناصبی اور خارجی سمجھتے ہیں" مولانا نے تو فقط ایک پہلو پر تبصرہ کیا ہے، لیکن ترکستان کے لوگ ایرانیوں کی نسبت عام طور پر زیادہ متشدد اور شرع کے زیادہ پابند ہوتے ہیں۔

تھا جو نقشبندیوں کو ایک ایسا فلسفہ دے دیتا جو اس معاملے میں بھی انھیں ایک امتیازی رنگ دے کر ان کے خاص رجحانات کے لیے ایک فکری اساس کا کام دیتا۔ یہ کمی حضرت مجدّد نے پوری کر دی۔ ان کے ظہور سے پہلے تمام صوفیوں میں ایک ہی فلسفہ رائج تھا[1]۔ ابن العربی کا فلسفۂ وحدت الوجود بیشک اس کے اخذ و قبول میں مراتب و منازل تھے۔ بعض انتہا پسند صوفی تو وحدت الوجود میں اتنا غلو کرتے کہ وہ قریب قریب دائرۂ اسلام سے باہر آجاتے۔ اور کئی دوسرے فقط اُسی حد تک اختیار کرتے، جس حد تک اسلام مانع نہ ہو۔ لیکن اب پہلی دفعہ ایک ایسا جُداگانہ فلسفہ مدوّن ہُوا، جو فلسفۂ وحدت الوجود کا مدِ مقابل ہو سکتا تھا۔ یہ فلسفۂ وحدت الشہود تھا جو معنوی لحاظ سے وحدت الوجود کی ضد یعنی تشنیہ الوجود کا فلسفہ کہلا سکتا ہے۔

حضرت خواجہ باقی باللہ کا مسلک شروع میں وحدت الوجود کا تھا اور گلزارِ ابرار میں لکھا ہے کہ ان کے دہلوی جانشین مرزا حسام الدین احمد نے اسے جاری رکھا۔ لیکن حضرت مجدّد لکھتے ہیں کہ آخری ایام میں خواجہ نے یہ مسلک ترک کر دیا تھا "معرفت پناہی، قبلہ گاہی، حضرت خواجہ ما قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ چندگاہ مشربِ توحیدِ وجودی داشتند و در رسائل و مکتوباتِ خود آں را اظہار می فرمودند اما آخر کار حق سبحانہٗ و تعالیٰ بکمال عنایتِ خویش ازاں مقام ترقی ارزانی فرمودہ بشاہراہ انداختہ از مضیقِ ایں معرفت خلاصی داد۔ میاں عبدالحق (محدّث) کہ از مخلصان ایشاں اند۔ نقل کردند کہ پیش از مرضِ موت بہ یک ہفتہ فرمودند کہ مرا بعین الیقین معلوم شد۔ کہ توحید کوچہ ایست تنگ۔ شاہراہ دیگر ایست۔ پیش ازیں ہم میدانستم اما اکنوں یقینِ دیگر حاصل گشت۔ و ایں حقیر نیز[2] کہ چندگاہ در حضرتِ

---

[1] وحدت الشہود کی کچھ جھلک شیخ علاء الدولہ سمنانی کی تحریروں میں ملتی ہے، جو قدیمی خواجگان ترکستان میں بڑے دیدہ ور بزرگ تھے۔

[2] گلزارِ ابرار میں خواجہ محمد صدیق بدخشی کا بیان اس واقعہ کے متعلق دیکھیے۔ اور اندازہ لگائیے کہ معتقدین بیانِ واقعات میں کس طرح بے احتیاطی کرتے ہیں۔

ایشاں ایں مشرب توحید داشت و مقدمات کشفیہ در تائید ایں طریق بسیار لائح گشتہ۔ امّا عنایت خداوندی جل سلطانہ ازاں مقام گزرانیدہ، بہ مقامے کہ خواست مشرف گردانیدہ۔"

وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے دونوں فلسفے ذات باری اور مخلوقات کے تعلقات کو بیان کرتے ہیں اور ان کے مطالب کے لحاظ سے انھیں توحید عینی اور توحید ظلی بھی کہہ سکتے ہیں۔ تصوف کی ایک مشہور کتاب تذکرۂ غوثیہ میں دونوں کا فرق اس طرح سمجھایا گیا ہے:۔

> وجود یعنی ہستی حقیقی واحد ہے لیکن ایک ظاہر وجود ہے اور ایک باطن۔ باطن وجود ایک نور ہے، جو جملہ عالم کے لیے بمنزلہ ایک جان کے ہے۔ اسی نور باطن کا پرتو ظاہر وجود ہے جو ممکنات کی صورت میں نظر آتا ہے۔ ہر اسم و صفت و فعل کہ عالم ظاہر میں ہے، ان سب کی اصل وہی وصف باطن ہے اور حقیقت اس کثرت کی وہی وحدت صرف ہے۔ جیسے امواج کی حقیقت عین ذات دریا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ جملہ افراد کائنات تجلیات حق ہیں۔ سُبْحَانَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَشْیَاءَ وَھُوَ عَیْنُھَا۔ اور اس کثرت اعتباری کا وجود اسی وحدت حقیقی سے ہے۔ اَلْحَقُّ مَحْسُوْسٌ وَالْخَلْقُ مَعْقُوْلٌ۔
>
> یہ خلاصہ وحدت الوجود کی تقریر کا ہے اور وحدت الشہود کا بیان یہ ہے کہ وجودِ کائنات اور ظہور آثار و صفات مختلفہ، واحد مطلق کی ذات و صفات کا ظل و عکس ہے، جو عدم میں منعکس ہو رہا ہے۔ اور یہ ظل عین صاحب ظل نہیں ہے بلکہ محض ایک مثال ہے۔

مندرجہ بالا تشریح دیکھ کر شاید بعض بزرگ کہیں کہ ان دونوں فلسفوں میں تو کوئی خاص بُعد نہیں (اور سچ یہ ہے کہ ان مسائل پر فلسفہ اور تصوف کی بھول بھلیاں دیکھ کر بار بار اس ذات حکیم کا فرمان یاد آتا ہے کہ اس ذات اور صفات کے جھگڑوں میں نہ پڑو) لیکن فی الواقعہ یہ دونوں نظریے دو مختلف بلکہ متضاد نفسیاتی رجحانات کے ترجمان ہیں۔ نواب سر احمد حسین نظامت جنگ بہادر نے اپنی کتاب فلسفۂ نقرا میں ان دونوں کے فرق کو ایک نقشے

کی مدد سے نمایاں کیا ہے :۔

وحدت الوجود (ہو الکل)	وحدت الشہود (ہو الہادی)
نظریہ ہمہ اوست یا اندر ہمہ اوست	نظریہ ہمہ از اوست
رجحانِ تصوف ۔ سکون کی طرف مائل ۔	رجحانِ تصوف ۔ جوش کی طرف مائل ۔
میں اور وہ جدا نہیں (وہ دریا تو میں قطرہ ہوں)	اس کے ساتھ میں لو دیے ساتھ وہ ہے ۔
وصل	عشق
اعتقاد ۔ میں کون؟ انا الحق (عارف)	اعتقاد ۔ میں کون؟ انا عبدہٗ (عاشق)

علامہ اقبال نے ایک خط خواجہ حسن نظامی کو لکھا تھا :۔

"حضرت امام ربانی نے مکتوبات میں ایک جگہ بحث کی ہے کہ گستن اچھا ہے یا پیوستن؟ میرے نزدیک گستن عین اسلام ہے اور پیوستن رہبانیت یا ایرانی تصوف ہے ۔۔۔۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب آپ نے مجھے سرّ الوصال کا خطاب دیا تھا۔ تو میں نے آپ کو کہا تھا کہ مجھے سرّ الفراق کہا جائے۔ اس وقت بھی میرے ذہن میں یہی امتیاز تھا جو مجدد الف ثانی نے کیا ہے۔"

اقبال نے سرّ الفراق کے جس خطاب کی خواہش کی تھی، حضرت مجدد الف ثانیؒ اس سے بھی زیادہ مستحق ہیں ۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اگر ابن العربی کو سرّ الوصال اور حضرت مجدد کو سرّ الفراق کہا جائے تو ان کے فلسفوں اور وحدت الوجود اور وحدت الشہود کا امتیاز بخوبی ذہن نشین ہو جاتا ہے ۔ وحدت الوجود کا قائل ہونے کی وجہ سے شیخ ابن العربی کا دوسرے مذہبوں کی نسبت جو طرزِ عمل ہو گیا، اسے انھوں نے چند عربی اشعار میں بڑی وضاحت سے نقل کیا ہے ۔ (ترجمہ)

"آج کے دن سے پہلے میرا یہ حال تھا کہ جس ساتھی کا دین مجھ سے نہ ملتا میں اس کا انکار کرتا اور اسے اجنبی سمجھتا ۔

لیکن اب میرا دل ہر صورت کو قبول کرتا ہے ۔ وہ اب ایک چراگاہ بن گیا ہے ۔

غزالوں کی۔ اور دیر ہے راہبوں کا۔ اور آتش کدہ ہے آتش پرستوں کے لیے اور کعبہ ہے حاجیوں کے لیے اور الواح ہے تورات کی اور صحیفہ ہے قرآن کا۔

مَیں اب مذہبِ عشق کا پرستار ہوں۔ عشق کا قافلہ جدھر بھی جا رہے، مجھے لیجائے

میرا دین بھی عشق ہے، میرا ایمان بھی عشق ہے۔"

برخلاف اس کے حضرت مجدد کا دُوسرے مذاہب کی نسبت جو خیال تھا، اس کا اندازہ اس مکتوب سے ہو سکتا ہے جو انھوں نے ایک ہندو ہردے رام کو لکھا۔ اور جس میں رام اور رحمان کو ایک سمجھنے کی بڑی خفگی سے تردید کی تھی۔

مندرجہ بالا سطور سے حضرت مجدد کے رُوحانی اسلوبِ خیال کا اندازہ ہوتا ہے اور تاریخ تصوّف میں ان کی منفردانہ حیثیت سمجھی جاسکتی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود ایک دوسرے کی ضد ہونے کے باوجود ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ یا ان میں سے اگر ایک حق پر ہے تو دوسرا ضرور باطل ہوگا۔

یہ دونوں رجحانات مختلف اور متضاد ہیں، لیکن حالات کے مطابق مختلف رجحانات برسرِکار آتے ہیں اور جُداگانہ حالات میں جُداگانہ رجحانات ہی مفید ہوتے ہیں۔ ایک انگریزی مقولہ ہے:۔

"There is a season and time for every purpose under Heaven;
A time to love and a time to hate."

دُنیا کی ہر ایک چیز کے لیے کوئی نہ کوئی وقت ہوتا ہے۔
کوئی وقت محبت کرنے کا ہوتا ہے اور کوئی وقت نفرت کا۔

یعنی کسی وقت سرّالوصال کی راہنمائی مفید ہوتی ہے اور کسی وقت سرّالفراق کی یا تصوّف کی اصطلاح میں یوں سمجھیے کہ کوئی وقت شانِ جمالی کا ہوتا ہے، کوئی وقت شانِ جلالی کا۔

یہی وجہ ہے کہ امام الہند شاہ ولی اللہ نے جو ہمارے سب سے متوازن مزاج اور معاملہ فہم عالم ہوئے ہیں۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ اور اسمٰعیل آفندی کے نام ایک طویل عربی خط میں (جواب مع اُردو ترجمہ کے فیصلۂ وحدت الوجود والشہود کے نام سے چھپا ہے) شیخ اکبر اور شیخ مجدد کے خیالات کی تطبیق کی۔ شاہ صاحب نے دیکھا ہوگا کہ ایک اصول ہے اخذ و انجذاب کا اور دُوسرا فلسفہ ہے تطہیر و تزکیہ کا۔ ایک کے پیرو مشابہتوں اور یکرنگیوں کو دیکھتے ہیں۔ اور دوسروں کی نظر اختلافات پر پڑتی ہے۔ ابن العربی۔ رومی۔ غزالی اور دارا شکوہ عیسائی، نو افلاطونی اور ہندو فلسفوں اور طریقوں کو کھنگالتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ان میں کونسی چیز اچھی ہے اور اخذ کی جا سکتی ہے، لیکن ابن تیمیہ۔ ابن عبد الوہاب۔ مجدد الف ثانی۔ اقبال اور اورنگ زیب ان چیزوں کو اسلام کی کسوٹی پر کستے ہیں۔ تاکہ جو چیز شرعی معیار پر پُوری نہ اُترے، اسے رد کر دیا جائے۔ اگر پہلا گروہ نہ ہو تو خیالات اور فلسفہ کی نشوونما ختم ہو جائے۔ دماغ ایک محدود اور تنگ و تاریک دائرے سے باہر نہ نکلے۔ اور خیالات میں وسعت اور لچک نہ رہے۔ اگر دُوسرا گروہ اپنا کام بند کر دے تو ہر رطب و یابس، بلکہ ملحدانہ اور مضر خیالات قبول کر لیے جائیں اور قوم کا نہ صرف شرعی، بلکہ فکری اور روحانی نظام درہم برہم ہو جائے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام کی تاریخ میں دونوں اصول کار فرما رہے ہیں۔ وحدۃ الوجودیوں اور حق کو ہر گوشے میں تلاش کرنے والوں نے دوسری قوموں اور دوسرے طریقوں سے استفادہ کیا۔ اور ان کے قابلِ اخذ خیالات کو اسلام میں داخل کیا، لیکن جب اس طرح بعض مضر خیالات اور شعائر بھی رائج ہو گئے اور باہر کے عناصر قومی تخیل پر اس طرح چھا گئے کہ اصل اسلامی احکام نظر سے اوجھل ہونے شروع ہوئے تو ابنِ تیمیہ۔ ابنِ عبد الوہاب۔ حضرت مجدد اور اقبال نے اپنا کام شروع کیا اور اسلام کو غیر اسلامی عناصر سے پاک صاف کرنے کی کوشش کی۔

ظاہری نقطۂ نظر سے تو دوسری کوششیں شرع کی پابند اور اسلام کے لیے زیادہ

مفید معلوم ہوتی ہیں، لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اسلام کی روح کے لیے پہلی کوششیں اسی قدر ضروری نہیں؟ اسلام تو وہ مذہب ہے جس نے سابق کے تمام پیغمبروں اور ان کے مذہبوں کو سچا تسلیم کیا ہے اور ان کی نیک اور مفید باتیں اخذ کرلی ہیں۔ کیا یہ امر اسلام کی عین روح کے مطابق نہیں کہ اخذ و انجذاب کا یہ اصول جاری رہے اور جو باتیں اسلام کے بنیادی اصولوں کے متناقض نہیں، ان میں وسیع النظری سے کام لیا جائے اور حقیقت کو ہر گوشے میں تلاش کیا جائے؟

حضرت مجدد اسی زمانے میں پیدا ہوئے، جب ہندو احیائیت اور اکبر و ابوالفضل کی مصلحت کوشیوں سے اسلام کے لیے ایک عظیم خطرہ پیدا ہوگیا تھا۔ اور اسلامی معاشرے کو بچانے کے لیے سر الفراق کی ضرورت تھی۔ لیکن یہ امر قابل ذکر ہے کہ انھوں نے 'وحدت الوجود' کی بالکل نفی نہیں کی۔ بلکہ اسے 'وحدت الشہود' سے نچلے درجے پر ایک صوفیانہ مقام ظاہر کیا ہے۔

حضرت مجدّد اور شیخ ابن العربی

حضرت مجدد نے بعض جگہ شیخ ابن العربی کی کتابوں کے خلاف ایسی ادبیانہ شان سے اور ناقابلِ فراموش الفاظ میں (مارا بہ نص کار است، نہ بہ فص۔ مارا فتوحات مدنیہ از فتوحات مکیہ مستغنی ساختہ است) اظہار خیال کیا ہے۔ اور ان کا فلسفۂ وحدت الشہود اس طرح فلسفۂ وحدت الوجود کے مخالف سمجھا جاتا ہے کہ شیخ کے متعلق حضرت مجدد کے نقطۂ نظر کو ذرا وضاحت سے بیان کرنا مفید ہوگا۔

ہم حضرت مجددؒ کے والد مخدوم عبدالاحدؒ کا ذکر کرتے ہوئے لکھ چکے ہیں کہ وہ وحدت الوجودی خیالات کے تھے۔ اور حضرت مجددؒ کا بیان بھی نقل کرچکے ہیں کہ ابن الفقیہہ نصف الفقیہہ۔ ان کے بھی یہی خیالات ہوگئے۔ اور ایک مدت تک ان پر توحیدی رنگ غالب رہا۔ اس کے بعد ان پر وحدت الشہود منکشف ہوئی۔ اور انھوں نے شیخ ابن عربی سے اپنے اختلاف کا اظہار زوردار طریقے سے کیا۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ کلیتاً شیخ کے منکر تھے۔ زبدۃ المقامات میں خواجہ ہاشم کشمی

جو آخری سالوں میں کافی عرصہ ان کے ساتھ رہے، لکھتے ہیں "... شیخ محی الدین ابن العربی قدس سرہ رابس بزرگ مے دانستند و نیک یاد مے کردند" (زبدۃ المقامات)
فی الحقیقت شیخ کی نسبت ان کا نقطۂ نظر بڑا پیچ در پیچ تھا۔ بعض باتوں میں انھیں ان سے اختلاف تھا۔ اور بعض میں اشتراک رائے۔ لیکن شیخ کی عظمت اور پاکیزگی پر وہ بڑا زور دیتے تھے۔ شیخ کے متعلق حضرت مجدد نے اظہار خیال کئی جگہ کیا ہے آخری ایام کا ایک خط (دفتر سوم ۷۹) صاحبزادہ محمد معصوم کے نام ہے۔ اس میں شیخ ابن العربی کی نسبت لکھتے ہیں :-

"دریں عرصہ شیخ سست قدس سرہ کہ گاہے با وے جنگ است و گاہے صلح"
آگے چل کر لکھتے ہیں (ترجمہ)

ہم پسماندوں نے بھی اس بزرگ کی برکات سے استفادہ کیا ہے۔ اور اس کے علوم و معارف سے بہت فائدے حاصل کیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کو ہماری طرف سے جزائے خیر دے۔ لیکن چونکہ بشریت کے مطابق خطا و صواب ایک دوسرے کے ساتھ ملا جلا ہے۔ اور انسان احکام میں کبھی خطا پر ہے۔ اور کبھی صواب پر۔ اس لیے اہل حق کے سواد اعظم کے احکام کی موافقت کو صواب کا مصداق اور ان کی مخالفت کو خطا کی دلیل سمجھنا چاہیے۔ کہنے والا خواہ کوئی ہو۔ اور خواہ کوئی کلام ہو"

اسی زمانے کے ایک اور خط میں شیخ کی بعض شطحیات کا ذکر کر کے لکھتے ہیں :-

عجب معاملہ ہے۔ کہ شیخ باوجود اس گفتگو اور ان خلافِ جواز اور مخالف شطحیات کے مقبولوں میں سے نظر آتا ہے۔ اور اولیا کے زمرہ میں گنا جاتا ہے ... شیخ کو قبول کرنا چاہیے۔ اور ان کی مخالف باتوں کو قبول نہ کرنا چاہیے (دفتر سوم ۷۹)

حضرت مجدد نے وضاحت کی ہے کہ توحید وجودی کے متعلق ان کا اپنا نقطۂ نظر علما کا نہ تھا :-

"علما کا خلاف مشائخ کے ساتھ مسئلہ توحید وغیرہ امور خلافیہ میں نظر و استدلال

کی وجہ سے ہے ۔ اور فقیر کا خلاف ان کے ساتھ ان امور میں کشف و شہود کی راہ سے ہے ۔

علما ان امور کی قباحت کے قائل ہیں اور فقیر بشرط عبور ان کے حُسن کا" (دفتر دوم ص۲۲)

دفتر دوم کا پہلا مکتوب سارے کا سارا شیخ ابن العربی کے خیالات کے متعلق ہے اس ضمن میں شیخ کی بڑی تعریف کرنے کے بعد فرماتے ہیں :-

پس شیخ برسانِ متقدمانِ ایں طائفہ آمدہ و بجہتِ متاخران الیشان گفتہ ۔ معذالک دقائق کثیرہ دریں مسئلہ مختفی ماندہ است و اسرارِ غامضہ، ظہور نیامدہ کہ فقیر باظہارِ آں توفیق یافتہ است و بہ تحریر آں بشر گشتہ ۔

حضرت مجدد نے شیخ ابن العربی کی بعض باتوں کی تردید کی ۔ [مثلاً جہاں وہ اپنے آپ کو ختمِ ولایت محمدیہ بتا کر یہ کہتے ہیں کہ بعض علوم ختم النبوت نے ختم الولایت سے اخذ کیے (معاذ اللہ)] اور اصولی طور پر بھی وہ اس بات پر اصرار کرتے تھے کہ ہر بات کو مخبر صادق کے ارشادات کی روشنی میں پرکھنا چاہیے ۔" کہنے والا خواہ کوئی ہو ۔ اور خواہ کوئی کلام ہو۔" (کاش ان کے اپنے پُرجوش معتقدان اس اصول کو اختیار کرنے کی ضرورت محسوس کریں) ۔ لیکن جیسا کہ (دفتر دوم مکتوب اوّل کی) مندرجہ بالا عبارت سے ظاہر ہے ۔ وہ اپنے آپ کو شیخ ابن العربی کے کام کو آگے بڑھانے والا اور اس کی تکمیل کرنے والا سمجھتے تھے ۔ صاحبزادہ محمد معصوم کے نام کے مکتوب کے آخر میں، اگرچہ صراحتِ اسمی نہیں، لیکن مفہوم قریباً یہی ہے ۔ توحیدِ وجودی کے متعلق، جو ان کے اور شیخ کے درمیان سب سے بڑی وجۂ اختلاف سمجھی جاتی ہے انھوں نے بالصراحت کہا ۔ کہ "بشرطِ عبور" وہ اس کے حُسن کے قائل ہیں ۔ ان کی توحید شہودی شیخ کی توحیدِ وجودی کی ضد نہیں، بلکہ اس سے اگلی منزل ہے ۔ اسی طرح ابن العربی کے نظام باطنی کا مسئلہ ہے ۔ حضرت مجدد نے نہ صرف اسے قبول کیا بلکہ اسے ترقی دی ۔ اور طریقۂ مجددیہ کا قیوم، شیخ ابن العربی کے قطب کی ارتقائی صورت ہے ۔

جارحانہ ہندو احیائیت اور حضرت مجددؒ کا ردِ عمل۔

حضرت مجددؒ کی ایک نمایاں خصوصیت ان کا غیر مسلموں کے متعلق نقطۂ نظر ہے۔ ان سے پہلے ہندوستان میں بزرگانِ اہلِ طریقت نے غیر مسلموں کے ساتھ سختی اور شدت کی تلقین نہیں کی۔ مسلمان بادشاہوں کا ملکی اور فوجی مصلحتوں کی بنا پر ان سے خواہ کیا سلوک ہو اور فقہا اور علما ان کے متعلق خواہ کچھ ہی فتوے دیں، لیکن حضرات صوفیہ نے ان کے خلاف غیظ و غضب کا اظہار نہیں کیا۔ حضرت خواجہ بزرگ خواجہ معین الدین اجمیری قدس سرہ کو (بعض روایات کے مطابق) ایک ہندو راجا نے تکلیفیں دیں۔ انھوں نے اس کے حق میں بددعا بھی کی۔ لیکن عام ہندوؤں کے خلاف جوش اور غصے کا اظہار ان کے ارشادات میں نہیں ملتا اور خواجہ بزرگؒ کے معتقدین میں ہندو بھی شامل تھے۔ شہزادہ دارا شکوہ آپ کی نسبت سفینۃ الاولیا میں لکھتا ہے :۔

> "و جمع کثیرے از کفار بہ برکت قدوم ایشاں مسلمان شدند و جماعت کہ مسلمان نشدہ بودند، فتوح و دینار بے حد بخدمت ایشاں می فرستادند و ہنوز کفارے کہ دراں نواحی اند۔ بہ زیارتِ ایشاں می آیند۔ و مبلغہا بہ مجاوران روضۂ منورہ می گزرانند۔"

رائے بہادر پنڈت ہربلاس سارڈا حضرت خواجہ کی نسبت اپنی انگریزی تصنیف اجمیر میں لکھتے ہیں :۔

> انھوں نے کبھی کسی کو تنگ کرنے کا مشورہ نہیں دیا اور خدا کی تمام مخلوقات کی نسبت ان کا نقطۂ نظر صلح جوئی اور خیر خواہی کا تھا (ترجمہ)

حضرت خواجہ کے علاوہ جن دوسرے بزرگوں نے ہندوستان میں اشاعتِ اسلام کی ان کے حالات اور ارشادات بھی کسی غصے کے جذبے سے عاری ہیں۔ حضرت مجددؒ کا نقطۂ نظر اس سے بہت مختلف تھا۔ ان کے خطوط میں غیر مسلموں کے خلاف غیظ و غضب کا اظہار کثرت سے ہوا ہے اور انھیں ذلیل کرنے کی جا بجا تلقین ہے۔ اس نئے زاویۂ نگاہ کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ حضرت مجددؒ نے وہ زمانہ دیکھا تھا جب مسلمان

ایک مسلمان بادشاہ کے عہدِ حکومت میں احکامِ اسلامی جاری کرنے سے عاجز تھے۔

"در قرونِ ماضی کفار بر ملا طریقِ استیلا اجرائے احکامِ کفر در دارالاسلام می کردند و مسلمانان از اظہارِ احکامِ اسلام عاجز بودند و اگر می کردند بقتل می رسیدند۔ واویلاً واصیبتا، واحسرتا، واحزنا! محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہ محبوب رب العالمین است مصدقانِ او ذلیل و خوار بودند و منکرانِ او بعزت بودند و معاندان بسخریہ و استہزا بر جراحت ہائے ایشاں نمک پاشیدند۔"

حضرت مجدد کے حساس دل پر ان واقعات کا بڑا اثر ہوا اور نہ صرف اکبر کے خلاف، بلکہ غیر مسلموں کے متعلق بھی ان کے دل میں غصے اور انتقام کے جذبات پیدا ہو گئے۔ لیکن اصل وجہ یہ تھی کہ اگرچہ درباری مورخوں نے جنگوں اور جشنوں کی داستانوں سے حقیقتِ حال پر پردہ ڈال رکھا ہے، جیسا کہ ہم آگے چل کر تفصیلات دیں گے۔ اس وقت ہندوؤں میں احیائے مذہب کی تحریک زوروں پر تھی اور اطرافِ ملک میں اس کے جو مظاہرے ہوتے تھے، ان سے باغیرت مسلمانوں کے دل مجروح ہوتے تھے۔ حضرت کو ان واقعات کا بڑا قلق تھا اور ان کے دل میں انتقام اور غیظ و غضب کی آگ بھڑک اٹھی۔ شاید اس میں نہ صرف اس زمانے کے حالات کو، بلکہ حضرت مجدد کی اپنی حساس اور پُر جوش طبیعت (رگِ فاروقیم) کو بھی دخل تھا۔ وہ خود ایک خط میں شیخ فرید کو لکھتے ہیں:۔

"ہر کسے را در دل تمنائے امریست از امور۔ و تمنائے ایں فقیر شدت نمودن است، بدشمنانِ خدا و دشمنانِ پیغمبر و اہانت رسانیدن بایں بے دولتاں و خوار داشتن ایشاں و بیقین میداند کہ ہیچ عملے نزدِ حق عمل مرضی تر نیست۔"

معلوم ہوتا ہے کہ شیخ فرید اس انتہائی نقطۂ نظر کے قائل نہ تھے۔ چنانچہ حضرت مجدد بار بار انھیں خطوں میں، غیر مسلموں کو اپنی مجلس میں جگہ نہ دینے اور اگر آئیں تو ذلیل رکھنے کی ہدایت کرتے تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

---

[1] شاید ذبح بقر پر پابندیوں کی طرف اشارہ ہے۔

"پس اسلام کی عزت کفر اور کافروں کی خواری میں ہے۔ جس نے اہلِ کفر کو عزیز رکھا اس نے اہلِ اسلام کو خوار کیا۔ ان کے عزیز رکھنے سے فقط تعظیم کرنا اور بلند بٹھانا ہی مراد نہیں۔ بلکہ اپنی مجلسوں میں جگہ دینا اور ان کی ہم نشینی کرنا اور ان کے ساتھ گفتگو کرنا سب اعزاز میں داخل ہے۔ کتوں کی طرح ان کو دُور کرنا چاہیئے۔ اور اگر دُنیاوی غرض ان کے متعلق ہو، جو ان کے بغیر حاصل نہ ہوتی ہو تو پھر بھی بے اعتباری کے طریق کو مدِّ نظر رکھ کر بقدرِ ضرورت ان کے ساتھ میل جول رکھنا چاہیے۔ اور کمالِ اسلام تو یہ ہے کہ اس دُنیاوی غرض سے بھی درگزر کریں اور ان کی طرف نہ جائیں۔" (ترجمہ)

لہ یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ اخیر عمر میں حضرت مجدد کے طرزِ عمل میں زیادہ ملائمت آگئی۔ جس قسم کے خطوط کا ہم نے حوالہ دیا ہے، وہ دفترِ اوّل میں بہت ہیں۔ دفترِ دوم میں شاذ و نادر اور دفترِ سوم میں بالکل نادارد۔ بلکہ دفترِ سوم میں ایک خط ایسا ہے (مکتوب ۲۲) جس میں "المشرکون نجس" کی تاویل مشرکوں کے حق میں کی ہے اور مُلّا مقصود علی تبریزی کو لکھا ہے "آپ خلقِ خدا پر رحم کریں۔ اور عام طور پر ان کی نجاست کا حکم نہ دیں۔ اور مسلمانوں کو بھی کفار کے ساتھ ملنے جُلنے کے باعث جس سے چارہ نہیں، نجس نہ جانیں"۔ اسی طرح ایک اور خط میں انھوں نے چند سوالات کے جواب میں بعض ہنود کے "جذبہ" بلکہ "ایک قسم کی محبوبیت" کا ذکر کیا ہے "... ہم نے بہت سے ہندوؤں کو دیکھا ہے کہ جذبہ رکھتے ہیں۔ لیکن چونکہ صاحبِ شریعت علیہ السلام کی متابعت سے آراستہ نہیں ہیں۔ اس لیے خراب و ابتر ہیں اور جذب کی صورت کے سوا کچھ نصیب نہیں۔

سوال۔ جذب کا حاصل ہونا ایک قسم کی محبوبیت چاہتا ہے۔ پس کفار کے لیے جو اللہ تعالیٰ کے دشمن ہیں، جذبہ کا نصیب کس طرح تصوّر کیا جاتا ہے؟

جواب۔ ہو سکتا ہے کہ بعض کفار ایک قسم کی محبوبیت رکھتے ہوں جو ان کے جذب کے حاصل کرنے کا باعث ہوئی ہوں"۔ [دفترِ سوم مکتوب ۱۲۱۔ ص ۲۱۷]

اسی طرح جب شیخ فرید کی وفات کے بعد جہانگیر نے فتح کانگڑہ کے لیے ایک ہندو جرنیل کو مامور کیا تو مجددی تذکرہ نگاروں کے بیان کے مطابق حضرت مجدد نے اسے دُعا و بشارت سے سرفراز فرمایا۔

غیر مسلموں کے متعلق عام صوفیہ اور حضرت مجدد کے نقطۂ نظر میں جو اختلاف تھا، اس کا کچھ اندازہ سکھ راہنماؤں کے متعلق ان کے زاویۂ نگاہ سے ہو سکتا ہے۔ حضرت میاں میر کی معاصر سکھ گرو سے دوستی تھی اور سکھ روایات کے مطابق امرتسر کے مشہور تالاب کا سنگِ بنیاد حضرت میاں میر سے رکھوایا گیا۔ لیکن جب گرو ارجن دیو کی (شہزادہ خسرو کی سرپرستی کی وجہ سے) جہانگیر کے ساتھ (اور بعض نجی معاملات کی بناپر لاہور کے دیوان چندو لال سے کشمکش ہوئی۔ اور اس کشمکش میں اس کی موت واقع ہوئی تو حضرت مجدد نے شیخ فرید کے نام ایک خط میں اس پر بڑی خوشی کا اظہار کیا:-

"دریں وقت کشتنِ کافرِ لعین گوبند وال بسیار خوب واقع شد۔ و باعثِ شکستِ عظیم بر ہنودِ مردود گشت۔ بہر نیت کہ کشتہ باشند، و بہر غرض کہ ہلاک کردہ خواری کفار نقدِ وقت اہلِ اسلام است۔

غیر مسلموں کے متعلق عام صوفیہ اور حضرت مجدد کے نقطۂ نظر میں جو فرق تھا، اس کی بنیادی وجہ وہی تھی، جس کا ہم ذکر کر چکے۔ یعنی ہندو احیائیت کی تحریک جو بسا اوقات دار السلطنت یا بڑے اسلامی شہروں مثلاً لاہور سے دُور (اور بالخصوص ہندوؤں کے مقدس مقامات کے گرد و نواح میں) بڑی خطرناک صُورت اختیار کر لیتی تھی۔ عہدِ اکبری میں متھرا کے ایک برہمن نے مسجد کی اینٹ پتھر کو ایک مندر کی تعمیر میں جس طرح استعمال کیا۔ اور مسلمان عالم کی مزاحمت پر رسولِ اکرمؐ کی شان میں گستاخی کی، اس کا ہم ذکر کر چکے۔ اس واقعے کا بیان صفحاتِ تاریخ میں اس لیے آجاتا ہے کہ اس برہمن کو سزائے قتل دینے پر اکبر کے دربار میں بڑا ہنگامہ ہوا تھا۔ ہندوؤں کی سینہ زوری کے اور بھی کئی واقعات اطراف ملک میں ہو رہے تھے، لیکن درباری مورخین یا تو ان سے باخبر نہ تھے یا انھیں درجِ کتاب کرنا اپنے ممدوح بادشاہوں کی شان کے منافی سمجھتے تھے۔ حضرت مجدد کے مکتوبات میں ان کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ ایک جگہ تھانیسر میں ایک ایسے واقعہ کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

کفارِ ہند بے تحاشا مسجدوں کو گرا کر وہاں اپنے معبد و مندر تعمیر کر رہے ہیں۔
چنانچہ تھانیسر میں حوض کرکھیت (کوروکشیتر) کے درمیان ایک مسجد اور ایک بزرگ کا مقبرہ تھا۔ اس کو گرا کر اس کی جگہ بڑا بھاری مندر بنایا ہے (دفتر دوم مکتوب ۹۲)

اسی خط میں وہ آگے چل کر مسلمانوں کی مشکلات کی اور مثالیں دیتے ہیں (جو ہندو علاقوں میں دیہی اور کاروباری نظام ہندوؤں کے ہاتھ میں ہونے سے پیدا ہوتی تھیں)۔

نیز کفار اپنی رسموں کو کھلم کھلا بجا لا رہے ہیں۔ اور مسلمان اکثر اسلامی احکام کے جاری کرنے میں عاجز ہیں۔ ایکادشی کے دن ہندو کھانا ترک کر دیتے ہیں۔ بڑی کوشش کرتے ہیں کہ اسلامی شہروں میں کوئی مسلمان اس دن روٹی نہ پکائے اور نہ بیچے۔ اور ماہِ مبارک رمضان میں برملا نان و طعام پکاتے اور بیچتے ہیں۔ مگر اسلام کے مغلوب ہونے کے باعث کوئی روک نہیں سکتا۔

ہائے افسوس! بادشاہِ وقت ہم میں سے ہو اور پھر ہم فقیروں کا اس طرح خستہ و خراب حال ہو۔

یہ حالت تو شاہی علاقے کے قصبات و دیہات میں تھی۔ جہاں (مثلاً مشرقی پنجاب کے پہاڑی علاقے میں) ہندو ریاستیں ابھی قائم تھیں۔ وہاں قریب کی مسلمان آبادیوں پر گاہے گاہے حملے اور بڑے مظالم برپا ہوتے۔ حضرت مجددؒ ایک خط میں خواجہ شرف الدین حسین کو لکھتے ہیں:۔

تم کو معلوم ہو گا کہ ان ہی دنوں میں دار الحرب کے کفار نے نگر کوٹ کے گرد و نواح میں مسلمانوں اور مسلمانوں کے شہروں پر کیا کیا ظلم و ستم کیے ہیں۔ اور کیسی اہانت کی ہے۔ (دفتر دوم مکتوب ۶۹)

سرہند کا مقام وقوع ایسا تھا کہ اس کے ایک طرف ہندوؤں کا مذہبی مرکز تھانیسر تھا۔ دوسری طرف گوونددوال، جہاں ان دنوں گورو ارجن کا قیام تھا اور سکھ قوم کی نئی تنظیم ہو رہی تھی۔ جس میں جیسا کہ تزکِ جہانگیری سے پتا چلتا ہے، بعض

مسلمان بھی جذب ہو رہے تھے۔ تیسری طرف پرانا تیرتھ نگر کوٹ تھا۔ یہ سب ہندو سکھ احیائیت کے مرکز تھے۔ بیچ میں سرہند تھا۔ اس لیے حضرت مجدد کو ہندوؤں کی جارحانہ سرگرمیوں سے واقف ہونے کے وہ سامان میسر تھے، جو دارالسلطنت میں رہنے والوں (جیسے کہ بدایونی) کو بھی حاصل نہ تھے۔

اس کے علاوہ انھوں نے اپنے خسر (حاجی سلطان تھانیسری) کی زندگی (اور موت) میں (تھانیسر کے ہندوؤں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے) جو کچھ دیکھا۔ وہ ایک الگ درسِ عبرت تھا۔

حضرت مجدد کے گرد و پیش جب اس طرح کے واقعات پیش آ رہے تھے تو چنداں جائے تعجب نہیں کہ غیر مسلموں کی نسبت ان کا زاویۂ نگاہ عام صوفیہ سے بالکل مختلف تھا۔

حضرت مجدد کا غیر مسلموں کے متعلق جو خاص نقطۂ نظر تھا، اور جو فی الحقیقت ہندوؤں کی جارحانہ احیا کی تحریک کے خلاف ردِ عمل تھا، اس کا ایک اثر یہ ہوا کہ اکبر کے زمانے سے ہندوؤں کی تالیف قلوب کے لیے جو مصالحانہ کوششیں ہوئی تھیں، ان کی مخالفت شروع ہوئی۔ اکبر کے زمانے میں جزیہ موقوف ہوا تھا اور ذبح بقر پہ پابندیاں لگائی گئیں۔ حضرت مجدد کو یہ دونوں باتیں ناگوار تھیں اور ان کی بڑی خواہش تھی کہ جزیہ نئے سرے سے لگایا جائے اور ذبح بقر عام طور پہ رائج ہو۔ اس کی کوشش انھوں نے جہانگیر کی تخت نشینی کے فوراً بعد شروع کی۔ کئی خطوں میں اس بات کا افسوس کیا ہے کہ ہندوؤں سے جزیہ لینا برطرف کر دیا گیا ہے۔ ایک خط میں شیخ فرید کو لکھتے ہیں "جزیہ از اہلِ کفر[1] کہ در ہندوستان برطرف شدہ است۔

---

[1] حضرت مجدد نے ہنود کے لیے ذمی کا لفظ کہیں نہیں استعمال کیا۔ ہمیشہ اہل کفر کہتے ہیں۔ جزیہ کفار سے نہیں لیا جاتا۔ اہل کتاب ذمیوں سے لیا جاتا ہے۔ لیکن جب مسلمان ہندوستان میں آئے اور انھوں نے دیکھا کہ اکثر ہندو بت پرست ہیں لیکن ان کے طریقے کفارِ مکہ سے مختلف ہیں۔ اور [باقی اگلے صفحے پہ]

بواسطۂ شومیِ مصاحبت اہلِ کفر است با سلاطین ایں دیار "۔ ایک اور خط میں ذبح بقر کی تائید کی گئی ہے ۔ " ذبح بقر در ہندوستان از اعظم شعائرِ اسلام است ۔ در ابتدائے بادشاہت اگر مسلمانی رواج یافت ۔ فبہا ۔ اگر عیاذاً باللہ سبحانہٗ در توقف افتاد کار بر مسلماناں بسیار مشکل خواہد شد "۔

اختلافات کا حل

حضرت مجدد نے ہندوؤں کی جارحانہ احیائیت کا ترکی بہ ترکی جواب دیا ۔

وہ ان کوششوں کے بھی خلاف تھے ، جو اسلام اور ہندومت کے امتزاج کے متعلق بعض ہندو اور مسلمان پسند کرتے تھے ۔ دفترِ اوّل میں ایک خط ایک ہندو ہردے رام کے نام ہے ، جس نے حضرت مجدد کے نام دو خطوں میں فقرا و صوفیہ سے محبت کا اظہار کیا تھا اور لکھا تھا کہ رام اور رحمان حقیقت میں ایک ہیں ۔ حضرت مجدد کو اس طرزِ استدلال میں خطرہ نظر آتا تھا ۔ انھوں نے ایک مختصر خط میں مکتوب نگار کے نقطۂ نظر کی تردید کی اور لکھا " رام اور رحمان کو ایک جاننا بڑی بے وقوفی ہے ۔ خالق مخلوق کے ساتھ ایک نہیں ہوتا ۔ اور چوں بے چوں کے ساتھ متحد نہیں ہوتا "۔

غیر مسلموں کی نسبت حضرت مجدد کا اندازِ بیان عام صوفیہ سے مختلف تھا ۔ لیکن ان کا نقطۂ نظر محض منفیانہ نہ تھا ۔ انھوں نے حالات کے تحت بعض جگہ بڑے سخت الفاظ استعمال کیے ، لیکن ہندو مسلم مسئلے کا انھوں نے ایک حل بھی پیش کیا ۔ اور شاید کشیدگی کو دور کرنے اور ملک میں ایک خوشگوار فضا پیدا کرنے کے لیے سب سے کار آمد طریق کار وہی تھا ۔ ان کی نگہِ تیز بین نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلافات اتنے بنیادی ہیں کہ دینِ الٰہی کا ملغوبہ بنا کر ، یا رام اور رحمان کو ایک کہہ کر انھیں جوڑا نہیں جا سکتا ۔ یہ ایک سعیِ لاحاصل ہے ۔ یا خرابیوں کا پیش خیمہ

(بقیہ نوٹ صہ ۳۲۳)

ان میں سے کئی اپنے خیال کے مطابق خدائے واحد کی عبادت کرتے ہیں تو انھوں نے ان سے بھی وہی سلوک کیا جو فقہی کتب میں اہلِ کتاب ذمیوں کے لیے مخصوص تھا ۔ حضرت مجدد ہندو کو کافر کہتے ہیں لیکن وہ قدیم ہندوستان میں پیغمبر مبعوث ہونے کے قائل تھے ۔

اور بہر کیف اسلام اور مسلمانوں کے لیے ایک خطرۂ عظیم ہے۔ باہمی امن و امان کی خاطر اور ہندوستان کے خاص حالات کے لیے، زیادہ سے زیادہ وہ جس بات کو گوارا کر سکتے تھے، وہ یہ تھی "مسلمانان بر دینِ خود باشند و کفار بر کیشِ خود۔ (آیۂ کریمہ) لکم دینکم ولی دین بیان این معنی است" (مکتوبات) یعنی امتزاج یا اتحاد (Integration) نہیں۔ رواداری (Co-existence) اور کیا یہ طریق کار حالات کا واحد قابلِ عمل ہونے کے علاوہ منصفانہ نہ تھا؟

ہندوؤں کے متعلق حضرت مجدد نے بسا اوقات اظہارِ خیال بڑی تلخی اور غیظ و غضب سے کیا۔ اور بہر کیف ان کا اندازِ فکر اور اسلوب اظہار ان صوفیہ سے بالکل مختلف تھا، جنھیں ہندو احیائیت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ لیکن ہندو مسلم اختلافات کے متعلق تاریخ نے ان کے نقطۂ نظر کی تائید کی۔ ہندو مسلم اتحاد کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔ انگریزی عہد میں اختلافات اور بڑھ گئے۔ اور برصغیر کو بھارت اور پاکستان میں تقسیم کرنا پڑا۔ شاید ان ملکوں کے راہنما اور بیرونی خیر خواہ بھی کبھی سرہند کے اس "مردِ آخر بیں" کی رائے تسلیم کر لیں کہ ان دونوں کے درمیان امن اور سلامتی کا راستا اتحاد نہیں بلکہ ہمسایانہ رواداری (Neighbourly coexistence) ہے۔

مکتوباتِ امام ربانی

ہندوستان میں تصوف کی تھوڑی کتابوں کو وہ قدر و منزلت میسر آئی ہے، جو مکتوبات امام ربانی کو نصیب ہے۔ حضرت سرہندی کی زندگی ہی میں ان کی نقلیں، ہندوستان اور ہندوستان سے باہر دوسرے ملکوں میں پھیل گئی تھیں۔ اور آج بھی ان کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ مولانا عبد الماجد دریابادی لکھتے ہیں:-

"تصوف اسلام کے ذخیرہ میں سب سے زیادہ اثر میرے اوپر دو ہی کتابوں کا پڑا ہے۔ نمبر اول پر مثنوی ہے۔ جس نے دہریت و الحاد سے کھینچ کر مجھے اسلام کی راہ دکھائی — اس اجمال کے بعد ضرورت تفصیل کی تھی۔ یعنی اسلام کے اندر عقائد و اعمال میں متعین راہ کون سی اختیار کی جائے۔ اس باب میں شمع ہدایت کا کام مکتوبات ہی نے دیا۔"

مکتوباتِ امامِ ربانی حضرت مجددؒ کی زندگی میں ہی مرتب ہو گئے تھے۔ ان کی تین جلدیں ہیں۔ دفترِ اوّل۔ جسے دُرّ المعرفت بھی کہتے ہیں۔ ۳۱۳ خطوط پر مشتمل ہے۔ اسے خواجہ یار محمد بدخشی نے ۱۶۱۶ء میں یعنی محبوسی سے تین سال پہلے ترتیب دیا ہے۔ یہ مجموعہ سب سے مفصل ہے۔ اور اس میں کئی سالوں کے خطوط جمع ہیں۔ پہلے میں خطوط وہ ہیں، جو حضرت سرہندی نے اپنے پیر و مرشد خواجہ باقی باللہؒ کو لکھے۔ پھر متعدد خطوط شیخ فرید اور دوسرے امرائے جہانگیری کے نام ہیں، جن میں انھیں تلقین کی گئی ہے کہ وہ نئے بادشاہ کے زمانے میں ترویجِ دین کی کوشش کریں۔ باقی خطوط میں سوالوں کے جواب ہیں۔ یا علمی اور مذہبی مسائل کی توضیح ہے۔ چونکہ اس زمانے میں ان کے مکتوب یازدہم پر (جس میں انھوں نے اپنے عروج کا ذکر کیا تھا) اعتراضات شروع ہو گئے تھے۔ اس لیے اس جلد کے آخر میں کئی خطوط اپنے معترضوں کی تسکین کے لیے لکھے گئے ایک چالیس صفحے کا خط اپنے مرشد زادوں کے نام ہے۔ جس میں اہلِ سنت والجماعت کے عقائد بیان کیے ہیں۔ دفترِ اوّل کے آخر میں جواں مرگ صاحبزادہ خواجہ محمد صادقؒ کے وہ تین خطوط درج ہیں، جو انھوں نے اپنے والد ماجدؒ کی خدمت میں ارسال کیے۔

دفترِ دوم، جس کا تاریخی نام نور الخلائق ہے ۱۶۱۹ء میں یعنی واقعہ قید سے ذرا پہلے مرتب ہوا۔ اسے خواجہ عبد الحی نے خواجہ محمد معصومؒ کے ایما پر جمع کیا۔ اس میں خطوط تھوڑے ہیں۔ فقط ننانوے ۹۹۔ لیکن ان میں سے بعض بڑے طویل اور مفصل ہیں۔ ایک خط بیس صفحے سے زیادہ خواجہ محمد تقی کے نام ہے۔ جس میں اہلِ سنت اور شیعوں کے خیالات سے بڑی مدلل بحث کی ہے اور اپنے نقطۂ نظر کی توضیح کی ہے۔ ایک پندرہ صفحے کا خط خان جہان کے نام ہے۔ اس میں اسلامی عقائد کو تفصیل سے منضبط کیا ہے۔ چند ایک خط اپنے مرشد زادوں کے متعلق ہیں۔ باقی خطوط میں بیشتر مسائلِ صوفیہ کی توضیح ہے۔

دفترِ سوم موسوم بہ معرفت الحقائق کی ترتیب میر محمد نعمانؒ نے شروع کی۔ لیکن انھوں نے فقط تیس کے قریب مکاتیب جمع کیے تھے۔ باقی کو خواجہ محمد ہاشم کشمی

برہانپوری نے ۱۶۲۲ء میں یعنی حضرت مجدد کی وفات سے تین سال پیشتر نقل کرنا شروع کیا۔ پہلے اس میں ۱۱۴ خطوط تھے۔ خواجہ محمد ہاشم زبدۃ المقامات میں لکھتے ہیں کہ دفتر سوم ۱۱۴ مکاتیب پر ختم کر دیا گیا۔ اور دفتر چہارم شروع ہوا، لیکن ابھی چودہ مکاتیب لکھے گئے تھے کہ حضرت مجدد کا وصال ہوگیا۔ اس لیے ان چودہ مکاتیب کو بھی دفتر میں شامل کر لیا گیا۔ اس حساب سے دفتر سوم میں ۱۲۸ مکاتیب ہونے چاہئیں۔ لیکن مطبوعہ دفتر سوم میں ۱۲۴ مکاتیب ہی ملتے ہیں۔ یعنی زبدۃ المقامات کے بیان کے مطابق ۴ مکاتیب مطبوعہ نسخوں میں نہیں۔ دفتر سوم کے بیشتر خطوط اس وقت لکھے گئے، جب حضرت مجدد قلعۂ گوالیار میں محبوس تھے یا لشکرِ شاہی کے ہمراہ رہتے تھے، کئی ایک خطوط مخدوم زادگان کے نام ہیں۔ ایک خط (۱۰۹) میں اس گفتگو کا ذکر ہے، جو حضرت مجدد نے ایک دفعہ جہانگیر کی مجلس میں کی تھی۔ ایک خط جہانگیر کے نام ہے۔ جس میں دُعا کے اسرار اور علما و صلحا کی تعریف بیان کی ہے۔

ایک نہایت دلچسپ خط (۴۱) ایک صالحہ عورت کے نام ہے، جس میں ان شرطوں کی توضیح کی ہے، جن پر عورتوں کی بیعت ہونی چاہیے۔ اور اس میں تمام وہ بدعتیں بالتفصیل گنائی گئی ہیں۔ جن میں ہندوستانی عورتیں خاص طور پر گرفتار ہیں۔ (مثلاً سیتلا اور چیچک کے موقع پر دیوی کی منت ماننا۔ مشائخ کی قبروں پر منت کے جانور ذبح کرنا۔ پیروں کے روزے رکھنا۔ شگون کا اعتبار کرنا۔ جادو کا قائل ہونا) اور جن کی اصلاح کے لیے حضرت سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید نے کوشش کی۔

مکتوبات سے ہم نے اس قدر حوالے دیے ہیں کہ اب کسی طویل اقتباس کی ضرورت نہیں رہتی۔ وہ تو تمام کے تمام پڑھنے اور غور کرنے کے لائق ہیں۔ لیکن انھیں پڑھنے سے پہلے تصوف اور مذہب اسلام کے مشہور مسائل اور ان کی تاریخ سے تھوڑی بہت واقفیت ہونی چاہیے۔ تاکہ حضرت مجدد کی قابلیت، دلاوت خیالی اور سلیم الطبعی کا صحیح اندازہ ہو سکے اور یہ معلوم ہو کر جو صدیوں کی پرانی گتھیاں تھیں، انھیں شرع اور عقل و سمجھ کے موافق انھوں نے کس طرح سلجھانے کی کوشش کی۔

اس کے علاوہ عہدِ اکبری اور عہدِ جہانگیری کے واقعات اور ممتاز شخصیتوں سے تھوڑی بہت واقفیت ہو تو مکتوبات کی دلچسپی اور بڑھ جاتی ہے۔

مکتوبات کی مقبولیت کی اگر بڑی وجہ ان کے مضامین کی خوبی، تنوع اور صاحبِ مکتوبات کی علمیت اور رُوحانی فضیلت ہے تو اس کے علاوہ حضرت مجدد کے طرزِ تحریر کو بھی ان کے اثر میں بڑا دخل ہے۔ ان مکتوبات سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ مجدد بڑے بلند پایہ اہلِ قلم تھے اور خط لکھتے وقت مکتوبات کی انشائی خوبیوں پر بھی پُوری نظر رکھتے تھے۔ ان کے خطوط میں بیشتر علمی اور دینی مسائل ہیں اور ان کے لیے وہی عالمانہ طرزِ تحریر اختیار کیا ہے۔ جس میں زیادہ سے زیادہ معانی تھوڑے سے الفاظ میں ادا ہو جائیں۔ وہ اربابِ تصوف کی مروجہ اصطلاحیں کثرت سے استعمال کرتے تھے اور جو لوگ ان سے ناواقف ہیں، انھیں بعض مطالب سمجھنے میں دقت ہوتی ہے۔ لیکن عام طور پر ثقیل الفاظ تھوڑے ہیں اور بالخصوص ان مکتوبات میں جو عقائد کی توضیح میں یا مبتدیوں اور نوجوان طالبوں کو لکھے گئے، زبان بڑی سلیس اور عام فہم ہے۔ مکتوباتِ امام ربانی کا ایک اہم جزو معاصرانہ اُمرا کے نام ہے۔ جس میں انھیں شریعت کو سنبھالنے اور اسلام کی مدد کرنے کی تلقین کی ہے۔ ان خطوط کا طرزِ تحریر علمی خطوط سے مختلف ہے۔ عالمانہ اصطلاحیں ان میں بہت کم ہیں۔ الفاظ پُر وقار مگر سریع الفہم ہیں، لیکن طرزِ تحریر میں ایک جوش ہے۔ خطیبانہ اور پُر تاثیر۔ یہ خطوط دل سے نکلے ہوئے جذبات کا آئینہ ہیں۔ اس لیے دل پر اثر کرتے ہیں۔

آپ تشریح اور تاثیر کے لیے گاہے گاہے مکاتیب میں کوئی دلچسپ شعر یا مصرع بھی درج کر دیتے۔ جس سے اندراج کی دلچسپی میں اضافہ ہو جاتا۔ اس کے علاوہ الفاظ کے انتخاب اور تقابل کا بھی خیال کرتے۔ ایک خط میں ملا حسن کشمیری کو لکھتے ہیں:-

"نوشتہ بودند کہ شیخ عبدالکبیر یمنی گفتہ است کہ حق سبحانہ و تعالیٰ عالم الغیب نیست

بے اختیار رگِ فاروقیم در حرکت می آید۔ و فرصت تاویل و توجیہ نمی دہد۔ تا آں ایں سخناں شیخ کبیر یمنی باشد یا شیخ اکبر شامی، کلام محمد علیہ و آلہ والصلوٰۃ والسلام درکار است۔ نہ کلام محی الدین عربی و صدرالدین قونیوی و عبدالرزاق کاشی۔ مارا بہ نص کار است۔ نہ بہ فص۔ مارا فتوحاتِ مدنیہ (یعنی احادیث) از فتوحاتِ مکیہ مستغنی ساختہ است۔

ہم لکھ چکے ہیں کہ حضرت کا طرزِ تحریر یا تو علمی ہوتا ہے، علمی مسائل کی توضیح کے لیے یا خطیبانہ۔ جب اپنے جذبات کا اظہار اور دوسروں کو کسی اقدام کی تلقین مقصود ہو۔ لیکن چند ایک خطوط اس تقسیم سے باہر ہیں۔ ان میں سے ایک خط جو انھوں نے صاحبزادوں کو حالتِ قید میں لکھا اور جس میں پدرانہ محبت نے نہایت ملائم اور شیریں الفاظ کا جامہ پہنا ہے، درج کیے بغیر جی نہیں مانتا:۔

" فرزندان گرامی بہ جمعیت باشند۔ مردم ہمہ وقت محنتہائے مارا در نظر میدارند و مخلصی ازیں مضیق می طلبند۔ نمیدانند کہ در نامرادی و بے اختیاری چہ بلا حسن و جمال است۔ و کدام نعمت برابر آں است کہ ایں کس را بے اختیار از اختیار او برآرند۔ و باختیار خود او را از ناکامی دہند۔ و اصول اختیاری او را نیز تابع آں بے اختیاری او ساختہ او را از زور اختیار او برآرند۔ ۔۔۔ در ایام حبس گاہے کہ مطالعۂ ناکامی و بے اختیاری خود می نمودم۔ عجب حظی می گرفتم و طرفہ ذوقی می یافتم۔ بلکہ ارباب فراغت، ذوقِ ارباب بلا را چہ دریابند۔ و از بلائے جمال او چہ درک نمایند۔ طفلاں را حظ منحصر در شیرینی است و آنکہ از تلخی حظ وافر گرفتہ است۔ شیرینی را بجوے نمی خرد ع

مرغِ آتش خوارہ کَے لذّت شناسد دانہ را

تاریخی لحاظ سے اس سے بھی اہم خط وہ ہے، جو صاحبزادگان کے نام واقعۂ قید کے بالکل آغاز میں لکھا گیا۔ اس میں ان کے لیے پدرانہ نصیحتیں ہیں۔ عتابِ شاہی سے جو صورتِ حالات پیدا ہو گئی تھی، اس کا اظہار بھی ہے۔ اور اس کے مقابلے میں ظرف اور حوصلے اور تسلیم و رضا کا مظاہرہ ہے۔ ہم اسی "وصیت نامہ" پر اس بیان کو ختم کرتے ہیں

فرزندِ عزیز!

ابتلا کا وقت اگرچہ تلخ و بے مزہ ہوتا ہے۔ لیکن اگر فرصت دیں تو غنیمت ہے۔ تم کو اب فرصت مل گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حمد بجا لا کر اپنے کام میں لگے رہو۔ اور ایک دم بھی فراغت و آرام اپنے لیے پسند نہ کرو۔ اور تین چیزوں میں سے ایک میں ضرور مشغول رہو۔ قرآن شریف کی تلاوت کرو۔ یا لمبی قرات کے ساتھ نماز کو ادا کرو۔ یا کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ کی تکرار کرتے رہو۔ کلمہ لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ حق تعالیٰ کے سوا تمام جھوٹے خداؤں اور اپنے نفس کی خواہشات کی نفی کرنی چاہیے۔ اور تمام مرادوں اور مقصودوں کو دفع کرنا چاہیے۔ کیونکہ اپنی مراد کا طلب کرنا اپنی الوہیت کا دعویٰ کرنا ہے۔ بلکہ سینہ میں کسی مراد کی گنجائش نہ رہے۔ اور متخیلہ میں بھی کوئی ہوس باقی نہ رہے تاکہ بندگی کی حقیقت حاصل ہو۔ اپنی مراد کو طلب کرنا گویا اپنے مولا کی مراد کو دفع کرنا اور اپنے مالک کے ساتھ مقابلہ کرنا ہے۔ اس امر میں اپنے مولا کی نفی اور اپنے مولیٰ بننے کا اثبات ہے۔ اس امر کی برائی اچھی طرح معلوم کر کے اپنی الوہیت کے دعوے کی نفی کرو۔ تاکہ تمام ہوا و ہوس سے کامل طور پر پاک ہو جاؤ۔ اور طلب مولا کے سوا تمھاری کوئی مراد نہ رہے۔ یہ مطلب اللہ تعالیٰ کی عنایت سے بلا و ابتلا کے زمانہ میں بڑی آسانی سے میسر ہو جاتا ہے۔ اور اس زمانہ کے سوا ہوا و ہوس سدِ سکندری ہے۔ گوشہ میں بیٹھ کر اس کام میں مشغول رہو۔ کہ اب فرصت غنیمت ہے۔ فتنہ کے زمانے میں تھوڑے سے کام کو بہت اجر کے عوض قبول کر لیتے ہیں۔ اور فتنہ کے زمانے کے سوا سخت ریاضتیں اور مجاہدے درکار ہیں۔ اطلاع دینا ضروری ہے۔ شاید ملاقات ہو یا نہ ہو۔

یہی نصیحت ہے کہ کوئی مراد ہوس نہ رہے۔ اپنی والدہ کو بھی اس امر پر اطلاع دے دو۔ اور اسے اس پر عمل پیرا ہونے کی ترغیب دو۔

باقی احوال چونکہ یہ جہاں فانی اور گزرنے والا ہے کیا لکھے جائیں۔ چھوٹوں پر شفقت رکھو۔ اور ان کو پڑھنے کی ترغیب دو۔ اور جہاں تک ہو سکے، تمام

اہلِ حقوق کو ہماری طرف سے راضی کرو۔ اور ایمان کی سلامتی کی دُعا سے ممد و معاون ہو۔ بار بار یہی لکھا جاتا ہے کہ اس وقت کو بیہودہ امور میں ضائع نہ کرو۔ اور ذکرِ الٰہی کے سوا کسی کام میں مشغول نہ ہو۔ اب کتابوں کے مطالعہ اور طلباء کے تکرار کا وقت نہیں ہے۔ اب ذکر کا وقت ہے۔ تمام نفسانی خواہشوں کو جو بجو تے خدا ہیں لآ کے نیچے لا کر سب کی نفی کر دو۔ اور کوئی مُراد و مقصود سینے میں نہ رہنے دو۔ حتیٰ کہ میری خلاصی بھی جو کر تمہارے لیے نہایت ضروری ہے۔ تمہاری مُراد و مطلوب نہ ہو۔ اور حق تعالیٰ کی تقدیر اور فعل اور ارادہ پر راضی ہو۔ اور کلمہ طیبہ کے اثبات کی جانب میں غیب ہویت کے سوا جو تمام معلومات و متخیلات کے وراء الوراء ہے۔ کچھ نہ رہے۔ حویلی و سرائے و چاہ و باغ اور کتابوں اور دوسری تمام اشیاء کا غم سہل ہے۔ ان میں کوئی چیز تمہارے وقت کی مانع نہ ہو اور حق تعالیٰ کی مرضیات کے سوا تمہاری کوئی مُراد و مرضی نہ رہے۔ ہم اگر مر جاتے تو یہ چیزیں بھی چلی جاتیں بہتر ہے کہ ہماری زندگی میں چلی جائیں تاکہ کوئی فکر نہ رہے۔ اولیاء نے ان امور کو اپنے اختیار سے چھوڑا ہے۔ ہم حق تعالیٰ کے اختیار سے ان امور کو چھوڑ دیں۔ اور شکر بجا لائیں۔ امید ہے کہ مخلصین بفتح لام میں سے ہو جائیں گے۔ جہاں تم بیٹھے ہو۔ اسی کو اپنا وطن خیال کرو۔ چند روزہ زندگی جہاں گزرے۔ یادِ حق میں گزر جائے۔ دُنیا کا معاملہ آسان ہے۔ اس کو چھوڑ کر آخرت کی طرف متوجہ رہو۔

اپنی والدہ کو تسلی اور آخرت کی ترغیب دو۔ باقی رہی ایک دُوسرے کی مُلاقات اگر خدائے تعالیٰ کو منظور ہوا۔ تو ہو کر رہے گی۔ ورنہ اس کی تقدیر پر راضی رہو اور دُعا کرو کہ دارالسلام میں سب جمع ہوں۔ اور دُنیاوی مُلاقات کی تلافی کو اللہ تعالیٰ کے کرم سے آخرت کے حوالہ کریں۔ الحمد للہ علیٰ کلِّ حال۔

مخدوم زادگان کی والدۂ محترمہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی نسبت کہا جاتا ہے کہ آپ کے دو خوارق تھے۔ ایک تو آپ کے مکاتیب، دوسرے آپ کے فرزندانِ گرامی۔

ایک سے آپ کی علمیت، ذہنی جرأت، سلیم الخیالی، حمیتِ دینی اور سلیقہ، تحریک کا پتا چلتا ہے، جن کا ظہور آپ کے مکتوبات میں ہُوا ہے۔ دوسرے سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ آپ ایک خوش قسمت، شفیق اور فرض شناس باپ تھے، جنھوں نے اپنے بیٹوں کی تعلیم و تربیت اس طرح کی کہ وہ مراتب عالیہ کو پہنچے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ کڑی آزمائشوں (مثلاً زمانہ طاعون میں تین صاحبزادگان اور ایک صاحبزادی کی وفات، عہدِ جہانگیری میں قید اور پھر لشکر میں نظر بندی) کے باوجود آپ کے خاندان کو ایک مثالی خاندان سمجھنا چاہیے۔

آپ کی زوجہ محترمہ ایک بڑے باپ کی بیٹی تھیں اور آپ سے انتساب اور آپ کے دُکھ سکھ میں شریک رہنے کی وجہ سے ہی ہماری روحانی تاریخ میں انھیں جو مرتبہ مل جاتا ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں۔ لیکن مکاتیب اور تذکروں میں جو ضمنی اطلاعات ملتے ہیں، ان سے پتا چلتا ہے کہ محترمہ نہ صرف ایک بڑی عابدہ، متدین اور باہمت خاتون تھیں، بلکہ آپ دونوں کے درمیان غیر معمولی محبت اور یگانگت کا رشتہ تھا۔ اور آپ کو ان کا بڑا پاسِ خاطر ملحوظ تھا۔

حضرت مجددؒ کو جس طرح آپ کا خیال رہتا تھا، اس کا تھوڑا بہت اندازہ اس اہم خط سے ہوتا ہے، جو انھوں نے قید کے بالکل آغاز میں صاحبزادگان کے نام لکھا۔ (دفتر سوم، مکتوب دوم)۔ اس میں صبر و تسلیم کی پُوری وضاحت کرکے اور رضائے الٰہی کے سامنے اپنی خواہشات کو بالکل مٹا دینے کے بارے میں متعدد دلائل دے کر لکھتے ہیں۔ "والدہ، خود را نیز بدیں معنی مطلع سازند و دلالت نمائند"۔ خط کے آخر میں پھر انھیں کا ذکر ہے۔ "والدہ، خود را تسلی دہند" لیکن شاید اس سے بھی اہم ایک اور واقعہ ہے، جو غیر معمولی یگانگت، محبت اور اعتماد کی نشاندہی کرتا ہے۔ جب آپ اجمیر میں تھے۔ تو حضرت خواجہ اجمیری کے خادمانِ درگاہ نے ان کے مزار کا قبر پوش، جو ہر سال اُتارا جاتا ہے، اور کم از کم اس زمانے میں، فقط خواص کے لیے تحفہ تھا، آپ کو پیش کیا۔ آپ نے ادب سے قبول کیا۔ اور خادم کو دے کر کہا۔ کہ یہ

لباس جو حضرت خواجہ کے اس قدر قریب تھا' ہمارے کفن کے لیے محفوظ رکھا جائے۔ یہ روایت خواجہ ہاشم کشمی کی ہے' جو سفرِ اجمیر میں ساتھ تھے۔ لیکن آگے چل کر وہی لکھتے ہیں۔ کہ جب آپ کا وقتِ وصال آن پہنچا تو آپ نے اپنی اہلیہ محترمہ سے فرمایا۔ "باید کہ از مبلغ مہر خود کفنِ من سازی"۔ اس غیر معمولی وصیت کی سوائے اس کے کوئی اور وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ آپ کو محترمہ کی انتہائی عقیدت کا احساس تھا (جس کی تائید تذکرہ نگاروں کے بیان کردہ دوسرے واقعات سے بھی ہوتی ہے) اور اس اعزاز سے اس عقیدت کا اعتراف اور پوری یگانگت کا اظہار مقصود تھا۔

تذکرہ نگار صاحبزادگان کی والدہ محترمہ کی عبادت اور پرہیزگاری کی بڑی تعریف کرتے ہیں اور ہم حضرات القدس کی بیان کردہ ایک حکایت سے اس رابعہ عصر کے متعلق اس مختصر اندراج کو ختم کرتے ہیں:۔

ایک دفعہ آپ زمانۂ شباب میں بیمار ہوئے۔ اور اتنا ضعف بڑھا کہ سب لوگ مایوس ہو گئے۔ والدۂ حضرت مخدوم زادگان عالی قدر یعنی حضرت کی بی بی صاحبہ نے جو ایک صالحہ اور عابدہ بی بی تھیں' نیا وضو کیا۔ اور دو رکعت نماز ادا کی۔ اور بکمال گریہ زاری و نیاز درگاہ باری جلت عظمتہ میں آپ کی صحت و عافیت کے لیے دعا کی۔ اس حال میں اس زہراء وقت کو نیند آگئی۔ آپ نے خواب میں دیکھا کہ کوئی کہنے والا آپ سے کہہ رہا ہے کہ اطمینان رکھو۔ ہم کو ان سے بڑی خدمتیں لینی ہیں۔ اور ابھی تو ہزار خدمتوں میں سے ایک بھی نہیں لی گئی۔ خدائے پاک عنقریب آپ کو صحت کامل عطا فرمائے گا۔ اور مراتب قرب تک پہنچائے گا (۹)

خواجہ محمد سعیدؒ | حضرت مجددؒ کے بڑے صاحبزادے خواجہ محمد صادق تھے' جو عین جوانی میں بعارضۂ طاعون وفات پا گئے۔ دوسرے بیٹے خواجہ محمد سعیدؒ تھے' جو شعبان ۱۰۰۵ھ (اپریل ۱۵۹۷ء) میں پیدا ہوئے۔ علوم متداولہ' عقلیہ و نقلیہ کی پوری طرح تحصیل کی اور پھر درس و تدریس شروع کی۔ حضرات القدس میں لکھا ہے۔ "کتبِ متعلقہ مثل شرح حکمت العین اور عضدی اور بیضاوی کا درس دیا کرتے

تھے۔ اور تصانیف لطیفہ تحریر فرمائیں۔ چنانچہ آپ نے مشکوٰۃ شریف پر حاشیہ لکھا اور حنفی مذہب کی تائید کی۔ اور ایک حاشیہ متن حاشیۂ خیالی پر لکھا.... ایک رسالہ تشہد میں دفع سبابہ کی ممانعت کے بارے میں تحریر فرمایا" آپ کے مکتوبات حال (۱۹۶۶ء) میں مکتبۂ حکیم سلفی لاہور[1] کی طرف سے شائع ہو گئے ہیں۔ بعض مکاتیب

---

[1] مکتوبات سعیدیہ کے ناشر حکیم ذوالقرنین صاحب نے کتاب کے شروع میں لکھا ہے: "چیف ایڈمنسٹریٹر صاحب اوقاف مغربی پاکستان جناب شیخ محمد اکرام صاحب نے [مکتوبات سعیدیہ کی] کتابت کے حُسن و جمال اور صاحب کلام کے علوِ مرتبہ و کمال کو دیکھ کر اس کی طباعت و اشاعت کے لیے محکمہ سے قرضِ حسنہ دینا منظور فرمایا" یہ بیان ذرا وضاحت طلب ہے۔ مکتوباتِ سعیدیہ کی اشاعت کے لیے مجھے سب سے پہلے جناب مولانا ابوالخلیل صاحب سجادہ نشین خانقاہ کندیاں شریف مدظلہ نے ارشاد فرمایا تھا۔ بلکہ انھوں نے بکمال محبت دینی و معارف پروری اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ بھی ارسال فرمایا۔ چنانچہ اسی نسخہ کی بنا پر کتاب کی اشاعت کا ارادہ تھا۔ لیکن اس دوران میں سید شبیر بخاری صاحب مشیر تعلیمات و ناظم نشریات محکمہ اوقاف حکیم ذوالقرنین صاحب والا نسخہ لائے، جس کی کتابت میں واقعی بڑا اہتمام کیا گیا تھا۔ چنانچہ اسی کی اشاعت کا انتظام ہوا۔ (۱) مکتوباتِ سعیدیہ کی اشاعت کے علاوہ راقم السطور کی نظامتِ اوقاف کے زمانے میں مجددیہ سلسلہ کی جن اصل فارسی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ وہ حسبِ ذیل ہیں: (۲) مکتوبات امام ربانی ہر سہ دفتر (امرتسری ایڈیشن) (۳) رسائل مجددیہ (۴) مکتوبات خواجہ محمد معصومؒ (ہر سہ دفتر) (۵) زبدۃ المقامات (۶) حضرات القدس (دفتر ثانی مع تذکرہ حضرت خواجہ باقی باللہ) دفتر اوّل اور (۷) کلیات حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ۔ [دیوان ہاشم کشمیؒ کے لیے بھی کوشش جاری ہے] محکمہ اوقاف کتاب کی نصف لاگت کے لیے قرضِ حسنہ دینے کے علاوہ اس کے سو نسخے خریدتا تھا۔ فی الواقع ان کتابوں کی اشاعت ناشرین کی ہمت اور محبت و عقیدت کی مرہونِ منت ہے۔ افسوس کہ اب فارسی کا رواج اس قدر کم ہو گیا ہے کہ ان کتابوں کی عام نکاسی بہت تھوڑی ہے لیکن انھیں کم از کم سب کتب خانوں میں ہونا چاہیے اور سلسلہ کے سجادہ نشین حضرات اور دوسرے محبوں کو بھی باہمت ناشرین کی سرپرستی کرنی چاہیے۔

عربی میں ہیں۔ اور سب ملا کر ایک سو سے زیادہ نہیں (غالباً یہ ایک انتخابی مجموعہ ہے)، لیکن "ہر چند بقامت کہتر، بقیمت بہتر" والا معاملہ ہے۔ معانی کی گہرائی اور عبارت کی شیرینی نے اس مختصر مجموعہ میں عجب دلکشی پیدا کر دی ہے۔ تو خطوط اورنگ زیب عالمگیر کے نام ہیں۔ جن میں شاید بعض (مثلاً مکتوب ۸۲ بنام خلد الدین) اس کی شہزادگی کے زمانے کے ہیں ان مکاتیب کا خواجہ محمد معصومؒ کے مکاتیب کی تین جلدوں اور عالمگیر نامہ کے ساتھ ملا کر مطالعہ کریں تو خیال ہوتا ہے کہ اگرچہ عالمگیر دونوں بھائیوں کا قدردان تھا۔ اور ان دونوں کے درجات عالیہ میں کلام نہیں۔ لیکن شاید حضرت مجددؒ کا جانشین، اُن کے زندہ بیٹوں میں سب سے بڑا ہونے کی وجہ سے) خواجہ محمد سعیدؒ کو سمجھا جاتا تھا۔ خواجہ محمد معصومؒ کے مکاتیب کی پہلی جلد میں فقط ایک خط "شاہزادہ دین پناہ سلطان محمد اورنگ زیب" کے نام ہے۔ جہادِ اصغر و جہادِ اکبر کے فضائل میں (مکتوب ۱/۶۴)۔ دوسری جلد میں بھی ایک ہے " در فنائے قلب و فنائے نفس" (مکتوب ۲/۵) تیسری جلد میں چار اہم مکاتیب اورنگ زیب کے نام ہیں۔ (۳/۶، ۱۲۲، ۲۲۱، ۲۲۷) اور تین خطوط شیخ سیف الدین کے نام ایسے ہیں، جو عالمگیر کے متعلق ہیں۔ (۲۲۰، ۲۳۳، ۲۴۲) اس تفاوت کی وجہ غالباً یہ ہے کہ تیسری جلد خواجہ محمد معصومؒ کے آخری سالوں کے متعلق ہے۔ جب خواجہ محمد سعید وفات پا چکے تھے۔ خواجہ محمد معصوم کار و بارِ ارشاد و ہدایت کے تنہا ذمہ دار تھے۔ اور انھوں نے اپنے صاحبزادے شیخ سیف الدین کو لشکرِ شاہی میں بھیج رکھا تھا۔

خواجہ محمد سعید اور خواجہ محمد معصوم کے تعلقات میں برادرانہ محبت اور یگانگت تھی۔ شاہجہاں کے آخری ایام میں (۱۰۶۷ھ / ۵۷-۱۶۵۶ء) وہ اکٹھے حج کے لیے روانہ ہوئے۔ اور قریباً تین سال ہندوستان سے باہر رہے۔ جب وہ روانہ ہوئے۔ تو دارا شکوہ کا ستارہ عروج پر تھا۔ واپس پہنچے تو عالمگیر تختِ سلطنت پر متمکن تھا۔ دونوں بھائیوں کی، بلکہ خاندانِ مجددیہ کے تمام سرآوردہ افراد کی قدردانی ہوئی۔ لیکن خواجہ محمد سعید کی صحت اب ٹھیک نہ رہتی تھی۔ وہ سفرِ حج

میں ہی ایک دفعہ اتنے بیمار ہوئے تھے کہ امید زیست نہ رہی تھی۔ واپسی پر ایک مرتبہ اورنگ زیب کی دعوت پر دہلی تشریف لے گئے۔ وہاں سخت بیمار ہو گئے۔ بادشاہ نے علاج میں بڑا اہتمام کیا، لیکن طبیعت سے سنبھلی۔ چنانچہ آپ سرہند کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ سرہند میں مدفون ہوئے۔ آپ کا سالِ وفات ۱۰۸۰ھ (۱۶۶۹ء) بتایا جاتا ہے۔

شیخ محمد معصومؒ حضرت مجدد الف ثانی کے دوسرے مشہور خلیفہ آپ کے صاحبزادے، عروۃ الوثقیٰ، قیوم ثانی، شیخ محمد معصوم تھے۔ آپ کی نسبت "مرآت العالم" میں لکھا ہے:-

"مرید و خلیفۂ والد بزرگوار خود شیخ احمد بود۔ در تربیت مریداں و تعبیر وقائع و حل مشکلاتِ ایشاں، از برادران و سائر شیوخِ زماں امتیاز داشت و از تصانیف او سہ جلد مکتوبات است کہ بس اسرارِ غریبہ و نکاتِ عجیبہ و علوم بدیعہ دراں اندراج یافت و بنابر استدعاے بادشاہِ دیں پناہ (عالمگیر) چند بار بہ بارگاہِ عظمت و جاہ رسید با قسامِ تبجیل و تکریم و انواعِ توقیر و تعظیم مخصوص گشتہ بود۔"

آپ کی نسبت مشہور ہے کہ اورنگ عالمگیر آپ کا مرید ہو گیا تھا۔ اس کا تو کوئی ثبوت ہماری نظروں سے نہیں گزرا۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ عالمگیر آپ کا اور آپ کے بھائیوں کا قدردان تھا۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ آپ نے اپنے صاحبزادے شیخ سیف الدین کو اورنگ زیب کے لشکر میں ارشاد و ہدایت کے لیے بھیجا۔ اور اورنگ زیب نے ان کے ارشادات کو توجہ اور ادب سے سُنا۔ عالمگیر نامہ میں آپ کے بڑے بھائی (خازن الرحمت) شیخ محمد سعید (المتوفی ۱۰۷۰ھ (۱۶۵۹ء)) کی نسبت لکھا ہے:-

"شیخ محمد سعید و شیخ محمد معصوم پسرانِ شیخ مغفور واقفِ اسرارِ حقائق و علوم شیخ احمد سرہندی کہ بکمالِ فضائل و کمالاتِ صوری و معنوی خلف الصدق آں سالکِ مسالکِ طریقت و عرفان است، بانعام سر صد اشرفی ..... موردِ نوازش گردیدند۔"

ایک اور جگہ یہی مؤرخ لکھتا ہے "تقویٰ شعار شیخ محمد سعید خلف شیخ احمد سرہندی

خلعت و دو ہزار روپیہ .... مرحمت شد "

شیخ محمد معصوم کی نسبت فرحت الناظرین کا اندراج ہم نقل کر چکے ہیں۔ اسی تذکرہ میں آگے چل کر لکھا ہے کہ شیخ محمد معصوم کے دوسرے بھائی شیخ محمد یحییٰ، شیخ محمد سعید اور موخر الذکر کے دو فرزند شیخ سعد الدین اور شیخ عبد الاحد المعروف بہ میاں گلؒ کئی بار "بادشاہِ دین پناہ" کی بارگاہ میں پہنچے اور الطاف خسروانہ سے فیض یاب ہوئے۔ اس سے اور دوسرے شواہد سے خیال ہوتا ہے کہ بادشاہ کی عقیدت فقط شیخ محمد معصوم سے نہ تھی، بلکہ حضرت مجدد کے تمام خاندان سے تھی۔

خواجہ محمد معصوم کے کاموں کا صحیح طور پر مطالعہ نہیں ہوا۔ مکتوبات کی تین جلدیں مختلف مطبعوں سے منتشر طور پر شائع ہوئیں۔ اور اب عنقا ہیں۔ ان کی معاصرانہ سوانحِ عمریاں بھی ابھی طباعت سے محروم ہیں، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ نے ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر سلسلۂ مجددیہ کو بے انتہا وسعت دی۔ ان کے خلفا کابل۔ پشاور۔ ننگرہار کے علاقے میں بہت تھے۔ ایک خلیفہ شیخ مراد نے شام میں اقامت اختیار کی۔ وہاں انھیں بڑا عروج ہوا۔ اور ان کی بدولت سلسلۂ مجددیہ نقشبندیہ کو بڑی وسعت ہوئی۔ ہندوستان میں بھی کئی امراد اکابر آپ کے حلقۂ ارادت میں تھے۔ مثلاً بختاور خاں (جو مراۃ العالم کا مؤلف سمجھا جاتا ہے) کامگار خاں، وغیرہ۔

خواجہ محمد معصوم کا ایک اور مشہور مرید فارسی شاعر ناصر علی سرہندی تھا جس نے آپ کی تعریف میں کئی شعر کہے ہیں ؎

چراغِ ہفت محفل خواجہ معصوم	منور از فروغش ہند تا روم
رَوَد جائے کہ جا آنجا نہ گنجد	نظر بے کار ماند پا نہ گنجد
ردائے ماہتابی شرع بر دوش	چوں صبح از پاکی باطن قصب پوش

لہ آدم الشعرائے اُردو دکنی کے اُستاد گلشن کے پیر و مرشد تھے۔ اور آپ کے عرف گل پر ہی اس نے اپنا تخلص گلشن رکھا۔ آپ کا ضخیم دیوان (دیوانِ وحدت) ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں ہے۔

ستونِ بارگاہِ شرعِ اسلام — بہ افعالِ پیمبرؐ گام بر گام
زہے عزت کہ ربّ العزتش داد — کہ بر سر تاجِ قیومیش بنہاد

شیخ محمد معصوم کی وفات اورنگ زیب کے دسویں سال جلوس ۱۰۷۹ھ (۱۶۶۸ء)
میں ہوئی۔ مزار مبارک سرہند میں ہے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ کے سب سے چھوٹے بیٹے شیخ محمد یحییٰ عرف شاہ جیو تھے
وہ ۱۰۲۴ھ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے علوم ظاہری بڑے انہماک سے حاصل کیے
موطا شیخ عبدالحق محدث سے پڑھی۔ ان کی شادی حضرت خواجہ باقی باللہ کے صاحبزادے
خواجہ کلاں کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ روضۃ القیومیہ میں لکھا ہے کہ اورنگ زیب نے آپ کو
مدد معاش کے طور پر بہت کچھ دیا ہوا تھا۔ چنانچہ آج تک سرہند میں ضرب المثل ہے۔
"الملک الملت والملک الیحیٰ"۔ سرہند میں آپ نے ایک عالیشان مسجد تعمیر کرائی۔ دینی
علوم میں کئی کتابیں لکھیں۔ ۲۷ جمادی الثانی ۱۰۹۶ھ کو وفات پائی۔ اور سرہند میں
مدفون ہوئے۔

خواجہ محمد معصومؒ کے جانشین خواجہ محمد نقشبندؒ تھے۔ ان کا ذکر ہم عہدِ عالمگیری کے
ضمن میں درج کریں گے۔

ہم حضرت مجددؒ کی تصانیف کے سلسلے میں ان کے رسالہ ردِّ روافض کا ذکر کر چکے
ہیں۔ شیعوں کی مخالفت حضرت مجددؒ کی تعلیمات کا ایک اہم جزو تھی۔ وہ خلفائے اربعہ
کے احترام میں ذرا بھی کمی گوارا نہ کرتے تھے۔ ایک دفعہ شہر سامانہ کے خطیب نے
خطبۂ عید کے دوران میں خلفائے راشدین کا نام نہ لیا تو آپ نے فوراً اس شہر کے
مشائخ و قضاۃ کو خط لکھا کہ خطیب کی اس فروگذاشت پر اس کے ساتھ سختی کیوں نہ کی گئی:

"شنیدہ شد کہ خطیب آں مقام در خطبۂ عید قربانی ذکرِ خلفائے راشدین رضی اللہ تعالےٰ
عنہم ترک کردہ واسامی متبرکۂ ایشاں را نخواندہ ... ونیز شنیدہ کہ اکابر و اہالیِ آں مقام
دریں باب مبالاتے ورزیدند۔ و بشدت و بغلظت بآں خطیب بے انصاف پیش نیامدند
وائے نہ یکبار بلکہ صد بار وائے! ...... چوں استماعِ ایں خبرِ وحشت اثر در شورش

آورد و رنگِ فاروقیم را حرکت داد۔ بچنیں کلمہ اقدام نمود۔"

خواجہ محمد معصوم کا بھی اس مسئلے میں وہی طرزِ عمل تھا، جو ان کے والدِ بزرگوار کا تھا۔ اور ان کے مکتوبات میں ایک اہم خط ہے (دفتر اول۔ شمارہ ۱۴۴) جو کہا جاتا ہے کہ انھوں نے شاہزادہ اورنگ زیب کو لکھا۔ اور جس میں تکفیر روافض اور ان کو قتل کرنے کے حق میں کئی حدیثیںؔ درج کی ہیں۔ ایک حدیث ہے:۔

ابو درداء میں لکھا ہے کہ ابنِ عباسؓ نے روایت کی کہ آخری زمانے میں ایسے لوگ ہوں گے جن کو روافض کہیں گے، جو اسلام کی توہین کریں گے۔ ان کو قتل کرنا کیونکہ یہ مشرک ہوں گے۔"

شیخ آدم بنوریؒ حضرت مجدد کے خلفاء اور فیض یافتگان کا سلسلہ بڑا وسیع تھا۔ صاحبزادگان شیخ محمد سعید اور شیخ محمد معصوم کے بعد ان میں سب سے بزرگ میر محمد نعمان اور خواجہ ہاشم کشمی کو سمجھا جاتا ہے۔ موخر الذکر زبدۃ المقامات کے مصنف، مکتوبات کے دفتر سوم کے مرتب اور ایک بڑے خوشگو شاعر تھے۔ ہم نے ارمغانِ پاک (اشاعت چہارم) میں ان کی کئی پُرسوز غزلیں درج کی ہیں۔ لیکن ان دونوں بزرگوں کے کام کا میدان برہان پور کا علاقہ تھا، جہاں سلسلۂ مجددیہ بلکہ اسلام کی جڑیں بہت نہیں پھیلیں۔

ؔ جتنی وضعی حدیثیں اس مسئلے پر ہیں، شاید ہی کسی اور مسئلے کے متعلق ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ بنی امیہ اور بنی عباسیہ کی کشمکش کے دوران میں مخالف فریق ایسی حدیثیں گھڑ کر اپنے مخالفوں کو ذلیل اور بدنام کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ سولھویں صدی میں ایران و توران کی کشمکش سے پھر پرانی تلخ بحثیں تازہ ہو گئیں۔ ایک طرف اسمٰعیل صفوی شاہ ایران تھا، جس کی ترجمانی علمائے مشہد وغیرہ نے کی۔ دوسری طرف شیبانی خاں ازبک، جس کو علمائے ماوراء النہر سے مدد ملتی تھی حضرت مجدد اور دوسرے نقشبندیہ بزرگوں کا شیعہ سُنی مسئلے پر علمائے ماوراء النہر کا نقطۂ نظر تھا۔ لیکن شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کے زمانے میں اس نقطۂ نظر میں ملائمت آئی۔ اور علیگڑھ تحریک میں شیعہ سُنی زعماء نے مل کر کام کیا۔ خود بانیِ پاکستان قائدِ اعظم اثنا عشری شیعہ تھے۔

حضرت مجددؒ کے ایک اور خلیفہ جنھیں ان کے بے شمار معتقدین صاحبزادگان سے بھی بڑھ کر سمجھتے تھے۔ اور جو مختصر تعلیم کے باوجود صفحاتِ تاریخ پر ایک گہرا نقش چھوڑ گئے شیخ آدم بنوری تھے۔ وہ بنور کے (جو سرہند سے بیس میل دور ایک بستی ہے) رہنے والے تھے۔ پہلے شاہی لشکر میں ملازم تھے۔ لیکن ایک واقعہ سے متاثر ہو کر ملازمت ترک کر دی۔ اور پہلے حاجی خضر خاں افغان اور پھر حضرت مجددؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر نعمتِ باطنی سے فیض یاب ہوئے۔ شروع میں اُمّی محض تھے۔ ایک جذبۂ پُرزور کے تحت قرآن مجید حفظ کیا۔ اور علومِ ظاہری بھی حاصل کیے۔ پھر ایک عالم کو سیراب کیا۔ آپ کی شخصیت بڑی قوی الاثر تھی۔ کہتے ہیں کہ آپ کی خانقاہ میں ایک ہزار سے زیادہ طلبائے معرفت جمع رہتے تھے۔ جن کو آپ کے لنگر سے کھانا ملتا تھا آپ کے خلفاء کی تعداد ایک سو اور مریدین کی تعداد ایک لاکھ بتائی جاتی ہے۔ جہاں آپ جاتے تھے، ہزار ہا پٹھان آپ کے ساتھ ہوتے تھے۔ ۱۶۴۲ء میں آپ لاہور تشریف لے گئے۔ ایک کثیر جماعت آپ کے ساتھ تھی۔ بعض مخالفوں نے شاہجہان کو خبر پہنچائی کہ شیخ کے پاس اتنی جمعیت ہے کہ اگر وہ چاہے تو حکومت کا تختہ پلٹ سکتا ہے۔ شاہجہان نے اپنے وزیرِ اعظم نواب سعد اللہ خاں اور مُلا عبد الحکیم سیالکوٹی کو تحقیقِ حالات کے لیے بھیجا۔ آپ ان سے سرد مہری سے پیش آئے۔ دیر تک ملے نہیں اور جب ملے تو بے رُخی سے بات چیت کی۔ انھوں نے واپس جا کر سارے حالات بادشاہ کو سنائے اور کہا کہ بے شمار افغان شیخ کے ساتھ ہیں۔ ممکن ہے کوئی فتنہ پیش آئے۔ چنانچہ بادشاہ نے کہلا بھیجا کہ شیخ حج کو چلے جائیں۔ شیخ پہلے ہی حج کو جانا چاہتے تھے۔ بڑی خوشی سے اس حکم کی تعمیل کی اور وہیں مدینہ منورہ میں قریباً ۷۰ سال کی عمر میں ۲۵ دسمبر ۱۶۴۳ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔

شیخ آدم بنوری تو حج کے لیے چلے گئے، لیکن انھوں نے فیض کے جو سرچشمے لگائے تھے، ان کا فیض جاری رہا۔ ان کے خلفا بے شمار تھے۔ جن میں سے کئی افغان علاقہ میں تھے۔ (شاید روشنیہ فرقہ کے زوال کا ایک باعث یہ بھی تھا۔ کہ اب

افغان علاقے میں نقشبندیہ سلسلے کے بزرگوں مثلاً شیخ آدم بنوری اور خواجہ محمد معصوم کو جن کے اجداد کا زوہ یا کابل سے خاندانی تعلق تھا، بڑا قبول حاصل ہوا۔ اور لوگوں کی توجہ اس طرف پھر گئی۔ (آپ کے خلفا میں سے لاہور کے شیخ سعدی (جن کے کئی افغان مرید تھے)۔ کوہاٹ میں حاجی عبداللہ کوہاٹیؒ اور پشاور میں شیخ نور محمد پشاوری خلف اخوند درویزہ خاص طور پر مشہور ہیں۔ ایک بزرگ حافظ سید عبداللہ اکبرآبادی تھے۔ جن کے مرید شاہ ولی اللہ کے والد اور چچا یعنی شیخ عبدالرحیم اور شیخ محمد رضا ہوئے۔ جن سے خود شاہ صاحب نے فیض حاصل کیا۔ شاہ صاحب نے انفاس العارفین میں شیخ آدم بنوریؒ اور حافظ صاحب کے بہت سے واقعات لکھے ہیں اور شیخ کی بڑی تعریف کی ہے۔

شیخ آدم بنوری صاحب تصانیف تھے۔ کلماتِ معارف میں نقشبندی سلسلہ کی تعلیمات کو مدوّن کیا ہے۔ اور بہت سی معرفت کی باتیں بیان کی ہیں۔ اس سے پہلے نکات الاسرار میں اسی مضمون پر لکھا تھا۔ مناقب الحضرات میں آپ کے حالات شیخ محمد امین بدخشی نے بڑے غلو سے بلکہ تاریخی صحت کو نظر انداز کر کے لکھے ہیں۔

اہلِ تشیع کے متعلق حضرات مجددیہ کا جو نقطہ نظر تھا، وہ تو مندرجہ بالا اقتباسات سے ظاہر ہے، لیکن اس مسئلے پر دوسرے نقشبندیہ حضرات کا بھی یہی نقطہ نظر تھا۔ نقشبندیہ سلسلے کو ماوراء النہر کی سرزمین سے خاص تعلق ہے اور شیعہ سُنّی مناقشات زیادہ تر نقشبندیہ سلسلے کی ایک اور شاخ کے ذریعے ظہور پذیر ہوئے۔ ہندوستان میں اس سلسلے کے بانی خواجہ خاوند محمود نقشبندی المعروف بہ حضرت خواجہ ایشاں تھے، جو شیخ سرہندی کے ہم عصر تھے۔ وہ بخارا میں پیدا ہوئے۔ وہیں تعلیم پائی۔ اور سمرقند و کابل ہوتے ہوئے ہندوستان تشریف لائے۔ کشمیر میں آپ کے سلسلے کو خاص فروغ ہوا۔ یہاں ان دنوں شیعہ سُنّی سوال زوروں پر تھا۔ دربارِ دہلی کی طرف سے نواب خاں والیِ کشمیر تھا۔ تھوڑا شیعوں اور اہلِ سُنّت کے درمیان بلوہ ہوا اور بہت سے کشت و خون کے بعد قاضی ابوالقاسم اور قاضی محمد عارف کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوا۔ انھوں نے اہلِ تشیع کی سزادہی میں توقف کیا۔ اس سے

اہلِ سُنت ناراض ہو گئے اور خواجہ خاوند محمود کی سرکردگی میں شہر چھوڑ کر ہفت چنار آ گئے۔ ناظمِ صوبہ انھیں آ کر منا کے لے گیا اور شیعوں کے خلاف کارروائی بھی کی لیکن اس نے ساتھ ساتھ دربارِ شاہی میں خواجہ کی شکایت لکھی۔ چنانچہ دربار میں بُلائے گئے اور ان کے متعلق فیصلہ ہُوا کہ وہ شاہی لشکر کے ساتھ ساتھ رہیں۔ کشمیر واپس نہ جائیں۔ اس کے بعد وہ مختلف مقامات میں شاہی لشکر کے ساتھ رہے اور بالآخر ۹ر نومبر ۱۶۴۲ء کو بمقام لاہور وفات پا کر وہیں دفن ہوئے۔

خواجہ خاوند محمود تو شاہی حکم کے بعد کشمیر نہیں گئے، لیکن شیعہ سُنی چپقلش ان کے جانشینوں کے عہد میں جاری رہی۔ ان کے ایک سجادہ نشین خواجہ کمال الدین نقشبندی تھے۔ انھوں نے شیعوں کی مخالفت جاری رکھی اور ان کی کوششوں سے امین نامی ایک شیعہ کو قتل کی سزا ہوئی۔ اس پر شیعہ برافروختہ ہو گئے اور ایک آدمی کو آمادہ کیا کہ خواجہ صاحب کو شہید کرے۔ چنانچہ ۳۰ر دسمبر ۱۷۶۶ء کی رات کو (یعنی مرزا جانجاناں کی شہادت سے پندرہ سال پہلے) آپ اپنی خانقاہ میں شہید کر دیے گئے۔ آپ کی شہادت کے بعد شیعوں سُنیوں میں پھر بلوے ہوئے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ

علومِ دینی کا نیا دور

حضرت مجدد الف ثانی ایک بڑے عالم تھے۔ اور شریعت کی پیروی پر بڑا زور دیتے تھے۔ وہ اپنے صوفیانہ احوال و واقعات کو کتاب و سنت کی روشنی میں پرکھتے۔ اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتے۔ انھوں نے تصوف کو شریعت سے قریب لانے کی مسلسل کوشش کی۔ اور بعض صوفی حلقوں میں جو مطلق العنانی اور آزاد روی وسطی دور میں پھیل گئی تھی۔ اس کی مخالفت کی لیکن شاید یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ صوفی پہلے تھے اور عالم و متشرع بابعد میں۔ ان کا شمار فی الحقیقت "علمائے باطن" میں سے ہوتا ہے۔ اب جس بزرگ کا ذکر ہو رہا ہے۔ انھیں بھی تصوف سے بڑی دلچسپی تھی۔ متعدد بزرگوں سے فیض پایا تھا۔ صوفیہ کا جو تذکرہ انھوں نے اخبار الاخیار کے نام سے لکھا۔ وہ اس زمانے کے ادبی شاہکاروں میں سے ہے۔ لیکن تصوف سے گہرے لگاؤ کے باوجود وہ صوفی کم تھے۔ اور عالم متشرع زیادہ۔ وہ شمالی ہندوستان کے پہلے بڑے عالم تھے۔ جنھوں نے اکبر کی فتح گجرات کے بعد حجاز کے سمندری راستوں کے کھل جانے کا پورا فائدہ اٹھایا۔ حرمین جا کر علم حدیث کی تکمیل کی۔ اور واپس آ کر اس علم کی وسیع اشاعت کی۔ علوم اسلامی کے بڑے سرچشمے، یعنی مقاماتِ مقدسہ سے اسلامی ہندوستان کا رشتہ جوڑنا ہی اتنا اہم تھا۔ کہ محض اس کی بدولت انھیں علوم دینیا کی تاریخ میں ایک بلند مقام مل جاتا ہے۔ لیکن حجاز میں جس بزرگ سے آپ زیادہ تر وابستہ رہے۔ ان کا موروثی وطن ہندوستان تھا۔ اور انھیں یہاں کی مذہبی مطلق العنانی کے ازالے اور روحانی اصلاح کا خاص خیال رہتا تھا۔ شیخ عبدالوہاب متقی فی الحقیقت شیخ علی متقی کے جانشین تھے۔ جنھوں نے مہدویت کے قلع قمع میں زندگی صرف کر دی۔ شیخ عبدالوہاب نے یہ طریق کار جاری رکھا۔ بلکہ اسے

وسعت دی۔ اور اپنے شاگرد اور مرید کو ان خطرات سے بچایا جو راسخ العقیدگی کو بعض مشہور اور باا ثر، لیکن آزادہ رو صوفیہ مثلاً شیخ ابن العربی۔ شیخ عبدالکریم جیلی۔ شیخ غوث گوالیاری شطاری سے پیش آرہے تھے۔

بالجملہ شیخ عبدالوہاب کے زیر اثر شیخ عبدالحق محدث نے جو راستا اختیار کیا وہ اسی سمت جاتا تھا، جدھر صوفیہ کو حضرت مجدد الف ثانی لیجا رہے تھے۔ لیکن تصوف سے لگاؤ کے باوجود، شیخ عبدالحق کی اصل جگہ "علماے ظاہر" کے ساتھ تھی۔ ان کے عرفان پر ان کی فقاہت غالب تھی۔ راسخ العقیدگی کی راہ پر وہ حضرت مجدد سے بہت آگے نکل گئے۔ انھوں نے نہ صرف اکبری بے قاعدگیوں پر تنفر کا اظہار کیا۔ اور فیضی سے علحدگی اختیار کی۔ بلکہ ایک زمانے میں حضرت مجدد کے بعض احوال و مقامات کے خلاف ایک زوردار رسالہ لکھا۔ بعض روایات کے مطابق اس کے بعد شیخ محدث کو حضرت مجدد کی بزرگی کا زیادہ احساس ہوا۔ لیکن جیسا کہ حضرت شاہ غلام علی مجددیؒ نے اس رسالے کی وضاحت میں لکھا ہے "حضرت شیخ عبدالحق.... سخن بطور علماے ظاہر فرمودہ اند و کلام حضرت مجدد بطور علماے باطن است"۔ شیخ عبدالحق علماے ظاہر اور ٹھیٹھ راسخ العقیدگی کے ترجمان تھے۔

خاندانی حالات

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے آباو اجداد بخارا کے رہنے والے تھے۔ سلطان علاء الدین خلجی کے عہد حکومت میں ہندوستان آئے اور معزز فوجی عہدوں پر مامور ہوئے۔ شیخ کے دادا شیخ سعداللہ تھے۔ ان کی زیادہ توجہ سلوک اور طریقت کی طرف رہی اور ان کے دو بیٹوں کو بھی یہی ذوق وراثت میں ملا۔

شیخ کے چچا شیخ رزق اللہ مشتاقی نے علم و ادب میں نام پایا۔ وہ عربی فارسی اور سنسکرت کے فاضل اور ہندی کے نامور شاعر تھے۔ ہندی میں ان کا تخلص راجن تھا اور اس زمانے میں ان کے کئی رسالے (مثلاً پیمان۔ جوت نرنجن) مشہور ہیں۔ ہندوؤں کے علوم کا بھی انھوں نے خوب مطالعہ کیا تھا اور علم تاریخ سے بھی

گہری دلچسپی تھی۔ ان کی مشہور تالیف واقعات مشتاقی لودھیوں کے متعلق معلومات کا بیش قیمت خزانہ ہے۔ طریقت میں وہ شطاری سلسلے سے منسلک تھے، جو اس زمانے میں مشرقی اور وسطی ہندوستان میں زوروں پر تھا۔ ان کی وفات ۱۵۸۱ء میں ہوئی۔

شیخ سیف الدین شیخ کے والد شیخ سیف الدین سیفی قادری نے باطنی اور روحانی امور پر زیادہ توجہ کی۔ وہ شیخ امان پانی پتی کے مرید اور صاحب استعداد بزرگ تھے۔ صوفیانہ ذوق و شوق اور عشق و محبت اس خاندان میں شیخ عبدالحق کے دادا سے شروع ہوا۔ وہ آزاد صوفیانہ خیالات کے آدمی تھے۔ راتوں کو جاگتے اور سوز و گداز کے اشعار پڑھتے۔ ایک روز شیخ سیف الدین نے اپنے والد سے پوچھا کہ کبیر، جس کے دوہے مشہور ہیں۔ مسلمان تھا یا کافر؟ آپ نے فرمایا موحد تھا۔ انھوں نے دوبارہ پوچھا کہ کیا موحد کو اسلام و کفر سے کوئی تعلق نہیں (کہ موحد مگر غیر کافر و مسلمان است) انھوں نے ٹال دیا اور کہا کہ یہ نکتہ سمجھنا بڑا مشکل ہے۔ آہستہ آہستہ سمجھ جاؤ گے۔

شیخ سیف الدین کے مرشد شیخ امان پانی پتی وحدت الوجودی خیالات کے صوفی اور ابن العربی کے مقلد تھے۔ شیخ عبدالحق ان کی نسبت لکھتے ہیں: "وے از صوفیہ موحدہ است از تابعان ابن العربی۔ در علم ایں طائفہ مرتبہ بلند و پایۂ ارجمند داشت و در تقریر مسئلہ توحید بیان شافی و تقریر وافی، و سخن توحید را فاش گفتے۔" ان کی زندگی میں کئی باتیں ایسی تھیں، جن کی شرع تائید نہیں کرتی۔ ان کا مشرب ملامتیہ تھا۔ اور یہ شیخ امان پانی پتی وہی ہیں، جن کے ایک مشہور شاگرد شیخ تاج الدین زکریا اجودھنی کی نسبت کہا جاتا ہے کہ انھیں اکبر کے خیالات بدلنے میں دخل تھا۔ بدایونی ان کی اکبر سے ملاقات کے سلسلے میں لکھتا ہے:-

"تمام شب شطحیات و ترہات اہل تصوف از وے شنیدند و چوں بر شرعیات مقید نبود۔ مقدمات وحدت وجود کہ متصوفہ مبطلہ دارند و عاقبت منجر باباحت

والحاد می شوند، درمیان آوردند۔"

شیخ سیف الدین کو شیخ امان سے بڑی عقیدت تھی۔ جس کا اظہار انھوں نے اشعار میں بھی کیا ہے ؎

ہر چہ از من در سخن آید یقیں، — ہست ہم از صحبت آں مرد دیں
ورنہ چہ جا است کہ راز درون — از دہن چوں منے آید بروں
من کیم و کیستم و چیستم — از دم عیسیٰ نفسے زیستم
اوست دریں راہ مرا راہنما — خاکِ درش چشم مرا توتیا

شیخ امان کے خیالات پر اہل شرع اعتراض کریں لیکن ان کی علمی قابلیت میں شبہ نہیں اور مریدوں کی تعلیم و تربیت بھی وہ بڑی سوچ سمجھ سے کرتے تھے۔ شریعت کی مخالفت کے باوجود طریقت کے سلسلوں کے دیرپا ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ان سلسلوں کے بزرگ انسانی نفسیات کو خوب سمجھتے تھے اور اپنی تعلیم و تربیت میں اس کو نظر انداز نہ کرتے تھے۔ آج کل ہمیں نفسیات کے عالم بتا رہے ہیں کہ ذہنِ انسانی میں بُنیادی تبدیلیاں پیدا کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہمیں افراد کے ذہن تحت الشعور یعنی ان خیالات اور تصورات سے آگہی ہو، جو ان کے ذہن کی گہرائیوں میں موجزن ہیں۔ اہلِ تصوف اس اصول پر شروع سے ہی عمل پیرا تھے۔ اور سب اہلِ نظر مرشد، مرید کو تلقین کرنے سے پہلے اس کے تحت الشعور سے بخوبی واقف ہو جاتے تھے۔ شیخ امان بھی اس اصول کو پوری طرح ملحوظ رکھتے۔ چنانچہ شیخ سیف الدین فرماتے تھے کہ جب میں پہلے پہل شیخ امان کی خدمت میں پہنچا تو انھوں نے کہا کہ اپنے تصورات اور خیالات کا کچھ حال بیان کرو۔ شیخ سیف الدین نے جواب دیا کہ مجھے تو صوفیانہ احوال ہی کوئی نہیں پیش آتے۔ میرے تصورات اور خیالات کیا ہوں گے۔ شیخ امان نے کہا کہ یہ میں اس لیے پوچھتا ہوں کہ تمھاری طبعی مناسبت کا اندازہ لگاؤں۔ اور یہ معلوم کروں کہ تمھارے ذہن کا کیا اسلوب ہے۔ انھوں نے عرض کیا کہ کئی دفعہ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سارا جہان، فرش سے لے کر عرش تک

میں سنگھیر رکھا ہے (محاطہ من است - دمن بر ہمہ محیطم) شیخ نے فرمایا کہ تمھارے دل میں توحید کا سمندر موجزن ہے اور اس لیے مسئلہ توحید میں ہی زیادہ تعلیم و تربیت دی۔

شیخ محدث کے سمجھدار اور شفیق والد نے اپنے ہونہار فرزند پر اپنے خیالات مسلط نہیں کیے لیکن دونوں میں مسئلہ توحید پر اکثر گفتگو ہوتی تھی اور شیخ سیف الدین اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوں گے۔

"شب و روز در خدمت ایشاں در تذکرہ و تذکار و بحث و تکرار میگزشت و بندہ را بہ ہمزبانی خود قبول داشتہ محظوظ بودند۔ خصوصاً در تلقین علم توحید و تحقیق مسئلہ وحدت وجود بر وجہے کہ موافق علم و شہود است۔ و اگر گاہے بمقتضائے تقیید مقامات علم کسی و بقصد تحقیق ایں علوم و ہبی دغدغہ و شبہ درمیان آوردہ می شد۔ فرمودند ما را ازیں نوع شبہات و شکوک دریں مسئلہ بسیار بود۔ انشاء اللہ رفتہ رفتہ پردہ از روے کار باشاند و جمال یقین روے نماید"

ابتدائی تعلیم شیخ سیف الدین نے اہل علم کی مجلس میں اونچی جگہ حاصل نہیں کی، لیکن انھوں نے اپنے ہونہار بیٹے کی تعلیم و تدریس پر پوری نظر رکھی اور شیخ کی تربیت بڑے نیک اصولوں پر کی۔ علوم ظاہری سے بھی آپ کو بہرہ ور فرمایا۔ اور بے تعصبی اور انصاف پسندی کی تلقین بھی شروع ہی سے کی۔ چنانچہ آپ اکثر اپنے بیٹے سے کہا کرتے تھے۔ "با ہیچ کس در بحث علم نزاع نہ کنی کلفت نرسانی۔ اگر دانی کہ حق بجانب دیگر است قبول کنی۔ وگرنہ، دو سہ بار بگو۔ اگر قبول نکنند بگو کہ بندہ را چنیں معلوم است"۔ اسی طرح طمع و حرص سے بھی وہ بالکل خالی تھے اور کہا کرتے تھے کہ حریص اور طالب جاہ عالم سے گمنام لیکن متوکل اور متقی کم علم اچھا ہوتا ہے۔ چنانچہ شیخ عبدالحق سے انھوں نے کہا کہ "چوں مشاہدہ کردہ می شود کہ علما و فضلا در طلب جاہ و عزت و کثرت اسباب و جمعیت اموال و نزاع و خصومت کہ با خلق می افتند۔ مرا تشکرانہ آید بداں کہ بسیار نخواندیم و ا کابر نشدیم"۔

لیکن آپ کی بڑی خواہش تھی کہ بیٹا علم و فضل میں شہرۂ آفاق ہو۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی چاہتے تھے کہ اہل دل ہو "ملّائے خشک و ناہموار نباشی"۔

شیخ عبدالحق کو شروع ہی سے پڑھنے لکھنے سے بے حد رغبت تھی۔ اخبار الاخیار کے اخیر میں لکھتے ہیں: "از ابتدائے ایام طفولیت نمی دانم کہ بازی چیست وخواب کدام و مصاحبت کیست وآرام چہ وآرائش دیگر کجا ؎

شب خواب چہ و سکوں کدام است

خود خواب بعاشقاں حرام است

ہرگز در شوقِ کسب و کار، طعام بوقت نخوردہ وخواب در محل نبردہ" رات کا زیادہ حصہ پڑھنے میں اور دن کا زیادہ حصہ کتابیں نقل کرنے میں گزرتا۔ والدین ان سے کہتے کہ محلے کے لڑکوں سے جا کر کھیلو۔ تو وہ جواب دیتے کہ آخر کھیلنے سے مقصد دل خوش کرنا ہے۔ میرا دل اس مطالعہ سے خوش ہوتا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ آدھی رات گزر گئی اور والد نے آواز دی کہ سو جاؤ۔ تو میں لیٹ گیا۔ اور جب والد کی آنکھ لگ گئی تو پھر اٹھ کر پڑھنا شروع کر دیا۔ چند ایک مرتبہ تو یہ بھی ہوا کہ پڑھتے پڑھتے کتاب میں اتنے منہمک ہو گئے کہ چراغ کی لو سے پگڑی کو آگ لگ گئی۔ اور انھیں اس وقت معلوم ہوا، جب سر کو گرمی پہنچی ؎

چہ دُودہائے چراغے کہ در دماغ نرفت | کدام بادۂ محنت کہ در ایاغ نرفت
کدام خواب و چہ آسائش و کجا آرام | چہ خار خار کہ در بسترِ فراغ نرفت
بحیرتم ز دلِ خود کہ عمر رفت ولے | ز کنجِ غم کدہ ہرگز بصحنِ باغ نرفت

دربارِ اکبری

شیخ عبدالحق کے علمی انہماک کا یہ عالم تھا تو جائے تعجب نہیں کہ بیس بائیس برس کی عمر میں آپ نے جہاں تک دہلی میں ممکن تھا، تکمیلِ تعلیم کر لی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد آپ فتح پور سیکری تشریف لے گئے، جو ان دنوں اکبر کا دارالسلطنت اور علمی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ یہاں آپ نے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا مشغلہ اختیار کیا۔ لیکن علمی اور روحانی ترقیوں کا سلسلہ

برابر جاری رہا۔ اور ایک برگزیدہ اور نڈر بزرگ سے اسی زمانے میں بیعت ہوئی۔ سیکری میں شیخ عبدالحق کا قیام کوئی دس بارہ برس رہا ہوگا۔ آپ کی علمی قابلیت نے کئی علماے دربار، مثلاً فیضی، مرزا نظام الدین بخشی مصنف طبقات اکبری، ملا عبدالقادر بدایونی کو مسخر کیا۔ بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ اکبر سے بھی آپ کی ملاقات ہوئی اور شاید فیضی، ابوالفضل اور اکبر کی خواہش تھی کہ آپ ان کے ہم خیال ہوجائیں۔ آپ زاد المتقین میں اختتام تعلیم کا ذکر کرکے لکھتے ہیں:۔ (ترجمہ)

> جب اللہ کے فضل و کرم سے مجھے (علم کا) خاصہ حصہ مل گیا تو بعض اہلِ حقوق نے مجھے اہلِ دُنیا کی طرف بُلایا۔ اور میں بادشاہِ وقت اور امرا کے پاس گیا۔ انھوں نے میری طرف بہت توجہ کی۔ میرا رتبہ بلند کیا۔ بلکہ ارادہ کیا کہ میرے ذریعے اپنی جماعت بڑھائیں اور مجھ ضعیف سے اپنی قوت میں اضافہ کریں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے محفوظ رکھا۔"

شیخ محدّث اور اکبری دربار کے تعلقات کی تفاصیل نہیں ملتیں، لیکن اتنا معلوم ہے کہ فیضی ان کا بڑا مداح بلکہ شیدائی تھا۔ اور شیخ امان پانی پتی کے جس گھرانے سے آپ کے والد نے فیض حاصل کیا تھا۔ اس کے کئی افراد اکبر کی مذہبی بے راہ روی میں اس کے راہنما تھے۔ عجب نہ تھا۔ آپ کا قدم بھی صراطِ مستقیم سے دُور جا پڑتا[1]۔ لیکن عنایتِ ایزدی اور ایک نیک نفس باپ کی تربیت کا فیض تھا۔ آپ پر اکبری دربار کے اثرات غالب نہ آسکے۔ آپ نے بیعت کی تو وہ بھی ایک ایسے بزرگ سے جو اس زمانے میں بھی اکبر کے دیوانخانے میں اذان دے کر باجماعت نماز شروع کر دیتے تھے۔ اور جب شعائرِ اسلامی کی محبت اور بیرونی ماحول میں کشمکش بڑھ گئی تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ایک جذبہ کے ماتحت پہلے دہلی آئے اور پھر حجاز کا رُخ کیا۔

---

[1] شیخ کے یکایک سفرِ حج پر (بلا اطلاع) روانہ ہونے پر فیضی نے جل بھن کر جو خط لکھا اس کا ایک پُر معنی فقرہ ہے، "خدا نخواستہ باشد یہ حق خدمت و نمکِ صحبت (نمک و صحبت؟) را فراموش بکنند۔"

شیخ موسیٰ پاک شہید ملتانیؒ

شیخ سیف الدین کا سلسلۂ بیعت پانی پت کے بزرگوں سے تھا، لیکن ان کی بالغ نظری دیکھیے کہ انھوں نے اپنے بیٹے کو مرید اس بزرگ کا کرایا، جو علمی دنیا میں شہرت نہیں رکھتا، لیکن رُوحانی اور اخلاقی میدان میں دُوسروں سے آگے تھا۔ شیخ موسیٰ گیلانی جن کے "بہ امر یدیہ" شیخ محدث ۹۷۵ء میں یعنی والد کی وفات سے پانچ سال پہلے مُرید ہوئے، اُچ کے قادری بزرگ تھے۔ ان کے والد مخدوم شیخ حامد جیلانیؒ نے اپنی زندگی میں انھیں اپنا جانشین منتخب کیا تھا، لیکن بڑے بھائی کو اس سے اختلاف تھا۔ چنانچہ عہدِ اکبری کے اواخر میں شیخ موسیٰ اُچ چھوڑ کر دربار میں آگئے۔ یہاں آپ کو پانسو کا منصب ملا۔ اور ایک زمانہ آپ لشکرِ شاہی میں رہے، لیکن جس جرأت کے ساتھ آپ دربارِ اکبری میں آمد و رفت رکھتے تھے، اس کا بیان بدایونی کی زبان سے سُنیے:۔

> در حضورِ بادشاہ مدعین دیوان خانۂ خاص و عام اگر وقت نماز می رسید۔ خود اذان گفتہ نماز بحضورِ خلیفہ وقت بہ جماعت می گزارد۔ و ہیچ کس چیزے نے توانست گفت۔

شیخ محدث نے اخبار الاخیار میں مرشد کا تذکرہ بڑی عقیدت و احترام سے کیا ہے۔ اس سے بھی پتا چلتا ہے کہ شیخ موسیٰ اکبری دَور میں احیائے اسلام کے سرگرم ترجمان تھے:۔

> اگر دیگران قطب اند۔ او قطب الاقطاب است۔ و اگر ایشان سلاطین، او سلطان السلاطین۔
>
> محی الدین کہ دینِ اسلام زندہ گردانید و ملتِ کفر بمیرانید۔

شیخ موسیٰ گیلانی ایک عرصے تک لشکرِ شاہی اور دار السلطنت میں اسلام کا بول بالا کرتے رہے۔ اور کئی شہر نشینوں کو اس بادیہ پیما کی بدولت رُوحانی تازگی اور

لہ بدایونی کے بیان سے خیال ہوتا ہے کہ حصولِ منصب سے پہلے آپ مریدانِ شاہی میں داخل ہو گئے تھے "و دریں ایام شیخ موسےٰ بعد از زہد و عبادت و مشیخت چنداں سالہ ارادت متعارف رسمی بہ پادشاہ آورد۔ و خصت سپاہگری یافتہ و تسلیم نوکری کردہ داخل امرائے پنصدی شدہ"۔ (منتخب التواریخ جلد سوم ص ۹۲)

استقامت نصیب ہوئی۔ بالآخر آپ کسی سلسلے میں ملتان تشریف لے گئے اور ۲۰۱۲ھ میں وہاں شہادت پائی۔

سفرِ حرمین

شیخ موسیٰ گیلانیؒ کے فیضِ صحبت سے شیخ محدث کی اسلامی حمیت کو اور تقویت ہوئی، لیکن فتح پور سیکری کا ماحول ٹھیٹھ اسلامی خیالات کی نشو و نما کے لیے سازگار نہ تھا۔ اس لیے طبیعت ایک سخت باطنی کشمکش میں گرفتار تھی۔ بالآخر عنایتِ ایزدی شاملِ حال ہوئی۔ اکبر کی فتح گجرات (۱۵۷۲ء) نے سمندری سفر کا راستا آسان کر دیا تھا۔ اور شاید آپ شمالی ہندوستان کے پہلے برگزیدہ عالم تھے، جو فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے ہی نہیں بلکہ مزید علمی ترقیوں کی خاطر اس راستے سے جہاز روانہ ہوئے۔

شیخ محدث نے اپنا سفر ایک جذبہ کے تحت، بغیر کسی تیاری اور ساز و سامان کے (''به طریق جذبه، به ہیچ چیز متقید نشده'') بلکہ پوری معلومات حاصل کیے بغیر شروع کیا تھا، لیکن اس وقت تک علما و امرا میں ہر جگہ آپ کے قدر دان موجود تھے انھوں نے آپ کی آمد کو اپنی خوش قسمتی خیال کیا اور راستے کی مشکلات بآسانی کٹ گئیں۔ گلزارِ ابرار کا مصنف غوثیؒ لکھتا ہے کہ ۹۹۵ھ (۸۷-۱۵۸۶ء) میں آپ گھر سے نکلے۔ پہلے مالوہ پہنچے۔ یہاں کا حاکم اکبر کا رضاعی بھائی اور مشہور متدین امیر مرزا عزیز کوکہ تھا۔ کچھ عرصہ اس کے پاس قیام فرمایا۔ مالوہ کے قدیمی دار الخلافہ مانڈو تشریف لے گئے۔ وہاں غوثیؒ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر مستفید ہوا۔ پھر احمد آباد پہنچے اور اپنے قدیمی دوست مرزا نظام الدین اکبری کے پاس قیام کیا۔ جو ان دنوں صوبہ گجرات کے بخشی تھے۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ جہاز کا موسم گزر چکا ہے۔ چنانچہ کوئی ایک سال تک رکنا پڑا۔ اس دوران میں علمی اور روحانی مشاغل برابر جاری رہے۔ بلکہ شاید آپ کے مشہور تذکرۃ الاولیا (اخبار الاخیار) کے زیادہ وسیع نقطۂ نظر اور زیادہ صحیح معلومات کا ایک سبب یہ ہے کہ آپ نہ صرف دہلی کے اہلِ علم یا ان بزرگوں سے جو اپنی ضروریات کے سلسلے میں دار الخلافہ میں آتے تھے، واقف تھے۔ بلکہ آپ نے (حجاز کے علاوہ)

پنجاب - بندھیل کھنڈ، مالوہ اور گجرات کا سفر کیا تھا - وہاں کی زیارتیں دیکھی تھیں - اہل علم سے ملاقاتیں کی تھیں - اور اطراف ملک کی رُوحانی زندگی سے ذاتی واقفیت تھی - احمد آباد میں آپ کو وہاں کے سب سے برگزیدہ عالم شیخ وجیہ الدین علوی سے ملنے اور فیض پانے کا موقع ملا اور اخبار الاخیار میں آپ نے لکھا ہے کہ آپ نے ان سے قادریہ سلسلہ کے کئی اذکار و اشغال بھی حاصل کیے - مولنا سلیمان کردی نے (جن کے صاحبزادے مولنا احمد کردی احمد آبادی گجرات کے مشہور فاضل شیخ نور الدین احمد آبادی کے اُستاد تھے) آپ سے احمد آباد میں حدیث پڑھی -

۱۵۸۷ء کا اخیر یا ۱۵۸۸ء کا شروع تھا جب شیخ نے ساحلِ ہندوستان کو خیر باد کہا - زادِ سفر مہیا کرنے اور جہازی اخراجات بہم پہنچانے کی سعادت ، بخشی نظام الدین کو نصیب ہوئی - حجاز پہنچتے ہی آپ نے مکہ معظمہ کے محدثین سے صحیح مسلم اور صحیح بخاری کا درس لینا شروع کیا - فریضۂ حج سے فارغ ہوئے - اور پھر شیخ عبدالوہاب متقی کی خدمت میں حاضر ہوئے ، جن کا احسان آپ کی علمی اور رُوحانی زندگی پر سب سے زیادہ ہے -

شیخ عبدالوہاب متقی

ہم شیخ عبدالحق محدث کے ابتدائی وحدت الوجودی ماحول کا ذکر کر چکے ہیں - ان کے والد، چچا اور والد کے مرشد شیخ امان پانی پتی کا جو اندازِ خیال تھا، اگر اس کے زیرِ اثر وہ اسی رنگ میں رنگے جاتے تو کسی کو تعجب نہ ہوتا، لیکن خوش قسمتی سے حرمین میں انھیں ایک ایسا اُستاد میسّر آیا، جو ابن العربی اور اس کے ہم مشرب بزرگوں کے خیالات پر کڑی نظر رکھتا تھا اور جس نے شیخ عبدالحق کے ابتدائی ماحول کی تلافی کر دی -

شیخ عبدالوہاب متقی شاید (شیخ علی متقی کے علاوہ) پہلے با اثر ہندوستانی عالم تھا، جنھوں نے وحدت الوجودیوں کی افراط و تفریط کے خلاف باقاعدہ آواز اٹھائی اور شیخ عبدالحق محدثؒ اور شیخ محمد طاہر پٹنیؒ جیسی ہستیوں پر اثر ڈالا - وہ اور ان کے اُستاد شیخ علی متقی ہماری مذہبی تاریخ میں بڑی باعزت جگہ کے مستحق ہیں -

شیخ عبدالوہاب کی ولادت مالوہ کے دارالخلافہ مانڈو میں ہوئی۔ ان کے والد شیخ ولی اللہ امرائے سلطنت میں سے تھے۔ چند واقعات کی بنا پر انھیں مانڈو چھوڑ کر برہان پور آنا پڑا، لیکن تھوڑا عرصہ بعد وہ اور شیخ عبدالوہاب کی والدہ انتقال کر گئے۔ اور شیخ صغیر سنی میں یتیم ہو گئے۔ ان پر پتا نہیں، ان حوادث کا اثر ہوا یا کوئی اور سبب تھا انھوں نے وطنِ مالوف چھوڑ کر سیاحت اختیار کی اور گجرات۔ دکن۔ لنکا اور دوسرے ممالک کی سیر کی۔ جہاں کہیں جاتے، طلب علم اور صحبتِ اہل اللہ میں منہمک ہو جاتے۔ بلکہ عنفوانِ شباب میں ہی مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور شیخ علی متقی کی صحبت اختیار کی۔ مؤخر الذکر کے شیخ عبدالوہاب سے مراسم تھے۔ اور انھیں بھی والد نے وصیت کی تھی کہ اگر ہو سکے تو تم شیخ علی متقی کی صحبت اختیار کرنا (اور شیخ غوث گوالیاری اور اس قسم کے لوگوں سے بچے رہنا!) آخرکار شیخ عبدالوہاب متقی، شیخ علی متقی کے مرید ہوئے۔ اور بارہ سال تک ان سے فیض حاصل کیا۔

شیخ علی متقی

شیخ علی متقی، جن کا فیض شیخ عبدالحق کو شیخ عبدالوہاب کی وساطت سے پہنچا۔ خود ہندوستان کی مذہبی تاریخ میں بڑا مرتبہ رکھتے ہیں۔ اور ایک خاص شان اور پایہ کے بزرگ تھے۔ ان کا آبائی وطن جونپور تھا، لیکن وہ خود مانڈو میں پیدا ہوئے۔ اعلیٰ خاندان کے تھے۔ اس لیے عنفوانِ شباب امرا و اکابر کے درمیان گزرا۔ لیکن عین عالمِ شباب میں ایک جذبے کے تحت دنیوی دلچسپیاں ترک کر دیں۔ اور ملتان پہنچ کر شیخ حسام الدین متقی کی خدمت میں راہِ سلوک طے کی اور تفسیر بیضاوی اور عین العلم کا درس لیا۔ وہاں سے مانڈو اور احمد آباد کے قیام کے بعد حجاز روانہ ہوئے۔ اور مزید علمی اور روحانی سربلندی کا سامان کیا۔

آپ کے اساتذہ میں سے شیخ ابوالحسن بکری۔ شیخ محمد سخاوی اور شیخ ابن حجر مکی جیسے بزرگ تھے۔ تکمیلِ تعلیم کے بعد درس و تصنیف میں مشغول ہو گئے اور بڑا مرتبہ حاصل کیا۔ حتیٰ کہ آپ کے استاد شیخ ابنِ حجر سلوک میں آپ کے مرید

ہو گئے اور خرقہ خلافت حاصل کیا۔ ۹۴۶ھ میں آپ تھوڑی دیر کے لیے احمد آباد آئے، جہاں کے بادشاہوں نے آپ کی بڑی قدر کی، لیکن آپ جلد ہی مکۂ معظمہ واپس چلے گئے اور اپنے شغل میں لگ گئے۔ سلطانِ روم نے آپ کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ ۹۷۵ھ میں بمقام مدینہ منورہ نوے برس کی عمر میں وفات پائی۔

شیخ علی متقی نے سو سے زیادہ کتابیں لکھیں۔ آپ کی زیادہ دلچسپی علم حدیث اور تصوف سے تھی، لیکن آپ نے معاصرانہ بے اعتدالیوں پر بھی بڑی توجہ دی۔ شیخ غوث گوالیاری کے رسالہ معراجیہ کی مخالفت کے علاوہ آپ نے مہدی جونپوری کے خیالات کی بڑی مخالفت کی۔ اور نہ صرف اس مقصد کے لیے حکامِ وقت کی اعانت حاصل کی بلکہ مہدویت کی تردید میں دو مبسوط رسائل لکھے اور ظہور مہدی کے نشانوں کی تفصیلات اور علماے مکہ کے فتاویٰ درج کر کے مہدی جونپوری کے دعاوی کی تردید کی۔ یہ آپ کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ گجرات میں جو مہدویت کا مرکز بن گیا تھا۔ یہ تحریک بالآخر ناکام ہوئی اور اسے اپنا مرکز دکن میں منتقل کرنا پڑا۔

آپ کے شاگردوں میں دوسرے اکابر علما کے علاوہ شیخ محمد بن طاہر پٹنی تھے۔ جنھوں نے اپنے اُستاد کی متابعت میں مخالفتِ بدعت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی اور بالآخر اسی کوشش میں شہید ہو گئے۔

شیخ عبدالوہاب کو اس طرح کے اُستاد ملے ہوں تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے اپنے خیالات کا کیا اسلوب ہوگا۔ شیخ علی کے علاوہ انھوں نے حرمین کے دوسرے اساتذہ سے بھی فیض حاصل کیا۔ اور جب شیخ عبدالحق مکہ معظمہ پہنچے تو اس وقت ان کا شمار وہاں کے بہترین علما میں سے ہوتا تھا۔ اور ہندوستانی طلبا کے لیے تو وہ خاص طور پر ایک آیۂ رحمت تھے۔

شیخ عبدالحق ان کی نسبت لکھتے ہیں۔ "کہ دریں زماں بدانش ایشاں در علوم شرعیہ کمتر کسے خواہد بود"۔ اور باوجودیکہ وہ فقہ، حدیث اور لغت میں امامِ زمانہ تھے، وہ زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنے کی طلب ہمیشہ جاری رکھتے۔ ان کا قول تھا: "علم بمنزلہ غذا

است کہ ہمیشہ احتیاج بآں باقی است"۔ ذکر کو وہ بمنزلہ دوا سمجھتے جس کی کبھی کبھی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ فرماتے تھے کہ بزرگانِ سلف کا قاعدہ تھا کہ وہ اعمالِ خیر۔ تہذیبِ اخلاق اور نشرِ علوم کو باقی سب چیزوں کے مقابلے میں اہمیت دیتے اور یہی سلامتی کا راستا ہے۔ ایک دفعہ ان کی صحبت میں کسی نے مشائخ کا یہ قول دہرایا کہ طالب کو ہمیشہ ذکر میں مشغول رہنا چاہیے۔ آپ نے فرمایا کہ جو کوئی نیک کاموں میں مشغول ہے وہ فی الحقیقت ذکر ہی کر رہا ہے "نماز گزاردن ذکر است و تلاوتِ قرآن ذکر است و درسِ علوم دینیہ ذکر است و ہر چہ عملِ خیر است ذکر است"!!

آپ نے شیخ عبدالحق کو بڑی محبت سے تعلیم دی۔ اور علوم شریعت و طریقت میں طاق کر کے اپنا مجازِ مطلق و خلیفۂ کل بنایا۔ شیخ عبدالحق وطن کے ماحول سے بددل ہو کر حجاز گئے تھے۔ ان کا واپسی کو بالکل جی نہ چاہتا تھا۔ لیکن اُستاد نے سختی سے ہدایت کی کہ تمھاری بوڑھی والدہ اور تمھارے بچے منتظر ہیں۔ تمھیں واپس جانا چاہیے۔ شیخ نے پھر کہا کہ ابھی تو میرا دل ان مقاماتِ شریفہ میں دیر تک رہنے کو چاہتا ہے پھر بغداد جانے کی خواہش ہے کہ حضرت غوثِ اعظم کے مزار کی زیارت کروں' لیکن اُستاد نے منع کیا اور کہا کہ تم بغداد جا کر پھر رُک جاؤ گے۔ اور وطن کی واپسی' جواب تمھارے لیے شرعی فریضہ ہے' اس کی بجاآوری میں دیر ہوگی۔ شیخ نے اور دلیلیں دیں۔ لیکن اُستاد نے دلائلِ عقلی و شرعی سے لاجواب کر دیا۔ اور بالآخر انھیں مجبور ہو کر وطن کا رُخ کرنا پڑا۔

شیخ محدثؒ اور بدایونی

شیخ عبدالوہاب متقی کے متعلق متذکرہ بالا حالات شیخ عبدالحق کی اپنی تصانیف سے ماخوذ ہیں۔ لیکن ملا عبدالقادر بدایونی کی تیغِ زبان سے کوئی نہیں بچا۔ اس نے علما و فضلا کے ضمن میں ان کے متعلق چار صفحے لکھے ہیں۔ زیادہ جگہ دو خطوں نے لی ہے۔ ایک فیضی کا شیخ کے نام خط ہے۔ جس سے اقتباسات ہم آگے چل کر پیش کریں گے۔ دوسرا ایک ایسا خط ہے جس کی نسبت منتخب التواریخ حصہ سوم کے انگریز مترجم اور پروفیسر خلیق احمد نظامی کا خیال ہے کہ یہ خط بدایونی نے لاہور سے شیخ محدث کو لکھا۔ پروفیسر صاحب اپنی مشہور کتاب حیاتِ شیخ عبدالحق محدث

دہلوی میں لکھتے ہیں :۔

شیخ محدث جب حجاز سے واپس آئے تو بدایونی نے دہلی میں ان سے ملاقات کی۔
یہ ملاقات سرسری سی ہوئی تھی۔ اس لیے کہ بدایونی اس وقت لشکر کے ہمراہ جا رہے تھے۔
بدایونی کو اس کا بڑا افسوس رہا۔ اور لاہور سے شیخ محدث کے نام ایک خط میں لکھا..

"در وقتیکہ ملازمان ایشاں بدہلی تشریف آوردند۔ و مخلص خود را
ساعتے لطیف مشرف ساختند۔ آں ملاقات جز تعطش و شوق بتعزدد
و چنداں چیز ناگفتہ و ناشنیدہ ماند" [ص ۲۴۵/۲۴۶]

پروفیسر صاحب نے اس خط کا ایک اور اقتباس درج کتاب کیا ہے
اور شیخ محدث اور ملا بدایونی کی "محبت و یگانگت" پر زور دیا ہے، لیکن ان کا
یہ خیال کہ یہ اظہارِ شوق بدایونی نے کیا۔ صحیح نہیں۔ جس خط سے انھوں نے
اقتباسات دیے ہیں، وہ ملا بدایونی کا نہیں، شیخ محدث کا ہے۔ بدایونی کی
عبارت حسب ذیل ہے :۔

درایامیکہ [شیخ محدث] از مکہ معظمہ تشریف بدہلی آوردہ فقیر بحسب
مطلب [طلب ؟] باضطراب تمام از بداؤں متوجہ اردوئے بادشاہی بودم
لحظہ خدمتش را دریافتم و بعد از انکہ بہ لاہور رسیدم، خطے نوشتہ فرستاد۔
نقل آں بجہت تیمن و تذکار ثبت مے نماید ...."

پروفیسر نظامی نے اس خط کا جو پہلا اقتباس اپنی کتاب میں دیا ہے۔ اور
جسے ہم اوپر نقل کر آئے ہیں، اس سے بھی ظاہر ہے۔ کہ اس خط کا لکھنے
والا کوئی ایسا شخص ہے، جو دہلی میں مقیم ہے۔

بدایونی کا باقی اندراج غور سے پڑھیں تو صاف نظر آتا ہے۔ کہ
رسمی تعریفوں کے ساتھ ساتھ طنز و تشنیع اور خردہ گیری کے اس
بادشاہ نے زہر میں بجھے ہوئے نشتر چلائے ہیں۔ شیخ محدث کا بلند
مقام علم حدیث کی وجہ سے ہے۔ اور عشق رسول نے انھیں امتیازی

رنگ دے دیا تھا۔ پروفیسر صاحب نے ایک مستقل باب (ہشتم) مدینہ منورہ میں شیخ کی حاضری کے متعلق لکھا ہے۔ (بہ عنوان مدینۃ الرسول میں)۔ اس میں لکھتے ہیں۔ "شیخ عبدالحق دہلوی کو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ پاک سے عشق تھا۔ دیارِ حبیب میں جب داخل ہوتے تو برہنہ پا ہو جاتے تھے"۔ (ص ۱۱۲)

اس سے پہلے بالوضاحت لکھتے ہیں۔" ۲۳ ربیع الثانی ۹۹۷ھ کو شیخ عبدالوہاب کی اجازت سے مدینہ طیبہ میں حاضر ہوئے۔ اور آخر رجب ۹۹۸ھ تک یہیں مقیم رہے" (ص ۱۰۸)۔ لیکن بدایونی کہتا ہے۔ کہ شیخ محدث تو مدینہ منورہ جا ہی نہ سکے!

یہی نہیں، بلکہ اُس کا بیان ہے۔ کہ شیخ نے صرف چند روز ("روزے چند") مکہ معظمہ میں "شیخ عبدالوہاب ہندی" کے سامنے بیٹھ کر حدیث کی اجازت لی تھی۔ اور یہ شیخ عبدالوہاب ہندی کون تھے؟ شیخ رحمت اللہ محدث کے (جن سے خود بدایونی نے تیمناً حدیث کا سبق لیا تھا اور ان کے دستِ مبارک سے آبِ زمزم پیا تھا) "خادم"!

"د [شیخ عبدالحق دہلوی] بحسنِ سعی مرزا نظام الدین احمد و مدگاری او دچہار شستہ بسفرِ حجاز رفت و بجہت تیغ (؟) بعضے موانع طبعی بمدینۂ سکینہ علیٰ ساکنہا السلام والتحیات، نتوانست مشرف شد و روزے چند در مکہ معظمہ پیش شیخ عبدالوہاب ہندی خادم شیخ رحمت اللہ محدث علیہ الرحمۃ (کہ با حاجی ہم از حج باز گشتہ با گرہ آمد۔ و حقیر از دست مبارکِ او آبِ زمزم نوشیدہ و سبقِ حدیث تیمناً گرفتہ بود) اجازت حدیث حاصل کردہ، بوطن مالوف رسیدہ"

(منتخب التواریخ جلد سوم ص ۱۱۳-۱۱۴)

اگر بدایونی کا بیان صحیح ہے۔ تو ظاہر ہے۔ کہ مدینہ منورہ میں شیخ محدث کی جس حاضری کا پروفیسر خلیق احمد صاحب نے اس ولولے اور وضاحت سے

ذکر کیا ہے ۔ اور شیخ عبدالوہاب کے فیوض اور علو مرتبہ کی جو تفاصیل انھوں (اور راقم السطور) نے گنائی ہیں ۔ ان کی صحت سے انکار لازم آتا ہے ، لیکن واقعہ یہ ہے ۔ کہ ہم دونوں کے اندراجات شیخ محدث کے اپنے بیانات پر مبنی ہیں !

اب ایک فرد کی تردید میں دوسرے فرد ، بلکہ ایک مقدس ہستی کے مقابلے میں دوسری مشہور (اور بعض حلقوں میں بے انتہا مقبول) ہستی کے بیان کا مسئلہ ہے ۔ ان میں سے کسے ترجیح دی جائے ؟ ہمارا اپنا خیال ہے ۔ کہ اصل حقیقت فقط اللہ تعالےٰ ہی کو معلوم ہے ۔ لیکن روایت و درایت کے اصولوں سے شیخ کے بیان کو ترجیح ہوگی ۔ ان کا اپنا معاملہ تھا ۔ انھیں حقیقتِ حال سے زیادہ خبر ہوگی ۔ بدایونی کا اندراج سماعی معلومات پر مبنی ہے ۔

بدایونی کو دانستہ غلط بیانی کا ملزم قرار دینا ضروری نہیں ، لیکن اس کے بیان سے اتنا ظاہر ہے کہ ان مقدس ہستیوں کے معاملے میں بھی ، جنھیں وہ "مجموعۂ کمالات و منبعِ فضائل" کہتا تھا ۔ اگر اُسے خُردہ گیری کا موقع ملتا تو قلم کا نشتر چلانے سے پہلے وہ تامل اور تصدیقِ واقعات کو کام میں نہ لاتا ۔ واہ میاں بدایونی ! واہ !!

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

فیضی اور شیخ محدثؒ

شیخ عبدالحق محدث اگست ۱۵۹۰ء میں مکۂ معظمہ سے روانہ ہوئے اور پانچ سال سے زیادہ کی غیر حاضری کے بعد دہلی پہنچے ۔ جب وہ دارالسلطنت سے روانہ ہوئے تھے تو فیضی اور ان کے درمیان بڑی میل ملاقات تھی ۔ واپسی پر فیضی نے چاہا کہ انھیں پھر اپنے حلقۂ احباب میں شریک کرے ۔ اور انھیں بُلانے کے لیے بڑے پُر جوش ، شوق آمیز خط لکھے :

"اگر بال و پرے می داشتم ، ہر روز بر بام آں حجرہ می نشستم و دانہ چینِ نکاتِ محبت می شدم ۔

لیکن جو جذبۂ رُوحانی شیخ کو بے قرار کر کے فتح پور سیکری سے باہر لے گیا تھا۔ وہ اب شیخ عبدالوہاب متقی کی صحبت میں اور حدیث نبوی کے مطالعے سے اور قوی ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ شاید انھیں اس تفاوت کا بھی اندازہ نہ تھا، جو فتح پور سیکری والے فیضی اور تفسیر غیر منقوط والے فیضی میں واقع ہو گئی تھی۔ انھوں نے معذرت آمیز خط لکھے۔ لیکن ملاقات کا قدیمی سلسلہ تازہ نہ کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ فیضی کی عقیدت اس سے کم نہ ہوئی۔ اب اس کے خطوں میں وہ شوخی اور بے تکلفی نہ تھی، جس کا اظہار اس نے شیخ کی روانگیٔ حجاز پر کیا تھا، لیکن عقیدت و ارادت برقرار تھی۔ ایک خط میں شیخ کو "ملک الاحبا" کہا ہے۔ ایک اور خط میں انھیں لکھا ہے:۔

"بمعبودِ مطلق قسم کہ ہرگز ایں شوق و قلق کہ ایں مخلص مشتاق را نسبت با ایشاں است بدیگرے نبودہ و نیست ؎

ز منزلے نگذشتم، بمنزلے نرسیدم
کہ در دلم نگذشتی، بخاطرم نرسیدی

والحق ایں ہمہ مہر و مہربانی و دوام ہمنشینی و ہمزبانی کہ در ایام قربت و غربت از ایشاں و با ایشاں متحقق بود۔ چرا ایں کس چنیں کشاکشِ شوق بے قرار نسازد۔"

بالآخر فیضی کو اس امر کا احساس ہو گیا کہ شیخ اس سے ملنا نہیں چاہتے۔ اس نے "ملک الاحبا" کے اس فیصلے پر بھی سرِ تسلیم خم کیا لیکن عقیدت و ارادت اب بھی کم نہ ہوئی۔ بلکہ وہ تفسیر سواطع الالہام لکھنے میں مشغول ہوا تو شیخ سے ملنے، انھیں تفسیر دکھانے اور ان سے داد لینے کی خواہش اور بھی بے قرار کرتی۔ کئی خطوط میں اس آرزو کا بے تابانہ اظہار ہے:۔

تو اے کبوترِ بامِ حرم چہ می دانی
طپیدنِ دلِ مرغانِ رشتہ بر پا را

اشتیاقِ ملاقات گرامی و توجہ بجمعیتِ باطن آں رُوحانی مواطن نہایتے ندارد۔ و دلِ بیخش ایشاں شاہدِ حال بس کہ محبت روز افزوں است و ہموارہ چشم در راہِ نامہ و پیغام می باشد۔ آں خود چہ گوید کہ در راہ مقدمِ شریف دارد۔ کہ خود را تابع

رضاے ایشاں داشتہ۔ از خود خواہی خود را گزرانیدہ است۔ علی الخصوص نسبت
بایشاں وایں بار بر خود پسندیدہ بعد دل اگر بار کشد، بار بکارے یارے

۵ خوش باش کہ ما خوے بہجراں کردیم
بر خود دشوار بر تو آساں کردیم

چہ نویسد کہ بر دل چہ می رود، و در دل چہ می آید۔

شیخ سے بھی کبھی کبھار خط آجاتا لیکن وہ "ترکِ صحبت الاضداد والاغیار" میں
ثابت قدم رہے۔ انھوں نے فیضی کو فتح پور سیکری کی ان محفلوں میں دیکھا تھا جب
اس کی بے راہ روی اور رعونت عروج پر تھی۔ اس زمانے میں ان کی اور فیضی کی گاڑھی
چھنتی تھی۔ لیکن شیخ نے ان محفلوں میں جو کچھ دیکھا، اس نے ان کا دل اس قدر
کھٹا کر دیا کہ اب وہ سواطع الالہام والے فیضی سے بھی نہیں ملنا چاہتے۔ حالانکہ اس
دوران میں فیضی کے انداز خیال میں جو تبدیلی ہوئی۔ اس پر مثنوی نل دمن کی نعت یا
تفسیر سواطع الالہام ہی نہیں، شیخ کے نام فیضی کے خطوط بھی گواہی دیتے ہیں۔ شیخ
اپنے فیصلے پر ثابت قدم رہے بلکہ انھوں نے تذکرۃ المصنفین دہلی میں فیضی کی
نسبت لکھا :-

فیضی اگرچہ در فصاحت و بلاغت و متانت و رصانتِ سخن ممتاز روزگار بود ولیکن
حیف کہ بجہت وقوع و ہبوط در بادیہ کفر و ضلالت رقم انکار در داد بار بر ناصیہ احوالِ
خود کشیدہ۔ زبانِ اہلِ دین و ملتِ جناب نبوت را از بردن نام وے دنام
جماعت شوم وے باک است۔

حج سے واپسی کے بعد شیخ عبدالحق نے دہلی میں قیام کیا اور اپنے آپ کو
درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے لیے وقف کر دیا۔ آپ کی تصنیفی زندگی
سفرِ حجاز سے پہلے شروع ہو چکی تھی۔ اخبار الاخیار کا نقشِ اوّل غالباً فتح پور سیکری میں
مکمل ہوا۔ آداب الصالحین جو امام غزالی کی تصنیف احیاء العلوم کے چند ابواب کا
فارسی ترجمہ ہے اور بعض دوسرے رسالے اسی زمانے میں لکھے گئے لیکن حجاز میں

تکمیل تعلیم اور اپنے طویل سفرِ حرمین میں متعدد بزرگوں سے تبادلۂ خیال کے بعد اب شیخ محدث نے سلسلۂ تصنیف و تالیف باقاعدگی سے شروع کیا۔ اور یہ سلسلہ اخیر عمر تک جاری رہا۔ آپ نے مدینہ منورہ کی تاریخ موسومہ جذب القلوب فی دیار المحبوب سفر حجاز میں شروع کی تھی، لیکن اس کی تکمیل دہلی پہنچ کر ہوئی۔ ان کے علاوہ آپ نے جو کتابیں لکھیں، ان کی تعداد چالیس پچاس کے قریب ہے۔ ہم ان میں سے بعض کا ذکر آئندہ صفحات میں کریں گے۔

شیخ عبدالحق محدث اب ایک مستند عالم تھے، لیکن سلوک و طریقت سے ان کی دلچسپی کم نہ ہوئی۔ ۱۵۹۹ء میں خواجہ محمدؐ باقی باللہ نقشبندی قدس سرہ دہلی تشریف لائے تو شیخ نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کی۔ اور ارشاد و ہدایت کی اجازت حاصل کی۔ حضرت خواجہ باقی باللہ سے آپ کے تعلقات بڑے گہرے اور مخلصانہ تھے۔ طبیعتیں بھی ملتی تھیں۔ ان کے نام آپ کے متعدد خطوط مجموعۃ المکاتیب الرسائل میں موجود ہیں۔

شیخ عبدالحق محدثؒ اور حضرت مجددّ الف ثانیؒ

شیخ عبدالحق محدث کو حضرت خواجہ باقی باللہ سے بڑی عقیدت تھی، لیکن ان کے نامور مرید حضرت مجدد الف ثانی سے آپ کو سخت اختلافات پیدا ہوئے۔ اور ان کے بعض بیانات کی تردید میں آپ نے ایک مستقل رسالہ لکھا۔ ہمارے فاضل دوست پروفیسر خلیق احمد نظامی نے یہ پورا رسالہ اپنی کتاب حیاتِ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے ساتھ شائع کر دیا ہے، لیکن افسوس کہ انھوں نے شیخ محدث کی چار سو صفحے کی مبسوط سوانحعمری میں نہ ان اختلافات کی، جو انھیں حضرت مجدد سے تھے۔ نہ ان اسباب کی، جن کی بنا پر بعضوں کے نزدیک یہ اختلافات رفع ہوئے، وضاحت کی ہے۔ بلکہ یہ لکھ کر کہ "یہ اختلاف عارضی تھا اور بہت جلد دور ہو گیا" ان اختلافات کے متعلق غلط فہمی کی گنجائش باقی رکھی ہے۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جب شیخ محدثؒ نے حضرت مجدد کے بعض

"واقعات" پر اعتراض کیے۔ اس وقت انھیں مجدد کے علوِ مرتبہ کا صحیح اندازہ نہ تھا۔ لیکن یہ خیال بالکل غلط ہے۔ ان اعتراضات کی توضیح میں شیخ نے جو رسالہ لکھا اس میں وہ حضرت مجدد کو صاف کہتے ہیں کہ جتنی محبت اور یک جہتی مجھے آپ سے ہے، شاید ہی کسی سے ہو۔ "ظن فقیر بشیخ جمیل است۔ ایں مقدار کہ مرا بشما نسبتِ محبت و اتحاد است، کم کسے را خواہد بود۔" انھوں نے یہ رسالہ "نصیحت و خیر خواہی" کے لیے لکھا اور پوری ذمہ داری کے ساتھ تحریر کیا۔ بلکہ وہ تو کہتے ہیں کہ یہ رسالہ کئی مجلسوں میں مکمل ہوا۔ ہر بار میں نے استخارہ کیا اور خدا سے دعا مانگی کہ وہ "شرِ نفس" اور غلط فہمیوں سے محفوظ رکھے۔ [حیاتِ شیخ عبد الحق محدث دہلوی ص۳۴۲]

شیخ محدث کو حضرت مجدد بڑے عزیز تھے اور ان کا طریقہ بھی عزیز تھا۔ لیکن رسول کی محبت سب سے بڑھ کر تھی۔ اس نے انھیں مجبور کیا کہ وہ حضرت مجدد کے بعض دعاوی کے خلاف آواز اٹھائیں۔ "نزد ایں فقیر شما ہم عزیز ید و ہم طریقہ شما۔ اما سخناں کہ نسبت بہ حضرت کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم میگویند۔ آنہا را تاب نداریم و آنچہ نسبت بہ مشائخ گفتہ اند۔ کرہاً و جبراً برداشتہ شد۔ اما برداشتِ ایں کلمات از طاقت حالِ ایں فقیر بیرونست۔"

اخبار الاخیار کے مجتبائی ایڈیشن کے آخر میں ناشر یا مرتب نے اپنی طرف سے حضرت مجدد کا ذکر بڑھا دیا ہے۔ اور کہا ہے کہ آخر عمر میں شیخ محدث نے حضرت مجدد کے متعلق اپنے خیالات سے رجوع کر لیا تھا۔ (شیخ مصنف رحمۃ اللہ تعالے علیہ در آخر عمر ازاں خیالات کہ نسبت بحضرت ایشاں داشت رجوع فرمود) اور اس کی تائید میں شیخ محدث کا ذیل کا رقعہ خواجہ حسام الدین کے نام کا نقل کیا:۔

"دریں ایام صفائے فقیر بخدمت میاں شیخ احمد سلمہ اللہ تعالیٰ از حد متجاوز است و اصلا پردہ بشریت و غشاوہ جبلت بمیاں نہ ماندہ قطع نظر از رعایت طریقہ و انصاف و حکم عقل کہ با ایں چنیں عزیزاں و بندگاں بدنباید بود، در باطن بطریق ذوق و وجدان و غلبہ چیزے افتادہ کہ زبان از تقریر آں لال است۔ سبحان اللہ مقلب القلوب و مبدل الاحوال۔ شاید

ظاہر بینیاں استبعاد کنند۔ من نمی دانم کہ حال چیست و بچہ منوال است"۔

یہ روایت مجددیہ سلسلے میں کافی پرانی ہے لیکن معاصرانہ اور معتبر تذکروں یعنی زبدۃ المقامات اور حضرات القدس میں نہیں۔ اس کا سب سے قدیمی بیان[1] جو ہماری نظر سے گزرا ہے، روضۃ القیومیہ میں (دفتر اوّل ص ۲۱۱ پر ہے' جہاں حضرت خواجہ کلاں (خلف ارشد حضرت خواجہ باقی باللہؒ) کی کلیات کے حوالے سے شیخ محدث کا ایک رقعہ خواجہ حسام الدین کے نام کا درج ہے: جس کا مضمون تتمہ اخبار الاخیار والے مندرجہ بالا رقعہ سے ایک حد تک ملتا ہے۔ چونکہ حضرت خواجہ کلاں نے خواجہ حسام الدین کی سوانح عمری لکھی تھی۔ اس لیے ان کی کلیات میں موصوف کے نام کے رقعات کا ہونا مستبعد نہیں (ممکن ہے کلیات خواجہ کلاں کا کوئی نسخہ دستیاب ہو جائے۔ اور حقیقت حال پر زیادہ روشنی پڑ سکے)۔ روضۃ القیومیہ میں مندرجہ رقعہ اور تتمہ اخبار الاخیار والے رقعہ میں صرف ایک حد تک اشتراک ہے۔ (شاید اختلاف مضمون کی وجہ یہ ہو کہ ہمارے سامنے روضۃ القیومیہ کا صرف اُردو ترجمہ ہے) لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ روضۃ القیومیہ میں یہ رقعہ کسی "رجوع" کی تائید میں نقل نہیں ہوا۔ بلکہ مصنف نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ شیخ محدثؒ "آنجناب (یعنی حضرت مجدد الف ثانیؒ) کی تجدید اور قیومیت" کے معترف تھے!

اس کے بعد "رجوع" کی روایت عام ہونی شروع ہوئی۔ اور شیخ عبدالحق محدث کے رقعہ بنام خواجہ حسام الدین کو اس روایت کی تائید میں پیش کیا گیا۔ تتمہ اخبار الاخیار (مجتبائی) میں لکھا ہے۔ "رجوع شیخ مشہور و بر السنہ ثقات مذکور"۔ مجتبائی پریس سے اخبار الاخیار ۱۳۳۲ھ (یعنی ۱۹۱۳ء) میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد عام طور پر اس روایت کو دُہرا دیا جاتا ہے۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی تذکرہ میں اسی خیال کا اظہار کیا۔ دَورِ حاضر میں شیخ عبدالحق محدثؒ کے سوانح نگار پروفیسر خلیق احمد نظامی نے ایک نیا اور کسی قدر مشکل الفہم نقطہ نظر پیش کیا۔ انھوں نے شیخ محدثؒ کے بالصراحت

---

[1] مناقب العارفین کا ذکر آگے آئے گا۔

اپنے خیالات یا اپنے رسالے کے مضامین سے "رجوع" کا تو غالباً کہیں ذکر نہیں کیا۔ لیکن "شیخ محدث کی رائے" کے بدل جانے" "شکوک و شبہات رفع" ہونے اور "عارضی" اختلافات دُور ہونے کا ذکر کر کے "رجوع" کے نظریے کو تقویت دی ہے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے نہ صرف اپنے کتاب کے ضمیمہ کے طور پر وہ رسالہ چھاپ دیا، جو شیخ محدث نے حضرت مجدد کے بعض بیانات کے متعلق لکھا تھا بلکہ اس رسالے کی اہمیت پر زور دیا اور اس کے اندراجات پر "سنجیدگی سے غور کرنے کی" دعوت دی:

"یہ مکتوب شیخ مجددؒ اور شیخ محدثؒ کے تعلقات کو سمجھنے میں بے حد مدد دیتا ہے۔

شیخ محدث نے مجدد صاحب کے جن جن خیالات پر اعتراض کیا ہے، ان پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے" [حیاتِ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۳۱۲]

پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی کی کتاب کی اشاعت اور ان کے شائع کردہ رسالے کے مطالعہ کے بعد ہم نے خیال ظاہر کیا کہ غالباً رجُوع کی روایت صحیح نہیں۔ ہمارے اس خیال کی تفصیلی تردید ایک محترم بزرگ نے کی ہے۔ ان کے ارشادات کا خلاصہ ہے کہ (۱) جو رسالہ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے شائع کیا ہے۔ وہ "شیخ محدث کے قلم سے کم اور دُوسروں سے زیادہ تعلق رکھتا ہے" چنانچہ انھوں نے رسالے میں سے کئی بے ربط جملے جمع کیے ہیں (۲) شیخ عبدالحق محدث کا جو خط خواجہ حسام الدین کے نام ہے، اسے پوری اہمیت دینی چاہیے (۳) "ہمارا خیال ہے کہ "رجوع" یا "صفائی" ضرور ہو چکی تھی اور ان جیسے بلند پایہ بزرگوں کی شان کا تقاضا بھی یہی تھا۔"

محترم بزرگ نے رسالے کے بعض بے ربط اندراجات کے متعلق جو شکائت کی ہے، وہ بجا ہے۔ پروفیسر نظامی نے یہ رسالہ عہدِ عالمگیری کی تالیف معارج الولائت (مرتبہ ۱۰۹۴ھ[1]) سے لیا۔ اور بظاہر جو غلط سلط متن ملا، چند حواشی کے ساتھ چھاپ دیا۔ چنانچہ کئی اغلاطِ کتابت اور بے ربط جملے رہ گئے۔ جن میں سے بعض کی

---

[1] محترم بزرگ کے مضمون میں "(مرتبہ ۱۹۰۴ء)" غالباً سہو ناقل ہے۔

تصحیح معارج الولایت کے دوسرے نسخوں سے ہو سکتی ہے[1]۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ صورت بھی پوری طرح تسلی بخش نہ ہوگی۔ رسالے کی اشاعت مناسب طریقے سے تبھی ہوگی، جب اسے ثانوی ذریعہ سے نہیں، بلکہ اصل رسالے کے مخطوطوں کے مطابق مرتب کیا جائے۔ اور یہ ناممکن العمل نہیں۔ اصل رسالہ کا کوئی نہ کوئی نسخہ شیخ محدث کے خاندان سے مل جائے گا۔ (جب ۱۹۰۲ء میں شیخ محدث کی سوانح عمری مراۃ الحقائق شائع ہوئی۔ اس وقت جواب بعض کلمات حضرت مجدد الف ثانیؒ کا ایک نسخہ خان بہادر مولوی محمد انوار الحق کے کتب خانہ میں تھا) رام پور لائبریری میں اس رسالے کا ایک[2] مخطوطہ ہے۔ کراچی میں کرنل عبدالرشید صاحب کے کتب خانے میں بھی ایک نسخہ ہے۔

محترم بزرگ نے رسالے کے متن کی تصحیح پر جو زور دیا ہے، وہ بجا ہے، لیکن جیسا کہ انھوں نے اعتراف کیا ہے۔ ان کے نشان کردہ "تمام اغلاط" کاتب کے ذمے" بھی قرار دیے جا سکتے ہیں۔ انھیں اس کے باوجود بھی خیال ہے۔ کہ کتاب میں اضافے ہیں۔ اس کی انھوں نے وضاحت نہیں کی۔ اور بہر کیف اس کا فیصلہ کتاب کے بہتر مخطوطوں کی مدد سے ہو سکتا ہے۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بنیادی طور پر اور بظاہر متعدد اغلاطِ کتابت کے باوجود پروفیسر نظامی کا شائع کردہ رسالہ وہی ہے، جو حضرت مجدد کے متعلق شیخ عبدالحق نے لکھا۔ اس کی تصدیق کا ایک آسان طریقہ یہ ہے کہ متعدد حضرات مجددیہ (مثلاً حضرت شاہ غلام علی صاحبؒ) نے اس رسالے کا رد لکھا ہے۔ اور اس سلسلے میں اس کی طویل عبارتیں نقل کی ہیں۔ پروفیسر نظامی کے شائع کردہ رسالے میں یہ سب عبارتیں موجود ہیں۔ اور نہ اس میں کوئی کلام نہیں کہ متعدد اغلاطِ کتابت کے باوجود شائع شدہ رسالہ وہی ہے، جو

---

[1] پروفیسر نظامی نے جس نسخہ پر انحصار کیا ہے۔ اس کی تاریخ کتابت ۱۲۸۳ھ ہے۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں دو مخطوطے ہیں۔ جن میں سے ایک (مجموعہ آذر کا شمارہ 25H) سالِ تالیف کے ستر و سال بعد (یعنی ۱۱۱۱ھ میں) لکھا گیا۔ یہ نسخہ نہایت ہی خوشخط اور پروفیسر نظامی کے نسخے سے زیادہ صحیح ہے۔

شیخ محدث نے لکھا۔ اس میں کئی فقرے ایسے ہیں، جن میں حضرت مجددؒ کی تعریف و تصدیق کی گئی ہے (مثلاً "حضرت خواجہ (باقی باللہؒ) اثبات شما (حضرت مجددؒ) بسیار میکردند۔ وکسان واقف اند برآں وبیشتر از ہمہ ایں فقیر" وغیرہ) معارج الولایت کے مؤلف غلام معین الدین کو حضرت مجددؒ کے مخالفین میں سے سمجھنا چاہیے۔ لیکن بظاہر یہ نظر نہیں آتا۔ کہ اس نے عبارت میں تحریف کی ہو۔

جہاں تک خواجہ حسام الدین کے نام کا رقعہ ہے، روضۃ القیومیہ کی عبارت دیکھنے کے بعد یہ اغلب معلوم ہوتا ہے کہ جو رقعہ تتمہ اخبار الاخیار میں نقل کیا گیا اس سے ملتا جلتا کوئی رقعہ شیخ محدث نے کسی وقت خواجہ حسام الدین کے نام لکھا۔ یہ رقعہ ہم نقل کر چکے، لیکن اس رسالے سے "رجوع" اخذ نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ "صفائی" کا خیال ہو سکتا ہے۔ (اور محترم بزرگ کو بھی اس کا کسی قدر احساس ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔ "رجوع" یا "صفائی" منرور ہو چکی تھی)۔ شیخ محدث نے جس طرح کا رسالہ لکھا تھا اور مشتہر کیا تھا۔ اگر اس کو وہ غلطی سمجھتے تھے تو اعترافِ سہو بھی علانیہ ہونا چاہیے تھے۔ اس کے علاوہ اس امر کا کوئی ثبوت نہیں کہ یہ رقعہ رسالے کی تالیف کے بعد لکھا گیا۔ شیخ عبدالحق محدث کے متعلق ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ان کا زیادہ تعلق خانقاہِ باقویہ دہلی کی اس جماعت سے تھا، جن کے حضرت مجدد سے حضرت خواجہ کی وفات کے بعد اختلافات رونما ہو گئے تھے۔ خواجہ حسام الدین کے ساتھ ان کا یگانگت معنوی کا قوی رشتہ تھا۔ ہمارا خیال ہے کہ خواجہ حسام الدین کے نام حضرت مجددؒ کے مکتوب (دفتر سوم۔ مکتوب ۱۲۱) میں جس "عزیز" (اندراج یافتہ بود کہ عزیزے بر عبارتِ مکتوبے کہ در اجمیر نوشتہ بودی، اعتراضہا دارد") کی طرف اشارہ ہے، وہ شیخ محدث تھے۔ خانقاہِ باقویہ کے مکینوں سے (جیسا کہ خواجہ حسام الدین کے نام کے متعدد مکتوبات سے واضح ہے) حضرت مجدد کے تعلقات میں اُتار چڑھاؤ ہوتا رہا۔ اور بہت ممکن ہے کہ شیخ محدث کا رقعہ کسی ابتدائی غلط فہمی یا عدمِ واقفیت کے دُور ہونے کے بعد یا فقط ان کی

عظمت کے زیادہ احساس پہ لکھا گیا ہو۔ یہ قرینِ قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ مندرجہ بالا رقعہ شیخ محدث کے رسالے کی تحریر اور رفع اختلاف کے بعد لکھا گیا ہو۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جیسا کہ فاضل محترم نے لکھا ہے۔ "مجتبائی ایڈیشن والے خط میں حضرت مجددؒ کے نام کے ساتھ "سلمہ اللہ تعالیٰ" کا دعائیہ فقرہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ صفائی یا رجوع ان کی زندگی ہی میں (یعنی ۱۰۳۴ھ سے پہلے) ہو چکا تھا۔" رسالے کی تاریخ تحریر معلوم نہیں، لیکن اس کے اندراجات سے صاف ظاہر ہے کہ یہ رسالہ دفتر سوم کے مکتوب شمارہ ۱۲۱ کے بعد لکھا گیا۔ کیونکہ اس مکتوب کی عبارتیں رسالے میں درج ہیں۔ یہ امر قریب قریب یقینی ہے۔ کہ مکتوب ۱۲۱ اجمیر سے سرہند کو آخری واپسی کے بعد لکھا گیا۔ (۱) یہ مکتوب خواجہ حسام الدین کے ایک خط کے جواب میں لکھا گیا۔ جس میں ایک ابتدائی مکتوب (۱۲۰) کا اس طرح ذکر ہے۔ "مکتوبے کہ در اجمیر نوشتہ بودی" کہ خیال ہوتا ہے کہ خواجہ حسام الدین کے مکتوب الیہ (یعنی حضرت مجدد) اس وقت اجمیر میں نہ تھے۔ (۲) مکتوب ۱۲۱ سے پہلا خط یعنی مکتوب ۱۲۰ "اختیار کردن عزلت" کے متعلق ہے۔ اور معاصرانہ تذکرے گواہ ہیں۔ کہ آپ نے اجمیر سے واپسی کے بعد گوشہ نشینی اختیار کی۔ اور اس کے بعد "مدتِ قلیل" (حضرات القدس ص ۱۷۷) میں رحلت فرمائی۔ بالعموم یہ مدت چھ ماہ کی بیان ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ خواجہ ہاشم کشمی کی دکن کو روانگی کے قریباً سات ماہ بعد آپ کا انتقال ہوا۔ اس لیے سرہند کا آخری قیام آٹھ نو مہینے کا ہوگا (۳) مکتوب ۱۲۱ بالکل آخری مکاتیب میں سے ہے۔ دفتر سوم میں، جو مکتوبات کی آخری جلد ہے، فقط تین مکاتیب اس کے بعد ہیں۔

مندرجہ بالا وجوہ سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مکتوب ۱۲۱ حضرت مجدد کے آخری سال میں تحریر ہوا۔ یہ مکتوب دہلی پہنچا۔ اس کے بعد شیخ عبدالحق محدث نے کافی غور و تعمق کے بعد اور کئی مجلسوں میں اپنا رسالہ لکھا۔ کیا یہ قرینِ قیاس ہے کہ اس کے چند مہینے بعد ہی انھوں نے حضرت مجدد کے بیانات، جن کی نسبت وہ سالہاسال ("سالہا است") سے غیر مطمئن تھے، کے متعلق اپنا نقطۂ نظر ترک کر دیا۔

اور اُس رسالے کے مضامین سے، جسے انھوں نے ہر بار استخارہ کر کے اور دُعائیں مانگ کر لکھا تھا، رجوع کر لیا ؟

فاضل محترم نے یہ بھی لکھا ہے کہ "ان (حضرت مجددؒ اور شیخ محدثؒ) جیسے بلند پایہ بزرگوں کی شان کا تقاضا یہی تھا" کہ "رجوع" یا "صفائی" ہو جاتی۔ یہ صحیح ہے کہ دونوں بزرگوں کا پایہ بہت بلند تھا۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان میں کسی معاملے پر اختلاف رائے نہیں ہو سکتا تھا۔ نواب صدیق حسن تو اس اختلاف میں تقلید اور ردِّ بدعت کا پرتو دیکھتے ہیں[1]۔ لیکن وجہ اختلاف کی طرف شاہ غلام علی قدس سرہ نے اشارہ کیا ہے اور کہا ہے کہ شیخ محدثؒ نے اعتراضات "بطریقِ علمائے ظاہر" کیے تھے۔ حضرت مجدد کے متعلقہ بیانات بطور اہلِ باطن کے تھے۔ ان دونوں کے درمیان اختلاف رائے ناممکن نہ تھا۔

ابھی تک "رجوع" کے مسئلے پر جو کچھ مواد ہمیں ملا ہے، اس کے مطالعہ سے ہمارے شبہات رفع نہیں ہوئے۔ اس کی چند وجوہات اُوپر درج ہو چکیں۔ ایک اہم وجہ یہ ہے کہ سلسلۂ مجددیہ کے بزرگ جس طریقے سے اس روایت کی تائید کرتے ہیں۔ اس سے صاف نظر آتا ہے کہ وہ استنادی حوالوں میں کافی چھان بین یا غور و خوض کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ مثلاً حال ہی میں ایک بزرگ نے انوارِ احمدیہ کے ایک اندراج کا ذکر کیا ہے، جس میں مناقب العارفین کے حوالے سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ شیخ عبدالحق کی تردید حسن افغانی کی شرارت کا شاخسانہ تھا۔ جب شیخ پر "حقیقت ظاہر ہوئی تو انھوں نے حضرت مجددؒ سے معذرت کی"۔ انھوں نے متعلقہ عبارت نقل نہیں کی لیکن حسن خاں افغانی کے مکتوبات میں ترمیم و تحریف کا قصہ بہت مشہور ہے۔ جواہر مجددیہ میں بھی مناقب العارفین کے حوالے سے یہ واقعہ درج ہے۔ اگرچہ وہاں حضرت مجدد سے معذرت کا ذکر نہیں۔ خواجہ حسام الدین کے نام اخبار الاخیار والے رقعہ لکھے جانے کا بیان ہے) لیکن یہ امر بھی ملحوظ خاطر

---

[1] ملاحظہ ہو حیاتِ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۲۴۲

رکھنا ضروری ہے کہ حسن خاں افغانی کی ترمیم و تحریف کا واقعہ اگر صحیح بھی ہو، تب بھی اس سے شیخ محدث کے خیالات کی تبدیلی قرین قیاس نہیں کیونکہ انھیں مکاتیب کی جن عبارتوں پر اعتراض تھا، ان سے کبھی انکار نہیں کیا گیا۔ اور وہ مطبوعہ مکاتیب کے تمام نسخوں میں موجود ہیں!

اخبار الاخیار (مجتبائی) والے رقعہ کی نسبت یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس میں حضرت مجددؒ سے جتنی ارادت کا ذکر ہے۔ اس سے زیادہ شیخ محدث رسالہ لکھتے وقت ظاہر کر چکے تھے، لیکن یہ ارادت رسالہ لکھنے میں مانع نہ ہوئی۔ اس خط میں بھی "میاں احمد سرہندی" کو مجدد نہیں کہا گیا۔ اور بہر کیف اگر کسی باطنی اشارے کی بنا پر حضرت مجدد سے شیخ کی عقیدت بڑھ گئی ہو۔ تب بھی رسالے میں کوئی چیز ایسی نہیں، جس سے شیخ عبدالحق جیسا عاشقِ رسول "رجوع" کرے۔

ابھی تک جو مواد ہمیں ملا ہے۔ اس کی بنا پر ہمارا خیال ہے کہ شیخ عبدالحق نے رسالے کے مضامین سے رجوع نہیں کیا۔ بلکہ جس مقصد سے انھوں نے یہ رسالہ لکھا تھا، اسی کی تکمیل کے لیے اپنی ضخیم کتاب مدارج النبوۃ لکھی۔ اور فی الواقع یہ مقصد شیخ کی علمی زندگی میں مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ ان کے ایک معاصر میر عبدالاول ان کی نسبت لکھتے ہیں:-

"بہت حفظ امن و عافیت و در فع مرض فتنہ اشتغال بہ علوم حدیث واجب دید
وضرر سموم حوادث را باین تریاق فاروق مندفع گردانید۔"

میر عبدالاول نے بڑے پتے کی بات کہہ دی ہے کہ شیخ عبدالحق نے اپنے زمانے کے فتنوں کا تریاق علم حدیث کی ترویج میں دیکھا۔ اور اسی میں مشغول رہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شیخ کے زمانے میں مہدویت۔ قبوریت اور عقلیت کے طرفداروں نے عقائد و خیالات میں الجھنیں ڈال رکھی تھیں۔ شیخ نے ان سب کا علاج یہی سوچا کہ نبوت کی عظمت و حقیقت کو نمایاں کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے (جیسا کہ میر عبدالاول نے کہا ہے) علوم حدیث کی اشاعت کی، بلکہ ان کی علمی زندگی کا

اصل محورِ رسالت مآبؐ کی ذاتِ بابرکات تھی۔ آپ نے نہ صرف حدیثِ نبوی کا درس دیا اور اس علم میں متعدد کتابیں لکھیں، بلکہ رسول کریمؐ کی سیرت اور حقیقت نبوت پر بڑی تقطیع کی بارہ چودہ سو صفحے کی کتاب مدارج النبوت لکھی۔ انھوں نے تاریخ مدینہ کے متعلق ایک عربی کتاب کا جو ترجمہ کیا، اس کا عنوان "جذب القلوب فی دیارِ المحبوبؐ" بھی اس عاشقِ رسولؐ کی قلبی کیفیتوں کا آئینہ دار ہے۔

شیخ عبدالحق محدث نے حضرت مجددؒ کے بعض بیانات کے متعلق جو رسالہ لکھا، اس کا مقصد بھی ان خیالات کی تردید تھا، جو مجددیت اور نبوت کی شرکت کے متعلق ظاہر کیے گئے تھے۔ مدارج النبوۃ کے مقصد تحریر کی نسبت شیخ لکھتے ہیں:-

"چوں از فسادِ زماں انحرافے در مزاجِ وقت بعضے درویشانِ مغرورِ ایں روزگار راہ یافتہ ...... تنگیٔ حوصلہ را در ادراک پایۂ ارفع و مقامِ اقدسِ محمدیؐ گرسجکیپ را بدرک و دریافت آں راہ نیست نشناختہ۔ و تقصیرے درادائے حق نمودہ و از جادۂ دین و صراطِ مستقیم برافتادہ بودند۔ لازم حق مسلمانی آں نمود۔ کہ احوال و صفات قدسیہ ... نگارش نماید وایں بے خبراں را از حقیقت حال آگاہ گرداند"

پروفیسر خلیق احمد نظامی اپنی کتاب میں یہ عبارت درج کرنے سے پہلے فرماتے ہیں۔ "مدارج النبوۃ کی تصنیف سے شیخ کا مقصد یہ تھا کہ عہدِ اکبر کے فتنوں کا سدِباب کیا جائے" لیکن پتا نہیں کہ "درویشانِ مغرورِ ایں روزگار" سے وہ اکبر اور اس کے درباری کیوں مراد لیتے ہیں جو مدارج النبوت کی تالیف سے بہت پہلے ختم ہو چکے تھے۔ اور بہرکیف کبھی بھی درویش نہ تھے اور اس کے واضح مفہوم کو ہم عصر درویشوں پر کیوں منطبق نہیں کرتے؟

مدارج النبوۃ میں ایک اور جگہ ہے:-

بعض کوتاہ بیناں کہ شہودِ حق را از وساطتِ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مفارق میدانند و بہ ہر رخنہ وے واقف نمی شوند۔ ایں معنی در رسالہ جدا آوردہ بعضے از مدعا ہا را

لہ منقول از حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی (تالیف پروفیسر خلیق احمد نظامی) صفحہ ۲۹۷

مشرح تر ازیں گفتہ ایم۔"

چونکہ شیخ محدث نے مندرجہ بالا عبارت میں رسالے کا نام نہیں لیا۔ اس لیے تیقن سے نہیں کہا جا سکتا کہ کس رسالے کی طرف اشارہ ہے۔ غلط فہمی کی گنجائش رہتی ہے، لیکن چونکہ شیخ محدث نے رسالے کا موضوع بیان کر دیا ہے۔ اس لیے عبارت کا مفہوم محدود ہو جاتا ہے۔ ہمارے ایک محترم بزرگ کا خیال ہے کہ اس میں "حضرت شیخ (عبدالحق محدث) کے رسالہ 'فقر محمدی' کی طرف اشارہ ہے" لیکن واقعہ یہ ہے کہ رسالہ فقر محمدی شیخ محدث کی تصنیف نہیں۔ یہ رسالہ عرب کے ایک عالم صوفی شیخ احمد بن ابراہیم الواسطی الحزمی نے عرب میں تصنیف کیا۔ خواجہ باقی باللہؒ کے استفسار پر شیخ محدثؒ نے "بطریق اختصار" اس کا ترجمہ کیا۔ "تا پیدا گردد کہ مقصود چیست۔ بے زیادتِ چیزے براں۔" اب قارئین ہی غور فرمائیں۔ کہ ایک دوسرے عالم کی تصنیف کے اس ملخص کو "حضرت شیخ" عبدالحق کا "رسالہ" کیسے کہا جا سکتا ہے۔ اور اس سے وہ رسالہ کیسے مراد لیا جا سکتا ہے جس کی نسبت شیخ محدث (جو انتخابِ الفاظ میں اتنے محتاط اور باریک بیں تھے) مدارج النبوت میں فرماتے ہیں۔ "ایں معنی در رسالۂ جدا آوردہ، بعضے از مدعا ہا را مشرح تر ازیں گفتہ ایم" یعنی جو ان کی اپنی تصنیف ہے!

رسالہ فقر محمدی کا یہ ملخص حضرت خواجہ باقی باللہ کے نام شیخ محدث کے پانچویں خط کی صورت میں اخبار الاخیار (مجتبائی) کے حاشیے پر ملتا ہے۔ محترم بزرگ نے بھی اس میں سے تفصیلی اقتباسات دیے ہیں۔ رسالت مآبؐ کو اپنا شیخ طریقت سمجھنے اور طریقتِ محمدی کے قواعد و اشغال کا بیان ہے۔ لیکن اگر آپ کو "شہودِ حق" اور وساطت نبوی کو "مفارق" سمجھنے والوں کے متعلق "مشرح تر" اظہارِ خیال مطلوب ہے تو وہ یہاں نہیں ملتا۔ اس مسئلے پر واضح اور مفصل اظہارِ خیال شیخ عبدالحق محدث کے اس رسالے میں ہے جس کا نام ان کی قدیمی سوانح عمری مراۃ الحقائق میں جواب بعض کلمات حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمۃ دیا ہے۔ اور جسے اب پروفیسر

خلیق احمد نظامی نے حیاتِ شیخ عبدالحق محدث کے آخر میں شائع کیا ہے۔

جس رسالے کا مدارج النبوت میں ذکر ہے، کیا یہ رسالہ وہی تو نہیں، جو حضرت مجدد کے بعض بیانات کے متعلق لکھا گیا اور جس میں توسطِ نبویؐ کی ضرورت پر تفصیلی بحث کی گئی ہے؟ موجودہ اشاعت میں توضیح حال کے لیے ہم نے دو پیراگراف بڑھا دیے ہیں۔ اس سے پہلے مدارج النبوت کا اندراج نقل کرنے کے بعد فقط خط کشیدہ عبارت لکھی تھی۔ اور اہلِ علم سے سوال کیا تھا کہ جس رسالے کا منقولہ اندراج میں ذکر ہے کیا وہ وہی رسالہ تو نہیں جو شیخ محدث نے حضرت مجدد کے بعض بیانات کے متعلق لکھا؟

ہماری اس دو سطری عبارت پر ایک بزرگ نے بڑی برہمی کا اظہار کیا ہے اور لکھا ہے۔ "حضرت مجددؒ پر فاضل محترم نے افترا اور بہتان باندھا ہے۔ کہ انھوں نے شہودِ حق کے لیے اس (حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی) وساطت کو مفارق سمجھا ہے"۔ دوسری جگہ اسی طرح کا اظہار کرکے "ظلم اور سینہ زوری" اور "افترا پردازی" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ (آپ ان الفاظ کی شدت پر نہ جائیے۔ یہ ہمارا اور بزرگِ محترم کا معاملہ ہے۔ ہم نے انھیں نقل کر دیا ہے۔ تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ کس چیز نے ہمیں مجبور کیا۔ کہ حقیقت کو وضاحت سے بیان کریں)۔

آپ مندرجہ بالا خط کشیدہ عبارت پر غور فرمائیں۔ ہم نے ہرگز ہرگز یہ نہیں کہا کہ ہمارے نزدیک حضرت مجدد علیہ الرحمۃ نے شہودِ حق کے لیے وساطتِ نبویؐ کو مفارق سمجھا ہے۔ سوال صرف شیخ محدث کے بیان کا ہے۔ ہم نے اشتراکِ مضمون کی بنا پر فقط اس امکان کا اظہار کیا ہے کہ جس رسالے کا مدارج النبوت میں ذکر ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ وہی رسالہ ہو، جو شیخ محدث نے حضرت مجدد کے متعلق لکھا۔ اس چیز کو اس طرح پیش کرنا کہ جس بات کا شیخ محدث نے اظہار کیا۔ وہ ہمارا خیال ہے، شاید صحتِ بیان سے کسی قدر دور ہے!

اب اصل سوال کو لیجیے اور اس امر پر غور کیجیے کہ شیخ عبدالحق محدث کے کن بیانات کی بنا پر ہمیں خیال ہوا۔ کہ شاید مدارج النبوت میں اسی رسالے کی طرف اشارہ ہے جو

حضرت مجدد کے بعض بیانات کی نسبت لکھا گیا۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ اجمیر سے حضرت مجددؒ نے ایک مکتوب (دفتر دوم۔ شمارہ ۸۷) لکھا، جو شیخ عبد الحق کے تردیدی رسالے کا محرک ہوا۔ اس مکتوب کی چند سطریں (امرتسری ایڈیشن کے مطابق) درج ذیل ہیں:۔

سلسلۂ ارادتِ من بے توسط بہ اللہ متصل است تعالےٰ

و یدِ من نائب مناب یدِ اللہ است۔

ارادتِ من بہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم بوسائط کثیرہ است ....

و ارادتِ من بہ اللہ قبولِ وساطت نمی نماید۔ چنانکہ گزشت۔

پس من ہم مریدِ محمد رسول اللہ ام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم و ہم پیرِ او پس رو اد۔

بر خوانِ ایں دولت ہر چند طفیلی ام، اما ناخواندہ نیامدہ ام

و ہر چند تابع ام، اما از اصالت بے بہرہ نیم

و ہر چند امتم، اما شریکِ دولتم، نہ شرکتے کہ ازاں دعوئ ہمسری خیزد کہ آں کفراست بلکہ شرکتِ خادم است با مخدوم .....

مندرجہ بالا سطور سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ مسئلہ زیر بحث کیا تھا۔ جب اس مکتوب پر "شور و غوغا" ہوا (دفتر سوم۔ مکتوب ۱۲۱)۔ اور شیخ حسام الدین نے حضرت مجدد کے نام شبہات اور اعتراضات ارسال کیے تو حضرت مجدد نے ایک مفصل خط لکھا۔ (شمارہ ۱۲۱)۔ اس کے آخر میں رسول اللہ کی مدح و ثنا لکھی۔ اور ان کے توسط و توسل کی ضرورت پر زور دیا۔ شیخ عبد الحق محدث نے توضیحی مکتوب کے اس حصے پر بڑی خوشی ظاہر کی ("جان را سیراب و دل را شاداب می گرداند" لیکن پہلے خط (شمارہ ۸۷) اور بعد کے مکتوب کے ابتدائی حصے پر انھیں اعتراض رہا۔

ہ امرتسری ایڈیشن میں اس طرح ہے۔ شیخ عبد الحق محدث نے اس مکتوب کی جو نقل اپنے رسالے میں دی ہے اس میں آخری جملہ حسب ذیل ہے۔ "و ہم بہرہ" (ملاحظہ ہو حیاتِ شیخ عبد الحق محدث دہلوی صہ ۳۱۵)

توضیحی مکتوب میں حضرت مجدد نے محمدی مشرب سالک کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا۔ "مخدوما وصول فیوض مر سالک را بتوسط و حیلولت خیر البشر علیہ وعلی آلہ الصلوٰۃ والسلام تا زمانے است۔ کہ حقیقت آں سالک کہ محمدی المشرب است۔ بحقیقت محمدی منطبق نگشتہ است۔ و باں متحد نشدہ وچوں بکمال متابعت بلکہ بمحض فضل در مقامات عروج ایں حقیقت را باں حقیقت اتحادے حاصل شد توسط برخاست" شیخ محدث شکایتاً لکھتے ہیں۔ "در عبارت ایشاں اکثر متابعت بہ ذکر فضل الٰہی مقرونست۔" حضرت مجددؒ نے لکھا تھا کہ یہ شرکت خادم و مخدوم کی ہے۔ شیخ محدث کو اس پر بھی اعتراض تھا۔ جہاں تک تبعیت کا تعلق ہے، انھوں نے لکھا کہ یہ مقولہ تو بالکل مہدویہ فرقہ کے بیان کے مطابق ہے۔ "می گفتند کہ ہر کمالے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم داشت۔ در سید محمد (جونپوری) نیز بود۔ فرق (ایں) است کہ آنجا بہ اصالت بود۔ و ایں جا بہ تبعیت رسول بجائے رسیدہ کہ ہمچو او شدہ۔ و ایں بعینہ مقول ایشاں (مجددؒ) است"۔ جہاں تک خادمی و مخدومی کا تعلق ہے، شیخ محدث نے لکھا۔ "تفرقہ و تفصیل باعتبار خادمی و مخدومی و اصالتہ و فرعتہ نیز باطل است و عاطل"۔ ایک اور جگہ کہتے ہیں۔ "ایں سخن خادمے و مخدومے در کلام ایشاں بسیار واقع شدہ۔ در اجتماع کمالات ابراہیمی و محمدی نیز گفتہ اند۔ و ایں را گریز گاہ ساختہ اند۔ اما فائدہ ندارد"۔ لیکن رسالے میں زیادہ بحث خدا تک پہنچنے کے لیے وساطت نبوی کی ضرورت پر ہے۔ (شاہ غلام علی صاحبؒ نے جو رسالہ شیخؒ کی تردید میں لکھا۔ اس میں کہتے ہیں "معظم اعتراضات حضرت شیخ رفع توسط است۔ و دریں باب اطالت کلام بسیار فرمودہ" ص۲۶)۔ متعدد صفحوں پر "توسط"۔ "عدم توسط"۔ "وساطت"۔ "وسائط"۔ "واسطہ" کا ذکر آتا ہے۔ ان سب کے حوالے دینا غیر ضروری ہے۔ لیکن "شہود حق" اور "وساطت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم" کی مفارقت کے متعلق رسالے کا مضمون ایک اندراج سے ہی واضح ہو جاتا ہے۔ شیخ محدث حضرت مجدد کو مخاطب کر کے لکھتے ہیں:۔

"شمارا عالم و فاضل و ماہر و دانشور و سخنور میدانیم۔ بلکہ عارف و مکاشف ہم گوئیم۔

اما آں راز کجا معلوم کنم کہ شما بسیر مرادی بمرتبہ رسیدہ اند کہ وساطت حضرت سید المرسلین وسید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم درمیان شما و خدائے عز وجل نماندہ است؟" (ص ۱۲۲)

کیا "شہود حق" اور "وساطت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم" کی "مفارقت" کے متعلق اس سے زیادہ واضح کوئی چیز ہو سکتی ہے؟

یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت مجدد کے متعلق شیخ محدث کا خیال صحیح نہ تھا۔ اسی طرح مدارج النبوت میں جس رسالے کا ذکر ہے، اس کے متعلق شاید قوی دلائل سے یہ ثابت کیا جا سکے کہ اس کے متعلق ہم نے جس امکان کا ذکر کیا تھا، وہ قابل قبول نہیں۔ لیکن شیخ محدث نے اس رسالے میں جسے پروفیسر خلیق احمد نظامی نے شائع کیا ہے، "شہود حق" اور "وساطت" "سید المرسلین کی مفارقت کا جس طرح ذکر کیا ہے، کیا اس کو دیکھتے ہوئے اس امکان کا ذکر کرنا (بلکہ اس امکان کے متعلق محض ایک سوال اٹھانا) کہ مدارج النبوت کی خط کشیدہ عبارت میں جس رسالے کا ذکر ہے کیا یہ وہی رسالہ تو نہیں، جسے پروفیسر خلیق احمد نظامی نے شائع کیا، شاید اتنا بے بنیاد نہیں کہ اس سوال پوچھنے والے کی دیانت پر شبہ ہو۔ اور "افترا" اور "بہتان" کے الفاظ استعمال کیے جائیں۔

ہمیں رسالے سے "رجوع"[1] کے متعلق شبہ ہے۔ اور اگر مدارج النبوت کی مندرجہ عبارت میں واقعی اس رسالے کی طرف اشارہ ہے۔ تو ظاہر ہے کہ شیخ محدث اپنی بعض

---

[1] "رجوع" کی روائت کے متعلق یہ امر قابل غور ہے کہ یہ روائت صرف مجددی حلقوں میں مشہور ہے یا شیخ کی (بعد کی) کتابوں میں ملتی ہے جو شیخ محدث کی کسی تصنیف میں اس کا ذکر نہیں۔ ان کے خاندان میں بیسیوں صاحب علم، صاحب تصنیف گزرے ہیں۔ ان کے صاحبزادے شیخ نور الحق ممتاز اہل قلم تھے۔ ان کی کسی تحریر کا حوالہ نہیں دیا جاتا۔ آج سے ساٹھ ستر سال پہلے ان کے خاندان کے ایک بزرگ نے شیخ محدث کی ایک مبسوط سوانحعمری مراۃ الحقائق کے نام سے شائع کی۔ اس میں شیخ کی تصنیفات کے ضمن میں رسالے کا اندراج بالوضاحت ہے۔ "جواب بعض کلمات حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ" (ص ۲۶-۲۷) لیکن "رجوع" کا کہیں ذکر نہیں۔

دوسری تحریروں میں ان خیالات کی طرف اشارہ کرتے رہے جنھیں وہ رسالے میں ظاہر کر چکے تھے، لیکن "رجوع" کی روایت سے انکار سے یہ نہ سمجھا جائے کہ خدانخواستہ ہمیں رسالے کے اندراجات سے اتفاق ہے یا ہمیں حضرت مجددؒ کی عظمت و بزرگی کا پورا اعتراف نہیں۔ حاشا و کلا۔ ایک عرصے تک تو ہم حیران تھے کہ توضیحی مکتوب (۱۲۱/۱) کے بعد شیخ محدث کو یہ رسالہ لکھنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ پہلے خط (۳/۸) سے ان کی پریشانی تو بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے۔ لیکن جب حضرت مجدد نے توضیحی مکتوب میں لکھ دیا کہ ان کے یہ اور اس قسم کے دوسرے بیانات کا سُکر سے تعلق ہے۔ اور دوسرے مشائخِ کبار (مثلاً شیخ شہاب الدین سہروردی مصنف عوارف المعارف) کی مثالیں دیں، تو معاملہ کی نوعیت دوسری ہو جاتی ہے۔ ہمارے خیال میں اس مکتوب کو، جو حضرت مجدد کی قابلیت، قوتِ استدلال اور سلیقۂ تحریر کا شاہکار ہے، حرفِ آخر سمجھ لینا چاہیے تھا، لیکن شیخ محدث نے اسے حرفِ آخر نہیں سمجھا۔ اس کی وجہ سوچ کر اور مزید مطالعے سے یہی سمجھ میں آئی کہ اس مکتوب میں بھی ایک فقرہ ایسا تھا، جو انھیں قبول نہ تھا۔ اور جس سے ان کے خیال میں وساطتِ نبوی ﷺ کی اہمیت میں ضعف آتا تھا۔ یہ فقرہ تھا۔ "چوں بکمالِ متابعت بلکہ بمحض فضل در مقاماتِ عروج ایں حقیقت [یعنی حقیقت آں سالک کہ محمدی المشرب است] را با آں حقیقت [حقیقتِ محمدی] اتحادے حاصل شد، توسط برخاست"۔ یہ صحیح ہے کہ حضرت مجدد نے سالک کے اس اتحاد کو "شرکتِ خادم با مخدوم" کہا تھا۔ لیکن شیخ محدث اس توضیح کو قبول نہ کرتے تھے۔ ("باطل است و حاطل") اور اسے "گریزگاہ" کہتے تھے۔ اس کے علاوہ سُکر اور صحو کے متعلق حضرت مجددؒ نے جو کچھ توضیحی مکتوب کے متعلق لکھا، شیخ محدث اسے بھی تسلیم نہ کرتے تھے۔ حضرت مجدد نے اس موضوع پر تفصیلی اظہارِ خیال کیا تھا۔ چند متعلقہ فقرات حسبِ ذیل ہیں:۔

"ہر کہ صحو دارد، گماں نکنند، کہ سُکر ہمراہِ او نیست کہ آں عین قصور است۔ صحوِ خالص نصیبِ عوام است۔ ہر کہ صحو را ترجیح دادہ است، مرادش غلبۂ صحو است، نہ صحوِ صرف۔"

شیخ نے بھی اس مسئلے پر تفصیل سے لکھا۔ ان کی رائے کا ماحصل تھا "در حقیقت سُکر و صحو منداں اند، کہ جمع نمی شوند"۔ بہرکیف شیخ خود "ارباب صحو" میں سے تھے۔ اور انھوں نے حضرت مجدد کے بیانات پر تبصرہ بطور ایک اہل صحو کے ہی کیا ہے۔

شیخ محدث سلوک کی منزلوں سے واقف تھے۔ برِ کوچک کے اولیا کا بہترین تذکرہ اخبار الاخیار انھی نے لکھا۔ زاد المتقین میں حضرت خواجہ باقی باللہ کی صحبت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "مدتے مشق نسبت خواجگان کردہ، طریقہ، ذکر و مراقبہ و رابطہ و حضور و یادداشت حاصل نمودہ"۔ رسالے میں بھی انھوں نے کئی جگہ اہل معرفت کا انداز اختیار کیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اہل شرع سے تھے۔ اور احتیاط کے باوجود کبھی کبھی متشدد نقطۂ نظر بھی اختیار کر لیتے تھے۔ ان کے رسالے کو حضرت مجدد کے بیانات پر "علمائے ظاہر" کا محاکمہ سمجھنا چاہیے۔ شاہ غلام علیؒ نے ان کے جواب میں جو رسالہ لکھا۔ اس کے عنوان میں انھوں نے (یا مرتب نے) شیخ محدثؒ کا ذکر ملا عبدالحق کہہ کر کیا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بسا اوقات ان کی مولویت ان کے عرفان پر غالب آجاتی۔ ان کے رسالے کی اہمیت اس بات میں ہے۔ کہ یہ ایک بلند احوال شیخ کے بیانات پر ایک ممتاز عالم شرع کا تبصرہ ہے۔ اس سے ایک متوازن رائے قائم کرنے میں مدد ملتی ہے، لیکن حضرت مجدد کا مقام اتنا بلند ہے۔ اور ان کے احسانات اتنے عظیم ہیں کہ شیخ محدث کے اختلاف کی وجہ سے یا ان کے بعض بیانات کو قابل تاویل سمجھ لینے سے بھی ان کے مرتبہ میں فرق نہیں آتا۔ انھیں شیخ کی تائید (یا بدایونی کی ہمنوائی) کی ضرورت نہیں۔ ع

آفتاب آمد دلیل آفتاب !

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے رسالے کے اندراجات کے متعلق لکھا ہے کہ ان پر "سنجیدگی سے غور کی ضرورت ہے"۔ اس تجویز پر عمل تو اس وقت ہو سکتا ہے، جب جب رسالے کا صحیح ایڈیشن موجود ہو اور رسالے کے جواب میں حضرات مجددیہ نے جو کچھ لکھا ہے، وہ بھی اس کے ساتھ شامل ہو۔ اور اس وقت بھی طالب حق

کے لیے ضروری ہے کہ صرف سنجیدگی یا ادب نہیں۔ بلکہ ایک حسنِ ظن کے ساتھ اور ان تمام اصولوں کو مدِ نظر رکھ کر، جو حضرت مجددؒ نے مکتوب ۱۲۱/۲ کے آخر میں درج فرمائے ہیں۔ بزرگانِ دین کی تحریروں کا مطالعہ کیا جائے۔ یہ ایک بڑا ذمہ داری کا کام ہے۔ لیکن اس وقت بھی شیخ محدث کی ایک شکایت پر غور ہو سکتا ہے، جو انھوں نے بعض وابستگانِ سلسلہ کے متعلق حضرت مجدد کے نام کے رسالہ میں کی۔ متعلق "بگفت وگوے مریدانِ ایشاں کہ در نقلِ اقوال و ذکر حکایات بے صرفہ و بے احتیاط"۔

پروفیسر محمد فرمان نے تسلیم کیا ہے کہ حضرت مجددؒ کے بارے میں "متاخرین حضرات نے واقعی غلو سے کام لیا ہے" لیکن جیسا کہ شیخ محدث کی مندرجہ بالا عبارت سے پتا چلتا ہے۔ یہ عمل اس سے بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔ اس عمل کی تکمیل تو روضۃ القیومیہ کے مصنف نے کی، لیکن زبدۃ المقامات بھی مشکوک روایات سے خالی نہیں[1]۔ اور ۱۸۰۱ء میں غوثی منڈوی کو گلزارِ ابرار کے لیے حضرت خواجہ باقی باللہ کا جو تذکرہ خواجہ محمد صدیق بدخشی نے لکھ کر دیا۔ اور اب شاملِ کتاب ہے۔ اس کے بعض اندراجات بھی پوری احتیاط سے نہیں لکھے گئے۔ مثلاً سوانح عمری حضرت مجدد الف ثانی سرہندی میں "علامہ ابو الفضل محمد احسان اللہ عباسی گورکھپوری" نے لکھا ہے "حضرت خواجہ باقی باللہؒ بظاہر آپ کے پیر اور در پردہ مرید تھے"۔ (توبہ توبہ) اس کی ہلکی سی بُنیاد خواجہ محمد صدیق بدخشی کی تحریر میں نظر آتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں۔ کہ حضرت خواجہؒ حضرت مجددؒ کے بے حد معترف تھے، لیکن وہ ان کے پیر تھے۔ اور ان کے نزدیک (جیسا کہ مبدا و معاد کی متعلقہ عبارت سے نظر آتا ہے) پیرِ کامل۔ بعض مجددی تذکرہ نگار اس مسئلے پر جو کچھ لکھتے آئے ہیں، وہ نہ صرف انتہائی بے ادبی

---

[1] ناممکن نہیں کہ ایک آدھ فقرہ الحاقی ہو۔ زبدہ کا ایک "مصحح (؟)" نسخہ طباعت کے لیے ایک ثقہ بزرگ کے کتب خانہ سے ملا۔ مطبوعہ نسخوں سے بیسیوں صفحے مستزاد ہیں۔ کتب صوفیہ کی صحت کا مسئلہ (سوائے مکتوبات امام ربانی جیسی استثنائی صورتوں کے) بڑا پیچیدہ ہے۔

ہے۔ اور مکتوباتِ امام ربانی کے مودبانہ، سعادت مندانہ طرزِ تحریر کے بالکل برعکس بلکہ اس نقطۂ نظر میں بڑے رُوحانی خطرات مضمر ہیں۔ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب نے بالکل صحیح فرمایا ہے۔ "مکی زندگی اور مدنی زندگی کی جو خصوصیات ہیں، ان پر غور (کریں) تو...... یہ بھی معلوم ہو سکے گا کہ باقویہ رنگ میں جمال اور مجددیہ رنگ میں جلال کیوں تھا" حضرت خواجہؒ اور حضرت مجدد میں جمال اور جلال دونوں تھے۔ (اگرچہ کمی بیشی کا فرق تھا) لیکن جو مختلف حالات انھیں درپیش تھے۔ ان کے مطابق ایک بزرگ کی زندگی میں جمال اور دوسرے کی زندگی میں جلال زیادہ نظر آتا ہے۔ جو سادہ دل مجددی تذکرہ نگاروں کے غلو کا شکار ہو کر حضرت خواجہؒ کی خوبیوں کا صحیح اندازہ نہیں کرتے۔ وہ قدرتی طور پر رنگِ جمال کی رُوحانی خوبیوں سے بہرہ ور نہیں ہوتے۔ محمدیت مکی جمال اور مدنی جلال کا مجموعہ ہے۔ بلکہ مکی جمال تو مدنی جلال کے لیے پہلی منزل ہے۔ جو لوگ اس جمال سے محروم رہتے ہیں، وہ منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔ فلاح کا راستا صرف ایک ہے ؎

بہ مصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

شاہ ابوالمعالی قادری لاہوریؒ

شیخ محدث نے حضرت خواجہ باقی باللہ سے سلسلۂ نقشبندیہ میں بیعت کی تھی، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ کی وفات کے بعد ان پر پھر قادری نسبت غالب آگئی۔ اور فی الواقع ان کا تعلقِ خاطر اسی سلسلہ سے تھا۔ ان کے پہلے مرشد اوچ کے مخدوم موسیٰ گیلانی تھے۔ ان کی بدولت شیخ کا پنجاب کے قادری بزرگوں سے رشتۂ عقیدت استوار ہو گیا تھا۔ اور آخر عمر میں لاہور کے شاہ ابوالمعالی قادریؒ کو ان کا رُوحانی راہنما سمجھنا چاہیے۔ وہ مخدوم موسیٰ گیلانی کے ایک مشہور پیر بھائی شیخ داؤدؒ شیر گڑھی کے جانشین تھے۔ ان کا اصل نام شاہ خیرالدین تھا۔ اور وہ بھیرہ ضلع سرگودھا کے رہنے والے تھے۔ شاعر بھی تھے اور کئی ادبی رسالوں (مثلاً زعفران زار۔ مونس جان) کے مؤلف۔ لیکن شیخ محدث ان کی سطوتِ روحانی کے بڑے قائل تھے۔ شیخ محدث کی

تصنیفی زندگی میں بھی انھیں دخل تھا۔ مثلاً فتوح الغیب کی شرح انھی کے اصرار پر لکھی گئی۔ شرح مشکوٰۃ کی تالیف میں بھی ان کی تشویق و ترغیب کو دخل تھا۔ طرزِ تحریر کی نسبت بھی وہ مشورے دیا کرتے تھے۔ چنانچہ شرح مشکوٰۃ کی نسبت انھوں نے لکھا کہ اس میں جا بجا اشعار درج ہونے چاہئیں تاکہ اندازِ بیان دلچسپ اور مؤثر ہو۔ "فرمودند در ترجمہ گاہے بتقریب بعضے از کلماتِ قوم نیز در آوردہ باشید۔ چنانچہ ملا حسین در تفسیر خود می کند۔ و فرمودند نگاں بیتے مناسب مقام ہم می نوشتہ باشند۔"

شاید ادبی مشوروں سے بھی اہم چیز روحانی راہنمائی اور دستگیری تھی۔ شیخ عبدالحق محدث کا ابتدائی ماحول صوفیانہ تھا۔ اور انھیں اس راستے سے گہری دلچسپی تھی۔ مثلاً ان کے عزیز دوست اور مربی نظام الدین بخشی ان کی نسبت لکھتے ہیں۔ "امروز در دہلی است .... و در لباسِ صوفیہ می گزراند" لیکن انھوں نے مشغلہ علما کا اختیار کیا ہوا تھا۔ انھوں نے ان دونوں میں تطبیق و ہم آہنگی کا راستا نکالا، لیکن بسا اوقات اس کوشش میں شدید باطنی کشمکش اور انتہائی روحانی سربلندی سے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ بالخصوص حضرت مجدد کے دعاوی ان کے لیے بڑے خلجان کا باعث ہوئے۔ حضرت خواجہ باقی باللہ کی وفات کے بعد وہ جس بزرگ سے اپنی روحانی مشکلات کے حل کے لیے رجوع کرتے وہ شاہ ابوالمعالیؒ تھے۔ شاہ صاحب کے نام ان کے کئی خط ہیں، جو ان تعلقات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ لیکن ان سے بھی زیادہ دلچسپ ایک خط اپنے فرزند دلبند شیخ نورالحق کے نام ہے۔ "طلب الخیر فی قصۃ السفر لاہور" جس میں بتایا ہے کہ کس طرح شاہ ابوالمعالی ان کی تصانیف کی تعریف کرکے ان کا دل بڑھاتے۔ اور ساتھ ساتھ جلالی شان بھی دکھاتے۔ ("افشاے ایں سر نتوانیم کرد۔ و میگویند کہ اگر اظہار کردی و افشا نمودی۔ ترا رسواے مرد و زن سازیم") بسا اوقات وہ شیخ عبدالحق محدثؒ کی نقل و حرکت پر بھی کڑی پابندیاں لگاتے۔ ان سے ملاقات کے لیے شیخ لاہور آنا چاہتے تو روک دیتے۔ یہاں آتے تو جلد دہلی واپس جانے پر اصرار کرتے۔

ز دہلی در فراقِ شما بزبانِ حال می نالد۔ بر وید، بر وید") قیام دہلی میں بھی ایک زمانے میں ان کا حکم تھا:" از زاویہ انزوا پائے بیروں نہ نہد۔ و از درویش و توانگر و خویش و بیگانہ و مُردہ و زندہ، ہیچ کس را نہ بیند" اصل میں شاہ ابوالمعالی چاہتے تھے کہ شیخ گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر اپنا علمی کام کریں۔ شیخ ان سب ارشادات کی بجز تعمیل کرتے اور جب کسی باطنی الجھن کا سامنا ہوتا تو اس کے حل کے لیے لاہور لکھتے۔ لاہور جاتے تو وہاں سے ہلنے کو جی نہ چاہتا (گرفتاری ما بہ ایں شہر لاہور کہ وطن گزاشتہ اینجامی باشیم۔ سبب آں اینست کہ اینجا کسے ہست کہ گرفتار اویم) شیخ کی شاہ صاحب سے عقیدت کا باعث یہ تھا کہ اس زمانے میں انھی کو اپنا مونس و غمخوار سمجھتے تھے۔ ایک خط کے آخر میں لکھتے ہیں:۔

اظہار ایں اگرچہ بے ادبی است۔ اما چہ کند کہ طاقت طاق است۔ کجا رود و بکہ گوید ؎

فریاد دلِ غمزدہ را گر نکنی گوش

پس پیش کہ از دستِ تو فریاد تواں کرد

شاہ ابوالمعالیؒ نے ۱۰۲۴ھ میں وفات پائی۔

غالباً قادریہ سلسلے کے بزرگوں سے تعلق کا نتیجہ تھا کہ آخر عمر میں شیخ عبدالحق محدث کے دارا شکوہ سے جو اسی سلسلے میں مرید تھا تعلقات استوار ہو گئے۔ دارا شکوہ کی فرمائش پر شیخ نے زبدۃ الآثار کا فارسی ترجمہ کیا۔ سکینۃ الاولیا میں دارا شکوہ نے شیخ اور جہانگیر کے تعلقات کے متعلق ایسی باتیں لکھی ہیں جو کسی اور تذکرے میں نہیں ملتیں۔ وہ کہتا ہے کہ جس زمانے میں جہانگیر کشمیر میں تھا۔ کچھ لوگوں نے شیخ عبدالحق اور مرزا حسام الدین کے متعلق بادشاہ کے "سخنانِ غیر واقع" سے کان بھرے۔ بادشاہ نے دونوں کو کشمیر بلوا بھیجا۔ شیخ نورالحق کو حکم ہوا کہ کابل چلے جائیں۔ شیخ محدث کی عمر اس وقت چھیتر برس سے زیادہ تھی۔ سخت پریشانی کی حالت میں لاہور پہنچے۔ حضرت میاں میر لاہوری نے وجہ پوچھی تو فرمایا کہ اس عمر میں وطن اور اولاد سے جدا ہونا بڑا تکلیف دہ ہے، لیکن شیخ ابھی کشمیر نہ

پہنچے تھے کہ جہانگیر کا انتقال ہو گیا اور وہ شیخ نور الحق کے ساتھ دہلی واپس آ گئے۔

جہانگیر نے تزک میں جس احترام سے شیخ عبد الحق کا ذکر کیا ہے، اس کے پیشِ نظر دارا شکوہ کا بیان مستبعد معلوم ہوتا ہے۔ ایک خیال ہے کہ شاید شیخ سے باز پرس میں جہانگیر کی شیعہ بیگم نور جہاں کی شکائتوں کو دخل ہو۔ لیکن شیعہ سُنّی مسئلے پر شیخ عبد الحق محدث کی رائے معتدلانہ تھی۔ شیعہ مورخ خافی خاں ان کی نسبت لکھتا ہے "صد کتاب از علوم عقلی و نقلی تالیف فرمودہ خصوص شرح مشکوٰۃ و تاریخ مدینہ کہ دراں ذکر حضرت آئمہ طاہرین و ظلم و تعدیٔ مخالفین باظہار کمال حسن عقیدت نمودہ . . . . گویند بعد مراجعت از کعبۃ اللہ اکثر بر زبانِ صداقت بیان ایں سخن جاری بود کہ تا بہ بیت اللہ رفتہ مدّتے مقیم گشتہ صرفِ اوقات برائے تحقیقات احادیث نمودم، ندانستم کہ بیشتر احادیث مشہور وضعی است" شیعہ سُنّی اختلافات پر شیخ کا مسلک شاہ ولی اللہ کا تھا۔ حضرت مجدّد الف ثانی کا نہ تھا۔ اس کی بنا پر حکومتِ وقت سے چپقلش قرینِ قیاس نہیں۔ اگر دارا شکوہ کا بیان صحیح ہے تو ممکن ہے کہ جہانگیر کے خلاف شاہ جہان نے جو بغاوت کی تھی، اس میں دُوسرے راسخ الاعتقاد مسلمانوں کی طرح آپ اور شیخ حسام الدین کی ہمدردیاں شاہ جہان کے ساتھ شریک ہوں۔ بہر کیف شاہ جہان کی تخت نشینی نے یہ اُلجھن ختم کر دی اور عہدِ شاہ جہانی میں آپ کی قدر و منزلت میں اور اضافہ ہو گیا۔

شیخ عبد الحق کی عمرِ عزیز میں اللہ تعالیٰ نے بڑی برکت دی۔ اکبر اور جہانگیر، دو بادشاہوں کا پُورا عہدِ حکومت آپ نے دیکھا۔ اور شاہ جہان کے سولھویں سالِ جُلوس میں انتقال فرمایا۔ آپ کی وفات ۲۸ - ۲۹ رجون ~~۱۶۴۲~~ء کی درمیانی رات کو چورانوے سال، دو مہینے کی عمر میں ہوئی۔ اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مزار کے قریب، حوضِ شمسی کے کنارے ایک پُر فضا زیارت گاہ میں دفن ہوئے۔

معلوم ہوتا ہے، شیخ محدث کی صحت میں اخیر عمر تک فرق نہیں آیا۔ چنانچہ جس وقت آپ کی عمر نوّے برس کے قریب تھی۔ اس زمانے کی نسبت شاہجہان کا درباری

مؤرخ لکھتا ہے۔ "با آنکہ عقود درِ زندگیش بہ تسعین پیوستہ۔ از سلامت قوی بانواع طاعات و ریاضات و تعلیم و تالیف و تصنیف بسانِ ایام شباب می پردازد۔"

شیخ محدّث کی علمی خدمات

مؤرخین اس پر متفق ہیں کہ اگرچہ فنِ حدیث کے فاضل شیخ عبدالحق محدث سے پہلے بھی ہندوستان میں موجود تھے۔ لیکن اس علم کو پہلی دفعہ آپ ہی نے عام کیا۔ "تذکرۂ علمائے ہند" میں لکھا ہے "علم حدیث بہ محروسۂ ہندوستان از و شیوع یافتہ۔" میر غلام علی آزاد بلگرامی مآثر الکرام میں نقل کرتے ہیں:۔

"بہ نشرِ علوم سیما علم شریف حدیث پرداختہ بہ نہجے کہ در دیارِ عجم احدے را از علماءِ متقدمین و متاخرین دست نداده است۔ ممتاز و مستثنیٰ گردید۔ و در فنونِ علمیہ خاصتہً فنِ حدیث کتب معتبرہ تصنیف کرد۔ چنانکہ علماءِ زماں اعتنائیکی ورزیدہ دستور العمل خود دارند۔"

مولانا ابوالکلام آزاد ہندوستان میں علمِ حدیث کے آغاز کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔ "مولانا جمال الدینؒ کے آخری عہد میں شیخ عبدالحق حجاز سے واپس آئے۔ اللہ نے ان کی عمرِ مبارک میں بڑی برکت دی۔ اور ان کے درس و تصنیف نے ایک پورا سلسلۂ تعلیم ملک میں عام کیا۔"

شیخ محدثؒ نے نہ صرف درس و تدریس کے ذریعے علمِ حدیث کی اشاعت کی۔ بلکہ اس موضوع پر کئی کتابیں لکھیں، جن کا علمی پایہ اب تک مسلّم ہے۔ عربی میں ان کی مشہور کتاب لمعات ہے جو مشکوٰۃ کی شرح ہے اور جسے چھ سال کی محنت کے بعد انھوں نے ۱۶۱۶ء میں مکمل کیا۔ اس کے دیباچے میں انھوں نے حدیث کی مختلف قسموں اور علمِ حدیث پر تبصرہ کیا ہے۔ اور طویل اقتباسات دے کر فقہ حنفی کو حدیث کے مطابق ثابت کیا ہے[1]۔ اس کے علاوہ انھوں نے حدیث کے

---

[1] شیخ عبدالحق نے حدیث کی اتنی اشاعت کی لیکن ان کا طریقِ کار اس قدر معتدلانہ تھا کہ بعض اہلِ حدیث حضرات کو ان کی فقہ حنفی کی پاسداری کھٹکتی ہے۔ مثلاً نواب صدیق حسن خاں ان کی نسبت لکھتے

[باقی اگلے صفحے پر]

اسناد اور اسماء الرجال پر بھی ایک کتاب لکھی ہے، لیکن شاید ان کتابوں سے بھی زیادہ مفید کتاب اشعۃ اللمعات تھی جو فارسی میں مشکوٰۃ کی شرح ہے اور لمعات سے زیادہ مفصل ہے۔ اس کتاب کا آغاز انھوں نے لمعات کے ساتھ ۱۰۱۹ھ میں کیا تھا۔ لیکن اس کی تکمیل میں دیر لگی۔ مولنا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں "حضرت شاہ عبدالحق محدّث جس دورِ علم و تعلّم کے بانی ہوئے، اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ علمِ حدیث کے متعلق فارسی زبان میں جو ملک کی عام زبان تھی، تصنیف و تراجم کی بنیاد ڈالی گئی۔ خود شاہ صاحب نے مشکوٰۃ وغیرہ کا ترجمہ کیا۔ پھر ان کے صاحبزادے شیخ الاسلام نور الحق نے صحیح بخاری کا۔"

حدیث کے علاوہ شیخ عبدالحق نے سب سے زیادہ توجہ سیرت اور مدینۃ النبیؐ کی تاریخ پر (جسے سیرت کا تکملہ کہنا چاہیے) مبذول کی۔ مقصد ساری کوششوں کا یہ تھا کہ مہدویہ تحریک۔ بعض "درویشانِ مغرور" کے دعاوی اور مقامِ اقدس محمدیؐ کے عدم ادراک۔ نظریۂ الفی۔ دربارِ اکبری میں توحید بلکہ عقلیت کے مقابلے میں نبوّت سے کم نگہی۔ رسولِ اکرمؐ کے صحیح واقعاتِ زندگی سے عام ناواقفیت۔ ان تمام اسباب کی بنا پر عوام جادۂ محمدی سے دُور جا رہے تھے۔ اس کا سدِّباب ہو جائے۔ چنانچہ شیخ نے اسلامی ہندوستان کی پہلی مبسوط سیرت نبویؐ مدارج النبوت کے عنوان سے کوئی بارہ سو صفحات میں ترتیب دی، جو اب بھی مقبول ہے اور اصل فارسی اور اردو ترجمہ (منہاج النبوت) متعدد بار شائع ہو چکے ہیں جذب القلوب فی دیار المحبوب مدینۃ النبی کی تاریخ ہے۔ اس کا اردو ترجمہ تاریخ مدینہ منورہ کے عنوان سے شائع ہوا ہے اور اصل فارسی بھی کئی مرتبہ

(بقیہ فٹ نوٹ ص ۳۸۴)

ہیں۔ "فقیہہ حنفی و علامۂ دینِ حنیفی است، واما محدث مشہور است۔ و دستگاہش در فقہ بیشتر از مہارت در علوم سنتِ سنیہ است ولہٰذا جانب داری اہل الرائے جانب گرفتہ۔ معہذا جابجا حمایت سنتِ صحیح نیز نمودہ طالب علم را باید کہ در تصانیف وے "خذ ما صفا و دع ما کدر" پیشِ نظر دارد۔"

چھپی ہے۔

شیخ عبدالحق محدث کی دوسری دلچسپی قادریہ سلسلے کے بانی حضرت غوثِ اعظم عبدالقادر جیلانیؒ سے تھی۔ آپ نے ان کی تصانیف کو رائج کرنے کی کوشش کی۔ غنیۃ الطالبین کا ترجمہ کیا۔ فتوح الغیب کی شرح لکھی۔ غوثِ اعظم کی سوانحِ عمری اخبار الاخیار کے شروع میں تبرکاً درج کی۔ اور آخر عمر میں دارا شکوہ کی فرمائش پر (جو آپ کی طرح قادریہ سلسلے سے منسلک تھا) حضرت کی قدیمی اور مستند سوانح عمری بہجت الاسرار کا خلاصہ زبدۃ الآثار کے عنوان سے مرتب کیا۔ اس کا اردو ترجمہ کحل الابصار کے نام سے شائع ہوا ہے۔

آپ کی ایک دلچسپ تصنیف زاد المتقین الی طریق الیقین ہے۔ جس میں ان شیوخ و اساتذہ کے حالات لکھے ہیں، جن سے آپ نے سفرِ حجاز میں فیض حاصل کیا۔ فہرس التوالیف میں اپنی تصانیف کی مفصل فہرست دی ہے۔ شروع میں مصنفینِ دہلی کا تذکرہ ہے جس کا اردو ترجمہ حکیم سید شمس اللہ قادری نے حیدر آباد سے شائع کیا ہے۔ ایک دلچسپ رسالہ نورانیہ سلطانیہ ہے، جس میں جہانگیر کے لیے آئینِ سلطنت اور قواعدِ حکمرانی کو ترتیب دیا ہے۔

شاید آپ کی سب سے زیادہ کامیاب تالیف اخبار الاخیار ہے[1]۔ جس میں آپ نے ہندوستان کے اولیاء اور بزرگوں کے حالات تاریخی ترتیب سے لکھے ہیں شروع میں

---

[1] اس کتاب اور شیخ محدث کے متعلق جہانگیر کی رائے دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔ وہ چودھویں سالِ جلوس (آغاز ۱۰ مارچ ۱۶۱۹ء) کے واقعات میں لکھتا ہے "شیخ عبدالحق دہلوی کہ از اہلِ فضل و اربابِ سعادت است۔ دریں ایام دولت ملازمت دریافت۔ کتابے تصنیف نمودہ بود مشتمل بر احوالِ مشائخِ ہند (اخبار الاخیار) بر نظر در آمد۔ خیلے زحمت کشیدہ مدت ہاست کہ در گوشۂ دہلی بوضع توکل و تجرید بسر می برد۔ مردِ گرامی است" یہ جہانگیر نے شیخ محدث کو ایک گاؤں بطور جاگیر پیش کیا اور بہ اصرار اسے لینے پہ آمادہ کیا۔

تبرکاً حضرت غوث اعظمؒ کے حالات دیے ہیں۔ جن کے سلسلۂ قادریہ میں آپ نے
کئی بزرگوں سے بیعت کی تھی۔ پھر اولیاء کے تین طبقے ترتیب دیے ہیں۔ پہلے میں
خواجہ بزرگ اجمیریؒ اور ان کے معاصرین اور مریدین کے حالات ہیں۔ دوسرے میں
بابا فریدؒ اور ان کے ہم عصر بزرگوں اور مریدوں کے اور تیسرے طبقے میں حضرت
چراغ دہلیؒ سے لے کر اپنے زمانے تک کے مشائخ کے حالات لکھے ہیں۔ آخر میں
اپنے بزرگوں کا تذکرہ اور ۱۵۸۷ء تک کے اپنے بعض حالات درج کیے ہیں۔ ہندوستان
کی مذہبی تاریخ سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے یہ تذکرہ نہایت اہم ہے۔ ایک تو
آپ نے حتی الوسع مستند واقعات لکھے ہیں۔ دوسرے طرز ادا پاکیزہ اور بلیغ و مؤثر ہے۔
غیر ضروری جزئیات سے پرہیز کیا ہے، لیکن کام کی کوئی چیز نہیں چھوڑی۔ غیر معروف
سلسلوں اور دُور افتادہ بزرگوں کے مستند حالات تلاش کرنے میں خاص محنت کی ہے
اور بعد میں آنے والوں کو زیر بارِ احسان کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کتاب کی تکمیل
میں آپ کو برسوں محنت کرنی پڑی۔ پہلے تلاشِ حالات میں اور پھر ترتیبِ مضامین
اور اصلاح عبارت میں۔ شروع میں کوئی پندرہ ہزار سطریں تھیں۔ پھر بارہ ہزار اور
آخری ترتیب میں آپ کے ایجاز و اختصار کی بدولت نو ہزار رہ گئیں۔ یہ کتاب
آپ کی سب سے پہلی تصنیف ہے، لیکن برسوں کی تہذیب و اصلاح کی بدولت اس کا
مرتبہ بہت بلند ہو گیا اور اب اسی کو آپ کا شاہکار سمجھنا چاہیے۔

آپ کی ایک اور قابلِ ذکر تاریخی تصنیف تاریخ حقی یا ذکر ملوک ہے۔ جس میں
سلطان محمد غوری سے اکبر کی تخت نشینی تک کے حالات ہیں۔ یہ کتاب غالباً قیام
فتح پور سیکری میں شروع ہوئی اور حج سے واپسی کے تین چار سال بعد (۱۰۰۵ھ)
میں مکمل ہوئی۔ اگرچہ بعد میں بھی اضافے ہوتے رہے۔ اس کتاب میں اکبر کے خلاف
کوئی خاص چیز نہیں، بلکہ آخری باب میں اس ارادے کا اظہار ہے کہ بادشاہ کی فتوحات
اور قواعد و ضوابط کو کسی اور وقت لکھیں گے۔ لیکن یہ ارادہ پورا نہ ہوا۔ معلوم ہوتا
ہے کہ یہ کتاب کسی فرمائش کی تکمیل میں لکھی گئی، اپنی خوشی سے نہیں۔ اور کئی جگہ

شیخ نے دنیاداروں کی تاریخ لکھنے پر معذرت آمیز شعر لکھے ہیں مثلاً ؎

حقی ز پے قصہ و افسانہ شدی | چوں مردم روزگار فرزانہ شدی
درویشی، ترا از ذکر شاہاں چہ غرض | مفتونِ سخن گشتی و دیوانہ شدی

اور ؎

حقی تو ز تاریخ و حکایات گوئے | در راہِ تتبع روایات میوئے
در زاویۂ فقر نشستی، کارے | جز ذکرِ خدا، نفی و اثبات مجوئے

شیخ عبدالحق کی کل تصانیف کی تعداد سو سے زائد بتائی جاتی ہے۔ لیکن اس شمار میں وہ اڑسٹھ رسائل بھی ہیں، جو المکاتیب والرسائل کے عنوان سے ایک جلد میں جمع ہیں۔ آپ شاعر بھی تھے اور حقی تخلص کرتے تھے۔ آپ کا مجموعۂ کلام جس میں غزلیات، قصائد، قطعات و رباعیات اور مثنویاں غرض تمام اصنافِ سخن شامل تھیں، "حسن الاشعار" کے نام سے مرتب ہوا۔ غالباً یہی مختصر مجموعہ وہ دیوان تھا، جو گزشتہ صدی کے آخر یا اس صدی کے شروع میں نواب علی حسن خاں مؤلف صبحِ گلشن نے دیکھا تھا۔ لیکن صبحِ گلشن میں جو اشعار منتخب ہوئے ہیں۔ وہ بیشتر رسمی، عاشقانہ قسم کے ہیں اور غالباً قیام فتح پور سیکری میں لکھے گئے۔ مثلاً ؎

شوخ جا بیک سوار من نگرید | فتنۂ روزگارِ من نگرید
کوہ کن کوہ کند و من جاں را | کارِ او نیز و کارِ من نگرید
اے خوش آندم کہ بار قیلباں گفت | حقیٔ خاکسارِ من نگرید

چوں من میرم چہ حاصل گر لبت آرامِ جاں باشد
من از حسرت بمیرم، او بکام دیگراں باشد
بہر جو ربکہ آں مہ می کند، از جا مرو حقی
کہ بد خوئے مرا شاید کہ مقصود امتحاں باشد

بر رخش زلفِ پُر شکن بینید　　سُنبل اُفتادہ بر سمن بینید
در گرفت از رخش بگل آتش　　آتش اُفتادہ در چمن بینید
تنِ او در برونِ پیراہن　　ہمچو جاں در دُرونِ تن بینید

نثر کی بعض تصانیف میں بھی شعر درج ہیں۔ مثلاً ؎

حقی از گوشۂ دلی نہ نہم پا بیروں　　خود گرفتیم کہ مُلکِ گجراتم داند

حقا بیانِ شوق بپایاں نمی رسد　　کوتاہ ساز قصۂ دُور و دراز را

خاندانِ حقی شیخِ محدث کی اولادِ معنوی بہت تھی، لیکن اولادِ ظاہری میں بھی وہ خوش نصیب تھے۔ ان کے فرزندِ اکبر مولٰنا نور الحق عہدِ شاہجہانی میں معزز عہدوں (مثلاً قضاۃ اکبر آباد) پہ ممتاز رہے۔ اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ آپ کی سب سے مشہور تالیف شرح صحیح بخاری ہے، جو چھ جلدوں میں مکمل ہوئی، اورنگ زیب سے منسوب کی گئی۔ اس کے علاوہ آپ نے نواب مرتضیٰ خاں کے ایما پر ہندوستان کی تاریخ، زبدۃ التواریخ کے نام سے لکھی۔ یہ کتاب فی الحقیقت شیخ عبدالحق کی کتاب ذکر الملوک کا ترمیم شدہ نسخہ ہے، لیکن اس میں عہدِ اکبری کے حالات اضافہ کیے گئے ہیں۔ والد کی وفات کے بعد آپ سرکاری عہدوں سے علٰحدہ ہو گئے۔ اور خاندانی مدرسے میں درسِ حدیث اور ارشاد و ہدایت کا کام شروع کیا۔ وفات نوے برس کی عمر میں ۱۶۶۳ء میں ہوئی۔
آپ کے تفصیلی حالات نہیں ملتے اور یہ پتا نہیں چلتا کہ آپ سے کس کس نے علمِ حدیث اخذ کیا۔ لیکن آپ کے شاگردوں میں "قطب المحدثین" مولٰنا سید مبارک حسین واسطی بلگرامی (متوفی ۱۷۰۵ء) کا نام لیا جاتا ہے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ آپ کا فیض دُور دُور تک پھیلا ہوا تھا۔

فرحت الناظرین میں آپ کی نسبت لکھا ہے:۔

"فاضل محدث و عالم متبحر بود۔ خلیفہ و جانشین پدرِ خود، عبدالحق دہلوی ہست

رحمۃ اللہ علیہ۔ و شیخ مذکور نسبت و ارادت بہ سلسلۂ قادریہ ساداتِ السید (شاذایہ؟) داشت و او برسی جزو بر صحیح بخاری شرحے وافی داشت و معضلات و مشکلات احادیث را حل ساختہ و در تقویتِ مذہبِ امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ جہدِ بلیغ نمودہ، و احادیث مخالف ایں مذہب را تاویلاتِ خجستہ فرمودہ و بر عضدی و شرح مطالع و شرح ہدایہ حکمت و دیگر کتب متداولہ حواشی دارد و در نظم و نثر وحید زماں بود۔ ایں رباعی از وست

از شیوۂ ہمدماں ایں دورِ خلاف ... گویم رمزے اگر نگیری بگزاف

چوں شیشہ ساعت اند پیوستہ بہم ... دلہا ہمہ پُر غبار رُو ہا ہمہ صاف

بارہا بہ ملازمتِ اقدس عالمگیر پادشاہ رسیدہ بعنایاتِ بادشاہانہ ممتاز گردیدہ بود"

آپ کا تخلص مشرقی تھا۔ اسی کتاب میں ایک اور جگہ لکھا ہے :-

"مشرقی تخلص شیخ نور الحق دہلوی بود۔ در بحرِ تحفۃ العراقین مثنوی دارد و دیوانش قریب پنج ہزار بیت است۔ از وست ؎

با آنکہ مشرقی ہمہ تن دیدہ چوں گل است

با ہیچ کس، چوں چشمِ حباب آشنا نبود"

عُلمائے عصر

شیخ عبدالحق کا زمانہ علم و فضل میں بڑا خوش قسمت تھا۔ اس وقت کھمبایت اور سُورت کی بندر گاہیں رونق پر تھیں اور حکومت دہلی کے تابع، حجاز کا سمندری راستا پہلی مرتبہ شمالی ہندوستان والوں کے لیے کھلا تھا۔ جن لوگوں کی قسمت میں تھا انھوں نے وہاں جاکر علوم دینی حاصل کیے اور واپس آکر ہندوستان کو سیراب کیا۔ شیخ عبدالحق اس قافلے کے میر کارواں تھے۔ لیکن دوسرے علاقوں کے علما کا معیار بھی بلند تھا۔

مُلا عبدالحکیم سیالکوٹی

ہندوستان میں اس وقت اسلامی علوم کے چھ بڑے مرکز تھے۔ ایک دہلی، دوسرے پنجاب، تیسرے پُورب یعنی[1] جونپور، الہ آباد اور لکھنؤ کا علاقہ، چوتھے گجرات۔ پانچویں سندھ اور چھٹے برہانپور۔[2] دہلی میں خود شیخ عبدالحق علمی مجلس کے صدر نشین تھے۔ پنجاب میں ان دنوں حاکم سے ناراضگی کی بنا پر کشمیر سے ایک بزرگ ترکِ مکان کرکے سیالکوٹ آئے تھے۔ جنھوں نے پنجاب کی علمی شہرت کو ایک مرتبہ پھر فروغ دیا۔ یہ بزرگ ملا کمال الدین کشمیری (۱۰۱۸ھ) تھے۔ جن کے تلامذہ میں نواب سعداللہ خاں، وزیر اعظم ہندستان،

---

[1] مولٰنا آزاد بلگرامی نے عظیم آباد کو بھی اسی علاقے میں گنا ہے اور پورب کی بجا طور پر بڑی تعریف کی ہے "پورب کے قصبے شہروں کے برابر ہیں۔ کیونکہ ان میں عمارات عالی اور شریفوں و نجیبوں و مشائخ و عالموں مختلف اقوام و انواع اقسام کے پیشہ وروں کے مکانات اور مسجدیں و مدرسے و پرستش گاہیں موجود ہیں۔ اور مسجدیں وہاں کی جمعہ اور جماعت کی نمازوں سے آباد۔ اگر ان کو شہر کہا جائے تو بجا ہے۔" (مظہر آدم ترجمہ سبحۃ المرجان)

[2] برہانپور کی علمی تاریخ سے عام بے خبری ہے۔ لیکن سندھ ادبی بورڈ نے وہاں کے سندھی اولیاء کے جو حالات شائع کیے ہیں۔ ان سے بھی اس مرکز کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ اور ملّا عبدالحکیم سیالکوٹیؒ کے نام لیے جاتے ہیں۔ ان کا علمی فیض علامہ عبدالحکیم نے جاری رکھا۔ انھیں عہدِ شاہجہانی میں بڑا فروغ ہُوا۔ دو مرتبہ بادشاہ نے انھیں سونے چاندی سے تُلوایا اور ان کے وزن کے مطابق چھ چھ ہزار روپیہ نقد انعام دیا۔ آپ ایک زمانے میں اکبر آباد کے سرکاری مدرسہ میں جسے اکبر نے جاری کیا تھا، مدرّسِ اعلیٰ مقرر ہوئے۔ اور یہاں مشہور شاعر قدسی کے ساتھ ایک ہی وقت میں فرائض درس و تدریس سرانجام دیتے رہے۔ آپ کی تصانیف کئی ہیں۔ ایک رسالہ در تمینہ، ہستیِ باری تعالیٰ کے ثبوت میں ہے، جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ آپ نے اسے دربارِ شاہجہان میں باریابی کے وقت پیش کیا۔ باقی تصانیف شرحیں اور حاشیے ہیں جنھیں آپ نے اپنے تلامذہ اور دوسرے اہلِ علم کی سہولت کے لیے مرتب کیا۔ مثلاً تفسیر بیضاوی۔ حاشیہ شرح عقائد تفتازانی، حاشیۂ شرح تمسیہ۔ تکملہ حاشیۂ عبدالغفور اور حاشیۂ خیالی، جس کی نسبت ذیل کا شعر مشہور ہے ؎

خیالاتِ خیالی بس عظیم است

برائے حلِّ او عبدالحکیم است

حافظ عبدالرحمٰن امرتسری اپنے سفر نامہ میں ملّا عبدالحکیم کی نسبت لکھتے ہیں:-

"عراق، شام اور استنبول کی متعدد درس گاہوں میں مجھے آپ کی تصانیف داخلِ درس دیکھنے کا موقع ملا۔۔۔ ہندوستان سے باہر بلادِ اسلامیہ میں علمی حیثیت سے جو شہرت مولوی عبدالحکیم صاحب کو حاصل ہوئی، اسے کوئی مصنّف حاصل نہیں کر سکا۔"

ملّا عبدالحکیم کی وفات ۱۶۵۶ء میں ہوئی۔ مزار سیالکوٹ کے باہر شہابان روڈ پہ ہے۔

ملّا محمود جونپوری | بلادِ مشرق کے علمانے معقولات میں امتیاز حاصل کیا اور اس کی ابتدا بھی اس زمانے میں ہو گئی تھی۔ شیخ عبدالحق محدّث کے ایک ہم عصر ملّا محمود فاروقی جونپوری تھے، جنھوں نے معقولات میں نام پایا اور علم حکمت میں ایک کتاب شمسِ بازغہ تصنیف کی۔ جو اب بھی مدارس میں پڑھائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ علمِ بلاغت میں ایک کتاب فرائد فی شرح الفوائد بھی ان سے یادگار ہے، جو معانی و

بیان کی مشہور کتاب فوائدِ غیاثیہ کی شرح ہے۔ آپ نے ۱۵۶۲ء میں زیادہ عمر پا کے بغیر وفات پائی۔ ان کی نسبت تذکرۂ علمائے ہند کے مؤلف لکھتے ہیں: "اگر بوجودش سرزمینِ جونپور بمرزبوم شیراز تفاخر مے جست، روا بودے۔"

شیخ محمد بن طاہر پٹنی گجرات میں سب سے زیادہ شہرت شیخ محمد بن طاہر پٹنی (وفات ۱۵۷۸ء) اور علامہ وجیہ الدین گجراتی (۱۵۹۰ء) نے پائی۔ شیخ محمد بن طاہر صرف عالم ہی نہ تھے، بلکہ مبلغ اور قاطع بدعت بھی تھے اور انھوں نے ردِّ بدعت کی کوششوں میں شہادت پائی۔ وہ گجرات کے قدیم دار الخلافہ پٹن کے باشندے تھے۔ کتبِ متداولہ سے فارغ ہونے کے بعد حرمین پہنچے۔ وہاں کے علمائے کبار سے مدتوں فیض حاصل کیا۔ اور علمِ حدیث میں متعدد بزرگوں سے سند لی۔ زیادہ عقیدت انھیں شیخ علی متقی سے تھی، جن کے وہ مرید بھی ہو گئے تھے۔ حجاز سے واپسی کے بعد وہ درس تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہوئے۔ مرشد کی ہدایات کے مطابق وہ طلبہ کی ضرورت کے لیے ساتھ ساتھ سیاہی بنایا کرتے تھے۔ چنانچہ جس وقت وہ درس میں مشغول ہوتے، اُس وقت بھی یہ شغل ساتھ ساتھ جاری رہتا۔ ان کی تصانیف کئی ہیں۔ سب سے مشہور مجمع البحار ہے۔ جسے صحاحِ ستہ کی شرح سمجھنا چاہیے۔ ایک رسالہ تصحیح اسماء الرجال میں ہے۔ دو کتابیں موضوع حدیثوں کے متعلق ہیں۔ تذکرۃ الموضوعات در بیانِ احادیث موضوعہ اور قانون الموضوعات فی ذکر الضعفاء۔

وہ قوم کے بوہرے تھے اور ان کی کوشش تھی کہ اپنی قوم سے تمام بدعتیں دُور کر دیں۔ چنانچہ انھوں نے عہد کیا کہ جب تک میری قوم تمام بدعتوں اور ضلالتوں سے بری نہ ہو جائے گی، میں سر پر عمامہ نہ باندھوں گا۔[1] وہ اپنی کوشش میں مشغول تھے کہ

---

[1] بوہروں کے دو فرقے ہیں شیعہ (جماعت خرد)۔ اہلِ سنّت والجماعت (جماعت کلاں) "شیخ محمد طاہر در پٹن و سید محمد جعفر در حیدر آباد دو عالم بزرگ بودند۔ باشارتِ نبویہ علیہ الصلوۃ والسلام، ہر دو فریق را از ہم جدا کردند۔ ... و جماعتِ عمدہ از صوبہ گجرات برآمدہ در صوبہ مالوہ مستقر شد"۔ (اتحاف النبلا، از نواب صدیق حسن)

اکبر نے گجرات فتح کر لیا۔ اور بادشاہ کے سامنے دوسرے علماء کے ساتھ وہ بھی پیش ہوئے۔ بادشاہ نے برہنہ سر رہنے کی وجہ دریافت کی اور جب انھوں نے حقیقتِ حال بیان کی تو اکبر نے خود ان کے سر پر عمامہ باندھا اور کہا کہ دین کی حفاظت میرا فرض ہے۔ آپ اپنا کام جاری رکھیں اور میں اس میں آپ کی پُوری مدد کروں گا۔ چنانچہ خانِ اعظم گجرات کا گورنر مقرر ہُوا اور چونکہ وہ راسخ العقیدہ سُنّی تھا، اس نے اپنے ایامِ حکومت میں شیخ کی پُوری مدد کی۔ لیکن کچھ عرصہ بعد وہ تبدیل ہو گیا اور اس کی جگہ عبدالرحیم خان خاناں گورنر ہُوا، جس کے عہدِ حکومت میں شیعہ بوہرے پھر دلیر ہو گئے۔ شیخ نے اپنا عمامہ پھر سر سے اُتارا اور آگرے کا رُخ کیا۔ تاکہ خود بادشاہ کے حضُور میں عرضِ حال کریں۔ شیخ وجیہ الدین نے طریقے سے منع کیا، لیکن شیخ اپنے ارادے سے باز نہ آئے۔ (شیخ وجیہ الدین علوی ہر چند بہ طریقِ کنایہ منع کرد و فرمود، عالم مظہرِ اسمائے جمالی و جلالی است، حفظِ آثار و احکام ہر اسم صراطے است مستقیم سودمند نیفتاد) وہ ابھی راستے میں ہی تھے کہ اجین کے قریب چند مخالف پیچھے سے آپہنچے اور انھیں شہید کر دیا۔ ان کے ساتھی ان کی لاش کو پٹن واپس لے گئے اور بزرگوں کے قبرستان میں دفن کیا۔

شیخ وجیہ الدین احمد آبادی شیخ وجیہ الدین پیدا تو مشرقی گجرات کے قدیمی شہر چانپانیر میں ہوئے، لیکن ان کے علم و فضل کا دریا احمد آباد میں بہتا رہا۔ انھوں نے کئی سال درس دیا اور ایک عالم کو سیراب کیا اور متعدد درسی کتب پر حاشیے اور شرحیں لکھیں۔ ان کی وفات ۹۹۸ھ/۱۵۹۰ء میں ہوئی اور اپنے مدرسے کے وسط میں دفن ہیں۔ ان کے مزار کا چھپر کھٹ نواب مرتضیٰ خاں نے تیار کروایا، جس پر سیپ کا نہایت اعلیٰ درجے کا کام ہُوا ہے۔

تذکروں میں آپ کا نام، اکثر شیخ محمد غوث گوالیاری شطاری کے واقعۂ تکفیر کی وجہ سے آجاتا ہے، جن کی بعض تصنیفات کی بنا پر شیخ علی متقیؒ نے ان کے خلاف کفر کا فتویٰ دیا تھا۔ بادشاہ نے یہ فتویٰ آپ کے پاس بھیجا۔ لیکن آپ نے نہ صرف

اس فتویٰ پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا، بلکہ اس قسم کی تکفیر کی سخت مخالفت کی۔ اور اس مسئلے پر ایک مستقل رسالہ تصنیف کیا۔ "جس میں ابتداءً فقہی کتابوں سے مسئلہ تکفیر پر روشنی ڈالی ہے۔ پھر احادیث سے سنداً سب کو مشرح بیان کیا ہے۔ آخر میں صوفیائے کرام کے احوال سے بحث کی ہے کہ حالتِ سکر میں جو کہہ جاتے ہیں۔ وہ قابلِ مواخذہ نہیں ہوتا۔ پھر سید محمد غوث گوالیاری کی کتاب اورادِ غوثیہ پر لوگوں نے جو اعتراضات کیے تھے، ان کا جواب دیا ہے ...... آپ کا ارشاد یہ تھا کہ کسی شخص کی سو باتوں میں سے ایک بات بھی اسلام کی ہو تو اس کو مسلم سمجھو اور کسی کلمہ گو اہلِ قبلہ کو کافر نہ کہو۔"

شاہ وجیہ الدین ایک جید عالم تھے۔ بدایونی لکھتا ہے کہ شاید ہی کوئی درسی کتاب، چھوٹی یا بڑی ہو گی، جس کی انھوں نے شرح یا حاشیہ نہ لکھا ہو لیکن لوگ انھیں ایک ولی مانتے تھے۔ "خلائق را پیوستہ از انفاسِ متبرکہ او فیض مے رسید۔ و حق سبحانہ، اسم الشافی را ظاہر و اور امظہر ساختہ بود۔ تا ہر روز جمعے لاتعداد اجلبی از بیماراں و محنت زدگاں بہ ملازمت او آمدہ التماسِ دعا می نمودند و اثرآں زود می یافتند۔" ان کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ موٹا کپڑا پہنتے اور عام لوگوں کی طرح رہتے جو کچھ آتا، وہ دوسروں پر خرچ کرتے۔ امیروں کے گھر پر بطورِ خود کبھی نہ جاتے۔ ایک دو دفعہ حکامِ وقت کی طلب پر بہ مجبوری و اکراہ جانا پڑا۔ ورنہ گھر اور مسجد کے احاطہ سے باہر قدم نہ نکالتے۔

مولانا سید صبغتہ اللہ بروجی شطاری

شیخ وجیہ الدین خود شطاریہ سلسلے میں شیخ محمد غوث گوالیاری کے مرید ہو گئے اور ان کے ایک شاگرد اور مرید سید صبغتہ اللہ بروجی نے اس سلسلے کو حجاز میں عام کیا۔ سید صبغتہ اللہ بروج (بھڑوچ) کے رہنے والے تھے، جو اب سورت اور بڑودہ کے درمیان ایک ضلع کا صدر مقام ہے۔ آپ کی احمد نگر اور بیجاپور کے بادشاہوں نے بڑی قدر کی۔ لیکن بالآخر آپ نے مدینہ منورہ کے

قریب جبلِ اُحد پر سکونت اختیار کی۔ وہاں ایک خانقاہ تعمیر کی اور تصنیف و تالیف اور ارشاد و ہدایت کا سلسلہ شروع کیا۔ آپ نے شیخ محمد غوث گوالیاری کی کتاب جواہرِ خمسہ کا عربی زبان میں ترجمہ کیا۔ جس پر آپ کے شاگرد شیخ احمد شناوی نے حاشیہ لکھا۔ جن لوگوں نے سلسلہ شطاریہ میں آپ سے بیعت کر کے اسے حجاز میں پھیلایا۔ ان میں شیخ احمد شناوی کے علاوہ مدینہ منورہ کے سید میر اور سید اسعد بلخی بھی تھے۔ آپ نے عربی میں مسائلِ تصوف پر کئی کتابیں تصنیف کیں۔ گلزارِ ابرار اور مراۃ الاسرار میں لکھا ہے کہ آپ کی شہرت سن کر سلطان روم نے آپ کو بلایا لیکن آپ نہیں گئے۔ وفات مدینہ منورہ میں ۱۰۱۶ھ میں ہوئی۔ ایک عرصہ تک مزار زیارت گاہِ خاص و عام بنا رہا۔

مندرجہ بالا حالات سبحۃ المرجان میں میر غلام علی آزاد نے لسان الزمان (از احمد مکی) کے حوالے سے لکھے ہیں۔ یادِ ایام میں مولانا عبدالحی لکھتے ہیں۔ "شیخ احمد بن عبدالقدوس شناوی، ابوبکر بن تعوالنسفی، محمد بن عمر بن محمد الحضرمی اور شیخ عبدالعظیم المکی جیسے نامور ان کے شاگرد ہوئے۔ انھوں نے تفسیر بیضاوی پر حاشیہ لکھا ہے، جو بلادِ روم تک پہنچا۔ اور علماء نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس کے سوا ان کی اور بھی تصنیفات ہیں جو علمائے عرب کی فرمائش سے لکھی ہیں۔ محمد بن فضل اللہ محبی نے خلاصۃ الاثر فی اعیان القرن الحادی عشر میں ان کا مضبوط ترجمہ (تذکرہ) لکھا ہے اور شیخ نجم الدین غزی نے لطف السمر و قطف الثمر میں ان کی بڑی مدح و ثنا کی ہے ..... جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔"

شیخ محمد بن فضل اللہ برہانپوری

شاہ وجیہ الدین کے ایک اور نامور شاگرد جن کا شہرہ دور دور تک پہنچا، اور جو اس عہد کے ایک بڑے علمی مرکز برہانپور کے نمائندہ تھے۔ شیخ محمد برہانپوری تھے۔ ان کے والد شاہ فضل اللہ برہانپوری (وفات ۱۵۹۶ء) اپنے زمانے کے مشہور صوفی اور عالم تھے۔ بلکہ "نائب رسول اللہ" کہلاتے تھے۔ شاہجہان کہا کرتا تھا کہ اگرچہ کئی بزرگوں کی

خدمت میں حاضر ہوا ہوں، لیکن کامل شیخ فقط دو دیکھے ہیں۔ میاں میر لاہوری اور شیخ المشائخ فضل اللہ۔ شاہ صاحب کا وطن جونپور تھا، لیکن برہانپور میں مقیم ہوگئے اور وہاں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ آپ فقط تفسیر اور حدیث کا درس دیتے تھے۔ اور صوفیانہ ارشاد و ہدایت سے باطنی راہنمائی اور تزکیہ نفس کا اہتمام کرتے۔

شیخ محمد بن فضل اللہ احمد آباد میں ۹۴۵ھ کے قریب پیدا ہوئے۔ پھر حجاز چلے گئے۔ شیخ علی متقی کی صحبت پائی۔ پھر احمد آباد واپس آئے۔ شاہ وجیہ الدین سے تکمیل تعلیم کی۔ پھر شیخ ابو احمد جعفر کے پاس، جو آپ کے والد کے مرید تھے۔ اسیر (مالوہ) پہنچے اور بالآخر برہانپور میں توطن اختیار کر کے مدرسہ اور مسند ارشاد و ہدایت کو زینت دی۔ سچے عاشقِ رسول تھے۔ بالآخر آپ نے درس و تدریس چھوڑ کر یادِ خدا اور خلق کی رُوحانی رہنمائی کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا لیکن تصنیف و تالیف کی دُنیا میں بھی آپ کا نام بلند ہے۔ آپ کا اصل شاہکار التحفۃ المرسلہ الی النبی ہے۔ لیکن اور کتابیں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً التحفۃ المرسلہ کی شرح آپ نے الحقیقت الموافق الشریعت کے عنوان سے لکھی ہے۔ اس کی ایک نقل بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ میں ہے۔ آپ نے ۱۰۲۰ھ میں وفات پائی۔ حضرت مجدد الف ثانی کے مخلص و محمد خلیفہ (مکتوبات امام ربانی جلد ثالث کے مؤلف اور زبدۃ المقامات کے مصنف) خواجہ محمد ہاشم کشمی ثم برہانپوری نے تاریخ لکھی ؎

مظہرِ اسمائے سمی مصطفےٰ   آنکہ از نامش زباں چوں گل شگفت

سینہ اش شق آمد آخر از جہاں   بس کہ رازِ عشق دردِ وے می نہفت

ابنِ فضل اللہ بود و ہاتفے   سالِ فوتش ابنِ فضل اللہ گفت

غوثی جس نے گلزارِ ابرار اس زمانے میں تصنیف کی، جب آپ ابھی حیات تھے، لکھتا ہے کہ آپ خاندیش کے بادشاہ محمد شاہ ابن مبارک شاہ فاروقی کے عہدِ حکومت (۹۶۶ھ) میں گجرات سے خاندیش تشریف لائے۔ برہانپور میں مسجد اور خانقاہ تعمیر

کی۔ حدیث، تفسیر اور دوسرے دینی علوم کا درس دیتے تھے۔ اہلِ دل تھے، لیکن سماع اور سرود سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ سچے عاشقِ رسول ؐ تھے۔ ہر سال حجاز کے موسم میں دیوانہ وار وطن سے نکلتے اور سمندر کے کنارے پر پہنچ جاتے۔ اگر قسمت یاوری کرتی تو جہاز پر سوار ہو کر حرمین شریفین میں پہنچتے اور روضۂ نبوی ؐ کی زیارت سے دل کو تسکین دیتے۔ اس طرح آپ نے حجاز کے کئی سفر کیے۔ وطن میں بھی محبتِ رسول میں مست رہتے۔ سال بھر میں اگر کوئی کوڑی پیسہ بچا لیتے تو اس لیے کہ سفرِ حجاز کا سامان ہو جائے۔ یا ربیع الاول میں مجلسِ میلاد پورے اہتمام سے ہو۔ ربیع الاول کے پہلے بارہ روز مجلسِ میلاد قائم ہوتی۔ ہر رات ذاکرین احادیثِ نبوی اور نعتیں آوازِ سوزناک سے پڑھتے۔ اور آپ اپنا سارا اندوختہ مجلس میں تبرکات، حلوے اور عطریات تقسیم کرنے اور ذاکرین کی خدمت میں صرف کر دیتے۔ اگر کچھ زیادہ ہوتا تو حرمین کے فقرا میں تقسیم کرنے کے لیے بھیج دیتے۔

بارگاہِ الٰہی میں آپ کی محبتِ نبوی مقبول ہوئی۔ اور آپ کی التحفۃ المرسلۃ الی النبی ؐ نے بڑی شہرت پائی۔ اس کی کم از کم تین شرحیں لکھی گئیں۔ اور انڈونیشیا میں اس کا بہت چرچا تھا۔ ملایائی زبان کے ایک اہلِ علم نے نورالدین رانیری (راندیری؟) نے اس کا ترجمہ ملایائی میں کیا۔ رانیری ہندی النسل تھا۔ لیکن جزائر شرقی میں بس گیا تھا اور اس نے کثرت سے ملایائی زبان میں کتابیں لکھیں۔ اس کی تاریخِ وفات معلوم نہیں[1]۔ لیکن اس کی کتابوں کا زمانہ تصنیف ۱۰۳۸ھ (۱۶۲۸ء) سے شروع ہوتا ہے۔

انڈونیشیا میں شطّاری سلسلہ

اس وقت سماٹرا میں وحدت الوجود کے متعلق اسی طرح بحثیں ہو رہی تھیں۔

---

[1] غالباً انھی کی "رحیق المحمدیہ فی طریقۃ الصوفیہ" کا ذکر مولانا عبدالحی نے یادِ ایام میں کیا ہے۔ اس میں تاریخِ وفات ۱۰۶۸ھ یعنی ۱۶۵۷ء لکھی ہے۔

جس طرح ہندوستان میں، بلکہ مدینہ منورہ کے راستے یہاں کی بحثیں وہاں منتقل ہو رہی تھیں۔ سماٹرا کے قدیمی اہلِ قلم (مثلاً حمزہ) وحدت الوجود کے مسئلے میں ابن العربی اور عبدالکریم جیلی کے قائل تھے۔ نورالدین راندیری اس نقطۂ نظر کے سخت مخالف تھے، لیکن ایک اور مقامی عالم عبدالرؤف جو سولہ سال حجاز میں مقیم رہے اور شطاری سلسلے میں منسلک ہو گئے تھے، مولانا وجیہ الدین کی طرح بین بین رہے تھے۔ ان کے اُستاد دو ہندوستانی تھے۔ مولانا احمد قشاشی (وفات سنہ ۱۶۶۱ء) اور ان کے جانشین ملا ابراہیم القرانی (وفات سنہ ۱۶۹۷ء) موخرالذکر نے عبدالرؤف کو شطاری سلسلے میں مرید کرنے کی اجازت دی۔ چنانچہ انھوں نے جزائر شرقی میں یہ سلسلہ جاری کیا۔ اور جلد ہی جاوا میں کثرت سے لوگ اس سلسلے میں شامل ہوئے۔

مندرجہ بالا معلومات ہمیں ہالینڈ کے مستشرقین سے دستیاب ہوئیں۔ شاہ ولی اللہ صاحب اپنی کتاب الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ میں لکھتے ہیں کہ انھوں نے جواہر خمسہ کی اجازت اپنے اُستاد شیخ ابوطاہر کردی سے حاصل کی تھی جن کے والد نے یہ اجازت شیخ احمد شناوی کے خلیفہ شیخ احمد قشاشی[1] سے حاصل کی تھی۔ شاہ صاحب نے سفرِ حج کے سلسلے میں قیام لاہور کے دوران میں طریقہ شطاریہ میں حاجی شیخ محمد سعید لاہوری سے بھی دعاے سیفی اور اعمال جواہر خمسہ کی اجازت لی تھی۔ لیکن ان کی تصنیف سے اتنا تو پتا چلتا ہے کہ شیخ احمد قشاشی، جن کے فیض یافتگان انڈونیشیا میں تھے، شیخ صبغت اللہ بروجی کے مرید المرید تھے۔ اور ان سے شیخ ابراہیم کردی نے شطاریہ طریقہ اخذ کیا۔ یہ شیخ ابراہیم شاہ ولی اللہ کے محبوب اُستاد شیخ ابوطاہر الکردی المدنی کے والد اور مُرشد تھے۔ اور شاہ ولی اللہ نے بھی اپنے اُستاد سے یہ طریقہ اخذ کیا۔

عُلماے سندھ

اس زمانے کا ایک اور علمی مرکز زیریں سندھ کا دارالخلافہ ٹھٹھہ تھا۔ مغربی پنجاب اور سندھ کی ثقافتی تاریخ ابھی تک مرتب نہیں ہوئی، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ملتان۔ اچھ۔ منصورہ اور دیبل کے

---

[1] شطاری بزرگوں کی نسبت ان کی عربی تصنیف سمط المجید، دائرۃ المعارف حیدر آباد سے شائع ہو چکی ہے۔

قدیمی اثرات اور ایران سے قرب کی وجہ سے اس علاقے میں علوم اسلامی اور عربی فارسی ادب کا بہت بلند معیار تھا۔ اور ٹھٹھہ، بھکر، سیوستان، دربیلہ (نزد سیوستان) ہیں علم وادب کے بڑے مرکز تھے۔ جب خاندانِ تغلق کے زوال کے بعد مرکزی حکومت کمزور ہو گئی اور سندھ خود مختار ہو گیا۔ اس وقت بھی علم وفضل کی سرپرستی جاری رہی اور اس علاقے میں بڑے اہلِ علم پیدا ہوئے۔ مغلیہ حکومت میں بھی کئی سندھی علماء نے نام پایا۔ متعدد سندھی علماء (مثلاً سید نظام الدین ٹھٹھوی اور مولانا محمد ابوالخیر ٹھٹھوی) نے فتاویٰ عالمگیری کی تدوین میں مدد دی۔ قاضی ابراہیم ٹھٹھوی عہدِ شاہجہانی میں دارالخلافہ کا مفتی اور قاضیِ عساکر تھا۔ ملا محمد دماغی ٹھٹھوی شاہجہان کے ایام شاہزادگی میں اس کا پیش امام تھا۔ ٹھٹھہ کے قدیمی سربرآوردہ بزرگوں میں مخدوم میراں ٹھٹھوی (وفات ۱۵۴۴ء) مخدوم مشو ٹھٹھوی، جو علمِ حدیث کے اُستاد تھے۔ اور شرح از عینی، شرح گیلانی اور دوسرے رسائل کے مصنف (وفات ۱۵۴۳ء) شیخ الاسلام میرک محمد سبزواری ٹھٹھوی (۱۵۵۵ء) اور میرک محمد ٹھٹھوی مؤلف فتاویٰ تورانی (۱۵۶۲ء) تھے۔ علم پرور سندھیوں نے وفات کے بعد ان میں سے اکثر کو کوہ مکلی کے قبرستان میں جگہ دی ایک اور قابلِ ذکر ٹھٹھوی عالم قاضی محمود علامہ عباسی تھے، جو مرزا عیسٰے ترخان اور مرزا جانی (معاصرِ اکبر) کے ہم عصر تھے اور متعدد کتب پر حواشی کے علاوہ ایک تذکرۃ الاولیاء کے مؤلف ہیں۔

قاضی نور اللہ شوستری رحمہ اللہ عہدِ جہانگیری میں مشہور شیعہ عالم قاضی نور اللہ شوستری کی شہادت کا واقعہ پیش آیا۔ جس کے متعلق نجوم السمائی تراجم العلماء میں جو علمائے شیعہ کی مستند تاریخ ہے، ذیل کا اندراج ہے:- (ترجمہ)

"اور ان کی شہادت کا قصہ، جو صاحبِ تذکرہ نے بعض ثقات سے نقل کیا ہے اس طرح ہے کہ سید صاحب مذکور ہمیشہ مخالفین کے درمیان تقیہ کرتے تھے۔ اور اپنے مذہب کو ان سے مخفی رکھتے تھے۔ انھیں اہلِ سنت کے مذاہبِ اربعہ کے

فقہی مسائل پر ید طولیٰ حاصل تھا۔ اس لیے اکبر بادشاہ اور عام لوگ انھیں سُنّی المذہب سمجھتے۔ اور جب اکبر بادشاہ کو ان کے علم و فضل اور لیاقت سے آگہی ہوئی تو انھیں قاضی القضاۃ مقرر کیا۔ جناب سیّد نے فرمایا کہ میں ایک شرط پر اس خدمت کو قبول کرتا ہوں کہ مذاہب اربعہ یعنی شافعی، حنفی، حنبلی اور مالکی طریقوں میں سے جس کے موافق میری رائے اور اجتہاد ہو گا۔ اسی کے مطابق مقدمات میں فتویٰ دوں گا۔ اور چونکہ غور و نظر اور استدلال کی قوت حاصل ہے۔ اس لیے تمام مسائل و احکام میں ایک فقہی مذہب کا پابند نہیں ہوں۔ لیکن اپنے اجتہاد میں (اہل سنت کے) چار فقہی مذاہب سے باہر نہیں جاتا۔ بادشاہ نے یہ بات مان لی۔ چنانچہ قاضی علیہ الرحمۃ نے تمام مسائل قضا و احکام میں امامیہ مذہب کے مطابق فتوے دینا شروع کیا۔ اگر کوئی اعتراض کرتا تو جناب قاضی ثابت فرما دیتے کہ میرا یہ فتوے اہل سنت کے چار فقہی مذاہب میں سے فلاں کے مطابق ہے۔ چنانچہ ان کے بعض فتوے مذہب شافعی، بعض حنفی، بعض مالکی اور بعض حنبلی مذہب کے مطابق ہوتے۔ قاضی تقیہ کی اس حالت میں شیعہ احکام کو جاری کرتے اور خفیہ طور پر تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے۔

جب اکبر بادشاہ نے وفات پائی اور جہانگیر تختِ سلطنت پر بیٹھا تو قاضی بدستور اپنے عہدے پر قائم رہے۔ حتیٰ کہ علمائے مخالفین میں سے بعض کو پتا چل گیا کہ وہ شیعی المذہب ہیں۔ چنانچہ انھوں نے بادشاہ کے پاس شکایت کی کہ قاضی (نوراللہ) کا مذہب شیعہ ہے۔ اپنے فتوؤں میں کسی ایک فقہی مذہب کا پابند نہیں۔ اور ہر مسئلے کا فتویٰ اس فقہی مذہب کے مطابق دیتا ہے، جو اس معاملے میں مذہب امامیہ کے مطابق ہو۔ بادشاہ نے اس شکایت پر توجہ نہ دی اور کہا اس سے ان کا شیعی مذہب ثابت نہیں ہوتا، بلکہ شروع ہی سے انھوں نے شرط کر لی تھی کہ مذاہب اربعہ میں سے، جس کا تقاضا ان کی رائے کرے گی، اس کے مطابق فتویٰ دیا جائے گا۔

اب علماے مخالفین اس گھات میں بیٹھے کہ کسی طرح قاضی کی شیعیت ثابت کر کے ان کے قتل کا حکم حاصل کریں۔ چنانچہ انھوں نے ایک شخص کو قاضی کے پاس اس غرض سے بھیجا کہ اپنے آپ کو شیعہ ظاہر کر کے قاضی کی تصانیف حاصل کرے۔ وہ شخص قاضی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شیعیت کا مدعی ہوا اور قاضی کی شاگردی اختیار کی۔ جب وقت گزرنے پر اسے جناب قاضی کا اعتبار حاصل ہو گیا اور اسے کتاب مجالس المومنین کے متعلق اطلاع ملی تو نہایت کوشش اور التجا سے اس نے وہ کتاب قاضی صاحب سے مستعار لی۔ اور گھر لے جا کر اس کی ایک نقل تیار کر کے اسے علماے مذکور تک پہنچایا۔ علمار نے اس کتاب کو قاضی نور اللہ کی شیعیت کے ثبوت میں بادشاہ کے حضور میں پیش کیا۔ اور کہا کہ اس رافضی نے ایسی ایسی باتیں لکھی ہیں اور سزا کا مستحق ہے۔ بادشاہ نے پوچھا کہ کیا سزا چاہیے۔ تو علمار نے کہا کہ اتنی تعداد میں درۂ خاردار لگانے چاہئیں۔ بادشاہ نے اجازت دے دی۔ چنانچہ ان لوگوں نے بہ عجلت تمام جناب پر یہ ظلم شروع کیا حتٰی کہ وہ شہید ہو گئے۔

ان کی شہادت آگرہ میں ہوئی اور ان کا مزار بھی اسی جگہ ہے اور وہاں اس کی زیارت سے لوگ سعادت اندوز ہوتے ہیں۔" (ترجمہ از نجوم السمار صفحہ ۱۵-۱۶)

نجوم السمار جس سے ہم نے یہ اندراج نقل کیا ہے۔ شیعہ علمار کی سب سے مستند تاریخ ہے اور معاصرانہ حالات کے لیے پورے اعتماد کے لائق ہے۔ لیکن یہ روایت کہ قاضی صاحب کو عہدِ اکبری میں سُنّی سمجھا جاتا تھا صحیح نہیں۔ جاننے والے ان کے عقیدے سے بے خبر نہ تھے[1] لیکن ایک تو اکبر کے سامنے شیعہ سُنّی اختلافات کی کوئی

---

[1] لیکن یہ صحیح ہے کہ آپ مجالس المومنین کو مخالفوں اور نا اہلوں سے چھپانا چاہتے تھے۔ کتاب میں جا بجا تقیہ کو شیعہ مذہب کی ترویج کے لیے مضر ظاہر کیا ہے اور آغازِ کتاب میں صاف لکھا ہے کہ حکومت صفویہ کی بنا اور اس "دولت روز افزوں" کی پشت پناہی نے "تقیہ" سے پیوند اور قدم قلم کے "سند" دور کر دیے ہیں، لیکن کتاب کے اختتام تک حالت بدل چکی تھی۔ خاتمہ میں "اوقات جلال" کا ذکر ہے اور [باقی اگلے صفحے پر]

اہمیت نہ تھی۔ دوسرے قاضی صاحب کی علمیت، منصف مزاجی اور مستعدی اعلیٰ درجے کی تھی کہ مخالفین بھی ان کا احترام کرتے تھے۔ بدایونی جس نے بعض شیعہ علماء کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے اس طرح گندگی اچھالی ہے کہ تہذیب و متانت کو بھی نظر انداز کر دیا، قاضی صاحب کا بڑا مداح تھا۔ وہ یہ جانتے ہوئے کہ قاضی صاحب شیعہ مذہب کے تھے، ان کی نسبت لکھتا ہے:۔

قاضی نوراللہ شوستری اگرچہ شیعی مذہب است۔ امّا بسیار بہ صفت نصفت و عدالت و نیک نفسی و حیا و تقویٰ و عفاف و اوصاف اشراف موصوف است و بہ علم و حلم و جودت فہم و حدّتِ طبع و صفائے قریحہ و ذکا مشہور است۔ صاحبِ تصنیف لائقہ است توقیع بر تفسیر مہمل شیخ فیضی نوشتہ کہ از حیز تعریف و توصیف بیرون است۔ و طبع نظم و اشعارِ دلنشیں می گوید۔ بوسیلہ حکیم ابوالفتح بملازمت شاہی بپیوست۔ در زمانیکہ موکب منصور بہ لاہور رسید و شیخ معین قاضی لاہور را در وقتِ ملازمت از ضعفِ پیری و فتورِ قویٰ سقطہ در دربار واقعہ شدہ۔ رحم بر ضعفِ او آوردہ فرمودند کہ شیخ از کار ماند۔ بنابراں قاضی نوراللہ بآں عہدہ منسوب کردید۔

الحق کہ مفتیان و محتسبانِ بدنفس لاہور کہ بمعلم الملکوت سبق می دہند۔ خوش بہ ضبط در آوردہ و راہِ رشوت را بر ایشاں بستہ۔ و در لوپست بستہ گنجانیدہ۔ چنانچہ فوق آں متصور نیست و می تواں گفت کہ قائل بایں بیت او را منظور داشتہ و گفتہ:۔

تو آں کسی کہ نکردی بہ ہمہ عمر قبول
در قضا ہیچ ز کس غیر شہادت ز گواہ

قاضی نوراللہ صاحب شوستر میں ۱۵۴۹ء میں پیدا ہوئے۔ اپنے بزرگوں سے

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۴۰۷)

بالتصریح لکھا ہے "دیگر آنکہ ایں کتاب را از مخالفاں و سائر ... مستور دارند کہ مبادا از آنجا بر احوال بلادِ شیعہ و طوائف ایشاں اطلاع یافتہ، بآحاد ایں فرقہ محقہ کہ در دیارِ اغیار واقع شوند آزارے رسانند یا تعرضے بہ مزاراتِ اسلاف ایشاں نمایند۔"

اور پھر مشہد میں تعلیم پائی ۱۵۸۵ء میں ہندوستان آئے اور تریسٹھ برس کی عمر میں شہید ہوئے۔ بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ جہانگیر کو سب سے زیادہ طیش اس بات پہ آیا کہ قاضی صاحب نے حضرت خواجہ اجمیریؒ کی نسبت (جن کے اکبر اور جہانگیر بڑے معتقد تھے) درشت الفاظ کہے۔ اور ان سے ایک رسالہ بھی منسوب کیا گیا، جس میں شیخ سلیم چشتی کی نسبت (جن کے نام پہ بادشاہ کا نام سلیم رکھا گیا تھا) قرمساق پدر سگ نا تحقیق لکھا تھا۔ (ملاحظہ ہو تازہ اردو سوانح عمری موسومہ صحیفۂ نور مؤلفہ سید صغیر حسین زیدی۔)

قاضی صاحب کی شہادت ۱۶۱۰ء میں بمقام آگرہ ہوئی۔ اس کے ڈیڑھ دو سو سال بعد، جب شمالی ہندوستان میں شیعیت کو فروغ ہوا تو ۱۷۷۴ء میں ان کی قبر پر ایک روضہ تعمیر ہوا جس کے گرد ایک خوشنما باغ بھی لگایا گیا۔ یہ باغ تو اب ویران ہو گیا ہے، لیکن مزار کی زیارت کے لیے اب بھی معتقد آتے ہیں اور حضرات شیعہ قاضی صاحب کو شہید ثالث کے لقب سے یاد کرتے ہیں[1]۔

قاضی صاحب کی متعدد تصانیف بتائی جاتی ہیں۔ ان میں مجالس المومنین اور احقاق الحق چھپ چکی ہیں۔ مؤخر الذکر کتاب میں حکمت اشاعرہ کا اچھا مضحکہ اڑایا گیا ہے۔ لیکن آپ کا اصل شاہکار مجالس المومنین ہے۔ یہ کتاب شیعہ زعما کا ایک مبسوط تبصرہ ہے۔ اور شیعہ مذہب کی تاریخ میں ایک خاص مرتبہ رکھتی ہے۔ اس میں ان امنگوں اور حوصلوں کا پرجوش اظہار ہے جو شیعہ صفوی حکومت کے قیام سے جو شیعوں میں پیدا ہوئے۔ تصنیفِ کتاب کی بنیاد ہی اس بات پر رکھی گئی کہ صفوی حکومت کی پشت پناہی کی وجہ سے اب تقیہ کی ضرورت نہیں رہی اور علی الاعلان برملا میدان میں آنا چاہیے۔

شد آنکہ اہلِ نظر بر کنارہ مے رفتند — ہزار گونہ سخن در زبان و لب خاموش
بہ صوتِ چنگ بگوئیم بس حکایت ہا — کہ از نہفتن آں دیگ سینہ می زد جوش

---

[1] یعنی علمائے شیعہ میں سے شہید ثالث۔ ان سے پہلے دو بزرگ دمشق اور مشہد میں بالترتیب ۹۸۶ھ اور ۹۶۶ھ میں شہید ہوئے۔

علمی اور ادبی حیثیت سے بھی کتاب کا درجہ بڑا ہے۔ اور اس سے قاضی صاحب کی قابلیت، وسیع مطالعہ، معلومات اور محنت کا بیّن ثبوت ملتا ہے، لیکن افسوس کہ بعض جگہ مخالفین کی نسبت ایسی زبان استعمال کی گئی ہے، جو شاید اُس زمانے کی مناظرانہ کتابوں میں عام تھی، لیکن آج ایک علمی کتاب کے شایانِ شان نظر نہیں آتی۔ مثلاً مخدوم الملک لاہوری کی نسبت لکھتے ہیں۔ "شنیدہ شُد کہ از جمو شی و عقوری ملّا عبداللہ لاہوری مشہور بہ مخدوم الملک کہ مخدوم کرہٗ مردان حمار و سگ بچہ معاویہ دیزید خمار بود ۔۔۔۔۔۔۔
اشخاص کے علاوہ یہی درشت اظہارِ خیال قوموں اور ملکوں کی نسبت روا رکھا گیا ہے۔ مثلاً اُچ کے سید جلال بخاریؒ کا ذکر کرتے ہوئے اہلِ بخارا و کابل کی نسبت لکھا ہے۔

سید جلال ۔۔۔ از جانبِ عراق بہ بخارا اُفتاد۔ و چوں بعضے از ایام بہ صحبت مردانیان آنجا گرفتار گردید۔ و دید۔ کہ در میانِ اشرارِ آں دیار اقامت بغایت دشوار است۔ از روئے اضطرار متوجہ دارالحرب کابل گردید۔ و چوں بہ کابل رسید۔ و دہلئے آں جماعت را مانند اہلِ بخارا در مرتبہ سنگِ خارا دید۔ مجاورتِ ایشاں را نیز نہ پسندید۔ از غایتِ حیرت و ملالت کہ باو رسید۔ زبان بہ مضمونِ ایں بیت برکشید ؎

قتل علمائے آرزو دارم ہلاکو خاں کجاست
زانکہ از سرحدِ کابل تا بخارا کشتنی ست

مجالس المومنین کی ایک اور بحث طلب خصوصیت شیعہ عقائد کا ایسی متعدد برگزیدہ ہستیوں سے انتساب ہے، جنھیں عام طور پر اہلِ سنت والجماعت سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً بادشاہوں میں ہارون رشید۔ مامون رشید۔ (حکما میں) بوعلی سینا، نصیر الدین طوسی۔ جلال الدین دوانی (شعرا میں سے) سعدی، حافظ، رومی، انوری، متنبی۔ (صلحا میں سے) بایزید بسطامی، سلطان ابراہیم ادہم، شیخ شہاب الدین سہروردی ان سب کو شیعہ ظاہر کیا گیا ہے۔ ان میں سے صوفی بزرگوں کو تو عہدِ صفوی کے اکثر اہلِ علم شیعہ اپنے ہم خیال نہیں سمجھتے، لیکن رومی وغیرہ کی نسبت قاضی صاحب نے اپنے دعوے کی جس طرح منقبت کے بعض اشعار پر بنیاد رکھی ہے۔ وہ بھی محلِ نظر ہے۔

اسلامی ہندوستان میں جہاں حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور اہل بیت سے محبت و عقیدت عام اہل سنت کا شعار ہے ۔ (اور جہاں اقبال جیسا راسخ الاعتقاد سُنی منقبت میں بڑے زوردار شعر کہتا ہے) وہاں اس محبت و عقیدت کی بنا پر شیعیت (اور وہ بھی تبرائی شیعیت) کا انتساب مشکل ہی سے ثابت کیا جا سکتا ہے ۔

مجالس المومنین میں تمام دُنیا کے شیعہ زعما کے حالات ملتے ہیں، لیکن ضمنی طور پر کشمیر، بلوچستان، گجرات، دکن کے ان شیعہ اکابر پر بھی روشنی پڑتی ہے، جو اسلامی ہندوستان کی مذہبی تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے خاص دلچسپی کا مرکز ہیں۔ تصوف کے بارے میں قاضی صاحب کا مسلک لکھنؤ کے شیعہ علماء سے بالکل مختلف تھا! اور آپ نے مجالس المومنین میں ایک مستقل باب تصوف کی تعریف و توضیح میں لکھا ہے لیکن علمائے لکھنؤ اس اندراج کی اپنے خیالات کے مطابق تاویل کر لیتے ہیں ۔

افغان مشائخ و علماء

شیخ عبداللہ نیازی سرہندی

عہدِ جہانگیری کے سب سے زیادہ مشہور افغان بزرگ (شیخ آدم بنوری) کا ذکر ہم ان کے مرشد حضرت مجدد الف ثانی کے ساتھ کر چکے، لیکن ان کے علاوہ بھی اس زمانے میں کئی افغان بزرگ ہوئے ہیں ۔ سرہند کے قریب تو ان کی خاص طور پر کثرت تھی مثلاً میاں عبداللہ نیازی، جو ایک زمانے میں مہدوی ہو گئے تھے اور شیر شاہ کے بیٹے اسلام شاہ سور کے زمانے میں مخدوم الملک کے حکم سے بُری طرح پٹوائے گئے، بلکہ نیم جاں ہونے پر ہی چھوڑے گئے ۔ خدائے تعالیٰ نے ان کی عمر میں بڑی برکت دی اور وہ عہدِ جہانگیری تک زندہ رہے ۔ مخزنِ افغانی کا مصنف، جس نے ان سے ملاقات کی تھی، لکھتا ہے کہ وفات کے وقت ان کی عمر ایک سو چالیس سال سے زیادہ تھی ۔ انھوں نے ایک زمانہ دیکھا تھا اور بڑی سیر و سیاحت کی تھی ۔ ابتدائی عمر ہی میں انھوں نے بارہ سال عرب و شام میں تحصیل علوم کی تھی ۔ اس کے بعد

سات سال بغداد میں علومِ باطن حاصل کیے اور ریاضاتِ شاقہ اختیار کیں۔ اسلام شاہ کے زمانے میں ہندوستان آئے۔ یہاں یہ صورت پیش آئی، چنانچہ اب پھر سمندر کے راستے مکہ معظمہ چلے گئے۔ چند سال وہاں بسر کیے۔ عہدِ اکبری میں پھر ہندوستان آئے اور سرہند میں اقامت اختیار کی۔ اس دوران میں (کتب کے مزید مطالعہ اور تحقیق کے بعد) مہدویت سے توبہ کی۔ علماء کا طریقہ اختیار کیا اور متاہل ہو گئے۔ انھوں نے متعدد کتب تصنیف کیں، جن میں نوادرِ افغانی اور مراۃ الصفا کے نام تذکروں میں ملتے ہیں۔

شیخ احمد سون قدس سرہ

ایک اور قابلِ ذکر بزرگ ہستی سید احمد سون کی تھی، جس کے حالاتِ زندگی میں حضرت مجدد الف ثانی سے اس طرح تطابق ہے کہ بادی النظر میں شبہ ہوتا ہے کہ شاید معتقدوں نے بعض حالات کو واقعاتِ مجددیہ سے مستعار لیا ہے۔ لیکن گلزارِ ابرار اور مخزنِ افغانی کے مصنف دونوں، سید احمد سون کی ملاقات سے شرفیاب ہوئے اور دونوں نے ان کے حالات ذاتی معلومات کی بنا پر لکھے ہیں، جن میں شبہ کی گنجائش نہیں۔

شیخ احمد سون کے والد شیخ محمد بن الیاس سون عرف عشقی تھے، جو بجواڑہ (علاقہ پنجاب) کے رہنے والے تھے۔ والد کی وفات پر ۱۵۹۳ء میں شیخ احمد سجادہ نشین ہوئے۔ انھوں نے تعلیم اپنے والد اور شیخ الہ داد لاہوری سے حاصل کی تھی۔ جب جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد اس کے بیٹے خسرو نے بغاوت کی تو اگرچہ یہ بغاوت جلد فرو کر دی گئی، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پنجاب میں خاصی ہلچل پیدا ہو گئی۔ ایک تو تاجِ مغلیہ کا "اقبالِ اکبری" سے محروم ہو جانا ہی معمولی بات نہ تھا، دوسرے جانشینی کے جھگڑے۔ باپ بیٹے کی کشمکش۔ چنانچہ محفلِ شاہی میں بھی سیاسی انقلابات پر تبصرے ہوا کرتے تھے۔ گلزارِ ابرار کے مطابق "اس فتنہ انگیز سال میں ہر ایک تقریب سے شہنشاہ کی محفل میں باوجود کمال ارزانی کے اس قسم کی گفتگو کا رُخ بڑھ گیا تھا۔" ایک روز ایک ندیم نے سادات صفویہ کا ذکر کیا، جنھوں نے

ابتدا تو مشائخ اور مذہبی سرگرمیوں کے طور پر کی تھی لیکن بالآخر تختِ ایران پر قابض ہو گئے۔ اس اثنا میں ایک اور شخص بول اٹھا کہ اس زمانے میں بھی چند درویش صورت اشخاص ایسے ہیں، جن کے حلقہ بگوش معتقدین ایک ولایت کی فوج سے زیادہ ہیں۔ ان میں سے بزرگ ترین سید احمد افغان ہیں، جو بجواڑہ کے اطراف میں رہنے والے افغانوں کی شورش کا باعث ہو سکتے ہیں اور تمام جماعت میں سے کوئی ان کے فرمان سے سرتابی نہیں کرتا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ انھیں دربار میں حاضر کیا جائے۔ چنانچہ وہ دارالسلطنت آگرہ میں بلائے گئے۔ دربار میں حاضر ہونے پر انھوں نے سجدۂ دربار کرنے سے انکار کر دیا۔ گلزارِ ابرار کے ترجمہ اذکارِ ابرار میں تو اتنا ہی لکھا ہے کہ "آپ شاہی حضور میں پہنچے تو ملازمتِ شاہی کے آداب بجا نہیں لائے"۔ لیکن مخزنِ افغانی میں صراحت ہے:۔

"در روز ملاقات سجدۂ تکریم و تحریم کہ در سلسلۂ چغتیہ متعارف است۔ بجا نیاورد"

بادشاہ نے حکم دیا کہ اس "دیوانہ" کو چند روز قلعۂ گوالیار کے ادبستان میں محفوظ رکھو۔ حتےٰ کہ حسنِ سلوک کے گلوبند میں اپنی گردن دینا گوارا کرے"۔ (اذکارِ ابرار)

شیخ احمد سوں تین سال تک گوالیار کے قلعہ میں قید رہے۔ نہایت کشادہ پیشانی سے یہ وقت عبادتِ الٰہی میں گزارا اور بڑے مراتب عالی حاصل کیے۔ اتفاق سے سنہ ۱۰۱۹ھ / ۱۶۱۰ء میں خانِ جہاں لودھی (پیر خاں ابنِ دولت خاں لودھی) کو صوبہ خاندیش و دکن کی حکومت سپرد ہوئی۔ جب دکن کو جاتے ہوئے وہ گوالیار پہنچا (اور شیخ احمد کے حالات سے آگاہ ہوا) تو اس نے حضورِ شاہی میں عرضی بھیجی کہ شیخ کو اس مہم میں میرے ہمراہ کر دیا جائے۔ جہانگیر نے خانِ جہاں کے پاسِ خاطر سے یہ التماس قبول کر لی چنانچہ شیخ احمد سوں خانِ جہاں کے ساتھ دو سال دکن میں رہے۔ مخزنِ افغانی میں لکھا ہے کہ لڑائی کے وقت ان کی بڑی کوشش ہوتی کہ سب سے پیش پیش رہیں۔ جو بیڑیاں قید کے وقت ان کے پاؤں میں تھیں، انھیں تمام عزت و احترام کے ساتھ اپنے پاس رکھتے۔ رات کو انھیں اپنے سرہانے رکھ کر سوتے اور فرماتے کہ یہ بیڑیاں میرے لیے

مرشدِ راہِ حقیقت ہیں اور میں نے ان سے بڑے فائدے حاصل کیے ہیں۔

جب خانِ جہاں خاندیش سے آگرہ واپس جانے لگا۔ تو آپ بھی ساتھ تھے اور تین نومبر ۱۶۱۱ء کو جب آپ اثنائے سفر میں مانڈو پہنچے تو گلزارِ ابرار کے مصنف غوثی منڈوی نے آپ سے ملاقات کی۔ ان دونوں بزرگوں کے درمیان صوفیانہ رموز پر باتیں ہوئیں۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ کی طرح شیخ احمد سونؒ بھی تصوف میں شیخ علاء الدولہ سمنانیؒ کے ہم خیال تھے، جنھوں نے شیخ ابن العربی پر اعتراضات کیے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ خان جہاں لودھی کو بھی صوفیانہ مسائل سے دلچسپی تھی۔ ایک روز وہ شیخ احمد کی خدمت میں شیخ علاء الدولہ سمنانی کی کتاب چہل مجلس لے کر پہنچا۔ جس میں شیخ ابن العربی کا ایک متشابہ قول درج تھا۔ خان جہاں نے اس کی تشریح چاہی۔ شیخ نے اس مقصد کے لیے مسیح القلوب کے نام سے ایک رسالہ لکھا، جس میں ابن العربی کے بیان کی اس طرح تاویل و تعبیر کی کہ وہ شریعت اور عقل سمجھ کے قریب آ جائے۔ اس مسئلے پر غوثی کے مرشد شیخ عیسیٰ سندھی برہانپوری سے آپ کی بحث بھی ہوئی تھی۔ چنانچہ غوثی نے اس کا خلاصہ آپ کی زبان سے سن کر گلزارِ ابرار میں درج کیا ہے۔

بالآخر آپ نواب سے رخصت لے کر اپنے وطنِ مالوف تشریف لے گئے۔

مخزنِ افغانی میں یہ بھی لکھا ہے کہ آپ کو سیّد احمد سون کہنے کی وجہ یہ ہے۔ کہ ایک روز آپ کے والد کو خواب میں حضور رسالت مآبؐ نے فرمایا کہ تمھارا بیٹا شیخ احمد میرے فرزندوں میں داخل ہے۔ اسے سیّد احمد کہنا۔ شیخ احمد ہرگز نہ کہنا۔ چنانچہ اس کے بعد ان کا لقب سیّد احمد ہوا۔

مخزنِ افغانی میں یہ بھی لکھا ہے کہ آپ شروع شروع میں جذبہ کی حالت میں رہتے۔ اکثر ایسا ہوا کہ مست و خراماں جنگل میں چلے جاتے اور کئی کئی روز جنگل میں گھومتے رہتے اور جنگلی جانوروں کی آواز سے رقص و جذبہ کی حالت میں آجاتے۔ آپ کی درگاہ کے افغان خادم آپ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر گھر مکان پر لے آتے، لیکن

آپ کے مکان کے متعلق مخزن کا بیان ملاحظہ ہو۔ "محلاتِ ایشاں بہ شکلِ محل بادشاہی بود کہ تمام در و دیوار و سقف را مخمل و زربفت پوشیدہ بود۔ و تخت ہائے دراز از چوبِ صندل بود و چوکیہا از صندل۔ واز چوبِ اگر دراں مکان نصب کردہ بودند واز بیچہائے گلیمہائے نفیس دراں بساط ہمیشہ موجود و طیار می بودند و خوشبوئے عیر مکرر کہ لائق حال بادشاہاں باشد دراں جا خرج می شد۔" غالباً آپ کے خلاف دربار شاہی میں جو شکائتیں ہوئیں، ان کا ایک باعث آپ کے ڈیرے کا یہ شاہانہ ٹھاٹھ تھا۔ جسے آپ کے معتقدوں نے قائم کر رکھا تھا۔

آپ کی نسبت اویسی تھی۔ کسی خاص خانوادے سے منسلک نہ تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اولیا کے عام تذکروں میں آپ کے حالات بہت تھوڑے ہیں۔ طبقات شاہجہانی میں آپ کی تاریخ وفات ۱۰۲۷ھ یعنی ۱۶۱۷ء لکھی ہے۔ مخزنِ افغانی سے پتا چلتا ہے کہ آپ کی وفات اسی برس سے زیادہ کی عمر میں ہوئی۔ اور بجواڑہ کے قریب اپنے گاؤں میں دفن ہوئے۔ ع

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

معلوم ہوتا ہے کہ شاہانہ تزک و احتشام برقرار رکھنے کا طریقہ اس زمانے کے مشائخ میں عام تھا۔ مثلاً مخزنِ افغانی میں ایک اور افغان بزرگ شیخ متی کانسی کا ذکر ہے جو اب قصبہ کٹھالہ (نزد گجرات؟) صوبہ پنجاب میں آرام فرما ہیں۔ وہ خود تو بیشتر روزہ سے رہتے اور راتوں کو جاگ کر عبادت کرتے، لیکن باورچی خانہ ہمیشہ گرم اور لنگر ہمیشہ جاری رہتا۔ جہاں ایک سے دس ہزار مہمان، امیر اور غریب خواتین اور امراء، جوگی اور ملنگ کھانا کھاتے تھے۔ "و مہمان خانہ ایشاں بہ نوعے مکلف بود۔ کہ محفلِ ایں دنیا ہرگز باایں لطافت و ظرافت آراستہ و پیراستہ نمی باشد سقف و جدار و ستون ہا ہمہ موافق یک دیگر، بطرز و روش بہ مخمل و مشجر و زر گرفتہ بودند و فرشِ آں گلیمہا و قالین ہا ولایتی قیمتی۔ و دریچہائے اعلیٰ گراں بہا و سایہ بان ہائے بادشاہانہ کشیدہ۔ تکیہ ہائے بسیار بالطافت و نظافت و پلنگہائے نقرہ و جامہ خوابہا

ظرایف برآں گسترده و تخت پوش ہا و صندلی ہاے اعلےٰ خاتم بہنود محاذی آں نہادہ کہ چشمِ فلک ندیدہ و گوشِ سمٰوات نشنیدہ ہمیشہ شب و مہیّا بود"۔

قصور کے افغان مشائخ

افغان مشائخ کے جس مرکز کے متعلق سب سے زیادہ معلومات ملتی ہیں، وہ ضلع لاہور کا شہر قصور ہے۔

اس کے متعلق فارسی میں ایک مستقل کتاب شیخ عبدالقادر خویشگی نے "اخبار الاولیا من لسان الاصفیا" کے نام سے لکھی۔ جس میں عام افغان مشائخ اور ان کے حسب نسب کے متعلق بھی طویل اندراجات ہیں، لیکن کتاب کا جزوِ غالب خویشگی افغانوں اور مشائخِ قصور کے متعلق ہے۔ اس کتاب کی ایک نقل بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانے میں ہے اور پنجاب کے بعض علمی ذخیروں میں بھی اس کی نقلیں ملتی ہیں۔

ان مشائخ کے مورثِ اعلیٰ پیر کبار شیخ وتو تھے، جو چشت میں جاکر قدیم بزرگ خواجہ مودود چشتی کے مرید ہوئے۔ ان کی وفات ۱۱۵۵ء میں ہوئی۔ قصور میں اس سلسلے کے پہلے بزرگ شیخ حاجی اویس دِ توزی تھے، جنھوں نے ۱۵۹۷ء میں وفات پائی۔ انھوں نے اپنے مورثِ اعلیٰ پیر کبار سے اویسی طریقہ سے فیض حاصل کیا اور حج کی سعادت حاصل کی۔ اکبر کے ہم عصر تھے۔ انھی کے زمانے میں اخوند سعید شوریانی اور شیخ رحمت شوریانی تھے، جو ان کی طرح پیر کبار کی روحانیت سے فیض یاب ہوئے۔ انھوں نے بالترتیب ۱۶۰۹ء اور ۱۶۱۶ء میں وفات پائی۔ اور قصور میں دفن ہوئے۔ دونوں صاحبِ باطن بزرگ تھے۔

اس سلسلے کے سب سے نامور بزرگ مولنا شیخ احمد شوریانی قصوری تھے۔ وہ بھی حضرت پیر کبار کی اولاد میں سے تھے۔ علومِ ظاہری و باطنی کی تکمیل لاہور میں شیخ اسحاق ابن حضرت شاہ کاکو چشتی لاہوری سے کی، جو عہدِ اکبری میں ملک کے برگزیدہ ترین علمار میں سے تھے (ملاحظہ ہو بدایونی کی منتخب التواریخ)۔ شیخ احمد اپنے قبیلہ میں پہلے بزرگ تھے، جنھوں نے کمالاتِ باطنی کے ساتھ علمِ ظاہری کو جمع کیا۔

زُہد و ریاضت میں بھی وہ بے نظیر تھے۔ اور علم و فضل میں بھی ان کا دُور دُور شہرہ تھا۔ وہ حضرت مجدد الف ثانی، شیخ عبدالحق محدث اور شیخ عیسٰی سندھی برہانپوری کے ہمعصر تھے۔ اور تینوں حضرات ان کا بڑا احترام کرتے تھے بلکہ مشہور صوفی بزرگ اور فاضل شیخ عبداللطیف برہانپوری تو کہا کرتے تھے کہ اپنی عمر میں علماے ظاہر و باطن میں دو ہی کامل بزرگ دیکھے ہیں۔ ایک شیخ عبدالوہاب مرصیعی (؟) دوسرے شیخ احمد شوربانی۔ قصور کے نواح سے اگر کوئی شخص اخذِ فیض کے لیے شیخ عبداللطیف کے پاس برہانپور پہنچتا تو وہ اسے واپس بھیج دیتے۔ کہ قصور میں فیض کا ایسا چشمہ جاری ہے۔ تم وہاں سے اخذِ فیض کیوں نہیں کرتے۔ شیخ احمد بڑے فاضل تھے اور ان کا بیشتر وقت تعلیم و تعلم میں گزرتا۔ لیکن وہ تصنیفِ کتب کے حق میں نہ تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ جب پہلوں کی لکھی ہوئی اتنی کتابیں موجود ہوں تو میں تصنیف و تالیف میں کیوں وقت ضائع کروں۔ ان کی فقط ایک کتاب (سوالاتِ احمدی) کا نام ملتا ہے، جو ایک خاص مقصد یعنی "ردِ ملاحدہ و زنادقہ" کے لیے تصنیف کی گئی۔ اور اس مقصد میں بڑی کامیاب "اکسیر اعظم" بتائی جاتی ہے۔ شیخ احمد کی وفات ۱۶۲۱ء میں ہوئی۔

اسی خاندان کے ایک اور بزرگ شیخ حاجی گگن شوربانی قصوری تھے۔ ان کی زندگی میں عجیب انقلابات آئے۔ وہ حضرت پیر کبار کی اولاد سے تھے۔ زہد و تقوٰی کمال کو پہنچا ہوا تھا۔ سات حج کیے۔ زہد و اتقا کا یہ عالم تھا کہ ہر وقت چہرے پر نقاب رکھتے۔ تاکہ نظر کسی محرم پر نہ پڑ جائے۔ لیکن طبیعت کو اطمینان نہ تھا۔ کئی اولیاءِ کبار کی خدمت میں پہنچے۔ لیکن انشراحِ قلب میسر نہ ہوا۔ جب ساتویں مرتبہ حج کو گئے اور رو رو کر منزلِ مقصود تک پہنچنے کی دُعا کی تو اشارہ ہوا کہ تمھاری مشکلات کا حل شیخ عیسٰی مشوانی سے ہوگا۔ چنانچہ واپسی پر شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کا طریقہ ملامتیہ تھا۔ اکثر شراب کے نشے میں چُور رہتے تھے۔ حاجی گگن نے یہ حال دیکھا تو واپس لوٹنے کا ارادہ کیا۔ لیکن شیخ نے بُلایا کہ اتنے بزرگوں کے پاس پہنچے ہو

اور تمھارا کام نہیں بنا۔ تمھاری مشکل میں حل کر سکتا ہوں۔ حاجی نے سرِ تسلیم خم کیا۔ اور اب یہ حال ہُوا ؎

بہ مے سجّادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسمِ منزلہا

پیر کی صحبت میں انھوں نے بھی ملامتی طریقہ اختیار کیا۔ زہد و تقویٰ اور پابندیِ شرع کو سلام کہا۔ چار ابرو کا صفایا کیا اور لباس میں فقط سترِ عورت پر اکتفا کی۔ ہر وقت آگ روشن رکھتے۔ اگر کوئی چیز لاتا تو اسے بھی آگ میں ڈال دیتے۔ ان کی وفات ۱۶۲۴ء میں ہوئی۔

قصور کے ایک اور بزرگ شیخ بایزید بتک زئی تھے، جنھوں نے حضرت پیر کیار کے خلیفہ شیخ بتک کی روحانیت سے فیض حاصل کیا۔ وہ اپنے بھائیوں سے کسی بات پر خفا ہو کر خورجہ چلے گئے۔ اور وہاں مرجع خلائق ہوئے۔ ان کی وفات ۱۶۲۶ء میں ہوئی۔ ان کے علاوہ شیخ الہ داد و توزئی اور شیخ بھوگی افغان بھی قصور کے افغان مشائخ میں سے تھے۔ ان کی وفات بالترتیب ۱۶۳۹ء اور ۱۶۵۹ء میں ہوئی۔

خویشگی شوربانی مشائخ سلسلۂ چشتیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ معرفت و طریقت اور اشاعت علم و فضل کے علاوہ انھوں نے ادبی خدمات بھی کیں اور ان میں جاہ و جلال والے حضرات بھی ہوئے۔ جن میں مبارز الدولہ پیر ابراہیم خاں خویشگی قصوری خاص طور پر ممتاز ہیں۔

اخوند بابا درویزہ پشاوری قدس سرّہ'

حضرت پیر بابا

افغانوں کی مذہبی تاریخ میں سب سے اہم اور دلچسپ باب ان ہستیوں کا تذکرہ ہے۔ جنھوں نے افغان علاقے میں ارشاد و ہدایت اور صحیح اسلامی تعلیم کو وسعت دی۔ ان میں حضرت سیّد علی غواص المعروف

حضرت پیر باباؒ کو بلحاظ قدامت اور بزرگی خاص مرتبہ حاصل ہے۔ وہ سادات ترمذ میں سے تھے۔ جائے پیدائش قندس۔ ان کے دادا اہلِ باطن میں سے تھے لیکن والد نے ہمایوں کے لشکر میں منصب لے لیا تھا۔ وہ والد کے ساتھ ہندوستان آئے۔ لیکن ان پر فقیری رنگ غالب رہا۔ اور اس سلسلے میں انھوں نے پانی پت، اجمیر وغیرہ کا سفر کیا۔ خرقہ خلافت انھیں طریقہ چشتیہ میں اجمیر کے شیخ سید سالار سے ملا۔ اور مرشد نے ہدایت کی کہ کوہستان کو اپنے کام کا مرکز بنا دیں۔ ان کے دو گگیانی معتقدوں نے انھیں آمادہ کیا کہ وہ افغان علاقہ میں مقیم ہوں۔

اس وقت اس علاقے کی جو مذہبی حالت تھی، اس کا بیان اخوند درویزہ نے حضرت پیر بابا کی زبانی بڑے دردناک طریقے سے بیان کیا ہے۔

"یعنی اس علاقے کے لوگوں کو میں نے انتہائی سادہ دل، ہر وقت دین کی طلب و تلاش کرنے والے اور خدا طلب پایا۔ جوان بوڑھوں سے زیادہ دین میں استوار، عورتیں مردوں سے زیادہ دین پر مضبوط، بچے بچپن ہی میں دین طلب کرنے والے اور تلاش کرنے والے اور ان کے ملازم بھی شریعت پر عامل پاتا ہوں۔ ان میں قبولیتِ حق کی صلاحیت تو موجود تھی مگر اس علاقے کے لوگوں میں نہ درس تھا نہ مدرسہ۔ نہ علم تھا اور نہ ہی علماء، اتقیا، اس لیے شریعت سے بے بہرہ مشائخ اور ایسے پیروں نے جو کہ مشائخ بھی نہیں رکھتے تھے ان لوگوں کی سادگی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ان کو غلط راستے پر ڈال دیا۔" (ترجمہ)

آپ نے اس علاقے میں قیام اور اس صورت حال کی اصلاح کا تہیا کیا۔ اللہ کے فضل و کرم سے آپ کو بڑا اقبول حاصل ہوا۔ جہاں کہیں کسی بے علم اور بے شرع پیر کے متعلق اطلاع پاتے۔ جا کر اس سے بحث مباحثہ کرتے۔ چنانچہ تذکرۃ الابرار والاشرار میں ایسے کئی مدعیانِ مذہب کے نام ہیں۔ آپ کے سب سے اہم حریف فرقہ روشنیہ کے راہنما، پیر روشن سے ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی مساعی کو بڑی کامیابی دی۔

چنانچہ حضرت پیر باباؒ نے بڑے ذوق و شوق سے افغان علاقے میں صحیح اسلام کی اشاعت شروع کی۔ ایک خلقِ کثیر آپ سے فیض یاب ہوئی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اخوند درویزہ اور ان کے صاحبزادے شیخ عبدالکریم ان کے مرید ہوئے۔ انھوں نے اپنی کتاب مخزن الاسلام میں سید علی غواصؒ کی بڑی تعریف کی ہے اور ملحدین کے خلاف ان کی کوششوں کو بڑا سراہا ہے۔ پیر بابا کی وفات ۹۹۱ھ (۱۵۸۳ء) میں ہوئی۔ مزار مبارک بونیر اور سوات کی سرحد پہ ایک نہایت پُر فضا مقام میں ہے۔ اور یوسف زئی علاقے کی مشہور زیارت گاہ ہے۔

اخوند بابا درویزہ پشاوری قدس سرہٗ

حضرت پیر بابا کے سب سے نامور مرید مولانا اخوند درویزہ پشاوری قدس سرہ تھے۔ ریورٹی نے نے جو پشتو ادبیات کا بڑا ماہر تھا، اس رائے کی تائید کی ہے کہ افغانوں میں سب سے مشہور عالم اور سب سے محترم بزرگ وہی ہیں۔ افغان علاقے میں وہ اخوند بابا (اخون بابا) کے عرف سے مشہور ہیں۔ وہ علومِ ظاہر اور کمالاتِ باطنی کے جامع تھے۔ خزینۃ الاصفیا میں لکھا ہے "جمالِ ولایتِ خود را در پردۂ تدریس و تعلیم و ملّائی پوشیدہ می داشت"۔ ان کے مزار پر تو عقیدت مندوں کا ہجوم ان کے کمالاتِ باطنی اور تصرفاتِ معنوی کی وجہ سے ہوتا ہے، لیکن تاریخ میں ان کا بلند مرتبہ ان کے علمی کارناموں کی بدولت ہے۔ ان کا سب سے بڑا کام فرقہ روشنیہ کے خیالات کی کامیاب مخالفت ہے، جو اگر نہ کی جاتی تو افغانوں، بالخصوص ان کے مشرقی قبائل میں ایک خود ساختہ قسم کا مذہبی نظام ہمیشہ کے لیے مسلط ہو جاتا اور یہ غیور قوم، جو اب مذہبی حمیت میں سب سے آگے اور اسلام کی پشت پناہ ہے۔ عامۃ المسلمین کی جماعت سے کٹ جاتی۔ اخوند درویزہ، ان کے خاندان کے دوسرے بزرگوں اور ان کے مریدوں نے نہ صرف علوم اسلامی کو عام کرنے کے لیے پشتو میں قابلِ اعتماد کتابیں لکھیں بلکہ روشنیہ طریقے کی مباحثہ و مناظرہ سے بھی پوری طرح مخالفت کی۔ اخوند درویزہؒ نے بایزید کا نام، جسے اس کے معتقد پیر روشن کہتے تھے، پیر تاریک رکھا۔ اور اس کے معتقدوں سے جا جا کے مناظرے

رکھیے۔ خزینۃ الاصفیا میں اخوندؒ کی نسبت لکھا ہے :۔

" در دفع زنادقہ و ملاحدہ در نفس بسیار می کوشید و ہر جا کہ ملحدے یا رافضی شنیدے نزدِ او رسیدے و با او مذاکرہ کردے و او را ملزم ساختے "

اخوند درویزہ صاحب کے بزرگ علاقہ ننگرہار (موجودہ جلال آباد۔ مشرقی افغانستان) میں مقیم تھے۔ جب ان کے دادا مغلوں اور یوسف زئیوں کی کشمکش میں شہید ہو گئے تو یہ خاندان مہمندوں کے علاقے میں منتقل ہو گیا' جہاں اخوند صاحب کی پرورش ہوئی۔ انھیں شروع سے زہد و ریاضت کا شوق تھا۔ لیکن آپ نے علوم ظاہری کو بھی پورے انہماک سے حاصل کیا۔ آپ کے اساتذہ میں مولنا مصر احمد اور مولنا جمال الدین ہندوستانی " کا نام لیا جاتا ہے۔ موخرالذکر کے پاس آپ سات برس رہے ۔ لیکن آپ کی طبیعت کو تسکین حضرت پیر بابا کی خدمت میں پہنچنے کے بعد ہوئی۔

" دفع زنادقہ و ملاحدہ " کا سبق آپ نے اپنے مرشد سے حاصل کیا تھا۔ جب میاں بایزید نے ہشت نگر میں اقامت اختیار کی تو اس کے خیالات کی اصلاح کے لیے حضرت پیر بابا وہاں پہنچے۔ اخوند درویزہ بھی ان کے ساتھ ہوتے۔ پھر اخوند صاحب علٰحدہ بھی جانے لگے اور بحث و مباحثہ کرتے۔ وہ مخزن الاسلام میں لکھتے ہیں :۔

چوں حضرت پیر دستگیر ایں فقیر' شیخ المشائخ والاولیا' سیف السنت سید علی ترمذی در میانان افغانان یوسف زئی در موضع بونیر بودہ' از بایزید خبر یافتہ دفعِ دعوئے او بر خود فرض دید... پس ایں فقیر ہم ہمراہ برفتم و او را بعوائے خجل و شرمسار ساختم کہ سخن گفتن و دم زدن در حضور نتوانست۔ تالقب او را بیر تاریک کردم و بہذا بکرات و مرات گاہے با حضرت پیر دستگیر و گاہے بہ تنہائی خود حاضر می شدم و ایں ملحد را خجل ساختم۔

لیکن اخوند درویزہ کو پوری کامیابی نہ ہوتی تھی۔ ایک تو علاقے میں صحیح اسلامی حکومت نہ تھی کہ رفعِ شر کا انتظام ہوتا۔ دوسرے علوم اسلامی کی اس علاقے میں انتہائی کمی تھی۔ اخوند صاحب لکھتے ہیں کہ اگر نا واقف افغانوں میں سے ایک کو

ھ تذکرہ علماء و مشائخ سرحد (از مولنا محمد امیر شاہ قادری پشاوری) ص ۲۶

منت کرتا تو دوسرا میاں بایزید کے پاس جا پہنچتا۔ اخوند صاحب نے اندازہ لگایا کہ مسئلے کا اصل حل علومِ اسلامی کی اشاعت ہے۔ چنانچہ انھوں نے کثرت سے پشتو اور فارسی میں کتابیں مرتب کیں۔ اپنی پشتو تصانیف کی نسبت اخوند صاحب لکھتے ہیں:-

افغاناں چوں در طلبِ مولیٰ محبت تمام دارند و دین را جویاں اند اما بسبب نادانی و جاہلی کہ از علومِ دینی محروم اند۔ حق را از باطل نمی دانند۔ ... پس ایں فقیر می خواہد کہ متن عقائد بہ لفظ افغانی بیارد۔ تا ہر کہ آں را دریابد۔ و باور دارد ہرگز گمراہ نگردد۔

اس سلسلے میں آپ کی سب سے مشہور پشتو تالیف مخزن الاسلام ہے، جس میں عقائد و عبادات کے اہم مسائل مشہور عربی و فارسی کتب سے اخذ کر کے درج کیے ہیں اور اس امر پر زور دیا ہے کہ جو کوئی سنتِ نبوی پر نہ چلے۔ اور علمِ تفسیر و حدیث و فقہ سے آگاہ نہ ہو، اُسے پیر و پیشوا ہرگز نہ بنانا چاہیے۔

مخزن الاسلام کا بیشتر حصہ اخوند درویزہ صاحب کا اپنا لکھا ہوا اور احکامِ شریعت کا تمام تذکرہ ان کے اپنے قلم سے ہے، لیکن ان کے صاحبزادے مولٰنا عبدالکریم نے بھی درباب حقائق و معارف کے متعلق شاملِ کتاب کیے ہیں۔

اخوند درویزہ صاحب کو بھی اس امر کا قوی احساس تھا کہ میاں بایزید کی بے راہ روی طریقت کی غلط ترجمانی اور شریعت پر طریقت کی ترجیح سے پیدا ہوئی ("دریں ایام ہر کہ از افغاناں در بلائے در آمدہ است۔ از پیری و مریدی در آمدہ است") اس لیے انھوں نے مروجہ پیری مریدی اور طریق تصوف کی اصلاح کی بڑی کوشش کی۔ مخزن الاسلام میں بھی یہ کوشش مسلسل نظر آتی ہے۔ لیکن اس سلسلے میں ان کی سب سے جامع اور مشہور کتاب ارشاد الطالبین فارسی میں لکھی گئی۔ اس کے شروع میں یہ عاشقِ اسلام اپنے دردِ دل کا اظہار یُوں کرتا ہے:-

"اما بعد یکے از مریدانِ کمترینہ حضرت شیخ الاسلام والمسلمین وارثِ علوم انبیا و المرسلین شیخ علی ترمذی یعنی اضعف عباد اللہ الباری ہمی گوید کہ ... چوں انواعِ اہلِ الحاد تغلب نمودہ اند۔ پس ... معتقدان و معتمدان مذہب سنت و جماعت،

بل عالمان و عاملان مشرب شریعت را غریب الغربا دیدم ... از شدتِ تعصب دینی روز بروز در سوز و گداز در آمدم۔ اما از روئے تحقیق نظر کردم کہ سبب تفرقِ امت بہ ہفتاد و سہ گروہ چہ می باشد؟ جز امر شیخوخت مردودہ مبتدعہ چیزے دیگر نیافتم۔ تنہا اگر تمامی افعال و اقوال و احوال شیوخ این ایام را مخالف قرآن و حدیث و مخالفِ روایاتِ آئمہ و مخالفِ حالاتِ شیوخِ سلف دیدم۔"

اخوند درویزہ کے نزدیک امت کے اختلافات اور عوام کی گمراہی کا اصل باعث یہ "شیخوخت، مردودہ، مبتدعہ" یعنی مشائخ و اکابر کے دعوے اور بدعتی طور طریقے تھے۔ اور ان کا علاج قرآن و حدیث اور آئمہ و شیوخ سلف کی پیروی تھا، جس پر سب اتفاق کر سکتے تھے۔ اخوند صاحب نے رُوحانی مطلق العنانی کی سخت مخالفت کی۔ ان کی تصانیف میں یہ شعر جو میاں بایزید پر بظاہر صادق آتا ہے، بار بار درج ہوا ہے ؎

خیالاتِ نادانِ خلوت گزیں ۔۔۔ بہم بر زند عاقبت کفر و دیں

افغان عوام کو صراطِ مستقیم پر لانے کے لیے اخوند صاحب نے توسیع علم پر زور دیا۔ خود اس کے لیے بڑی جدوجہد کی اور علم کی قدر و قیمت منوانے کی بڑی کوشش کی۔ انھوں نے ان لوگوں پر نکتہ چینی کی جو علم کو "حجاب اکبر" کہتے تھے۔ اور کہا کہ اگر یہ صحیح ہوتا تو نبی کریم کیوں "رَبِّ زِدْنِی عِلماً" کا نعرہ لگاتے۔

مخزن الاسلام اور ارشاد الطالبین کئی بار چھپ چکی ہیں۔ ان کے علاوہ اخوند بابا کی اور کئی تصانیف ہیں۔ مثلاً تلقین المریدین، تذکرۃ الابرار والاشرار دو مرتبہ چھپی ہے۔

اخوند درویزہ شاعر بھی تھے۔ ان کی تصانیف میں ان کے پشتو اشعار آجاتے ہیں۔ اور میر احمد شاہ رضوانی مرحوم نے اپنی کتاب بہارستان میں صبر کی فضیلت پر ان کی ایک پشتو مثنوی درج کی ہے۔

اخوند درویزہ ایک زبردست اہلِ قلم تھے۔ لیکن ان کا اصل مرتبہ ایک مصلح اور مجدد کا ہے۔ انھوں نے صرف میاں بایزید کی روحانی مطلق العنانی ہی کا اپنی حمیت اسلامی اور ٹھوس علمی خدمات سے مقابلہ نہیں کیا، بلکہ اسلام کے بنیادی

عقائد کے خلاف انھیں جہاں کہیں بھی کوئی چیز ملتی وہ اس کی مخالفت کرتے تھے[1] اخبار الاولیاء میں روشنیہ فرقہ کے علاوہ ایک اور گروہ کا ذکر ہے، جس کی آپ نے مخالفت کی۔ افسوس کہ اخبار الاولیاء کی جو نقل ہماری نظر سے گزری۔ اس میں اس گروہ کا نام ٹھیک طرح سے پڑھا نہیں جاتا۔ غالباً "قدایان" ہے اور ان اسماعیلیوں کے متعلق ہے، جو نواح چترال میں اب بھی پائے جاتے ہیں۔ اخبار الاولیاء میں یہ بھی لکھا ہے کہ ایک روایت کے مطابق اس گروہ کے سردار نے آپ کو مسموم تربوز کھلا دیا، جس سے آپ کی وفات واقع ہوئی۔

لیکن شاید حضرت اخوند درویزہؒ کے اصلاحی جوش کا اس سے بھی زیادہ واضح ثبوت یہ ہے کہ آپ نے اپنے پیر و مرشد کو، جن کا آپ کو اتنا احترام تھا، غیر شرعی باتوں پر روکا۔ شیخ علی ترمذیؒ چشتیہ سلسلے سے منسلک تھے۔ اور اس سلسلے کے رواج کے مطابق سماع کے قائل تھے۔ حضرت اخوند صاحب نے اس پر اعتراض کیا۔ شیخ علیؒ نے فرمایا کہ میں کبھی کبھی سماع اس لیے سنتا ہوں کہ اس حالت میں مجھ پر بعض اسرار منکشف ہوتے ہیں، لیکن معترضوں کے پاسِ خاطر سے میں اسے ترک کرنے کے لیے تیار ہوں۔ چنانچہ اخبار الاولیاء میں لکھا ہے کہ اس کے بعد شیخ علیؒ نے پھر سماع نہیں سنا۔

حضرت اخوند درویزہ کو احکامِ شرعی کا بڑا خیال رہتا تھا، لیکن وہ اہلِ حال درویش بھی تھے۔ اور بسا اوقات اپنی دھن میں ایسے مستغرق ہوتے کہ تن بدن کی ہوش نہ رہتی۔ اخبار الاولیاء میں لکھا ہے کہ ایک روز ایک عورت سر پر تیل کا بھرا ہوا مٹکا لیے جا رہی تھی۔ مولانا کو پیاس لگی تھی۔ عورت سے کہنے لگے کہ بیٹی! پانی پلاؤ تو ثواب ملے گا۔ اس عورت نے حیا اور ادب کے مارے کچھ نہ کہا اور مٹکا اخوند صاحب کے سامنے رکھ دیا۔

---

[1] خویشگی افغانوں اور نواح قصور کے دوسرے بزرگوں کا تذکرہ ہے۔ لیکن ایک طویل باب (جو زیادہ تر مخزن افغانی سے ماخوذ ہے) افغان مشائخ کے متعلق ہے۔ اس کی ایک نقل پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں ہے۔

انھوں نے اپنی دھن میں پینا شروع کیا اور مٹکا خالی کر دیا۔ تب جا کر احساس ہوا۔ اور مزہ دہن سے پتا چلا کہ پانی نہ تھا۔ تیل تھا!

اخوند صاحب سماع کے خلاف تھے، لیکن چشتیہ سلسلے میں منسلک تھے اور اس سلسلے سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ ان سے پہلے اخوبنگی بزرگوں کے علاوہ، افغانوں میں چشتی تھوڑے تھے۔ زیادہ افغان اہل طریقت کا سلسلہ شیخ بہاء الدین زکریا سہروردی سے جا کر ملتا تھا۔ حضرت اخوند درویزہ اور ان کے مرشد سے افغان علاقے میں چشتیہ سلسلے کو فروغ ہوا اور انھوں نے تلقین المریدین میں بالتفصیل سہروردیہ سلسلے پر چشتیہ سلسلے کی فوقیت بیان کی ہے۔

اخوند درویزہ نے ۱۰۴۸ھ (مطابق ۱۶۳۸ء) میں عہدِ شاہجہانی میں وفات پائی۔ مزار شریف پشاور میں موقع ہزار خانی کے قریب ہے اور مرجع خلائق ہے۔

اخوند درویزہ کے والد ایک صاحبِ علم بزرگ تھے۔ ادبیاتِ سرحد میں ان کا نام انھوں گدا لکھا ہے، لیکن اخوند صاحب کے صاحبزادے مولٰنا عبد الکریم تو علمی اور باطنی مراتب میں اپنے دادا سے بہت بڑھ گئے۔ خلاصۃ البحر میں انھیں محققِ افغانستان کا خطاب دیا گیا ہے اور مخزن الاسلام کے جو باب انھوں نے لکھے ہیں، ان سے آپ کا ذوق و شوق اور روحانی مرتبہ ظاہر ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے والد سے ظاہری اور باطنی تعلیم پائی۔ پھر ان کی طرح میر سید علی غواص سے خلافت حاصل کی۔ والد کی طرح وہ جامع شریعت و حقیقت تھے۔ اور انھیں کی طرح شعر بھی کہتے تھے۔ اشعار میں انھوں نے اخوند کریمہ کا لقب اختیار کیا ہے اور بسا اوقات وہ اسی لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔

اخوند کریمہؒ کی وفات ۱۰۷۲ھ (مطابق ۶۲-۱۶۶۱ء) میں ہوئی اور یوسف زئی علاقے میں مدفون ہوئے (خزینۃ الاصفیا)

اخوند درویزہؒ اور اخوند کریمہؒ سے بھی بے شمار لوگوں نے فیض حاصل کیا۔ ان میں ایک برگزیدہ بزرگ شیخ پنجو پشاوریؒ تھے۔ وہ اہلِ حال درویش تھے۔ لیکن اخوند درویزہ کے اسلوبِ خیال کے دوسرے بزرگوں کی طرح لوگوں کو حصولِ علم کی بڑی ترغیب دیتے۔

ان کے متعدد مرید تھے "مولنا چالاک میانہ و شیخ شاہ شاہجہانپوری و شیخ علی وغیرہ" وہر کہ بہ صحبت او پیوست فضیلتے از علوم دینی یافت" ان کی زبان پشتو تھی، لیکن فارسی اشعار بھی کہتے اور ہندوستانی زبان میں بھی گفتگو کرتے۔ ان کی وفات ۱۰۷۳ھ مطابق ۱۶۶۳ء میں ہوئی، مزار شریف پشاور میں ہے۔

اخوند درویزہ نے علم و فضل اور معارف و حقائق کی جو شمعیں روشن کیں انھوں نے نام نہاد روشنیہ فرقہ کی گمراہی اور تاریکی کو دور کر دیا۔ افغانوں میں صحیح اسلامی تعلیمات کی روشنی پھیلی۔ اور سرحد میں چشتیہ طریقے کی اشاعت سے افغانوں کا روحانی رشتہ باقی قوم سے استوار ہُوا۔ اس کے علاوہ حضرت مجدد الف ثانی (جو خود اصلاً کابلی تھے) کے خلفا بالخصوص شیخ آدم بنوری اور خواجہ محمد معصوم کے متعدد افغان خلفا تھے، جنھوں نے افغان علاقے میں شریعت کو فروغ دیا۔ شیخ آدم بنوری خود افغان تھے۔ ان کے ایک مشہور خلیفہ شیخ سعدی لاہوری تھے۔ ان کے معتقدین میں سرحد کے کئی مشائخ کبار تھے۔ مثلاً حضرت میاں محمد عمر صاحب چمکنی اور حضرت یحییٰ المعروف حضرت جی۔ روشنیہ فرقہ کے خلاف ان بزرگوں کی کوششیں جس طرح کامیاب ہوئیں۔ اس کا اندازہ مرزا خاں انصاری کے واقعاتِ زندگی کے مطالعہ سے ہوتا ہے، جو روشنیہ فرقہ کے بانی میاں بایزید (پیر روشن یا پیر روخاں) کا پوتا اور پشتو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر تھا۔ ایک زمانے میں وہ کہتا تھا کہ میرے اشعار کی شیرینی پیر روخاں کی برکت سے ہے، لیکن (بقول ریورٹی) ایک زمانہ آیا کہ اس نے روشنیہ طریقے کو نظر انداز کر دیا اور ہر اس بات سے توبہ کی، جو اس نے شرع کے خلاف کی تھی یا کہی تھی۔

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ بعد کے پشتو نامور شعراء (مثلاً رحمان بابا یا خوشحال خاں خٹک) کے کلام میں روشنیہ طریقے سے عقیدت کا کوئی سُراغ نہیں ملتا بلکہ خوشحال خاں خٹک نے تو پیر روخاں اور اس کی کتاب خیر البیان کی مذمت کی۔[1]

---

[1] خوشحال خاں خٹک (از دوست محمد خاں کامل) صفحہ ۲۲۰ - ۲۲۱

اخوند صاحب کی تحریک کا دوسرا فائدہ ادبی تھا۔ انھوں نے اور ان کے مریدوں نے پشتو زبان میں علوم اسلامی کے متعلق کتابیں لکھیں۔ پشتو نظم میں دینی علوم کی اشاعت کی اور پشتو کے دامن کو مالا مال کر دیا۔ ادبیاتِ سرحد کے مصنف اخوند درویزہ اور پیر روشن کی مخالفت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"پیر رَوخاں کے ساتھ اُن کی شدید مخالفت تھی۔ تحریری مناظرے رہتے اور جذبۂ مسابقت میں دونوں طرف سے تصنیف و تالیف کی تخلیق ہوئی۔ اس سے اگرچہ مذہبی طور پر اس عہد میں دو بڑے گروہ ظہور میں آ کر متصادم ہوئے اور ایک دوسرے کو کافر بتاتے رہے، لیکن اس چپقلش نے پشتو ادب میں تصنیف و تالیف کا ایک گراں قدر مجموعہ چھوڑا، جس نے پشتو کا دامن بھر دیا۔ اور آج پیر رَوخاں اور اخوند درویزہ بابا صبح پشتو ادب کے دو بڑے رُکن سمجھے جاتے ہیں ۔

(ادبیات سرحد ص ۵۲)

عہدِ شاہجہانی

قادریہ سلسلے کا فروغ

شاہجہاں حضرت مجدد الف ثانی اور شیخ عبدالحق محدث دونوں کا ستارہ بیک وقت عہدِ جہانگیری میں چمکا اور ان کا ذکر کرتے ہوئے ہم نے عہدِ جہانگیری کے مذہبی حالات، اس زمانے کی مشہور شخصیتوں اور خود بادشاہ کے خیالات کا ذکر کیا ہے۔ جب جہانگیر نے وفات پائی، تو شاہجہاں تخت نشین ہوا۔ اس کے زمانے میں وہ ردِ عمل جو اکبری طریقِ کار کے خلاف جہانگیر کے عہدِ حکومت میں شروع ہوا تھا اور بھی قوی ہو گیا اور اسلام اور شعائرِ اسلامی پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔ جہانگیر کے زمانے میں عام لوگوں کے لیے درباری سجدہ برقرار تھا۔ شاہجہان نے اسے موقوف کر دیا۔ وہ شرع کے مطابق مقدمات فیصل کرتا اور علماء و فضلا کا بھی بڑا قدردان تھا۔ نماز روزے کا پابند تھا۔ بلکہ اگر درباری مورخوں کے پُرجوش اندراجات پر اعتماد کیا جائے تو خیال ہوتا ہے کہ شاہجہان کو نہ صرف نیک، پابندِ شریعت مسلمانوں، بلکہ مجددینِ ملت میں سے شمار کرنا چاہیے! بادشاہ نامہ میں لکھا ہے:۔

> سنّتِ سنیۂ الٰہی بدلں جاری است کہ ہرگاہ کارِ دین رو بہ اندراس نہد و شعایرِ اسلام رُخ بہ انطماس۔ بتائیدِ ایزدی یکے از بندگان سعادت اندوز برُئے کار آید تا بہ آبیاریِ مساعیِ جمیلہ گردِ فتور از ساحتِ اسلام فرو نشاند و بدستیاریِ دین پروری و دیانت داری اساسِ شریعت را مشیّد گرداند و چوں معابدِ اسلام رو بہ انہدام نہادہ بود و مبانیِ شریعت رُخ بہ انعدام۔ ایزدِ کارساز ایں بادشاہِ اسلام نواز کفر گداز را اورنگ آرائے اقبال گردانید۔ بُنیادِ اسلام را چناں محکم و مرصوص ساخت کہ تا روزِ نشور گردِ فتور بہ دامنِ دوام نہ نشیند۔"

اکبر اور جہانگیر کے مقابلے میں شاہجہان کو امورِ اسلامی کا زیادہ خیال تھا، لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ تمام مُلک سے مذہبی بے قاعدگیاں دُور ہوگئی تھیں۔ ہم جہانگیر کی نسبت لکھ چکے ہیں کہ اس نے راجوری (کشمیر) کے مسلمان راجپوتوں کی خلافِ اسلام رسمیں بند کرنی چاہیں لیکن عہدِ شاہجہانی کے واقعات پڑھیں تو پتا چلتا ہے کہ شاہی احکام کے باوجود یہ سبھی بے قاعدگیاں برقرار تھیں۔ بادشاہ نامہ میں ۱۶۳۴ء کے واقعات میں لکھا ہے۔ (ترجمہ)

"اسی دَوران میں خدمتِ شاہی میں عرض ہُوا کہ علاقہ بھنبر[1] کے مسلمان اپنی جہالت کی بنا پر ہنود کو بیٹیاں دیتے اور ان سے بیٹیاں لیتے ہیں اور یہ طے کر لیا ہے کہ جو ہندو لڑکی مسلمان سسرال میں مرے، وہ دفن کی جائے اور جو مسلمان لڑکی ہندوؤں کے گھر فوت ہو وہ جلائی جائے۔ دربارِ شاہی سے حکم ہُوا کہ جس ہندو کے گھر میں مسلمان عورت ہو۔ اگر وہ مسلمان ہو جائے تو عورت سے اس کا نکاح دوسری بار پڑھا جائے ورنہ مسلمان عورت کو اس سے جُدا کیا جائے۔ چنانچہ جوکو زمیندار جس سے یہ فعل سرزد اپنے تمام قبیلے کے ساتھ مسلمان ہُوا اور راجا دولتمند کے خطاب سے سرفراز ہُوا....

جب بادشاہ کی سواری پنجاب کے قصبہ گجرات میں پہنچی تو وہاں کے سادات و مشائخ نے عرض کیا کہ وہاں کے بعض ہندوؤں نے مسلمان عورتیں گھروں میں ڈال رکھی ہیں۔ (حرائر و امائے مومنہ در تصرف دارند) اور ان میں سے بعض نے تو مسجدوں پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اس پر شیخ محمد گجراتی کو جو علوم رسمی سے واقف تھا اور نو مسلموں کا داروغہ مقرر ہُوا تھا، حکم ملا کہ ثبوت کے بعد مسلمان عورتوں کو ہندوؤں کے قبضہ سے نکالے اور مسجدوں اور غیر مسلموں کی عمارتوں کو علٰحدہ علٰحدہ کرے۔ چنانچہ شیخ نے ستّر مسلمان عورتوں کو ہندوؤں کے قبضے سے نکالا۔ اور جہاں جہاں مسجدوں پر ہندوؤں نے بیجا تصرف کر لیا تھا تحقیق کے بعد انھیں واگزار کر دیا اور غیر مسلموں سے جُرمانہ لینے کے بعد مسجدوں کو بحال کیا۔"

---

[1] علاقہ آنناد کشمیر میں ہے۔ اور گجرات سے بہت دُور نہیں۔

لیکن مذہبی بے قاعدگیاں صرف غیر مسلموں کے متعلق نہ تھیں۔ ملک کے دُور دراز حصوں میں مسلمانوں میں بھی عجیب و غریب اعتقادات رواج پا رہے تھے خافی خاں ۱۶۲۹ء کے ضمن میں لکھتا ہے: (ترجمہ)

"کابل کی خبروں اور وہاں کے گورنر لشکر خاں کی رپورٹ سے معلوم ہُوا کہ افغان آئینِ شرعی کی بالکل پیروی نہیں کرتے۔ بلکہ انھوں نے ایک گمراہ پیر کے احکام کو آیت و حدیث کا درجہ دے کر ملحدوں کے طریقے اختیار کر رکھے ہیں۔ وہ بیویوں سے شرعی طور پر نکاح نہیں کرتے، بلکہ ایک گائے یا بیل کو ذبح کر کے اپنے ہم مشربوں کی ضیافت کرتے ہیں اور اس کے بعد بغیر کسی عقد و نکاح کے تعلقات ازدواجی شروع کر دیتے ہیں۔ طلاق کے لیے وہ تین سنگریزے عورت کے ہاتھ دے دیتے ہیں اور اسے گھر سے باہر نکال دیتے ہیں۔ بیوہ عورتیں ان کے رواج کے مطابق ترکے میں داخل ہیں اور میت کے وارث کو حق ہوتا ہے، خواہ وہ ان سے نکاح کرے یا کسی کے پاس ہبہ یا فروخت کر دے۔ جو بدنصیب مسافر اس سرزمین میں جا پہنچتا ہے، اسے یہ لوگ شکارِ حلال سمجھتے ہیں اور اسے بیچ کر آمدنی کا ذریعہ بناتے ہیں۔ یہ لوگ میت کے ورثہ میں سے بیٹیوں کو کوئی حصہ نہیں دیتے اور قتل و انتقام اور راہزنی میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کو بڑی خوبی سمجھتے ہیں۔"

اس پر حکم ہُوا کہ "احکام تورہ و شریعت" کے مطابق ان لوگوں کو زجر و تنبیہہ کی جائے چنانچہ بڑی تاکید کے بعد جس میں کئی دفعہ فساد و بلوے کی نوبت آئی، آہستہ آہستہ ان لوگوں کی بدعتیں کم ہوئیں، لیکن بالکل رفع پھر بھی نہ ہوئیں اور خافی خاں ۵ سال کے بعد لکھتا ہے۔ "اب بھی ان بدعتوں کے آثار اس قوم میں باقی ہیں۔"

خافی خاں نے تو یہ اندراج آج سے تقریباً ڈھائی تین سو سال پہلے لکھا تھا، لیکن عجب نہیں کہ اب بھی تحقیق و تفتیش سے کام لیا جائے تو شاید ان بدعتوں کے آثار صرف اسی قوم میں نہیں، بلکہ اسلامی ہندوستان کے بعض اور حصوں میں بھی نظر آ جائیں

ان ظاہری خرابیوں کے علاوہ ایک گہری بیماری توحید وجودی کے ذریعے

راہ پا رہی تھی حضرت مجدد الف ثانی نے عہدِ جہانگیری میں لکھا تھا:-

"اکثر ابنائے ایں وقت، بعضے بہ تقلید و بعضے بمجرد علم و بعضے دیگر بہ علم ممتزج بہ ذوق و بعضے بہ الحاد و زندقہ دست بدامن ایں توحید وجودی زدہ اند و ہمہ را از حق مے دانند و گرد نہائے خود را از ربقہ شرعی بہ حیلہ مے کشائند و مداہنات در احکام شرعیہ مے نمایند و باین معاملہ خوش وقت و خورسند اند و اتیان اوامر شرعیہ اگر اعتراف دارند، طفیلے میدانند، مقصود اصلی ورائے شریعت خیال مے کنند۔ حاشا وکلا نعوذ باللہ سبحانہ، من ہذا الاعتقاد السوء"

حضرت مجدد نے جس روحانی بدنظمی کا ذکر کیا تھا وہ عہدِ شاہجہانی میں بڑھ گئی اور جیسا کہ ناظرین آئندہ صفحات میں دیکھیں گے نہ صرف مشائخ کے حلقے بلکہ اہلِ علم کی مجلسیں اور شاہزادوں کے دربار وحدت الوجود کی صداؤں سے گونج اُٹھے۔

حضرت شیخ میاں میر قادریؒ

حضرت شیخ عبدالحق محدث نے ابتدائے سلوک میں اُچ کے ایک قادری بزرگ سے فیض حاصل کیا تھا، لیکن تقویٰ و پرہیزگاری اور شریعت کی کشش نے انھیں آہستہ آہستہ ایسے سلسلے کی طرف کھینچ لیا جس میں اتباعِ شریعت پر قادریہ سلسلے سے زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ وہ حضرت خواجہ باقی باللہ کے عزیز دوستوں میں سے تھے اور طبقات شاہجہانی کا مصنف لکھتا ہے کہ انھوں نے خواب میں خود حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کا اشارہ پاکر حضرت خواجہ باقی باللہ سے نقشبندیہ سلسلے میں بیعت کی تھی۔

جس عمل سے شیخ عبدالحق متاثر ہوئے، اس کا اثر عہدِ جہانگیری میں دُور دُور پہنچا اور حضرت مجدد الف ثانی کی عالمگیر شخصیت نے اس زمانے میں نقشبندیہ سلسلے کو بے حد مقبول بنا دیا۔ لیکن ان کی زندگی میں ہی لاہور کے قرب میں ایک ایسا شیخ سلوک کی منزلیں طے کر رہا تھا، جس کے اثر سے پھر ایک بار قادریہ سلسلہ چمک اُٹھا۔ یہ بزرگ شیخ میاں میر تھے، جنھوں نے قادریہ سلسلے کے ہندوستانی مرکز اُچ سے نہیں بلکہ اس طریقے کی ایک اور شاخ سے فیض حاصل کیا اور جن کو نہ صرف عوام الناس میں

بلکہ علمی اور درباری حلقوں میں اس قدر مقبولیت ہوئی کہ ان کے سامنے دُوسروں کے چراغ مدھم پڑ گئے۔ آپ حضرت مجدد الف ثانی کے صاحبزادے خواجہ محمد معصوم کے ہمعصر تھے لیکن عہدِ شاہجہانی کی عام مُلکی تاریخیں دیکھیں تو حضرت میاں میر کے متعلق طویل اندراجات ملیں گے اور خواجہ محمد معصوم کی نسبت کہیں ایک آدھ سطر بلکہ اس زمانے کی بعض مشہور تاریخیں (مثلاً عملِ صالح۔ بادشاہ نامہ۔ منتخب اللباب) تو خواجہ صاحب کے ذکر سے یکسر عاری ہیں اور اس کی وجہ یہی خیال میں آتی ہے کہ خاص خاص حلقوں سے قطع نظر جو رنگ عہدِ شاہجہانی میں مقبول تھا' وہ قادری تھا۔ نقشبندی نہ تھا اور اس زمانے کے سب سے بااثر شیخ حضرت میاں میر ہی تھے۔

حضرت شیخ میاں میر' بالا پیر قدس سرہ کا اصل نام میر محمد تھا۔ وہ سندھ کے قدیم شہر سہوان میں پیدا ہوئے۔ قاضیوں کے خاندان سے تھے' جس میں علم و فضل کا بڑا چرچا تھا۔ سات سال کے تھے کہ شفقتِ پدری سے محروم ہو گئے' لیکن علومِ دینی آپ نے اچھی طرح حاصل کیے اور آپ کی والدہ ماجدہ نے خود آپ کو سلسلۂ قادریہ میں تعلیم دی۔ اس کے بعد علائق دنیا سے مُنہ موڑ کر آپ شیخ حضرت سیوستانی کے مرید ہوئے جو سہوان کے باہر ایک پہاڑ پر قیام فرما تھے۔ پچیس سال کی عمر میں لاہور آئے اور یہاں ریاضت و عبادت اور تلقین و ہدایت شروع کی۔

آپ قدیم طرز کے صُوفی بزرگوں میں سے تھے جو فنا فی اللہ ہوتے ہیں اور شرع کی ترویج پر اس قدر زور نہیں دیتے۔ جس قدر عبادت و ریاضت پر۔ آپ عبادتِ الٰہی میں اس طرح منہمک رہتے تھے کہ زاویہ خمول سے باہر نہ نکلتے اور چالیس سال تک اہلِ لاہور کو پتا بھی نہ ہوا کہ اس پلے کا ایک بزرگ ان کے درمیان موجود ہے' آپ کو وحدت الوجودی فلسفے سے خاص محبت تھی۔ چنانچہ عملِ صالح میں لکھا ہے "واکثر عبارات فتوحات مکی شیخ الموحدین ابن عربی بخاطر داشتند و صفحہ صفحہ شرح فصوص الحکم حضرت مولوی جامی را از بر مے خواندند"۔ آپ نے تمام عمر شادی نہیں کی۔

آپ کی وفات ۱۰۴۵ھ (۱۶۳۵-۳۶ء) میں ہوئی۔ مزار لاہور سے پانچ میل کے فاصلے پر ایک

گاؤں میں ہے جو اس مزار کی بنا پر میاں میر کہلاتا ہے۔ داراشکوہ جس نے آپ کے اور آپ کے ممتاز خلفا کے تفصیلی حالات سکینۃ الاولیا میں لکھے ہیں آپ کا بڑا معتقد تھا۔ اس نے مزار کے لیے مسالہ جمع کیا۔ لیکن تعمیر کی نوبت نہ آئی تھی کہ قضا و قدر نے اس کا تختہ اُلٹ دیا۔ مزار کچھ عرصہ نامکمل رہا۔ پھر چند سال بعد اورنگ زیب خود مزار پر آیا اور اس کی تکمیل کا حکم دیا۔ مزار کے قریب ایک شکستہ بارہ دری ہے جس میں داراشکوہ کی رفیقِ حیات نادرہ کی قبر ہے۔

حضرت میاں میر کو اپنے زمانے میں بڑا فروغ حاصل ہُوا تھا۔ جہانگیر ان کی نسبت تزکِ جہانگیری میں لکھتا ہے :۔

"چوں بعرض رسید کہ در لاہور شیخ محمد میر نام درویشے است ہندی الاصل بغایت فاضل و مرتاض و مبارک نفس و صاحبِ حال در گوشۂ توکل و عزلت منزوی گشتہ از فقر غنی و از دُنیا مستغنی نشستہ است۔ بنا بریں خاطرِ حق طلب بے ملاقات ایشاں قرار نگیرد و بدیدن ایشاں رغبت افزود۔ چوں بہ لاہور رفتن متعذر بود رقعہ بخدمت ایشاں نوشتہ، شوقِ باطن را ظاہر ساختم و آں عزیز باوجود کبرِ سن و ضعف بنیہ تصدیعہ کشیدہ تشریف آورد و مدت ممتد تنہا با ایشاں نشستہ صحبتِ مستوفی داشتہ شد۔ الحق ذاتِ شریف است و دریں عہد بغایت غنیمت و عزیز الوجود۔ ایں نیاز مند از خود بر آمد با ایشاں صحبت داشت و بسا سخنان بلند از حقائق و معارف استماع افتاد۔ ہر چند خواستم نیازے بگذرانم۔ چوں پایۂ ہمت ایشاں را از اں عالی تر یافتم۔ خاطر باظہار ایں مطلب رخصت نداد۔ پوستِ آہوئے سفید بجہت جائے نماز بایشاں گزرانیدم"۔

اس کے بعد حضرت لاہور واپس چلے گئے۔ لیکن جہانگیر نے ان سے خط و کتابت جاری رکھی اور اس کے دو خط سکینۃ الاولیا میں نقل ہوئے ہیں۔

شاہجہان بھی حضرت کا بڑا معتقد تھا۔ وہ دو دفعہ حضرت سے ملا۔ بادشاہ نامہ میں ایک مُلاقات کی نسبت لکھا ہے۔ (۲۸ دسمبر ۱۶۳۴ء)

"خدیو خدا آگاہ، بکاشانۂ فیض آشیانۂ پیشوائے ارباب صفوت و صفا، زبدۂ اصحاب معرفت و تقیٰ، قدوۂ حق شناسان صافی ضمیر میاں میر کہ پیشتر نیز بقدوم سعادت لزوم مہبط انوار گشتہ بود، تشریف فرمودۂ و بگذارش بساد قائق حقائق و غوامض معارف باعث انشراح صدور و انبساط قلب آں زاویہ نشین تجرد گزیں گشتند۔"

معلوم ہوتا ہے۔ شاہجہاں آپ کا بڑا قائل ہو گیا تھا۔ عمل صالح میں لکھا ہے:-

"حضرت بادشاہ حقائق آگاہ بہ نحوے شیفتۂ صحبت آں مقتدائے اصحاب عرفان شدند کہ مزیدے برآں متصور نباشد۔ چنانچہ بارہا اطوار محمودہ و احوال ستودۂ ایشاں را ستودہ می فرمودند کہ از مشائخ متصوفہ ایں کشور میاں میر را کامل تر یافتم۔ و از ایشاں گزشتہ شیخ المشائخ شیخ فضل اللہ۔"

دارا شکوہ کا بیان ہے کہ بیس سال کی عمر میں میں اس طرح بیمار ہوا کہ اطباء میرے علاج سے عاجز آ گئے۔ بادشاہ مجھے لے کر حضرت کے گھر گیا اور کہا کہ یہ میرا بڑا لڑکا ہے۔ معالج اس کا علاج نہیں کر سکے۔ آپ ہی اس پر توجہ کیجیے۔ حضرت نے پانی کا ایک پیالہ منگوایا اور اس پر دم کر کے دارا شکوہ کو پینے کے لیے دیا۔ دارا شکوہ کہتا ہے کہ اسی ہفتے مجھے صحت ہو گئی اور میری بیماری بالکل جاتی رہی۔

دارا شکوہ نے حضرت میاں میر اور ملا عبدالحکیم سیالکوٹیؒ کی (جو حضرت مجدد کے مُرید تھے) ایک گفتگو کا ذکر کیا ہے، جس سے خیال ہوتا ہے کہ حضرت میاں میر اور مجددیہ طریقہ کے بزرگوں میں اختلاف نمودار ہو رہے تھے۔ اس گفتگو کے وقت بادشاہ بھی موجود تھا اور حضرت میاں میر اسے خدا تک پہنچنے کے طریقے بتا رہے تھے۔ اس ضمن میں انھوں نے کہا کہ جب سالک پر عالمِ ملکوت کشف ہو جاتا ہے تو ہم اسے جنگلوں میں بھیج دیتے ہیں تاکہ وہ تنہائی میں یادِ الٰہی کرے۔ اس پر ملا عبدالحکیم نے اعتراض کیا کہ اس طرح تو نماز باجماعت فوت ہو جاتی ہے۔ حضرت میاں میر نے اس کا مناسب جواب دیا۔ لیکن اس اعتراض اور جواب سے بھی خیال ہوتا ہے کہ شرع کی غیر مکمل پابندی کی نسبت جو اعتراض مجددیوں کو قادریوں پر تھے اور جنھوں نے آگے چل کر دارا شکوہ اور عالمگیر

کی مخالفت کو چکا دیا وہ حضرت میاں میر کے زمانے میں ہی رونما ہو رہے تھے۔

ملّا شاہ قادری

داراشکوہ حضرت میاں میر پر فریفتہ تھا اور انھوں نے اس کے رُوحانی ذوق و شوق کو ترقی دی، لیکن جس وقت داراشکوہ نے بیعت کا ارادہ کیا (۱۶۳۹ء) اس وقت حضرت میاں میر وفات پا چکے تھے، اور اس نے بیعت اُن سے نہیں، بلکہ اُن کے خلیفہ شاہ محمدؒ المعروف ملّا شاہ قادری سے کی جو علاقہ بدخشاں کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے، لیکن ابتدا سے شباب میں ہی کشمیر آ گئے اور وہاں سے لاہور آ کر حضرت میاں میر کے مُرید ہوئے۔ چونکہ لاہور کی گرمی آپ کے نازک جسم کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ اس لیے آپ مُرشد کی اجازت سے موسم گرما میں کشمیر تشریف لے جاتے، جہاں داراشکوہ اور جہاں آرا نے آپ کے لیے دامنِ کوہ ایک شاندار خانقاہ تعمیر کرا دی تھی۔ اور موسم سرما میں (جب تک مرشد زندہ رہے) لاہور آجاتے۔ تذکرہ نگار آپ کی ریاضتوں اور مجاہدوں کا اس طرح ذکر کرتے ہیں کہ حیرانی ہوتی ہے۔ داراشکوہ ایک جگہ لکھتا ہے کہ میں نے لوگوں سے سُنا ہے کہ شروع میں آپ نے سات سال تک عشاء کی نماز کے بعد سے صبح تک حبسِ نفس سے ذکرِ خفی کیا ہے۔ ایک اور جگہ کہتا ہے۔ (ترجمہ) آپ کی ریاضتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اب ۱۰۵۲ھ تک تیس سال سے کچھ اُوپر آپ نے ایک لحظہ اور ایک لمحہ بھی نیند نہیں کی۔

ان غیر معمولی ریاضتوں کی وجہ سے آپ کی شخصیت میں بڑی کشش اور بات میں بڑی تاثیر پیدا ہو گئی تھی۔ جن دنوں آپ کشمیر میں تھے، وہاں شیعہ سُنّی اختلافات زوروں پر تھے۔ آپ برسرِ مجلس چاروں خلفاء کی تعریف کرتے۔ مخالفین بحث و مناظرہ کے لیے آتے، لیکن آپ اس خوش اسلوبی سے پیش آتے اور آپ کی بات میں اتنی تاثیر تھی کہ وہ قائل ہو جاتے۔ کہتے ہیں کہ کئی ہزار مخالف آپ کی وجہ سے اہلِ سُنّت ہو گئے۔ تصوف میں آپ کا طریقہ وحدت الوجود کا تھا۔ دوسرے مذاہب کے ہم مشرب لوگوں سے ملنے سے آپ کو احتراز نہ تھا اور بسا اوقات ان پر نیک اثر ڈالتے۔ چنانچہ ایک

کائستھ کی نسبت، جو ولی رام کے نام سے مشہور ہُوا، کہتے ہیں کہ وہ پہلے مغلیہ حکومت کے تابع ایک برسرِ اقتدار امیر تھا۔ داراشکوہ اور ملّاشاہ کے فیضِ صحبت سے اسے عشقِ الٰہی دامنگیر ہُوا اور سب جاہ و مال ترک کر کے شیخ ملّاشاہ کے ہاتھ پر مرید ہُوا۔ دبستانِ مذاہب میں اس کی نسبت لکھتا ہے۔ "در کشمیر بخدمت ملاشاہ بدخشی رسیدہ کامیاب شناخت گشت و بمقتضائے الصوفی لامذہب لہ بقیدِ ہیچ دین و آئین باز نہ ایستہ۔ بابُت بُت خانہ آشناست و از مسجد بیگانہ نیست۔" اسی کتاب میں ولی رام کے بعض شعر درج ہیں ؎

ما نہ آنِ خودیم، آنِ توایم — بے نشانی تو ما نشانِ توایم
ایں نشانہا نشانِ ذاتِ تو اند — مظہرِ جلوۂ صفاتِ تو اند
پاکی از فکر و از قیاسِ ما — اے تو پیدا دریں لباسِ ما
مظہرِ ذاتِ تو ہمہ اشیا — بے تو و ما توئی، وخود تو و ما
ذاتِ تو در صفاتِ تو پیدا — صفتِ عینِ ذات اے مولا
ما ہمہ ہیچ، ہر چہ ہست توئی — اے منزّہ ز فہم و وہم و دوئی
ما ہمہ موجِ بحرِ ذاتِ توایم — مظہرِ مجملِ صفاتِ توایم

داراشکوہ نے سکینۃ الاولیا میں ملّاشاہ کے کلام سے جو انتخاب دیا ہے، اس میں بھی وہی وحدت الوجودی رنگ جھلکتا ہے جو ولی رام کے اشعار میں ہے۔ ملّاشاہ کی ایک غزل کے چند اشعار ہیں ؎

حرفِ دیوانگی است در دلِ ما — چہ زند سر دگر ازیں گِلِ ما
وز تماشاش فرضہا ہمہ رفت — چیست پُرسیدن از نوافلِ ما
رُوئے او در مقابلِ مرأت — رُوئے ما بود در مقابلِ ما
در رہِ عشق آنکہ مارا کُشت — غیرِ ما کس نبود قاتلِ ما
وصل داد ایں خبر کہ غیر یکے — نیست موصولِ ما و واصلِ ما
از سرِ اتحاد ایں برخاست — میلِ ما اوست، اوست مائلِ ما
ما کہ جُز حق نہ ایم از عرفاں — پس چہ پُرسی ز حق و باطلِ ما

ایک اور جگہ کہتے ہیں :۔

بُردیم بسر نزد د لابد را | رفتیم تمام رہِ بود و شد را
شد تا مطلب مقابلِ آئینۂ دل | دیدیم در آئینہ جمالِ خود را

ایک اور رباعی ہے ؎

آنرا کہ بجاست بر سرِ ایماں جنگ | او مومن و زایمانِ من او را صد ننگ
مومن نشود تا کسے برابر نشود | بابانگِ نماز، بانگِ ناقوسِ فرنگ!

آخری شعر میں ملا شاہ نے جس خیال کا اظہار کیا ہے ۔ اسی پر داراشکوہ نے عمل کیا اور دوسرے مذاہب بالخصوص ہندو ویدانتیوں کی کتابوں میں حقیقت کی اس طرح تلاش کی کہ گویا وہ اس کے اپنے طریقے کی کتابیں ہیں اور اسلامی تصوف اور ویدانت میں ہم آہنگی ثابت کی ۔

بعض دفعہ تو ملا شاہ کی وارستہ گوئی اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ اعتراض کی زبانیں بے محابا کھل جاتیں۔ ایک دفعہ اس نے ایک شعر لکھا (نقلِ کفر، کفر نباشد) ؎

پنجہ در پنجۂ خدا دارم
من چہ پروائے مصطفےٰ دارم

اس پر علمائے کشمیر نے ملا شاہ کے کافر اور واجب القتل ہونے کا فتویٰ دے کر شاہجہاں سے استدعا کی کہ وہ اس کے خلاف حدِ شرعی جاری کرے ۔ شاہجہاں نے علما سے اتفاق کیا اور کشمیر کے گورنر ظفر خاں کے نام فرمان لکھا جا چکا تھا، مگر داراشکوہ نے سفارش کی کہ اس معاملے میں جلدی نہیں کرنی چاہیے اور کسی اور بزرگ مثلاً حضرت میاں میر سے استصواب کیا جائے ۔ بادشاہ نے یہ بات قبول کر لی اور حضرت میاں میر سے مُلا شاہ کے بارے میں دریافت کیا ۔ حضرت میاں میر نے فرمایا کہ احوال کے تابع مُلا شاہ ایسی باتیں کہہ جاتا ہے، جن سے پرہیز واجب ہے، لیکن اُسے ان کی بنا پر قتل کرنا نامناسب اور ناموزوں ہوگا۔ بادشاہ نے یہ مشورہ قبول کر لیا اور ملا شاہ کے خلاف قدم نہ اٹھایا۔

اس کے کچھ عرصہ بعد جب ۱۶۳۹ء میں شاہجہاں کشمیر آیا تو اس نے ملا شاہ کو بلا بھیجا

دیر تک اس سے صوفیانہ مسائل کی نسبت گفتگو رہی ۔ بادشاہ نامہ میں یکم جمادی الثانی ۱۰۵۰ھ روز سہ شنبہ کے بیان میں لکھا ہے :۔

"در تاریخ مذکور غواص لجۂ توحید ملا شاہ بدخشی کہ مہین خلیفۂ مصباح سبل ہدایت مفتاح ابواب ولایت میاں میر قادری است و در نزہت گاہ کشمیر برسم انزوا بسر مے برند حسب الطلب بادشاہ درویش نواز بشرف حضور محفل فیض منزل کہ وسیلۂ دریافت مآرب دینی و ذریعۂ ادراک مطالب معنوی است رسید و بساتکات بلند دراں صحبت فیض منقبت گزارش یافت ۔ بادشاہ حق آگاہ باقسام تلطف و مہربانی آں ایزد پرست را منبسط ساختہ مرخص گردانید"۔

اسی سال دارا شکوہ اور اس کی بہن جہاں آرا ملا شاہ کے حلقۂ بیعت میں آئے۔ ملا شاہ اپنے شاہی مریدکے ذوق و شوق سے بڑے خوش تھے اور کہا کرتے تھے کہ یہ عزیز قادریہ سلسلے کو فروغ دے گا ۔

کچھ عرصہ بعد حالات نے پلٹا کھایا اور دارا شکوہ کو شکست دے کر ۱۶۵۸ء میں تخت شاہی پر اورنگ زیب متمکن ہوا ۔ اب علما نے پھر ملا شاہ کے خلاف آواز اٹھائی چنانچہ دار الخلافے سے ملا شاہ کی طلبی کا پروانہ جاری ہوا ۔ لیکن ملا شاہ ان دنوں کمزور اور بیمار تھا ۔ اس لیے کشمیر کے گورنر نے لکھا کہ اس وقت شیخ سفر کے ناقابل ہے بحالی صحت پر حاضر ہو گا ۔ اس طرح کچھ وقت گزر گیا اور اس دوران میں ملا شاہ کے مندرجہ ذیل اشعار جو اس نے اورنگ زیب کی تخت نشینی پر لکھے تھے اورنگ زیب تک پہنچے ۔ وہ اشعار حسب ذیل ہیں ؎

صحن دل من چوں گل خورشید شگفت ۔۔۔ کامد حق و غبار باطل رفت
تاریخ جلوس شاہ حق آگہ را ۔۔۔ ظل الحق گفت الحق ایں را حق گفت
۱۰۶۹ھ

اس کے بعد اورنگ زیب نے اپنا پہلا حکم منسوخ کر دیا اور فقط یہی لکھا کہ ملا شاہ بجائے کشمیر کے لاہور میں قیام کرلے ۔ چنانچہ ۱۶۶۰ء کے موسم سرما میں شیخ نے نقل مکان کیا اور لاہور میں سکونت اختیار کی ۔ اب اس کی عمر بھی زیادہ ہو گئی تھی کچھ اس وجہ سے اور کچھ

نئے حالات کی بنا پر اس نے گوشہ نشینی اختیار کی اور آمد و رفت کا دروازہ خلقت سے لیے بند کر دیا۔ فقط چند مخلص معتقد اور مرید گاہے گاہے ملتے اور شیخ ان کے ساتھ اپنے روحانی تجربات کا بیان کرتے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کے حاشیہ نشینوں کو شاہی معتقدوں کے خواب ابھی نہ بھولے تھے۔ ایک دفعہ اس کے ایک دوست کابل خاں نے کہا۔ قدیم زمانے میں اورنگ زیب تصوف کی باتیں بڑی دلچسپی سے سنا کرتا تھا۔ اور مجھے خوب یاد ہے کہ جب میں اس کی خدمت میں مثنوی مولنا روم پڑھا کرتا تھا تو وہ بعض بند سن کر آنسو بہایا کرتا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ جب وہ لاہور آئے گا تو آپ سے ملنے کی خواہش کرے گا۔" لیکن شیخ نے نفی میں جواب دیا اور کہا کہ" اورنگ زیب کی اور میری ملاقات کبھی نہ ہو گی۔" اس کے کچھ عرصہ بعد شیخ عارضۂ بخار میں مبتلا ہوا اور اگرچہ اس وقت صحت ہو گئی، لیکن چند روز بعد مرض کا پھر حملہ ہوا اور ۱۰۷۲ھ (۱۶۶۱ء) میں ۱۰ اکتوبر کو شیخ نے انتقال کیا۔

سرمد

اس زمانے کی ایک دلچسپ ہستی سرمد ہے جسے اوائل عہد عالمگیری میں سزائے موت دی گئی۔ مذہبی تاریخ کا ایک دلچسپ موضوع ہونے کے علاوہ وہ ہندوستان کی ادبی تاریخ میں بھی ایک باعزت جگہ کا مستحق ہے۔ اس کی رباعیات بڑی پُر لطف ہیں اور جب اُس کے با اثر اور پُر خلوص اشعار کا متاخرین کے کلام سے مقابلہ کرتے ہیں جو معنی آفرینی اور نازک خیالی کی بھول بھلیاں میں گرفتار تھے تو خیال ہوتا ہے کہ اگرچہ اسے عرفی اور ناصر علی سرہندی کی ادبی شہرت حاصل نہیں ہوئی لیکن اس کا مختصر مجموعۂ کلام اس زمانے کے دوسرے شعرا کے کلام سے زیادہ شیریں اور صحیح شاعرانہ نقطۂ نظر سے زیادہ باوقعت ہے۔

سرمد کے حالات پر مولنا ابو الکلام آزاد نے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے اور مولنا محمد حسین آزاد نے بھی نگارستانِ فارس میں چند صفحے اس کے لیے وقف رکھے ہیں۔ دونوں نے تذکرہ نگاروں کی کم نویسی کی شکایت کی ہے۔ شمس العلماء آزاد لکھتے ہیں۔ "نام اس کا کسی کتاب سے معلوم نہیں ہوتا۔" مولنا آزاد بھی کہتے ہیں۔ "خاندانی نام کا پتا

نہیں چلتا اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ قبولِ اسلام کے بعد کیا نام رکھا۔ لیکن وہ اس خیال سے کہ بعض تذکروں میں سرمد کے "حالات سعید ائے سرمد" کے عنوان سے درج ہیں قیاس کرتے ہیں کہ اسلامی نام کا ایک جزو شاید لفظ سعید ہوگا۔" معلوم ہوتا ہے کہ دبستانِ مذاہب کا اندراج ہر دو مصنفین کی نظر سے نہیں گزرا۔ اس کتاب کا مصنفؔ سرمد کا معاصر اور عزیز دوست تھا اور دونوں آزاد خیالوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے، جو شہزادہ داراشکوہ کے گرد جمع ہوگیا تھا۔ چنانچہ دبستان میں سرمد کے حالات کسی قدر تفصیل سے درج ہیں۔

دبستان میں لکھا ہے کہ سرمد اصل میں یہودی تھا اور یہودیوں کے اس معزز طبقے سے تعلق رکھتا تھا جنھیں ربّی کہتے ہیں۔ یہودی عقائد اور تورات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد وہ مسلمان ہوگیا اور ایران کے مشہور فضلا مثلاً ملّا صدرا اور میر ابوالقاسم اندرسکی کی خدمت میں حاضر ہوکر حکمت و فلسفہ کی تکمیل کی۔ اس کے بعد تجارت کی غرض سے ہندوستان کو روانہ ہوا۔ سندھ کے مشہور مقام ٹھٹھہ میں پہنچا تھا کہ وہاں ابھے چند نام ایک ہندو بچے کو دیکھا اور مال و متاع کے ساتھ سب حکمت و فلسفہ بلکہ عقل و تمیز کھو بیٹھا اور ترکِ لباس کرکے سنیاسیوں کی طرح معشوق کے دروازے پر دھونی رمائی۔ جب ابھے چند کے والد نے دیکھا کہ سرمد کی محبت پاک اور خیالاتِ جسمانی سے منزہ ہے تو اس نے سرمد اور اپنے بیٹے کے تعلقات میں روڑے نہ اٹکائے۔ ابھے چند نے سرمد سے تورات اور انجیل اور دوسری مذہبی کتابیں پڑھیں اور فارسی شعرگوئی بھی شروع کر دی۔ چنانچہ یہ شعر جو اس زمانے کے روحانی رجحانات کا آئینہ ہے۔ اُسی کا ہے ؎

ہم مطیعِ فرقانم ہم کشیش و رہبانم
ربّی یہودانم، کافرم مسلمانم

۱؎ عام طور پر محسن فانی دبستانِ مذاہب کا مصنف سمجھا جاتا ہے۔ لیکن مآثر الامرا کے مطابق یہ کتاب ذوالفقار خاں اردستانی کی تصنیف ہے۔ (مقالاتِ شبلی)

اس کے بعد کے واقعات دبستان میں تسلسل سے درج نہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ سرمد نے کچھ عرصہ حیدرآباد دکن میں بھی گزارا اور دبستان کے مصنف سے اس کی پہلی ملاقات ۱۶۴۷ء میں وہیں ہوئی۔

جس وقت دبستان مذاہب لکھی گئی۔ سرمد بقیدِ حیات تھا۔ اور سرمد کے آخری ایام کے حالات اس کتاب میں نہیں ملتے، لیکن مصنف نے سرمد کے کئی اشعار اپنی کتاب میں درج کیے ہیں۔ رباعی

سرمد کہ زجام عشق مستش کردند
خواندند سرفرازش و پستش کردند
مے خواست خدا پرستی و ہشیاری
مستش کردند و بت پرستش کردند

نعتِ رسول میں کہا ہے ؎ رباعی

اے از رُخ تو شکستہ خاطر گلِ سُرخ
باطن ہمہ خونِ دل و ظاہر گلِ سُرخ
زاں دیر بر آمدی زیوسف کہ بباغ
اوّل گلِ زرد آمد و آخر گلِ سُرخ

فرد

در کعبہ و بتخانہ سنگ او شد و چوب او شد
یکجا حجر الاسود، یکجا بُتِ ہندو شد

ابھے چند نے جس کی وجہ سے سرمد نے ترکِ لباس کیا تھا۔ سرمد کی رفاقت اختیار کر لی تھی اور اس کے ساتھ حیدرآباد میں موجود تھا۔ چنانچہ جب دبستان کے مصنف نے اپنی کتاب کے لیے یہودی عقائد کی تفصیل چاہی تو ابھے چند نے تورات کے ایک باب (کتاب پیدائش Genesis) کے ابتدائی حصّے کا فارسی میں ترجمہ کیا جو سرمد کی تصحیح اور نظرِ ثانی کے بعد درج کتاب ہُوا۔

اس کے بعد سرمد شاہجہان آباد آیا۔ یہاں دارا شکوہ کو تصوف سے دلچسپی اور دیوانہ مزاج لوگوں سے خاص عقیدت تھی۔ چنانچہ سرمد نے اس کی صاحبت اختیار کی اور بالآخر یہی صُحبت اس کی موت کا باعث ہوئی۔ اس زمانے میں شاہجہان تختِ دہلی پر جلوہ افروز تھا۔ سرمد کی ولائت کا شہرہ سُن کر اس نے عنایت خاں آشنا کو بھیجا کہ سرمد سے ملے اور اس کی کشف و کرامات کا حال معلوم کرے۔ عنایت خاں نے وہاں برہنگی کے سوا

کچھ نہ دیکھا اور واپس آ کر یہ شعر پڑھا ؎

بر سرمد برہنہ کرامات تہمت است
کشفے کہ ظاہر است از کشف عورت است

۱۶۵۸ء میں عالمگیر اورنگ نشین ہوا اور معاملاتِ مُلکی کو شرع کے قواعد پر ترتیب دینا شروع کیا۔ اس کے نزدیک سرمد کی برہنگی خلافِ شرع اور لائقِ تعزیر تھی چنانچہ اس نے ملا عبدالقوی کو بھیجا کہ سرمد کو کپڑے پہننے کی تاکید کرے۔ ملا نے سرمد کو بلا بھیجا اور پوچھا کہ تم برہنہ و عریاں کیوں رہتے ہو[1]۔ سرمد پتا نہیں اس وقت کس لہر میں تھا۔ پکار اٹھا۔ کیا کروں، شیطان قوی است اور ساتھ ہی رباعی پڑھی ۔

خوش بالائے کردہ چنیں پست مرا	چشمے بہ دو جام بردہ از دست مرا
او در بغلِ من است و من در طلبش	دزدے عجبے برہنہ کردہ است مرا

ملا قوی کو شیطان قوی است کا فقرہ خاص طور پر کڑوا معلوم ہوا ہوگا لیکن فقط برہنگی وجہِ قتل نہ ہو سکتی تھی۔ اس لیے سرمد کی فردِ جرم میں اور بھی اضافہ کیا گیا۔ قتل کا ایک بہانہ ذیل کی رباعی تھی، جس کے متعلق کہا گیا کہ اس سے معراج کا انکار ثابت ہوتا ہے۔ رباعی

آں کس کہ سرِ حقیقتش باور شُد	خود پہن تر از سپہر پہناور شُد
ملا گوید کہ بر فلک شد احمدؐ	سرمد گوید فلک بہ احمدؐ در شُد

معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کی محتاط طبیعت نے اسے بھی کافی نہ سمجھا اور علماء سے کہا کہ سرمد سے کہا جائے کہ کلمہ طیبہ پڑھے۔ اسے معلوم تھا کہ سرمد کی عادت ہے کہ جب وہ کلمہ طیبہ پڑھتا ہے تو لا الٰہ سے آگے نہیں بڑھتا۔ چنانچہ جب علماء نے سرمد سے کلمہ طیبہ پڑھنے کے لیے کہا تو اس نے لا الٰہ سے زیادہ نہ پڑھا کہ کلمہ نفی ہے۔ اس پر علماء نے اعتراض شروع کیا تو سرمد نے کہا کہ ابھی تک میں نفی میں مستغرق ہوں۔ مرتبہ اثبات تک

---

[1] دبستانِ مذاہب میں لکھا ہے کہ سرمد کہتا تھا کہ یہودی مذہب میں برہنگی عیب نہیں اور حضرت اشعیا بھی اخیر عمر میں برہنہ رہتے تھے۔

نہیں پہنچا۔ جب پہنچوں گا تو الا اللہ بھی کہوں گا۔ علما نے فتوے دیا کہ فقط لا الٰہ کہنا کفر ہے۔ اگر سرمد توبہ کرے تو ٹھیک ورنہ واجب القتل۔ سرمد نے توبہ نہ کی۔ چنانچہ دوسرے دن سرمد کو قتل کے لیے جامع مسجد کے سامنے لے گئے۔ کہتے ہیں کہ قتل کے وقت سرمد بڑا ہشاش بشاش تھا۔ جلاد سامنے آیا تو اسے مسکرا کر کہا "فدائے تو شوم' بیا بیا کہ بہر صورتے کہ مے آئی۔ من ترا خوب مے شناسم" یہ کہا اور ذیل کا شعر پڑھ کر تلوار کے نیچے گردن رکھ دی ؎

شورے شد و از خواب عدم دیدہ کشودیم

دیدیم کہ باقی است شب فتنہ غنودیم

مآثر الامرا میں سرمد کے اسباب قتل کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ اگر سچ پوچھا جائے تو قتل کا اصل سبب دارا شکوہ کی مصاحبت تھی۔ ورنہ سرمد جیسے برہنہ مجذوب اور آزادانہ گفتگو کرنے والے ہر گلی کوچہ میں پھرتے ہیں اور کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا۔ اس دور کا ایک اور تذکرہ نگار لکھتا ہے۔

گویند کہ او با دارا شکوہ نیز سرے داشت و اکثر اوقات نیز بما تم عالمگیر مشغوف بود۔ لہٰذا بقتل رسید۔ واللہ اعلم بحقیقۃ حال۔

مولانا ابوالکلام آزاد بھی اسی خیال کی تائید کر کے لکھتے ہیں:۔

"ایشیا میں ہمیشہ سے پالیٹکس مذہب کی آڑ میں رہا ہے اور ہزاروں خونریزیاں جو پولیٹکل اسباب سے ہوئی ہیں۔ انھیں مذہب کی چادر اڑھا کر چھپایا گیا ہے۔"

سرخوش اپنے تذکرے میں لکھتا ہے کہ ایک دن میں اور ناصر علی سرہندی اور مرزا عبدالقادر بیدل جامع مسجد دہلی میں حوض کے کنارے بیٹھ کر شعر خوانی کر رہے تھے کہ سرمد آیا ہمیں دیکھ کر مسکرایا اور یہ شعر پڑھا ؎

عمریست کہ افسانۂ منصور کہن شد

من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را

چنانچہ اس کے جلد ہی بعد قتل ہوا!

سرمد کی کئی پُر لطف رباعیات مختلف تذکروں میں ملتی ہیں۔

رباعی

سرمد غم عشق بُوالہوس را نہ دہند | سوزِ دلِ پروانہ مگس را نہ دہند
عُمرے باید کہ یار آید بکنار | ایں دولتِ سرمد ہمہ کس را نہ دہند

رباعی

سرمد گلہ اختصار مے باید کرد | یک کار ازیں دو کار مے باید کرد
یا تن برضائے یار مے باید داد | یا قطع نظر زیار مے باید کرد

رباعی

سرمد تو حدیثِ کعبہ و دیر مکن | در کوچہ رشک چو گمرہاں سیر مکن
رو راہروی ز شیطاں آموز | یک قبلہ گزیں و سجدۂ غیر مکن

دبستانِ مذاہب

دبستانِ مذاہب جس پر ہم نے سرمد والے مضمون کی بُنیاد رکھی ہے۔ اس زمانے کی ایک معرکۃ الآرا تصنیف ہے۔ اس کے مصنف کے بہت کم حالات معلوم ہیں یقین سے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کون تھا۔ کب پیدا ہُوا اور کب اس دارِ فانی سے چل بسا، لیکن اس کی تصنیف سے اس کے خیالات اور رجحانِ طبع کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ مذہبی معاملات میں صلح کُل اور آزاد خیال تھا اور اسے دوسروں کے عقائد و اطوار جاننے کا غیر معمولی اشتیاق تھا۔

اس نے دبستانِ مذاہب میں ایشیا کے تمام مشہور مذاہب کے خیالات اور عقائد جمع کیے ہیں، لیکن البیرونی کی طرح کوشش کی ہے کہ کوئی ایسی بات نہ لکھی جائے، جس کی مذہب متعلقہ کے ماننے والے خود تصدیق نہ کریں۔ نصف کے قریب کتاب پارسی مذہب کے عقائد اور مختلف پارسی فرقوں کے حالات پر مشتمل ہے۔ قریباً ایک چوتھائی کتاب میں مختلف ہندو فرقوں کے حالات ہیں۔ ایک نہایت دلچسپ باب نانک پنتھیوں یعنی سکھوں کے حالات کے متعلق ہے۔ کتاب کا مصنف گورو ہرگوبند کے جاننے والوں میں سے تھا۔ اس لیے اس نے ذاتی واقفیت کی بنا پر ایسے واقعات درج کیے ہیں جو

معاصرانہ تواریخی کتب میں عنقا ہیں اور جن سے سکھوں کی ابتدائی تنظیمی کوششوں پر خوب روشنی پڑتی ہے۔

ایک باب میں ایسے متفرق فرقوں کے حالات درج ہیں، جن کا نہ ہندو مذہب اور نہ اسلام سے کوئی خاص تعلق تھا اور جن کے عقائد دیکھنے سے خیال ہوتا ہے کہ عوام بالخصوص خوش اعتقاد اور صوفی نما عوام کے خیالات میں اس وقت کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ سب سے عبرت آموز باب بیراگیوں کے متعلق ہے۔ دبستان میں لکھا ہے کہ ان میں مسلمان بھی داخل تھے اور وہ وشنو کی پرستش کرتے تھے۔ "از ہندو و مسلم وغیرہم ہر کس خواہد بکیش ایشاں درآید۔ مانع نشوند۔ در پذیرند و گویند مسلماناں نیز بشن را مے پرستند۔ چہ بسم اللہ ایں معنی بدارد یعنی بشن و بسم، بشن را گویند۔" جو مسلمان بیراگیوں میں شامل ہوئے تھے وہ محض جاہل عوام الناس نہ تھے "جمعے کثیر از مسلماناں بکیش ایشاں درر فتہ اند۔ مانند مرزا صالح و مرزا حیدر کہ از نجبائے مسلمانند و بیراگی شدند۔"

کتاب کے ربع آخر میں اختصار سے عیسائی، یہودی۔ بودھ مذاہب اور مختلف مسلمان فرقوں (مثلاً سُنّی، شیعہ، صادقیہ (پیروانِ مسیلمہ کذاب) واحدیہ۔ روشنیہ۔ (پیروانِ دینِ الٰہی) کے خیالات درج کیے ہیں۔ دینِ الٰہی کے متعلق جو واقعات لکھے ہیں، وہ زیادہ تر بدایونی سے ماخوذ ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں مختلف مذہبوں اور فرقوں کے درمیان ایک مباحثہ درج کیا ہے، جو خیالی ہے اور مصنف کے اپنے دماغ کی تخلیق۔ اس مباحثے کے دوران میں شیعہ، سُنّی، یہودی، نصرانی، اور ہندو عقائد پر بہت کڑے اعتراضات ہوتے ہیں اور سب مذاہبِ متداول کے ترجمان لاجواب ہو جاتے ہیں۔ اور حکیم فلسفی، جو حضرت عقل علیہ السلام کا معتقد ہے۔ سب پر غالب آجاتا ہے۔ اس بحث سے خیال ہوتا ہے کہ مصنف کسی مذہب سے وابستہ نہ تھا اور ایک آزاد خیال صوفی تھا۔ ایک مستقل باب میں اس نے ارشادات قرآنی اور اہم احادیث کی تاویل کر کے انھیں عقائدِ حکما کے مطابق ثابت کیا ہے۔

آخری باب میں چند ایسے بزرگوں کے حالات ہیں، جن سے مصنف کی ملاقات

الہامی تھی۔ سب سے پہلے دارا شکوہ کے مُرشد حضرت مُلّا شاہ بدخشی کا ذکر ہے اور اس سلسلے میں دارا شکوہ کو حضرت محی الدین محمدؒ۔ خداوندِ مکان و مکیں و صاحب زمان و زمیں" کا خطاب دیا ہے۔ جہاں آرا بیگم کا ذکر بھی بڑے احترام سے کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ حضرت مُلّا شاہ کی غائبانہ مرید تھی۔ "دو دیگر مریم روزگار۔ فاطمۂ زماں و اعصار۔ عفت عنصر۔ عصمت پیکر۔ جہاں آرا بیگم بنت ابوالمظفر شہاب الدین محمد صاحبقران ثانی امیر المسلمین شاہ جہاں بادشاہ غازی غائبانہ بفرمان حضرت مُلّا شاہ بحضور دل رُو بسلوک آوردہ و کامیاب شناخت تام گشت" اپنی نسبت ایک جگہ لکھتا ہے۔ "بریں فقیر از برکت شیخ خود غوث الآفاق، اُستاد اہل اللہ، عارف باللہ حضرت مولانا شاہ (مُلّا شاہ) سلمہ اللہ و ابقاہ، ہمچو آفتاب روشن گشتہ" اس سے خیال ہوتا ہے کہ وہ بھی مُلّا شاہ کا مُرید تھا اور آزاد خیال صوفیوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتا تھا جو دارا شکوہ اور اس کے مرشد مُلّا شاہ کے گرد جمع ہو گئے تھے۔

شیخ محب اللہ الٰہ آبادی

اب تک ہم نے اس باب میں جن بزرگوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ باقاعدہ قادریہ سلسلے سے وابستہ تھے لیکن ان سے باہر بھی کئی بزرگ تھے جو شاید اس سلسلے میں منسلک نہ تھے، لیکن جن کے خیالات میں مُلّا شاہ اور دارا شکوہ کی آزاد خیالی اور وسعت مشرب کی جھلک ملتی ہے۔

ان میں سے ایک خاص رنگ اور شان کے بزرگ شیخ محب اللہ الٰہ آبادی تھے، جو علوم ظاہری و باطنی کے جامع تھے اور جن کی نسبت تذکرۂ علمائے ہند میں یہاں تک لکھا ہے کہ "تحقیقات و تدقیقاتش در علم تصوف بدرجہ اجتہاد رسیدہ بلکہ مے رسد کہ شیخ محی الدین ابن العربی را شیخ اکبر و دوسے را شیخ کبیر گویند" دارا شکوہ آپ کا بڑا مداح تھا۔ بلکہ وہ ایک خط میں آپ کو لکھتا ہے کہ الٰہ آباد کی گورنری سے مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ آپ سے ربط ضبط ہو سکے گا۔

ایک مرتبہ دارا شکوہ نے آپ سے اُس مسئلے پر استفسار کیا جو عہدِ اکبری سے ہندوستان میں اسلامی سیاسیات کا ایک اہم مسئلہ بن گیا تھا۔ یعنی آیا حکومت کو

تمام رعایا کا مساوی خیال رکھنا چاہیے یا مومن اور کافر میں تمیز کرنی چاہیے۔ اس کا آپ نے جواب لکھا، اس سے آپ کے طبعی رجحانات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے اور یہ وہی جواب تھا جس سے ابوالفضل کے رقعات اور اکبر کے فرامین پڑھنے والے بخوبی واقف ہیں فرماتے ہیں :-

"حق آنست کہ اندیشۂ رفاہیت خلق دامن گیر خاطر حکام باشد چہ مومن و چہ کافر کہ خلق خدا بیدائش خداست و سید ایں مقام کہ صاحب آں مقام ہر کسے از صالح و فاجر و مومن و کافر رحم کند۔ رسول خداست صلی اللہ علیہ وسلم۔ چنانکہ بیان یافتہ در فتوحات و وارد است در قرآن وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ بر سبیل عموم است مثل رب العالمین غالباً افاضۂ رحمت بہ ہر کسے بحسب مرتبہ آں باشد۔"

آپ کی تصانیف زیادہ تر علم تصوف میں یا خواص کے عقائد کے متعلق ہیں۔ شرح فصوص (عربی) شرح فصوص (فارسی) مغالیط عامہ۔ سر الخواص۔ عبادت الخواص طرق الخواص۔ عبادت اخص الخواص۔ رسالہ وجود مطلق۔ ان کے علاوہ انھوں نے رسالہ تسویہ کے نام سے ایک مختصر کتاب لکھی ہے، جس پر عہد عالمگیری میں ایک بڑا ہنگامہ برپا ہوا تھا۔ اس میں انھوں نے وحی کی نسبت ایسے خیالات کا اظہار کیا تھا جو سرسید کے ہم خیالوں کو تو عجیب معلوم نہ ہوں لیکن عام اسلامی اعتقاد کے صریح برخلاف ہیں۔ اس پر علما نے اعتراض کیا اور عہد عالمگیری میں جب مصنف کی وفات ہو چکی تھی۔ بادشاہ سے استدعا کی کہ اس رسالے کی تمام نقلیں جلا دی جائیں اور جو لوگ اس کے قائل ہوں ان پر حد شرعی نافذ کی جائے۔ چنانچہ بادشاہ نے حکم دیا کہ ممالک محروسہ کے تمام درویش حاضر کیے جائیں (کہ درویشان قلم و پادشاہ را در معسکر سلطانی احضار نمایند) اور رسالے کی تلاش شروع ہوئی۔ بالآخر پہلا حکم تو منسوخ ہوا لیکن رسالے کی جو نقلیں دستیاب ہوئیں انھیں تلف کر دیا گیا۔

شیخ محب اللہ الہ آبادی کی وفات ۱۶۴۸ء میں ہوئی۔ ان کے تلامذہ و خلفا میں قاضی گھاسی کا نام زیادہ مشہور ہے، جن سے علمائے فرنگی محل لکھنؤ نے میراث اعلیٰ

ملا قطب الدین شہید سہالوی نے فیض حاصل کیا، جسے ان کے بیٹوں نے تمام ہندوستان میں عام کیا۔

شہزادہ دارا شکوہ قادری

عہدِ شاہجہانی میں آزاد خیال صوفیوں کا جو جمگھٹا ہو گیا تھا، اس میں بعض بڑی دلچسپ ہستیاں شامل تھیں، لیکن ان میں جو کشش ایک مورخ کے لیے دارا شکوہ میں ہے، کسی اور میں نہیں۔ اور وہ صرف اس لیے نہیں کہ دارا بادشاہِ وقت کا بیٹا تھا اور اس کا انجام بڑا عبرتناک ہوا، بلکہ اس لیے بھی کہ اس کا علمی مرتبہ خاصہ بلند تھا۔ اور اس کی تصانیف میں جو وضاحت اور باقاعدگی ہے، وہ عام صوفیانہ ادب کی بھول بھلیاں میں شاذ و نادر ہی نظر آتی ہیں۔

دارا شکوہ شاہجہان کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ ایک مدت تک شاہجہان کے ہاں بیٹیاں ہی بیٹیاں پیدا ہوتی رہیں اور اسے اولادِ نرینہ کی بڑی خواہش تھی۔ چنانچہ اس نے خواجہ معین الدین اجمیری کی درگاہِ عالیہ پر حاضر ہو کر دعا کی اور نذر و نیاز مانی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ۲۰ مارچ ۱۶۱۵ء کو دارا شکوہ بمقام اجمیر پیدا ہوا۔

جو اولاد بڑی خواہش کے بعد حاصل ہو، اس سے خاص لگاؤ ہو جاتا ہے۔ کچھ اس وجہ سے اور شاید کچھ اس لیے کہ بڑے بیٹے کو واضح ترجیح دینے سے تخت و تاج کی وراثت بغیر کسی خانہ جنگی کے طے پا سکے۔ شاہجہان "مہین پور خلافت" کے ساتھ امتیازی سلوک کرتا تھا۔ اُسے "شاہِ بلند اقبال" کا خطاب دے رکھا تھا۔ اس کے مراتب و مناصب بھی اپنے بھائیوں سے بدرجہا بلند تھے اور شاہجہان اسے دور دراز صوبوں میں بھیجنے کی بجائے زیادہ تر اپنے پاس دار الخلافہ میں ہی رکھتا۔

شاہجہان کی یہ کورانہ محبت دارا شکوہ کو دنیوی لحاظ سے بہت مہنگی پڑی کیونکہ ایک تو اس لاڈ پیار سے وہ زیادہ خود سر اور ضدی ہو گیا اور دوسرے اسے عملی نظم و نسق کا وہ سلیقہ حاصل نہ ہوا جو اورنگ زیب نے گجرات، دکن اور دوسرے علاقوں کی صوبیداری میں حاصل کیا۔ لیکن علمی اور روحانی دلچسپیوں کے لیے اسے دار الخلافہ میں بہت وقت

ملتا رہا۔ اور اس نے اس سے پُورا پورا فائدہ اٹھایا۔

اس کی رُوحانی نشوونما کی بسم اللہ شاید اُس دن ہوئی۔ جب ۲۵ فروری ۱۶۳۴ء کو شاہجہاں اسے لے کر حضرت میاں میر کی خدمت میں حاضر ہُوا اور ان سے التجا کی کہ وہ اس کی صحت کے لیے دُعا کریں۔ اس وقت دارا کی عمر اُنیس سال کی تھی اور اگرچہ اس کے عقائد اور تاثرات کا اس وقت کوئی ذکر نہیں ملتا، لیکن قرینِ قیاس ہے کہ صحت پا جانے کے بعد جسے وہ حضرت کی کرامات پر محمول کرتا ہے، اس کی عقیدت اہل اللہ سے ضرور بڑھ گئی ہوگی۔ اس کے دس مہینے بعد جب ستمبر ۱۶۳۴ء کو شاہجہان حضرت میاں میر کی خدمت میں حاضر ہُوا تو دارا شکوہ اس کے ہمراہ تھا اور اس وقت دارا کی عقیدت مندی کی یہ حالت تھی کہ وہ حضرت کے مکان کی دُوسری منزل میں جہاں حضرت کا قیام تھا، برہنہ پا گیا۔ اور جو لونگ وہ چبا چبا کر پھینکتے جاتے تھے۔ انھیں اُٹھا کر کھاتا رہا۔ اس کے بعد جب بادشاہ چلا گیا تو دارا شکوہ تنہا شیخ کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ ان کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ وہ بھی دیر تک اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے رہے اور اس کے حق میں دعا کی۔

اس کے اگلے سال حضرت میاں میر کی تو وفات ہوگئی، لیکن جو چنگاری دارا کے دل میں جاگی تھی، وہ برابر سلگتی رہی۔ وہ کہتا ہے کہ حضرت کی وفات کے بعد انھوں نے غائبانہ طور پر مجھے مشاہدہ اور مراقبہ سکھایا اور ان کی وجہ سے مجھے لیلۃ القدر کی زیارت ہوئی۔

دارا شکوہ کی پہلی تالیف سفینۃ الاولیا ہے۔ جسے خاتمہ کتاب کے مطابق اس نے ۱۱ جنوری ۱۶۴۰ء کو یعنی پچیس سال کی عمر میں ختم کیا۔ غالباً اس تاریخ کے بعد بھی کتاب میں کمی بیشی ہوتی رہی۔ کیونکہ حضرت میاں میر کے ذکر میں وہ یہاں کہتا ہے "جمل پیش ازیں رسالۂ مسمّٰی بہ سکینۃ الاولیا در احوال و اوضاع آنحضرت پیر و مریدان ایشاں مفصل نوشتہ بود۔ دریں کتاب ہمیں قدر اکتفا نمود"۔ سفینۃ الاولیا میں دُنیائے اسلام کے ۴۱۱ بزرگانِ دین کے مختصر حالات ہیں۔ یہ تذکرہ نفحات الانس اور دوسرے قدیمی تذکروں سے ماخوذ ہے اور عام طور پر اسے کوئی امتیازی حیثیت حاصل نہیں، لیکن کہیں کہیں دارا شکوہ نے اپنے

تاثرات بھی درج کیے ہیں اور وہ دلچسپ ہیں۔ اس کتاب کے شروع میں دارا نے اپنے آپ کو "حنفی قادری" لکھا ہے اور صوفی سلسلوں کا ذکر کرتے ہوئے قادریہ سلسلے کو پہلی جگہ دی ہے، لیکن یہ کتاب صحیح اسلامی وسیع القلبی کے ساتھ لکھی گئی ہے اور یہ امر قابل ذکر ہے کہ اگرچہ قلت صفحات کی بنا پر مؤلف نے بہت تھوڑے ہندستانی مشائخ کا ذکر کیا ہے، لیکن حضرت مجدد الف ثانی (حضرت احمد کابلی و سرہندی قدس سرہٗ) کا ذکر اہتمام سے کیا ہے اور ان کے مخالف ان کی نسبت جو الزام لگاتے تھے۔ ان کی بالتفصیل تردید کی ہے۔

جس سال سفینۃ الاولیا ختم ہوئی۔ اسی سال ۱۲ را پریل کو دارا شکوہ نے ملا شاہ بدخشی کے ہاتھ پر بیعت کی اور اس کے تین سال بعد سکینۃ الاولیا لکھی۔ جس میں حضرت میاں میر۔ ملا شاہ بدخشی اور حضرت میاں میر کے دوسرے خلفا کے حالات ہیں۔ اس دوران میں دارا شکوہ نے شاعری شروع کر دی تھی اور قادری تخلص اختیار کیا۔ چنانچہ جب اس نے ۱۶۴۶ء میں ایک مختصر سا صوفیانہ رسالہ حق نما کے نام سے لکھا تو اس کے خاتمے میں کہا ہے

ایں رسالہ حق نما باشد تمام	در ہزار و پنجہ و شش شد تمام
ہست از قادر مداں از قادری	آنچہ ما گفتیم فافہم والسلام

معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں لوگوں نے دارا کے بعض اقوال پر اعتراض شروع کر دیے تھے۔ چنانچہ دارا نے ان کا جواب دینے کے لیے اور اس امر کی تائید میں کہ جو الفاظ حالتِ جذب میں کہے جائیں وہ قابلِ گرفت نہیں ہوتے۔ رسول کریمؐ اور اصحاب کبارؓ کے بعض صحیح اور موضوع اقوال اور اپنے زمانے اور پہلے کے مشہور مشائخ کے ایسے فقرے جو حالتِ جذب میں کہے گئے تھے شطحیات یا حسنات العارفین (۱۰۶۲ھ) میں جمع کیے اس میں وہ حمد و نعت کے بعد لکھتا ہے :-

بے غم و اندوہ محمدؐ دارا شکوہ کہ اب ہجری کا ایک ہزار باسٹھ اور فقیر کی پیدائش کا اڑتیسواں سال ہے۔ دل بالکل اہل سلوک اور طریقت کی کتابوں سے پھر گیا تھا اور

سوائے محض توحید کے کچھ اور منظور نہ تھا اور وجد اور ذوق کی رُو سے اکثر کلمات بلند حقائق و معارف نکلتے تھے اور پست فطرت کم ہمت والے زاہد خشک بے علاقہ کوتاہ بینی سے طعن اور تکفیر اور انکار کے درپے رہتے تھے۔ اس واسطے اس فقیر کے دل میں آیا کہ جو کچھ بڑے بڑے موحدوں اور عارفوں سے کہ جو کچھ اس وقت کی مخلوقات سے سب سے بہتر ہیں اور معاملات میں راستباز ہیں اور ان سے سخنانِ بلند صادر ہوتے ہیں، جن کو تشابہات اور شطحیات کہتے ہیں اور اس قوم کے رسالوں اور کتابوں میں متفرق موجود ہیں۔ یا وہ باتیں جو آج کل کے شخصوں سے خود سُنی ہیں۔ جمع کرے تاکہ حجتِ قاطعہ ہو۔ ان لوگوں پر اور دلیل بلند ہو ان شخصوں پر جو عیسےٰ نفس دجال اور موسےٰ صفت فرعون اور محمدی مشرب ابوجہل ہیں۔ [ترجمہ]

اس دوران میں دارا کے رُوحانی تجسس نے ایک اور کروٹ لی۔ اب تک اس کی تلاش و تحقیق مسلمان صوفیہ تک محدود تھی، لیکن مُلا شاہ اور دُوسرے مسلمان مشائخ جن کا طریقہ دارا نے اختیار کیا تھا، ان کے وحدت الوجودی مشرب اور ہندو ویدانت میں کوئی بُعد نہ تھا اور فلسفۂ وحدت الوجود سے وحدت ادیان کے تصوّر تک پہنچنے میں کوئی ناقابلِ عبور مشکل نہ تھی۔ چنانچہ دارا نے دوسرے مذاہب بالخصوص ہندو ویدانت میں چھان بین شروع کی، جس کا پہلا نتیجہ مجمع البحرین کی صورت میں ۱۰۶۵ھ ۵۵-۱۶۵۴ء میں نمودار ہوا۔ اس میں وہ لکھتا ہے:۔

"میگوید فقیر بے اندوہ، محمد دارا شکوہ کہ بعد از دریافت حقیقت الحقائق و تحقیق رموز و دقائق مذہب حق صوفیہ و فائز گشتن بایں عطیۂ عظمیٰ دراں شد کہ درک کنہ مشرب موحدان ہند و محققان ایں قوم قدیم نماید۔ با بعضے از کاملان ایشاں کہ بہ نہایت ریاضت و ادراک و فہمیدگی و غایت تصوف و خدایابی و سنجیدگی رسیدہ بودند، مکرر صحبت ہا داشتہ و گفتگو نمودہ جز اختلافات لفظی دریافت و شناخت تفاوتے ندیدہ۔ ازیں جہت سخنان فریقین را بہم تطبیق دادہ و بعضے سخنان کہ طالبینِ حق را دانستن آن ناگزیر و سود مند است، فراہم آوردہ۔"

چونکہ یہ کتاب مسلمان صوفیوں اور ہندو یوگیوں کے عقائد کا مجموعہ ہے۔ اس لیے اس کا نام مجمع البحرین رکھا گیا۔ ایک مختصر سا رسالہ ہے، جس میں عناصر۔ حواس۔ صفاتِ الٰہی۔ نبوّت۔ ولایت اور عالمِ برزخ وغیرہ کے متعلق تصوّف اور یوگ کے خیالات جمع کیے ہیں اور انھیں ایک دُوسرے کے مطابق ثابت کیا ہے۔ عہدِ عالمگیری میں غالباً اسی رسالے کی تالیف پر "کفر و اسلام را برادر توام خوانده" دارا کو ملحد اور واجب القتل قرار دیا گیا لیکن دارا کے علاوہ دوسرے کئی صوفیوں نے وقتاً فوقتاً تصوّف اور یوگ کی ہم آہنگی کے متعلق خیالات کا اظہار کیا ہے۔

اب دارا نے ویدانتیوں اور "ہندو موحدین" کے خیالات کو زیادہ محنت سے فارسی زبان میں منتقل کرانا شروع کیا۔ اس سلسلے میں ایک مختصر سا رسالہ "مکالمہ دارا شکوہ و بابا لال" کے نام سے دارا شکوہ کے میر منشی چندر بھان نے مرتب کیا، جس میں دارا کے سوالات اور بابا لال کے جوابات جمع ہیں۔ پھر ۱۰۶۶ھ ۱۶۵۵-۵۶ء میں دارا کے ایما پر جوگ بششٹ کا آسان فارسی میں ترجمہ ہُوا۔ اس میں شری رام چندر جی کے گورو بششٹ کے ارشادات جمع ہیں۔ ان دونوں سے بھی اہم کتاب سرِّ اکبر ہے۔ جس میں دارا شکوہ نے بنارس کے پنڈتوں کی مدد سے اپنشدوں کے قریباً پچاس الواب کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ ان کے علاوہ کہا جاتا ہے کہ دارا شکوہ نے بھاگوت گیتا کا بھی فارسی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔

اس زمانے میں دارا شکوہ مسلمان صوفیوں اور ہندو یوگیوں کی اس جماعت کا سرگروہ ہو گیا تھا جو تصوّف اور ویدانت میں دونوں قوموں کے لیے ایک مشترک روحانی مطمحِ نظر تلاش کر رہی تھی۔ ہم لکھ چکے ہیں کہ سکندر لودھی کے زمانے میں ہندوؤں نے فارسی سیکھنی شروع کی۔ مغلیہ حکومت کے تابع یہ سلسلہ وسیع ہو گیا۔ ادھر اکبر کے عہدِ حکومت میں بھاگوت گیتا اور سنسکرت کی کئی دُوسری کتابوں کا فارسی میں ترجمہ ہُوا اور مسلمانوں کو ہندو عالموں اور اہلِ فکر سے ربط و ضبط کے زیادہ مواقع میسّر آئے۔ ان سب اثرات کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ہندو ویدانتی دیکھنے لگے کہ مثنوی مولانا روم اور اسلامی تصوّف کی

کتابوں میں کئی ایسی باتیں ہیں جنھیں وہ اپنا کہہ سکتے ہیں اور بعض مسلمان بھی سمجھنے لگے کہ ہندوؤں میں فقط بُت پرست اور دیوتاؤں سے انسانی اوصاف اور عام بشری خصائص منسوب کرنے والے لوگ نہیں، بلکہ کئی پاکیزہ خیال، بے حرص اور بے ریا تارکانِ دُنیا بھی ہیں۔ جہانگیر کے زمانے میں اکبر کی مذہبی بدعنوانیوں کا خاتمہ ہوگیا تھا، لیکن اس رُوحانی مفاہمت کا سلسلہ بند نہ ہُوا۔ جہانگیر نے کئی موقعوں پر اسلامی نقطۂ نظر کی جرأت و استقلال سے پیروی کی، لیکن وہ بھی ہندو جوگیوں کا معتقد تھا۔ اور گسائیں جدروپ سے اس کی ملاقاتوں کا حال تزکِ جہانگیری میں کئی جگہ درج ہے۔

شاہجہاں، جہانگیر کی طرح ہندوستنیاسیوں کا قائل نہ تھا، لیکن اس کے عہدِ حکومت میں یہ رجحانات ختم نہ ہوئے اور اس کے آخری ایام میں تو دارا کی شرکت سے انھیں بڑی تقویت ملی۔ مسلمانوں میں اس رُوحانی مفاہمت کے ترجمان خود دارا شکوہ۔ ملّا شاہ۔ سرمد۔ دبستانِ مذاہب کا مصنف اور دوسرے کئی آزاد خیال تھے، جو دارا شکوہ کے گرد جمع ہوگئے تھے۔ لیکن ان کے علاوہ بھی کئی مسلمان تھے، جو ہندو سادھوؤں کی روحانیت سے متاثر ہوتے تھے۔ دبستان میں مشہور فارسی شاعر ملّا شیدا کی رائے ایک گیانی کی نسبت درج ہے:۔

> ملّا شیدائے ہندی کہ از شعرائے نامدار و فصحائے عصر بود، نوبتے با راقم بخانۂ گیانی زیتی رفت و با ایشاں صحبت داشت۔ مریدان او دیدہ و وضع اہل خانہ را مشاہدہ نمودہ بہ شگفتی فرو ماند و گفت۔ تمام عمرِ من در خدمتِ وارستگاں گزشت۔ چشمِ من چنیں آزادے ندید۔ دگوشم چیزے از انساں وارستہ نشنود"

ہندوؤں میں بھی اس رُوحانی آمیزش کو ترقی دینے والے کئی تھے۔ ایک چندر بھان برہمن تھا، جو دارا شکوہ کا منشی[1] اور فارسی میں پہلا صاحبِ دیوان ہندو شاعر تھا۔ اس کا

[1] دارا شکوہ کی وفات کے بعد اس کے رفقاء کے ساتھ جس طرح اپنے تئیں اورنگ زیب سے وابستہ کرنا چاہا۔ وہ تاریخ کا ایک عبرتناک باب ہے۔ ہم ملّا شاہ کی وہ رباعی نقل کر چکے ہیں، جو اس نے اورنگ زیب کی تخت نشینی پر لکھی۔ برہمن نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا۔ وہ اخیر عمر تک [باقی اگلے صفحے پر]

یہ شعر کئی تذکروں میں نقل ہوا ہے ؎

مرا دلے است بکفر آشنا کہ چندیں بار
بکعبہ بُردم و بازش برہمن آوردم

عمل صالح میں جو عہدِ شاہجہانی کی مستند تاریخ ہے، اس کی نسبت لکھا ہے "ہر چند بصورت ہندو است، لیکن دم در اسلام مے زند" ڈاکٹر سید محمد عبداللہ ایک محققانہ مضمون میں اس کے کلام کی نسبت لکھتے ہیں :-

"دیوان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ برہمن فارسی و اسلامی تخیل میں ڈوبا ہوا ہے۔ عشق کی کیفیات، محبت کی صعوبتیں، تصوف کی منزلیں، وحدت الوجود کے مراحل، براہمن کے کلام میں اسی طرح پائے جاتے ہیں جس طرح باقی (مسلمان؟) شعرا کے کلام میں۔"

اسی زمانے کا ایک اور ہندو شاعر تھا۔ بھوپت رائے نام، بیغم تخلص، بیراگی لقب، شاعری میں خوشگو کا شاگرد اور طریقت میں شیخ الشیوخ محمد صادق اور نارائن بیراگی کا مرید تھا۔ اس کی نسبت سید عبداللہ لکھتے ہیں، "بیغم کی وفات ۱۱۳۲ھ/۱۷۱۹ء میں واقع ہوئی تھی۔ اس لیے یہ امر قرینِ قیاس ہے کہ بیغم نے ملا شاہ اور دارا شکوہ کے زمانے کی کچھ جھلک ضرور پائی ہوگی۔ دارا شکوہ کا ماحول کچھ اس قدر صوفیانہ اور فلسفیانہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ہندو منشیوں سے یہ امر ثابت ہے کہ انھوں نے ترکِ دنیا کو احساسِ وجود اور علتِ زندگی کی مصیبت کے ختم کرنے کا واحد ذریعہ سمجھا۔ منشی چندر بھان برہمن نے دارا شکوہ کی وفات کے بعد عزلت گزینی اختیار کر لی۔ منشی ولی رام ولی نے بھی یہی راستا اختیار کیا اور کلفتِ حیات کو ترکِ آرزو سے منایا۔ اگرچہ بیغم بیراگی کا

[بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ]

اورنگ زیب کا ملازم رہا اور اس نے اورنگ زیب کی تعریف میں بعض بڑے پُرزور اشعار لکھے مثلاً ؎

شاہا عالم مطیعِ فرمانِ تو باد — لبریز ادائے شکرِ احسانِ تو باد
چوں ذاتِ تو خلق را نگہباں باشد — ہر جا باشی خدا نگہبانِ تو باد

داراشکوہ کے دربار سے کوئی خاص تعلق معلوم نہیں ہوتا تاہم نارائن چند کی محبت میں وہ بھی از خود رفتہ ہوگیا اور پھر اس نگری کی راہ لی، جہاں داراشکوہ کا مقام تھا۔ نارائن بیراگی اور شیخ محمد صادق کے دوگونہ مواعظ سے اس کا قلب مجمع البحرین بن گیا تھا۔ چنانچہ مثنوی میں جابجا ان دورنگی موجوں کا سُراغ ملتا ہے، جن کو اگر غور سے دیکھا جائے تو ان میں اسلامی اور ہندو تصوّف کا رنگ علٰحدہ علٰحدہ نظر آئے گا۔ اس زمانے میں مُلّاشاہ (المتوفی ۱۰۷۲ھ) بہت بڑے صُوفی اور عالم تھے۔ یہ میاں شاہ میر لاہوری کے شاگرد تھے اور انھوں نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ مثنوی بنگم میں مُصنّف نے خود حضرت مُلّاشاہ کا ذکر کیا ہے ؎

وہ چہ خوش فرمود مُلّاشاہ ما ۔۔۔ شاہ ما آں عارفِ آگاہ ما

سینِ انساں گر نبودے درمیاں ۔۔۔ اوّل و آخر نہ بودے غیر آں

بنگم کی مثنوی کی نسبت سیّد محمد عبداللہ لکھتے ہیں، "مثنوی بنگم کا مطالعہ بتاتا ہے کہ مولوی رومی بنگم بیراگی کے روحانی اُستاد تھے۔" مثنوی بنگم مولانائے روم کے خیالات کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ کتاب کی ترتیب، خیالات کی نوعیت، تصوّف کے ساتھ تفلسف کی جھلک سب باتیں اس حقیقتِ نفس الامری کو عالم آشکارا کر رہی ہیں کہ اگرچہ ہم نے مُلّاشاہ، نارائن بیراگی اور شیخ صادق قدس سرہ کی تصانیف اور فیوضِ صحبت کا اثر بنگم پر ثابت کیا ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنگم کا اصلی سرچشمۂ فیض اور سب سے بڑا منبع عرفان رومی تھا۔" اپنے دعوے کو طویل اقتباسات سے استوار کرنے کے بعد سیّد صاحب لکھتے ہیں "مثنوی بنگم کی ایک اور خصوصیت یہ ہے اس میں ویدانت اور اسلامی تصوّف کو تطبیق دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان ہر دو رُوحانی سلسلوں کے اتّصالی مقامات کو نہایت خوبی اور خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔ مثلاً تصوّر یا استغراق، بے ثباتیِ عالم۔ دُنیا کا ایک وہم اور افسانہ ہونا یا وحدۃ الوجود وغیرہ مسائلِ اسلامی اور ہندو تصوّف میں مشترک ہیں۔

ڈاکٹر سیّد محمد عبداللہ نے اپنے مضمون میں مثنوی بنگم کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل

بحث کی ہے اور اس سے طویل اقتباسات نقل کیے ہیں۔ ہم ان میں سے فقط دو اقتباسات نقل کرتے ہیں تاکہ ناظرین دیکھ سکیں کہ اس رُوحانی تحریک کے دَوران میں اسلامی خیالات اور زبان و بیان کس طرح ایک ہندو کے دل و دماغ کو رنگ رہے تھے۔ سنجیم ایک جگہ دہر کے متعلق کہتا ہے:-

دہر اسمِ اعظمِ اللہ ہست	جلوۂ انوارِ مہر و ماہ ہست
عارفان و عاقلان و عالماں	ساجدِ دہر اند جملہ بے گماں
جامعِ اسماست چوں اسمِ الٰہ	پس چہ می پرسی ز من اے دادخواہ
نغمہ ام در گوش کن اے مردِ راہ	لاتسب الدہر برخواں رمزِ شاہ
خود انا الدہر بگفتا در کلام	پس چہ می پرسی ز من اے ناتمام
من چو غیر از حق ندیدم در جہاں	پس چہ خوانم دہر را اے نورِ جاں

ایک اور جگہ شیخ شبلیؒ اور جنیدؒ کے درمیان ایک مکالمہ نظم کیا ہے۔ شبلی پوچھتے ہیں اصل علوم کیا ہے؟ جنیدؒ جواب دیتے ہیں ؎

ذاتِ اللہ ہست اصلِ ہر علوم	نیست صرف و نحو و نے طب و نجوم
اصل جملہ علمہا ذاتِ خداست	کز فروغش روشن ایں ارض و سماست

گفت دیگر چیست۔ گفتا غیر ازیں

نیست چیزے در زماں و در زمیں

ہندوؤں اور مسلمانوں کی رُوحانی آمیزش کی یہ کوششیں صرف فارسی زبان میں ہی فروغ نہ پا رہی تھیں بلکہ دارا شکوہ کے ہندو دوستوں نے سنسکرت میں بھی انھیں منتقل کیا۔ چنانچہ مجمع البحرین کا سمودر سنگم کے نام سے اسی زمانے میں ترجمہ ہُوا اور کئی دوسری صُوفیانہ کتب بھی اس زبان میں منتقل ہوئیں۔

علمی نقطۂ نظر سے دارا اور اس کے ہم خیال ہندو اور مسلمان صوفیہ کی کوششیں بڑی دلچسپ تھیں اور جو مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ پُورا اسلامی مذہب نہ سہی لیکن کم از کم اس کے بنیادی اصول ہی دوسرے مذہبوں میں اخذ ہو جائیں اور ان کی اسلام سے

بھر ٹک دُور ہو۔ وہ بھی ان کوششوں کو پسند کرتے ہوں گے، لیکن شخصی حکومتوں میں جو غلامانہ ذہنیت عوام میں داخل ہو جاتی ہے، اس کا نتیجہ اُن کوششوں کے حق میں جو بادشاہ یا کسی وارثِ تاج و تخت کے زیرِ سایہ شروع ہوں، بڑا بُرا ہوتا ہے۔ لوگ بادشاہ یا شہزادہ کی ہر جدت کی تعریف کرنے لگتے ہیں حتیٰ کہ انھیں اپنی بوالعجبیوں کا احساس نہیں رہتا۔ خوشامدی درباریوں کے زیرِ اثر اکبر جن قباحتوں کا مرتکب ہُوا تھا، ان کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔ دارا اکبر سے کہیں زیادہ باعلم تھا اور اس کے ہاتھ میں اختیار بھی کم تھا۔ اس لیے وہ ان انتہائی حماقتوں کا مرتکب نہیں ہُوا جو بدایونی اکبر سے منسوب کرتا ہے، لیکن وہ بھی سادہ لوح اور زود الاعتقاد تھا اور کشفی واقعات پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کرتا۔ اپنی علمی اور رُوحانی کوششوں میں وہ گاہ گاہ جن عجیب و غریب نتائج پر پہنچ جاتا تھا۔ اس کا اندازہ اُس نظریے سے ہو سکتا ہے، جس کے مطابق کلام مجید اپنشدوں سے ماخوذ ہے!!

دارا شکوہ کی تصنیفات میں تلاش و تفتیش کے باوجود کوئی ایسا اندراج نظر نہیں آتا، جس سے اس کا الحاد ثابت ہو سکے، لیکن ایسے بیانات کئی ہیں جن کے نمونے آزاد صوفیائے کبار کی تصانیف میں ہی مل سکتے ہیں اور جن کا اظہار ایک تاج و تخت کے طالب مسلمان کے لیے ضرور خلافِ مصلحت ہے۔ مثلاً وہ ایک خط میں حضرت شاہ دلربا کو لکھتا ہے: "الحمد للہ! الحمد للہ! کہ از برکتِ صحبتِ ایں طائفہ شریفہ مکرمہ معظمہ از دلِ ایں فقیر اسلام مجازی برخاست و کفرِ حقیقی رو نمود و معنی ایں رباعی عارف نامی مولانا عبدالرحمٰن جامی ظاہر گشت ؎

در دیدہ عیاں تو بودہ من غافل	در سینہ نہاں تو بودہ من غافل
از جملہ جہاں نشاں تو بودہ من غافل	خود جملہ جہاں تو بودہ من غافل

اکنوں قدرِ کفرِ حقیقی دانستم۔ زنار پوش و بت پرست بلکہ خود پرست و دیر نشیں گشتم ؎

مسلماں گر بدانستے کہ بت چیست	بدانستے کہ دیں در بت پرستی است
درونِ ہر بتے جانیست پنہاں	بزیرِ کفر ایمانیست پنہاں"

اس کے اشعار میں بھی آزاد خیالی اور وحدت الوجودی مسلک صاف طور پر جھلکتا ہے ؎

ہر خم و پیچے کہ شُد از تاب زلفِ یار شُد
دم شُد، تسبیح شُد، زنجیر شُد، زنّار شُد!

رباعی

مردم شُدم تا کہ بقرآں گشتم — عارف شدم و زخویش عُریاں گشتم
پیدا کردی مرا و لیکن من ہم — پیدا کردم تُرا و قرباں گشتم

ابیات

تا دوست رسیدیم، چو از خویش بریدیم — از خویش گذشتن، چہ مُبارک سفرے بُود

سلطنت سہل است خود را آشنائے فقر کن — قطرہ تا دریا تواند شُد چرا گوہر شود

دارا کی کوششوں کو اس وجہ سے بھی ضعف پہنچا کہ وہ حضرت اجمیریؒ، حضرت سُلطان المشائخ اور قدیمی صوفیہ کے زمانے میں شروع نہ ہوئیں بلکہ ان کا آغاز اُس وقت ہُوا۔ جب تصوّف کی شرع کے مطابق تطبیق ہو رہی تھی۔ ہم نے حضرت سلطان المشائخ کی وفات کے ضمن میں کہا تھا کہ اس کے ساتھ ہی دہلی میں صوفیہ کا عہدِ زرّیں ختم ہو گیا۔ اس کے بعد تصوّف کو شرع کے سامنے سر جُھکانا پڑا۔ عہدِ مغلیہ میں جُوں جُوں عُلومِ اسلامی کو فروغ ہُوا یہ تحریک زور پکڑ گئی اور شیخ عبدالوہاب متقیؒ، شیخ عبدالحق محدثؒ، حضرت مجدّد الف ثانیؒ جس طرح تصوّف کو تمام غیر اسلامی اور غیر شرعی عناصر سے پاک کرنے کی کوشش کر رہے تھے، ان کا تذکرہ ان صفحات میں ہو چکا ہے حضرت مجدّدؒ نے جس طرح ہردے رام نامی ایک ہندو کو رام اور رحیم کے ایک کہنے پر دھتکار دیا تھا۔ اس کا بھی ہم بیان کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ہندو مذہب کے احیا کی تحریک آثارِ اسلامی اور مسلمانوں کے خلاف جو جارحانہ صُورتیں اختیار کر رہی تھی، ان کے سامنے دارا شکوہ کی اتحاد پرور کوششیں کامیاب نہ ہو سکتی تھیں۔

ان سب اثرات کا نتیجہ یہ تھا کہ مسلمان علما[1] اور اہلِ فکر کی ایک با اثر جماعت تصوف میں کوئی غیر اسلامی عنصر دیکھنا پسند نہ کرتی تھی۔ داراشکوہ کی مساعی ان رجحانات کی صریح مخالف تھیں۔ اس لیے ان کا متشرع اور محتاط مسلمانوں کی نظروں میں ناپسند ہونا لابد تھا۔

داراشکوہ کو شخصی اور اتفاقی واقعات سے بھی نقصان پہنچا۔ وہ تاج و تخت کا دعویدار تھا۔ مراد۔ شجاع۔ اورنگ زیب اس کے حریف تھے اور وہ سب چاہتے تھے کہ دارا کو عیوب اور نقائص کا مجموعہ ثابت کریں۔ اورنگ زیب کو تو دارا سے اصولی اختلافات تھے، لیکن اب مراد جیسے رنگیلے انسان، جو ہر وقت شراب میں سرشار رہتے تھے، دارا پر مذہبی الزام لگانے لگے اور اپنے خطوط میں اُس کی نسبت "ملحد"۔ "بے دین"۔ "دشمنِ دینِ متین" کے الفاظ استعمال کرنے لگے۔

داراشکوہ کے ہم خیال تو اسے "محی الدین و ملت" کہتے تھے۔ لیکن مسلمانوں کو اس کی ہندو یوگیوں اور سادھوؤں سے صحبت ضرور ناپسند ہو گی۔ بھائیوں کی مخالفانہ کوششوں کا نتیجہ یہ ہُوا کہ مسلمان امرا اور علما بھی دارا کو ملحد سمجھنے لگے اور انھیں یہ ڈر پیدا ہو گیا کہ اگر داراشکوہ بادشاہ ہُوا تو اکبر کی سی مذہبی بے قاعدگیاں ہندستان میں پھر عام ہو جائیں گی۔

---

[1] داراشکوہ بعض علما کے ساتھ اپنے اختلافات کا ذکر کرتا ہُوا لکھتا ہے: "در ہندوستان وحدت نشاں گفتگوے توحید بسیار است و علماے ظاہری و باطنی طائفہ قدیم ہند را از وحدت انکارے و بر موحداں گفتارے نیست۔ بلکہ پایہ اعتبار است۔ برخلاف جہلاے ایں وقت کہ خود را علما قرار دادہ اند و در پے قیل و آزار و انکار خداشناساں و موحداں اُفتادہ۔ جمیع کتاب توحید را کہ از فرقان مجید و احادیث صحیحہ نبوی صریح ظاہر است ردّ مے نمایند و راہزنانِ راہِ خدایند۔"
(سِرِّ اکبر دیباچہ)

عہدِ عالمگیری

فقہ اور شریعت کا عُروج

عالمگیر اورنگ زیب شاہجہان کا تیسرا بیٹا تھا۔ داراشکوہ اور شجاع، دونوں عُمر میں اس سے بڑے تھے، لیکن قابلیت اور کیرکٹر کی پختگی میں وہ ان سے کہیں بڑھا ہُوا تھا۔ وہ محنتی، دُور اندیش اور منتظمانہ نقطہ نظر سے بڑا قابل تھا۔ اس نے مُلک کے دُور دراز حصّوں میں صوبیداری کر کے انتظامی تجربہ حاصل کیا تھا اور اس دَوران میں بطور ایک باتدبیر جرنیل اور بہادر سپاہی کے نام پیدا کیا تھا۔ اس کے لیے شہزادگی پھولوں کی سیج نہ تھی اور اپنا اثر و اقتدار قائم رکھنے کے لیے اسے شروع سے ہی بُوڑھے سیاستدانوں کی سب چالیں سیکھنی پڑیں۔ وہ طبیعت کا بڑا ٹھنڈا اور محتاط تھا ضرورت کے وقت اپنے جذبات کو خوب قابو میں رکھتا اور ایسی سب تدبیریں تیزی سے سوچ لیتا جو اسے حصُولِ مقصد میں کام آسکتی تھیں۔

شاہجہان جب اپنے بیٹوں پر نظر ڈالتا تو اسے بھی عالمگیر کے عزم و حزم اور اس کی دماغی قابلیّت کا قائل ہونا پڑتا۔ اس کی اپنے بیٹوں کی نسبت جو رائے تھی، اسے اورنگ زیب نے ایک خط میں نقل کیا ہے۔

> "مارا بعضے اوقات بہ خاطر راہ مے باید کہ مہین پور (دارا) عدوِ نیکو کاراں واقع شدہ و مراد بخش بکارِ مشرب دل بستگی دارد۔ محمد شجاع جز سیر چشمی وصفے ندارد۔ مگر عزم و شعور اورنگ زیب اقتضا مے کند کہ متحمل ایں امرِ خطیر مے تواند شد اما رکاکت نقصِ عظیم در نوعِ انسانی اوست"۔

شاہجہان اورنگ زیب کے "عزم و شعور" سے خوب واقف تھا، لیکن اپنی حکومت کے

آخری پندرہ بیس سالوں میں اس نے اورنگ زیب سے کوئی قدردانی کا برتاؤ نہیں کیا۔ شاہجہان کے اس زمانے کے خطوط و احکام پڑھیں تو نظر آتا ہے کہ نہ صرف اورنگزیب کی نسبت اس کا رویہ پدرانہ شفقت و محبت سے عاری تھا، بلکہ بعض اوقات تو اس کا طرزِ عمل یکسر معاندانہ ہو جاتا۔ اکثر چھوٹی چھوٹی باتوں پہ اورنگ زیب سے بازپرس کی ہے۔ اس کے لائقِ فخر کارناموں کی کوئی تعریف نہیں ہوتی بلکہ بسا اوقات ان کوششوں میں جو اورنگ زیب مغلیہ حکومت کی توسیع کے لیے (مثلاً گولکنڈہ اور بیجاپور میں) باپ کے زیرِ فرمان شروع کرتا ہے۔ روڑے اٹکائے جاتے ہیں اور اُسے دُوسروں کی نظر میں ذلیل کیا جاتا ہے۔

شاید شاہجہاں چاہتا تھا کہ اس کے بعد دارا شکوہ بغیر کسی کشمکش کے وارثِ تخت و تاج ہو جائے اور اس لیے وہ اس کے سب سے قوی حریف کو دبا کے رکھنا چاہتا تھا یا ممکن ہے کہ وہ سمجھتا ہو کہ اورنگ زیب کی چھوٹی چھوٹی چیزوں پہ نظر رکھنے کی عادت (نکاکت) اور خشک، فقیہانہ طبیعت مستقبل کے لیے ایک خطرہ ہے اور اس وجہ سے وہ بار بار ایسی باتوں پہ اُلجھتا ہو جو آج ہمیں بے ضرر نظر آتی ہیں۔

شاہجہاں اور اورنگ زیب کے جو اختلافات تھے وہ تو پھر جزوی اور ضمنی تھے لیکن اورنگ زیب اور دارا شکوہ کی مخالفت بُنیادی تھی۔ ایک تو وہ دونوں تخت و تاج کے دعویدار تھے۔ جس کا مغلیہ خاندان کی قاموس میں یہ مطلب ہے کہ اگرچہ وہ دونوں بھائی بھائی تھے، لیکن ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے اور پھر ان کے درمیان فقط ذاتی مقاصد و خواہشات ہی کی دیوار حائل نہ تھی، بلکہ ان کے خیالات، ان کے عقائد، ان کے طور طریقوں اور ان کی طبیعتوں میں بُعد المشرقین تھا۔ دارا شکوہ اور اورنگ زیب دونوں مذہب میں دلچسپی لیتے تھے، لیکن ان کے مذہب میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ دارا شکوہ آزاد خیال صُوفیوں کا پیرو تھا اور اورنگ زیب متشرع بلکہ متشدد علما کا۔ دارا کی وسعتِ مشرب کا تو یہ عالم تھا کہ وہ ہندو موحدین کی مجلس میں اسی ذوق و شوق سے شریک ہوتا، جس طرح مسلمان صوفیہ کی محفل میں۔ اور اورنگ زیب کا

یہ حال تھا کہ اس کے نزدیک شیعہ مسلمان بھی زندیق تھے[1]

عالمگیر اور دارا دو مختلف زاویہ ہائے نگاہ کے ترجمان تھے اور جس طرح قابل اور جواں ہمت طرفداروں کی مدد سے بالآخر ایک عقیدے اور طریقے کی فتح ہو جاتی ہے۔ اسی طرح مغلوں کے عہد میں ہُوا۔ اس سے کوئی اسّی سال پہلے دینِ الٰہی اور شرع کے جھگڑوں میں اکبر اور محمد حکیم مرزا کا مقابلہ ہُوا، لیکن حکیم مرزا کی اکبر کے مقابلے میں کوئی ہستی نہ تھی۔ چنانچہ اکبر کامیاب رہا اور اس کی کامیابی سے اہلِ شرع کو بُرے دن دیکھنے نصیب ہوئے۔ اب شریعت اور طریقت کا مُقابلہ تھا۔ اور ان کے نمایندے عالمگیر اور داراشکوہ تھے۔ لیکن عالمگیر دارا کی بہ نسبت کہیں زیادہ باتدبیر اور بہادر تھا۔ چنانچہ وہی کامیاب ہُوا اور طریقت کا طرفدار ناکام رہا۔ روضتہ القیومیہ میں تو اورنگ زیب کی وجہ خواجہ محمد معصوم کی دُعا لکھی ہے لیکن مورخین کو اس سے بھی زیادہ واضح وجوہ نظر آئیں گے۔ ایک تو اورنگ زیب نے تدبر سے کام لیا اور دارا کے خلاف باقی سب بھائیوں کو اکٹھا کر لیا۔ دوسرے بہادری میں دارا، اورنگ زیب کی گرد کو بھی نہ پہنچتا تھا۔ اورنگ زیب نے اپنی بہادری اور بے خوفی کا پہلا ثبوت چودہ برس کی عمر میں دیا تھا۔ جب وہ ایک مست ہاتھی کے سامنے کھُلے میدان میں ڈٹ گیا۔ دُوسرا قابلِ ذکر واقعہ ۹ رجون ۱۶۴۶ء کو پیش آیا۔ جب بلخ کی مہم پر اورنگ زیب عبدالعزیز بلخی کے خلاف معرکہ آرا تھا۔ دونوں لشکر آپس میں لڑ رہے تھے کہ نمازِ ظہر کا وقت آگیا۔ "درعین گرمیٔ ہنگامۂ پیکار وقت نمازِ ظہر در رسید۔ و آنحضرت باوجود التماس و امتناع بندہ ہائے ظاہر بیں از مرکوبِ خاص فرود آمدہ صف آرائے جماعت شدہ فرض و سنت و نوافل را ... (بہ) کمالِ حضور و اطمینان ادا کردند" عبدالعزیز خاں پر اورنگ زیب کی اس

---

[1] بعد میں یہ رنگ ہلکا ہوگیا۔ لیکن شروع میں جو اورنگ زیب کا حال تھا اس کا اندازہ ایک خط سے ہوتا ہے جو اس نے ایامِ شہزادگی میں شاہجہان کو لکھا اور جس میں والیٔ گولکنڈہ کی نسبت کہا ہے۔ "رفض و سبِّ اصحابِ کبار را کہ محض کفر و زندقہ است در قلمرو خویش شائع گردانیدہ"۔

جرأت کا اتنا اثر پڑا کہ اس نے کہا "باچنیں کسے در افتادن بر افتادن است"۔ اور اورنگ زیب سے صلح کا خواستگار ہُوا!

اورنگ زیب اور دارا کی قابلیت اور بہادری کا بہترین امتحان جنگ تخت نشینی کے دَوران میں ہُوا۔ سموگڑھ کے میدان میں دونوں فوجیں لڑ رہی تھیں۔ دارا کے ہاتھی پر حملہ ہونا شروع ہُوا تو دارا ہاتھی سے اُتر کر گھوڑے پر سوار ہو بیٹھا۔ فوج نے سمجھا کہ شہزادہ مارا گیا اور تتر بتر ہو گئی۔ اورنگ زیب کو بھی کھجوہ کے مقام پر یہی صُورت پیش آئی۔ وہ ایک ہاتھی پر بیٹھا شجاع کے خلاف لڑ رہا تھا کہ ایک مست جنگی ہاتھی نے اس کے ہاتھی پر حملہ کر دیا۔ اس موقعے پر اگر بادشاہ کا ہاتھی بھاگ جاتا تو ساری فوج تتر بتر ہو جاتی، لیکن اورنگ زیب کی جُرأت اور قوتِ حوصلہ کام آئی۔ ہاتھی سے اُتر کر گھوڑے پر سوار ہونا تو ایک طرف، اُس نے اپنے ہاتھی کے پاؤں میں بیڑیاں ڈلوا دیں کہ کہیں گھبرا کے بھاگنا نہ شروع کر دے!

دارا اور اورنگ زیب کے اوصاف میں جب یہ بیّن فرق تھا تو ظاہر ہے کہ کامیاب کون ہوتا۔ چنانچہ سُنّتِ الٰہی کے مطابق زیادہ قابل آدمی کامیاب رہا اور اورنگ زیب تختِ دہلی کا مالک بنا۔

اصلاحاتِ عالمگیری

اورنگ زیب کی تخت نشینی کے زمانے کی اخلاقی اور اجتماعی حالت کے متعلق ڈاکٹر ہنٹر ایک مضمون میں لکھتے ہیں:۔ "لیکن نہ اکبر کا بیٹا اور نہ اس کا پوتا شاہجہاں بدچلنی اور بداخلاقی کے اس طوفان کا مقابلہ کر سکا جو الحاد و تشکک کی تین نسلوں کے درمیان بڑھتا چلا آتا تھا۔ اکبر کے ایک بیٹے نے اپنے آپ کو شراب پی پی کے ہلاک کر دیا تھا۔ اور جب اس کی شراب بند کی گئی تو بندوق کی نالی میں چوری سے شراب منگوا لیا کرتا تھا۔ دہلی کا وہ محلہ جسے شیطان پورہ کہتے ہیں، اکبر کے زمانے کی یادگار ہے۔ بدچلنی لے سیلاب کے ساتھ توہم پرستی بھی آگئی تھی۔ جادوگروں، رمالوں اور کرامت کے دعوے داروں سے دارالخلافہ بھرا پڑا تھا۔ مغل دربار کا ایک فرانسیسی طبیب

لکھتا ہے "یہاں دو پیسے لے کر ایک آدمی کی قسمت بتائی جاتی ہے اور اس جگہ ایک کونے میں ایک پرتگیز نجومی دوسروں کے ساتھ دری پر بیٹھا رمل و نجوم کی باتیں لوگوں کو بتاتا ہے اور اپنی انجیل کی تصویروں کو نجوم کے بُرج بتا کر اور اپنا قطب نما استعمال کر کے اپنا اُلّو سیدھا کرتا ہے۔ بداخلاقی توہم پرستی اور الحاد کی یہ دُنیا تھی۔ جس میں نوجوان "زاہدِ خشک اورنگ زیب نے اپنی آنکھیں کھولیں"۔ چنانچہ جب وہ بادشاہ ہُوا تو اُس نے اپنی ساری کوششیں ان خرابیوں کا قلع قمع کرنے میں صرف کر دیں۔ تخت نشین ہونے کے بعد ہی اُس نے بھنگ وغیرہ کاشت کرنے کی ممانعت کر دی۔ شراب نوشی ممنوع قرار دی۔ جُوا بند کر دیا۔ بدکاری کے خلاف پُوری کوشش کی۔ بازاری عورتوں کو حکم دیا کہ یا تو وہ شادی کر لیں یا مُلک چھوڑ دیں۔ ان احکام کی تعمیل کرانے کے لیے محتسب مقرر کیے۔ ۱۶۶۴ء میں اس نے "ستی" کی ممانعت کی اور بچوں کو بطور غلام یا خواجہ سرا بیچنے کے خلاف احکام جاری کیے۔

اس کے علاوہ اس نے خود اپنی پرہیزگاری اور سادگی سے اپنی رعایا کے لیے نیک مثال قائم کی۔ بادشاہ کے درشن کو موقوف کیا۔ اگرچہ وہ خود موسیقی کا ماہر تھا، لیکن اس نے گانے والوں اور گانے والیوں کو دربار سے ہٹا دیا۔ اس کی سالگرہ پر جو اسراف ہوتا تھا، اسے ترک کر دیا۔ اور شاہجہاں کی ضیافتوں اور فضول خرچیوں کی وجہ سے رعیت پر جو ٹیکسوں کا بوجھ پڑا ہُوا تھا، اسے ہلکا کر دیا۔ اس نے تقریباً اَسّی ٹیکس معاف کیے۔

وہ عالموں اور بزرگوں کی قدر کرتا۔ اس نے مُلک کا انتظام شرع کے اصُولوں پر قائم کیا تھا اور عدل و انصاف کا محکمہ علماء کے ہاتھ میں تھا۔ اس وقت اسلامی قوانین کے متعلق کوئی مستند اور جامع کتاب نہ تھی۔ اُس نے تمام ملک کے قابل علماء کو جمع کر کے فتاویٰ عالمگیری کے نام سے حنفی فقہ کی ضخیم کتاب مرتب کروائی جو اب تک بڑی اہم اور مستند سمجھی جاتی ہے۔

وہ خود بڑی سادہ زندگی بسر کرتا تھا۔ بیت المال کے پیسے کو ہاتھ نہ لگاتا۔ اپنی روزی ٹوپیاں بنا کر اور قرآن شریف لکھ کر کماتا۔ اُس نے ۲۱ر فروری ۱۷۰۷ء کو

بروز جمعہ نوّے سال کی عمر میں بمقام احمد نگر وفات پائی اور اورنگ آباد سے بارہ کوس کے فاصلے پر "روضہ خلد آباد" میں دفن ہُوا۔ مرتے وقت اس نے وصیت کی تھی کہ چار روپے دو آنے جو میں نے ٹوپیاں بنا کر کمائے ہیں میرے کفن پر خرچ ہوں اور تین سو پانچ روپے جو میں نے قرآن شریف لکھ کر کمائے ہیں، مساکین میں تقسیم کیے جائیں۔ حسبِ وصیت اس کی تدفین نہایت سادہ ہوئی اور اس کی قبر پر کوئی عالیشان عمارت نہیں۔

اربابِ ظاہر

اورنگ زیب کی زندگی ایک لحاظ سے اتباع و ترویج شریعت کی ایک نہایت روشن مثال ہے لیکن جہاں اس کے عہدِ حکومت میں اتباعِ شریعت کی کوششیں بداخلاقی۔ شراب خوری۔ جوئے اور بدچلنی وغیرہ کی بیخکنی کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں۔ وہاں بعض اربابِ شریعت کی تنگ نظری کی بھی مثالیں موجود ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اہلِ ظاہر کی ایک اہم خصوصیت پر اپنے شاہکار تذکرہ میں تبصرہ کیا ہے :-

"افسوس جزئیات مزعومہ عقائد کے غرورِ باطل نے مسلمانوں کو جس قدر نقصان پہنچایا، کسی چیز نے نہیں پہنچایا۔ عملِ صالح کی اہمیت بالکل جاتی رہی اور سارا دار و مدار چند مزعومہ عقائد پر آ کر رہ گیا۔ ساری جستجو اور کاوش صرف اس کی ہوتی ہے کہ فلاں شخص کے عقائد کیسے ہیں یعنی چند مزعومہ جزئیات غیر متعلقہ میں اس کے عقیدے کا کیا حال ہے؟ اس کو کوئی نہیں دیکھتا کہ اس کا عمل کیسا ہے۔ اللہ اور اس کے رسول کی محبت میں انفاقِ جان و مال کا کیا حال ہے؟ تقوی و طہارتِ نفس کے لحاظ سے کیسی زندگی بسر کرتا ہے؟ بندوں کے ساتھ اس کا کیسا سلوک ہے۔ اور خدا کے خوف سے دل خالی رکھتا ہے یا بھرپور؟ معاملات میں کیا حال ہے۔ لین دین میں سچائی اور دیانت ہے یا نہیں؟ ایک شفیق باپ۔ رفیق بھائی۔ وفادار شوہر اور رحیم و غمگسار ہمسایہ ہے یا ایک بے رحم وجود۔ بے حس پتھر اور موذی و مہلک مخلوق؟ ان ساری باتوں میں (جن کے الگ کر دینے کے بعد اسلام میں کوئی چیز باقی نہیں رہتی) اس کا حال خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو لیکن اگر چند

اختلافی جزئیات میں ہمارا ہم آہنگ ہے تو ہمارے نزدیک اس سے افضل ہستی روئے زمین پر کوئی نہیں "

مولانا ابوالکلام آزاد نے اعمالِ حسنہ پر عقائد کو ترجیح دینے اور جزوی اختلافات کے لیے تکفیر و تذلیل کرنے کی جس غلطی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ آج کے ظاہر بینوں کی خصوصیت نہیں، بلکہ اہلِ ظاہر کا پرانا شیوہ ہے۔ اسلام کی تاریخ میں اس کی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں اور چونکہ اورنگ زیب کے عہدِ حکومت میں اہلِ شرع کو زیادہ اختیارات حاصل تھے اس لیے اس زمانے میں ایسے واقعات بھی زیادہ ہیں۔

علامہ اقبال نے اپنے انگریزی لیکچروں میں ایک جگہ کہا ہے کہ "فقہ اسلامی آخری ایام میں اسلام کے بہترین دماغوں کے ہاتھ میں نہیں رہی"۔ اور اگر ہندوستان کے بعض قاضیوں اور مفتیوں کے حالات پڑھے جائیں تو اس خیال کی تائید ہوگی۔ ہندوستان میں جو قاضی القضاۃ اور شیخ الاسلام ہوئے ہیں اور جن کے احکام کو صاحبِ ایمان کر خوش عقیدہ بادشاہوں نے اس طرح نافذ کیا ہے کہ گویا بہشت و دوزخ کی کنجی ہی ان بزرگوں کے ہاتھ میں تھی۔ ان کے حالات دیکھیں تو حیرانی ہوتی ہے کہ ان بزرگوں کی زندگیوں کو کس طرح مسلمانوں کے لیے نمونہ سمجھا جائے۔

اورنگ زیب کے قاضی القضاۃ گجرات کے قاضی عبدالوہاب تھے جن کے متعلق منوچی لکھتا ہے "اورنگ زیب نے ایک دن کہا کہ ہندوستان میں صرف دو آدمی ہیں جو شراب نوشی سے بالکل مبرا ہیں۔ ایک میں اور ایک قاضی عبدالوہاب، لیکن عبدالوہاب کے متعلق وہ دھوکے میں تھا۔ کیونکہ میں (منوچی) اُسے خود ہر روز شراب بھیجا کرتا تھا۔"

ہمارے خیال میں یہ قصہ جسے زمانہ حال کے اکثر مورخین نے صحیح تسلیم کر لیا ہے، محض بہتان ہے اور ہم منوچی کو قابلِ اعتماد راوی نہیں سمجھتے۔ البتہ اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جب قاضی عبدالوہاب ۱۶۷۵ء میں فوت ہوئے تو انھوں نے ایک لاکھ اشرفیاں اور پانچ لاکھ روپیہ نقد علاوہ جواہرات اور اثاث البیت کے چھوڑا۔[۱]

---

[۱] "یادِ ایام" از مولانا عبدالحی (ص ۶۸)

جمع اموال میں وہ بھی اکبری عہد کے مخدوم الملک سے پیچھے نہیں رہے ۔
مورخین ان کی زراندوزی بلکہ بددیانتی کی صاف شکایت کرتے ہیں۔ مآثر الامرا میں ان کے متعلق لکھا ہے :۔

"قاضی حضور ذکر بزہد و تدین خود را وانمودہ در تمشیت امور جزوی و کلی لوائے امان و لاغیری مے افراشت) امرائے عمدہ از و حساب بر میداشتند و از حد چوں کباب طیسو غلغند و با ایں ہمہ میگویند کہ قاضی، راحد و جرید طوطلے داشت ۔ و زرہائے کثیر اندانستہ بودیہ"

اسی سلسلے میں ایک لطیفہ لکھا ہے ۔ مہابت خاں لہراسپ اورنگ زیب کا ایک امیر تھا۔ اسے حکم ہوا کہ وہ اپنی فوج کے ساتھ دکن جائے اور وہ اس کے لیے تیار بھی ہوا۔ ابھی دار الخلافے کے گرد و نواح میں ہی تھا کہ اُسے پتا چلا کہ قاضی (عبدالوہاب) تین چار لاکھ روپے کی چیزیں کشمیر اور آگرے سے خرید کر تاجروں کے مال کے ساتھ احمد آباد بھیج رہے ہیں۔ اس کی اور قاضی کی نہ بنتی تھی۔ اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ سب کچھ بلا منگوایا اور اپنی سپاہ میں تقسیم کر دیا۔ بادشاہ کے پاس شکایت ہوئی تو مہابت خان نے کہہ دیا کہ مجھے فوج کے اخراجات کے لیے روپے کی سخت ضرورت تھی۔ سوداگروں سے بطور قرض کے لیا ہے۔ منافع کے ساتھ واپس کر دوں گا۔ اب قاضی اس امر کا اظہار نہ کر سکتا تھا کہ اتنا مال متاع سب میرا ہے۔ چنانچہ اسے لہو کے گھونٹ پی کر خاموش رہنا پڑا۔

قاضی عبدالوہاب کے صاحبزادے قاضی شیخ الاسلام کی نسبت لکھا ہے:
"او بخلاف پدر دیانت واقعی داشت و ورع و صلاح او منسوب بر ریا نبود"۔ قاضی شیخ الاسلام کا نام اس اندھیری رات میں چراغ کی طرح چمکتا ہے۔ وہ واقعی پرہیزگار اور دیانتدار تھے۔ اُنھوں نے اپنے باپ کے ورثہ سے ایک پائی نہ لی اور جب اورنگزیب نے بیجاپور پر حملہ کرنے کے متعلق ان سے استصواب کیا تو انھوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ ایک مسلمان بادشاہ سے اس طرح جنگ شروع کرنی ناجائز ہے لیکن ان کا دل قضا میں نہ لگتا تھا۔ چند سال خدمت کرنے کے بعد انھوں نے استعفیٰ دے دیا اور باوجودیکہ بادشاہ بڑا زور دیتا تھا کہ وہ یہ کام سنبھالے رکھیں لیکن انھوں نے طریقے طریقے سے

ٹال دیا۔ پہلے حج کو چلے گئے۔ پھر زیارتِ مقابرِ بزرگاں و ملاقاتِ عیال و اطفال کیلیے رخصت لی اور اپنے آپ کو اس سلسلے میں الجھنے نہ دیا۔ اپنی قضاۃ کے زمانے میں بھی ان کا اصول تھا کہ گواہ بالعموم جھوٹ بولتے ہیں۔ ان کے بیان پر فیصلہ نہیں دینا چاہیے "منظر بر فسادِ زمانہ (کہ مزاجہا بکذب و زور آشنا شدہ) انفصال قضایا بر بینہ و شواہد کمے نمود۔" ان کے باقی سارے خاندان میں ان جیسا کوئی نہ تھا۔ ان کا اپنا بیٹا شیخ سراج الدین برادر کا دیوان تھا۔ سرکاری روپیہ غبن کر کے خرقہ درویشی پہن لیا تاکہ کوئی باز پرس نہ ہو۔ ان کے بھتیجے یعنی قاضی عبدالوہاب کے پوتے محمد معالی خان کی نسبت لکھا ہے "خوگرِ شراب و شیفتہ کُرنگ بود"۔

مآثر الامرا میں اس زمانے کے قاضیوں کی بڑی شکایت کی گئی ہے :-

"ایں امر جلیل القدر را دین بدُنیا فروشاں سخت آساں گرفتہ اند۔ زرہا بر رشوت خرچ مے کنند کہ تا بابطال حقوقِ مردم صد چنداں ستانند۔ نکاحانہ و مہرانہ را حلال تر از شیرِ مادر مید انند۔ از قضات ارتقی قصبات چہ تواں گفت کہ مسِ علم ایشاں نصیب اعداست و گفتۂ دلیپا اندیہ و زمیندار آں کتاب و شرع آنہاست ہرگاہ در شانِ قضات با علم و عمل حدیثے وارد شدہ (کہ از سہ قاضی یکے بہشتی است)۔ (و خواجہ محمد پارسا (قدس سرہ) در فصل الخطاب گوید کہ آں قاضی بہشتی ہم مگر قاضی بہشت باشد!) اندازۂ گمراہی و ضلالتِ ایں قوم کہ کمتر از جہال اند۔ کہ تواند گرفت۔"

جب شرع کی تدوین و ترویج اور اہلِ شرع کی تنظیم قاضی عبدالوہاب اور ان جیسے بزرگوں کے ہاتھ میں رہی ہو تو ہمیں اس بات پر تعجب نہ کرنا چاہیے کہ اسلامی حکومت کی سات آٹھ صدیوں میں ایک بھی صاحبِ اجتہاد فقیہ ہندوستان میں پیدا نہ ہوا۔ جو بزرگ شیخ عبدالحق کی طرح قابل سمجھ دار اور اسلامی مذہب و شریعت کی گہرائیاں سمجھنے والے تھے یا مجدد الف ثانی کی طرح اسلام کا درد اور اعلیٰ درجے کی اخلاقی جرأت رکھتے تھے، وہ قاضی یا مفتی بننے سے کوسوں بھاگتے تھے۔ شریعت کی عام ترویج جن لوگوں کے ہاتھ میں رہی وہ زیادہ سے زیادہ اسی کے اہل تھے کہ فقہ کی کتابیں دیکھ کر

حرام حلال کے مسئلے بتا دیں۔ کسی کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ ملکی ضروریات کا خیال کر کے اور قوم کی بہبودی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے شرع اور فقہ کی تدوین ان اصولوں پر کرے جن سے اسلامی حکومت دیرپا اور محکم ہو۔ جن لوگوں میں شریعت رائج ہے ان کے آرام و فلاح کا انتظام ہو۔ قوم کی اصلاح اور ترقی اس طرح ہو کہ وہ دنیا کی دوسری قوموں سے آگے بڑھتی رہے۔

سندھ میں عربوں کی آمد پر محمدؒ بن قاسم اور دمشق کے مفتیوں نے فقہی معاملات میں اجتہاد سے کام لیا اور بت پرست ہنود کو وہ حقوق دیے گئے، جو اہلِ کتاب کے لیے مخصوص تھے، لیکن اس کے پانچ سو سال بعد جب دہلی میں اسلامی حکومت قائم ہوئی تو بابِ اجتہاد بند ہو چکا تھا۔ اب علما و فقہا کی نظر کتابوں سے آگے نہ جاتی تھی اور ان کی ترجمانی میں بھی مغز کو چھوڑ کر استخوان کے پیچھے پڑتے۔ آج بھی کئی اسلامی ممالک ایسے ہیں، جن میں تمباکو پینے پر تو درّے لگائے جاتے ہیں اور اگر کوئی شخص شرعی حیلوں سے شارع کا تمام مقصد ضائع کر دے تو اس سے کوئی پرسش نہیں ہوتی۔ ایک شخص کا پاجامہ ٹخنوں سے نیچے آ جائے تو وہ مستوجب سزا ہے، لیکن اگر وہی شخص سو عورتوں سے یکے بعد دیگرے اس طرح شادی کرے کہ ایک وقت میں چار سے زیادہ عورتیں اس کے نکاح میں نہ ہوں تو خواہ وہ نفس پرستی اور ہوس رانی میں اپنی زندگی گزار دے۔ اپنی اور دوسروں کی زندگی کو دوزخ کا نمونہ بنا دے؛ وہ قابلِ الزام نہیں۔ بعض اربابِ شریعت کی اسی ظاہر پرستی پر اہلِ طریقت کو اعتراض رہا ہے اور اسی وجہ سے شریعت اور طریقت کا اختلاف بڑھا۔ اگر دونوں فریق افراط و تفریط کو ترک کر دیں۔ میانہ روی کا راستا اختیار کریں، جو قرآن کریم کا صحیح طریقہ ہے اور جس پر رسولِ اکرمؐ عامل تھے تو یہ اختلاف مٹ جائے اور اس کے مٹ جانے سے اسلام کی روحانی اور اجتماعی زندگی کی ایک بڑی مشکل دور ہو۔

اسلامی مدارس اور ان کا نصابِ تعلیم

اورنگ زیب ایک متدین بادشاہ تھا۔ اس نے شرع کے احکام پر اپنا نظامِ حکومت ترتیب دیا اور ان کی پوری پوری

پیروی کی لیکن وہ کوئی تنگ نظر اور سادہ دل بادشاہ نہ تھا۔ اس کو اپنے زمانے کے علما اور مدرّسین کے نقائص سے پوری آگاہی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنے ایک اُستاد کے سامنے اس زمانے کے طرزِ تعلیم پر جو تنقید کی اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ اُس زمانے کے طریقۂ تعلیم کی کوتاہیوں سے پوری طرح واقف تھا۔

برنیر لکھتا ہے کہ اورنگ زیب کی تخت نشینی کے بعد جب اس کا ایک اُستاد کسی منصب کی ہوس میں اس کے دربار میں آیا اور درباری اُمرا سے جوڑ توڑ کر کے ایک بلند پایہ منصب لینے کے درپے ہُوا تو اورنگ زیب نے ایک دن اُسے تخلیے میں بُلا کر ایک طویل تقریر کی اور کہا:۔

"مولانا! آپ کی کیا خواہش ہے؟ کیا آپ چاہتے ہیں کہ مَیں آپ کو دربار کے اوّل درجہ کے اُمرا میں داخل کر لوں؟ مَیں جانتا ہُوں کہ آپ کا مجھ پر حق ہوتا اگر آپ مجھے کوئی کام کی تعلیم دیتے۔ لیکن آپ نے مجھے کیا پڑھایا؟ آپ نے مجھے بتایا کہ فرنگستان ایک معمولی سا جزیرہ ہے جہاں سب سے بڑا بادشاہ پہلے پرتگال کا حاکم تھا۔ پھر ہالینڈ کا بادشاہ ہُوا۔ اور اب شاہِ انگلستان ہے۔ فرانس اور اندلس کے حکمرانوں کے متعلق آپ نے مجھے بتایا کہ وہ ہمارے معمولی راجاؤں کی طرح ہیں اور شاہنشاہانِ ہندوستان اُن سب حکمرانوں سے بڑے ہیں۔ انھی میں ہمایوں۔ اکبر۔ جہانگیر اور شاہجہاں ہوتے ہیں جو شاہانِ عظیم فاتحانِ جہان اور بادشاہانِ عالم ہیں۔ آپ نے مجھے بتایا کہ ایران کا شغر۔ تاتار۔ پیگو۔ سیام اور چین کے حاکم شاہِ ہند کا نام سُن کر کانپتے ہیں۔ سُبحان اللہ! آپ کے علمِ جغرافیہ اور تاریخ دانی کا کیا کہنا! کیا آپ کا فرض نہ تھا کہ آپ مجھے دُنیا کی تمام قوموں کی خصوصیات سے آگاہ کر کے یہ بتاتے کہ ان مُلکوں کی پیداوار اور ان کی جنگی طاقت کا کیا حال ہے۔ یہ لوگ لڑتے کس ڈھب سے ہیں۔ ان کے رسم و رواج اور مذہب و حکومت کے طریقے کیسے ہیں؟ ان کی پولیٹکل پالیسیاں کیا ہیں؟ آپ کا فرض تھا کہ مجھے تاریخ کی باقاعدہ تعلیم دے کر حکومتوں کے آغاز اور ان کی ترقی و تنزل کے اسباب بتاتے۔ ان واقعات، حادثات اور غلطیوں سے آگاہ کرتے۔ جن کی وجہ سے بڑے بڑے انقلابات ظہور میں آتے ہیں۔ خیر دُنیا کی تاریخ

سے پوری اور گہری واقفیت دلاتا تو درکنار آپ نے مجھے میرے آباواجداد کے نام بھی پوری طرح نہیں بتائے ۔

آپ نے یہ خیال نہ کیا کہ ایک شہزادے کی تعلیم کے لیے کونسے مضامین درکار ہیں۔ یہی سمجھا کہ مجھے بس صرف و نحو کی بڑی مہارت چاہیے اور مجھے وہ علم حاصل کرنا چاہیے جس کی ضرورت ایک قاضی یا فقیہ کو ہوتی ہے ۔ اس طرح آپ نے میری جوانی کا قیمتی زمانہ لفظوں کے سیکھنے کی خشک، بے فائدہ اور لامتناہی کوشش میں صرف کر دیا ۔

آپ نے میرے والد ماجد سے کہا کہ ہم نے اسے فلسفہ پڑھایا ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ آپ نے کئی برس تک میرے دماغ کو ان فضول اور احمقانہ مسائل سے پریشان کیا جن کا زندگی کے کاروبار سے کوئی تعلق نہیں ۔ بیشک آپ نے میری زندگی کے بہترین سال اپنے دلپسند لیکن خیالی مسائل کی بحث میں صرف کر دیے ۔ جب میری تعلیم ختم ہوئی تو مجھے علم و فن سے سوائے اس کے کوئی واقفیت نہ تھی کہ میں چند ایسی دقیق اور مشکل اصطلاحیں استعمال کر سکتا تھا ۔ جن سے روشن سے روشن دماغ والے انسان گھبرا جاتے ہیں اور جن سے فلسفے کے دعویدار اپنی جہالت اور ناواقفیت پر پردے ڈالتے ہیں !

اگر آپ مجھے وہ علم سکھاتے جو عقل اور سمجھ کے اصولوں پر دماغ کی تربیت کرتا ہے اور اسے صحیح اور وزنی دلائل کا طلبگار بناتا ہے یا مجھے وہ باتیں بتاتے جن سے حوادثِ زمانہ کے مقابلے میں انسان اتنا مضبوط ہو جاتا ہے کہ نہ مصائب اسے پریشان کرتی ہیں اور نہ خوشی اور کامیابی سے اس کا دماغ بگڑتا ہے ۔ یا اگر آپ مجھے انسانی فطرت کے رموز سے واقف کر دیتے یا مجھے دُنیا کا، اس کے مختلف حصوں کا اور اس کے نظام کا پُورا پُورا حال بتا دیتے تو مجھ پر آپ کے احسانات سکندر اعظم پر ارسطو کے احسانات سے بڑھ کر ہوتے اور میں پوری طرح آپ کی قدر افزائی کرتا ۔"

یہ اندراج ہم نے برنیر کے سفر نامے سے لیا ہے ' جو عہدِ عالمگیری میں دیر تک اس ملک میں مقیم رہا اور بعض امرائے دربار سے وابستہ ہو گیا تھا ۔ اب بعض اہلِ تحقیق کہتے ہیں کہ یہ تقریر برنیر کے نہاں خانۂ دماغ کی تخلیق ہے ۔ عالمگیر کے خیالات کا اظہار نہیں ۔

ممکن ہے کہ یہ شبہ جائز ہو، لیکن اس سے اصل بحث پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جو اعتراضات اس میں درج ہیں، وہ فی نفسہ اس قدر وزنی ہیں کہ انھیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور کیا یہ امر قابلِ افسوس نہیں کہ جو کوتاہیاں ایک ژرف بیں اجنبی کو تھوڑے ہی قیام کے بعد نظر آگئیں، ان سے ہمارے اربابِ حل و عقد اتنی صدیاں غافل رہے؟

عالمگیر اور غیر مسلم

اورنگ زیب کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اُس نے غیر مسلموں سے منصفانہ سلوک نہ کیا اور مغلیہ رواداری کی دیرینہ روایات کو درہم برہم کر دیا۔ مولانا شبلیؒ نے ایک زوردار اُردو رسالے میں اور مسٹر فاروقی نے ایک مبسوط انگریزی کتاب میں اس اعتراض کی تردید کی ہے۔ لیکن پروفیسر جادوناتھ سرکار نے سالوں کی محنت اور تحقیق و تفتیش کے بعد اورنگ کے خلاف جو مواد جمع کیا ہے اور جس چالاکی سے اسے عالمگیر کے خلاف استعمال کیا ہے۔ اس کا تدارک ان کتابوں سے نہیں ہوتا۔ اس کے لیے ایک ایسے عالم کی ضرورت ہے، جو اس زمانے کے ایک ایک واقعہ سے پوری طرح واقف ہو کوئی معاصرانہ تصنیف اس کے مطالعہ سے باہر نہ رہی ہو اور پھر وہ پروفیسر سرکار جتنی قابلیت اور ان سے زیادہ انصاف پسندی کے ساتھ ان کے زہر کے لیے تریاق تیار کرے۔ ظاہر ہے کہ ہماری مختصر کتاب میں اس مسئلے پر طویل بحث کی گنجائش نہیں، لیکن ہم اس سلسلے میں دو ایک باتوں کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں پہلی توجہ طلب بات یہ ہے کہ جو غیر مسلم مورخین اورنگ زیب کے احکام سے اسلام کے متعلق نتائج اخذ کرتے ہیں یا جو مسلمان سمجھتے ہیں کہ اورنگ زیب فرشتہ ثابت نہ ہوا تو اسلام مطعون ہوگا۔ وہ تناسب امور کا خیال نہیں رکھتے۔ اسلام کی بُنیاد احکامِ عالمگیری بلکہ فتاوٰے عالمگیری پر نہیں۔ "کتاب الھدٰے" پر ہے اور اسی کے مطابق یہ مذہب پرکھا جاسکتا ہے۔ اگر عالمگیر یا کوئی دُوسرا مسلمان اس کے سمجھنے میں غلطی کرے تو اس سے سارا مذہب مطعون نہیں ہوسکتا۔ اسلام کے حسن و قبح کا اندازہ تو قرآن کریم ہی سے ہو سکتا ہے جو مذہبی رواداری کے معاملے میں بہت واضح ہے۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ۔

اس کے علاوہ بعض حلقوں میں یہ غلط فہمی پھیلائی جاتی ہے کہ اورنگ زیب کے طرزِ عمل سے

ہندو برگشتہ ہو گئے تھے اور اس سے مغلیہ حکومت کو زوال ہوا۔ اس کے متعلق ڈاکٹر تارا چند کی رائے پڑھنے کے قابل ہے۔ وہ فرماتے ہیں:-

"بعض لوگوں کے نزدیک اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی اس کی ناکامیابی کا سبب بنی۔ بالعموم یہ خیال غلط ہے۔ ہندوؤں کی بغاوتیں ناکام رہیں اور ان کا کوئی مذہبی یا سیاسی مقصد نہ تھا۔ اورنگ زیب نے انھیں ہندوؤں ہی کی مدد سے فرو کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مرہٹوں کے خلاف جنگ مغلیہ سلطنت کے لیے ایک بارِ عظیم ثابت ہوئی لیکن ان کی بغاوت نہ ملکی تھی نہ مذہبی، فقط ایک قبیلے کی بغاوت تھی اور دوسرے قبائل کی بغاوت سے بہت مختلف نہ تھی۔ راجپوت بندیلے اور شیواجی کے اپنے رشتہ دار اورنگ زیب کی خاطر شیواجی اور اس کے جانشینوں کے خلاف لڑے اور پھر مرہٹوں نے ہندوؤں کے خلاف بھی حملے کیے اور ان کے لشکروں میں مسلمان بھی موجود تھے۔

سر پی۔ سی رائے نے بھی اپنی تقریر میں ایک اہم حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "جو لوگ شیواجی کے متعلق کہتے ہیں کہ اس کا مقصد ہندو دھرم کا احیا تھا اور وہ مغلوں کے خلاف قومی جدوجہد کا رہنما تھا، وہ غلطی پر ہیں"

مرہٹہ تاریخ کے ضمن میں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ شیواجی کا دادا مسلمان پیروں کا بڑا معتقد تھا اور حضرت شاہ شریف کا مرید تھا، جو احمد نگر میں مدفون ہیں۔ اپنے مرشد کے نام پر اس نے اپنے بیٹوں کے نام شاہ جی اور شریف جی رکھے، جو فی الحقیقت مسلمانوں کے نام ہیں۔

مرہٹوں کے علاوہ اورنگ زیب کے صوبیداروں کو گورو گوبند سنگھ کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اس کشمکش میں بعض افسوسناک واقعات ظہور پذیر ہوئے، لیکن غیر مسلم مؤرخین یہ امر بھول جاتے ہیں کہ اپنی وفات سے پہلے گورو گوبند سنگھ جی مغل فوج میں ایک عہدے پر مقرر ہو گئے تھے اور جب انھیں کسی پٹھان نے ذاتی عداوت کی بنا پر زخمی کیا۔ تو اورنگ زیب کے جانشین بہادر شاہ نے اپنا خاص طبیب ان کے معالجے کے لیے بھیجا۔

خوشحال خان خٹک

اورنگ زیب کے مخالفین میں صرف مرہٹے اور سکھ نہ تھے، بلکہ اسے افغان قبائل کا بھی مقابلہ کرنا پڑا۔

افغان بغاوت کا راہنما خوشحال خان خٹک تھا، جو پشتو شعرا کا سرتاج ہے سو وہ بیک وقت صاحب السیف والقلم تھا اور اس کے اشعار میں جوش، آزادی، افغانوں کی فوقیت اور مغلوں کی مخالفت کی آگ اس طرح بھری ہوئی ہے کہ ایک زمانہ گذرنے پر بھی ان سے افسردہ دل گرم ہو جاتے ہیں۔ وہ قبیلہ خٹک کا سردار تھا۔ شاہجہان نے اس کا حقِ سرداری قبول کر لیا اور شاہجہان کا ذکر اس نے ہمیشہ تعریف سے کیا، لیکن اورنگزیب نے چند ایک شکوک کی بنا پر اسے گرفتار کر لیا اور رنتھنبور کے قلعے میں کئی سال قید رکھا۔ اس قید و بند نے خوشحال کو ہمیشہ کے لیے عالمگیر بلکہ تمام مغلوں کا دشمن بنا دیا اور جب اسے وفاداری کے وعدے پر آزادی ملی تو اس نے اس وعدے کا ایفا ضروری نہ سمجھا اور کچھ دیر بعد جب سرحد پر آفریدیوں نے بغاوت کی تو اس نے اپنے پُراثر اشعار سے اس آگ کو اور بھڑکایا اور کئی سال تک بغاوت کی تائید کی۔ حتیٰ کہ خود اورنگ زیب کو اٹک کے قریب دو سال تک ڈیرے ڈالنے پڑے۔ یوسف زئی افغانوں کی مدد اور زر و مال کی تقسیم سے (جس سے سرحد کے اکثر مسائل حل ہوتے ہیں) اورنگ زیب نے بالآخر اس شورش کو فرو کیا اور خوشحال خاں کا اپنا بیٹا بہرام باپ کے خلاف مغلوں سے مل گیا لیکن خوشحال خاں کی آتشِ انتقام فرو نہ ہوئی۔ اس نے اپنی کوششیں جاری رکھیں اور جب ساتھیوں کی ترکِ رفاقت سے بے بس ہو گیا تو اشعار میں اپنے دل کا بخار نکالا۔

ظلم سے اکبر تو مل کے چُپ رہنا چاہیے
اور کچھ نہ بن پڑے تو شعر کہنا چاہیے

پاکستانی ادبیات میں خوشحال خاں کی شخصیت اس قدر دلچسپ ہے کہ فقط اس کی تصنیفات پر تبصرہ کرنے کے لیے ایک مستقل کتاب درکار ہے[1]۔ یہاں ہم

[1] مقامِ شکر ہے کہ دوست محمد خاں صاحب کامل ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی نے اپنی مبسوط کتاب (خوشحال خاں خٹک) لکھ کر یہ کام پورا کر دیا۔

اس کے چند اشعار کا ترجمہ درج کرتے ہیں جن سے پتا چلے گا کہ اس جوشیلے گرشرف ہیں افغان کے دل میں اورنگ زیب اور مغلوں کی نسبت کیا خیالات گزر رہے تھے۔ اورنگ زیب کی نسبت اس کی رائے غیر جانبدارانہ نہیں، لیکن اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اورنگ زیب کے دشمن اس کی نسبت کیا کہتے تھے۔ خوشحال مغل بادشاہ کے متعلق ایک نظم میں لکھتا ہے (ترجمہ)

"میں اورنگ زیب کے عدل و انصاف کو خوب جانتا ہوں!
اور اس کے دین و مذہب اور نفس کشی اور روزہ داری سے بھی واقف ہوں!
کیا اس کے سب بھائی ایک ایک کر کے اس کی تلوار کے شکار نہیں ہوئے؟
اور اس کے باپ کو شکست کھا کر قید خانہ کی مصیبتیں نہیں جھیلنی پڑیں؟
خواہ کوئی شخص دن میں ہزار بار سجدے کرے اور زمین پر سر مارے۔
اور روزوں کی کثرت سے اس کی ناف ریڑھ کی ہڈی سے مل جائے۔
جب تک اس کے دل میں نیکی نہ ہو۔
اس کی سب عبادتیں اور طہارتیں مکر و ریا ہیں۔
اورنگ زیب کی زبان کچھ اور کہتی ہے اور اس کا دل کچھ اور ہی سوچتا ہے۔
خدا کرے کہ اس کے دل اور گردے مجروح ہو جائیں اور وہ تیغ و تفنگ کا شکار ہو۔"

لیکن خوشحال کو فقط اورنگ زیب سے عداوت نہ تھی۔ آہستہ آہستہ اس کی عداوت نے ایک قومی رنگ اختیار کر لیا اور اس نے تلقین شروع کی کہ افغان پھر اپنی کھوئی ہوئی عظمت حاصل کر لیں۔ اس نے کئی نظموں میں قدیم افغان بادشاہوں اور بہادروں کا ذکر کر کے افغانوں کو ابھارا ہے۔ ایک قصیدہ میں مغل فوج کے خلاف اپنی فتوحات گنا کر اور اورنگ زیب کی گھبراہٹ کا ذکر کر کے لکھتا ہے۔ (ترجمہ)

جب صورت حالات یہ ہو تو دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں۔
کہ یا تو مغل دنیا سے نیست و نابود ہو جائیں یا افغان تباہ ہو جائیں۔
اگر یہ کچھ ہم دیکھتے ہیں یہی نیرنگی روزگار کا تقاضا ہے۔

اور یہی خدا کی مرضی ہے تو پھر یہ کچھ ہو کے رہے گا۔
زمانہ ہمیشہ ایک ہی روش پر نہیں چلتا۔
آج یہ پھول پہ مہربان ہے تو کل کانٹے پر۔
سوائے تلوار کے کسی اور چیز سے نجات نہیں ملتی۔
جو افغان اس کے سوا کچھ اور سوچتا ہے وہ گمراہ ہے۔
افغان تیغ زنی میں مغلوں سے کہیں بڑھ کے ہیں۔
کاش کہ عقل اور سمجھ میں بھی وہ زیادہ محتاط و ہوشیار ہوں۔
اگر جُدا جُدا قبیلے سب ایک دوسرے کی مدد کریں۔
تو بادشاہوں کو بھی ان کے سامنے سر جُھکانا پڑے۔
ایک نظم میں افغان بادشاہوں کا ذکر کر کے افغانوں کی ہمت افزائی کی ہے، (ترجمہ)
بہلول کی شہرت اور شیر شاہ کی۔ میرے کانوں میں آتی ہے۔
جو ہندوستان کے افغان بادشاہ تھے۔ بڑے بہادر اور منتظم۔
انھوں نے چھ سات نسلوں تک اس عقل سمجھ سے حکومت کی
کہ ساری دُنیا ان کی تعریف سے گونجتی تھی۔
خوشحال نے ہندوستان میں ایک عرصہ گزارا تھا اور جانتا تھا کہ مغلوں کا عسکری نظام کھوکھلا ہو چکا ہے۔ وہ ایک غزل میں کہتا ہے (ترجمہ)
مغل جو اب میری آنکھوں کے سامنے گزرتے ہیں۔ پہلوں کی طرح نہیں۔
اب ان کی تیغ و تفنگ کا زمانہ گزر گیا اور فقط قلم ان کے پاس ہے۔
وہ افغانوں کو زر و مال سے خریدتے ہیں اور مکر و فن سے انھیں پھنسلاتے ہیں۔
مغلوں سے افغان عداوت کے آثار صرف خوشحال کی شاعری میں ہی نہیں ملتے، اس زمانے کے دوسرے افغان شعرا کے کلام میں بھی اس کا اظہار ہے۔ حمید کا ایک پشتو شعر ہے۔ (ترجمہ)
مغل جس گھر میں پہنچے پتھروں کی طرح

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا دُنیا میں بے انصافی کی وجہ سے آگ لگ گئی۔

ایک اور مشہور شاعر خواجہ محمدؒ کا شعر ہے۔ (ترجمہ)

اورنگ زیب کی بادشاہی میں انصاف نہیں ملے گا۔

مَیں، خواجہ محمدؒ نکل جاؤں گا کسی اور طرف کو۔

اس کے اظہار سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ان لوگوں کو اسلام سے دلچسپی نہ تھی یا یہ کہ وہ افغان عصبیت کا شکار تھے۔ انھیں تو اصل میں مغلوں اور ان کے کارندوں کی بے انصافی سے شکایت تھی۔ خوشحال خاں نے قلعہ رَن تھنبور کی قید میں جہاں کابل اور پشاور کو یاد کیا ہے، وہاں لاہور کو فراموش نہیں کیا ؎

وہ ہوا جو کابل کی طرف سے اُٹھ کر آتی ہے۔

مجھ پر عنبر چھڑکتی ہے۔

جب کوئی کابل کا نام لیتا ہے۔

میرے سینے میں جوش اُٹھتا ہے۔

اگر کوئی پشاور کا ذکر کرتا ہے۔

تو میرا دل روشن ہو جاتا ہے۔

جو کوئی لاہور کا نام لیتا ہے۔

تو اس سے بھی میرے دل کو دلاسہ ہوتا ہے۔

کابل و پنجاب کے خواہ آدمی ہوں یا کُتّے۔

جونہی مجھے دکھائی دیتے ہیں۔

میرا دل بے اختیار ان پر گر پڑتا ہے۔

ابھی تک اسلامی قومیت اور ملّی یک جہتی کے زیرِ اثر افغانوں اور مغلوں کے قبائلی اختلافات رفع نہ ہوئے تھے، لیکن اسلام سے خوشحال خاں خٹک کو بھی اسی طرح محبت تھی، جس طرح اورنگ زیب کو۔ اور اس کی نظموں میں مذہبی رنگ جھلکتا ہے ایک نظم کے چند اشعار ہیں۔ (ترجمہ)

تمام تیراہ میں مؤذن کی آواز نہیں سُنائی دیتی۔
سوائے اُس بانگ کے جو مُرغِ سحر کے گلے سے نکلتی ہے۔
اور بارک نئی، وہ بھی راہِ ہدایت سے دُور جا پڑے ہیں۔
اور آفریدی تو ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔
نہ وہ نماز پڑھتے ہیں اور نہ ہی ان کے ہاں کوئی مُلّا ہے۔
نہ وہ زکوٰۃ صدقہ دیتے ہیں اور نہ ہی ان کے دلوں میں خدا کا خوف ہے۔
نیک وہی ہے جو نبی کے احکام اور شرع کی پیروی کرتا ہے۔
اور بدبخت وہ ہے جو ان کی بجا آوری میں ٹال مٹول کرے۔
معلوم ہوتا ہے کہ تصوف[1] کی مروجہ صورت سے خوشحال کو بڑی شکایت تھی۔
اس نظم میں آگے چل کر لکھتا ہے۔ (ترجمہ)
صوفیہ کے قائل اور ملحد سبھی ایک سے ہیں۔
کیونکہ دونوں شرع اور احکام نبوی سے پہلو بچاتے ہیں۔
گاہے گاہے، کبھی کبھار، وہ کہہ لیتے ہیں۔
(ان میں سے چند ایک) لا الہ الا ہُو۔
لیکن وہ ہمیشہ گناہوں میں سرالود رہتے ہیں اور تائب نہیں ہوتے۔
خدا بچائے ان لوگوں سے، یہی خوشحال کی دُعا ہے!
خوشحال خاں خٹک کی شاعری میں ایک آگ ہے، لیکن وہ اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہُوا۔ مغلوں کی حکومت ایک قوم یا قبیلہ کی حکومت نہ تھی، بلکہ اس وسیع سائبان کے نیچے تمام مسلمانوں کے لیے آگے بڑھنے کا موقع تھا۔ خوشحال خاں خٹک کے اپنے خاندان نے ان موقعوں سے فائدے اُٹھائے، بلکہ جب دکن میں مرہٹوں کے ساتھ

---

[1] خوشحال خاں کو روہ کے ایک بڑے ولی اللہ شیخ رحمکارؒ سے تعلق خاطر تھا اور ملا عبدالحکیم سیالکوٹیؒ کی صحبت اور شاہ ادریس صدیقی ملتانی کے درس سے بھی اس نے فیض حاصل کیا تھا۔

مغلوں کی طویل کشمکش شروع ہوئی تو اورنگ زیب کا بڑا سپہسالار دلیر خاں اور دوسرے افغان جرنیل تھے۔ مغلیہ حکومت کے زوال سے اسلامی ہندوستان کے متعلق افغانوں کی ذمہ داریاں اور بڑھ گئیں۔ اس دورِ ابتلا میں امام الہند شاہ ولی اللہ جیسے بزرگوں کی کسی طرف نظر اٹھتی تھی تو وہ احمد شاہ ابدالی تھا اور اس مردِ مجاہد نے بھی اسلامی ہندوستان کی پاسبانی اور بالخصوص سُنّی علماء و شرفا کی حمایت میں کبھی کوتاہی نہ کی۔

علوم و فنون

اکبر کی وفات ۱۶۰۵ء میں ہوئی اور اس کی جگہ جہانگیر تخت نشین ہوا۔ وہ شراب اور عیش کا دلدادہ لیکن سمجھ دار اور معاملہ فہم بادشاہ تھا۔ تُزکِ جہانگیری سے اُس کی قوتِ مشاہدہ اور ذہانت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ جس نے اکبر کی مذہبی بوالعجبیوں کا خاتمہ کر دیا لیکن باقی باتوں میں اکبر کی پیروی کی۔ اور اس کے زمانے میں فنونِ لطیفہ کو بڑا فروغ ہوا۔ وہ شعرا کا قدردان تھا۔ دربار کا ملک الشعرا طالب آملی تھا جس کے کئی اشعار پُرلطف ہیں۔ فنِ تعمیر میں بھی عہدِ جہانگیری کے کئی نمونے موجود ہیں لیکن اس زمانے میں سب سے زیادہ فروغ مصوری کو ہوا۔ جس کا جہانگیر ایک اچھا نقاد تھا۔ عہدِ جہانگیری کے بہترین مصوّر چار تھے۔ ابوالحسن جسے "نادر الزمان" کا خطاب ملا تھا اور منصور جسے "نادر العصر" کا خطاب عطا ہوا تھا۔ ان کے علاوہ بشن داس اور فرخ بیگ بھی مشہور تھے۔ مورخین کئی تھے۔ اس عہد کے علماء و صلحاء کا ذکر شیخ عبدالحق کے تذکرے کے ضمن میں ہو چکا ہے

۱۶۲۸ء میں شاہجہان تخت نشین ہوا۔ اس کا زمانہ خاندانِ مغلیہ کا سب سے زیادہ شاندار اور پُرشکوہ عہدِ حکومت ہے۔ فارسی کا مشہور شاعر صائب اسی زمانے میں ہندوستان آیا، لیکن ملک الشعرائے دربار کلیم تھا، جس کا مدِمقابل قدسی سمجھا جاتا تھا۔ علماء و فضلا میں عبدالحکیم سیالکوٹی، سعد اللہ خاں وزیرِ اعظم اور ملا محمود جونپوری مشہور تھے۔ مورخین کئی تھے۔ جن میں محمد امین قزوینی۔ عبدالحمید لاہوری اور راجا بہاری مل قابلِ ذکر ہیں۔ مصوّر بھی بہت تھے۔ شاہجہان کے زمانے میں ہندوستانی مصوّر ایرانی اور ولائتی مصوّروں سے فنِ مصوری سیکھ کر خود اتنے کامل

ہوگئے تھے کہ وہ ایرانی مصوروں کا بخوبی مقابلہ کرسکتے تھے۔ اور اس عہد کے مشہور مصوروں میں زیادہ تر ہندوستانی بلکہ ہندو ہیں۔ مصوری سے زیادہ جس بات میں شاہجہان کا زمانہ ممتاز تھا' وہ اسلامی فنِ تعمیر کا عروج ہے۔ اس زمانے میں تاج محل۔ لال قلعہ جامع مسجد دہلی۔ جہانگیر کا مقبرہ اور دوسری عمارتیں تعمیر ہوئیں' جنھیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے اور جن سے بہتر فنِ تعمیر کے نمونے شاید ہی دُنیا میں کہیں ہوں۔

اورنگ زیب کے زمانے میں موسیقی اور مصوری پر زوال آگیا۔ وہ خود شعر کا صحیح نقاد تھا اور اس نے کم از کم ایک نہایت پُراثر اور بلیغ شعر خود لکھا ہے ؎

غمِ عالم فراوان است و من یک غنچہ دل دارم
چساں در شیشہ ساعت کنم ریگِ بیاباں را

لیکن اس ــــ ملک الشعرا کا عہدہ موقوف کر دیا۔ مرزا بیدل فطرت۔ ناصر علی سرہندی اور نعمت خاں عالی اس کے زمانے کے شعرا ہیں' لیکن کفایت شعار اورنگ زیب نے ان کی کوئی قدر نہ کی' بلکہ دس سال کی وقائع نویسی کے بعد درباری مورخ کا عہدہ بھی موقوف کر دیا اور تاریخ نویسی کی ممانعت کر دی۔ اس کے باوجود اس کے زمانے میں کئی مورخین ہوئے۔ اورنگ زیب نے اپنی توجہ زیادہ تر رعیت کی خوشحالی۔ ٹیکسوں اور محصولوں کی کمی اور تعلیم کی اشاعت پر مبذول رکھی۔ اس کا زمانہ فنونِ لطیفہ کے لیے سازگار نہ تھا۔ البتہ شریعت اور علومِ اسلامی کی اشاعت خوب ہوئی۔ اس نے اشاعتِ علم کو بڑی ترقی دی۔ مدرسوں کے لیے زمینیں وقف کیں اور اساتذہ کے مشاہرے اور طلبا کے لیے شاہی خزانے سے وظائف مقرر کیے۔

اورنگ زیب کے عہدِ حکومت میں علومِ اسلامی کی بڑی قدر ہوئی۔ لیکن قدرت کی نیرنگیاں دیکھیے کہ پچاس سال کے طویل عرصے میں نہ تو شیخ عبدالحق محدثؒ یا امام الہند شاہ ولی اللہؒ جیسا کوئی جید عالم اور نہ ہی حضرت سلطان المشائخ یا حضرت مجدد الف ثانیؒ جیسا کوئی زبردست شیخ نظر آتا ہے۔ البتہ مدرس اور فقیہ بکثرت تھے اور بعض خاصے تھے۔ ان میں سے ایک قابلِ ذکر ہستی میر محمد زاہد ہروی کی تھی' جو کلام و حکمت میں

اپنے زمانے کے سب سے بڑے عالم سمجھے جاتے تھے۔ ان کے والد قاضی محمد اسلم ہرات کے رہنے والے تھے لیکن بود و باش کابل میں اختیار کر لی تھی۔ قاضی محمد اسلم نے لاہور میں شیخ بہلول سے تعلیم پائی اور عہدِ جہانگیری و شاہجہانی میں معزز عہدوں پر مامور رہے۔ پہلے کابل میں قاضی تھے۔ پھر قاضیِ عسکر ہو گئے۔ شاہجہاں نے ایک مرتبہ ان کا وزن کرا کے وزن کے برابر روپے انعام دیے۔ قاضی محمد اسلم کی وفات ۱۶۵۱ء میں ہوئی اور لاہور میں دفن ہوئے (سبحۃ المرجان)۔ ان کے صاحبزادے میر محمد زاہد ہندوستان میں پیدا ہوئے اور شاہجہان نے انھیں کابل میں واقعہ نویسی پر مامور کر رکھا تھا۔ عہدِ عالمگیری میں وہ پہلے محتسب لشکر اور بعد میں صدارت کابل پر مامور ہوئے اس تقریب سے انھیں دلجمعی سے اپنے وطن میں بیٹھ کر تالیف و تصنیف کا موقع ملا۔ انھوں نے کئی ایک درسی کتب مثلاً شرح مواقف۔ شرح تہذیب دوانی اور رسالہ تصور و تصدیق مصنفہ ملا قطب رازی پر حاشیے لکھے، جو اب بھی رائج ہیں۔ ان کی وفات ۱۶۹۰ء میں ہوئی۔ جن لوگوں نے ان سے دار الخلافے میں براہِ راست استفادہ کیا۔ ان میں شاہ ولی اللہ کے والد ماجد شاہ عبد الرحیم کا نام بھی شامل ہے۔

ہندوستان میں اس وقت سب سے زیادہ فروغ علماے پورب کو حاصل تھا۔ شیخ عبد الحق محدثؒ کی جلائی ہوئی شمعیں دہلی میں مدھم پڑ چکی تھیں۔ پنجاب میں ملا عبد الحکیم کا فیض ان کے صاحبزادے ملا عبد اللہ نے جاری رکھا۔ لیکن وہ گوشہ نشینی کی طرف زیادہ مائل تھے۔ اگرچہ گجرات میں اب بھی درس و تدریس کا معیار بلند تھا اور اواخر عہدِ عالمگیری میں وہاں مولٰنا نور الدین احمد آبادی جیسے علما ہوئے، لیکن جو امتیازی شان اس وقت بلادِ مشرق کے علما کو حاصل تھی، وہ کسی دوسرے صوبے کو میسر نہ ہوئی۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ شاہ ولی اللہؒ کی مخصوص خوبیوں کے باوجود عہدِ عالمگیری سے لے کر مغلیہ سلطنت کے خاتمے تک عام دنیوی درس و تدریس میں دہلی اور باقی حصص ملک کی نسبت لکھنؤ اور دوسرے اضلاع شرقی کی درسگاہیں زیادہ رونق پر تھیں۔ اس وقت بھی ان علاقوں میں ایسے علما تھے، جن کے سامنے دوسروں کے چراغ ماند پڑ گئے۔ ایک بزرگ شیخ احمد

المعروف ملا جیون امیٹھوی تھے (وفات ۱۷۱۸ء) جو لکھنؤ کے قریب قصبہ امیٹھی کے رہنے والے تھے۔ عالمگیر خود ان کا شاگرد تھا۔ ان کی تصانیف میں سے ایک تفسیر احمدی ہے۔ جس میں ان آیات کی تفسیر ہے، جن سے مسائلِ فقہ مستنبط ہوتے ہیں۔ ان کی نور الانوار اصولِ فقہ میں منار کی شرح ہے۔ ایک اور بزرگ حافظ امان اللہ بنارسی تھے (وفات ۱۷۲۱ء) جو لکھنؤ میں عہدہ صدارت پر متعین تھے۔ انھوں نے علمِ فقہ اور علمِ کلام پر کئی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ علمائے فرنگی محل لکھنؤ کے مورثِ اعلیٰ ملا قطب الدین سہالوی نے بھی اسی زمانے میں شہادت پائی تھی (۱۶۹۲ء) ان کے علاوہ شیخ غلام نقشبند لکھنوی بھی جنھوں نے علمِ تفسیر اور فنِ تصوف میں متعدد کتابیں لکھیں، ذکر کے قابل ہیں۔ ان کی وفات ۱۷۱۴ء میں ہوئی۔ سید عبد الجلیل بلگرامی (وفات ۱۱۳۸ھ ۱۷۲۵ء) جو حسان الہند میر غلام علی آزاد بلگرامی کے نانا اور خود ایک پرگو شاعر اور کئی زبانوں کے ماہر تھے۔ طریقت میں شیخ غلام نقشبند کے مرید تھے، لیکن ان سب سے زیادہ اس زمانے کے جس بزرگ نے علمی حلقوں میں نام پایا اور معقولات کو درسیات میں بڑی ممتاز جگہ دے دی۔ قاضی محب اللہ بہاری تھے۔ وہ لکھنؤ اور حیدرآباد دکن میں قاضی رہے۔ پھر اورنگ زیب کے جانشین بہادر شاہ کے بیٹے شہزادہ رفیع القدر کے اتالیق مقرر ہوئے اور عالمگیر کی وفات کے بعد کچھ عرصہ تمام ہندوستان کی صدارت پر مامور رہے۔ ۱۷۰۸ء کے اواخر میں وفات پائی۔ آپ نے فقہ اور منطق کی بہت سی کتابیں لکھیں۔ جن میں سے بعض آج بھی مستعمل ہیں۔ مسلم الثبوت فقہ اور اصولِ فقہ کے متعلق آپ کی ایک بلند پایہ کتاب ہے اور علامہ بحر العلوم اور دوسرے علماء نے اس پر حاشیے لکھے ہیں۔ منطق میں آپ کی مشہور کتاب سلم العلوم ہے۔ ان کے علاوہ افادات جوہر فرد اور دوسرے رسائل آپ کی یادگار ہیں۔

عہدِ عالمگیری میں شیخ عبد الحق محدث اور شاہ ولی اللہ کے پایہ کا کوئی عالم نظر نہیں آتا۔ لیکن اب بادشاہ کی علم نوازی اور قدر دانی علماء سے علم و فضل کو بے حد فروغ ہوا۔ اور درسِ علوم اسلامی نے بڑی وسعت اختیار کی۔ درسِ نظامیہ عالمگیر کی

وفات کے کئی سال بعد مدون ہوا لیکن ملا نظام الدین کو جن کے نام پر یہ طریق تدریس نظامیہ کہلاتا ہے، عالمگیر نے ہی فرنگی محل لکھنؤ کی عالیشان عمارت مدرسہ کے لیے عطا کی۔ اس طریق تعلیم میں جو کتابیں برصغیر کی رائج ہیں ان کا اکثر حصہ عہد عالمگیری میں لکھا گیا۔ اور وہ بھی بادشاہ کے منظور نظر علما (مثلاً میرزاہد۔ ملا محب اللہ بہاری) کے قلم سے۔ یہ کہنا بیجا نہیں کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں علوم اسلامی نے جو فروغ پایا۔ اور دین کا جو احیا ہوا، اس کی بنیاد عہد عالمگیری میں رکھی گئی۔

فتاوٰے عالمگیری

عہد عالمگیری کی دو تین کتابیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں ایک ملا محسن (متوفی ۱۷۰۷ء) کی رد شیعہ ہے جس میں انھوں نے دلائل و براہین سے شیعوں کے اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ دوسری نجم الفرقان ہے۔ جسے مولانا محمد مصطفےٰ بن محمد سعید نے اورنگ زیب کے نام معنون کیا۔ یہ فلوگل کی کتاب کی طرح کلام مجید کے الفاظ کا انڈکس ہے۔ تیسری کتاب عہد عالمگیری کی سب سے اہم تصنیف فتاوٰی عالمگیری ہے، جسے ہندوستان کے حنفی علما ہدایہ کے بعد بہترین فقہی کتاب سمجھتے ہیں۔ فقہ کے متعلق اس وقت کئی کتابیں موجود تھیں۔ لیکن کوئی مبسوط اور مکمل کتاب نہ تھی۔ جب اورنگ زیب نے باقاعدگی سے شرع رائج کی تو اس نے محسوس کیا کہ کئی باتیں ایسی ہیں، جن کے متعلق صحیح شرعی فیصلے پر پہنچنے میں دقت ہوتی ہے۔ چنانچہ اس نے ہندوستان کے ممتاز علما کی ایک جماعت کو حکم دیا کہ فقہ کی تمام کتب سے "مفتیٰ بہا مسائل" منتخب کر کے ایک کتاب تیار کی جائے جو فقہ کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہو۔ اس جماعت کے صدر شیخ نظام تھے۔ علما کے لیے وظائف مقرر ہوئے اور آٹھ سال کی محنت کے بعد کتاب تیار ہوئی۔ اس کی تیاری میں دو لاکھ روپے صرف ہوئے۔ معاصرانہ تذکروں سے خیال ہوتا ہے کہ بادشاہ اس کی تدوین و تالیف میں خود شریک تھا۔ وہ کتاب کا ایک صفحہ روزانہ ملا نظام سے پڑھوا کر سنتا تھا اور اس پر جرح قدح کرتا تھا۔ فتاوٰے عالمگیری کے متعلق معارف کے ایک مضمون نگار لکھتے ہیں "حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب نے علماء اور طلباء کو فقہ کی

تمام کتابوں سے بے نیاز کر دیا۔"

مراۃ العالم میں لکھا ہے کہ بادشاہ نے نامور فاضل ملا عبداللہ رومی چلپی کو حکم دیا کہ وہ اور اُن کے شاگرد فتاوٰے عالمگیری کا فارسی میں ترجمہ کریں لیکن اس ترجمے کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ غالباً وہ تکمیل کو نہیں پہنچا۔ حال میں نولکشور پریس نے ایک اُردو ترجمہ فتاوٰی ہندیہ کے نام سے شائع کیا ہے۔ کوئی پانچ ہزار صفحے کی کتاب ہے۔ دس جلدوں میں۔ شروع میں دو سو سے زیادہ صفحے کا مقدمہ ہے جس میں ان علماء فقہاء کے مختصر حالات ہیں، جن کی تصانیف و آرا سے مدد لی گئی۔ ابتدائی دو جلدیں زیادہ تر ارکان مذہب مثلاً نماز، حج، روزہ، زکوٰۃ کے متعلق ہیں۔ جلد سوم ایمان، حدود، سرقہ اور اس قسم کے اہم مسائل کے متعلق ہے۔ چالیس صفحے باب ارتداد کے لیے وقف ہیں۔ چوتھی جلد میں زیادہ تر کاروباری مسائل ہیں۔ مثلاً شرکت۔ بیوع۔ وقف۔ پانچویں جلد بیشتر عدالتی امور کے متعلق ہے۔ بعض عنوانات ہیں۔ ادب القاضی کتاب الشہادات کتاب الوکالت۔ چھٹی ساتویں اور آٹھویں جلدوں میں قانونی مسائل ہیں۔ جن کا بڑا حصہ فوجداری امور کے متعلق ہے۔ جلد نہم کا سب سے اہم باب ذمیوں کے متعلق ہے اور جلد دہم میں ستر سے زائد صفحوں کا باب الحیل[1] ہے۔ کتاب کا طریق کار یہ ہے کہ اہم مسائل پر فقہ کی مشہور اور مستند کتابوں کے اقتباسات مآخذ کے حوالوں کے ساتھ جمع کر دیے گئے ہیں اور یہ انتخاب اور ترتیب اس محنت اور احتیاط کے ساتھ کی گئی ہے کہ جو مسائل قاضی یا مفتی کو پیش آسکتے ہیں، ان کے متعلق مشہور فقہا کی رائے بغیر کسی دشواری کے دستیاب ہو سکتی ہے۔

عالمگیر اور بزرگانِ سرہند

پروفیسر محمد فرمان اپنی کتاب حیات مجدد میں

---

[1] مولانا ابوالکلام آزاد نے تذکرہ میں ان فقہا کی مذمت کی ہے جو فقہی کتب میں باب الحیل کو شامل کرتے ہیں لیکن جس قانونی نظام میں سزائیں کڑی اور معین ہوں اور سزا دینے والے کو اس کا اختیار نہ ہو کہ جرم کی معمولی صورتوں میں سزا میں مؤثر تخفیف کر سکے۔ وہاں بے انصافی اور جرم سے بچنے کے لیے باب الحیل ناگزیر ہے۔

لکھتے ہیں :۔

"جہانگیر، شاہجہان اور اورنگ زیب بھی شہنشاہ پہلے تھے۔ اور اس کے بعد ان کے دلوں میں اسلام کی محبت اور شریعت کی ترویج کا خیال تھا۔" (ص ۵۸۶)

بنیادی طور پر تو یہ خیال صحیح ہے کہ یہ تینوں بادشاہ ملکی مصلحتوں کا خیال رکھتے تھے۔ اور اس میں فقط ان کی شخصی یا خاندانی خود غرضی نہ تھی۔ اگر ہم اس تباہی کا خیال کریں جو حکومت کے زوال سے اسلامی مرکزوں (مثلاً سرہند) پر آئی تو مسلمان بادشاہوں کی اپنی (یعنی مسلمانوں کی) حکمرانی برقرار رکھنے کی کوشش معیوب نہیں معلوم ہوتی۔ لیکن عالمگیر کے متعلق تو یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ اس نے اپنی "شہنشاہت" کو "اسلام کی محبت اور شریعت کی ترویج" پر مقدم رکھا۔ یہ درست ہے کہ (اکابر سلسلہ مجددیہ سے بڑی موانست اور احترام کے باوجود) اس نے مکاتیب امام ربانی کی نسبت ایسے احکام جاری کیے جو بزرگان سرہند کو ناگوار تھے، لیکن ان احکام کے پس پشت بھی شریعت سے بے اعتنائی نہ تھی بلکہ ان کا مقصد بھی فتاوٰے علما کی پیروی اور شرع کی ترویج تھا۔

حضرت مجدد الف ثانی کے صاحبزادگان گرامی، خواجہ محمد سعیدؒ اور خواجہ محمد معصومؒ کے ذکر میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ ان بزرگوں کے مجموعہ ہائے مکاتیب میں متعدد خطوط اورنگ زیب کے نام ہیں۔ اور عالمگیر نامہ کے وہ اندراجات بھی نقل کر چکے ہیں، جن سے ان بزرگوں اور عالمگیر کے روابط پر روشنی پڑتی ہے۔

مکتوبات سعیدیہ میں کل سو مکاتیب ہیں۔ ان میں سے نو عالمگیر کے نام ہیں۔ ایک خط خاص طور پر اہم ہے۔ اس کا اقتباس ملاحظہ ہو:۔

الحمد للہ کہ بطلوع آفتاب ہدایت، ظلمات کفر و ضلالت رو بانعدام آورد۔ و بیخ الحاد و بدعت از پا افتاد، و رایات عدل و انصاف بافق اعلیٰ رسید.... معہذا اگر از راہ عنایت و دین پروری ما لقی من الفواحش والمنکرات و منع برخے از منہیات و مسکرات بمقتضائے خدمات اسلام تاکید اہتمام روئے نور علیٰ نور است، و در باب تعمیر مساجد منہدمہ و مدارس معطلہ و ترفیہ علماء و فضلا و تکریم زہاد و صلحا احکام واجب الاستعلام شرف صدور

یابد۔ موجب اعلاے ارکانِ شریعتِ بیضا و تمکین دولتِ عظمیٰ بطریقِ اتم باشد۔ زیادہ براں جرأت از حدِ ادب دُور است۔ (۳۷)

خواجہ محمد معصومؒ کے اہم مکاتیب اس زمانے کے ہیں جب انھوں نے اپنے صاحبزادے شیخ سیف الدین کو دارالخلافہ میں بھیجا تھا۔ اس سلسلے میں پہلا خط شیخ سیف الدین کے نام ہے:۔

آنچہ در احوال بادشاہ دین پناہ سلمہ اللہ مرقوم نمودہ بودند از سریانِ ذکر در لطائف و حصولِ سلطانِ ذکر و رابطہ و قلتِ خطرات و قبولِ کلمۂ حق و رفعِ بعضے منکرات و ظہورِ لوازمِ طلب ہمہ بوضوح پیوست۔ شکرِ خداوند جل شانہ بجا آورد۔ در طبقہ سلاطین ایں نوع امور حکم عنقاے مغرب دارد (۲۲۲)

اگلا خط بادشاہ کے نام اور بادشاہ کے ایک خط کے جواب میں ہے:۔

فرمانِ عالیشان کہ از کمالِ عنایت و مہربانی مرقوم قلمِ عنبریں رقم گشتہ بود بخواجہ محمد شریف بخاری در اعزّ از منہ رسانید و فقرائے بے نیاز را بہ تشریفاتِ عالیہ بنواخت ۔۔۔ الحمد للہ والمنۃ کہ فقیر زادہ منظورِ نظرِ قبول گشتہ و اثرِ صحبت بحصولِ انجامید و از معروف و نہی منکر کہ شیوۂ فقیر زادہ است، اظہارِ تشکر و رضامندی نمودہ است۔ شکرِ خداوندی جل شانہ بہمیں تحلیہ بجا آورد (۲۲۳)

ایک اور خط میں عالمگیر کو لکھتے ہیں:۔

"کیفیت سعی باطن را در کتابت فقیر زادہ پیش نوشتہ است، بنظرِ عالی در آمدہ باشد۔ استمداد توجہ غائبانہ ازیں شکستہ فرمودہ اند۔ ہر چند از راہِ دعاگوئی قدیم سابقاً ہم اکثر بعاد توجہ آنحضرت مشغول بودہ، درینولا کہ ایں قسم مہربانیہا و خصوصیت درمیان آمدہ، خود بجمیع ہمت بطریق معہود ایں سلسلۂ علیہ در ترقی باطن و ازدیادِ کیفیت آں و استقامت

لہ یہ سب دفترِ سوم میں ہیں، جو ایک مرتبہ امرتسر میں چھپا تھا۔ لیکن اب عنقا کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے ہم نے تمام اہم متعلقہ اندراجات نقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ تینوں دفاتر کا ایک کار آمد ملخص (اردو میں) مولانا نسیم احمد امروہی نے مکتوبات خواجہ محمد معصوم سرہندی کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس میں اہم خطوط کے اقتباسات کے ترجمے ہیں۔

ظاہر نیز مقید است و بہیچ وجہ تقصیر رضا ندارد" (۲/۲۳۳)

ایک خط میں شیخ سیف الدینؒ کو لکھتے ہیں :۔

نوشتہ بودند کہ در مجالس سلطانی طرفہ اسرار لازم الاستتار جلوہ مید ہند۔ و بجرد دخول باآں محافل بعروج و نزول خاص ممتاز می سازند۔ بلے اہلِ کمال از ہر بقعہ فیوض و اسرار مناسبۂ آں بقعہ اخذ می نمایند۔ و از ہر زمین کمالِ مناسب آں زمین میگیرند۔ ..... و در احوال بندگانِ حضرت برنگاشتہ بودند کہ از وسعتِ لطیفۂ اخفی و مناسبتِ تام باآں خبر مید ہند، از مطالعۂ آں ذوقہا کرد۔ لطیفۂ اخفی اعلائے لطائف است و ولایتِ آں فوق سائر لطائف است و ایں لطیفہ را خصوصیتے ست خاص بہ سرورِ کائنات و مفخرِ موجودات علیہ و علیٰ آلہ الصلوات و التسلیمات و البرکات، فقیر نیز ایشاں را مناسبتے بہ لطیفۂ اخفی درمے یابد (۳/۲۴۲)

شیخ سیف الدین کے نام کے ایک اور خط میں بادشاہ کا ذکر ہے :۔

آنچہ از احوال پادشاہِ دین پناہ مرقوم نمودہ بودند۔ ہمہ بوضوح انجامید۔ در طبقۂ سلاطین ظہور ایں نوع امور از غرائبِ روزگار است ..... نوشتہ بودند کہ مبدأ تعین خود را صفتِ علم یافتہ اند و لے فرمایند کہ بایں صفت مبارک بیشتر مناسبت یافتہ میشود، از مطالعۂ آں خطہا نمود ۔ نزدیک بود کہ رقص کند۔ حق سبحانہ از برکاتِ ایں صفتِ بزرگ بہرۂ تام عطا فرماید (۳/۲۴۲)

ان اقتباسات سے پتا چلتا ہے کہ اگرچہ عالمگیر نے حضرت خواجہ محمد معصومؒ سے بیعت نہ کی تھی (ورنہ اس اہم امر کی صراحت ہوتی) لیکن اس نے ان کے صاحبزادے شیخ سیف الدین سے بعض اشغال نقشبندیہ سیکھے۔ اور خود حضرت خواجہؒ سے "توجہ غائبانہ" کی آرزو کی۔

مکتوباتِ معصومیہ (دفتر سوم) میں دو اور دلچسپ خطوط ہیں۔ ایک کامگار خاں کے نام، جو وزیر سابق جعفر خاں کا بیٹا اور خود ایک منصبدار تھا۔ دوسرا بختاور خاںؒ کے نام، جسے

ؒ بختاور خاں سے خواجہ نقشبند ثانیؒ کے تعلقات اور بھی گہرے تھے۔ جیسا کہ ان کے مکتوب ۶۵ سے ظاہر ہے۔

مراۃ العالم' اس کی ترمیم شدہ صورت مراۃ جہاں نما[1] اور ریاض الاولیا کا مصنف کہا جاتا ہے ۔ وہ عالمگیر کا ایک معتمد اور عزیز عہدیدار تھا ۔ علما و مشائخ کا قدردان تھا ۔ اور ان کے بادشاہ سے روابط کا ایک ذریعہ تھا ۔

مندرجہ بالا اقتباسات اور حوالوں سے بزرگانِ سرہند اور عالمگیر کے قریبی روابط کا پتا چلتا ہے' لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایک زمانے میں عالمگیر نے مکتوباتِ امام ربّانی پڑھائے جانے کی ممانعت کا حکم جاری کیا تھا ۔ معارج الولایت میں ۲۵ شوال ۱۰۹۰ھ کا ایک خط درج ہے' جو عالمگیر کے ایما پر قاضی شیخ الاسلام (جو اپنے والد کی جگہ قاضی القضاۃ ہوئے) کی مُہر سے قاضی اورنگ آباد کے نام لکھا گیا ۔ (... حسب الحکم بادشاہِ اسلام بمہر قاضی شیخ الاسلام بجانب قاضی اورنگ آباد رسید) یہ حکم حسب ذیل تھا :-

> از قرار بتاریخ بیست و ہفتم شہر شوال' سنہ یک ہزار و نود ہجری' آنکہ شریعت پناہ فضائل و کمالات دستگاہ' فقاہت انتباہ قاضی ہدایت اللہ بعافیت باشندہ درینولا بعرضِ مقدس معلےٰ رسید ۔ کہ بعضے مواضع مکتوبات شیخ احمد سرہندی بظاہر درمخالفت

---

[1] ان تینوں کتابوں کا اصل مصنف شیخ محمد بقا سہارنپوری کو سمجھنا چاہیے ۔ انھوں نے حدیث کی سند شیخ نورالحق محدث دہلوی سے لی ۔ باقی علوم سرہند میں جا کر شیخ عبداللہ المعروف حضرت میاں ؒ سے پڑھے ۔ اور خواجہ محمد معصومؒ کے مریدوں میں داخل ہوئے (ملاحظہ ہو خاتمہ مراۃ جہاں نما) چنانچہ ان تینوں کتابوں میں بزرگانِ سرہند کے متعلق کافی معلومات مل جاتی ہیں ۔ اور ان کا نقطۂ نظر بھی "سرہندی" ہے ۔ مآثر عالمگیری کا مصنف ساقی مستعد خاں پہلے بختاور خاں کا منشی اور دیوان تھا ۔ غالباً بختاور خاں اور اس کے رفقائے کار کو بزرگانِ سرہند سے خاص لگاؤ تھا ۔ مآثر عالمگیری میں حضراتِ سرہند کے متعلق کئی اندراجات ہیں ۔ اور ہندو مسلم معاملات (مثلاً تمام ممالکِ محروسہ میں غیر اسلامی معابد" اور پرستش گاہوں کے "خاتمہ") کے متعلق ان کے بیانات بڑے جوشیلے ہیں ۔ بلکہ عالمگیر کے معترض اکثر اس کتاب کے حوالے دیتے ہیں ۔

عقائدِ اہلِ سنت وجماعت است۔ ومعتقدان شیخ مذکور کہ در بلدۂ اورنگ آباد
خجستہ بنیاد سکونت دارند۔ ترویج آں بیشتر دہند وتدریس مے نمایند۔ اعتقادِ حقیقت
باطلۂ مذکورہ دارند۔ حکمِ والا شرفِ صدور یافت۔ کہ ایں خادمِ شریعت با شریعت پناہ
بنویسد۔ کہ آنہارا از رشد ودرس آں منع کند۔ کسے کہ معلوم شود۔ کہ معتقد عقائدِ باطلہ
مذکور است' او را بسزائے شرعی رسانند۔ لہٰذا نگارش مے باید۔ کہ بر طبقِ حکمِ مطاع
واجب الاتباع بہ عمل آرند وحقیقت بر نگارند۔"

[معارج الولایت مخطوطہ شمارہ ۱۲۸۱ کتاب خانہ دانشگاہ پنجاب ورق ۴۰۴]

یہ خط ۲۵ شوال ۱۰۹۰ھ (مطابق ۳۰ نومبر ۱۶۷۹ء) کا ہے۔ اور قاضی اورنگ آباد
کے نام ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے تین چار سال بعد دار الخلافہ میں بھی مکتوبات
امام ربانی کے خلاف ایک ہنگامہ ہوا۔ روضۃ القیومیہ میں قیوم ثالث (خواجہ محمد نقشبند)
کی قیومیت کے سال پانزدہم کا سارا باب اسی کے متعلق ہے۔ چونکہ روضۃ القیومیہ کے
مطابق قیوم ثالث کی قیومیت کا آغاز ۱۱ ربیع الاول ۱۰۷۹ء کو ہوا۔ اس لیے یہ واقعات
۱۰۹۴ھ کے متعلق ہی ہو سکتے ہیں۔ روضۃ القیومیہ کے اندراج کا خلاصہ یہ ہے کہ جب
"طریقہ احمدیہ معصومیہ" نے بڑا فروغ پایا تو دشمنوں نے حسد سے طریقہ کی مخالفت شروع کی۔
تین خط بادشاہ کی طرف سے جعلی لکھ کر سرہند بھیجے۔ جن کی بادشاہ کو مطلق خبر نہ تھی۔
ایک حضرت قیوم ثالث رضی اللہ عنہ کے نام۔ دوسرا شیخ سیف الدین کے نام اور
تیسرا مولوی فرخ شاہ صاحب کی طرف۔ جن کا مضمون یہ تھا۔ کہ حضرت مجدد الف ثانی
رضی اللہ عنہ کے مکتوبات کی بعض عبارتیں بظاہر مخالفِ شرع ہیں۔ اور تمام علما نے
متفق ہو کر اس بات کا فتوےٰ دیا ہے کہ مکتوبات کا پڑھنا پڑھانا بند کر دیا جائے۔ اس بابت
میں ایک محضر پر تمام علما کے دستخط کر کے سارے مخالف اکٹھے ہو کر دار الخلافہ میں
آئے۔ اور اس طریقہ کے خلفا کو پیغام بھیجا۔ کہ تمھارے شیخ کے کلام کے بعض حصے
شریعت کے موافق نہیں۔ تم اگر اس کا جواب دو، جو شرع کے مطابق ہو۔" روضۃ القیومیہ کے[1]

---

[1] روضۃ القیومیہ رکن سوم صفحہ ۴۳-۴۴

بیان کے مطابق" احمدی اور معصومی تمام خلفاء دارالخلافہ میں جمع ہوئے۔ مخالفوں نے جو سوال کیے۔ ان کے شافی اور شریعت کے مطابق جواب دیے کہ مخالفوں کو اعتراض کی گنجائش نہ رہی .... پھر بادشاہ نے انھیں اپنے پاس بلایا .. مناظرہ ہونے لگا۔ جس میں مخالفین نے نیچا دیکھا۔ بادشاہ نے انھیں بہت شرمندہ کیا۔"

روضۃ القیومیہ میں یہ بھی لکھا ہے۔ کہ مخالفین کے جواب میں بہت سے رسالے لکھے گئے۔ فقط حضرت مجدد الف ثانیؒ کی اولاد نے بہتر رسالے لکھے اور خلفا کے مکاتیب و رسائل کو ملا کر سب کی تعداد تین سو ساٹھ تھی۔ مولوی فرخ شاہ صاحب یہ رسائل لے کر بادشاہ کے پاس آئے تو اس نے ان کی بڑی عزت کی اور یقین دلایا کہ جو خطوط مشائخ سرہند کے نام میری طرف سے لکھے گئے' ان کی مجھے خبر نہیں۔

ہم روضۃ القیومیہ کے متعلق لکھ چکے ہیں کہ یہ ایک خاص نقطۂ نظر سے لکھی گئی۔ اور بغیر مزید تصدیق کے' اس کے اندراجات پر اعتماد نہ کرنا چاہیے۔ واقعات کو رنگ لگا کر بلکہ موڑ توڑ کر اور ڈرامائی انداز سے پیش کرنا مصنف کا دلپسند طریق کار ہے' لیکن معارج الولایت میں بھی استفتا کے تحت[1] کئی صفحوں پر مخالفین کے فتوے درج ہیں۔ اس لیے بعید از قیاس نہیں کہ فریقین میں کوئی بحث و مناظرہ ہوا ہو۔

معارج الولایت میں قاضی شیخ الاسلام کا جو خط درج ہے' وہ تاریخی نقطۂ نظر سے معلومات افزا اور غور و فکر کا مستحق ہے۔ اور خواجہ محمد نقشبندؒ کے مکاتیب سے بھی نفسِ مضمون (یعنی مکاتیب امام ربانیؒ کے بعض اندراجات کے متعلق اورنگ زیب کے اپنے شبہات) کی کسی حد تک تائید ہوتی ہے۔ لیکن مکتوبات کے پڑھنے پڑھانے کی بابت میں جو ممانعت ہے' اسے ضرورت سے زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہیے۔ عالمگیر کے متعلق یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس نے دیوانِ حافظ کے پڑھنے پڑھانے کی ممانعت

---

[1] غالباً یہ وہی "رسالہ استفتا" ہے' جس کا ذکر خواجہ محمد نقشبند ثانیؒ کے مکتوب ۱۸۱ میں ہے۔ قاضی شیخ الاسلام کے نام کے مکتوب (۲۴۲) میں بھی انھی بحثوں کی طرف اشارے ہیں۔

کر دی تھی۔ اگرچہ یہ کتاب اُس کو بے حد عزیز تھی۔ اور بقول ایک تذکرہ نگار کے اس کے سرہانے رہتی تھی۔ دوسری قابلِ ذکر حقیقت یہ ہے کہ اس امر کے قوی شواہد موجود ہیں کہ معارج الولایت اور روضۃ القیومیہ میں بیان کردہ بحثوں کے بعد بھی عالمگیر کے دل میں بزرگانِ سرہند کی بڑی قدر رہی۔ اور ان کے ساتھ اس کے روابط بڑے گہرے تھے خواجہ محمد معصومؒ کے صاحبزادے خواجہ محمد نقشبندؒ، جنھیں قیوم ثالث کہا جاتا ہے، کے مکاتیب کا ایک حصہ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب نے شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو جو مخطوطہ ملا۔ وہ "کسی نہایت بدخط اور غلط نویس کاتب کا لکھا ہوا تھا" انھوں نے کسی بزرگوں کو تصحیح کی زحمت دی، "لیکن پھر بھی غلطیاں رہ گیئں"۔ یہ غلطیاں اتنی فاش ہیں کہ بعض جگہ تو مطلب خبط ہو جاتا ہے۔ اور ایک آدھ طویل خط کے متعلق

لہ مثلاً اس اہم خط کو لیجیے، جو مکتوباتِ امام ربانی کے متعلق معاصرانہ رسالۂ استفتا کے بارے میں اہم معلومات کا حامل ہے۔ متعلقہ عبارت ملاحظہ ہو: "تعجبہا نمودہ اند۔ [کہ جواب] از رسالۂ استفتیٰ [نہ نمودہ تحقیقِ حال] آں کہ دریں [باب] بادشاہ دین پناہ۔ شیخ [؟] بالمشافہ بعضے حقائق از رسالہ موصولہ ایشاں بہ ایں فقیر بیان نمودند۔ و چیزہا بہ زباں نیز فرمودہ اند۔ کہ نقلِ تفصیل آں طولے دارد۔ چوں دراں وقت فقیر از حقیقتِ حال واقف نہ بود۔ از راہ علم و دانائی ایشاں تعجب و استیفائے آں (؟) نمود۔ بعد ازاں [بادشاہ بہ] شیخ عبداللہ فرمودند۔ کہ آں رسالہ را پیش ایشاں [خواجہ محمد نقشبندؒ] خواہی برد تا مطالعہ نمایند۔ و بہ حقائق آں واقف شوند۔ و ہر چند گفتہ شد۔ شیخ مذکور نیاورد۔ کوچ ہم درمیان بود۔ دراں فرصت قلیل اطلاق بر حقائق و توجیہ آں بعید نمود" [مکتوب ۱۱۸] خط کے باقی حصے میں مکتوباتِ امام ربانی کے متعلق توجیہ و تاویل سے کام لیا ہے۔ اور اصلاح حال کے لیے [مکتوب الیہ سے] کہا ہے کہ "متصدیانِ دربار مثل قاضی القضاۃ و عبدالرحیم خاں وغیرآں کہ از دوستاں و معتقدان ایں سلسلہ، علیہ اند" کو اس بارے میں لکھا جائے۔

مندرجہ بالا اقتباسات میں بین القوسین عبارت ہماری ہے، جو قیاس پر مبنی ہے۔ ممکن ہے کہ ہمارا قیاس غلط ہو، لیکن ظاہر ہے کہ جس صورت میں یہ عبارت درج ہے اسے بغیر کسی قیاسی اضافہ کے

[باقی اگلے صفحہ پر]

تو خیال آتا ہے کہ شاید اصل ناقل کو منتشر اوراق ملے۔ اور نقل کرتے وقت صفحات کی ترتیب ہی بدل گئی، لیکن اس کے باوجود مجموعہ بے حد اہم ہے۔ خواجہ محمد نقشبند قریباً عہدِ عالمگیری کے پینتیس سال تک مسندِ ارشاد و ہدایت پر متمکن تھے۔ اس لیے عالمگیر اور حضرات مجددیہ کے تعلقات جاننے کا سب سے مستند ذریعہ یہ مجموعہ ہے۔ اس میں ایک مکتوب ہے، جو یقیناً اس زمانے کا ہے، جب عالمگیر نے گولکنڈہ کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ یا اسے ابھی ابھی فتح کیا تھا۔ اس میں ایک اہم خط کا اقتباس ملاحظہ ہو:۔

ودیگر فقیر بہ قصدِ زیارت حرمین الشریفین از وطن برآمدہ بود۔ در اثنائے راہ فرمانِ بادشاہ دین پناہ بہ دستخط خاص مشتمل بر کمال اشتیاق و اختصاص رسید۔ بموجب مہربانیہائے آں حضرت خود را بہ خدمت ایشاں رسانید۔ عنایات بے غایات فرمودند و دریں موسم رخصت نہ نمودند۔ و بادشاہ زادہ محمد کام بخش را در حضور خود طلبیدہ بہ ایں فقیر سپردند۔ کہ من ہم در صحبتِ بزرگانِ ایشاں ایں طریقہ علیا حظہا یافتہ ام۔ شما ہم از ایشاں استفادہ نمائید۔ و بخدمت ایشاں مشغول شوید۔ حسب الامر فقیر بادشاہ زادہ را مشغول ساختہ محظوظ گشتند۔ روزِ دیگر بحکم بادشاہِ دین پناہ بہ فقیر خانہ نیز رسیدند۔ خود (عالمگیر) ہم چند نوبت مکرر آمد و رفت نمودند۔ [مکتوب ۲۶]

اس اقتباس سے صاف ظاہر ہے۔ کہ محاصرہ کے وقت عالمگیر نے سرہند کے اہم ترین شیخ کے ساتھ خاص ارتباط کا اظہار کیا۔ اور اپنے چاہیتے بیٹے کام بخش کو اسی طرح توجہ

[بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۴۶۹]
پوری طرح سمجھنا ناممکن ہے۔ البتہ قیاسی اضافوں کے بغیر بھی یہ امر واضح ہے کہ اس میں رسالہ استفتا کا ذکر ہے، جو بادشاہ کو ملا تھا۔ [اور جو بعد کی عبارت سے مکتوباتِ امام ربانی کے متعلق معلوم ہوتا ہے۔] بادشاہ نے خواجہ نقشبندؒ سے اس کے متعلق ذکر کیا۔ اور بعض باتیں کہیں جنہیں انھوں نے نقل کیا۔ [چیز یا بزبان نیز فرمودند کہ نقلِ تفصیل آں طولے دارد] خواجہ صاحب نے یہ رسالہ نہیں دیکھا تھا اس لیے انھوں نے ان بیانات پر فقط تعجب کا اظہار کیا۔
خواجہ نقشبند ثانیؒ کے مکتوبات کی بڑی تاریخی اہمیت ہے۔ اگر وہ سارے کے سارے پوری صحت کے ساتھ شائع ہو گئے۔ تو عہدِ عالمگیری کے متعلق ہماری معلومات میں بڑا اضافہ ہو گا۔

دلائی۔ جس طرح اُس نے خود خواجہ محمد معصوم کی زندگی میں حاصل کی تھی۔
فتحِ بیجاپور و گولکنڈہ کے زمانے میں خواجہ محمد نقشبند سے بادشاہ کے جو خاص روابط تھے، ان کا ثبوت معاصرانہ کتب تواریخ سے ملتا ہے۔ مآثر عالمگیری [ترجمہ شائع کردہ عثمانیہ یونیورسٹی] کے صفحہ ۱۹۶ پر شیخ محمد نقشبندی [نقشبند] سرہندیؒ کی بادشاہ سے ملاقات اور گفتگو کا بیان ہے۔ اسی کتاب کے صفحہ ۲۱۹ پر ان کے بیٹے شیخ محمد عمر سے تاناشاہ والیِ گولکنڈہ کی بیٹی بیاہے جانے کا ذکر ہے۔ جب یہ خیال کیا جائے کہ والیِ گولکنڈہ کی دوسری دو بیٹیاں وزیرِ سلطنت اسد خاں اور سابق والیِ بیجاپور کے بیٹوں سے بیاہی گئیں، تو اندازہ ہوتا ہے کہ خواجہ محمد نقشبندؒ کو بادشاہ کی نظروں میں کس قدر وقعت و احترام تھا[1]۔
مآثر عالمگیری کے اور کئی اندراجات ہیں، جن سے شیوخ سرہند اور عالمگیر کے روابط پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً جلوس کے سال یازدہم کے ضمن میں ذکر ہے کہ جب شاہزادہ محمد اعظم کی شادی ہوئی۔ تو دو گواہوں میں سے ایک شیخ (سیف الدین) سرہندی تھے۔ اسی طرح بارھویں سال جلوس کے ضمن میں لکھا ہے:۔

> قبلہ عالم تیرہ محرم کو ایک گھڑی رات گزرنے کے بعد باغ حیات بخش کے راستے سے شیخ سیف اللہ (سیف الدین) سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے مکان پر تشریف لے گئے اور دیر تک حقائق و معارف کی گفتگو فرما کر دولت خانہ پر آگئے۔

شیخ سیف الدین کے متعلق یہ بیانات تو ابتدائی عہدِ عالمگیری کے ہیں، لیکن دکن والے تمام اندراجات ۱۶۸۸-۸۹ء کے متعلق یعنی مکتوبات کے متعلق قاضی شیخ الاسلام کے خط کے بہت بعد کے ہیں۔ اس زمانے کا ایک اور معمولی واقعہ ہے جس سے سرہندی سلسلے سے بادشاہ کے اختصاص کا اظہار ہوتا ہے۔ ۱۶۹۰ء کے آغاز میں جب ابھی ابھی

---

[1] خواجہ نقشبند ثانی کا وقار و احترام اور طریقِ کار مخالفوں کی نظر میں جس طرح کھٹکتا تھا اس کی ایک جھلک نعمت خاں عالی کے وقائع میں نظر آتی ہے۔ جس کے کئی صفحے شیخانِ سرہندی وطن کی ہجو سے پُر ہیں۔

رائچور فتح ہُوا تھا ۔ ایک آدمی آیا ۔ اور کہنے لگا کہ میں بادشاہ کا مُرید ہونے کی خاطر دُور دراز ملک بنگالہ سے آیا ہوں ۔ بادشاہ کو اطلاع ہوئی تو اُس نے مسکرا کر جیب سے کچھ نقدی نکالی ۔ اور ملازمین کو دے کر کہا کہ یہ شخص ہمارے فیض سے جس چیز کا امیدوار ہے ، وہ یہی ہے ۔ یہ اسے دے دو ۔ لیکن اس شخص نے عطیہ کو پھینک دیا اور خود فرطِ مایوسی سے دریا میں ، جس کے قریب خیامِ شاہی نصب تھے ۔ کُود پڑا ۔ پیراکوں نے نکالا ۔ تو بادشاہ نے ہندی کا ایک شعر پڑھ کر کہا کہ اس شخص کو میاں محمد نافع سرہندی کے پاس لیجا کر کہو کہ اسے مُرید کر کے سرہندی ٹوپی اس کے سر پر رکھیں (مآثر عالمگیری ص ۲۴۲-۲۴۳)

اس زمانے میں سرہندی سلسلے سے یہ اختصاص ، خواجہ نقشبند ثانی رح کے غیر معمولی احترام اور شہزادہ کام بخش کی مریدی سے یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ یہ سلسلہ بادشاہ کو بڑا عزیز تھا ۔ اور مکتوبات کے متعلق اس کے شبہات رفع ہو چکے تھے ۔ خواجہ محمد نقشبند ثانی نے مکتوبات کی توضیح و توجیہہ کے لیے جو کوششیں کیں ، ان میں سے ایک یہ تھی ۔ کہ "رفعِ اتہام" کے لیے انھوں نے قاضی القضاۃ شیخ الاسلام کو جو خط لکھا ، اس کے ساتھ ایک علٰحدہ کاغذ میں حضرت مجدد الف ثانی رح کے بعض ارشادات [مثلاً دفتر سوم ، مکتوب ۱۲۱ سے ؟] درج کیے ، جو خواجہ صاحب رح کے مطبوعہ مکتوبات کے ساتھ شائع نہیں ہوئے ۔ ان کے متعلق انھوں نے قاضی شیخ الاسلام کو لکھا ۔

> این فقیر فقرات بسیار ہمگی انوار از کلامِ جدِّ بزرگوار در کاغذِ علٰحدہ نوشتہ بحضرت شریف فرستادہ است ۔ حسبۃً للہ آں را مطالعہ نمایند و قیاس فرمایند و بہ نظر بندگان حضرت در آرند ۔

پتا نہیں ۔ کہ ان اقتباسات سے بادشاہ کی تسلی ہوگئی یا کوئی اور سبب تھا ۔ اتنا یقینی ہے کہ مکتوبات والے واقعہ کے کئی سال بعد بھی اورنگ زیب کی طرف سے سلسلہ مجددیہ کے بزرگوں کا پہلے جیسا ، بلکہ اس سے زیادہ احترام و اختصاص نظر آتا ہے ۔ اور یہ نتیجہ اخذ کرنا بیجا نہیں ۔ کہ مکتوبات کے متعلق اس کے شبہات رفع ہو چکے تھے ۔

عالمگیر کے دل میں بزرگانِ سرہند کے لیے ایک خاص جگہ تھی، لیکن یہ امر نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ اس کی طرف سے کئی دوسرے سلسلوں کے اولیا کے احترام کی بھی شہادتیں ملتی ہیں۔ ماثرِ عالمگیری میں لکھا ہے۔ "قبلۂ عالم کو اولیائے کبار کے ساتھ جو عقیدت و خلوص ہے، ظاہر ہے۔ اور ان برگزیدہ نفوس کے اسلاف و اخلاف تمام افرادِ جہاں پناہ کی نگاہ میں بے حد معزز و مکرم رہے ہیں۔" (ص ۲۲۷) ان میں سے بعض مجددیہ سلسلے کے مخالفین بھی تھے۔ مثلاً عالمگیر کے رقعات کے جو مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ اُن میں سے کسی میں اُس کے اپنے قلم سے بزرگانِ سرہند کا کوئی ذکر ہماری نظر سے نہیں گزرا، لیکن رقعاتِ عالمگیری کا جو مختصر مجموعہ عام طور پر ملتا ہے، اس میں بھی شیخ عبداللطیف برہانپوری کی بادشاہ نے جس طرح تعریف کی ہے، وہ اربابِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ اور مراۃ جہاں نما میں بختاور خاں (یا محمد بقا سہارنپوری) بھی شیخ کی نسبت لکھتا ہے۔

"خدا پرستی جو در آوانِ بادشاہزادگی سنبھالے جمعہ بمنزل آں عزلت گزیں تشریف بردہ صحبتہائے معنوی میداشتند۔ و شیخ بزرگوار ہم برائے انجاح امورِ دینی پیش حضرت دو سہ بار آمدہ۔"

یہ شیخ عبداللطیف سلسلۂ مجددیہ کے سخت مخالف تھے۔ مثلاً معارج الولائت میں جو عہدِ عالمگیری کی تالیف ہے، ان کی نسبت لکھا ہے۔ "و کلماتِ تصوف را نگفتے۔ [و کسے کہ گفتے] او را بہ الحاد و زندقہ نسبت کردے۔ خصوصاً کسے را کہ بہ شیخ احمد کابلی و شیخ آدم بنوری نسبت داشتے۔ او را ملحد و زندیق گفتے۔ و فرمودے کہ نماز عقب ایشاں جائز نیست۔"

اس کے علاوہ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ اورنگ زیب کو شرع کا ترجمان بنانے میں فقط بزرگانِ سرہند کو دخل نہ تھا۔ اس میں کئی دوسرے اثرات بھی شامل تھے۔ مثلاً شیخ عبداللطیف برہانپوری ہی کی نسبت، جن سے مراۃ جہاں نما کے بیان کے مطابق عالمگیر کے ایامِ شاہزادگی کے دوران، جب وہ دکن کا ایک مدت تک صوبیدار تھا گہرے روابط قائم ہوئے۔ معارج الولائت میں لکھا ہے:۔

مردِ متقی و متشرع و زاہد و متورع بود۔ ہر کہ بخدمت او پیوستے۔ باحکامِ شرع او را

وصیت کرد ے۔ وگفتے فقیر آں است کہ متشرع است۔ وہر کہ متشرع نیست، فقیر نیست۔ وکتبِ فقہ رابسیار مطالعہ کرد ے"۔

سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ میں اہلِ قلم حضرات کی کثرت ہے۔ (واقعہ یہ ہے کہ اس سلسلے کو شروع سے علم کے ساتھ اختصاص رہا ہے[1]) ان بزرگوں کی تالیفات کی اشاعت بھی دوسرے سلسلوں کی تصانیف سے زیادہ ہوئی ہے، لیکن دوسرے سلسلوں کے قلمی مخطوطے اور دیگر معاصرانہ ادبی اور تاریخی مآخذ غور سے پڑھیں تو خیال ہوتا ہے کہ عالمگیر کو فقط سلسلۂ مجددیہ سے تعلقِ خاطر نہ تھا، بلکہ وہ بڑا بلند نظر اور وسیع المطالعہ بادشاہ تھا۔ وہ نیکی، دیانتداری اور محبتِ دینی، خواہ وہ کسی خیال کے بزرگوں سے ظہور پذیر ہو، قدر کرتا تھا۔ مثلاً ذکرِ جمیع اولیائے دہلی (قلمی) میں ایک مولوی محمد یعقوب صاحب کا ذکر ہے، جو عہدِ عالمگیری میں میرِ عدل تھے۔ اور شاہزادگان سلطان محمد و محمد معظم کو پڑھاتے تھے۔ وہ بیس سال تک "مدرّس مدرسۂ بادشاہی عقبِ مسجد جہاں نما" رہے۔ بادشاہ ان کا اس حد تک معترف تھا کہ جب وہ ایک مرتبہ کسی وجہ سے قاضی عبدالوہاب سے کبیدہ خاطر ہُوا تو اس نے مولوی صاحب سے اس کی جگہ عہدۂ قضا قبول کرنے کے لیے کہا، لیکن انھوں نے اپنی نسبت تو یہ کہا: "من لیاقتِ قضا ندارم"۔ اور قاضی سے بادشاہ کی کبیدگی خاطر دُور کرانے کی کامیاب کوشش کی۔ یہ مولوی محمد یعقوب وہی بزرگ تھے، جنھوں نے بادشاہ کے

---

[1] اس سلسلے میں خواجہ محمد معصوم کے خلیفہ خواجہ محمد باقر کا بیان بڑا دلچسپ ہے۔ وہ کنز الہدایات میں لکھتے ہیں "حضرت پیر دستگیر (خواجہ محمد معصوم) کی قدم بوسی کا شرف حاصل کیا تو حضرت نے فقیر سے دریافت کیا۔ کہ تم کچھ پڑھنے پڑھانے کا شغل رکھتے ہو۔ فقیر نے عرض کیا کہ شغل باطنی کے زمانے سے تعلیم ظاہری کا اتنا سلسلہ باقی نہیں رہا۔

دوسرے سفر میں بھی خلوت کے وقت حضرت نے دوبارہ دریافت کیا۔ میں نے عرض کیا کہ مطالعہ علم ظاہر کی مصروفیت کے وقت آنجناب سے توجہ باقی نہیں رہتی ہے۔ اور توجہ و مطالعہ دونوں امور کا جمع کرنا ممکن نہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ بلاسوچے سمجھے کہہ رہے ہو۔ علمِ ظاہر کی مصروفیت ہماری نسبت کو بڑھاتی ہے۔ اس زمانے سے فقیر کو مطالعہ علمی کی توفیق بھی حاصل ہوگئی ہے" (ص ۸-۹)

اصرار، بلکہ عتاب کے باوجود دارا شکوہ کے محضرِ الحاد پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

"... مدتے بدارو غگی عدالت و وکالت شرعی محل سبحانی امتیاز داشت۔ محضرے کہ علما بر الحادِ دارا شکوہ ساختند۔ مولانا برآں مہر نکرد۔ ہر چند بادشاہ خطاب پُرعتاب نمود۔ کہ ایں ہمہ اہلِ فضل مہر کردند۔ وجہ مہر نہ کردنِ شما چیست۔ عرض نمود۔ کسانیکہ کردہ اند [علم بر الحادِ دارا شکوہ دارند مرا] علم بہ الحادِ او نیست" [ذکرِ جمیع اولیاے دہلی] ۔

عالمگیر کی دلپسند کتب مطالعہ کی فہرست بڑی دلچسپ ہے۔ اس میں مکتوبات امام ربانی یا سلسلہ نقشبندیہ کی کسی اہم کتاب کا کہیں نام نہیں ملتا۔ لیکن امام غزالی کی تصانیف کے متعلق متعدد شہادتیں ہیں۔ مآثر عالمگیری کا متعلقہ اندراج حسب ذیل ہے:۔

قبلۂ عالم کے کمالات کسبیہ کا عظیم الشان کارنامہ علومِ دینیہ یعنی فقہ و تفسیر و حدیث کی تحصیل ہے۔ جہاں پناہ کو حضرت امام غزالی کی تصنیفات اور شیخ شرف الدین یحیٰ منیری کے مکتوبات اور شیخ زین الدین و قطب محی الدین (قطب الدین؟) شیرازی کے رسائل کا خاص شوق ہے۔ اور یہ کتابیں اکثر مطالعہ میں رہتی تھیں۔

امام غزالیؒ کی تصانیف سے عالمگیر کی دلچسپی کی شہادت عملِ صالح سے بھی ملتی ہے۔ اس کے مصنف میر سید محمد کی نسبت، جن کا شاہجہاں بھی بڑا قدر دان تھا، لکھتے ہیں:۔

والیوم در خدمتِ فیض موہبت حضرت خلافت مرتبت محمدؐ اورنگ زیب بادشاہ عالمگیر مذکورِ احیاے علوم و کیمیاے سعادت درمیاں دارد۔ [عملِ صالح، دفتر سوم ص ۳۷۹]

مراۃ جہاں نما سے پتا چلتا ہے کہ عالمگیر نے دانشمند خاں سے امام غزالی کی اکثر کتابیں پڑھی تھیں:۔

و خدیوِ زماں بعض کتب رانزدِ خان سعادت نشاں [دانشمند خاں] تکرار فرمودہ اند۔ و مصنفات حجۃ الاسلام امام محمد غزالی قدس سرہٗ خصوص کتاب افادہ آیاب احیاء العلوم را از اوّل تا آخر تلمذ نمودہ۔

دانشمند خاں [مولانا شفیعا ے یزدی] اس عہد کا مشہور فاضل اور فاضل نواز تھا۔ اس نے ایک مدت تک فرانسیسی جہاں گرد سیاح ڈاکٹر برنیر کو اپنا مہمان رکھا۔

اور اس سے متاخرین حکمائے فرنگ کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ برنیر نے اپنے سفر نامہ میں "دانشمند خاں کی (جسے وہ "ایشیا کا سب سے بڑا عالم" کہتا ہے) اور وزیر سلطنت فاضل خاں (علاء الملک تونی) کی علم و حکمت سے محبت کی دل کھول کر تعریف کی ہے۔

اگر مآثر عالمگیری کے مندرجہ بالا اندراج کی نسبت ہمارا قیاس صحیح ہے۔ کہ قطب محی الدین شیرازی غالباً (علامہ) قطب الدین شیرازی کی تحریف ہے تو یہ خیال بجا نہیں کہ عالمگیر کو معقولات سے بھی لگاؤ تھا۔ کم از کم جس اُستاد کی نسبت وہ کہتا تھا کہ میں نے جو کچھ سیکھا، اس سے سیکھا۔ (چیزیکہ خواندہ ایم، از و خواندہ ایم) وہ (ملا عبد اللطیف سلطانپوری) امام معقولات، حکیم فتح اللہ شیرازی کا شاگرد تھا۔ (مراۃ جہاں نما وغیرہ)

غرضیکہ عالمگیر کے بزرگانِ سرہند سے گہرے روابط تھے، لیکن اس کا نقطہ نظر بڑا وسیع تھا۔ اور شرع کے معاملے میں وہ کسی کی رو رعائت نہ کرتا تھا۔

بنگال میں اسلام

عہدِ مغلیہ میں دہلی۔ لاہور۔ کشمیر۔ بلادِ پورب، دکن۔ گجرات سے متعلق تواریخ و تذکروں کا ایک انبار ہے، لیکن جو علاقے اب پاکستان میں، یعنی بنگال۔ مغربی پنجاب۔ سندھ۔ سرحد اور بلوچستان۔ ان کے متعلق معلومات کی بڑی کمی ہے۔ بالخصوص بنگال کی مذہبی اور تہذیبی تاریخ پر ناواقفیت کی ایک دبیز گھر چھائی ہوئی ہے۔ تاریخ کے صفحات پر ضمناً کبھی کوئی نام آجاتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اندھیری رات میں کوئی جگنو چمک گیا اور اس کی روشنی میں راستے کی تلاش ہوتی ہے۔ ان حالات میں نہ صرف تواریخ کے صفحات بنگال کے متعلق تفصیلات سے بالعموم عاری ہیں بلکہ مستند معلومات کی کمی کی وجہ سے بسا اوقات غلط رائیں مسلمات کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں۔

چیتنیہ کی وشنو تحریک

مثلاً بنگال کی اس عہد آفریں وشنو تحریک کو لیا جائے۔ جس کی چیتنیہ نے رہنمائی کی اور جس کا صرف ہندو مذہب یا بنگالی زبان اور ادب ہی پر نہیں۔ اس علاقے میں اشاعتِ اسلام اور عامۃ المسلمین کی مذہبی حالت پر بڑا اثر پڑا۔ اس کی نسبت عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ تحریک کبیر یا بابا نانک کی تعلیمات کی طرح ہندو مذہب اور اسلام کو ملانے کی ایک کوشش تھی۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس تحریک کا مقصد کبیر مت یا ابتدائی سکھ مذہب کی طرح ہندو اور مسلمانوں کو ملانا نہیں تھا بلکہ ہندو مذہب کا احیا تھا اور اس مقصد میں یہ تحریک اس حد تک کامیاب ہوئی کہ نہ صرف بنگال میں اشاعت اسلام رک گئی، بلکہ بعض مسلمانوں نے وشنو مذہب اختیار کیا اور عامۃ المسلمین اور وسطی اور شمالی بنگال کے ان پڑھ اور غریب مسلمانوں کے عقاید و اطوار میں ہندو طریقے داخل ہو گئے۔

چیتنیہ وسطی بنگال کے شہر ندیا میں جو پہلے ہندو راجاؤں کا دارالحکومت تھا۔ اور مسلمانوں کی فتح بنگالہ (اور لکھنوتی کے حاکم نشین شہر بن جانے) کے بعد ہندوؤں کا علمی اور مذہبی مرکز بن گیا تھا ۱۴۸۶ء میں پیدا ہوا۔ اس نے بعد میں مسلمان پیروں سے مسئلہ توحید پر بحث و مباحثہ کیا اور وہ مسلمان عقائد اور نقطۂ نظر سے بے خبر نہ تھا۔ اس کے طریقے میں کئی چیزیں ایسی ہیں، جن میں شاید صوفیہ کے طریق کار کو دخل تھا۔ اس کے قریبی اور بااثر ساتھیوں میں کم از کم ایسے تھے جو فارسی اور عربی کے ماہر اور بنگال کے مسلمان بادشاہ کے دربار میں دو بڑی باعزت اسامیوں پر مامور تھے۔ روپ اور سناتن دو ہمن بھائی تھے۔ جن کا مورث اعلےٰ کرناٹک میں کسی ریاست کا حاکم ہو گیا ۱۴۱۴ء میں اس کا انتقال ہوا اور اس کا بیٹا جانشین ہوا۔ اس کی وفات ۱۴۱۶ء میں ہوئی، لیکن مرنے سے پہلے گوڑ کے کسی مسلمان حاکم سے اس کی دوستی ہو گئی، جو ان دنوں جنوبی ہندوستان میں سفر کر رہا تھا۔ اس کی وفات کے بعد اس کے بیٹوں میں خانہ جنگی ہوئی اور ان میں سے ایک نے گوڑ میں اپنے باپ کے مسلمان دوست کے پاس پناہ لی اور ایک معزز عہدے (وزارت؟) پر مامور ہو گیا ۱۴۳۳ء میں اس کی وفات ہوئی اور اس کا بیٹا جانشین ہوا۔ روپ اور سناتن کا باپ پدماوا کا پوتا تھا۔ ان دو کے اصلی نام سنتوش اور امر تھے۔ رائے بہادر دینش چندر سین کے بیان کے مطابق، جس سے ہم نے یہ تفصیلات نقل کی ہیں، دونوں بھائی مسلمان ہو گئے تھے۔ انھوں نے عربی فارسی کی تعلیم ساتگاؤں کے مشہور عالم سید فخر الدین سے حاصل کی اور شاہی ملازمت میں داخل ہوئے۔ سناتن شاہ بنگالہ کا دبیر خاص تھا۔ اور روپ جسے شاکر ملک کا خطاب ملا تھا وزیر تھا۔ دونوں نے سنسکرت میں بھی اپنی دلچسپی برقرار رکھی تھی اور اپنے گاؤں میں (جو گوڑ کے نواح میں تھا) کرناٹک کے کئی برہمنوں کو بلا کر آباد کیا ۱۵۱۶ء میں چیتنیہ سے ملے اور وشنومت اختیار کیا۔ چیتنیہ نے ہی انھیں نئے نام دیے، جن سے وہ مشہور ہوئے۔ دونوں نے شاہی ملازمت کو ترک کر کے سادھوؤں کی طرح اپنے آپ کو نئے طریقے کی اشاعت کے لیے وقف کر دیا۔ چیتنیہ نے انھیں بندرابن جا کر پرانے تیرتھوں کا کھوج لگانے کے لیے

کہا۔ چنانچہ سناتن اور روپ اپنے ایک بھتیجے اور چیتنیہ کے بعض دوسرے باثر مریدوں کے ساتھ بندرابن میں آکر مقیم ہوئے اور وہ عمل شروع ہوا۔ جو متھرا اور بندرابن کو شمالی ہند میں ہندو مذہب کے احیا کا بڑا مرکز بنا دینے والا تھا۔

ویشنو تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ ان دو بھائیوں کی شہرت اکبر تک پہنچی اور اس نے ۱۵۷۳ء میں متھرا آکر ان سے ملاقات کی۔ اکبر کی روپ اور سناتن سے ملاقات کی روایت صحیح ہو یا غلط، لیکن اتنا یقینی ہے کہ بنگالہ کا مغل صوبیدار مان سنگھ ان کا بڑا معتقد تھا۔ اور سر جادو ناتھ سرکار کہتے ہیں کہ چیتنیہ کی تحریک کو جے پور کے راجپوت خاندان سے بڑی مدد ملی۔ بندرابن میں اس زمانے میں جو سر بفلک مندر تعمیر ہوئے، ان میں سب سے پُر شکوہ (گوبندجی کا مندر) مان سنگھ نے ایک کروڑ روپے کی لاگت سے تعمیر کرایا اور مندر کے ایک سنسکرت کتبے سے پتا چلتا ہے کہ یہ مندر ۱۵۹۰ء میں "مہاراجا پرتھوی راج کی نسل کے" راجا مان سنگھ نے اپنے گرو روپ اور سناتن کی زیر ہدایت تعمیر کرایا۔

متھرا کے قرب و جوار میں تعمیرِ منادر کا یہ وسیع سلسلہ ہندوستان کی مذہبی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ایک تو سلطان محمود غزنوی کی متھرا میں وسیع بُت شکنی کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ مسلمان دارالحکومت (آگرہ) کے قریب نئے مندر کثرت سے اور بڑے طمطراق سے تعمیر ہو رہے تھے۔ دوسرے اکبر کے دربار میں جس واقعہ نے علما کے اختیارات کا مسئلہ سخت نازک صورت میں پیش کیا اور محضر کی ترتیب اور اکبر کے امام عادل بننے کا پیش خیمہ ہوا۔ وہ متھرا بندرابن کی انھی عماراتی سرگرمیوں کا شاخسانہ تھا۔ ہم اکبری عہد کے سلسلے میں ذکر کر چکے ہیں کہ ۱۵۷۹ء میں صدر الصدور کے سامنے متھرا کے ایک ایسے برہمن کا مقدمہ پیش ہوا، جس نے مسجد کے مسالے کو ایک مندر کی تعمیر میں صرف کیا۔ اور جب اس سے باز پُرس ہوئی تو بانیِ اسلام کے متعلق اہانت آمیز کلمات کہے۔ بالآخر شیخ عبدالنبی صدر الصدور نے اس برہمن کو قتل کرا دیا تو اکبر کی راجپوت رانیوں نے، جن میں مان سنگھ کی پھوپھی بھی تھی، سخت شکایت کی اور آخرکار اکبر نے محضر لکھوا کر اختلافی امور میں تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں

لے لیے۔ اس زمانے میں متھرا بندرابن میں اس کثرت سے مندر تعمیر ہوئے کہ وثوق سے اس واقعہ کو کسی خاص مندر سے متعلق کرنا ممکن نہیں، لیکن بہرکیف اسلامی ہند کی مذہبی تاریخ کا یہ بحران وشنو مت کی اس احیائی تحریک کا بلاواسطہ نتیجہ تھا، جو تعمیر مندر اور دوسری صورتوں میں اظہار پا رہی تھی۔

بنگال میں وشنو تحریک کے اثرات

چیتنیہ کی وفات ۱۵۳۳ء میں ہوئی۔ اس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس کی زندگی اور بیانات میں مخالفِ اسلام عناصر نمایاں نہیں (اگرچہ اس نے اسلام کے ترجمانوں سے بحثیں کیں اور وشنو تذکرہ نگاروں کے مطابق ان میں سے بعض کو اپنے طریقے کا پیرو کار بنایا) یہ صحیح ہے کہ چیتنیہ پر کرشن بھگتی والہانہ طور پر غالب تھا، لیکن اس کا روپ اور سناتن کو پرانے تیرتھوں کا کھوج "نکالنے کے لیے متھرا بھیجنا ہی ایک احیائی تحریک کا آغاز تھا اور اس کے جانشینوں کے ہاتھ میں تو اس تحریک نے بالکل ایک جارحانہ صورت اختیار کر لی۔

چیتنیہ کی تحریک کا جو اثر بنگالہ کے باہر ہوا۔ اس سے کہیں زیادہ بنگالہ کے اندر تھا۔ اس علاقے میں اس نے اشاعتِ اسلام کا سلسلہ روک دیا۔ اسلام کی کامیابی کا ایک بڑا راز یہ تھا کہ آبادی کا بہت بڑا حصہ اچھوت سمجھا جاتا تھا اور ان لوگوں کے لیے ہندو سوسائٹی میں معزز جگہ نہ تھی۔ اس لیے انھوں نے اسلام کا خیر مقدم کیا۔ لیکن وشنو تحریک نے ان لوگوں کے لیے ہندو سوسائٹی میں ہی باعزت جگہ بنا دی۔ اور یہ تعلیم دی کہ جو کوئی کرشن کا سچا بھگت ہوگا۔ اسی کی مکتی ہوگی۔ خواہ وہ چنڈال ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے علاوہ اس تحریک اور اس کے مختلف مظاہر نے ہندو بھاتی میں نئی زندگی پیدا کر دی۔ اس نے اسلامی مبلغین کی کامیابی ناممکن بنا دی۔ چنانچہ جس علاقے میں یہ تحریک کامیاب ہوئی وہاں مسلمانوں کی تعداد تھوڑی ہے۔" وہی قبیلے اور ذاتیں، جن کے بھائی بند مشرقی بنگال میں مسلمان ہو گئے ہیں، مغربی بنگال میں ہندو رہے اور اس کا بڑا سبب وشنو اثرات تھے۔"

ویشنو تحریک کا کام فقط دفاعی نہیں، جارحانہ تھا۔ اس نے فقط ہندوؤں کو مسلمان ہونے سے نہیں بچایا، بلکہ مسلمانوں میں وشنومت کی اشاعت کی۔ اور اس میں اسے خاصی کامیابی ہوئی۔ چیتنیہ نے خود بعض مسلمانوں کو ارتداد کا راستا دکھایا۔ اس کا ایک قریبی ساتھی ہری داس پہلے مسلمان تھا اور قاضیوں کے خاندان سے تھا۔ اسی طرح بجلی خاں ایک افغان سوریا اس کے ہاتھ پر ویشنو ہوا۔ شیامانند نے کثرت سے مسلمانوں میں پرچار کیا اور کامیاب رہا۔ اس نے اس مقصد کے لیے اقتصادی حربے بھی استعمال کیے اور راجا نارائن گڑھ سے کہا کہ مسلمان مزدور جب تک اپنا مذہب ترک نہ کریں انھیں کام نہ دیا جائے۔ نچلی ذاتوں میں یہ سلسلہ بہت وسیع تھا۔ مسلمانوں کو پورا ویشنو بنانے کے علاوہ ویشنو طریقے کی کئی شاخیں ایسی شروع ہوئیں، جن کا مقصد مسلمانوں کو ویشنو سلسلے سے منسلک کرنا تھا۔ ایک فرقہ درویشی تھا جو سناتن سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ایک نہایت وسیع سلسلہ باؤل فقیروں کا تھا جن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترکہ فرقہ تھا۔ لیکن چیتنیہ مت کے متعلق ڈاکٹر کینیڈی اپنی کتاب میں صاف صاف کہتے ہیں کہ "یہ بنگالی ویشنوؤں کا ایک گروہ" ہے۔ ڈاکٹر انعام الحق نے اس رائے سے اختلاف کیا ہے، لیکن انھوں نے بھی ان لوگوں کے رہنماؤں کے جو نام دیے ہیں، وہ زیادہ تر ہندو ہیں اور سب ندیا کے ضلع سے متعلق ہیں۔ راسخ الاعتقاد مسلمان انھیں غیر مسلم سمجھتے ہیں اور اس خیال کی تائید میں فتوے بھی شائع ہوئے۔

ویشنو تحریک نے ادب کے ذریعے بھی بنگالی مسلمانوں کو متاثر کیا۔ ایک تو اس جاندار وسیع تحریک نے بنگالی ہندوؤں میں نشاۃ ثانیہ کی کیفیت پیدا کر دی اور اب زندگی کے ہر شعبے میں انھوں نے بڑھ بڑھ کر ہاتھ مارنا شروع کیا۔ دوسرے کرشن بھگتی کی شدید جذباتی کیفیت نے کثرت سے باثر اشعار کا جامہ اختیار کیا۔ اس کا اثر مسلمانوں پر دو طرح ہوا۔ ایک تو اس نئے ادب نے بنگالی زبان اور ادب کو ایک خاص رنگ دے دیا، جس نے بنگالی بولنے اور سمجھنے والے مسلمانوں کو متاثر کیا۔ دوسرے کرشن بھگتی کے اشعار اس طرح

مقبول ہو گئے کہ کئی مسلمانوں نے جو وشنو نہ تھے، ان مضامین پر نظمیں لکھیں۔ بالآخر حالت یہاں تک پہنچی کہ چشتی پیروں کی مجالس سماع میں بشن پد (وشنو گیت) گائے جاتے اور ان پر اہلِ حال وجد کرتے۔ اس زمانے کی ایک دلچسپ تصنیف مسائل المشائخ ہے، جو حضرت نور قطب عالم کے سلسلہ کے ایک بزرگ شاہ قطب الدین حقانی نے نویں صدی ہجری کے آخر میں مرتب کی۔ اس کتاب میں حضرت نور قطب عالمؒ سے ایک روایت منسوب کی گئی ہے کہ جب ان کی محفل میں بشن پد دوسری نعتوں وغیرہ کے ساتھ گائے گئے اور کسی نے کرشن۔ رادھا اور اس طرح ہندو ناموں پر اعتراض کیا تو جواب یہ دیا گیا کہ قرآن مجید میں بھی فرعون، نمرود کے نام ہیں۔ حضرت نور قطب عالمؒ سے اس روایت کا انتساب تو غالباً بشن پد کے جواز کے لیے ایک مستند اور مشہور بزرگ کے ارشاد ڈھونڈنے کا نتیجہ ہے، اتنا قرین قیاس ہے کہ جن بزرگوں نے یہ روایت اپنی کتاب میں درج کی ہے ان کی مجلس میں یا کم از کم اس زمانے کی صوفیہ مجالس میں بشن پد نعتوں اور قوالیوں کے ساتھ ساتھ پڑھے جاتے تھے!

بنگالی مسلمانوں کا ردِ عمل

وشنو مت اور دوسری ہندو احیائی تحریکوں اور اس کے ساتھ ساتھ باہر سے مسلمان مبلغوں کی آمد بند ہو جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنگال کے نچلے طبقے میں، جو فارسی دان حکام اور علما کے اثر سے دور تھا۔ عقائد اور اعمال کے بارے میں بڑی کھلبلی پھیل گئی۔ ہندو اور مسلمان عقائد خلط ملط ہو گئے۔ باؤل طریقہ اور ستیہ پیر ماننے والے بڑھ گئے۔ اور عوام الناس کے دین کو مقامی اور ہندو خیالات نے مسخ کر دیا۔ اس صورت حالات کی تلافی انیسویں صدی سے شروع ہوئی۔ جب حاجی شریعت اللہ مولانا شاہ امام الدین اور مولانا کرامت علی جیسے بزرگوں نے اصلاح عقائد کا بیڑا اٹھایا، لیکن عوام الناس کے عقائد اور منفی غیر مسلم اثرات کے بیان سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ خدانخواستہ اس سرزمین میں اسلام کی قدر و منزلت نہ تھی۔ یا مقامی اہلِ فکر نے اصلاح حالت کی کوئی کوشش نہ کی۔

مثلاً بنگال کے جن حسین شاہی مسلمان بادشاہوں نے (سنسکرت کے مقابلے میں) بنگالی ادب کی سرپرستی کی اور رامائن۔ مہابھارت اور دوسری کتابوں کے بنگالی ترجمے کرائے۔ وہ بڑے راسخ العقیدہ مسلمان اور اسلام اور علوم اسلامی پر جان دینے والے تھے۔ اس خاندان کا مورثِ اعلیٰ علاء الدین حسین شاہ خود عرب تھا۔ اس نے کثرت سے مساجد اور مدرسے تعمیر کرائے۔ اُن کے لیے اور بزرگوں کے مزارات کی نگہداشت کے لیے ہزاروں بیگھے زمین وقف کی۔ حضرت نور قطب عالم کے مزار کی زیارت کے لیے ہر سال اپنے دارالخلافہ سے پنڈوہ جاتا تھا۔ جمعہ کی نماز باقاعدہ جامع مسجد میں جاکر پڑھتا۔ یہی سلسلہ اس کے بیٹے نصرت شاہ اور اس خاندان کے دوسرے بادشاہوں نے جاری رکھا۔ افسوس کہ اس عہد کی فارسی تصانیف ایک دو کے سوا جمع نہیں ہوئیں۔ مسلمان ابھی تک غالباً بنگالی میں علمی کتابیں لکھتے ہچکچاتے تھے، لیکن اس زمانے کی کئی عمارتیں اور متعدد کتبے محفوظ ہیں۔ ان سے حسین شاہی خاندان کی دینداری کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

سید سلطانؒ

اس کے علاوہ جب وشنومت کا ادب اور رامائن۔ مہابھارت کے بنگالی ترجمے مسلمانوں میں عام ہونے شروع ہوئے تو خود بنگالہ میں کئی اہلِ دل مسلمان اُٹھے، جنھوں نے اسلامی موضوعات پر بنگلہ میں نظمیں اور کتابیں لکھ کر بنگالی مسلمانوں کے لیے صالح دماغی اور رُوحانی غذا مہیا کی۔ اس تحریک کا پیش رَو سید سلطان تھا، جس نے ۱۵۸۴ء (یعنی اکبر کی تخت نشینی کے زمانے میں) وفاتِ رسول لکھی۔ جس کے شروع میں اس نے کہا کہ چونکہ بنگالی مسلمان عربی فارسی نہیں جانتے اور بنگالی میں اسلامی موضوعات پر کتابیں نہیں، اس لیے ناچار مسلمان بھی رامائن۔ مہابھارت پڑھتے ہیں۔ اس صورتِ حالات کی اصلاح کے لیے میں اپنی کتابیں لکھ رہا ہوں۔ علماء اسے ناپسند کرتے ہیں اور مجھے منافق کہتے ہیں، لیکن میں جانتا ہوں کہ میرا فرض کیا ہے!

سید سلطان کی وفاتِ رسُول شائع ہوگئی ہے۔ اس کے ابتدائی صفحات صورتِ حالات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس میں سید سلطان فرماتے ہیں (ترجمہ)

سب بنگالی عربی نہیں جانتے۔

کوئی اپنے دین کی باتیں نہیں سمجھتا۔
ہر کوئی کتھا کہانیوں سے دل بہلاتا ہے۔
میں گنہگار اور راندۂ مخلوق ان لوگوں کے درمیان ہوں۔
مجھے معلوم نہیں کہ روزِ جزا مجھ سے باری تعالیٰ نے کیا پوچھے گا۔
لیکن اگر اس نے پوچھا۔ کہ ان لوگوں کے درمیان رہ کر ان کو دین کی باتیں نہیں بتائیں۔
اور مجھے اس قصور کے لیے ملزم قرار دیا تو میں کیا جواب دوں گا؟
یہی سوچ کر میں نے نبی دمسا (خاندان نبوی کی تاریخ) لکھی ہے۔
اور اس پہ اتنے لوگ کہتے ہیں کہ میں نے دین کی کتاب کو ناپاک کر دیا۔
اگر پڑھے لکھے لوگ عربی میں کتابیں پڑھیں اور ان کا ہندوانی (بنگالی) ترجمہ نہ کریں
تو لوگوں کو یہ چیزیں کس طرح سمجھ آئیں گی؟
جس زبان (کے خطے) میں خدا نے کسی کو پیدا کیا ہے۔ وہی اس کا بڑا خزانہ ہے۔

یہ غور طلب امر ہے کہ ان سطور میں سید سلطان نے بنگالی کو ہندوانی کہا ہے اور اگرچہ ان کی کتاب کی زبان بنگلہ ہے، لیکن اس میں سنسکرت کے الفاظ نہیں اور ہندوستانی اور بنگالی کے اتنے مشترک الفاظ ہیں کہ جدید بنگالی نہ جاننے والے کے لیے بھی عبارت کا سمجھنا دشوار نہیں۔ آگے چل کر سید سلطان اپنا نقطۂ نظر اور وضاحت سے بیان کرتے ہیں :۔ (ترجمہ)

اگر پڑھے لکھے عام لوگوں کو تعلیم نہ دیں گے تو وہ بچارے ضرور دوزخ میں جائیں گے۔
اور اگر عام لوگ ناواقفیت کی وجہ سے گناہ کریں گے تو اللہ تعالیٰ اہلِ علم کو اس کا ذمہ دار سمجھے گا۔
چونکہ میں بھی ان میں سے ہوں۔ اس لیے میں اہلِ علم سے صاف صاف کہتا ہوں۔
(روزِ قیامت) خدا کہے گا "تم لوگ اہلِ علم تھے۔ تم نے گناہ سے لوگوں کو کیوں نہ روکا"
پس اہلِ علم روزِ قیامت اپنا فرض ادا نہ کرنے کے مجرم ٹھہریں گے۔
جب باری تعالیٰ نے لوگوں کے نیک بد کا حساب کرے گا تو وہ کہیں گے۔
ہمیں ایک اہلِ علم ملا تھا۔ لیکن اس نے ہمیں سکھایا نہیں۔

تو خدا ہم اہلِ علم کو اور بھی ملزم قرار دے گا۔
اس ڈر سے اور نبی کی عظمت کا خیال کر کے میں تمھیں بتاتا ہوں تاکہ تم گناہ میں نہ پڑو۔
اللہ نے مجھے کتاب شریف کا علم دیا ہے تاکہ لوگوں کو بتاؤں۔
اس لیے میں نے یہ بنگالی تصنیف کی۔
علما مجھے منافق کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں نے ہندوانی زبان میں لکھ کر دین کو ناپاک کر دیا۔
لیکن خدا کا ارشاد ہے۔ میں نے نبی بھیجا۔ اس مُلک کی زبان میں تعلیم دینے کے لیے
جس میں وہ پیدا ہُوا۔

سید سلطان اہلِ علم میں سے تھے، لیکن ان کی کتابوں میں بھی مقامی اثرات کافی ہیں۔ انھوں نے رسولِ اکرم کے جو واقعات لکھے ہیں، ان میں بعض ایسے قصے بھی درج ہیں جو کرشن اور وشنو کے متعلق ہیں، بلکہ انھوں نے تو نبی کریمؐ کو اوتار کہا ہے۔ یا تو یہ مقامی اثرات کا نتیجہ ہوگا یا سید سلطان نے عوام کے ساتھ اس پیرائے میں کلام کرنے کی کوشش کی ہو۔ جس کے وہ عادی ہو چکے تھے، لیکن ان کی تحریر سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ بنگالی مسلمانوں کے خیالات اور رجحانات کی عقبی سرزمین کو سمجھنے کے لیے یہاں کے مقامی اثرات کا کھلے دل سے مطالعہ کرنا ہوگا۔

سید سلطان کی تحریروں سے خیال ہوتا ہے کہ ۹۹۴ھ (۱۵۸۶ء) یا ایک اور مسودے کے مطابق ۹۶۲ھ (یعنی ۱۵۵۴ء) تک کسی نے بنگالی میں خدا اور رسول کی نسبت نہیں لکھا۔ سید سلطان کی تصانیف دو قسم کی تھیں۔ ایک تو وہ جن میں اُنھوں نے قصص الانبیا اور سیرتِ نبوی کی روایات بنگالی میں منتقل کیں۔ دوسرے وہ جن میں اسلامی فلسفہ یا تصوف اور شریعت کے مسائل کو بنگالی زبان میں لکھا۔ دوسری قسم کی اہم کتاب گیان پردیپ (یعنی نورِ عرفان) ہے۔ جس میں سلطان نے صوفیانہ خیالات کو تنتر کی یوگ کی زبان میں بیان کیا ہے۔ ان کے جانشینوں نے ان کوششوں کو بڑی وسعت دی۔ اور حج۔ روزہ۔ نماز۔ زکوٰۃ اور دوسرے احکام اسلامی پر کثرت سے سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں کتابیں لکھی گئیں۔ ان تصانیف میں نصراللہ خاں کا

شریعت نامہ خاص شہرت رکھتا ہے، لیکن مغلیہ دور کے سب سے مشہور بنگالی شاعر علاؤل نے بھی ان مضامین کی توضیح کے لیے تحفہ لکھا۔

اسلامی خیالات کو بنگالی میں منتقل کرنے والوں کا اگلا قدم عربی اور فارسی قصص اور ان زبانوں کی ادبی تصانیف کا بنگالی ترجمہ تھا۔ ان میں داستانِ امیر حمزہ۔ یوسف زلیخا۔ سکندر نامہ۔ ہفت پیکر کے ترجمے خاص شہرت رکھتے ہیں، جن میں بعض علاؤل کے قلم سے ہیں۔

سید سلطان کی بعض تصانیف کے نام یہ ہیں:۔

۱۔ شبِ معراج ۲۔ رسول وجے ۳۔ وفاتِ رسول ۴۔ ابلیس نامہ۔
۵۔ معرفتی گان ۶۔ گیان پردیپ۔

سید سلطان کی تاریخِ وفات و پیدائش اور جائے رہائش کے متعلق اختلاف ہے۔ وہ اکبر اور جہانگیر کے ہمعصر تھے بعض انھیں ضلع سلہٹ کا باشندہ کہتے ہیں لیکن ڈاکٹر انعام الحق کی تحقیق کے مطابق وہ ضلع چٹاگانگ کے رہنے والے تھے۔ بنگال کے قدیم مسلمان ادیبوں کی تصانیف پر ابھی تک اتنی تھوڑی تحقیق و تفتیش ہوئی ہے (ان میں سے بیشتر ابھی قلمی مسودوں کی حالت میں ہیں) کہ ان کے زمانۂ حیات کے متعلق شدید اختلافات ہیں۔ ڈاکٹر انعام الحق متعدد ایسے بنگالی ادیبوں کے نام گناتے ہیں جنھوں نے سید سلطان سے پہلے اسلامی موضوعات پر بنگالی کتابیں تصنیف کیں لیکن دوسرے اہلِ الرائے ان سے متفق نہیں۔ اور وفاتِ رسول سے جو طویل اقتباسات ہم نے دیے ہیں، ان سے بھی خیال ہوتا ہے کہ سید سلطان نے اس میدان میں پہل کی۔ سید سلطان پیری مریدی بھی کیا کرتے تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ وفاتِ رسول میں خلفائے راشدین اور واقعۂ کربلا کا ذکر کریں لیکن وہ اپنا ارادہ پورا نہ کر سکے۔ اس لیے انھوں نے اپنے مرید محمد خاں سے تکمیل کا کے لیے کہا اور محمد خاں نے اس ارشاد کی تعمیل میں صحابا رکھا یا اصحاب نامہ، مقتولِ حسین اور قیامت نامہ لکھیں۔ ان میں مقتولِ حسین کو بڑی شہرت حاصل ہے۔ محرم کے موقع پر ان کے انتخاب مجالس میں اب بھی پڑھے جاتے ہیں اور کتاب کا ادبی درجہ بھی بلند ہے۔

اصلاح حالت کی یہ کوشش صرف اہلِ علم بنگالی مسلمانوں نے نہیں کی، بلکہ عوام میں بھی ہندو ادبی اثرات کے خلاف ردِّ عمل پیدا ہُوا۔ اس کا اندازہ اس عوامی ادب سے ہو سکتا ہے جو قصّوں، کہانیوں اور جنگ ناموں کی صُورت میں کثرت سے "مسلمانی بنگال" میں لکھا گیا اور جس کا بسا اوقات موضوع تھا کہ مسلمان پیر، ولی اور "غازی" کس طرح ہندو دیوتاؤں پر غالب آگئے!!

بنگالی میں مذہبی کتب لکھنے کے متعلق سیّد سلطان کا طرزِ عمل معذرت آمیز تھا۔ لیکن پچاس ساٹھ سال بعد اس بحث نے تلخ صُورت اختیار کی۔ عہدِ عالمگیر میں جو مذہبی کتابیں بنگالی میں تصنیف ہوئیں۔ ان میں ایک جزیرہ سندیب (ضلع چٹاگانگ) کے ایک شاعر عبدالحکیم کی کتاب نور نامہ ہے۔ اس میں وہ لکھتا ہے:۔

میں بنگالی میں لکھ رہا ہوں۔
تاکہ ہر ایک کو اپنی محنت سے خوش کر سکوں۔
میں عربی اور فارسی کو حقارت سے نہیں دیکھتا۔
لیکن لوگ اپنی مادری زبان سمجھتے ہیں۔
ایک مضمون چاہے عربی فارسی یا ہندی میں ہو بدل نہیں جاتا۔
اگر کوئی شخص خدا اور نبی کے اوصاف بیان کرے۔
خدا لوگوں کی زبان سمجھ لیتا ہے۔
وہ ہندوؤں کی زبان سمجھتا ہے۔
اور بنگالیوں کی زبان سمجھتا ہے۔
مجھے ان لوگوں کی اصل کا پتا نہیں۔
جو پیدا تو بنگال میں ہوئے ہیں، لیکن بنگالی زبان سے متنفر ہیں۔
تو کیوں یہ جگہ چھوڑ کر وہ دوسری جگہ نہیں چلے جاتے؟

عبدالحکیم نے نور نامہ کے علاوہ یوسف زلیخا۔ شاہ نامہ۔ نصیحت نامہ۔ لیلیٰ مجنوں سیف الملوک اور شہاب الدین نامہ تالیف کیں۔ آخری کتاب شاعر نے اپنے

پیر و مرشد شہاب الدین کے نام معنون کی۔

بہرام سقا بردوانی
۱۵۶۲ء

عہد اسلامی میں عام دیہاتی مسلمانوں کی زبان بنگالی تھی۔ لیکن دفتری اور درباری زبان فارسی تھی۔ مرحوم منشی عبدالکریم کی کوششوں سے بنگالی تصانیف کے مسودے تو ایک حد تک جمع ہو گئے ہیں، لیکن فارسی تصانیف کے متعلق کوئی ایسی کوشش نہیں ہوئی۔ اس وقت جو اکابر بنگالہ کی سرزمین میں دفن ہیں، ان میں سب سے قدیم صاحب دیوان شاعر حاجی پیر بہرام سقا ہیں، جن کا مزار بردوان کی مشہور زیارت گاہ ہے۔ وہ بخارا کے چغتائی ترک تھے۔ شاعر تھے۔ مسافروں، زائرین اور حاجیوں کو مفت پانی پلاتے اور آزاد مجذوبانہ زندگی بسر کرتے۔ عہد اکبری کے مورخین لکھتے ہیں کہ اکبر کے ختنہ پر جب ہمایوں نے مارچ ۱۵۴۶ء میں قندھار میں جشن کیا تو اس کے دوران میں آپ پر جذبہ طاری ہوا۔ ہمایوں کی دوسری بادشاہت کے دوران میں ہندوستان آئے۔ عہد اکبری میں آگرہ میں تھے۔ دارالسلطنت کے ادبی و مذہبی مشاغل میں حصہ لیا۔ بدایونی کہتا ہے کہ آپ اپنے چند شاگردوں اور مریدوں کے ساتھ مفت پانی تقسیم کیا کرتے تھے اور ساتھ ساتھ آبدار و دلگداز شعر کہتے۔ جب اکبر کے ابتدائی ایام میں بیرم خاں کے سیاسی مخالفوں (اور پھر مخدوم الملک نے) شیعہ سنی سوال اٹھایا تو آپ پر بھی رفض کا الزام لگایا گیا۔ آپ نے اس الزام کی تردید میں ایک ترکیب بند لکھا، جس میں رفض کو برا بھلا کہا لیکن آپ کے اشعار سے خیال ہوتا ہے کہ آپ انتہائی طور پر آزاد خیال بلکہ وارستہ مزاج تھے۔ اشعار میں نوربخشی خیالات کی بھی جھلک ہے۔ اور حضرت علی کرم اللہ وجہ اور اہل بیت کی شان میں بھی کثرت سے اشعار ہیں۔ مورخین لکھتے ہیں کہ آپ ان بحثوں سے برگشتہ ہو کر اکبرآباد سے چل دیے۔ بدایونی لکھتا ہے کہ آپ لنکا کے سفر پر پاپیادہ چلے اور راستے میں وفات پا گئے۔ لیکن یا تو یہ اطلاع غلط تھی یا آپ کا ارادہ ساتگاؤں بندر سے جہاز پر سوار ہونے کا تھا۔ ۹۷۰ھ میں آپ بردوان پہنچے اور مقامی روایات کے مطابق تین روز کے بعد ہی وفات پا گئے۔ لیکن اس دوران میں آپ نے ایک ہندو جوگی کو زیر کیا اور اس کی دی

ہوئی زمین پر آپ کا مزار ہے۔

بہرام سقا کے مزار پر سالِ وفات ۹۷۰ھ/۶۳-۱۵۶۲ء درج ہے۔ اس زمانے میں بنگالہ بھی افغانوں کے قبضے میں تھا۔ کوئی گیارہ بارہ سال بعد ۱۵۷۴ء میں اکبر کے جرنیلوں نے داؤد خاں حاکمِ بنگالہ کو شکست دی اور فتح بنگالہ کے دوران میں بردوان پر قبضہ کر لیا۔ مسلمان مؤرخوں کی کتابوں میں پہلی دفعہ اس شہر کا نام اس سال آیا، لیکن اس کے بعد اس شہر کی تاریخی اہمیت بہت بڑھ گئی اور اس تاریخی دلچسپی کا عمارتی مرکز پیر بہرام سقا کا روضہ ہے، جس کے احاطہ میں دو قبریں دکھائی جاتی ہیں۔ ایک نور جہاں کے پہلے خاوند شیر افگن کی، جو بردوان کی عملداری میں جہانگیر کے کوکہ اور بنگالہ کے گورنر قطب الدین کوکلتاش کے ساتھیوں کے ہاتھ ہلاک ہُوا۔ دُوسری قطب الدین کی جس کا شیر افگن نے کام تمام کیا۔ بردوان کے ریلوے اسٹیشن سے ایک میل کے فاصلہ پر صوفی بایزید کا مزار ہے، جنھوں نے فرخ سیر کو بادشاہت کی نوید دی تھی اور جن کے مزار کے قریب فرخ سیر نے بادشاہت حاصل کرنے کے بعد مسجد تعمیر کرائی تھی۔

سقا کی اپنی ادبی اہمیت بہت ہے۔ ان کے دیوان کے متعدد نسخے بنگالہ میں ملتے ہیں۔ دو ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانہ میں ہیں۔ ایک بانکے پور میں خدا بخش لائبریری میں ہے۔ ہمارے تذکرہ نگار جو عرفی، نظیری اور ظہوری کے دربارکی وضعدارانہ، پُرتکلف طرزِ شاعری پر فریفتہ ہیں۔ سقا سے بالکل بیگانہ ہیں۔ اور اس کے کلام کا کوئی تفصیلی مطالعہ نہیں ہُوا۔ ورنہ ایک منفرد، حساس، متجسس شخصیت کے اظہار کے علاوہ معاصرانہ طور طریقوں پر روشنی پڑتی۔ بدایونی لکھتا ہے کہ سقا نے بہت سے دیوان جمع کیے۔ جب جذب غالب آتا تو انھیں دھونا شروع کر دیتے لیکن پھر بھی جو کچھ بچ گیا ہے۔ ایک "دیوان بزرگ" سے کم نہیں۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:

آمد خبیثے ز مدارس برائے بحث | بُنیاد کرد با منِ مسکیں بنائے بحث
گفت از کدام کشوری و مذہبِ تو چیست | با طمطراق بوالعجبی از برائے بحث
گفتم کہ لامکانم و عشق است مذہبم | دارد فراغتے دلم از ماجرائے بحث

باآبِ دیدہ ماورقِ بحث شستہ ایم	بنوشتہ ایم حرفِ خموشی بجائے بحث
بگذر بہ بحثِ عمر مدہ در جہاں بہ باد	مرغِ دل تو تا نپرد در ہوائے بحث
راہے بسوئے دفترِ معنی نبردہ	زاں آیت و حدیث کہ خوانی برائے بحث

سقا برون ز مدرسہ دہر شو کہ ہست
خود ایں مکان مدرسہ خاص از برائے بحث

ایک عام رنگ کی غزل ہے ؎

بے خود و مستم از محبت دے	محتسب چیست ایں ہمہ ہے ہے
میدہد یار بادہ زاں مئے ناب	با اسیرانِ خویش پے در پے
دہنم را مبو و تلخ مگو	بتو بوئے نمی رسد زاں مے
بگذر از شیوۂ دل آزاری	پیرۂ جور و جفا شدن تا کے
خوش بود ہائے و ہوئے مستاں ہم	نیم شبہا بہ یارب و یا حے
زاہد و حافظانِ خوش آواز	باد در دی کشاں و نالہ دنے

نزد سقا سفالِ فقر خوش است
کے کشد جامِ او بہ منتِ کے

بہرام سقا سیلانی مزاج اور رصاف گو تھے ۔ وہ مروجہ خیال بندی اور لفظ پرستی کے قائل نہ تھے ۔ جو دل پر گزرتی سیدھے سادے الفاظ میں بیان کر دیتے ۔ کئی قطعات میں شخصی تجربات کا بیان ہے ؎

در مردمِ ہند طرفہ حالیست	کس را بکسے سرِ سخن نیست
مستغرقِ حیرت اند یکسر	چندانکہ مجالِ دم زدن نیست
سرمست ز بادۂ غرور اند	کس را خبرے ز خویشتن نیست
گفتم کہ سقا و ۂ بسازم	در شہر کسے ممدِ من نیست

سقا چہ کند حسن دریں کار
ایں از فلک است از حسن نیست

معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بھی حکام لاہور (لاہر) کی سخت گیری مشہور تھی ؎

ہر کہ در لاہر بنائے خیر سازد بعد ازیں — خون فے در گردنش بادا بگو تم حالِ شہر
نامرادے ساخت سقاخانہ و ہم مسجدے — ریسماں در گردنش مے افگند کو توالِ شہر
طمطراقِ شحنۂ بازار و شیخ شہرہا — میکشد سقا نخوردہ یک درم از مالِ شہر

بہرام سقا ہندوستان زادہ تھے، لیکن طبیعت آزاد و قلندرانہ اور نو پسند تھی۔ ریختہ میں بھی طرح آزمائی کی اور ان کی ابتدائی عہدِ اکبری کی لکھی ہوئی غزلیں سب سے قدیمی ریختوں میں شمار ہونے کے لائق ہیں۔ لہجہ بھی دلائی ہے ؎

باز ہندو بچۂ آہ دلم دھرتے ہے — کوچہ دیکھو ناہی جاتوں ازیں خستہ کیا کرتے ہے
چیں برابر وزدہ بربستہ کنارہ بہ میاں — چل چل اے دل مگر توجہ کنی اد مرتے ہے
چشم او طرفہ غزالیست کہ در باغِ جہاں — ہمہ ریحان و گل و سنبلِ تر چرتے ہے
ہات مہندی لائیا دست فرو بُردہ بخوں — کہ بسے کشتہ ز دستان غمش مرتے ہے
بُتِ سروِ سہی شرم ندارد ز قدش — خویشتن را بہ چہ رو اینہمہ او برتے ہے
آنکہ مردم کشِ او دمبدم از خونِ جگر — قدحِ چشم مرا از غم خود بھرتے ہے
چُپ کر اے دلشدہ سقا ز غم یار منال — گر جفا رفت بجانِ تو میاں کرتے ہے

بردوان بڑی دیر تک مغلیہ تہذیب و تمدن کا ایک اہم مرکز رہا۔ عالمگیر کی وفات کے بعد یہاں موجودہ ہندو مہاراجا کی گدی قائم ہوئی، لیکن قدیم تہذیب و تمدن سے تعلق برقرار رہا۔ انیسویں صدی میں شمس العلما مولنا لطف الرحمن بردوانی نے نام پایا جن کی مذہبی مسائل پر کئی تصانیف ہیں۔ اسی زمانے کے ایک بردوانی شاعر تھے منشی محمدی خادم۔ حضرت شاہ بہرام سقا کی درگاہ کے خادم تھے اور بردوان کے مہاراجا مہتاب چند بہادر کے فارسی شاعری میں اُستاد۔ ان کا فارسی دیوان چھپ چکا ہے۔

مولنا حمید دانشمند منگلکوٹی
وفات سنہ ۱۶۵۳ء

عہدِ مغلیہ میں بردوان اور مرشد آباد کے درمیان کا سارا علاقہ بالخصوص وہ حصہ جو شرفا کی آبادی کی بنا پر شریف آباد کہلاتا

تھا اور چھبیس پرگنوں پر مشتمل ایک پوری سرکار (سرکار شریف آباد) کی وسعت رکھتا تھا۔ مسلمان علما اور مشائخ کی وجہ سے ممتاز تھا۔ ان میں سے بعض خاندان ایسے تھے جو گوڑ کی تباہی کے بعد یہاں آبسے اور علٰحدہ دیہات کو آباد کر کے اسلامی عمل دخل اور علم وہدایت کا مرکز بن گئے۔ مثلاً سالار۔ بنودیہ۔ منصور پور جہاں کے اخوند کا ان صدیقی جو اپنا سلسلہ نسب سلطان غیاث الدین کے قاضی القضاۃ شیخ سراج الدین اور سلسلہ طریقت حضرت نور قطب عالم سے ملاتے ہیں۔ بنگالہ کی علمی اور رُوحانی تاریخ مرتب کرنے کے لیے ان تاریخی دیہات میں تلاش کی ضرورت ہے، لیکن سرکار شریف آباد میں جو قصبہ اشاعتِ علمی کے لیے عہدِ مغلیہ میں سب سے مشہور تھا۔ منگل کوٹ تھا جو ضلع بردوان کے شمال میں اب ایک معمولی گاؤں کی حیثیت رکھتا ہے۔ تقسیمِ ہند سے پہلے پرگنہ منگل کوٹ کی نوّے فیصدی آبادی مسلمان تھی اور اس میں قدیم مسجدیں اور مزار ہیں۔ ایک مزار مخدوم شاہ محمود غزنوی المعروف راہی پیر کا ہے جو مقامی روایات کے مطابق اس پرگنہ کی فتح کے باعث ہوئے۔ ایک مزار مخدوم شاہ عبداللہ گجراتی کا ہے۔ کئی پرانی مسجدوں کے آثار ہیں۔ ایک شکستہ مسجد جس کا سالِ تعمیر ۱۵۱۰ء ہے، علاء الدین حسین فرمانروائے گوڑ نے تعمیر کرائی تھی۔ دوسری اس کے بیٹے اور جانشین نصرت شاہ نے ۱۵۲۳ء میں۔ ان مسجدوں کے کتبوں سے پتا چلتا ہے کہ عہدِ مغلیہ سے پہلے بھی یہ قصبہ رونق پر تھا۔ عہدِ مغلیہ میں اس کی اہمیت مولانا حمید دانشمند کی وجہ سے بڑھ گئی جو حضرت مجدد الف ثانی کے چہیتے مُرید تھے۔ اور جن کا قدردان شاہجہان بتایا جاتا ہے۔

مولانا شیخ حمید دانشمند منگلکوٹ کے قاضیوں کے مشہور خاندان سے تھے۔ ان کے مورثِ اعلےٰ قاضی ضیاء الدین (المعروف احمد سالار) بنگال میں شاہ صفی الدین کے ساتھ، جن کا مزار پنڈوہ (ضلع ہگلی) میں زیارتگاہِ خاص وعام ہے اور جن کی وفات تیرھویں صدی عیسوی کے آخری سالوں میں ہوئی تشریف لائے۔ مولانا حمید کو تعلیم کے لیے لاہور بھیج دیا گیا۔ جہاں انھوں نے علومِ ظاہری کا پورا طرح مطالعہ کیا۔

ان علوم کا ان پر ایسا اثر ہوا کہ وہ صوفیہ کے مخالف ہو گئے ۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ اس زمانے میں لاہور میں تھے، لیکن صوفیہ سے مخالفت کی بنا پر مولانا حمید نے ان سے فیض حاصل نہ کیا۔ تکمیلِ تعلیم کے بعد آپ دہلی آئے اور مفتی ِعسکر کے مکان پر مقیم ہوئے۔ یہاں اتفاقیہ حضرت مجدد سے ملاقات ہو گئی۔ کچھ بحثا بحثی بھی ہوئی، لیکن آپ حضرت مجدد سے اس طرح متاثر ہوئے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ان کے پیچھے ہو لیے۔ تعلیم باطنی کے کوئی ایک سال بعد حضرت مجدد نے انھیں خلافت عطا کی اور یہ مرشد کی کھڑاویں لے کر انھیں اپنی دستار میں لپیٹ کر وطن کو روانہ ہوئے اور باقی وقت منگل کوٹ میں ارشاد و ہدایت میں صرف کیا۔

کہا جاتا ہے کہ شاہجہاں آپ کا بڑا معتقد تھا۔ وہ منگل کوٹ آیا۔ آپ سے اخذِ فیض کیا اور مسجد، مدرسہ اور خانقاہ کے لیے اسّی ہزار سالانہ آمدنی کی وسیع اراضی کا فرمان دیا گیا۔ ان بیانات کی تصدیق کا کوئی ذریعہ نہیں کہ شاہجہاں جب اپنے والد کے خلاف بغاوت کر کے بنگالہ میں مقیم تھا اور بالخصوص جب ۱۶۲۴ء میں اس نے بردوان فتح کیا اس وقت اسے مولانا حمید دانشمند کے کاموں سے واقفیت حاصل کرنے کا موقع ملا ہو۔ مولانا حمید کے شکستہ مزار کے قریب ایک مسجد تھی، جس کی نسبت مشہور ہے کہ وہ شاہجہان کی مالی مدد سے تعمیر ہوئی تھی۔ مولانا کا مقبرہ تو اب شکستہ حالت میں ہے اور شاہجہانی مسجد کے ملبہ سے اہلِ قصبہ نے ایک نئی مسجد تعمیر کی ہے، لیکن اب بھی اس شہر میں علمی اثرات موجود ہیں۔ تقسیمِ ہند کے وقت تک یہاں ایک مدرسہ تھا، جس کا کتب خانہ اب مدرسہ عالیہ ڈھاکہ کے کتب خانہ کا حصہ ہے[1]!

مولانا حمید کا پورا نام مولانا حمید الدین تھا۔ ان کے نام حضرت مجددؒ کے کئی خطوط

---

[1] یہ تفاصیل مولانا بدرالدین سرہندی نے حضرت مجدد کی سوانحمری حضرات القدس میں دی ہیں۔ اس وقت حضرات القدس ہمارے سامنے نہیں۔ ہم نے اس کے اندراج کا خلاصہ خان صاحب مولوی عبدالولی صاحب کے مضمون متعلقہ منگلکوٹ، بہار۔ اڑیسہ ریسرچ سوسائٹی جرنل ۱۹۱۷ء سے اخذ کیا ہے۔

ہیں۔ جلد اوّل میں ایک اہم طویل خط (مکتوب ۲۲۰) صوفیوں کی بعض غلط فہمیوں الٰہ مقاماتِ روحانی کے متعلق غلط فہمیوں کے بارے میں ہے۔ جلد ثانی میں چھ صفحے کا ایک خط (۹۴) کمالاتِ نبوت اور کمالاتِ ولایت کے متعلق ہے۔ مُرشد کو اپنے دُور اُفتادہ مُرید کا خاص خیال تھا۔ ایک خط (۴۸) میں شکایت کی ہے کہ مولٰنا حمید الدین کی طرف سے بہت کم خط آتے ہیں اور فرماتے ہیں:۔

"اخوی ارشدی میاں شیخ حمید عجب انزوا اختیار نمودند کہ سلام و پیام را ہم آنجا گنجائش کمتر است۔ دریں ہفت و ہشت سال یک کتابت از جانب شمار سیدہ آنہم ناتمام و بے سرانجام۔ کتابت ہا کہ ازیں جانب مے رود معلوم نیست کہ بشما مے رسد یا نہ"

آگے چل کر لکھا ہے کہ میں شیخ عبدالحی کو جو پانچ سال میرے ساتھ رہے۔ آپ کے پاس بھیج رہا ہوں تاکہ آپ کے احوال سے آگہی حاصل کریں اور آئندہ کے لیے مناسب مشورے دیں۔

مولٰنا حمید دانشمند کے متعلق زیادہ تفاصیل نہیں ملتیں اور یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کی بدولت مجدّدیہ سلسلہ کس حد تک بنگال میں اشاعت پذیر ہُوا۔ حضرت مجدّد کے جانشین خواجہ محمدؒ معصوم کے مطبوعہ مکتوبات (کانپور ایڈیشن) میں ایک خط شیخ فیض اللہ بنگالی کے نام ہے اور دو خطوط شاہ نعمت اللہ قادری کے نام ہیں۔ قلمی مکتوبات (بانکی پور لائبریری) میں شیخ عبدالخالق کے نام خطوط ہیں۔ لیکن وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کون بزرگ تھے۔ بنگال میں نقشبندیہ مجدّدیہ طریقے کے ماننے والے کئی ہیں لیکن بظاہر اس علاقے میں اس طریقے کی زیادہ اشاعت اُنیسویں اور بیسویں صدی میں ہوئی۔

بزرگانِ ڈھاکہ

مشرقی پاکستان کے جس سب سے قدیمی مجدّدی بزرگ کا پتا چلا ہے، وہ ڈھاکے کے شاہ عبدالرحیم صاحب شہید تھے۔ آپ کشمیری الاصل تھے۔ پہلے مُرشد آباد آئے۔ وہاں سے ڈھاکہ تشریف لائے۔ تین واسطوں سے آپ کا سلسلہ خواجہ محمدؒ معصومؒ تک اور چار واسطوں سے حضرت مجدّد الف ثانیؒ تک جا پہنچتا ہے۔ آپ صوفی ہدایت اللہ عُرف صوفی حسن کے

خلیفہ تھے۔ وہ صوفی عبداللہ کے، اور صوفی عبداللہ حضرت خواجہ محمد معصوم کے۔ آپ سال ۱۶۷۱ء میں پیدا ہوئے۔ غالباً عہدِ عالمگیری کے اواخر میں ڈھاکہ تشریف لائے۔ چوراسی برس کی عمر میں، ایک دیوانے کے ہاتھ سے چار ستمبر ۱۷۴۵ء کو زخمی ہوئے۔ اس کے بعد ایک مہینا تین دن زندہ رہے اور بالآخر ۹ رمضان المبارک ۱۱۵۸ھ کو وفات پائی۔ اگلے روز دفن ہوئے۔ کسی ہمعصر شاعر نے تاریخ لکھی ؎

مزارِ شاہِ دیں عبدالرحیم است | پُر از فیضِ خداوندِ کریم است
زہے روشن دلِ صاحب سکینہ | اثر مے داشت از سینہ بہ سینہ
ز او صافش کرامت مُنجلی بُود | چرا پنہاں کنم بیشک ولی بُود
سِنِ تدفین از روئے وفائے | دہم رمضان بود آمد ندائے

۱۱۵۸

شاہ عبدالرحیم شہید کی عمر میں خدا تعالیٰ نے برکت دی اور آپ کی بدولت مجددیہ نقشبندیہ طریقے کی اشاعت اس علاقے میں خوب ہوئی۔ چٹاگانگ کے مشہور صاحب خانقاہ بزرگ صوفی شاہ امانت اللہ صاحب آپ ہی کے خلیفہ تھے اور ڈھاکہ میں بھی آپ کا فیض جاری ہے۔ آپ کو اپنے زمانے میں میاں صاحب کہا جاتا تھا۔ اس لیے ڈھاکہ کے جس علاقے میں آپ کا قیام تھا اور اب مزار ہے، محلہ میدان میاں صاحب کہلاتا ہے۔

ڈھاکہ کی ایک اور مشہور خانقاہ جس کا فیض ابھی جاری ہے اور جس کے بعض ارکان نے مجددیہ طریقہ اختیار کر لیا تھا، دائرہ عظیم پورہ کی درگاہ ہے۔ جس کا آغاز اسی زمانے میں ہُوا۔ اس خاندان کے سب سے قدیمی بزرگ صوفی سید محمد دائم صاحب چٹاگانگ کے رہنے والے تھے اور حضرت سید بختیار ماہی سوار کی اولاد سے تھے جو قریباً پانچ سو سال ہوئے، چٹاگانگ تشریف لائے۔ صوفی صاحب نے اپنے وطن میں شاہ امانت اللہ صاحبؒ سے بیعت کی، جو چاٹگام میں شاہ عبدالرحیم شہید کے مشہور صاحبِ خانقاہ خلیفہ تھے، جب وہاں کشودِ کار نہ ہُوا، تو آپ پیر کی اجازت سے ڈھاکہ آئے اور حضرت شاہ عبدالرحیم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے ارشاد کیا کہ تمھارا حصہ پٹنہ کے شاہ منعم پاکباز

کے یہاں ہے۔ چنانچہ وہ پٹنہ گئے اور حضرت منعم پاکباز قدس سرہٗ سے حصولِ فیض کے بعد ڈھاکہ تشریف لائے۔ اور محلہ عظیم پورہ میں حصور ہو گئے۔ آپ کے جانشین بھی سوائے حج کے دائرہ سے کبھی باہر نہیں نکلتے اور ہمیشہ دائرہ میں حصور رہتے ہیں۔

حضرت صوفی محمد دائمؒ کو خدا نے بڑی مقبولیت دی اور دُور دُور سے لوگ آپ کے پاس فیض حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوئے۔ تاریخ ڈھاکہ میں لکھا ہے کہ چاٹگام، کمرلا اور نواکھالی کے اکثر اشخاص آپ کے مُرید تھے۔ آپ بڑے پابندِ شرع تھے۔ سماع المزامیر کبھی نہیں کرتے تھے۔ صرف قال اللہ و قال رسول سے دائرہ گونجا کرتا تھا۔ خانقاہ میں کثرت سے طالب علم رہتے تھے، جن کی تعلیم و تدریس کے لیے علما مقرر تھے اور کھانا کپڑا خانقاہ کے لنگر سے ملتا تھا۔ آپ کا وصال ۱۷۹۹ء میں ہُوا۔ آپ کا فیض آپ کے جانشینوں نے جاری رکھا اور اب بھی جاری ہے۔ لیکن رُوحانی امور اور تزکیہ نفس سے اس زمانے میں جو دلچسپی کم ہو گئی ہے۔ اس سے یہ خانقاہ بھی متاثر ہوئی ہے۔ مثلاً آپ کے ایک جانشین صوفی سید شاہ خلیل صاحب نے حکیم حبیب الرحمن سے فرمایا۔ "میاں، چالیس برس ہو گئے۔ باپ دادا کی گدی پر بیٹھا ہوں۔ مگر اللہ کا راستا پوچھنے لوگ کم ہی آتے ہیں۔ جو آتا ہے، جھاڑ، پھونک، تعویذ، طومار کے لیے آتا ہے۔" آپ کے پوتے صوفی شاہ وجیہ اللہ صاحب نے مجددی طریقہ اختیار کر لیا تھا اور وحدت الوجود کی تردید اور وحدت الشہود کی تائید میں ایک رسالہ بھی لکھا لیکن باقی حضرات نے اپنے بزرگوں کا طریقہ جاری رکھا۔ دائرہ کی ایک خصوصیت یہاں کا علمی ماحول ہے۔ ایک کتب خانہ بھی ہے۔ اور تصنیف و تالیف کا جو سلسلہ شاہ وجیہ اللہ صاحب سے شروع ہُوا برابر برقرار ہے۔

مدرسۂ باگھا ضلع راج شاہی

منگل کوٹ اور ڈھاکہ کے علاوہ اس زمانے میں علم و ہدایت کا ایک سرچشمہ قصبہ باگھا تھا۔ تصدیق النہاد میں خان بہادر اخوند کا فضل ربی لکھتے ہیں۔ کہ حضرت

نور قطب عالم کے خلیفہ شیخ بدر الاسلام جنھیں راجا گنیش کی تعظیم نہ کرنے پر شہید کیا گیا، باگھا کے عباسی اخوند کاروں کے مورثِ اعلیٰ تھے۔ یہاں بہت سے بزرگوں کے مزار ہیں اور ایسٹ بنگال ریلوے ٹائم ٹیبل کے مطابق یہ مقام "پیروں کا مسکن" سمجھا جاتا ہے۔ یہاں کی جامع مسجد نصرت شاہ نے ۱۵۲۳ء میں تعمیر کرائی۔

مشہور ہے کہ ۱۵۱۹ء میں یہاں بغداد سے مولانا شاہ معظم دانشمند (المعروف شاہ دولہ) تشریف لائے اور انھوں نے مخدوم پور کے شاہی جاگیردار الٰہ بخش برخوردار لشکری کی صاحبزادی زیب النسا سے شادی کی اور خاندانی مدرسے کا آغاز کیا۔ ان کے بیٹے نے تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری رکھا اور پوتے شاہ عبدالوہاب کو شاہجہاں کی طرف سے بیالیس گاؤں، جن کی آمدنی کا اندازہ اس زمانے میں آٹھ ہزار کیا جاتا تھا، انعام میں ملے۔ غالباً یہ اراضی اس زمانے میں ملی ہوگی، جب شاہجہاں بنگالہ میں مقیم تھا اور بعد میں اس کی توثیق ہو گئی ہوگی۔ ۱۶۲۷ء میں شاہ عبدالوہاب کے بیٹے شاہ محمد رفیق نے نصف جائداد کو وقف میں منتقل کر دیا۔ اور باقی نصف اپنے بھائی نور العارفین کی اولاد کے پاس رہنے دی۔ اس وقت سے یہ وقف برقرار اور تعلیم و تعلم کا سلسلہ قائم ہے۔ متولی مدرسہ، مسجد، مزار اور مسافروں کی نگہداشت کا انتظام کرتا ہے۔ انیسویں صدی کے شروع میں جب مسٹر آدم نے بنگال بہار کے تعلیمی اداروں کا دورہ کیا اور اپنی مشہور تعلیمی رپورٹ مرتب کی تو اس وقت اس مدرسہ میں عربی فارسی کی پڑھائی کا باقاعدہ انتظام تھا۔ اور مسٹر آدم نے اپنی رپورٹ میں قصبہ باگھا کے مدرسہ کے متعلق کئی صفحات لکھے ہیں۔ وقف کی آمدنی کے متعلق اس زمانے کے کلکٹر کا اندازہ تیس ۳۰ ہزار تھا۔

شاہ نعمت اللہ قادریؒ

بنگال میں قادریہ سلسلے کے جس بزرگ کا نام سب سے پہلے لیا جاتا ہے، وہ گوڑ (فیروز آباد) کے شاہ نعمت اللہ قادری تھے، جو نارنول میں پیدا ہوئے اور سیر و سفر کے دوران

لہ غالباً یہ روایت صحیح نہیں۔

راج محل آئے جو شاہ شجاع کے زمانے میں بنگالہ کا حاکم نشین شہر تھا۔ شاہ شجاع نے آپ کی بڑی قدر کی۔ آخری ایام میں آپ گوڑ کے نواحی قصبہ فیروز آباد تشریف لے گئے اور وہیں ۱۰۷۶ھ/۱۶۶۶ء میں وفات پائی۔ آپ بڑے صاحب سطوت بزرگ تھے کئی بزرگوں سے آپ کے مراسم تھے اور علمی حلقوں میں بھی آپ کا نام ادب سے لیا جاتا تھا۔ آپ متعدد کتب کے مصنف تھے۔

اسی دار الخلافہ گوڑ کا بہت تھوڑا حصہ پاکستان میں شامل ہے۔ اس میں شاہ نعمت اللہ صاحب کی درگاہ بھی ہے۔

عہدِ آخر کے مشائخ قادریہ

شاید موجودہ زمانے میں بنگالہ کی سب سے اہم قادری خانقاہ کلکتہ میں ہے۔ اس خاندان کا سلسلہ مغلیہ خاندان کے عہدِ زوال میں، بلکہ پلاسی کی لڑائی کے بعد شروع ہوا، لیکن بزرگوں کے فیض سے اس سلسلے نے بڑی اہمیت حاصل کر لی اور چونکہ اس خانوادے سے اہلِ علم اور اہلِ تصنیف بزرگوں کا تعلق رہا ہے، اس لیے اس خانوادے کے متعلق معلومات بھی کافی مل سکتی ہیں۔

۱۷۶۴ء میں حضرت غوثِ اعظم قدس سرہ کی اولاد میں سے ایک بزرگ سیدنا حضرت ذاکر علیؒ اپنے والد بزرگوار اور بعض دوسرے عزیزوں کے ساتھ ایک اشارۂ غیبی کے تحت بنگالہ تشریف لائے اور منگل کوٹ ضلع بردوان میں جو ان دنوں خوب آباد اور علمی اور مذہبی سرگرمیوں کا بڑا مرکز تھا، بس گئے۔ آپ کے والد ماجد اور بعض دوسرے اقربا تو بعد میں بغداد واپس چلے گئے لیکن سیدنا شیخ ذاکر علی ان کے بھائی سیدنا روشن علی صاحب صوبہ بہار کے ضلع پورینہ میں تشریف لے گئے اور وہاں قادریہ سلسلے کی اشاعت کا مرکز بنے۔ سیدنا ذاکر علی نے اپنے بھتیجے کے ساتھ منگل کوٹ کو ارشاد و ہدایت کا مرکز بنایا۔ ایک مختصر سی خانقاہ تعمیر کی۔ آپ کی وفات اکیاسی برس کی عمر میں ۱۸۰۸ء میں ہوئی۔ آپ کے جانشین آپ کے بھتیجے اور داماد سیدنا شاہ طفیل علی قادری تھے۔ پہلی اہلیہ محترمہ کی وفات کے بعد انھوں نے دوسری شادی

مدناپور کے مشہور بزرگ اور مولنا شہباز بھاگل پوری کے ممتاز خلیفہ دیوان سید رجی البلخی (مشہور بہ چندن شہید) کے خاندان میں کی۔ شادی کے بعد آپ کا بہت سا وقت مدناپور میں گزرا۔ بلکہ ایک لحاظ سے آپ نے وہاں سکونت اختیار کر لی لیکن وفات سے پہلے اپنے پیر و مرشد کے قریب جگہ حاصل کرنے کے لیے آپ بیماری کی حالت میں منگلکوٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں ہی وصال ہو گیا۔ (۱۸۳۶ء) نعش مبارک آپ کی خواہش کے مطابق منگلکوٹ میں دفن ہے۔ آپ کے جانشین آپ کے دوسرے صاحبزادے حضرت مہر علی قادری (معروف بہ حضرت اعلیٰ حضور) تھے۔ وہ مدناپور میں ۱۸۰۸ء میں پیدا ہوئے اور وہیں قیام فرمایا۔ آپ نے مدناپور میں ایک مدرسہ اور ایک خانقاہ کا آغاز کیا' لیکن ارد گرد کے اضلاع (یعنی بردوان' مرشد آباد' بیربھوم۔ ہگلی۔ بانکورا اور اطرافِ مدناپور) میں دورہ کرتے اور لوگوں کو ہدایت فرماتے۔ آپ کی وفات ۱۸۶۸ء میں ہوئی۔ آپ کے جانشین حضرت شاہ علی عبد القادر شمس القادر مرشد علی القادری تھے' جو ۱۸۵۲ء میں پیدا ہوئے اور سولہ برس کی عمر میں اپنے والد بزرگوار کے جانشین ہوئے۔ آپ نے قریباً تینتالیس ۴۳ سال تک مسندِ ارشاد و ہدایت کو زینت دی۔ بالآخر آپ نے کلکتہ میں قیام اختیار کیا' لیکن مزار مبارک مدناپور میں ہے۔ آپ آخری ایام کے مشاہیر بزرگوں میں سے تھے۔ مولنا عبد الرحمٰن قادری پروفیسر سینٹ زیویر کالج کلکتہ نے دو جلدوں میں آپ کے سوانح حیات و ارشادات تذکرۃ المولیٰ کے نام سے جمع کیے ہیں۔ آپ سے بہت سی کرامات منسوب کی جاتی ہیں۔ شمس العلما مولنا ولایت حسین آپ کے بڑے معتقد تھے۔ آپ نے ان کے بیٹے ہدایت حسین کے مدرسۂ عالیہ کلکتہ کے افسرِ اعلیٰ ہونے کی پیشگوئی اُس وقت کی تھی' جب وہ ابھی گیارہ سال کے تھے اور یہ عہدہ انگریزوں کے لیے مخصوص تھا۔ آپ کی وفات فروری ۱۹۰۱ء میں ہوئی اور جانشین حضرت سید شاہ ارشاد علی قادری المعروف سیدنا حضور مولا ہوئے۔ وہ ۱۸۸۳ء میں کلکتہ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۵۳ء میں وفات پا گئے۔ قادریہ سلسلے کی اشاعت اور تبلیغ اسلام کے علاوہ اس خانوادے نے اشاعتِ علم

میں بھی حصہ لیا۔ خانقاہ لین کلکتہ میں ایک وسیع کتب خانہ قادریہ لائبریری کے نام سے ہے۔ اس کے علاوہ اس خاندان کے بزرگوں نے تصنیف و تالیف پر بھی توجہ دی۔ ہم تذکرۃ المولٰے کا ذکر کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ اس خاندان کے حالات میں فارسی میں مذاکرہ قطب العالمین اور انگریزی میں جسٹس مسٹر محبوب مرشد کی گلستانِ قادری (انگریزی) شائع ہو چکی ہیں۔ ہم نے مندرجہ بالا حالات گلستانِ قادری سے ہی اخذ کیے ہیں جسٹس محبوب مرشد کے والد اور سابق ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سید عبدالسالک صاحب کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی کتاب Early Heroes of Islam کلکتہ یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہوئی ہے اور انھوں نے حضرت غوث اعظم کی ایک انگریزی سوانح عمری بھی لکھی ہے۔

غیر شرعی طریقے

نقشبندیہ اور قادریہ سلسلوں اور باگھ جیسے علمی مرکزوں کی بدولت بنگال میں قرآن و سُنّت اور متشرع طریقت کی روشنی پھیلتی ہوگی، لیکن قرائن سے خیال ہوتا ہے کہ عہدِ مغلیہ میں یہاں غیر شرعی طریقے زوروں پر تھے اور انیسویں صدی کے آغاز تک عوام میں سب سے زیادہ زور انھی کا تھا۔ مثلاً مسائل المشائخ میں جو نویں یا دسویں صدی ہجری کی تالیف ہے۔ کثرت سے شطاری درویشوں کا ذکر آتا ہے۔ اسی طرح بے شرع مداریہ فرقہ کی نسبت حکیم حبیب الرحمان لکھتے ہیں۔" بنگال کے قریباً ہر ضلع میں مدار گنج۔ مدار کا دائرہ۔ مداری پور نام کی بستیاں ملتی ہیں۔ اسی ڈھاکہ میں مدار جھنڈا کی گلی اب بھی موجود ہے۔" ڈاکٹر انعام الحق کا خیال ہے کہ اس فرقے کے بانی شاہ مدار (جن کی پیدائش انھوں نے ۱۳۱۵ء اور تاریخ وفات ۱۴۳۶ء لکھی ہے) بنگال میں آئے تھے اور یہاں ان کا بڑا اثر تھا۔ بنگال کے کئی گاؤں اور شہر (مثلاً ضلع فریدپور میں مداری پور اور ضلع چٹا گانگ میں مدار باری اور مدار شاہ) ان کے نام پر آباد ہیں۔ یہ رائے تو قیاس پر مبنی ہے، لیکن مراۃ مداریہ اور فصول مسعودیہ کے مطابق شاہ مدار کے ایک مشہور خلیفہ حضرت شاہ اِلّا گوڑ میں آئے اور وہیں وفات پائی۔ مجذوب تھے۔ برہنہ رہتے تھے۔ حضرت نور قطب عالم کے ہمعصر تھے

گلزارِ ابرار میں آپ کی نسبت لکھا ہے۔ اس سلسلے کے بعض فصیح اللسان لوگ آپ کو شیخ اعلیٰ بھی کہتے ہیں، لیکن عوام کے نزدیک آپ شیخ الا کے نام سے ہی نامزد ہیں۔ آپ بھی انھیں مجذوبوں میں سے ہیں، جو مشہورِ دنیا ہیں۔ آپ کی گور گوڑ میں ہے۔ ضلع دیناج پور کا موضع بلیادھی (تھانہ ہمت آباد) میں عہدِ شاہجہانی سے آزاد قلندروں اور غیر شرعی فقیروں کا ایک مرکز ہے، جنھوں نے ہندو لوگ، اسلامی تصوف اور اخلاقی آزادی کی ایک عجیب کھچڑی بنا رکھی ہے۔ یہ لوگ سوائے ایک لنگوٹی کے کوئی کپڑا نہیں پہنتے۔ برہنہ کہلاتے ہیں۔ سر کے بال نہیں کٹواتے۔ پاؤں میں بعض سادھوؤں کی طرح بیڑیاں پہنتے ہیں۔ ان کے عقائد و اعمال کئی امور میں غیر اسلامی ہیں۔ ان کے مورث اعلیٰ شاہ سلطان حسنی مادیہ برہنہ تھے، جنھوں نے ایک ہندو راجا بلیا کو بھگا کر اس جگہ پر قبضہ کر لیا۔ شاہ شجاع نے جس نے ڈاکٹر باؤٹن سے خوش ہو کر انگریز کمپنی کو وہ بے پناہ مراعات دی تھیں، جن کا نتیجہ عالمگیر اور کمپنی کی کشمکش اور ساٹھ ستر سال بعد پلاسی کی لڑائی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ شاہ سلطان حسن کو بھی خاص مراعات دے رکھی تھیں۔ اس زمانے کی ایک سند محررہ ۱۶۵۹ء راج شاہی کے سرکاری دفتر میں موجود ہے۔ جس میں شاہ شجاع نے شاہ سلطان حسن کو اختیار دیا تھا:

دفعہ اول۔ تم جب کبھی لوگوں کی ہدایت یا سیر و سیاحت کے لیے شہروں، دیہات، اضلاع اور جہاں کہیں اپنی خوشی کے مطابق جانا چاہو تمھیں اختیار ہے کہ جلوس کا سارا ساز و سامان مثلاً علم، جھنڈے، پھریرے، بانس، عصا، باجے، ماہی مراتب اپنے ساتھ لے جاؤ۔

دفعہ چہارم: جب تم ملک کے کسی حصے میں جاؤ تو مالکان دیہہ اور کاشتکار تمھیں اشیائے خوردنی مہیا کرنے کا بندوبست کریں گے۔

شاہ شجاع نے جو مراعات دی تھیں، اس کا سلطان حسن کے جانشینوں نے پورا فائدہ اٹھایا۔ اٹھارھویں صدی میں جب حکومت کا نظم و نسق کمزور ہو گیا تو ملک میں نیم برہنہ قلندروں اور ہندو بیراگیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ پھرتے تھے جو

دیہات اور قصبات سے بظاہر خیرات کے طور پر لیکن فی الحقیقت جبر اور دباؤ سے نذرانے وصول کرتے تھے۔ بعض دفعہ تو ان کی تعداد ہزار بارہ سو تک جا پہنچتی کمپنی کے افسروں کو بنگال۔ بہار اور اڑیسہ کی دیوانی حاصل کرنے کے بعد کئی دفعہ ان کے خلاف فوج کشی کرنی پڑی لیکن برسوں تک یہ سلسلہ ختم نہ ہوا۔ مثلاً اکتوبر ۱۷۷۰ء میں پانسو فقیروں کا ایک لشکر بنگال سے بہار میں داخل ہوا۔ وہ کہتے تھے کہ ہم مدار یہ فرقہ سے متعلق ہیں۔ اور مالدہ کے قریب ایک درگاہ (غالباً شاہ مدار کے خلیفہ شاہ الاّ کا مزار ہوگا) اور ضلع بوگرہ میں مہستان (جہاں حضرت ماہی سوار بلخی کا مزار ہے) کی زیارت کے لیے آتے ہیں کئی مہینے وہ شمالی بنگال کے مختلف اضلاع اور ضلع ڈھاکہ میں چکّے لگاتے رہے۔ ان کا سرگروہ شاہ مجنوں مجذوب تھا، جو مداریوں کے مرکزی مقام مکن پور (یو۔ پی) کا رہنے والا تھا۔ بعض رپورٹوں میں اسے مداری اور بعض میں (سلطان حسن کے سلسلہ کا) برہنہ فقیر لکھا ہے۔ برہنہ فقیروں کے مرکز بلیا دگی میں بھی اس کا مکان تھا۔ وہ خوش خرام گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے ہمراہیوں کی قیادت کرتا تھا۔ انگریز افسروں نے فوج کے کئی دستے ان فقیروں کے خلاف بھیجے۔ لیکن وہ دیہات میں بکھر جاتے تھے اور عوام ان کی سرپرستی کرتے تھے اس لیے کوئی فیصلہ کن معرکہ نہ ہوا اور مجنون شاہ اور ان کے ساتھی اپنی ڈھولیاں کر کے واپس چلے گئے۔ ۱۷۷۱ء میں وہ پھر آئے اور نا ٹور کی رانی بھوانی کو ایک عرضداشت پیش کی کہ انگریز ان کی قدیم مسلّمہ مراعات میں مخل ہو رہے ہیں، انھیں بچایا جائے۔ اس کے بعد وہ ہر دوسرے سال آتے رہے۔ کمپنی نے کئی چھاؤنیاں ان مسلح فقیروں اور سنیاسیوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے قائم کیں۔ لیکن ان کا سلسلہ برقرار رہا حتیٰ کہ ۱۷۸۷ء میں مجنوں شاہ مکن پور میں وفات پا گیا۔ اس کے بعد بھی مجنوں شاہ کے بھائی موسیٰ شاہ اور متبنیٰ چراغ علی اور دوسرے چیلوں نے کئی سال تک یہ سلسلہ برقرار رکھا۔ کمپنی کے سپاہیوں اور فقیروں سنیاسیوں کی یہ کشمکش تھی جسے بنکم چندر چٹرجی نے اپنے ناول انند مٹھ کا پس منظر بنایا۔

مرتضیٰ شاہی فقیر

اسی طرح مرتضےٰ شاہیوں کا فرقہ تھا۔ جن کے بانی

شاہ مرتضیٰ مجذوب یا سید مرتضیٰ انند تھے۔ ان سے کئی بنگالی کتب منسوب کی جاتی ہیں۔ ایک پداولی یعنی بنگالی وشنوی گیتوں کی کتاب ہے۔ دوسری یوگ قلندر جو اس قسم اور اس نام کی کتابوں میں بہترین سمجھی جاتی ہے۔ یوگ قلندر دارا شکوہ کے مجمع البحرین کی طرح اسلامی تصوف اور ہندو یوگ کی ہم آہنگی کا اظہار ہے۔ ایسی کتابیں اٹھارھویں صدی میں کثرت سے لکھی گئیں اور ان میں تصوف کے خیالات یوگ کی زبان میں ادا کیے گئے، لیکن ان میں یوگ کا عنصر اس قدر زیادہ ہے کہ ڈاکٹر انعام الحق ان کتابوں کو مسلم یوگ لٹریچر کہتے ہیں۔ سید مرتضیٰ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ خان صاحب عبدالولی خاں مرحوم جنھوں نے بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل میں مسلمانانِ بنگالہ کی قدیمی عمارتوں اور شخصیتوں کے متعلق بیش بہا مضامین لکھے ہیں۔ اپنے ایک مضمون میں ذیل کی غزل سید مرتضیٰ سے منسوب کرتے ہیں ؎

فارغ از سود و بیغم از ضررم	دو جہاں را بہ نیم جو نہ خرم
از فریبِ جہاں خبر دارم	تا نگوئی کہ مردِ بے خبرم
قانعم ہمچو شیر در بیشہ	نہ چو سگ بہرِ جیفہ دربدرم
سرخ رویم چو لعلِ رمانی	زر ازاں رو ست زرد در نظرم
گزران است مرتضیٰ دنیا	بہتر آن است تیز تر گزرم

سید مرتضیٰ بریلی کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد کا نام سید حسن تھا۔ اور مرشد کا نام سید عبدالرزاق۔ سید حسن ترکِ وطن کر کے مرشد آباد چلے آئے اور سید مرتضیٰ اس ضلع کے تھانہ جنگی پور کے ایک گاؤں بلیا گھاٹا میں پیدا ہوئے۔ ان کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کے متعلق تذکرے خاموش ہیں، لیکن چونکہ وہ شاہ نعمت اللہ ولی قادری فیروز آبادی (متوفی ۱۶۶۴ء) کے ہمعصر تھے۔ اس لیے ڈاکٹر انعام الحق کا قیاس ہے کہ وہ سنہ ۱۵۹۰ء کے قریب پیدا ہوئے ہوں گے اور اس کے ستر بہتر سال بعد آپ کی وفات ہوئی ہوگی۔ شاہ نعمت اللہ صاحب آپ کی خلاف شرع باتوں کے خلاف معترض تھے، لیکن کہا جاتا ہے کہ بعد میں انھوں نے یہ اندازِ مخالفت ترک کر دیا۔

اور اب سید مرتضٰے کے سالانہ عرس کے بعد مرتضٰے شاہی فقیروں کا سرگروہ شاہ نعمت اللہ کے مزار پر جاتا ہے اور ان کے عرس تک وہیں قیام کرتا ہے۔

مفتی غلام سرور نے خزینۃ الاصفیا میں آپ کے کچھ حالات معارج الولایت سے نقل کیے ہیں۔ ان کے مطابق آپ راج محل میں جو شاہ شجاع کے زمانے میں بنگالے کا صدر مقام تھا، رہا کرتے تھے اور یوگیوں کی طرح نشے کی حالت میں رہتے اور سماع اور موسیقی کے بڑے دلدادہ تھے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کے انند مرتضٰے یا مرتضٰے انند کہلانے کا سبب یہی خوش باشی ہو، لیکن عوام الناس میں مشہور ہے کہ اس کا اصل سبب یہ تھا کہ ایک برہمن دلہن انند مایا دیوی اپنا گھر بار چھوڑ کر آپ کے ساتھ وابستہ ہو گئی تھی اور اس قربانی سے خوش ہو کر آپ نے کہا تھا کہ تمھارا نام میرے نام کے ساتھ وابستہ رہے گا۔

سید مرتضٰے کی زندگی لاہور کے مادھو لال حسین کی طرح تھی۔ ان سے بہت سی کرامات منسوب کی جاتی ہیں۔ مزار پر اب بھی ہر سال عرس ہوتا ہے۔ آپ کے سلسلے کے فقیروں کو مرتضٰے شاہی کہا جاتا ہے، لیکن خان صاحب عبدالولی کا جنھوں نے آپ کے حالات آپ کے خاندان کے ایک بزرگ مولوی سید ابوالفضل سے جمع کیے۔ خیال ہے کہ آپ کے (اور بعد کے بے شرع) طریقوں میں شیو شکتی کے ہندو پجاریوں کی بہت سی چیزیں جمع ہو گئیں، جن میں وحدت وجود کو عیاشی اور من مانی باتیں کرنے کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔

بنگال میں اسلام

غیر شرعی طریقوں کے رواج، گورکھ وجے اور یوگ قلندر جیسی کتابوں کی مسلمانوں کے قلم سے تحریر، ستیہ پیر اور مانک پیر جیسے غیر اسلامی عناصر کی تعظیم و تکریم، سے بھی زیادہ اہم چیز یہ تھی کہ عام مسلمانوں کی زندگی، اعمال و عقائد میں کثرت سے ہندوانہ چیزیں داخل ہو گئیں۔ فی الحقیقت یہ عمل بنگال کے ساتھ مخصوص نہیں ملک کے دوسرے حصوں میں بھی اس کی کارفرمائی نظر آتی ہے، لیکن ایک فرق تو قلت اور کثرت کا ہے۔ بنگال میں یہ اثرات دوسری

جگہوں سے بہت زیادہ وسیع ہیں۔ دوسرے باقی حصہ ملک میں تو ہندو اثرات بیشتر اس پس منظر کا بقیہ ہیں جو نو مسلم آبادی کو اپنے آبا و اجداد سے ملا۔ لیکن بنگال میں ہندو مذہب کی نئی زندگی اور ہندو زمینداروں کے بڑھتے ہوئے اثر کے ساتھ عام مسلمانوں میں وہ چیزیں آگئیں جو پہلے نہ تھیں۔ مثلاً صوفیوں کی مجالس میں بشن پد گائے جانے لگے۔ مسلمان شاعروں نے بشن پد لکھے۔ اسی طرح شیومت کے ماننے والوں نے جو تنترک طریقے اختیار کیے تھے وہ مداریوں اور شاید شطاریوں نے اختیار کر لیے۔ شاید ان سے بھی اہم وہ عقیدتمندانہ طرز عمل تھا جو ہندو رسم و رواج اور طور طریقوں کے متعلق عام ہو گیا اور اس وقت بھی بعض علاقوں سے بالکل زائل نہیں ہوا، بالخصوص مشرقی پاکستان کے راج شاہی ڈویژن جس میں زیادہ تر وہ علاقے شامل ہیں، جہاں ہندو زمینداریاں کثرت سے تھیں اور ہندوؤں کے علمی، مذہبی اور تہذیبی مرکز تھے، یہ رجحان کثرت سے نظر آتا ہے۔ اس ڈویژن میں ایک ضلع ضلع ہے کشتیہ، جس کا زیادہ حصہ پہلے (موجودہ مغربی بنگال کے) ضلع ندیا میں شامل تھا۔ یہاں کے ایک علی افسر نے راقم الحروف کو ۱۹۵۵ء میں بتایا کہ وہاں اب بھی قریباً پانچ فیصدی مسلمانوں کے نام ہندوانہ ہیں۔ یعنی گوکل چند وغیرہ۔ صرف نام سے پہلے وہ شیخ لگا لیتے ہیں۔ یعنی ہندو کا نام تو ہوگا گوکل چند اور مسلمان کا شیخ گوکل چند۔ دیہات میں مسلمان عورتوں کا لباس ہندوانہ ہے۔ راج شاہی کے گزیٹر میں نچلے طبقے کے مسلمانوں کے متعلق بعض معلومات جمع کی گئی ہیں، جو اس لیے اہم ہیں کہ ان کے ماخذ ایک مسلمان افسر، مولوی عبدالغفار (نساخ؟) ڈپٹی مجسٹریٹ راجشاہی تھے۔ ان میں نیرہ فقیر یا گوروصفا کے نام نہاد مسلمان پیروؤں کے طریقے تو بہت قبیح ہیں اور یقیناً ہندو وام مارگی طریقوں سے ماخوذ ہیں لیکن عام ان پڑھ دیہاتی مسلمانوں کی نسبت بھی انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس میں ہندو اثرات نمایاں ہیں۔ مثلاً اگر بچہ بیمار ہو تو پد ما پوران پڑھا جاتا ہے۔ اور اگر مویشی بیمار ہوں تو گنور اکھیر لا روگا یا جاتا ہے۔ شادی کے دوران میں منگل چاندی (جسے کی پوجا سے ملتی جلتی) ایک رسم ہوتی ہے، جس میں فرش پر دودھ کیلے اور سیندور رکھا جاتا ہے۔ دیواروں پر نقشے اور تصویریں بنتی

ہیں۔ عود جلایا جاتا ہے اور عورتیں تمام رات شام سے صبح تک گاتی ہیں۔ عام اعتقاد ہے کہ اس رسم کی بجا آوری سے دولہا دلہن کو منگل یعنی خوش قسمتی نصیب ہوتی ہے۔

ایک اور عمل آتش کارا اس وقت بجا لایا جاتا ہے جب کوئی قیمتی چیز گم ہو گئی ہو یا کوئی شخص بیمار ہو (بالخصوص جوڑوں کے درد میں) یا کسی مقدمہ میں کامیابی مقصود ہو۔ جو شخص یہ عمل کرتا ہے، اسے برہماد نیا فقیر کہتے ہیں۔ وہ گھنٹیاں بجاتا ہے۔ منتر پڑھتا ہے۔ دودھ اور کیلے پیش ہوتے ہیں اور برہماد تیا یعنی برہمن کی روح کی مدد لی جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دیہات تعلیمی اور طبی مرکزوں سے بہت دور ہیں۔ دریاؤں، نالوں اور دلدلوں کی وجہ سے آمد و رفت بہت مشکل ہے۔ اس لیے اس طرح کی جھاڑ پھونک پر گزارا کرنا پڑتا ہے۔ بعض جگہ (مثلاً سندر بن) میں گھنے جنگلات ہیں۔ کئی آدمی شیر کا شکار ہوتے ہیں۔ سانپوں سے ڈسے جانے کی وارداتیں تو لاتعداد ہیں۔ ان مصائب سے عہدہ برا ہونے کے مہذب اور معقول ذرائع ابھی تک عام نہیں ہوئے۔ غریب ان پڑھ دیہاتی جادو ٹونے اور منتروں کے ذریعے ان کا علاج کر لیتے ہیں، جو شخص یہ جادو ٹونے کرتے ہیں، ان کی نسبت یہ کہنا کہ وہ ہندو ہیں یا مسلمان، آسان نہیں۔ سانپ کا منتر کرنے والے جنھیں اوجھا کہا جاتا ہے، بالعموم مسلمان ہوتے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ جادو منتر اسلام نے جائز نہیں رکھا۔

بیاہ شادی کی نسبت بھی راج شاہی گزیٹر میں بعض دلچسپ باتیں لکھی ہیں: "نکاح ایک عربی لفظ ہے۔ جس کا مطلب ہے بیاہ، اور شادی خوشی کے اس اظہار کو کہتے ہیں جو اس موقع پر کیا جاتا ہے۔ ہندوستان کے اکثر حصوں میں نکاح اور شادی کے الفاظ ایک ہی معنی میں مستعمل ہیں، لیکن راج شاہی میں باقی بنگال کی طرح ان دو الفاظ سے دو مختلف قسم کے بیاہ مراد لیے جاتے ہیں۔ نکاح اس بیاہ کو کہتے ہیں جو ایک بیوہ کے ساتھ ہو اور شادی فقط ایک کنواری کے ساتھ ہوتی ہے۔ لیکن وہ شخص جس کی بیوی مر گئی ہو، نکاح اور بیاہ دونوں کر سکتا ہے۔ نچلے طبقوں میں نکاح ایک کم درجے کا بیاہ ہوتا ہے جو ایک لونڈی (Concubinage) سے تھوڑا ہی مختلف ہوتا ہے۔

مثلاً اگر ایک شخص اپنی نکاح شدہ بیوی سے بدسلوکی کرے یا اس کے گزارے کا انتظام نہ کرے تو نہ صرف وہ اس سے علیحدگی اختیار کر سکتی ہے، بلکہ بغیر کسی طرح کی طلاق لیے دوسرے سے نکاح کر سکتی ہے۔ یہ دوسرا نکاح مذہبی رسوم و قواعد کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور پہلا خاوند ذرا بھی اس کا بُرا نہیں مانتا۔ "میں تمھارا بھات نہیں کھاؤں گی"۔ یا میں تمھیں بھات نہیں دُوں گا"۔ اس طرح کے جملے کہہ دینے سے علیحدگی ہو جاتی ہے"۔

راج شاہی کے نچلے طبقے میں ایک گروہ ان لوگوں کا بھی ہے، جن کے ہاں بغیر کسی نکاح کے بیاہ مکمل ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ دیہات میں ادنٰے کام کرتے ہیں۔ بالعموم چلموں میں بھر کر تمباکو دیتے ہیں۔ ان کے ہاں کے ایک بیاہ کی چشم دید روئداد یہ تھی کہ دُلھن گھر کے اندر بیٹھی تھی اور دولھا باہر تھا۔ دلھن کا بھائی جو غالباً اس کا ولی تھا، باہر آیا۔ اور دولھا سے کہا "تمھارا بیاہ ہو گیا تمھارا بیاہ ہو گیا"۔ اس کے علاوہ اور کوئی رسم نہ ہوئی نہ کوئی مولوی یا قاضی بُلایا گیا اور نہ ہی اسلامی طریقے کے مطابق کچھ پڑھا گیا یا دُعا مانگی گئی

راج شاہی وسطی بنگال کے اُس حصہ میں واقع ہے، جہاں ہندوانہ اثرات زوروں پر تھے اور اصل میں بیاہ شادی کے معاملے میں غریب طبقے کی بے تکلفی ان اخراجات کے خلاف ردِ عمل ہے جو ان تقریبات پر ضروری سمجھے جاتے ہیں اور شاید بنگال سے باہر بھی ان پڑھ غریب عوام میں اس طرح کی بے قاعدگیاں مل جائیں۔ لیکن بنگال کی عام مسلم سوسائٹی کی بعض باتیں ایسی ہیں جو ملک کے دُوسرے حصّوں میں رائج نہیں۔ ناموں کے متعلق ہم کہہ چکے ہیں کہ وسطی بنگال کے بعض حصّوں میں کئی مسلمانوں کے ہندوانہ نام ہیں۔ لیکن مسلمانی ناموں کے ساتھ ساتھ مقامی عرف (Nickname) رکھنے کی رسم تو بنگال کے ان لوگوں اور علاقوں میں بھی ہے، جہاں مذہب اسلام سے بڑا شغف ہے، مخففانہ عرف دوسری جگہ بھی ہوتے ہیں، لیکن وہاں ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ رسمی اور باقاعدہ طور پر بھی مسمّی کے جوان ہو جانے کے بعد بھی یہ پیار کے عرف نام کا کام دیں اور تحریر میں بھی وہی استعمال ہوں۔ مثلاً حاجی شریعت اللہؒ سے بڑھ کر قاطع بدعت کون ہوگا۔ لیکن ان کے مشہور صاحبزادے کو عام لوگ صرف دودو میاں کے عرف سے جانتے ہیں

ان کا نام محمد محسن شاید ہی کسی کو معلوم ہو۔ اسی طرح مسلم لیگ کے سابق اور متحدہ محاذ کے موجودہ با اثر لیڈر موہن میاں اور ان کے بھائی لال میاں ہیں۔ جو فرید پور کے رہنے والے تھے اور ایک راسخ الاعتقاد مسلمان خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مقامی عرف کے علاوہ بسا اوقات اسلامی نام کو تخفیف یا تغیر و تبدل سے مقامی رنگ دیا جاتا ہے مثلاً بسا اوقات میمونہ کو مینا، چمن آرا کو چمپا۔ لطیفہ کو لتا۔ ملیحہ کو مالا اور کلثوم کو کسم کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ غالباً ناموں کا یہ تغیر و تبدل اور مقامی عرفوں کا استعمال لسانی مشکلات کی وجہ سے ہے۔ بنگالی لب و لہجہ عرب اور ایران تو ایک طرف رہے۔ کئی اہم امور میں شمالی ہندوستان کے لوگوں سے بھی مختلف ہوتا ہے۔ نام رکھنے والے مولوی یا خوش عقیدہ بزرگ نومولود بچوں کے نہایت ثقہ نام رکھتے ہیں، لیکن چونکہ ان ناموں کا ادا کرنا آسان نہیں ہوتا، اس لیے تحریف و تخفیف سے کام لیا جاتا ہے۔ (اس طرح کا تھوڑا بہت عمل دوسری جگہ بھی ہوتا ہے، مثلاً پنجابی عوام معراج الدین کو مھاجا اور غلام محمد کو گاماں کہتے ہیں۔ لیکن سوائے خاص صورتوں کے جن کی توجیہہ کی جا سکتی ہے) یہ مخفف اور محرف نام بالعموم تحریر میں استعمال نہیں ہوتے اور پنجابی اور اردو رسم الخط ہی ان کی غرابت کو نمایاں کر دیتا ہے۔

بعض دوسری باتوں میں ہندو اثر صاف ظاہر ہے۔ مثلاً بزرگوں کی تعظیم و تکریم کے موقع پر ہندوؤں کی طرح ان کے پاؤں چھوئے جاتے ہیں۔ چونکہ پاکستان کے آغاز کے بعد باہر سے آئے ہوئے مسلمان اس طریق تعظیم پر اپنی کراہت کا اظہار کرتے تھے۔ اس لیے اب پبلک میں اس کا مظاہرہ کم ہوتا ہے۔ لیکن گھروں پر یہ طریق تعظیم اب بھی رائج ہے اور ان خاندانوں میں بھی موجود ہے جو پڑھے لکھے ہی نہیں بلکہ مخلص اور پرجوش مسلمان ہیں۔ لسانی اختلافات اور بعض دوسرے اسباب کی بنا پر غیر بنگالی خواتین کو بنگالی گھروں کے بالکل اندر جانے کا بہت کم موقع ملتا ہے۔ (سوائے ان گھروں کے جہاں انگریزی رسم و رواج جاری ہے اور جو مقامی طریق کار کی نمائندگی نہیں کرتے) لیکن جن خواتین کو ایسا موقع ملا ہے، ان کا کہنا ہے کہ گھروں کی زیبائش

آرائشوں اور تصاویر میں ہندوانہ فضا کا کافی عنصر ہوتا ہے۔ بچوں کو جو کہانیاں سُنائی جاتی ہیں اور عوامی ادب میں اسلامی قصے بھی ہیں، لیکن ہندوانہ کہانیوں کا حصہ بھی اہم ہے "اب بھی رات کے وقت مسلمان بچے اپنی ماؤں اور دادیوں سے کنچن مالا۔ مدھو مالا۔ ملنچ مالا اور اس طرح کی دُوسری دِلکش اور ناقابلِ فراموش کہانیاں سُنتے ہیں"

ان جُزوی امور کے علاوہ اصل اہم چیز وہ موانست و عقیدت ہے جو (چند اضلاع اور بعض حلقوں سے قطع نظر) پڑھے لکھے بنگالی مسلمانوں کو ہندو خیالات اور زعما سے ہے۔ اس کا ایک سبب تو لسانی یکجہتی ہے جو خیالات پر بڑا اثر ڈالتی ہے، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ذمہ دار ہندوؤں نے بھی اپنے طرزِ عمل سے اس رجحان کو تقویت دی ہے۔ یوں تو بنگال کی پہلی تقسیم کے بعد ہی بنگالی ہندوؤں کا ایک بااثر طبقہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات کو کم کرنے اور ایک متحدہ بنگالی قوم کا نقشہ پیش کرنے کے درپے رہا ہے۔ (اب اس کی پشت پر رابندر ناتھ ٹیگور اور ان کی وشوا بھارتی یونیورسٹی ہے) لیکن بنگالی ادب نے جو ترقی کی ہے اور نامور بنگالی ہندوؤں (مثلاً ٹیگور۔ جے سی بوس۔ سی آر داس۔ سبھاش چندر بوس) نے دُنیا کی نظروں میں جو اہمیت حاصل کی ہے، اس کا اثر بنگالی مسلمانوں پر ہُوا ہے۔ اس کے علاوہ بالعموم ہندوؤں نے عملی طور پر زیادہ قربانی اور بادی النظر میں بہتر اخلاقی عظمت کے نمُونے پیش کیے ہیں۔ راماکرشن مشن کی طرف سے غریبوں اور مریضوں کی خدمت کے لیے جو کوششیں ہوتی ہیں اور پڑھے لکھے ہندو خدمتِ خلق کے لیے جس طرح اپنا عیش و آرام قربان کرتے ہیں۔ اس سے بنگالی مسلمانوں کا متاثر ہونا ناگزیر تھا۔ دیہات میں بھی دیکھا جاتا ہے کہ جن یونین بورڈوں (پنچایتوں) کے صدر ہندو تھے۔ وہاں جھگڑے کم تھے۔ کام باقاعدگی سے ہوتا تھا۔ گاؤں کی سڑکیں اور کنوئیں بہتر حالت میں تھے۔ ہندوؤں میں صبر اور احتیاط کی جو خصلتیں ہیں، انھوں نے بھی اس طرزِ عمل کی کامیابی آسان کر دی ہے۔ کلچرل نقطۂ نظر سے بھی بنگالی مسلمانوں کو ہندوؤں کے دھیمے مدھم طریقے باہر سے آئے ہوئے مسلمانوں کے شور و غل اور سینہ زوری سے زیادہ بھاتے ہیں۔

بالخصوص جب باہر والے مقامی نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوئی کوشش نہ کریں اور اپنی تہذیبی اور مذہبی فوقیت کے نشے میں سرشار رہیں۔

ان عام رجحانات کے علاوہ مقامی اثرات بھی ہیں۔ وسطی بنگال (یعنی مشرقی پاکستان کے موجودہ راج شاہی ڈویژن) میں اسلامی اثرات کمزور تھے۔ انیسویں صدی میں اسلامی احیا کی تحریک کا اثر زیادہ تر نواکھالی۔ چٹاگانگ۔ فرید پور۔ ڈھاکہ کمرلا تک رہا۔ (سلہٹ بھی حضرت شاہ جلال اور اُن کے ساتھیوں کی برکت سے اور علاء الدین حسین شاہ کے اس عمل کی بدولت کہ اس نے اس سرحد پر کئی ممتاز مسلمان خاندان آباد کیے تھے۔ اسلامی تہذیب کا ایک مرکز رہا ہے) لیکن ایک تو اصلاحی اور احیائی تحریک کا بعض علاقوں میں بہت تھوڑا اثر ہوا ہے۔ دوسرے فارسی عربی کی سرد بازاری، جدید بنگالی ادب اور اس کے متعلقہ اثرات کے فروغ اور پڑھے لکھے طبقوں کی مذہب سے بڑھتی ہوئی عدم دلچسپی نے منفی رجحانات کو بہت تقویت دی ہے۔ مدرسوں کے فارغ التحصیل طلبا نے جنوب اور جنوب مشرق میں مذہبی حالت بگڑنے نہیں دی، لیکن وہ بھی ضرورت سے زیادہ قدامت پسند ہیں اور نئی نسل کی ضروریات کا جواب دینے سے قاصر۔

ہمارے سامنے ایک ایسے بنگالی اسکالر کا ایک مقالہ ہے، جو اس وقت مشرقی پاکستان کے محکمہ تعلیم میں بڑا ممتاز مرتبہ رکھتے ہیں، لکھتے ہیں۔ تمام بنگالی مسلمان نہایت تھوڑی مستثنیات کے سوا فکر اور عمل میں بنگالی ہی ہیں۔ ان میں بنگال کا اصلی دل حرکت کرتا ہے اور ان کی زندگی کے مختلف شعبوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ بنگالی مسلمانوں کے ناموں، عرفوں، ان کی عوامی کہانیوں اور عوامی ادب کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہے کہ اسلامی افکار و خیالات اور اخلاق و رسوم کا طویل اور مسلسل نفوذ بنگالی مسلمانوں کی بنگالی ذہنیت کو کسی قابلِ لحاظ طور پہ بدلنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ (ترجمہ از انگریزی)

ہم فاضل مقالہ نگار کی رائے اور نقطۂ نظر سے متفق نہیں۔ ہمارے خیال میں

انھوں نے اس ٹھیٹھ اسلامی عنصر کا پورا اندازہ نہیں کیا، جو بنگالہ کے بیشتر مسلمانوں کی ذہنیت کا قیمتی اور عزیز جزو ہے، لیکن ان کی رائے اور اندازِ نگاہ سے ان خیالات کا اندازہ ہوگا، جو بنگالی مسلمانوں کے تعلیم یافتہ با اثر طبقے میں عام ہیں اور ہماری بھی یہ رائے ہے کہ جو لوگ اپنی نگاہ ڈھاکہ اور چند دوسری جگہوں کے قدیمی سرآوردہ خاندانوں تک محدود رکھتے ہیں اور مقامی رجحانات اور پس منظر کا ٹھنڈے دل اور غور اور وسیع النظری سے مطالعہ نہیں کرتے۔ وہ مشرقی پاکستان کی صورتِ حالات کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے۔

حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ

۱۷۰۳ء اٹھارھویں صدی عیسوی کے تیسرے سال کی ابتدا ہے۔ اسلامی ہندوستان کا آخری جلیل القدر بادشاہ عالمگیر دکن میں مخالفوں سے برسرِ پیکار ہے۔ اس کی عمر پچاسی سال کی ہو رہی ہے۔ بڑھاپے کے بوجھ سے کمر جھک گئی ہے، لیکن اس کمزور اور نحیف جسم کے اندر ابھی وہی آہنی دل ہے، جس کے بل بوتے پر عالمگیر چودہ برس کی عمر میں ایک مست ہاتھی کے سامنے یکہ و تنہا ڈٹ گیا تھا۔ اس کی دماغی محنت اور مستعدی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ فوج کی کمان بذاتِ خود کر رہا ہے مختلف مہموں کے نقشے خود سوچتا ہے اور قلعوں پر حملے کے وقت اپنے جرنیلوں کی خود راہنمائی کرتا ہے۔

اسے اپنے مقاصد میں کافی کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ اس نے مرہٹوں کا شیرازہ اگر اس کا دارومدار کسی ایک شخص یا کسی ایک مرکز پر تھا، منتشر کر دیا ہے، لیکن اس کا دل جانتا ہے کہ وہ اپنے اصل مقصد میں ناکام رہا ہے۔ اس نے مرہٹوں کے بڑے بڑے قلعے فتح کر لیے ہیں، لیکن اب ہر مرہٹے کا گھر قلعہ ہے، جس میں بادشاہ کے خلاف سازشیں ہوتی ہیں۔ بیشک اب سب بڑے بڑے علم بردارانِ بغاوت مٹ گئے ہیں یا مٹا دیے گئے ہیں، لیکن اس سے دکن میں سناٹا نہیں ہُوا۔ اب ہر مرہٹہ کاشتکار سپاہی ہے۔ جو کبھی شیواجی کے کسی خُردسال جانشین کی زیرِ قیادت اور کبھی کسی من چلی رانی کی متابعت میں مغلوں کے لیے عذابِ جان بنا ہُوا ہے۔

مولانا شبلیؒ کا بیان ہے کہ اب مرہٹے محض "اڑتے ہوئے ذرے" رہ گئے تھے۔ یہ تشبیہ گمراہ کن ہے، لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اس وقت مرہٹوں کی مرکزیت تباہ ہو گئی تھی تو سوچنا چاہیے کہ اس کے لیے حکومتِ دہلی کو کیا قیمت ادا کرنی پڑی؟ بیجاپور اور

گولکنڈہ کی وسیع خود مختار ریاستیں تو ایک ایک سال کے اندر مغلیہ مقبوضات میں داخل ہو گئیں، لیکن مرہٹوں کو سر کرنے میں اورنگ زیب نے پچیس سال صرف کیے اور اس تمام تگ و دو کا نتیجہ یہ تھا کہ جونہی اورنگ زیب کی آنکھیں بند ہوئیں یہ اڑتے ہوئے ذرّے بگولے بن گئے۔ اور خیام شاہی کو اپنی تند رفتاری کے ساتھ لے اڑے۔

واقعہ یہ ہے کہ مرہٹوں کے خلاف اورنگ زیب کو اس کی ذاتی خوبیوں کے باوجود حقیقی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ اس کی کئی وجہیں تھیں لیکن سب سے اہم وجہ جس میں اسلامی حکومت کے زوال کا راز پنہاں ہے) مغل امرا اور مغل لشکریوں کی عسکری کمزوری تھی بادشاہ کی بیدار مغزی ہمت، محنت اور استقلال میں کلام نہیں، لیکن اس کے سپہ سالار نسل اور سپاہیوں میں آرام طلبی۔ غداری۔ فرض ناشناسی اور خود غرضی جیسی قبیح خصلتیں گھر کر چکی تھیں اور اخلاقی حالت میں وہ اپنے مرہٹے مخالفوں سے پست درجے پر تھے۔ مرہٹوں میں ابھی ابھی پنڈھرپور کی مذہبی تحریک نے نئی روح پھونک دی تھی۔ وہ اب ایک زندہ قوم بن رہے تھے۔ اس نئی تحریک کے زیر اثر ان کی شخصی اور خاندانی نزاعیں بڑی حد تک دب گئی تھیں اور ان کا ہر فرد مغلوں کے مقابلے میں قلمے، درمے، سخنے جس طرح بھی ہو سکتا تھا، برسرِ کار تھا۔ دوسری طرف وہ مغل امرا اور لشکری تھے، جنھیں عہدِ جہانگیری اور عہدِ شاہجہانی کے عیش و عشرت نے بگاڑ رکھا تھا۔ ان کے لیے اتنی مدت تک شمالی ہندوستان سے دور دکن کی لڑائیوں میں مبتلا رہنا ہی ایک ایسی مصیبتِ عظمیٰ تھی کہ شاید وہ مرہٹوں کے ہاتھ شکست کھانے کو بھی اس پر ترجیح دیتے ان کے دل میں اس وقت جو گزر رہا تھا اس کی ترجمانی نعمت خاں عالی کرتا ہے ؎

سخن را بود در تقارب قبول!	فعولن۔ فعولن۔ فعولن فعول
الہٰ است اللہ و رحماں خدا	مگر او کند رحم بر فوجِ شاہ
رحیم است و غفار و آمرزگار	ندانم چہ شد حصۂ ایں سپاہ

لیکن مغل فوج میں صرف آرام طلبی اور محنت سے جی چرانے کا مرض ہی نہ تھا بلکہ ان میں غدار اور نمک حرام بہت تھے۔ جس کثرت سے مغل سپہ سالار مرہٹوں سے مل جاتے تھے،

اس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ اور تو اور مغل شہزادے اور اورنگ زیب کے بیٹے اس سے بالاتر نہ تھے۔ جنجی کے محاصرے کے وقت شہزادہ کام بخش نے جو ذوالفقار خاں کے ساتھ فوج کا سپہ سالار تھا، راجا رام کے ساتھ اپنے باپ کے خلاف ساز باز کرنا شروع کیا۔ وہ اپنی فوج کے ساتھ مرہٹوں سے ملنے والا ہی تھا کہ ذوالفقار خاں اور اس کے باپ اسد خاں کو پتا لگ گیا اور انھوں نے اسے گرفتار کر کے زیر حراست اورنگ زیب کے پاس بھیج دیا۔ ستارہ میں مرہٹوں نے شہزادہ محمد اعظم کو رشوتیں دے کر یہ طے کر لیا تھا کہ وہ ان کی رسد رسانی میں مخل نہ ہوگا۔ چنانچہ وہ قلعہ جس میں محاصرہ کے وقت فقط دو ماہ کی رسد تھی چھ ماہ تک فتح نہ ہُوا!

جو کیفیت سپہ سالاروں کی تھی۔ وہی حالت قلعہ داروں، منصبداروں، محاسبوں اور معمولی سپاہیوں اور امیروں وزیروں کی تھی۔ اور جن قلعوں کی فتح میں مہینے صرف ہوئے تھے، وہ ان کی نالائقی یا نمک حرامی سے دِنوں میں دشمن کو بغیر کسی کُشت و خون کے واپس مل جاتے۔ جب ۱۷۰۵ء میں اورنگ زیب جنوبی دکن کو چھوڑ کر داکن کھیڑہ کی طرف متوجہ ہُوا تو تھوڑے ہی عرصے میں اس طرح ستارہ۔ پرنالہ اور باؤگڑھ کے قلعے مغلوں کے ہاتھ سے نکل گئے!

دشمنوں سے ساز باز کرنے اور اپنی نالائقی اور غفلت شعاری سے ان کا ہاتھ بٹانے کے علاوہ مغلوں نے اب ایک نئی بات یہ سیکھی تھی کہ لڑنے سے جی چُراتے اور اگر انھیں کہیں خطرات کا سامنا کرنا پڑتا تو بجائے ان کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے راہِ فرار اختیار کرتے اور لطف یہ ہے کہ اس "فنِ کثیف" میں بادشاہ کے بھائی بند تورانی "بدمذہب" ایرانیوں سے بڑھے ہوئے تھے۔ ایک دفعہ اورنگ زیب سے ایک تورانی امیر میر محمد امین نے شکایت کی کہ فوج کے اعلیٰ عہدے "بدمذہب اور دیوسیرت" ایرانیوں کو مل رہے ہیں۔ تو بادشاہ نے لکھا:۔

"جماعتِ تورانیاں، کہ برادرانِ ہمشہری بزرگان ما اند...... بہ مضمون و لا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ یعنی میندازید بدخود را بدستہائے خود در ہلاکت، در عین گیرودار مراجعت را

معیوب نمے دانند۔ اگر در آوردن کسے ایں حالت رو دہد۔ چنداں مضائقہ ندارد۔ لیکن در عین کارزار سخت مشکل است۔ اگر عیاذاً باللہ از ہمراہیانِ حضور ایں صورت واقعہ شود۔ در یک لحظہ مقدمہ تمام حکایت بانجام برسد۔

اگر در ایں امر مجرب و آزمودہ انکارے داشتہ باشد۔ مفصل معروض دارد۔ و جماعت ایرانیاں، خواہ ولایت زا، خواہ ہندوستان زا، کہ بجہلِ مرکب مشہور اند بصد مرحلہ ازیں حرکت دور اند ؎

انصاف بدہ کہ جہلِ آں مردم زشت

بہتر ز ہزار عقل روباہ سرشت

اورنگ زیب اپنے ہمراہیوں کی اخلاقی کمزوریوں سے خوب واقف تھا۔ وہ بار بار اپنے رقعات میں دیانتدار، کاردان ملازموں کی کمی پر آنسو بہاتا ہے۔ ایک جگہ لکھتا ہے: "آدمِ ہوشیار، امانتدار، خداترس، آباداں کار، کمیاب ؎

آنچہ ما جستیم و کم دیدیم و بسیار ست و نیست

نیست جز آدم دریں عالم کہ بسیار ست و نیست"

ایک اور جگہ لکھتا ہے: "حالا یک کس برائے دیوانیِ بنگالہ کہ بہ حلیہ راستی و کاردانی آراستہ باشد، مے خواہم، یافتہ نمے شود۔ از نایابیِ آدمِ کار، آہ۔ آہ۔"

پوچھنے والے پوچھیں گے کہ عجب معاملہ ہے کہ اسلامی ہندوستان کا سب سے زیادہ مذہب پرست بادشاہ برسرِ اقتدار ہے۔ ہر طرف اہلِ شرع کا بول بالا ہے۔ لیکن وہی انسانی خوبیاں، جن کے لیے مذہب مفید بتایا جاتا ہے۔ مفقود ہو گئی ہیں اور بادشاہ خود کہتا ہے کہ راستی، خداترسی، امانتداری، کمیاب بلکہ نایاب ہے!! وجہ اس کی یہ ہے کہ شرع اور فقہ کی گرم بازاری سے باطنی برائیوں کا علاج نہیں ہوتا۔ ان کی نظر ظاہر پر ہوتی ہے۔ (محتسب را درونِ خانہ چہ کار؟) ان کا کام شعائرِ اسلامی کی حفاظت ہے۔ قمار بازی کا سدِ باب، شراب کی بندش۔ جزیے کا نفاذ۔ نئے بت خانوں کی ممانعت۔ صغائر و کبائر پر سزا دہی۔ ان پر فقیہ زور دیتے ہیں، لیکن روحانی اور باطنی کوتاہیوں کا

ان سے مداوا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ چیزیں ہی فقہا کے حیطۂ اختیار سے باہر ہیں۔

سرہند سے بیشک ایک تحریک اٹھی تھی، جس نے کئی مخلص اور سمجھ دار ہستیوں کو متاثر کیا لیکن یہ تحریک تجدیدی تھی۔ اصلاحی نہ تھی۔ اس کی بنیاد اپنی فوقیت کے احساس اور اغیار سے نفرت اور عداوت پہ تھی۔ اپنی کوتاہیوں کا ازالہ کرنا اس کا مقصد نہ تھا اور پھر اس تحریک میں مفید ہونے کی جتنی صلاحیت تھی، اس کا راستہ واقعات نے بند کر دیا۔ مشائخیت روحانیت پہ غالب آگئی اور تجدیدی تحریک قیومیت کے سراب میں گم ہو گئی۔ جب خواجہ محمد معصوم کی وفات ہوئی تو ان کے وارثوں میں سے ہر ایک نام نہاد قیومیت کا دعویدار تھا۔ سبھی آپس میں لڑ رہے ہیں کہ قیوم میں ہوں اور دنیا میرے سر پہ قائم ہے! حضرت خواجہ محمد معصوم نے اپنے بیٹے شیخ سیف الدین کو اورنگ زیب کے پاس امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے بھیجا تھا، لیکن جس انداز سے وہ رہتے تھے، اس کا بیان ایک معتقد کی زبان سے سنیے:۔

> حضرت شیخ صاحب کے لیے سرہند میں دیبا کا ایک خیمہ جواہرات اور مروارید سے ٹکا ہوا نصب ہوتا۔ جس کی چوبوں پہ یاقوت جڑے ہوئے تھے۔ اس خیمہ کے اندر ایک جڑاؤ کرسی رکھی جاتی، جس پر آنجناب جلوہ افروز ہوتے اور جس کے گرد اگرد نقیب اور چوبدار ہاتھوں میں سنہری اور روپہلی عصا لیے ہوئے کھڑے ہوتے۔ بادشاہ، شاہزادے اور امرا حاضر خدمت ہو کر کھڑے رہتے۔ جب تک حکم نہ ہوتا۔ نہ بیٹھتے[1]۔

یہ تھے حالات، جب دہلی کے ایک نامور عالم کے گھر آخیر عمر میں ایک فرزند ارجمند تولد ہوا، جس کی قسمت میں لکھا تھا کہ وہ ان حالات کی اصلاح میں ہاتھ پاؤں مارے اور اس اخلاقی اور روحانی انحطاط کا سدِ باب کرے۔

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مردِ گرامی حالات کی پورے طور پہ اصلاح کر سکا اور جس سیلاب کو عالمگیر جیسا دور اندیش اور مستعد منتظم نہ روک سکا، اس کا فوری سدِ باب ایک مذہبی عالم سے کس طرح ہو سکتا تھا لیکن اس بزرگ کی کوششوں سے اتنا ہوا کہ

---

[1] روضتہ القیومیہ۔ رکن دوم صہ ۲۴۳!

جب اس سیلاب کے بند ٹوٹے تو جہاں مغلوں کا تخت و تاج اس سیلاب میں بہ گیا۔ وہاں تسبیح و سجادہ تو سلامت رہے اور سیاسی زوال کے ساتھ، قوم کا دینی انحطاط نہ شروع ہو گیا۔

اس بزرگ نے ایک تو قوم کو قرآن فہمی کی نعمتِ عظمیٰ عطا کی اور دوسرے اُس نے اور اس کی اولاد نے ایک ایسا نظام قائم کر دیا جو انیسویں صدی کی مذہبی کشمکش میں ہماری سب سے بڑی ڈھال رہا ہے۔ یہ اس خاندان کا ہی فیض تھا کہ جب ہندوستان میں اسلام پر مشنریوں اور مادہ پرستوں کے حملے ہوئے، تو لوگ مذہب اسلام سے واقف تھے۔ اس میں دلچسپی لیتے تھے اور مخالفوں کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ فرنگی محل اور اضلاع پورب کی دوسری درسگاہوں سے فقہ اور منطق کا جو سیلاب آ رہا تھا، وہ اس مذہبی کشمکش میں مفید نہ تھا۔ اس کے لیے رُوحانی اور اخلاقی قوت کی ضرورت تھی، جو فقہ اور منطق سے نہیں، بلکہ قرآن اور حدیث سے حاصل ہوتی تھی۔ اور انھیں اس خاندان نے جس طرح عام کیا، اس پہ تاریخ گواہ ہے۔

اخلاقی حیثیت سے اس خاندان نے جس طرح قوم میں نئی رُوح پھونک دی تھی، اس کا اندازہ مولٰنا سیّد احمد رائے بریلوی کی تحریک جہاد سے ہوتا ہے۔ مغلوں کی وسیع سلطنت جاتی رہی، لیکن ان راحت طلبوں نے کروٹ نہ لی۔ مرہٹے، روہیلے، انگریز جو کوئی بھی آیا، اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ لیکن ولی اللّٰہی تحریک کا اثر تھا کہ لوگ اپنے گھروں سے سیکڑوں میل دُور، بالاکوٹ کی پہاڑیوں میں پروانہ وار اپنی جان پہ کھیلتے تھے۔ یہ کوشش ناکام رہی، لیکن کیا ان لوگوں کے ایثار، مذہبی غیرت اور اخلاقی جرأت میں کوئی شک ہے؟

سودا قمارِ عشق میں خسرو سے کوہکن
بازی اگرچہ پا نہ سکا، سر تو کھو سکا

اس بزرگ نے نہ صرف قوم کو ایک نئی رُوحانی اور اخلاقی زندگی عطا کی، بلکہ جیسا کہ ہم آگے چل کر تفصیل سے بتائیں گے۔ عقائد و خیالات کا ایک ایسا نظام مرتب کر دیا،

جو اسلامی ہندوستان کے خاص حالات کے لحاظ سے سب سے زیادہ موزوں تھا اور فی الحقیقت قوم کی نئی تنظیم کے لیے رُوحانی اساس ثابت ہُوا۔

خاندانی حالات

شاہ ولی اللہ ۲۱ فروری ۱۷۰۳ء کو یعنی اورنگ زیب کی وفات سے چار سال پہلے پیدا ہوئے۔ یہ زمانہ سیاسی حیثیت سے اسلام کا عہدِ زوال ہے، لیکن مذہبی اور علمی طور پر اصلاح اور تجدید کا زمانہ بھی یہی تھا۔ چنانچہ جس سال شاہ ولی اللہ پیدا ہوئے اُسی کے قریب اسلام کے دورِ جدید کا دُوسرا بڑا مصلح اور مجدّد ریگستان نجد میں ظہُور پذیر ہُوا۔

شاہ صاحب کا سلسلۂ نسب والد کی طرف سے حضرت عمرؓ اور والدہ کی طرف سے امام موسیٰ کاظم تک پہنچتا ہے۔ آپ کے ایک بزرگ شیخ شمس الدین مفتی اسلامی حکومت کے آغاز میں ہندوستان آئے اور بمقام رہتک مقیم ہوئے۔ پہلے آپ کا خاندان علم و فضل میں ممتاز تھا، لیکن ایک بزرگ شیخ محمُود نے منصب قضا کو ترک کر کے سپاہیانہ زندگی شروع کر دی۔ اس کے بعد یہ خاندان عرصے تک بہادری اور دلیری کے لیے نامور رہا۔ شاہ صاحب کے دادا شیخ وجیہ الدین صاحب السیف والقلم تھے۔ چنانچہ شاہ صاحب کے والد نے قرآن مجید انھی سے پڑھا۔ لیکن وجیہ الدین کی شہرت بطور ایک بہادر تیغ آزما کے ہے اور ان کی بہادری کے قصے شاہ عبدالرحیم اپنے گھر والوں کو سُنایا کرتے تھے تاکہ انھیں بھی اخلاقِ فاضلہ حاصل کرنے کا شوق ہو۔ وہ اورنگ زیب کے لشکر میں سردار تھے۔ اور جب کھجوہ کے مقام پر اورنگ زیب اور شجاع کے درمیان معرکہ ہُوا تو ان چند باہمّت اور وفادار سرداروں میں سے تھے، جو اس وقت بھی ثابت قدم رہے جب شجاع کے مست ہاتھیوں نے اودھم مچا رکھا تھا اور تمام لشکر تتر بتر ہو رہا تھا۔ وہ اخیر عمر میں دکن کے سفر کے لیے نکلے تھے۔ جہاں مسلمانوں کو اس وقت بڑی مشکلیں درپیش تھیں۔ لیکن برہان پور کے قریب انھیں بہت سے لٹیروں نے آن گھیرا۔ آپ ان کا بہادری سے مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوئے اور مالوہ کی خاک میں ہی دفن ہیں۔

شاہ عبدالرحیمؒ

شاہ ولی اللہ کے والد شاہ عبدالرحیم تھے۔ انھوں نے تلوار چھوڑ کر کتاب سنبھالی۔ آپ ۱۰۵۴ھ (۱۶۴۴ء) میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کچھ گھر پر پائی، کچھ آگرے میں جہاں شاہ وجیہہ الدین بسلسلۂ ملازمت مقیم تھے۔ میر محمد زاہد ہروی سے معقولات اور علم کلام کی کتابیں پڑھیں اور پھر کچھ عرصے کے لیے خواجہ باقی باللہ کے صاحبزادے خواجہ خرد سے فیض حاصل کیا جو خواجہ حسام الدین کے خلیفہ اور اس زمانے میں نقشبندیہ باقریہ طریقے کے ترجمان تھے۔

آپ کا خاندان قصبۂ پھلت[۱] میں مقیم ہوگیا تھا، لیکن آپ نے اکبر آباد میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد دہلی میں "مہندیوں" کے محلے کے نزدیک مدرسہ رحیمیہ قائم کرکے وہاں درس و تدریس کا شغل اختیار کیا۔ آپ کا شمار اپنے زمانے کے اہل دل علما میں سے ہوتا تھا۔ آپ عام طور پر عہد عالمگیری کے درباری علما سے الگ تھلگ رہے۔ اورنگ زیب کی دعوت کے باوجود آپ اس کے دربار میں نہیں گئے اور اس زمانے کا فقہی ماحول اور علما کا دنیادارانہ رنگ آپ کو ناپسند تھا، لیکن آپ کے تعلقات دارالخلافے کی اکثر علمی شخصیتوں سے تھے۔ شاہ ولی اللہ آپ کے متعلق ایک جگہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک شخص بھی ایسا نہیں دیکھا جو عام علوم میں عموماً اور فقہ و حدیث میں خصوصاً ان کی طرح تبحر رکھتا ہو۔ وفات آپ کی ۷۷ سال کی عمر میں، جب شاہ ولی اللہ ابھی سترہ سال کے تھے، ۱۱۳۱ھ (۱۹-۱۷۱۸ء) میں ہوئی۔

شاہ عبدالرحیمؒ کو وہ شہرت نصیب نہیں ہوئی جو ان کے نامور فرزند کے حصے میں آئی ہے اور فی الحقیقت علمی اور دینی خدمات میں بیٹا باپ سے بازی لے گیا۔ لیکن شاہ عبدالرحیم خود بڑے سمجھدار اور بلند پایہ عالم اور صاحب فہم صوفی تھے۔ اور شاہ ولی اللہ کی علمی ترقیوں اور طبعی نشو و نما میں ان کی تربیت اور تعلیم کو بڑا دخل تھا۔ ہم آگے چل کر بتائیں گے کہ شاہ ولی اللہ کی ایک نمایاں خصوصیت ان کی "جامعیت" ہے یعنی وہ اختلافی مسائل میں ایسا راستہ ڈھونڈتے ہیں اور اپنی علمی وسعت اور ذہانت

---

[۱] پھلت ضلع مظفر نگر میں ایک قصبہ ہے۔ میرٹھ سے تخمیناً بیس کوس شمال کی جانب [مقالات طریقت ص ۷]

کی مدد سے اکثر ایسا راستا تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، جس پر فریقین متفق ہو سکیں۔ لیکن ایک حد تک یہ خصوصیت شاہ عبدالرحیم میں بھی موجود تھی۔ مولانا عبیداللہ سندھی ان کی اور ان کے دوسرے فاضل بھائی کی نسبت لکھتے ہیں:۔

"ہر دو بھائیوں کے خاص نظریات کا ماحصل ایک ایسی شاہراہ بنانے کی سعی ہے۔ جس پر مسلمان فلاسفرین (صوفیہ و متکلمین) اور فقہا ساتھ ساتھ چل سکیں۔"

شاہ عبدالرحیم ایک کامل صوفی تھے۔ انھیں خدا رسیدہ بزرگوں کی تلاش رہتی اور ان کی صحبت میں وہ بڑے ذوق و شوق سے شریک ہوتے تھے۔ ابن العربی کے وہ مداح تھے۔ اگرچہ عوام کے سامنے وحدت الوجود کے مسائل اس لیے بیان نہ کرتے تھے کہ مبادا لوگ انھیں صحیح طور پر نہ سمجھیں اور الحاد و زندقہ میں گرفتار ہو جائیں۔ لیکن تصوف سے اس قدر شغف کے ساتھ ساتھ وہ فقہ اور علوم ظاہری سے بھی واقف تھے۔ انفاس العارفین سے پتا چلتا ہے کہ وہ فقہ کی سب سے مفصل کتاب فتاوٰے عالمگیری کی تصحیح میں بھی کچھ عرصہ کے لیے شریک رہے اور اس زمانے کے سب مشہور علما و فقہا سے ان کے روابط رہے۔ اس جامعیت کا یہ اثر ہوا کہ ان کا فرزند عالی مرتبہ نہ فقہ سے متنفر تھا۔ نہ تصوف کا مخالف بلکہ دونوں کے اختلافات دور کرنے کی طرف مائل تھا۔

اس اعتدال پسندی اور ہمہ گیری کے علاوہ ایک خصوصیت جو شاہ عبدالرحیم اور ان کے خاندان کو دوسرے علما سے ممتاز کرتی ہے، ان کی عملی سوجھ بوجھ ہے۔ عام علماء کتابوں میں ہر وقت محصور رہتے ہیں اور بالعموم مسائل کے نظری اور خیالی پہلوؤں پر زیادہ توجہ رکھتے ہیں۔ شاہ عبدالرحیم اور شاہ ولی اللہ بھی ارباب عمل نہ تھے۔ اہل علم تھے اور وہ نظر کی پختگی اور حقیقت پسندی جو زمانے کے تھپیڑے کھانے اور اہم امور و معاملات کا انتظام کرنے سے آجاتی ہے، انھیں ہر بات میں حاصل نہ تھی لیکن عام علما سے وہ اس معاملے میں بدرجہا ممتاز تھے اور انھیں کم از کم اس امر کا قوی احساس تھا کہ مسائل کا ایک عملی پہلو بھی ہے جو نظری پہلوؤں سے زیادہ اہم ہوتا ہے شاہ عبدالرحیم نے

اس پر بہت زیادہ زور دیا۔ شاہ ولی اللہ ان کی نسبت لکھتے ہیں:۔

"حضرت ایشاں باخلاق سلیمہ مرضیہ از شجاعت و فراست و کفایت و غیرت بوجہ اتم موصوف بودند و عقلِ معاش مثل عقلِ معاد کامل و وافر داشتند و در مجلسِ صحبت حکمت عملی و آداب معاملہ بسیار می آموختند۔

شاہ ولی اللہ نے اس سلسلے میں ان کی جو نصیحتیں انفاس العارفین میں نقل کی ہیں، وہ سب عملی سوجھ بوجھ کا نمونہ ہیں اور ان میں دو ایک تو اس طرح دنیاداری سے بھری ہوئی ہیں کہ شاید انھیں بعض لوگ ایک مذہبی عالم اور خدا رسیدہ بزرگ کے شایانِ شان نہ سمجھیں۔ مثلاً:

"اے فرزند اگر از تو شجاعتے یا سخاوتے یا فتوتے بظہور آید۔ باید کہ ابنائے روزگار از تو آں را بسنید و دانند۔ عیادتِ مقصودِ اعظم ازاں رضامندی مریض است نہ محض اطلاع بر کیفیت مزاج دے۔ ہمچنیں تعزیت و ہمچنیں سپارش و امثالِ آں پس کسے کہ ایں جملہ بجا آورد و صاحب معاملہ را بروقت خود مطلع نہ ساخت، محنت خود را ضائع ساختہ"

ان نصیحتوں میں کئی پتے کی باتیں ہیں۔ ایک دفعہ فرمایا:۔

"از خصلتِ احمقان است کہ بہ چیزے از لباس و عادت نشان مند شوند۔ یا تکیہ کلام مقرر کنند۔ یا طعامے مقرر کنند کہ ازاں متنفر شوند و مردم بسبب آں مزاح کنند"

ایک اور جگہ ارشاد ہے:۔

"در سخن گفتن و راہ رفتن و نشستن و برخاستن برسم اقربا و عادت ایشاں کار کن اگرچہ ضعیف باشی و اگر عیبے یا غبنے یا بخلے بنا گاہ از تو صادر شود در کتمان و اخفائے آں باید کوشید و ازاں مستحی باید بود۔ و خود را بہ تکلف بصفت مقابل فرا باید نمود تا نفس بہ اں خلق خو نگیرد"

یعنی بقول اقبال ؎

گرفتم ایں کہ غریبی و رہ شناس نہ
ز کوئے دوست باندازِ محرمانہ گزر

انفاس العارفین میں شاہ ولی اللہ نے اپنے والد بزرگوار کے جو حالات ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ وہ بڑے دیدہ ور صاحب نظر بزرگ تھے۔ ان کا قاعدہ تھا کہ امرا کے گھر قطعاً نہ جاتے تھے، لیکن اگر امرا میں سے کوئی آپ کی زیارت کے لیے آتا تو اس کا بہت پاس کرتے اور پیار محبت سے اسے نصیحت کرتے۔ بعض مجذوبوں کی طرح بد خلقی سے پیش نہ آتے۔ آپ اپنی معاشرت اور لباس اور وضع قطع میں معتدل مزاج تھے۔ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں۔ "در ہر امر توسطِ دوست میداشتند۔ نہ چنداں در تنسک و تعمق فرو رفتہ بودند کہ برہبانیت کشد۔ و نہ چنداں ترکِ تقید بآداب مترسل بودند کہ بہ بتہاون میل کنند۔"

آپ کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ شاہ ولی اللہ نے آپ کی ایک رباعی نقل کی ہے، جو آپ نے فی البدیہہ کہی اور اپنے فرزند ارجمند کو بطور وصیت کے لکھوائی۔ رباعی

گر تو راہِ حق بخواہی اے پسر　　خاطر کس را مرنجاں، الحذر

در طریقت رکن اعظم رحمت است　　ایں چنیں فرمود آں خیرُ البشر

حکیم الامت شاہ ولی اللہ کے خاندان کی نسبت عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ وہ تصوف میں نقشبندی مجددی طریقے پر عامل تھے۔ حضرت حکیم الامت کے طریق کار پر ہم آیندہ صفحات میں روشنی ڈالیں گے، لیکن اس بارے میں شاہ عبدالرحیم کا طریقہ بھی وہی تھا جو ان کے وسیع الخیال فرزند کا۔ یعنی وہ ہر سلسلے سے فیض حاصل کرتے۔

القول الجلیل میں شاہ ولی اللہ نے اپنے والد کے متعدد مرشدوں کے نام گنائے ہیں۔ ان میں سے ایک سید عظمت اللہ اکبرآبادی تھے جو چشتیہ سلسلے کے بزرگ تھے۔ ایک خلیفہ ابوالقاسم اکبرآبادی جنھیں زیادہ تعلق خاطر قادریہ سلسلے سے تھا۔ ان کے علاوہ انھوں نے نقشبندیہ سلسلے کے بزرگوں سے فیض حاصل کیا۔ لیکن یہ امر قابل ذکر ہے کہ یہ بزرگ مجددی سلسلے کی بڑی شاخ (یعنی حضرت مجدد الف ثانی کے اپنے خاندان) سے متعلق نہ تھے۔ وہ حضرت مجدد کے ارادت مند تھے، لیکن انھوں نے بیعت حضرت مجدد کے بیٹوں اور پوتوں سے نہیں کی تھی، بلکہ نقشبندیہ سلسلے کے دوسرے بزرگوں سے۔

شاہ عبدالرحیم نے حضرت خواجہ خرد سے ایک مدت تک فیض حاصل کیا۔" جو شیخ احمد سرہندی اور شیخ الہ داد اور خواجہ حسام الدین کی صحبت میں رہے اور تینوں خواجہ باقی باللہ کی صحبت میں رہے"۔ جب شاہ صاحب نے حضرت خواجہ خرد سے بیعت کی درخواست کی تو انھوں نے حضرت مجدد کے فرزند ارجمند، خواجہ محمد معصوم کی بیعت کا نہیں، بلکہ شیخ آدم بنوری کے کسی خلیفہ کی بیعت کا مشورہ دیا۔ چنانچہ آپ سید عبداللہ اکبر آبادی کے مرید ہوئے جو شیخ آدم بنوری کے ممتاز خلیفہ تھے۔

واقعہ یہ ہے۔ [اور شاہ ولی اللہ نے اس کی تصریح کر دی ہے] کہ شاہ عبدالرحیم سلسلہ "نقشبندیہ مجددیہ" نہیں، بلکہ "طریقۂ نقشبندیہ باقویہ" کے بزرگ تھے۔ ان کا اصل طریقہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کا نہ تھا، بلکہ حضرت خواجہ باقی باللہؒ کا تھا۔ وہ حضرت مجدد کے ارادت مند اور معترف تھے۔ لیکن مجددی سلسلے کی کئی باتوں کا ان کے ہاں سراغ نہیں ملتا۔

اس کے علاوہ ان کے خاندان میں ہر سلسلے سے فیض حاصل کرنے کا رواج تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ نقشبندیہ سلسلے سے عقیدت کے باوجود وہ اس سے پوری طرح مطمئن نہ تھے۔ مثلاً شاہ ولی اللہؒ کے جانشین شاہ عبدالعزیز کی نسبت شاہ غلام علیؒ کے قلمی ملفوظات میں لکھا ہے:-

> حضرت ایشاں (شاہ غلام علی) فرمودند کہ روزے حضرت مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب و من در یک مجلس بودیم۔ ناگاہ تذکرہ نقشبندیہ آمد۔ مولوی صاحب فرمودند کہ نسبت ایں طریقہ نقشبندیہ بے نمک است۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ کے ایک پوتے شیخ عبدالاحد المعروف شاہ گل متخلص بہ وحدت ایک صاحبِ علم اور صاحبِ ذوق بزرگ تھے۔ شاہ عبدالرحیم سے ان کا گہرا یارانہ تھا۔ ان کے ایک دوسرے کے نام کئی خطوط ملتے ہیں اور چونکہ دونوں بزرگ دہلی میں تھے، اس لیے اکثر ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ جن میں علمی اور روحانی مسائل پر باتیں ہوتیں۔ ان ملاقاتوں کی جو روداد شاہ ولی اللہ نے لکھی ہے، اس سے اس لطیف لیکن

گہرے فرق کا اندازہ ہوتا ہے، جو شاہ ولی اللہ خاندان کو مجددی بزرگوں سے تھا۔ مثلاً ایک مسئلہ یہ ہے کہ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی (امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنے کے مسئلہ پر اختلاف کے باوجود) ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ اپنے طریقے کے مطابق نماز پڑھ سکتے ہیں یا نہیں۔ اس مسئلے پر۔

شیخ عبدالاحد قدس سرہٗ نے اپنے اسلاف کی ایک متواتر نقل بایں مضمون پیش کی۔ کہ نماز جماعت بالکل اس درباری جماعت کے مشابہ ہے جو ایک اولوالعزم اور پرشوکت بادشاہ کے سامنے کھڑے ہو کر عرض احوال کرے۔ اور یہ ظاہر بات ہے کہ بادشاہ کا درباری ادب اسی امر کا متقاضی ہے کہ تمام لوگ ایک زبان ہو کر اپنی حاجتیں عرض کریں نہ یہ کہ کوئی کچھ کہے اور کوئی کچھ کہے۔

شیخ عبدالرحیم صاحب نے فرمایا کہ آپ نے حنفی مذہب کی تائید میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے محض قیاس ہے اور قیاس بھی مع الفارق، کیونکہ حقیقت میں دعا اور خضوع کے ساتھ مناجات کرنا اور نفس کو تہذیب و تزکیہ سے آراستہ کرنا نماز ہے۔ جیسا کہ حدیث نبوی لَا صَلٰوۃَ لِمَنْ مَا یَقْرَأُ بِاُمِّ الْکِتٰبِ۔ اس دعوے پر صراحت کے ساتھ دلالت کرتی ہے اور یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ خدائے تعالیٰ سمیع ہے۔ اگر تمام دنیا کے لوگ ایک میدان میں صف آرا ہوں اور ہر شخص ایک جدا لغت اور نئے الفاظ میں مناجات کرے تو وہ ہر شخص کی علٰحدہ علٰحدہ مناجات سن سکتا ہے اور ایک شخص کی مناجات دوسرے کی مناجات میں خلل انداز نہیں ہو سکتی۔

اس اختلافی مسئلے کے حق میں اور اس کے خلاف بہت سی دلائل دی جا سکتی ہیں اور ان کی صحت سے یہاں بحث نہیں، لیکن شیخ عبدالاحد اور شیخ عبدالرحیم نے اس مسئلے پر جس طرح اپنے خیالات پیش کیے اس میں سمجھنے والوں کے لیے بڑا غور و فکر کا سامان ہے اور اس لطیف فرق کو نمایاں کرتا ہے جو ہمارے دو ممتاز ترین خانوادوں کے طریق کار میں تھا۔ ایک نماز میں سب سے زیادہ اہمیت تہذیب نفس کو دیتا ہے۔ دوسرا اسے جماعت بندی اور ظاہری آداب کے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ ایک

جزوی امور میں انفرادی رنگ کی اجازت دینا فرد کی رُوحانی نشوونما کے لیے مفید سمجھتا ہے۔ دُوسرا جماعت بندی کے اصول سے یہ آزادی نہیں دینا چاہتا۔ ایک باطن پر نظر رکھتا ہے۔ دُوسرا ظاہر پر۔ ایک جمع بین الفریقین کے اصول پر چلتا ہے۔ دوسرا ایک طریقے پر اصرار کرتا ہے۔ ایک وحدت الوجودی ہے۔ دُوسرا وحدت الشہُودی!

شیعہ سُنّی مسئلے پر بھی شاہ عبدالرحیم کا طریق کار اسی طرح اعتدال اور معاملہ فہم کا تھا، جس طرح دوسرے اُمور میں وہ غلو اور تعصب سے پرہیز کرتے۔ اور یہ امر قابل ذکر ہے کہ جب وہ ایران و روم سے آئے ہوئے ایک فاضل (عبداللہ حلبی) سے شیعہ سُنّی مسائل پر مباحثہ کرنے گئے تو انھوں نے اپنا مذہب سُنّی نہیں بلکہ "خذ ما صفا ودع ما کدر" بتایا۔

روضۃ القیومیہ میں شیخ عبدالرحیم اور شیخ محمد رضا کو براہ راست حضرت مجدد الف ثانی کے مشہور خلیفہ شیخ آدم بنوری کا مرید لکھا ہے۔

"شیخ عبدالرحیم اور شیخ محمد رضا دونوں شیخ آدم کے معتبر خلفا سے ہیں۔ نہایت مستقیم الاحوال تھے۔ صاحب کرامت و خوارق تھے۔ اپنے وقت کے مشہور مشائخ خیال کیے جاتے تھے حضرت قیوم رابع رضی اللہ تعالٰی عنہ نے بھی ان کی تعریف کی ہے۔ اب ان کا سلسلہ بہت جاری ہے۔ ان کے مُرید ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ ان کی اولاد کا سلسلہ دو جگہ پر ہے۔ ایک پُرانی دلی میں۔ دُوسرا شاہجہاں آباد کے قریب پھلت نام قصبہ میں [رکن اول ص ۲۰۵]

جب روضۃ القیومیہ لکھی گئی، اس وقت شاہ ولی اللہ کا عالم شباب تھا۔ مصنف نے شیخ عبدالرحیم اور شیخ محمد رضا کے ذکر کے ساتھ ان کے متعلق بھی ایک سطر لکھی ہے۔

"شیخ ولی اللہ۔ آپ شیخ عبدالرحیم کے فرزند ہیں۔ ظاہری اور باطنی علوم کے جامع اور شریعت اور طریقت کے سخت پابند ہیں۔ عموماً پھلت میں رہتے ہیں۔ [رکن اول ص ۳۵۵]

شاہ ولی اللہ کی تعلیم و تربیت

شاہ ولی اللہ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ پانچ برس کی عمر میں آپ نے مکتب جانا شروع کر دیا۔ دو سال میں کلام مجید پڑھ لیا اور ساتویں سال سے نماز اور روزہ کی پابندی شروع کی۔

پھر فارسی کتابیں اور عربی رسالے پڑھے۔ دس سال کی عمر میں شرح جامی شروع کی اور پھر معقولات ختم کر کے منقولات تک جا پہنچے۔ فقہ۔ منطق۔ حدیث۔ کلام کے علاوہ آپ نے اپنے والد سے طب، معانی اور ہندسہ و حساب کی کتابیں پڑھیں۔

آپ کے بچپن کے متعلق بہت کم واقعات ملتے ہیں لیکن آپ کے مکتوبات کا ایک مختصر سا مجموعہ مطبع احمدی دہلی سے شائع ہوا تھا۔ اس میں ایک واقعہ درج ہے جس سے آپ کی ذہانت اور رنگِ طبیعت پر روشنی پڑتی ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ میں ابھی طفلِ مکتب تھا کہ شیخ فیروز شاہ جو مشاہیرِ عصر میں سے تھے، اور سلسلہ شیخ آدم بنوری سے پیوند رکھتے تھے۔ میرے والد کی ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ آپ اس دُنیا میں انھی آنکھوں سے رویت حق سبحانہٗ کے قائل تھے اور اس مسئلے پر والد ماجد سے بحث کرنے لگے۔ میں بھی باوجود طفولیت کے بیچ میں بول اُٹھا کہ باصرہ اپنی ناتوانی یا کسی اور کمی کے باعث اس چیز کو بھی جو ہمارے پیچھے بلکہ ہمارے سر پر ہو نہیں دیکھ سکتی۔ اس سے قریب ہمارا نفس ہے۔ اسے نہیں دیکھ سکتی۔ پھر اس کی ان کمزوریوں کے باوجود کس طرح اس سے توقع ہو سکتی ہے کہ وہ ایک ایسی ذات کو جو ہر لطیف شے سے زیادہ لطیف ہے، معائنہ کر سکے گی!

جب میں نے مثالیں دے کر یہ بات واضح کی تو بحث ختم ہو گئی اور سب لوگ میری تعریف کرنے لگے۔

۱۵ سال کی عمر میں شاہ عبدالرحیم نے آپ کو بیعت کیا۔ اس کے دو سال بعد والد کا انتقال ہو گیا تو سترہ سال کی عمر میں آپ کو مسندِ تدریس سنبھالنی پڑی اور قریباً بارہ برس تک آپ نے اپنے والد ماجد کے مدرسہ میں علوم دینی و عقلی کی تعلیم دی۔ اپنے والد کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں "بعد از وفات حضرت ایشاں دوازدہ سال کمابیش بدرس کتب دینیہ و عقلیہ نمودہ و در ہر علمے خوض واقع شد۔"

سفرِ حرمین

اس کے بعد حرمین محترمین کی زیارت کا شوق پیدا ہوا اور آپ عرب تشریف لے گئے۔ دو مرتبہ فریضہ حج ادا کیا۔ اور حدیث شریف،

جسے ہندوستان میں آپ نے مولانا محمد افضل سیالکوٹی سے پڑھا تھا۔ اس کی سند شیخ ابوطاہر بن ابراہیم مدنی سے لی۔ شیخ ابوطاہر آپ کے فہم کے بڑے مداح تھے اور کہا کرتے تھے کہ ولی اللہ مجھ سے الفاظ کی سند لیتے ہیں اور میں اُن سے معانی کی۔

شاہ صاحب نے ابوطاہرؒ کے جو حالات لکھے ہیں، ان سے خیال ہوتا ہے کہ شیخ اسلامی دُنیا کے بہترین اساتذہ میں سے تھے۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں "بالجملہ متصف بود بصفات سلف صالح از ورع و اجتہاد و طاعت و اشتغال بعلم و انصاف در مذاکرہ۔ در ادئی مراجعت تا تامل وافی نکردے و تتبع کتب نہ نمودے، جواب ندادے"

اختلافی نظریوں کو تطبیق دینے کا جو اصول شاہ ولی اللہ کے والد نے اختیار کیا، ان پر شیخ بھی عامل تھے۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں "در اثناء قراۃ صحیح بخاری سخن در اختلاف روایات احادیث و فقہ افتاد۔ شیخ ابوطاہر گفتند ابنہمہ ازاں ست کہ حقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ آلہ وسلم در نہایت جمعیت است و از فرط جمعیت اضداد در اراح میتواند کرد۔"

انفاس العارفین میں شاہ صاحب نے اپنے والد اور چچا کے جو حالات لکھے ہیں ان سے یہ امر قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان پر وحدت الوجودی رنگ غالب تھا۔ شاید شاہ صاحب بھی اپنے خاندانی رجحانات سے متاثر ہوئے تھے اور ان اثرات کی کسی حد تک اصلاح مدینہ منورہ میں ہوئی۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب اسی زمانے کے قریب مدینہ منورہ میں بطور طالب علم وارد تھے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ شاہ صاحب سے اُن کی ملاقات ہوئی، لیکن یہ امر قرین قیاس ہے کہ کئی ایسے بزرگ ہوں گے، جنھیں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے دونوں راہنما جانتے ہوں گے اور ممکن ہے کہ دونوں کے بعض اساتذہ مشترک ہوں۔

قیام مکہ معظمہ کے زمانے میں حضرت حکیم الامت نے ایک خواب دیکھا۔ جس کے دوران میں خود رسول کریمؐ نے آپ کو اس بشارت سے مفتخر فرمایا کہ (ترجمہ)

"تمھارے متعلق ارادہ ہو چکا ہے کہ اُمتِ مرحومہ کے جتھوں میں سے کسی جتھے کی تنظیم تمھارے ذریعے کی جائے۔"

جن دنوں آپ مکہ معظمہ تشریف لے گئے تھے، ہندوستان میں مرہٹہ گردی کی وجہ سے لوگوں کی بُری حالت تھی۔ اور آپ کو ہندوستان سے اس امر کا مشورہ بھی دیا گیا کہ آپ عرب میں ہی اقامت پذیر ہو جائیں، لیکن جس ہستی سے خدا نے تعالےٰ نے اس مُلک میں بے شمار خدمتیں لینی تھیں اسے بھلا اپنے آرام و سہولت کے لیے یہ مشورہ کیونکر قبول ہوتا۔ چنانچہ آپ نے مشورہ دینے والوں کو لکھا کہ مجھے ہندوستان واپس آنے سے نہ روکو اور واپس آگئے۔

جب آپ نے واپسی کی تیاری کی تو آپ شیخ ابوطاہر کے پاس گئے اور رخصتی سلام عرض کیا۔ اس وقت شفیق اُستاد اور ارادت مند شاگرد کے درمیان جو گزری اس کا ذکر شاہ ولی اللہ نے ایک خط میں کیا ہے۔

میں اس وقت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا کہ جب میرے کوچ کا زمانہ قریب ہوا اور جدائی کی گھڑی سر پر آکھڑی ہوئی اور رخصتانہ ملاقات کے دوران میں مزاج پُرسی کے بعد میں نے یہ شعر پڑھا:۔

نَسِيتُ كُلَّ طَرِيقٍ كُنْتُ أَعْرِفُهُ ۔۔۔ إِلَّا طَرِيقًا يُؤَدِّينِي إِلَىٰ رَبْعِكُمْ

(یعنی میں بجز اس رستے کے جو مجھے تمہاری زمین تک پہنچا دے، ان تمام رستوں کو بھول گیا، جن سے میں اس سے پیشتر واقف تھا) تو شیخ کی پُرنم آنکھوں سے آنسوؤں کی ندیاں بہنے لگیں اور دونوں رُخسارے سُرخ ہو گئے۔ یہاں تک کہ دفورِ گریہ سے آپ کا گلا بند ہو گیا۔ ازاں بعد آپ نے نہایت خلوص کے ساتھ اس عاجز کے حق میں دُعا کی۔

ہندوستان کو واپسی

اُستاد کو الوداع کہہ کر شاہ ولی اللہ نے ہندوستان کا رُخ کیا اور ۹ر جولائی ۱۷۳۲ء کو اپنے وطن مالوف دہلی میں وارد ہوئے۔ لیکن اس وقت وطن پردیس سے بدتر تھا۔ اسلامی حکومت پر زوال و ادبار کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ ہر طرف سے اعدا اور ان سے بدتر دوست نما دشمنوں کا ہجوم تھا۔ مرہٹے۔ سکھ۔ سادات بارہہ۔ نادر شاہ، مُلک و مخلوقاتِ الٰہی کے لیے ایک قہرِ عظیم بنے ہوئے تھے۔ ان حالات کے ملاحظہ سے

شاہ ولی اللہ پر جو گزرتی ہو گی اسے نگاہِ تصور بآسانی دیکھ سکتی ہے۔ شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان علما و مشائخ کے اس طبقے کا ہم خیال نہ تھا جو عالمانہ یا صوفیانہ مشاغل میں اس طرح مستغرق ہو جاتے ہیں کہ دنیوی ماحول ان کے لیے کوئی ہستی نہیں رکھتا۔ اس خاندان کو علم و عرفان کی قوی کشش کے باوجود' واقعات سے بڑا لگاؤ رہا ہے اور وہ قوم کے دکھ درد میں برابر شریک رہے ہیں۔

اس سے پہلے' جب اورنگ زیب کی وفات کے بعد ابھی زوالِ حکومت کا آغاز تھا تو شاہ ولی اللہ کے والد شاہ عبدالرحیم کی نگاہِ انتخاب نے امرا و ارکینِ سلطنت کی بھیڑ میں سے اس مردِ صاحب نظر کو چنا' جو حکومتِ اسلامی کی بربادی میں سے جو کچھ بچ سکتا تھا' اسے بچا لینے کا اہل تھا اور اسے نیک کام کی تلقین کی۔ شاہ عبدالرحیم نے آصفیہ خاندان کے بانی نظام الملک آصف جاہ کو اورنگ زیب کی وفات کے دس بارہ سال[1] بعد جو خط لکھا' وہ ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے:-

بہ جانب وزیر الممالک' آصف جاہ در تحریص جہاد تحریر یافت.....

بر خاطرِ عاطر ایں فقیر واضح شد کہ در ملکوت مقرر شدہ کہ کفار ذلیل و خوار شوند و بعد ازاں بر چند مدت باغیان رسوا و خراب گردند۔ و اگر آں شوکت و فخامت مآب بریں ملاعین کمرِ ہمت بربندید۔ ایں ہمہ منسوب بایشاں شود و تمام عالم مسخر ایشاں گردد و سبب رواجِ ملت و استقامتِ دولتِ ایشاں باشد۔

وزیر الممالک' آصف جاہ کی طرف جہاد کا شوق دلانے کے لیے لکھا گیا.....

اس فقیر کی خاطرِ عاطر پر یہ منکشف ہوا کہ عالمِ ملکوت میں یہ امر طے شدہ ہے کہ کفار ذلیل و خوار ہوں اور کچھ زمانے میں باغی رسوا و خراب ہوں۔ اب اگر شوکت مآب (آصف جاہ) ان گمراہوں کی مخالفت میں کمرِ ہمت باندھیں تو یہ سارے کارنامے ان سے منسوب ہوں گے۔ تمام عالم ان کا مسخر ہو گا اور یہ کام رواجِ ملت اور ان کی دولت کے استحکام کا باعث ہو گا۔

---

[1] اس خط پر تاریخِ تحریر درج نہیں' لیکن چونکہ اورنگزیب کی وفات کے تیرہ سال بعد شاہ عبدالرحیم انتقال کر گئے' اس لیے یہ خط اس سے پہلے کسی وقت کا ہے اور غالباً محمد شاہی دور کی ابتدا میں لکھا گیا۔

سعی قلیل خواہد بود۔ و فوائد جلیل ۔ و
اگر سعی نکنند۔ این جملہ خود بخود بہ حوادث سماویہ
ہلاک و مضمحل گردند۔ دریں صورت این معنی
بایشاں منسوب نگردد ؎

کارِ زلفِ تست مشک افشانی دما عاشقاں
مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

چوں این معنی منقح (؟) و موکد معلوم است،
لہٰذا بآں عزیز القدر بے اختیار نوشتہ مے شود
وقت را غنیمت دانند و در جہاد اعدائے اللہ
تقاعد و تغافل کار فرما نشوند۔ بعد چندیں کار واضح
خواہد شد۔ چوں اظہار اتم مطلوب نبود و دوستی
و خیر خواہی دامنگیر از مبالغہ احتراز برفت و سخنے
ازیں فاش تر تصور نمے شد ؎

گوئے توفیق و کرامت درمیاں افگندہ اند
کس بمیداں در نمے آید سواراں راچہ شد!

سخنے کہ با محرمانِ خود در پردہ ادا مے کردم
ایں جا بے پردہ نوشتہ شد، تا عذر نماند
والسلام والاکرام ۔

(اس معاملے میں اسی قلیل سے بھی فائدہ جلیل ہوگا
اور اگر آپ کوشش نہ کریں گے۔ تب بھی کفار حوادثِ
سماوی سے ہلاک اور مضمحل ہو جائیں گے۔ لیکن اس
صورت میں کارنامے ان کے گنے نہ جائیں گے ؎

کارِ زلفِ تست مشک افشانی وما عاشقاں
مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

چونکہ یہ امر پکی طرح معلوم تھا، اس لیے بے اختیار
اس عزیز کو لکھا گیا۔ وقت کو غنیمت سمجھیں اور
جہاد کے معاملے میں سستی یا دیر نہ کریں تھوڑی
دیر کے بعد سب چیزیں واضح ہو جائیں گی۔ چونکہ
ایک چیز کا اظہار مطلوب تھا۔ اور دوستی اور خیر خواہی دامنگیر
اس لیے مبالغہ سے پرہیز کیا گیا اور اس سے زیادہ فاش تر
لکھا نہیں جا سکتا ؎

گوئے توفیق و کرامت درمیاں افگندہ اند
کس بمیداں در نمے آید سواراں راچہ شد!

وہ باتیں جو محرموں سے بھی پردے میں کہی جاتی
تھیں، یہاں بے پردہ لکھی گئی ہیں۔ تاکہ
کوئی عذر نہ رہے۔

شاہ ولی اللہ نے بھی اپنے والد کی روش جاری رکھی۔ اسلامی حکومت کی مخالفین
سے کشمکش کے دوران میں جو کوئی کارِ نمایاں کرتا، شاہ صاحب اس کے لیے دعا کرتے
اور تحریر و تقریر سے اس کا دل بڑھاتے۔ اس سلسلے میں ان کے دو خطوط قابلِ ذکر ہیں۔
ایک پایندہ خاں روہیلہ کے نام ہے۔ در ہنگامِ فتح نواح جبالِ شرقیہ ہندوستان کہ کسر
کفار و منصوری اہلِ اسلام شد۔

عزیز القدر۔ رفعت مآب المجاہد فی سبیل اللہ۔ الرافع الکلمۃ اللہ پائندہ خاں سلمہ اللہ تعالیٰ۔۔
از فقیر ولی اللہ عفی عنہ سلام محبت التیام مطالعہ فرمایند۔ آنچہ شنیدہ میشود از سعی ایشاں
در جہاد کوہستان موجب فرح وخوشی وسبب دعائے بظہر الغیب مے شود۔ اللھم انصر
من نصر دین محمد صلی اللہ علیہ

دُوسرا خط[1] سہارنپور کے فوجدار خان زمان خاں کے نام ہے :۔

فارسی	اردو
اللہ تبارک وتعالیٰ مجدد قانون شجاعت و دلاوری خان عوالی مرتبت خان زمان خاں جیو را مدتِ مدید در ردِّ مکایدِ طاغیان کفر از بیضۂ اہلِ اسلام منصور و مظفر دارد۔	خدائے تبارک وتعالیٰ مجدد قانونِ شجاعت ودلاوری خان عالی مرتبہ خان زمان خاں جیو کو مدت مدید تک اہلِ کفر کی مخالفت میں مظفر و منصور رکھے۔
از فقیر ولی اللہ عفی عنہ بعد از سلام سنت اسلام واضح آنکہ خطوط بزرگان بہلت در بیان دلجوئی و دلاطفت آں رفیع القدر نبشتہ۔۔	فقیر ولی اللہ عفی عنہ سے بعد سلام مسنون کے واضح ہو کہ بزرگان بہلت نے خان رفیع القدر کی دلجوئی اور تسکین کے لیے خطوط لکھے۔۔۔۔
در برابر آں فقیر ارباب اللہ بالحاح وتضرع دعائے حسن خاتمہ با کمال آبروئے دنیوی و آخرت ادا کردند۔ خدائے تعالیٰ بہ کمالِ فضل خود بہ اجابت مقرون گرداناد۔ زیادہ اعمالِ خیر کرامت کناد۔ والسلام	ان ارباب اللہ نے حقیر کے ساتھ مل کر بڑی عاجزی سے خان عالی مرتبہ کے لیے احسن خاتمہ اور کمال آبروئے دینی و دنیوی کی دعا کی۔ خدا تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اس دعا کو قبول کرے اور انھیں زیادہ اعمالِ خیر کی توفیق دے۔ والسلام

شاہ صاحب کے یہ تین خطوط کتب خانہ جامعہ عثمانیہ کے ایک قلمی مجموعے سے ہمیں ملے تھے اور ہم نے انھیں رودِ کوثر کے گزشتہ ایڈیشن میں درج کر دیا۔ اس کے بعد پروفیسر خلیق احمد نظامی نے شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکاتیب نام کی ایک مستقل کتاب چھاپی ان سے بھی اہم

---

[1] یہ تینوں خطوط ابھی شائع نہیں ہوئے۔ اور کتب خانہ جامعہ عثمانیہ کے ایک قلمی مجموعہ میں ہیں حکیم الامت شاہ ولی اللہ کے تمام خطوط کو جمع اور شائع کرنے کی بڑی سخت ضرورت ہے۔

مکاتیب[1] شائع کیے ہیں اور رائے ظاہر کی ہے کہ مرہٹوں کے خلاف احمد شاہ ابدالی کو بلانے اور نجیب الدولہ کو اس کا شریک کرنے میں شاہ صاحب کا ہاتھ تھا۔ "پانی پت کا میدانِ کارزار حقیقت میں شاہ ولی اللہ صاحب کا سجایا ہوا تھا۔"

شاہ ولی اللہ ان تمام کوششوں میں دلچسپی لیتے، جو حکومت اسلامی کو تباہی اور خلق خدا کو بربادی سے بچانے کے لیے کی جاتیں۔ شاید کسی وقت انھیں یہ خیال بھی گدگداتا ہو کہ (اپنے معاصر شیخ عبدالوہاب کی طرح؟) وہ مخلص اور اہلِ دل مجاہدین اسلام کا ایک جتھہ بنا کر زوال حکومت کے روکنے میں مدد دیں۔ لیکن اس کے لیے حالات سازگار نہ تھے۔ اللہ تعالےٰ نے یہ کوشش ان کے نواسے شاہ اسمٰعیل کی قسمت میں لکھ دی تھی۔ شاہ صاحب نے ایک عملی اور ہوشمند انسان کی طرح مادی اور عسکری کوششوں کے لیے ان لوگوں کو شوق دلایا، جن کا یہ کام تھا اور اپنے آپ کو اس کام کے لیے وقف کیا، جس کے لیے وہ زیادہ موزوں تھے اور جو اہمیت میں اس سے کسی طرح کم نہ تھا۔

خلافتِ باطنی

آج سیاسیات کی گرم بازاری سے بعض حلقوں میں یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ دینی، مذہبی اور علمی کام کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ ہماری ذہنی تشکیل میں بڑا ہاتھ ان بزرگوں کا رہا ہے، جن کی زندگیاں بطور جزبلسط کے، یا اسی طرح کے کسی دوسرے دنیوی پیشے میں شروع ہوئیں۔ طبیعت کے لگاؤ سے یا کسی مصلحت کی خاطر انھوں نے مذہبی معاملات میں بھی ہاتھ مارا۔ لیکن ان کی اصل دلچسپیاں

---

[1] افسوس کہ پروفیسر صاحب نے ان خطوط کے ماخذ کی تصریح نہیں کی۔ خدانخواستہ ان پر شبہ کی کوئی وجہ نہیں۔ لیکن جب ایک مشہور بزرگ کا، جن کی متعدد تصانیف شائع ہو چکی ہیں، ایک مستقل سوانح عمری آج سے بہت پہلے چھپ چکی ہے، ایک ایسا نادر ذخیرہ، جس کا کہیں ذکر نہیں، شائع کیا جائے تو اصولِ فن کے مطابق جائے حصول کی بھی نشان دہی کرنی چاہیے۔

[پروفیسر صاحب نے زبانی فرمایا کہ اس نادر ذخیرہ میں شاہ صاحب کے پانچ سو کے قریب خطوط ہیں۔ وہ انشاء اللہ باقی کو بھی شائع کریں گے۔ اور اس وقت متعلقہ امور کی وضاحت کریں گے]۔

دنیوی اور مادی تھیں۔ ظاہر ہے کہ انھیں رُوحانی اور علمی معاملات کی اہمیت کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن شاہ ولی اللہ اس معاملے میں بھی نہایت صائب اور جامع نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ انھیں مادی اور دنیوی چیزوں کی اہمیت کا احساس بھی تھا اور ساتھ ہی مذہبی اور دینی کاموں کی بھی دلی قدر تھی۔ اس بات کو انھوں نے فیوض الحرمین میں نہایت وسعت سے واضح کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ رسُولِ اکرم کا کام جاری رکھنے والوں کے لیے دو راستے ہیں۔ (خلافتِ ظاہری اور خلافتِ باطنی) اور دونوں اپنی اپنی جگہ مفید اور ضروری ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زندگی میں امّتِ مرحُوم کے لیے نیک نمونہ ہے۔ مثلاً خلافتِ ظاہری والوں کے لیے جو شرعی حدود اور جہاد کے ساز و سامان کی تیاری اور سرحدی علاقوں کی ناکہ بندی و حفاظت اور وفود کو اکرام و انعام دینے کی خدمت اور صدقات، محصُول، مالگزاری وغیرہ کی وصولی۔ اربابِ استحقاق پر ان کی تقسیم، مقدمات کے فیصلوں۔ یتیموں کی نگرانی، مسلمانوں کے اوقاف کا انتظام۔ راستوں۔ سڑکوں اور مساجد وغیرہ کی تعمیر اور اسی قسم کے اور کاموں کے لیے مقرّر ہیں۔ مسلمانوں میں جو ان خدمات اور مشاغل میں مصرُوف ہیں، ان کو میں خلافتِ ظاہری والوں کے نام سے موسوم کرتا ہوں۔

جو لوگ باطنی خلافت والے ہیں یعنی جو اس کام پر مقرر ہیں کہ شرائع اور قوانین اسلامی قرآن اور سنن و آثار کی تعلیم دیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کریں۔ وہ لوگ جن کے کلام سے دین کی تائید ہوتی ہے خواہ وہ وہ مناظرہ و مباحثہ کی راہ سے جیسا کہ متکلّمینِ اسلام کا حال ہے۔ یا وعظ و پند کے طریقے سے جیسا کہ اسلام کے مقرّرین اور خطبا جس خدمت کو انجام دیتے ہیں یا وہ لوگ جو اپنی صحبت اور توجہ و ہمّت سے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کرتے ہیں۔ جیسا کہ مشائخ صوفیہ کا حال ہے۔ اسی طرح جو نمازیں قائم کراتے ہیں۔ حج کراتے ہیں اور جو انسان (دوامِ حضور) کے حصول کی راہ لوگوں کو بتاتے ہیں اور زہد و تقویٰ کی طرف لوگوں کو بلاتے ہیں ان کو ہم خلفاءِ باطنی کے نام سے

موسوم کرتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ نے اپنے تئیں رسولِ اکرمؐ کی خلافت باطنیہ کی تکمیل کے لیے وقف رکھا۔ خلافت ظاہری کے لیے جو لوگ زیادہ موزوں ہوئے، وہ ان کی ہمت افزائی کرتے اور قوم کی مادی مشکلات کبھی ان کی نظر سے اوجھل نہ ہوئیں لیکن ان کا اپنا راستہ دوسرا تھا۔ انھوں نے نہ صرف کلام مجید کا فارسی ترجمہ اور درس و تالیف کتب حدیث سے کتاب و سُنت کی وسیع اشاعت کا سامان کیا اور علوم اسلامی کی ترتیب و تنظیم سے ہمارے لیے ایک بیش بہا علمی خزانہ یادگار چھوڑا بلکہ اختلافی معاملات میں ایک ایسا راستہ اختیار کرکے جس پر صُوفی اور مُلّا، شیعہ اور سُنی، حنفی اور حنبلی، مجددی اور وحدت الوجودی، معتزلہ اور اشاعرہ متفق ہو سکیں۔ اسلامی ہندوستان کو ایک ایسا دینی اور علمی نظام عطا کیا جو اس ملک میں شعار قومی کی حیثیت حاصل کرسکتا تھا اور جس کے مروّج و مقبول ہونے کا یہ نتیجہ ہُوا کہ ایک متفق علیہ مذہبی نظام کی بُنیادوں پر ایک قوم کی تعمیر ہوسکی اور جدید اسلامی ہندستان کا آغاز ہُوا۔

مکہ معظمہ جانے سے پہلے حکیم الامت کا اصل کام درس و تدریس تھا۔ واپسی پر آپ نے یہ شغل کم کر دیا۔ بلکہ ہر ایک فن کے لیے ایک ایک قابل شخص کی تربیت کی۔ اور پھر ان فنون کی تعلیم ان کے سپرد کر دی۔ خود فقط حدیث پڑھاتے اور باقی وقت معارف گوئی و تصنیف و تالیف میں بسر ہوتا۔ خدائے تعالیٰ نے آپ کو صحت بھی اچھی عطا کی تھی اور آپ کے اعتدال اور باقاعدگی سے حفظِ صحت میں آسانی ہوتی ہوگی۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں "مریض ہم کم مے شدند" اور اپنے کام میں اس انہماک سے مشغول ہوتے کہ اشراق کے بعد جو بیٹھ جاتے تو دوپہر تک نہ زانو بدلتے نہ کھجلاتے اور نہ دہن مبارک سے تھوک پھینکتے " مقالاتِ طریقت کے مصنف لکھتے ہیں "معمول تھا کہ آپ سبق پڑھاتے وقت رُو بہ قبلہ دو زانو مودب بیٹھتے تھے۔ اور ہر روز عادت تھی کہ صبح کو غسل کرکے نیا یا دھویا ہُوا لباس پہنتے تھے۔ نظافت کو بہت دوست رکھتے تھے۔ مزاج میں ضبط اس طور تھا کہ آپ کو مدت تک خارش کی شکائت تھی لیکن آپ شب کو سونے کے وقت جسم

کھجلاتے تھے۔ اور کوئی وقت کسی نے آپ کو کھجلاتے نہیں دیکھا۔" آپ کا حافظہ بھی غضب کا تھا۔ شاہ عبدالعزیز کا بیان ہے "مثلِ والد ماجد حافظہ ندیدہ ام" اور اس محنت، حسن تدبیر اور ذہنی صلاحیتوں کی بدولت آپ نے چند سالوں میں ہی اتنا کام کر لیا کہ دوسروں سے اس کا عشر عشیر بھی مکمل نہیں ہوتا۔ آپ کی وفات ۱۱۷۶ھ میں بمقام دہلی ہوئی۔ تاریخ وفات ہے۔ او بود امام اعظم دیں

۷۶ ۱۱ ھ

مولانا شبلیؒ "تاریخ علم الکلام" میں لکھتے ہیں: "ابن تیمیہ اور ابن رشد کے بعد بلکہ خود انھی کے زمانے میں مسلمانوں میں جو عقلی تنزل شروع ہوا تھا۔ اس کے لحاظ سے یہ اُمید نہ رہی تھی کہ پھر کوئی صاحبِ دل و دماغ پیدا ہوگا۔ لیکن قدرت کو اپنی نیرنگیوں کا تماشا دکھانا تھا کہ اخیر زمانے میں جبکہ اسلام کا نفس بازپسیں تھا۔ شاہ ولی اللہ جیسا شخص پیدا ہوا۔ جس کی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالی۔ رازی۔ ابن رشد کے کارنامے بھی ماند پڑ گئے۔"

نواب صدیق حسن خاں لکھتے ہیں: "اگر وجود او در صدرِ اوّل و در زمانہ ماضی می بود امام الائمہ و تاج المجتہدین شمردہ مے شد۔" یعنی آپ پہلے زمانے میں پیدا ہوتے تو آپ کو اماموں کا امام سمجھا جاتا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم شاہ صاحب کو محض اپنی کم ہمتی اور تقلید پسندی سے امام نہیں کہتے۔ ورنہ جہاں تک علمی تبحر۔ دماغی قابلیت۔ مجتہدانہ نظر۔ سلیم الخیالی اور اشاعتِ کتاب و سنت کے سلسلے میں عظیم الشان قومی اور مذہبی خدمات کا تعلق ہے۔ دنیائے اسلام میں بہت ہی کم بزرگ ہوں گے جن سے آپ پیچھے رہے ہیں۔ آپ نے بیسیوں کتابیں لکھیں۔ تفسیر، حدیث، تصوف، فقہ، تاریخ، علم الکلام غرضیکہ علوم اسلامی کی کوئی شاخ نہیں جسے آپ نے سیراب نہ کیا ہو اور اللہ کا فضل ایسا شامل حال تھا کہ جس چیز کو ہاتھ لگاتے کندن ہو جاتی۔

قرآن

آپ کا سب سے اہم کام قرآن اور علوم قرآنی کی اشاعت ہے اور اس سلسلے میں آپ کا بڑا کارنامہ قرآن مجید کا فارسی ترجمہ ہے۔ ہندوستان میں بہت کم لوگ عربی جانتے تھے۔ دفتری اور تعلیمی زبان فارسی تھی۔ لیکن اس زبان میں قرآن مجید کا

کوئی ترجمہ رائج نہ تھا[1]۔ چنانچہ عام تعلیم یافتہ مسلمان گلستان، بوستان، سکندرنامہ اور شاہنامہ تو پڑھتے اور سمجھتے، لیکن قرآن مجید سے، جو ہدایات کا سرچشمہ ہے، ناواقف رہتے پرانے علما اور خواص میں سے قرآن مجید اگر کسی نے پڑھا تو ناظرانہ۔ یعنی مفہوم و معانی سمجھنے اور اس کی رُوح و تعلیمات سے فیضیاب ہونے کے بغیر۔ اکبر کے دربار میں جب مسلمان علما اور پرتگیز مشنریوں میں مباحثے ہوئے اور مشنریوں نے (جو کلام مجید کے لاطینی ترجمے کی وجہ سے اس کے اندراجات سے خوب واقف تھے) کلام مجید کے بعض حصوں پر اعتراض کیے تو اس وقت پتا چلا کہ جن مسلمانوں نے عربی میں قرآن پڑھا بھی تھا۔ انھیں بھی اس کے مضامین اور اندراجات سے پوری طرح واقفیت نہ تھی بسا اوقات یہ ہوتا کہ پادری کلام مجید کے کسی بیان پر اعتراض کرتے اور مسلمان کہہ دیتے کہ یہ تو قرآن میں ہے ہی نہیں اور پھر جب کلام مجید کھول کے دیکھا جاتا تو وہ حوالے نکلتے۔ شاہ صاحب کو اس بوالعجبی کا احساس ہوا اور حج سے واپس آنے کے پانچ سال بعد ۱۷۳۸ء میں آپ نے فارسی زبان میں کلام مجید کا ترجمہ کیا۔ جب علما کو اس کا پتا چلا تو تلواریں کھینچ کر آ گئے کہ یہ کلام مجید کی انتہائی بے ادبی ہے۔ بعض سوانح نگار لکھتے ہیں کہ اس مخالفت کی وجہ سے شاہ صاحب کی جان اس طرح خطرے میں پڑ گئی کہ انھیں کچھ عرصہ کے لیے دہلی سے چلے جانا پڑا۔ لیکن بالآخر شاہ صاحب کی جرأت اور فرض شناسی کامیاب ہوئی اُنھوں نے لوگوں کو سمجھایا کہ کلام اللہ اس لیے نہیں آیا کہ اسے ریشمی جزدانوں میں لپیٹ کر طاق پر تبرکاً رکھا جائے یا جس طرح دوسری قومیں منتر پڑھا کرتی ہیں، ہم اسے طوطے کی طرح بغیر سمجھے پڑھ دیں۔ یہ کتاب انسانی زندگی کے متعلق اہم ترین

---

[1] شیخ سعدیؒ کا ایک ترجمہ بھی اب بازار میں ملتا ہے، لیکن شیخ سعدی سے اس کی نسبت مشتبہ ہے اور یقیناً یہ ترجمہ کبھی بھی رائج نہیں ہوا۔ شاہ صاحب سے پہلے ملک العلما قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے سلاطین جونپور کے زمانے میں ایک تفسیر بحر مواج لکھی تھی، جس میں ہر آیت کی تشریح و تفسیر سے پہلے اس کا ترجمہ دیا تھا، لیکن ظاہر ہے اس ترجمے کی حیثیت محض ضمنی اور جزوی تھی اور اسے کبھی بھی عام مقبولیت نصیب نہیں ہوئی۔

حقائق کو بے نقاب کرتی ہے۔ اس کے نازل ہونے کا مقصد یہ تھا کہ لوگ اسے پڑھیں اور ان حقائق کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنائیں اور اس کے لیے رائج الوقت زبانوں میں اس کا ترجمہ ضروری ہے۔ چنانچہ آہستہ آہستہ معترضین کی مخالفت کم ہوئی اور نہ صرف شاہ صاحب کے ترجمے نے رواج پایا، بلکہ اُردو اور دوسری زبانوں کے ترجموں کی راہ پیدا ہو گئی۔

قرآن مجید کا محض ترجمہ کر دینا ہی اس قدر اہم کام تھا کہ اگر شاہ صاحب فقط اسی کارِ خیر پر اکتفا کرتے اور وہ ابتدائی دُشواریاں دُور کر دیتے جو عام علما کی فرض ناشناسی اور کورانہ تقلید کی وجہ سے اُن کے راستے میں حائل تھیں، تب بھی اسلامی تاریخ میں ان کا نام درخشاں ستارے کی طرح چمکتا، لیکن ان کا ترجمہ بطورِ خود بلند پایہ اور قابلِ قدر و عظمت ہے۔ ترجمے کی مخالفت بیشتر تو تقلید اور امورِ مذہب میں مغز کو چھوڑ کر استخوان کے پیچھے دوڑنے کی وجہ سے تھی، لیکن اس میں شک نہیں کہ قرآن مجید کے ترجمے میں ہزاروں دقتیں ہیں۔ ترجمے میں لفظی صحت کو برقرار رکھنا اور اس کے ساتھ ساتھ قرآن کے بلیغ معانی اور اس کی ادبی شان کو اس پر قربان نہ ہونے دینا اس قدر مشکل ہے کہ آج، جبکہ ہمیں قرآن مجید کے ترجموں میں دو سو سال کی مشق ہے اور قوم کے بہترین علما و ادبا نے اس قومی خدمت پر توجہ کی ہے ایک بھی ترجمہ ایسا نہیں، جسے تسلی بخش کہا جا سکے یا جس سے اصل کے زورِ بیان، فصاحت و بلاغت اور رُوحانی عظمت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ شاہ ولی اللہؒ کے ترجمے کے متعلق یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس سے بہتر ترجمہ نہیں ہو سکتا اور اصل میں ضرورت یہ ہے کہ مستند اور بلند پایہ ترجمے کے لیے علما اور اہلِ قلم کی ایک پوری جماعت یہ فرض ادا کرے، لیکن اکثر باتوں میں وہ موجودہ اُردو ترجموں سے کہیں بہتر ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن مجید کا ترجمہ کرنے والے میں جن خصوصیتوں کی ضرورت ہے وہ شاہ صاحب سے بڑھ کر آج تک کسی مترجم میں جمع نہیں ہوئیں مولانا نذیر احمد کہتے ہیں۔ "فی الحقیقت قرآن کے مترجم ہونے کے لیے جتنی باتیں درکار تھیں،

ترجمے سے ثابت ہوتا ہے وہ سب مولانا شاہ ولی اللہ میں علی وجہ الکمال پائی جاتی تھیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ مولانا صاحب کی نظر تفاسیر اور احادیث اور دین کی کتابوں پر ایسی وسیع ہے کہ بس انھیں کا حصہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک آیت بلکہ ہر ایک لفظ کی نسبت مفسرین کے جتنے اقوال ہیں وہ سب ان کے پیش نظر ہیں اور وہ ان میں جس کو واضح پاتے ہیں اُسے اختیار کرتے ہیں۔"

شاہ صاحب نے نہ صرف قرآن مجید کا ترجمہ کیا، بلکہ اس مسئلے کے علمی پہلوؤں پر بھی ایک رسالہ لکھا اور مقدمہ فی ترجمۃ القرآن مجید میں قرآن مجید کے مترجموں کی رہنمائی کے لیے کار آمد ہدایتیں درج کیں۔

شاہ صاحب اپنی کتاب میں لکھتے ہیں "اس بندہ ضعیف پر خداوند تعالیٰ کی کئی بے شمار نعمتیں ہیں۔ جن میں سب سے زیادہ عظیم الشان نعمت یہ ہے کہ اس نے مجھ کو قرآن مجید سمجھنے کی توفیق عطا فرمائی اور حضرت رسالت مآب کے احسانات اس کمترین اُمت پر بہت ہیں، جن میں سب سے بڑا احسان قرآن مجید کی تبلیغ ہے۔"

قرآن مجید کی تبلیغ شاہ صاحب نے فقط ترجمہ کر کے ہی نہیں کی، بلکہ علم تفسیر کے متعلق کتابیں بھی لکھیں۔ جن میں الفوز الکبیر فی اصول التفسیر خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس کتاب کے چار باب ہیں، جن میں علوم قرآنی اور مطالعہ قرآن کے مختلف پہلوؤں پر تبصرہ کیا ہے۔ دوسرے باب میں آپ نے مسئلہ نسخ پر مجتہدانہ انداز سے نظر ڈالی ہے اور وہ آیات منسوخہ جن کی تعداد بعض لوگوں کے نزدیک پانچ سو کے قریب تھی اور جن کی تعداد علامہ جلال الدین سیوطی نے بھی بیس[۲] مقرر کی تھی۔ چار سے زیادہ تسلیم نہیں کیں۔

فوز الکبیر کے بعض اندراجات سے خیال ہوتا ہے کہ شاہ صاحب قرآنی ارشادات کو وسیع سے وسیع مفہوم دینا چاہتے تھے۔ وہ مختلف آیتوں اور سورتوں کے متعلق اسباب نزول کا خیال رکھتے ہیں، لیکن اس بات کی بھی کوشش کرتے ہیں کہ اس سے کلام مجید کے اصلی مقصد پر پردہ نہ پڑ جائے۔ چنانچہ باب اول میں لکھتے ہیں۔ (ترجمہ)

" عام مفسرین نے ہر ایک آیت کو خواہ مباحثہ کی ہو یا احکام کی، ایک قصے کے ساتھ

ربط دیا ہے اور اس قصّے کو اس آیت کے لیے سببِ نزول مانا ہے، لیکن حق یہ ہے کہ نزولِ قرآنی سے مقصودِ اصلی نفوسِ بشریہ کی تہذیب اور ان کے باطل عقاید اور فاسد اعمال کی تردید ہے۔ اس لیے آیاتِ مناظرہ کے نزول کے لیے متکلمین میں عقایدِ باطلہ کا وجود اور آیاتِ احکام کے لیے ان میں اعمالِ فاسدہ اور مظالم کا شیوع اور آیاتِ تذکیر کے نزول کے لیے ان کا بغیر ذکر آلاء اللہ و ایام اللہ اور موت و واقعات بعد الموت کے بیدار نہ ہونا، اصلی سبب ہُوا۔ خاص واقعات کو جن کے بیان کرنے کی زحمت اُٹھائی گئی ہے۔ اسبابِ نزول میں چنداں دخل نہیں، مگر سوائے چند آیات کے جن میں کسی ایسے واقعہ کی جانب اشارہ ہے جو رسول اللہ کے زمانے میں یا اس سے پیشتر واقع ہُوا ہو۔

فوزالکبیر کی دوسری خصوصیت شاہ صاحب کی انصاف پسندی اور اخلاقی جرأت ہے۔ مثلاً عام طور پر مسلمان زمانۂ جاہلیت کے عربوں سے فقط بُرائیاں اور عیب ہی منسوب کرتے ہیں، لیکن شاہ صاحب نے اس معاملے میں بھی "انصاف بالائے طاعت" کے اصول کو ملحوظ رکھا اور تصویر کے دونوں پہلو پیش کیے۔ اسی طرح عام مسلمانوں کا خیال ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنی اصل مذہبی کتابوں کو بدل ڈالا ہے، لیکن شاہ ولی اللہ اس کے قائل نہ تھے۔ وہ لکھتے ہیں "یہودی تحریف لفظی، تورات کے ترجمے وغیرہ میں کیا کرتے تھے نہ کہ اصل کتاب میں کیونکہ فقیر کے نزدیک ایسا ہی محقق ہُوا ہے اور ابن عباس کا بھی یہی قول ہے۔"

بعض مفسّرین نے اہلِ کتاب سے قصّے لے کر انھیں قرآنی تفاسیر اور علوم اسلامی کا جزو بنا دیا ہے۔ اس کے خلاف شاہ صاحب نے جا بجا آواز بلند کی ہے مثلاً فوزالکبیر میں لکھا ہے "یہاں پر یہ جان لینا مناسب ہے کہ حضرات انبیا سابقین کے قصّے احادیث میں کم مذکور ہیں اور ان کے وہ لمبے چوڑے تذکرے جن کے بیان کرنے کی تکلیف عام مفسّرین بیان کرتے ہیں وہ سب اِلّا ماشاء اللہ علمائے اہلِ کتاب سے منقول ہیں۔" اسی کتاب میں آگے چل کر پھر لکھتے ہیں۔ "اسرائیلی روایات کا

نقل کرنا ایک ایسی بلا ہے جو ہمارے دین میں داخل ہو گئی ہے۔ حالانکہ صحیح اصول یہ ہے کہ ان کی نہ تصدیق کرو نہ تکذیب۔" مفسرین کے بعض قصے جنھیں عوام اسلام کا ضروری جزو سمجھنے لگ گئے ہیں، شاہ صاحب کو بہت ناپسند تھے۔ فرماتے تھے۔ "اور محمد بن اسحٰق واقدی کلبی نے قصہ آفرینی میں جس قدر افراط کی ہے (یعنی وہ ہر ایک آیت کے تحت میں ایک قصہ لائے ہیں) محدثین کے نزدیک ان کا اکثر حصہ صحیح نہیں اور ان کے اسناد میں خامیاں ہیں۔ ان لوگوں کی اس افراط کو علم تفسیر کے لیے شرط سمجھنا صریح غلطی ہے اور اس کے حفظ پر فہم کتاب اللہ کو موقوف کرنا در اصل کتاب اللہ سے اپنا حصہ کھونا ہے۔"

مفسرین کی یہی ژولیدہ نویسی تھی، جس کی وجہ سے شاہ صاحب نے اپنے وصیت نامے میں بھی لکھا کہ قرآن اور اس کا ترجمہ تفسیر کے بغیر ختم کرنا چاہیے۔ اور پھر اس کے بعد تفسیر اور وہ بھی تفسیر جلالین (بقدر درس) پڑھائی جائے۔ (جو نہایت مختصر ہے اور جس کے الفاظ قرآن کے الفاظ جتنے ہیں) وہ لکھتے ہیں: "قرآن عظیم اس طرح پڑھا دیں کہ صرف قرآن اور (ترجمہ بغیر تفسیر کے) پڑھا جائے) مگر جہاں شانِ نزول یا قاعدۂ نحو مشکل ہو وہاں ٹھہر جائیں اور بحث کریں بعد اس کے تفسیر جلالین بقدرِ درس پڑھا دیں۔" (ترجمہ)

حدیث

مُلا نظام الدین اور ان کے معاصرین کے حالات سے ظاہر ہے کہ اس زمانے میں اسلامی مدارس جن باتوں پر زور دیتے تھے، وہ صرف و نحو یا منطق اور فقہ کی کتابیں تھیں۔ اس میں کچھ تو لکھنؤ اور وہاں کے علماء کے مذاق کو دخل تھا اور کچھ یہ وجہ بھی تھی کہ حکومتِ اسلامی کا زمانہ تھا۔ شرع حکومت کا قانون تھی، جس طرح آج کل جج یا منصف یا مجسٹریٹ ہوتے ہیں۔ اسی طرح اس زمانے میں قاضی اور مفتی اور محتسب ہوتے تھے۔ ان لوگوں کو اپنے فیصلوں کے لیے فقہ کی واقفیت درکار تھی، منطق بھی فقہی فیصلوں میں مفید تھی اور صرف و نحو عربی جاننے کے لیے ضروری تھی۔ چنانچہ جب تک اسلامی حکومت کا اقتدار رہا۔ انھی علوم نے فروغ پایا۔ شیخ عبدالحق نے حدیث کی اشاعت شروع کی، لیکن فقہ و منطق کے فروغ نے حدیث کو پنپنے نہ دیا۔

ان کے جانشینوں نے اس علم پر تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا لیکن شاہجہاں اور عالمگیر کی علم پرستی انھیں قضا اور افتا کی مسندوں پر لے گئی۔ وہ درسِ حدیث کا سلسلہ پوری طرح جاری نہ رکھ سکے اور ملک میں بہت سے علما ایسے نہ پیدا ہوئے جو طالبین کو درسِ حدیث دے سکتے۔ اس کی تلافی شاہ ولی اللہ صاحب نے کی۔ ایک تو اورنگ زیب کے بعد مفتیوں اور قاضیوں کی پہلی سی قدر نہ رہی اور فقہ کی کشش کچھ کم ہو گئی۔ دوسرے شیخ عبدالحق محدث کی طرح شاہ ولی اللہ بھی فنافی العلم تھے۔ "قاضی القضاۃ" اور "شیخ الاسلام" بننے کی خواہش ان کے دل میں نہ تھی۔ انھوں نے اپنی کوشش اس علم کی ترسیع کے لیے وقف رکھی۔ جس کی بادشاہوں کے درباروں میں تو قدر نہ تھی۔ لیکن جو عام مسلمین کی اخلاقی اور روحانی اصلاح کے لیے ضروری تھا۔ علم الحدیث پر انھوں نے کئی کتابیں لکھیں لیکن اس سے بڑھ کر یہ کیا کہ ایسے علما کی تربیت کر گئے جنھوں نے درسِ حدیث کا سلسلہ ان کے بعد جاری رکھا اور یہ فیض ملک میں عام ہو گیا۔

حدیث میں ان کی کئی کتابیں ہیں۔ امام مالک کے مرتب کردہ اور سب سے قدیم مجموعۂ حدیث، موطا، کے وہ بڑے مداح تھے۔ چنانچہ وصیت نامے میں لکھتے ہیں۔ "جب عربی زبان کی قدرت ہو جائے۔ موطا بروایت یحییٰ بن یحییٰ مصمودی پڑھا دیں۔ اسے ہرگز نہ چھوڑیں کہ علمِ حدیث کی اصل ہے۔ اور اس کے پڑھنے میں بہت فیض ہیں۔" علمِ حدیث میں شاہ صاحب کا یہ اجتہاد سمجھنا چاہیے کہ وہ موطا کو صحیح بخاری پر بھی ترجیح دیتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں مولٰنا عبیداللہ سندھی کا یہ بیان بڑا پُرمعنی ہے کہ موطا میں وہ تمام مشکل حدیثیں نہیں پائی جاتیں جن کا سمجھنا کالجوں کے طلبا کے لیے مشکل ہے۔ شاہ صاحب نے موطا کی شرح فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں لکھی۔ عربی شرح کا نام المسوّیٰ اور فارسی کا المصفیٰ ہے۔

یہ کتابیں تو علما کے لیے تھیں، لیکن شاہ صاحب نے عوام کے لیے بھی مختصر احادیث کی کتابیں مرتب کیں۔ ایک کتاب چہل حدیث ہے۔ النوادر من الحدیث میں عجیب اور غیر معمولی حدیثیں جمع کی ہیں۔ الدر الثمین فی مبشرات النبی کریم میں ایسی چالیس حدیثیں جمع

کی ہیں جو خواب میں انھیں بتائی گئیں۔ شرح تراجم ابواب بخاری میں صحیح بخاری کے ابواب کی سرخیوں کی تشریح کی ہے۔ اسی طرح اور کئی مختصر رسالے ہیں۔ حجۃ اللہ البالغہ جو اسرارِ شریعت میں آپ کی ضخیم اور مشہور کتاب ہے۔ اس کے مضامین بھی بیشتر احادیث پر مبنی ہیں اور اس سے بھی علمِ حدیث سے آپ کی عمیق واقفیت کا پتا چلتا ہے۔

اصولِ فقہ

شاہ صاحب کو فقہ سے بہت دلچسپی نہ تھی۔ ان کے فتوے یا فقہ کے پیچیدہ مسائل کے متعلق بہت سے رسائل نہیں ملتے لیکن وہ تمام علومِ اسلامی کے ماہر تھے۔ وقتی ضروریات کے متعلق انھوں نے فقہی فتوے بہت نہیں دیے، لیکن علمِ فقہ کو صحیح علمی اور ٹھوس بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے انھوں نے بڑی کوشش کی اور ایسی کتابیں لکھیں، جو اہلِ بصیرت و دانش کو ہدایہ اور فتاویٰ عالمگیری سے اوپر فقہ اور شریعت کے اصلی سرچشمہ تک پہنچا دیتی ہیں اور جن کی وجہ سے ایک مبتدی کے لیے بھی ممکن ہے کہ وہ ان حالات کا اندازہ کرلے جن کے ماتحت شرع اور فقہ کی تدوین ہوئی۔ اس سلسلے میں ان کی بہترین کتاب ایک مختصر رسالہ انصاف فی بیان سبب الاختلاف ہے۔ اس کتاب کو اگر تاریخ فقہ و علم الحدیث کہا جائے تو بجا ہے۔ کیونکہ فی الحقیقت یہ کتاب عہدِ سعادت سے لے کر پانچویں صدی ہجری تک فقہ کی تدوین، کتبِ احادیث کی فراہمی اور مختلف مذاہبِ فقہی کے آغاز کی ایک نہایت دلچسپ منصفانہ اور پُراز معلومات تاریخ ہے۔ اصل کتاب عربی میں ہے۔ اب عربی اصل اور سلیس اردو ترجمہ مولانا محمد احسن نانوتوی نے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب کو شاہ صاحب کی وسیع معلومات اور ذہنی قوتِ استخراج کا اعجاز سمجھنا چاہیے۔ عام طور پر مسلمان علما کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ علمی مسائل کے متعلق تاریخی نقطۂ نظر نہیں رکھتے۔ یعنی جو عالم حدیث کا درس دیتے ہیں، وہ جس کتاب کا درس دیں، اس کے مضامین سے تو پوری طرح واقف ہوں گے لیکن حدیث کی تاریخ سے انھیں کامل واقفیت نہ ہوگی اور عہدِ نبوی سے لے کر اب تک محدثین کے مختلف ادوار

جمع احادیث کے طریقے۔ احادیث کے متعلق مختلف لوگوں کے خیالات' ان باتوں کے متعلق انھیں مسلسل صحیح اور نقادانہ واقفیت کم ہوتی ہے۔ اسی طرح فقہا میں جو فتوے تو دے لیں گے اور جو مسائل انھیں پیش کیے جائیں' ان کے متعلق اپنے اساتذہ یا مشہور مصنفین کی تصانیف دیکھ کر فیصلے تو کر سکیں گے' لیکن علم فقہ کی تدوین' عہد بعہد کی ترقیاں اور تبدیلیاں' مختلف صورتیں جو مسائل نے مختلف زمانوں میں اختیار کیں۔ ان سے انھیں پوری واقفیت نہیں۔ عام ہندوستانی علماء کے متعلق یہ اعتراض بہت حد تک صحیح ہے' لیکن شاہ ولی اللہؒ کے اس مختصر رسالے کو بھی دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ انھیں اسلام کی علمی تاریخ سے کتنی واقفیت تھی۔ اردو میں یہ رسالہ پچاس صفحے سے زیادہ کا نہیں لیکن اس میں نہایت وضاحت اور انصاف پسندی سے قریباً ان سب اہم بنیادی مسائل کا ذکر آگیا ہے' جن پر علما میں اختلافات ہوئے۔ ان اختلافات کی توضیح کی ہے۔ ساتھ ساتھ مذاہب اربعہ یعنی حنفی۔ شافعی۔ مالکی اور حنبلی طریقوں کی خصوصیات اور ان کی جداگانہ تشکیل کی نہایت عالمانہ تاریخ لکھی ہے۔ جمع احادیث اور محدثین مثلاً بخاری۔ مسلم۔ ابوداؤد۔ ترمذی کے مجموعوں کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ اجتہاد اور تقلید کے مسئلے پر روشنی ڈالی ہے اور ان وجوہات کا ذکر کیا ہے' جن کی بنا پر مسلمانوں میں تقلید کا رواج ہو گیا۔ ہم اس کتاب میں سے طویل اندراجات نہیں دینا چاہتے۔ کیونکہ ہمارا خیال ہے کہ ہر شخص' جسے علوم اسلامی کی تاریخ سے ذرا بھی دلچسپی ہے اسے خود پڑھے گا اور حرز جاں بنائے گا۔ لیکن تقلید کے متعلق متاخرین نے جو غلو کیا ہے' اس پر شاہ صاحب کا فیصلہ بہت دلچسپ ہے۔ اسے نقل کرنا بیجا نہ ہوگا۔ کتاب کے اخیر میں لکھتے ہیں:-

> پھر ان لوگوں کے بعد بہت سے قرن ایسے تقلید پر پیدا ہوئے کہ نہ حق کو باطل سے جدا کرتے' نہ جدل کو استنباط سے۔ تو فقیہ اس وقت وہی تھا جو بہت بکے۔ منہ پھٹ ہو کر فقہا کے قوی اور ضعیف اقوال کو بدوں تمیز کے یاد کرے اور ان کو باچھیں چیر چیر کر بیان کرے اور محدث وہ تھا' جو صحیح اور سقیم حدیثوں کو شمار کرلے

اور اپنی کلہ زوری سے ان کو کہانیوں کی طرح بکتا چلا جائے ..... اور اس کے بعد جو قرن ہُوا وہ فتنے اور تقلید میں اور بھی بڑھ گیا اور لوگوں کے دلوں سے دیانتداری جاتی رہی۔ یہاں تک کہ دین کے معاملے میں غور نہ کرنے پر مطمئن ہو گئے اور یہ کہنے لگے کہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایک دین پر پایا اور ہم انھی کے قدم کے نشانوں پر ان کی پیروی کرتے ہیں۔

اجتہاد و تقلید

اس کتاب کے علاوہ آپ نے تقلید اور اجتہاد کے مسئلے پر ایک بڑی مفید کتاب عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید کے نام سے لکھی ہے۔ اس کتاب کے چار باب ہیں، جن میں اجتہاد کی قسموں اور مجتہد کی خصوصیات کے علاوہ اس قسم کے مسائل پر بحث کی ہے کہ ایک عامی فقہا کے اختلاف کی صورت میں کیا کرے اور آیا ایک عامی مختلف فقہی مذاہب کی مختلف باتیں اختیار کر سکتا ہے؟ انھوں نے جماعت کو دو بڑے گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ مجتہدین اور عامی، مجتہدین کے تین مدارج ہیں۔ (ا) مجتہدین مطلق یعنی ائمۂ اربعہ۔ (ب) مجتہد فی المذہب اور (ج) مجتہد فی الفتوے۔ اجتہاد کی تعریف انھوں نے یہ کی ہے "خوب محنت کرنا دریافت کرنے میں، شریعت کے احکام فرعی کو، ان کی تفصیلی دلیلوں سے جن کی کلیات کا مآل چار قسم پر ہے یعنی کتاب اور سنت اور اجماع اور قیاس[1] پر"۔

معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب باب اجتہاد کے بند ہونے کے قائل نہ تھے۔ وہ عوام کو حق اجتہاد قطعاً نہیں دیتے۔ مجتہدوں کے بھی انھوں نے مدارج مقرر کیے اجتہاد کے لیے جو مناسب شرطیں درکار ہیں۔ وہ بیان کیں، لیکن وہ کہیں یہ نہیں کہتے کہ اب اجتہاد کی گنجائش نہیں رہی۔ بلکہ انھوں نے اس خیال کی جابجا تردید کی ہے۔ وہ آغاز کتاب ہی میں فرماتے ہیں:۔

" پھر اب جو گمان کیا جاوے ایسے شخص عالم کے حق میں جو اکثر مسائل میں اپنے امام کے

---

[1] عقد الجید کا ترجمہ مولانا احسن نانوتوی نے کیا ہے۔ ہمارے اقتباسات اسی سے ہیں۔

موافق ہو، لیکن اس کے ساتھ ہی ہر حکم کی دلیل چاہتا ہو کہ وہ مجتہد نہیں ہے تو یہ گمان اس شخص کے حق میں گمان فاسد ہے۔ اور اس طرح پر جو یہ گمان کرے کہ مجتہد اس زمانے میں نہیں پایا جاتا۔ بلحاظ اعتماد کرنے کے گمان اوّل پر تو یہ گمان بنا ر فاسد بر فاسد ہے۔"

شاہ صاحب نے اس کتاب میں ارشاداتِ نبوی کی ایک نہایت اہم خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے اور لکھا ہے "اور جو کوئی شارع علیہ السلام کے حکموں اور فتووں کو خوب جستجو کرے گا تو اس کو ایک کلیہ قاعدہ مل جائے گا کہ شارع علیہ السلام نے نیکی کی سب اقسام کو طرح طرح سے ضبط فرمایا۔ پھر بھی ان ارکان وغیرہ کی تعریفوں میں جامع اور مانع سے بہت بحث نہیں کی"۔ چنانچہ کئی مثالیں دے کر جن میں رسولِ اکرم نے کڑی شرطیں نہیں لگائیں۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں "تو ان امور کی وجہ یہ تھی کہ آپ نے ایسی باتیں امتی لوگوں کی رائے پر حوالہ کر رکھی تھیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اکثر فتووں کا حال ایسا ہی ہے، جیسا کہ منصف عاقل پر پوشیدہ نہیں اور ہم نے آپ کے احکام کی تلاش سے یہ سمجھا کہ آپ نے ترکی باتیں چھوڑنے اور اقسام ضبط کو زیادہ بیان نہ کرنے میں ایک بڑی مصلحت ملحوظ فرمائی ہے"۔ چنانچہ شاہ صاحب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کو دھیان میں رکھ کے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جزئیات کے معاملے میں تشدد نہیں کرنا چاہیے۔ اور معمولی اختلافات سے شارع کا مقصود فوت نہیں ہو جاتا۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں "تو جو کوئی اس مسئلے کی ماہیت بجوں کی توں جان لے گا۔ اس کو یہ امور معلوم ہو جائیں گے۔ اوّل یہ کہ اجتہاد کی اکثر صورتوں میں امرِ حق اختلاف کے دونوں جانب کے اندر دائر رہتا ہے۔ دوم یہ کہ دین کے معاملے میں وسعت ہے، تنگی نہیں۔ سوم یہ کہ ایک چیز پر جم جانا اور مخالفت کی نفی کا یقین کرنا کچھ بات نہیں"۔

فقہ کا ایک بڑا اختلافی مسئلہ تقلید اور عدم تقلید کا ہے۔ اس معاملے میں حنفی، شافعی، حنبلی، مالکی، ہر چہار مکاتیبِ فکر کے متبعین مقلد یعنی تقلیدِ ائمہ کے قائل ہیں۔

اہلِ حدیث جماعت تقلید کی قائل نہیں ۔ دوسرا مسئلہ لزوم مذہب معینہ کا ہے۔ یعنی آیا ایک مسلمان کو جو تقلید کا قائل ہے، فقہ کے چار مذاہب میں سے کسی ایک کی تقلید لازم ہے یا وہ مختلف معاملات میں مختلف مذاہب (شافعی، حنفی، مالکی، حنبلی) کی پیروی کر سکتا ہے۔ اس مسئلے پر علما میں بڑا اختلاف ہے۔ شاہ صاحب نے اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی ہے۔ چونکہ انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار بڑی باریکی سے کیا ہے۔ اس لیے یہ رائے بہت واضح اور یک طرفہ نہیں رہی۔ لیکن ان کی تصانیف کے مطالعہ سے خیال ہوتا ہے کہ اگرچہ وہ ایک عامی کے لیے "لزوم مذہب معینہ" کے قائل ہیں، لیکن علماء و مجتہدین کے لیے وہ ایسی پابندی ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب کے صفحہ ۷۲ پر لکھتے ہیں "اور علما کو درست ہے کہ ہمارے آئمہ میں سے ایک کا قول کسی مصلحتِ وقت پر عمل کرنے کی وجہ سے اختیار کریں"۔ اسی طرح انھوں نے کتاب کے اخیر میں لکھا ہے:۔

"یعنی اگر انسان کسی مجتہد کے، جس کو اجتہاد جائز ہو۔ ایسے قول کی جستجو کرے جو اس کے نفس پر سہل ہو تو ہم کو معلوم نہیں کہ شرع نے اس عمل پر اس کی برائی کی ہو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ جو باتیں آپ کی امت پر سہولت کی ہوں انھی کو دوست رکھتے تھے۔"

اس کے علاوہ حیاتِ ولی میں مولانا رحیم بخش لکھتے ہیں:۔ "آپ کو مذہبی تفریق کے خانہ برانداز جھگڑوں سے چنداں بحث نہ تھی۔ نہ اُن مشہور مذاہب اربعہ میں سے کسی خاص مذہب کے پابند تھے کہ خواہ مخواہ اُسی کے مطابق عملدرآمد کریں"۔ چنانچہ اس مسئلے کے متعلق خواجہ محمد امین کے سوال کے جواب میں جو کچھ آپ نے لکھا۔ اس سے آپ کا مسلک پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:۔ "سوال سوم آنکہ عمل تو در مسائل فقہیہ بر کدام مذہب است۔ گفتم بقدر امکان جمع مے کنم در مذاہب مشہور مثلاً صوم و صلوٰۃ و وضو و غسل و حج بوضعے واقعہ مے شود کہ ہمہ اہل مذاہب صحیح دانند و عند تعذر الجمع باقوی مذاہب از روئے دلیل و موافقت صریح حدیث عمل می نمائیم"۔

شاہ ولی اللہ عامی کو مجتہدین کا مقلد رکھنے کے حق میں تھے اور ظاہر ہے کہ اگر یہ نہ ہو تو جس ملک میں شرع رائج ہے۔ اس کا نظام درہم برہم ہو جائے۔ عامی کی تقلید حقیقتاً قوانین رائج کی تعمیل ہے، جو تمام مہذب ممالک پوری طرح کرواتے ہیں۔ لیکن شاہ صاحب تقلید کو حد سے زیادہ بڑھانے کے مخالف تھے۔ انھوں نے ایک باب تقلید میں اعتدال رکھنے کے بارے میں لکھا ہے اور تقلید کی ایک قسم لکھی ہے، جسے قطعاً حرام قرار دیا ہے۔ یعنی تقلید کی وہ صورت جس میں دانستہ یا غیر دانستہ مقلد صریح احادیث پر بھی مفتیوں اور فقیہوں کے اقوال کو ترجیح دیتے رہے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

"اور تقلید حرام کی یہ صورت ہے کہ کسی فقیہ کو گمان کرے کہ وہ علم میں نہایت کو پہنچ گیا ہے۔ ہو نہیں سکتا کہ وہ خطا کرے تو ایسے مقلد کو جب کوئی حدیث صحیح اور صریح پہنچتی ہے کہ مخالف اس فقیہ کے قول کے ہو تو اس کے قول کو نہیں چھوڑتا۔"

تصوّف

تصوّف کا مسئلہ بڑا ٹیڑھا ہے۔ ایک تو اسے بعض ریاکاروں نے دنیا طلبی اور ابلہ فریبی کا ذریعہ بنا رکھا ہے، لیکن اگر انھیں یہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے کہ ریاکار لوگ کس مشرب میں نہیں ہوتے؟ تب بھی اسلام کی تاریخ میں ایسے مخلص، نکوکار وارستہ مزاج کثرت سے ملیں گے جنھیں تصوّف نے رہبانیت، شرع سے آزادی اور پریشان روی کا راستہ دکھایا۔ بلکہ ہوتا یہ رہا ہے کہ جس کثرت سے شرع کی قیدیں بڑھیں اور اصولی باتوں کو چھوڑ کر فقیہوں اور محتسبوں نے روزمرہ کی معمولی اور بے ضرر باتوں میں بھی لوگوں کو اپنے خیالات اور اپنی کتابوں کے مطابق جکڑ بند کرنا چاہا۔ اسی قدر اہلِ تصوّف کی وارستگی بڑھ گئی۔

یہی وجہ تھی کہ بعض مذہبی حلقوں میں تصوّف کی مروجہ صورتیں شروع سے ہی مشتبہ تھیں۔ آج کچھ وہابی اثرات، کچھ اقبال کی مخالفت اور بڑی حد تک مغربی مادیت کی فتح سے تصوّف اور بھی بدنام ہو گیا ہے اور مذہبی اعتراضات سے قطع نظر اسے بعض سہل انگار، قومی زوال کا بڑا سبب قرار دیتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ تصوّف بالخصوص عجمی تصوّف نے بسا اوقات ان زمانوں میں فروغ پایا، جب دنیوی نقطۂ نظر سے قوم روبہ زوال

تھی۔ لیکن ان زمانوں میں تصوف کی مقبولیت، قومی زوال اور دنیوی پریشاں حالی کا نتیجہ تھی۔ سبب نہ تھی اور ان دونوں کا باعث قوم اور افراد کی عسکری، اخلاقی اور علمی کمزوریاں تھیں۔

لیکن اگر تصوف میں کچھ کوتاہیاں ہوں، تب بھی ہندوستانی مسلمانوں کے لیے اسے جڑ سے اکھیڑ پھینکنا آسان نہیں۔ ہمارا ادب، فلسفہ، مذہب، تصوف کی گود میں پلا ہے اور اگر ہم تصوف کا قلع قمع کریں تو بہت سی قیمتی چیزوں سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ اور اس کے علاوہ تصوف کی اسلامی صورت یعنی احسان یا اخلاص فی العمل کی ضرورت قوم کو ہمیشہ رہی ہے اور رہے گی۔ شاید بعض نوجوان خیال کرتے ہوں کہ غلام قادر روہیلہ کی خودی اور میر جعفر کی خود غرضی سے قوم کو فائدہ پہنچا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اگر ان بزرگوں پر تصوف اور مناسب نفی خودی (ایثار) کے چند چھینٹے پڑ جاتے تو غالباً ان کا عمل دوسرا ہوتا! تصوف کی ضرورت صرف خود پرستوں کو مناسب حدود کے اندر رکھنے کے لیے نہیں۔ بلکہ جو لوگ قومی راہ میں انتہائی قربانی کرنا چاہتے ہیں، انھیں بھی یہ عمل مفید پڑتا ہے کہ وہ سیدھی سادی صوفیانہ ریاضتوں اور ذکر و شغل کی مدد سے جن کا شرع سے کوئی تضاد نہیں، بلکہ جو شرعی فرائض کی تکمیل کے بعد شروع ہوتے ہیں، اپنی روحانی اصلاح کریں اور شخصی ہوا و ہوس، حسد، غصہ، خواہشِ انتقام، اور ان علائقِ دنیوی کو جو ذاتی قربانیوں کی راہ میں حارج ہوتے ہیں، مٹا دیں اور اس طرح فرشتہ خو انسان بن کر اپنے تئیں بنی نوع آدم کے لیے وقف کریں۔

حضرت حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ ان روحانی ضرورتوں کی اہمیت سمجھتے ہوں گے اس کے علاوہ انھوں نے جس ماحول میں پرورش پائی تھی، وہاں تصوف سے لگاؤ ہو جانا لازمی تھا۔ ان کے والد اور چچا اہلِ طریقت تھے اور معاصرانہ تذکروں (مثلاً روضۃ القیومیہ) میں ان کا ذکر مشائخ کے ضمن میں ہوا ہے۔ علما کے ضمن میں نہیں۔ چنانچہ شاہ صاحب کو بھی تصوف سے گہری دلچسپی ہو گئی اور ان کی اصلاحی تحریک اور شیخ محمد بن عبدالوہابؒ کی تحریک میں ایک وجہ امتیاز یہ بھی تھی کہ اگرچہ یہ دونوں بزرگ مجدد نبوی

کی طرف لوٹنا چاہتے ہیں اور شاہ صاحب بھی تصوف کی اصلاح کے خواہاں ہیں، لیکن وہابی مصلحین کی طرح وہ اس کے مخالف نہیں۔

شاہ صاحب نے علمِ تصوّف میں کئی کتابیں لکھیں۔ ایک کتاب لمعات ہے، جس کا اردو ترجمہ تفہیمات کے نام سے شائع ہوا ہے۔ ایک رسالہ وحدت الوجود و الشہود لکھا ہے جس میں شیخ اکبر کے "نظریہ وحدت الوجود" کی تاویل کر کے اسے شیخ مجددؒ کے مطابق ثابت کیا ہے۔ القول الجمیل میں بیعت کے طریقے اور فائدے، قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ سلسلوں کے اذکار اور صاحب بیعت کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ آخر میں دو نہایت دلچسپ اور کار آمد باب عالمِ ربانی کے خصائص اور آدابِ تذکیر و موعظت کے متعلق ہیں۔ القول الجمیل کا ترجمہ شفاء العلیل کے نام سے شائع ہوا ہے۔ تفہیماتِ الٰہیہ جس کا کچھ حصہ عربی میں ہے اور کچھ فارسی میں، بیشتر تصوف کے مسائل سے متعلق ہے۔ ان کے علاوہ الطاف القدس، خیر کثیر وغیرہ میں علمِ تصوف کا بیان ہے۔ انفاس العارفین میں بھی تصوف کے بہت سے مسائل ضمناً آ گئے ہیں۔

شاہ صاحب کو تصوف سے بڑی دلچسپی تھی، لیکن انھیں متصوفین کی قابلِ اعتراض باتوں کا پورا احساس تھا۔ ان کی تیسری وصیت ہے۔ "وصیتِ دیگر آنست کہ دست بدست مشائخ ایں زماں کہ بانواع بدعت مبتلا ہستند۔ ہرگز نباید داد و بیعت ایشاں نباید کرد۔ و بغلوِ عام مغرور نباید بود۔ و نہ بکرامات۔ زیرا کہ اکثر غلوِ عام بسبب رسم است و امور رسمیہ را بحقیقت اعتبارے نیست و کرامات فروشانِ ایں زمانہ ہمہ الا ما شاء اللہ طلسمات و نیرنگیات را کرامات دانستہ اند...."

اس کے علاوہ شاہ صاحب نہ صرف مشائخ کے نقائص پر معترض تھے، بلکہ انتہائی

ل اس موضوع پر مولوی غلام یحییٰ نے کلمات الحق لکھی۔ جس کا جواب شاہ رفیع الدین صاحب نے دمغ الباطل میں دیا۔ مولوی صاحب نے شاہ ولی اللہ سے اختلاف کیا تھا لیکن ان کے مرشد مرزا مظہر جانجاناں نے لکھا۔ (ترجمہ) "لیکن مسئلہ تطبیق سے تعرض کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ توفیق بین المکشوفین اگرچہ تکلف سے خالی نہیں، لیکن اس میں ایک عمدہ مصلحت پائی جاتی ہے۔"

نفیِ خودی کے مخالف تھے اور اقبالؔ کی طرح اسے ملتِ اسلامیہ کے لیے سخت مُضر سمجھتے تھے۔ چنانچہ اس مسئلے پر فریقین کے خیالات تفصیل سے لکھ کر آپ فرماتے ہیں۔

"بالجملہ افراط در مقدمات انسلاخ استہلاک و مشغول شدن ہر کس و ناکس بآں دارِ عضال (مرضِ شدید) است در ملتِ مصطفویہ خدا رحمت کناد کسے را کہ سعی اعمال آنہا کند۔"

ہم شاہ عبدالرحیم کی نسبت لکھ چکے ہیں کہ وہ تصوف میں ہر سلسلے کے بزرگوں سے فیض حاصل کرتے تھے۔ شاہ ولی اللہ بھی اسی طریق کار پر عامل تھے۔ "جس طرح آپ مذاہبِ اربعہ مشہورہ میں سے کسی خاص مذہب کے مقلد و پیرو نہ تھے۔ اسی طرح اہلِ سلوک کے طرق میں سے کسی ایک طریقہ کے پابند نہ تھے[1] بلکہ ہر مذہب و طریقہ میں جو بات کتاب و سنت کے زیادہ موافق اور انسان کی روحانی اور دنیوی فلاح کے لیے زیادہ مفید دیکھتے، اس کو اختیار کرتے۔

شاہ ولی اللہ کو (اپنے والد شاہ عبدالرحیم کی طرح) اصل تعلق خاطر سلسلہ باقویہ نقشبندیہ سے تھا۔ لیکن وہ دُوسرے مشہور صوفی سلسلوں سے بھی منسلک تھے اور تذکروں میں لکھا ہے کہ آپ بیعت کے وقت چاروں خانوادوں (یعنی نقشبندیہ۔ چشتیہ۔ سہروردیہ۔ قادریہ سلسلوں) کے بزرگوں کے نام لیتے تاکہ سب سے فیض حاصل ہو سکے۔ ان سلسلوں میں شطاری سلسلہ نہ تھا، لیکن آپ کی اپنی تصانیف سے پتا چلتا ہے کہ آپ نے اس سلسلے کے بعض اشغال اپنے محترم اُستاد (شیخ ابوطاہر مدنی) اور لاہور کے ایک مشہور بزرگ حاجی محمد سعید لاہوری[2] سے سیکھے تھے۔ شطاری طور طریقے بعض متقی بزرگوں کو پسند نہیں۔ مثلاً شیخ عبدالحق کے اُستاد شیخ عبدالوہاب متقی کو ان کے والد نے نصیحت کی کہ شیخ غوث گوالیاری شطاری کی صحبت سے دُور رہنا۔ اس سلسلے میں شرع کی پابندی پر اتنا زور نہیں اور کہا جاتا ہے کہ شطاری اشغال میں ہندو یوگ کا اثر بھی

---

[1] حیاتِ ولی صہ ۲۷۲

[2] ایک زبردست عالم سیاح اور صاحب باطن بزرگ تھے۔ احمد شاہ ابدالی آپ کا بڑا معتقد تھا۔ بلکہ آپ کی درخواست پر اس نے اپنے تیسرے حملے میں لاہور کی لوٹ مار بند کر دی۔ (تذکرۃ العلماء و مشائخ از نور احمد چشتی)

آگیا ہے، لیکن شاہ ولی اللہ (اور ان کے اُستاد) کے اس سلسلے سے انتساب سے نظر آتا ہے کہ اگرچہ ظاہر ہے کہ شطاری سلسلے کا عام طریقہ انھوں نے نہ اختیار کیا اور شرع کی پوری پابندی کی، لیکن فیض کے معاملے میں وہ دونوں وسعت اور آزادی کی طرف مائل تھے۔ اس کے علاوہ شاہ صاحب کی ابتدائی صوفیانہ تحریروں میں جو خارقِ عادت واقعات آجاتے ہیں اور بعض جگہ ایسی غیر معمولی فضا ملتی ہے جو ان جیسے تیز بیں اور صاف بیں بزرگ کی تصانیف میں عجیب معلوم ہوتی ہے، ممکن ہے وہ شطاری نسبت کا نتیجہ ہو!

حجۃ اللہ البالغہ

شاہ صاحب کی تصانیف میں سب سے زیادہ مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ ہے[1]۔ اس کے متعلق نواب صدیق حسن خاں صاحب مرحوم لکھتے ہیں:۔

"ایں کتاب اگرچہ در علم حدیث نیست امّا احادیث بسیار درآں درج کردہ و حکم و اسرار بیان نمودہ تا آنکہ در فنِ خود مسبوق علیہ واقع شدہ و مثلِ آں دریں دوازدہ صد سال ہجری ہیچ یکے از علمائے عرب و عجم تصنیفے موجود نیامدہ۔"

مولانا شبلیؒ اس کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"حجۃ اللہ البالغہ جس میں انھوں (شاہ صاحب) نے شریعت کے حقائق و اسرار بیان کیے ہیں، درحقیقت علم کلام کی رُوح و رواں ہے۔ علم کلام درحقیقت اس کا نام ہے کہ مذہب اسلام کی نسبت ثابت کیا جائے کہ وہ منزل من اللہ ہے۔ مذہب دو چیزوں سے مرکب ہے۔ عقائد و احکام۔ شاہ صاحب کے زمانے تک جس قدر تصنیفات لکھی جا چکی تھیں، صرف پہلے حصے کے متعلق تھیں۔ دوسرے حصے کو کسی نے مس نہیں کیا تھا۔ شاہ صاحب پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس موضوع پر کتاب لکھی۔"

---

[1] اس کی عالمگیر شہرت کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ حکومت سوڈان نے اسے گارڈن کالج خرطوم کے نصاب میں داخل کیا اور سررشتۂ تعلیم نے اس کے پڑھانے کی سفارش کی (الندوہ دسمبر ۱۹۰۷ء)

یہ کتاب جس کا اردو ترجمہ چھ سو بتیس[1] صفحوں پر محیط ہے۔ شاہ صاحب نے اپنے ایک بزرگ بھائی اور گرامی دوست مولانا محمد عاشق کے ایما پر لکھی۔ کتاب کے شروع میں شاہ صاحب نے ایک مقدمہ لکھا ہے، جس میں کتاب کی غرض و غایت واضح کی ہے۔ آپ نے یہ کتاب اسرار علم دین کے متعلق لکھی۔ مقدمے میں بتایا ہے کہ محدثین کے مختلف طبقے اور علم حدیث کے مختلف پہلو کون سے ہیں۔ بعض علما ایسے ہیں، جو احادیث کی صحت، ضعف، شہرت اور غرابت کا مطالعہ کرتے ہیں۔ دوسرے علما کی توجہ غریب احادیث کے معانی اور مشکل احادیث کی شرح پر ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ ایک گروہ فقہا اور محدثین کا ہوا ہے، جو احادیث کے شرعی معنی بیان کرتے ہیں اور ان سے فقہی احکام اخذ کرتے ہیں۔ اس طرح علم حدیث کی اور کئی قسمیں ہیں، لیکن شاہ صاحب کے نزدیک "علوم حدیث میں سب سے زیادہ دقیق فن جس کی جڑ نہایت عمیق ہے اور جس کا معیار نہایت بلند ہے" اور جو ان کی نظر میں تمام علوم شرعیہ سے زیادہ بلند مرتبہ اور عالی قدر ہے، وہ اسرار دین کا علم ہے، جس میں تمام احکام دین کی حکمت اور لم اور ایک ایک عمل کے راز اور نکات بیان کیے ہیں۔" حجۃ اللہ البالغہ علم اسرار دین کی کتاب ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ مذہب اسلام کے جو عقاید یا احکام ہیں۔ ان میں کیا کیا مصلحتیں ہیں۔ شاہ صاحب خود اسی سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"بعض لوگ خیال کیا کرتے ہیں کہ شریعت کے احکام میں کوئی مصلحت نہیں ہوا کرتی اور اعمال اور ان کی جزا میں جو منجانب اللہ مقرر ہے کوئی مناسبت نہیں ہے اور احکام شریعت سے تکلیف کرنا بعینہٖ ایسا ہے، جیسے کوئی آقا اپنے ملازم کی فرمانبرداری کی آزمائش کرنے کو کسی پتھر کے اٹھانے یا کسی درخت کے چھونے کا حکم دے۔ جس میں بجز آزمائش کے اور کوئی فائدہ نہیں۔ پس اگر اس کی اطاعت کرے جزا پاوے اور سرکشی کرے تو سزا دی جائے یہ گمان بالکل فاسد ہے۔ حدیث اور ان زمانوں کے اجماع جن کی خوبی اور برکت پر خود شریعت نے شہادت دی ہے۔ اس خیال کی تکذیب کرتے ہیں۔"

---

[1] حال میں ایک توضیحی ترجمہ شائع ہوا ہے۔ اس کے پندرہ سو صفحے ہیں۔

اس کے بعد تفصیل سے ارکانِ اسلام مثلاً نماز، حج، زکوٰۃ اور روزہ کی مصلحتیں بیان کی ہیں۔ شاہ صاحب نے کتاب کے دو حصے کیے ہیں۔ پہلا حصہ جو اردو ترجمے میں مقدمہ کے بعد ۲۷۴ صفحوں پر مشتمل ہے۔ ان عام اصولوں اور کلیہ قاعدوں کے متعلق ہے۔ جن پر شریعتوں اور مذہبوں کی مصلحتوں کا مدار ہے۔

دوسرے حصے میں پہلے حصے کے قاعدوں اور اصولوں کی کسوٹی پر مذہب اسلام کے مختلف فروعی احکام کو پرکھا ہے۔ ایک تو احادیث کے مطابق ان احکام کی توضیح کی ہے۔ دوسرے ان احکام کی مصلحتیں بیان کی ہیں۔ اس حصے میں طہارت، عبادت اور ارکانِ اسلامی کے علاوہ ذیل کے مسئلوں پر روشنی ڈالی گئی ہے:-

(۱) ابواب احسان (۲) ابواب معاملات (۳) ابواب ترتیب منزل (۴) ابوابِ سیاستِ مدن (۵) ابوابِ معیشت (۶) چند ابوابِ مختلف۔

شارع نے شریعتِ اسلام کو مرتب کرتے وقت جن مقاصد کو پیش نظر رکھا۔ وہ شاہ صاحب کے نزدیک تین ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:-

"جس مصلحت پر شارع نے مستند کیا ہے اور جس خرابی سے باز رکھا ہے۔ اس کی انتہا تین اصولوں میں سے ایک نہ ایک پر ہوتی ہے:-

(۱) ان چار اوصاف میں سے جو معاد میں مفید ہیں یا ان تمام خصلتوں میں سے جو دنیا میں سودمند ہیں کوئی نہ کوئی وصف نفس میں پیدا کرنا اور ان کو شائستہ اور مہذب بنانا ہے (۲) کلمہ الٰہی اور سچے مذہب کو غالب کرنا۔ شرائع کو خوب مستحکم کرنا ان کی اشاعت میں کوشش کرنا ہوتا ہے (۳) عامہ خلائق کی حالت کو منتظم کرنا ان کے امورِ نافع اور تدابیرِ مفیدہ کی درستی کرنا اور ان کی رسموں کو مہذب صورت میں لانا۔"

حجۃ اللہ البالغہ کی اہمیت کا صحیح اندازہ اس کے مطالعہ سے ہی ہو سکتا ہے، لیکن مندرجہ بالا اقتباسات سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ شاہ صاحب کا نقطہ نظر عقل اور سمجھ کے کس قدر قریب تھا۔ ان کی ساری کتاب کی غرض و غایت ہی اس خیال کی تائید تھی کہ جو لوگ ڈرا دھمکا کر احکام شرعی کی تعمیل کراتے ہیں، وہ دین کو صحیح طور پر نہیں

سمجھتے۔ اسلام کے تمام احکام کسی نہ کسی دنیوی یا روحانی مصلحت پر مبنی ہیں۔ چونکہ ان مصلحتوں کی توضیح ہی اسلام کی حقانیت اور صداقت کے حق میں بہترین دلیل و حجت ہے۔ اس لیے اس کتاب کا نام انھوں نے حجۃ اللہ البالغہ رکھا۔

شاہ صاحب کی کتاب پر تبصرہ ختم کرنے سے پہلے ہم ضمناً ایک مسئلے کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں۔ بعض حلقوں میں کہا جاتا ہے کہ زمانہ روز بروز خراب آرہا ہے اور ماضی کی نسبت حال اور مستقبل دونوں زمانے بُرے ہیں۔ یہ نقطۂ نظر جس نے قوم میں ایک بے ہمتی اور مایوسی پیدا کر رکھی ہے فی الحقیقت مواعید قرآنی اور ارشادات نبوی کے صریحاً خلاف ہے اور اسے وہی لوگ اختیار کرتے ہیں جو ماضی کی ہر ایک بات کو خوش اعتقادی کی عینک سے اور حال کی ہر ایک چیز کو شک اور وہم اور خوف کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ صاحب ازمنہ ماضیہ کی خوبیوں اور خامیوں سے پوری طرح واقف تھے اور سنت الٰہیہ پر بھی ان کی پوری نظر تھی انھوں نے حجۃ اللہ البالغہ کے اخیر میں عہد سعادت کی اہمیت اور خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے عام نقطۂ نظر کی پوری طرح تردید کی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چند اہم احادیث نقل کی ہیں۔ مثلاً آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا ہے :۔ (ترجمہ) کہ میری امت کی صفت بارش کی سی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ پہلا مینہ اچھا ہے یا اخیر کا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ (ترجمہ) تم میرے صحابہ ہو اور میرے بھائی وہ ہیں جو میرے بعد آئیں گے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ مختلف اعتبارات اور مختلف وجہیں ہر زمانے میں موجود ہوا کرتی ہیں۔

اس کے بعد شاہ صاحب لکھتے ہیں "اور یہ بھی ممکن نہیں کہ عمدہ اور بزرگ زمانے کے ہر شخص کو دوسرے مفضول زمانے پر فوقیت اور فضیلت ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جو قرون بالاتفاق عمدہ اور بزرگ تھے۔ ان میں بعض لوگ فاسق اور منافق بھی تھے۔ انھی زمانوں میں حجاج، یزید بن معاویہ، مختار ہیں "۔

دیگر تصانیف

شاہ صاحب بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ جن کتابوں کا

ہم ذکر کر چکے ہیں۔ ان کے علاوہ ان کی کئی اور کتابیں ملتی ہیں۔ ان میں ایک کتاب الجزو اللطیف آپ کی نہایت مختصر سوانح عمری ہے۔ جس کا ترجمہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے جرنل بابت سنہ ۱۹۱۲ء میں شائع ہو چکا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے حالات میں ایک رسالہ لکھا ہے۔ انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ جو اُردو ترجمے کے ساتھ شائع ہو چکا ہے تصوف کے متعلق ہے۔ اسی طرح ایک کتاب قصص الانبیا جس کا اُردو ترجمہ بھی ہو گیا ہے۔ آپ سے منسوب کی جاتی ہے۔ آپ کے ایک سوانح نگار نے آپ کی سینتیس تصنیفات کے نام لکھے ہیں۔ جن میں سے اکثر شائع ہو چکی ہیں۔ اگرچہ بہت سی اب کمیاب ہیں۔ آپ کی ایک نہایت دلچسپ کتاب المقدمۃ السنیہ ہے، جس میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے ایک کمیاب فارسی رسالے کا ترجمہ کیا ہے۔ اُن کی سوانح عمری لکھی ہے اور انھوں نے شریعت اور تصوف کی تطبیق کی جو کوشش کی تھی، اس کا حال لکھا ہے۔ اس کے علاوہ اکبری دور کے عقائد کا ذکر کر کے اس زمانے کے الحاد پر نکتہ چینی کی ہے۔ اگرچہ مذہبی نقطۂ نظر سے شاہ صاحب اس زمانے کے خیالات کو ناپسند کرتے تھے، لیکن وہ اس بات کا خاص طور پر ذکر کرتے ہیں کہ اس زمانے میں علماء صلحا کی کوئی کمی نہ تھی۔ چنانچہ ان کی فہرست بھی دی ہے۔

اصلاحِ معاشرت

اس کتاب کی گنجائش کے مطابق ہم نے شاہ صاحب کی تصانیف کا ذکر تفصیل سے کر دیا ہے، لیکن وہ اس زمانے کے باقی علما کی طرح فقط کتابیں پڑھنا اور پڑھانا ہی اپنا فرض نہ سمجھتے تھے۔ قوم کی معاشرتی بیماریوں پر بھی آپ کی نظر تھی اور اپنی تصنیفات میں انھوں نے ان خرابیوں کو جا بجا بے نقاب کیا۔ اس موضوع پر ان کا بہترین اظہارِ خیال تفہیمات الٰہیہ کے ایک باب میں ہے جو سارے کا سارا پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے، لیکن آپ کے مختصر وصیت نامے سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ معاشرتی اصلاح کا جو درخت مولٰنا سید احمد بریلویؒ اور شاہ اسمٰعیل شہید کے ہاتھوں پھلا پھولا، اس کا بیج آپ ہی نے بویا تھا۔ وصیت نامہ میں آپ نے ہدایت کی ہے: "بقدر امکانِ عادات و رسوم عرب اوّل کہ منشارِ آنحضرت

است صلی اللہ علیہ وسلم از دست ندہیم۔ در رسوم عجم و عادات ہنود را ندر میان خود نگزاریم۔
اس کے بعد حضرت عمرؓ کے ان احکام کا ذکر کیا ہے، جو انھوں نے عربوں کو عجمی عیش و عشرت سے بچانے کے لیے نافذ کیے تھے۔ "یعنی چوں عرب برائے جہاد باطراف عجم منتشر شدند۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ترسیدند کہ رسم عجم را اختیار کنند و رسم عرب را ترک نمایند۔ پس بدیشاں نامہ نوشتند کہ ازار بندید و چادر بپوشید و نعل بپوشید و بگزارید موزہا و بگزارید شلوارہا ولازم گیرید لباس پدر خود اسمٰعیل را و خود را دور دارید از تنعم و ہیئت عجم ولازم گیرید نشستن در آفتاب۔ ہر آئینہ آفتاب حمام عرب است و برسم قوم معد باشید و درشت لباس باشید و سخت گذران باشید و کہنہ پوشی خو کنید۔"
اس کے بعد ان معاشرتی خرابیوں کا ذکر کیا ہے جو ہندوؤں کی وجہ سے مسلمانوں میں آگئی ہیں اور جن کی اصلاح کی کوشش آج ہندو قوم خود کر رہی ہے۔ سب سے پہلے نکاحِ بیوگان کا ذکر کیا ہے۔

(۱) "یکے از عادت شنیعۂ ہنود آنست کہ چوں شوہر زنے بمیرد۔ نگذارند کہ آں زن شوہر دیگر کند و ایں عادت اصلاً در عرب نبود۔" اس کی مذمت کی ہے۔ اور کہا ہے کہ خدائے تعالیٰ رحمت کناد برآں کس کہ ایں عادتِ شنیعہ را استلاشی (برطرف) سازد۔

(۲) دوسری بُری رسم بڑے بڑے مہر باندھنا ہے جو سُنّتِ نبوی کے خلاف اور خانہ بربادیوں کا سبب ہے۔

(۳) تیسری عادتِ شنیعہ خوشی غمی کے موقعے پر اسراف کی ہے۔ جس کی وجہ سے قوم غریب ہو رہی ہے (دیگر از عادات شنیعہ ما مردم اسراف است در ماتمہا و رسوم چہلم و ششماہی و فاتحہ سالینہ و ایں ہمہ را در عرب اوّل وجود نبود)

یہی چار بڑی خرابیاں ہیں۔ جن کی اصلاح کے لیے مولانا سید احمد بریلوی اور مولانا اسمٰعیل شہید کو کوشش کرنی پڑی۔ اور جن کی اصلاح آج بھی مختلف صورتوں میں قوم کے لیے ضروری ہے۔ شاہ ولی اللہ کی سمجھ اور قابلیت قابلِ داد ہے کہ انھوں نے سات صفحے کے ایک مختصر سے وصیت نامے میں اپنے تجربے کا نچوڑ دے دیا۔ قوم

کے فائدے کی تمام اہم باتوں کا ذکر کر دیا اور ان ضروری معاشرتی اصلاحوں پر نظر کر کے، جن کی طرف نہ قاضی کی نظر جاتی تھی نہ فقیہ کی وہ ہیچ بود دیا، جسے شاہ عبدالعزیز اور شاہ اسمٰعیل شہید کے زمانے میں پھولنا پھلنا تھا۔

اشعار اور مکاتیب

شاہ ولی اللہ صاحب کی زندگی اور تصانیف کے مختلف پہلوؤں پر ہم نے تبصرہ کر دیا ہے، لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ شاہ صاحب شاعر بھی تھے اور فارسی غزلوں اور رُباعیوں کا ایک مختصر ذخیرہ چھوڑ گئے ہیں۔ آپ امین تخلص کیا کرتے تھے۔ آپ کی اکثر غزلوں اور رباعیوں میں تصوف اور معرفت کے مضامین ادا ہوئے ہیں، لیکن اشعار میں رسمی عاشقانہ خیالات بھی ہیں۔ ہم آپ کے کلام میں سے دو فارسی رباعیات اور ایک فارسی غزل کے چند اشعار کا انتخاب تبرکاً درج کرتے ہیں ؎

رُباعیات

علمے کہ نہ ماخوذ ز مشکوٰۃ نبی است — واللہ کہ سیرابی ازاں تشنہ لبی است
جائے کہ بود جلوۂ حق حاکم وقت — تابع شدنِ حکم خرد بوالہبی است

قومے بکتابتِ احرف موقوف — جمعے بتلاوتِ اسما معروف
شخصے کہ ازیں قوم قدم بیش نہاد — گشت است باین صورتِ ذہنی مشغوف

ابیات

تا بکے محنتِ مہجوری و دوری بکشم — تا زمینِ وطنم سوئے وطن باز روم
تا بکے ہمدمِ من سنگ بود شیوۂ من — گوہرے از عدنم سوئے عدن باز روم
تا بکے بستۂ زنجیر تعلق باشم — آہوئے از ختنم سوئے ختن باز روم
بوئے جاں میرسد از باد یمن در دل — شاہ ملکِ یمنم سوئے یمن باز روم

شاہ صاحب نے مستقل تصانیف کے علاوہ عربی اور فارسی خطوط کا ایک معقول ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے۔ ان کا مطالعہ بہت دلچسپ ہے۔ بعض خطوط ذاتی اور نجی ہیں۔

لیکن کئی خطوں میں مختلف علمی مسائل کی توضیح ہے۔ ان خطوط میں بھی شاہ صاحب کی علمی وسعت مجتہدانہ نظر اور انصاف پسندی پوری طرح نمایاں ہے۔ ایک عربی خط کا ترجمہ ہم نمونے کے طور پر درج کرتے ہیں، جسے انھوں نے بعض دوستوں کے نام لکھا۔ فرماتے ہیں:۔

"زمانے کا رنگ بالکل بدل گیا ہے اور مذہب کا چشمہ نہایت مکدّر ہو گیا ہے اور ہر پوشش جو مسلمانوں کو ظاہراً رونق دے رہی ہے، حقیقت میں اسلامی نہیں ہے۔۔

تم پانچ طرح کے لوگوں سے اپنے تئیں بچاؤ، جو حقیقت میں انناس کے سزا میں ہیں۔

ایک۔ بے حیا صوفی سے جو رفع تکلیف کے لیے حیلہ کرتا ہے اور اپنے مجازی امور میں توقف نہیں کرتا۔

دوسرا۔ جھگڑالو معقولی جو شکوک و اوہام کے فتنے پھیلاتا ہے۔ اور خدا کا منقاد و مطیع نہیں ہوتا۔

تیسرا۔ شیخی خور فقیہ جو مردہ اقوال پر خوش ہوتا ہے اور نبی صلعم نے اپنی امت کے لیے جن باتوں کی توضیح کی ہے ان کی پیروی نہیں کرتا۔

چوتھا۔ خشک زاہد جو دین میں اس درجہ سختی اور تشدد کرتا ہے کہ گویا اسے کسی بارے میں اجازت ہی حاصل نہیں۔

پانچواں۔ سرکش ملازم جو تکلف اور بادشاہ کے ساتھ عجمیوں کی ہیئت اختیار کرتا اور ان کے ہم نوالہ و ہم پیالہ ہونے کو دوست رکھتا ہے۔ والسلام"

حکیم الامت کون ہے؟

اسلامی ہندوستان کی مذہبی زندگی میں شاہ ولی اللہؒ کی عظمت اور اہمیت زیادہ تر تو ان کی علمی اور دینی خدمات کی وجہ سے ہے۔ لیکن اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ علما یا متصوفین کے کسی خاص گروہ کی ترجمانی نہیں کرتے، بلکہ اپنے وسیع علم اور تیز قوّتِ ادراک کی مدد سے مختلف فریقین کے نقطۂ نظر کو سمجھ کر ان کو باہم تطبیق دیتے ہیں اور

ہندوستان میں اشاعتِ اسلام کے حالات کچھ ایسے تھے کہ یہاں اس کی بڑی ضرورت ہے۔

شیعہ سُنّی خیالات کی تطبیق :- ہندوستان کے مسلمان بیشتر سُنّی ہیں، لیکن ان پر شیعہ اثرات بھی کثرت سے کارفرما رہے۔ اسلامی ہندوستان کی دفتری اور ادبی زبان فارسی رہی ہے اور ایران میں شیعہ مذہب اختیار ہونے کے بعد وہاں سے متعدد شیعہ علماء شعرا، فلسفی ہندوستان آتے رہے اور بعد میں خود ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ جن کا اثر ان کی تعداد کے تناسب سے بہت زیادہ ہے۔ اب اگر شیعہ سُنّی مسئلے میں کوئی عالم اسی طرح غلو کرے۔ جس طرح نجد یا ماوراء النہر میں کیا جاتا ہے۔ اور دُوسرے فریق کا نقطۂ نظر سمجھے بغیر ایک فریق کے خیالات پر شدت سے مصر ہو تو وہ قوم میں اختلافات بڑھائے گا اور ہندوستان میں اسلام کی نشوونما، تاریخی اتفاقات کی وجہ سے جن اصولوں پر ہوئی ہے اُن کے سمجھنے سے قاصر رہے گا۔ خوش قسمتی سے شاہ ولی اللہ نے اس معاملے میں ایک احسن طریقِ عمل اختیار کیا، جو دونوں طبقوں کے نقطۂ نظر اور اس بحث پر تمام تاریخی مواد اور نبوی احکام مطالعہ کرنے کے بعد مدوّن ہُوا ہے اور جس کو خواہ دونوں فرقوں کے غالی طرفدار پسند نہ کریں، لیکن اہلِ انصاف اس کی ضرور قدر کرتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ نے ان مسائل پر جن کی وجہ سے شیعہ سُنّی اختلافات پیدا ہوئے، کئی سیر حاصل کتابیں لکھیں۔ ازالۃ الخفا میں انھوں نے بالتفصیل مختلف خلفاء کے خصائل اور ان کے حقِ خلافت پر تبصرہ کیا اور اپنی رائے یہ ظاہر کی کہ رسول کریمؐ کے قطعی اشاروں کے مطابق خلفا کی ترتیب وہی ہونی چاہیے تھی جو فی الواقع ہوئی۔ لیکن حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے فضائل گنتے میں آپ کسی شیعہ سے پیچھے نہیں رہے بلکہ فیوض الحرمین میں لکھتے ہیں (ترجمہ) "میری طبیعت اور میرے فکر کو جب اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تو دونوں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو فضیلت دیں اور دونوں کو حضرت سے شدید محبت ہے"۔ اسی کتاب میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ تفضیلِ شیخین (یعنی حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ فاروق کی خلافت کے معاملے میں اولیت) کا عقیدہ "ایک ایسی چیز ہے کہ میرے ذاتی میلانات کے خلاف مجھے اس کے ماننے کا حکم ہُوا۔ افسوس ہے کہ

مجھ میں اس طرح کی متناقض اور متضاد باتیں ہیں، لیکن مجھ میں جو شدید جامعیت (یعنی تمام باتوں کو درمیان میں رکھنے کی خاصیت) ہے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے۔"

"جامعیت" کے علاوہ شاہ صاحب کے معتدلانہ نقطۂ نظر کا باعث ان کا متوازن دل و دماغ ہے، جس کی وجہ سے قوم کے ذہنی نظام میں انھیں مرکزی حاصل ہے۔

اس معاملے میں جس دوسرے بزرگ کا نام لیا جاسکتا ہے، وہ سرکار سرہند حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ ہیں۔ جن کے احسانات سے اسلامی ہندوستان کبھی عہدہ برا نہیں ہو سکتا۔ اور جن کا مرتبہ کئی اہم امور میں، شاہ صاحب سے بہت بلند تھا، لیکن دقت وقت کے تقاضے ہوتے ہیں۔ ایک نے کشتِ ملت کو دشمنوں کے تغلب سے بچایا۔ دینی اور ملی تحفظ کے لیے تیغ و تفنگ کا کام دیا۔ دوسرے نے کشتِ ملت میں ہل چلایا اور تخم ریزی کی۔ دونوں کے حالات اور مزاج مختلف تھے۔ اس لیے ان کے طریقِ کار اور اندازِ خیال میں بھی فرق تھا۔ حضرت مجددؒ کی امتیازی خصوصیت ان کی "رگِ فاروقیہ" یعنی شدید اسلامی احساس ہے۔ وہ بار بار اپنے مکتوبات میں اس ترکیب کو دہراتے ہیں۔ سامانہ کے خطیب نے خلفائے راشدین کا نام خطبہ میں نہ لیا تو حضرت کی رگِ فاروقی حرکت میں آئی اور انھوں نے اکابرِ شہر کو لکھا کہ آپ لوگ کیوں اس خطیب کے ساتھ "شدت و غلظت" کے ساتھ پیش نہ آئے۔ اس طرح کے اور موقعے کئی تھے۔ یہ رگِ فاروقی ایک بڑی خوبی ہے اور جس وقت فی الحقیقت اسلام خطرے میں ہو، اس سے بڑھ کر کوئی خوبی نہیں۔ جب حضرت مجدد الف ثانیؒ کے زمانے میں ہندو احیائیت نے اسلام کے لیے زبردست خطرہ پیدا کر دیا تو انھوں نے اس کا ترکی بہ ترکی جواب دے کر اور احیائے اسلام کی تحریک چلا کر برصغیر میں اسلام کو ایک نئی زندگی اور توانائی دی۔ لیکن شدتِ احساس میں واقعات کو صاف اور ان کی صحیح صورت میں دیکھنا مشکل ہوتا ہے اور غیر معمولی حالات میں جو طریق کار ضروری ہو، عام حالات میں اس پر عمل پیرا ہونے سے بسا اوقات دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً شیعوں کی نسبت حضرت مجددؒ کی رائے (علمائے ماوراء النہر کی طرح)

انتہا پسندانہ تھی۔ وہ انھیں کافر سمجھتے تھے اور ان کے صاحبزادے خواجہ محمد معصوم نے تو اورنگ زیب کے نام ایک خط میں شیعوں کو واجب القتل ٹھہرایا ہے[1]!

حضرت مجدد الف ثانی کے علم و عرفان، خلوص و جرأت اور عظیم احسانات میں شک نہیں۔ جن حالات سے انھیں سابقہ پڑا۔ انھیں دھیان میں رکھتے ہوئے ان کا نقطۂ نظر آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے[2]۔ لیکن ظاہر ہے کہ کئی اہم باتوں میں اسے قومی پالیسی کی اساس نہیں بنایا جاسکتا اور اگر آج شیعوں کو کافر اور گردن زدنی قرار دیا جائے۔ تو پتا نہیں قوم کو کتنے ممتاز اہلِ قلم، خادمانِ قوم اور قائدانِ اعظم سے ہاتھ دھونا پڑے!!

شاہ صاحب کی سب سے نمایاں خوبی "عدل" و اعتدال ہے، جو کوئی ان کے فلسفہ اور رجحانات پر تبصرہ کرتا ہے۔ اسے "متوازن دل و دماغ" "معتدل مزاج" "ہمہ گیر فطرت" "جامعیت" "توازنِ صادق" "اعتدالِ صحیح" یا اس طرح کے الفاظ استعمال کرنے پڑتے ہیں۔

حضرت حکیم الامت ہر امر میں طبعی توازن (Balance) برقرار رکھنے کی ضرورت

---

[1] رسالہ رد روافض میں حضرت مجدد نے بھی یہی نقطۂ نظر اختیار کیا ہے اور علمائے ماوراء النہر کے خیالی ملکہ مہلک نقطۂ نظر کے خلاف علمائے مشہد نے جو کچھ لکھا تھا، اس کی بالوضاحت تردید کی ہے۔

[2] حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کو اس بات کا بڑا احساس تھا۔ کہ حالات کے مطابق طریقِ کار بدل جاتا ہے۔ اور انھوں نے بار بار اس کا اظہار اپنے مکتوبات میں کیا۔ دفترِ اول کے مکتوب ۲۱۲ میں فرماتے ہیں "... ہر چیز را موسمے خاص و وقتے کہ آں چیز دراں موسم موزوں و زیبا مے باشد۔ و بموسم دیگر قبیح و صاحبِ بینش یکے را بر دیگرے قیاس نمے کند"۔ اسی طرح دفترِ دوم کے ایک مکتوب میں ہے "اس وقت متقدمین اور متاخرین کا فتویٰ نے جاری نہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ ہر وقت کے احکام جدا ہیں" (۵۴/۲) اس بنیادی نکتہ کو ان کے سلسلے کے قدیمی بزرگ خوب سمجھتے تھے۔ اور یہ امر محض اتفاقی نہیں۔ کہ جب ہندو احیائیت اور اکبر کی ذہنی مطلق العنانی ختم ہوگئی تو ہندوؤں کے ساتھ مصالحت سے رہنے کا سب سے واضح طریقِ کار مرزا مظہر جانجاناں مجددیؒ نے بتایا۔

خوب سمجھتے تھے۔ انھوں نے اس صفت کو عدل یا عدالت کا نام دیا ہے اور حجۃ اللہ البالغہ ہمعات اور دوسری تصانیف میں اس پر بڑا زور دیا ہے۔ اجتماعی نظام برقرار رکھنے کے لیے انھوں نے اسے "اصل" یا "معیار" مانا ہے اور اس کی بہت سی شاخیں گنائی ہیں۔ ہمعات میں اس کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"خصلت چہارم عدالت است و آں خصلت ہست کہ صدورِ آقامت نظام عادل و سیاست کلّی از وے باشد۔ و وے را شعب بسیار است۔ مثل ادب و کفایت و حریت و سیاست مدنیہ و حسنِ معاشرت و بالجملہ ایں ہمہ یک اصل دارند۔

ایک اور جگہ اس کی توضیح کی ہے (ترجمہ)

عدالت ہی ایک ایسی اساس ہے کہ جب انسانی اطوارِ زندگی مثلاً نشست و برخاست، خواب و بیداری، رفتار و گفتگو اور شکل و لباس وغیرہ میں اس کا لحاظ کیا جائے تو اس کو آداب کہتے ہیں اور جب مالی حیثیت یعنی جمع و خرچ سے متعلق امور میں اس کو پیشِ نظر رکھا جائے تو اس کا نام کفایت ہے اور اگر تدبیرِ منزل میں اس کا صحیح استعمال کیا جائے تو وہ آزادی کہلاتی ہے اور اگر تدبیرِ مملکت میں اس کو بنیاد بنایا جائے تو اس کو سیاست کہتے ہیں اور اگر اس کو باہمی اخوت و محبت اور تعلقات میں اساس بنایا جائے تو اس عدل کو حسنِ معاشرت کا نام دیا جاتا ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ جلد ۲ صفحہ ۲۹)

شیعہ سنی مسئلے پر اہلِ سنت کے نقطۂ نظر کی وضاحت اور تائید کے لیے شاہ صاحب نے بہت کچھ لکھا لیکن اس معاملے میں بھی ان کی رائے اس طرح انتہا پسندی سے دور تھی کہ جب ایک انتہا پسند سنی نے آپ سے پوچھا کہ کیا شیعوں کو کافر سمجھا جائے تو آپ نے یہ نہ مانا اور کہا کہ اس معاملے میں حنفی علما میں اختلاف ہے۔ وہ برہم ہو گیا اور کہنے لگا کہ یہ تو شیعہ ہے! یہ روایت خود شاہ عبدالعزیز کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں: "شخصے از والد ماجد مسئلہ تکفیر شیعی پرسید۔ آنحضرت اختلاف حنفیہ کہ دریں باب است بیان کردند۔ چوں مکرر پرسید، ہماں شنید۔ شنیدم کہ مے گفت شیعہ است۔" یہ واقعہ تو شاہ ولی اللہ کے ساتھ ہوا۔ شاہ عبدالعزیز نے دوسری باتوں کی طرح اس معاملے میں بھی اپنے والد کی پیروی

کی تھی۔ ان کے ساتھ بھی اس طرح کا واقعہ ہُوا۔ ان کا ایک پٹھان شاگرد تھا۔ حافظ آفتاب نام۔ ہمیشہ حاضرِ درس ہوتا تھا۔ ایک دن حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ذکر ہو رہا تھا اور شاہ صاحب نے ان کے "بجان و دل فضائل و مناقب بیان" کیے تو وہ آشنا بگڑا کہ شاہ صاحب کو شیعہ سمجھا۔ اور ان کے درس میں شریک ہونا بند کر دیا۔

مولانا مناظر احسن گیلانی اس مسئلے پر شاہ صاحب کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"ہندوستان میں پہلے تورانی سُنّی۔ پھر ایرانی شیعہ اور آخر میں متشدّد سُنّی رُوہیلوں کی شکل میں داخل ہوئے۔ ان تینوں عناصر کے امتزاج سے تسنّن و تشیع کے سلسلے میں بھی بڑا کام کیا۔ بڑی محنت سے ہزار ہا ہزار صفحات کو پڑھ کر آپ نے چاروں خلفا کے واقعی حالات ازالۃ الخلفا میں ایسے دل نشین طریقے سے مُرتب فرمائے کہ اس کتاب کے پڑھنے کے بعد اگر شیعوں کی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے تو اسی کے ساتھ ان غالی سنیوں کی شدت و تیزی میں بھی کمی پیدا ہوتی ہے' جو محض اس لیے کہ شاہ عبدالعزیز نے تنہا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مناقب کیوں بیان کیے۔ یا شاہ ولی اللہ نے شیعوں کی تکفیر میں فقہا حنفیہ کے اختلاف کو کیوں بیان کیا۔ ان پر بھی شیعیت کا فتوے صادر کر دیتے ہیں اور اس لیے بجائے مناظرے اور مجادلے کے شاہ صاحب نے ایک ایسی راہ دریافت فرمائی۔ جس سے بہت سے فتنوں کا سدِّ باب ہو گیا۔

شریعت اور طریقت :۔ اسی طرح صُوفی اور فقیہ یا صوفی اور مُلّا کے اختلاف کا مسئلہ ہے۔ ہندوستان میں کچھ تو مقامی اثرات سے اور کچھ اس وجہ سے کہ ہندوستان میں اسلام صوفیہ کے ذریعے اشاعت پذیر ہُوا۔ اور شاید اس لیے بھی کہ سو میں سے نوّے مُلّا اسلام کے اس قدر ظاہری پہلوؤں پر زور دیتے ہیں' کہ اصلاحِ باطن کے لیے بلکہ مذہبِ حقہ سے کوئی فیض حاصل کرنے کے لیے تصوف کی ضرورت رہ جاتی ہے۔ ہندوستان میں تصوف نے بڑا فروغ حاصل کیا' لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض صوفیہ کبھی اسلامی احکام کی پابندی نہیں کرتے یا جیسا کہ خود شاہ ولی اللہ نے

یا اب اقبال نے بتایا ہے۔ اصولی باتوں (مثلاً مسئلہ استہلاک یا فنا) میں کبھی کبھی اتنا غلو کرتے ہیں کہ اسلامی نقطۂ نظر یا قومی اور انفرادی فلاح کے اصولوں سے دور ہو جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے تصوف اور فقہ کے درمیان اختلاف کا دروازہ کھلا جو اس وقت شروع ہوا۔ جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے نائب اول خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اور شہر دہلی کے قاضی میں اختلاف بلکہ مخالفت کی نوبت آئی اور اس وقت سے آج تک جاری ہے۔ آج تصوف کے انحطاط اور بعض وقتی اثرات سے تصوف کا پانسہ بہت ہلکا ہو گیا ہے۔ لیکن پچھلی صدی تک کسی ہندوستانی مسلمان کو یہ خیال بھی نہ آ سکتا تھا کہ کسی صوفی سلسلے میں منسلک ہوئے سوا اور کسی مرشد کامل کے بغیر اسلام کی روحانی زندگی سے کوئی حصہ لیا جا سکتا ہے۔ شاہ ولی اللہ کے زمانے میں تصوف زوروں پر تھا۔ ضرورت تھی کہ اس کی اصلاح کی جائے اور اس کے ان اجزا کو جو شرع اور فقہ کے خلاف ہیں، علیحدہ کیا جائے تاکہ عوام و خواص کی روحانی اصلاح کے سلسلے بھی منقطع نہ ہوں اور شرع کی مخالفت بھی جاتی رہے۔ شاہ ولی اللہ اس کام کے لیے بے حد موزوں تھے۔ وہ اسلامی فقہ کی تاریخ سے پوری طرح باخبر اور فقہ کے زبردست عالم تھے۔ اس کے علاوہ وہ باقاعدہ صوفی تھے۔ انھوں نے بیعت کر رکھی تھی اور خود اپنے صوفیانہ مشاہدات اور واقعات کا حال انھوں نے اس طرح لکھا ہے کہ محدود روحانی تجربے والوں کو ان کا یقین بھی نہیں آ سکتا۔ انھوں نے اپنے اس علم اور اپنے ذاتی تجربات کو تصوف اور فقہ کے اختلاف مٹانے کے لیے استعمال کیا۔ ان سے پہلے ان کے والد اور ان کے چچا کا بھی یہی طریقہ تھا۔ مولنا عبید اللہ سندھی ان دونوں بزرگوں کی نسبت لکھتے ہیں۔ "ہر دو بھائیوں کے نظریوں کا ماحصل ایک ایسی شاہراہ بنانے کی سعی ہے، جس پر مسلمان فلاسفر (صوفیہ اور متکلمین) اور فقہا ساتھ ساتھ چل سکیں" ان کوششوں کو شاہ ولی اللہ نے وسعت دی اور تصوف کے مختلف پہلوؤں پر کئی کتابیں لکھیں۔ جن کے متعلق مولنا مناظر احسن گیلانی کہتے ہیں۔ "ان کتابوں سے ملا اور صوفی کے جھگڑوں کا بشرطیکہ انصاف سے کام لیا جائے، خاتمہ ہو جاتا ہے۔ شاہ

ولی اللہ نے تصوّف کے مسائل کو خالص اسلامی تعبیروں میں پیش کر کے مولویوں کی اس بھڑک کو مٹا دیا ہے جو ان بے چاروں میں صوفی و صوفیت کے متعلق پائی جاتی ہے"۔ تصوف اور شرع کے معاملے میں شاہ ولی اللہ کے طرزِ عمل کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ مدرسہ دیوبند میں جہاں شاہ صاحب کے اصولوں کی تھوڑی بہت پیروی ہو رہی ہے فقط علومِ ظاہری کی تعلیم نہیں ہوتی، بلکہ تلامذہ کی رُوحانی اصلاح کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ اساتذہ میں سے اکثر صحیح تصوف اور تزکیۂ نفس کی ضرورت سمجھتے ہیں اور حال میں مدرسے کے سرپرست مولانا اشرف علی تھانوی نے تصوف کے متعلق جو تفصیلی کتاب لکھی ہے۔ وہ بھی فی الحقیقت شاہ ولی اللہؒ کے نقطۂ نظر کا اظہار ہے۔

شاہ ولی اللہ نے نہ صرف صوفیہ اور فقہا کے اختلافات مٹانے کی کوشش کی، بلکہ صوفیہ کے اپنے درمیان جو اختلافات تھے، انھیں بھی کم کرنے میں ساعی ہوئے۔ اس کی ایک نمایاں مثال ان کا مکتوب مدنی ہے۔ جس میں انھوں نے ابن العربی کی "وحدت وجود" اور امام ربانی کی "وحدت شہود" کو ایک دوسرے کے مطابق ثابت کیا ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے رُوحانی اختلافات مٹانے کے لیے یہ بھی کیا کہ اگرچہ آپ کو زیادہ تعلق خاطر طریقہ نقشبندیہ باقویہ سے تھا لیکن بیعت کے وقت آپ چاروں خانوادوں کے نام لیتے۔ تذکرۃ الرشید میں مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کا ارشاد درج ہے "ہمارے حضرات بیعت کے وقت چاروں مشائخ کا نام لیتے ہیں تاکہ سب سے برابر عقیدت رہے اور سب بزرگوں کے فیض سے مستفیض ہوں۔ اور چاروں خانوادوں کے نام لینے کا طریقہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے زمانے سے نکلا ہے"۔

اختلاف بین المذاہب:۔ اس کے علاوہ فقہی مذاہب یعنی حنفی۔ شافعی۔ مالکی۔ حنبلی طریقوں کے اختلاف کا مسئلہ ہے۔ ہندوستان میں تو اس مسئلے نے بہت پیچیدہ صورت اختیار نہیں کی، لیکن ہندوستان سے باہر اسلامی ممالک میں اس پر سخت اختلافات رونما ہوئے ہیں۔ ہمارے ایک دوست کا بیان ہے کہ چند سال ہوئے وہ اسپین ہوتے ہوئے اسپینی مراکش میں بھی بغرضِ سیر و سیاحت چلے گئے۔ ایک مسجد میں گئے تو امام نے

پوچھا "کَیْفَ مَذْهَبُكُمْ" "تمھارا مذہب کیا ہے"۔ ان بچاروں نے مذہب کا مطلب ہندوستانی محاورہ کے مطابق دین لیا اور کہا کہ مسلمان ہوں۔ امام صاحب نے پھر اپنا سوال دُہرایا اور بالآخر ایک اور ساتھی کو ترجمانی کرنی پڑی۔ انھوں نے اپنا فقہی مذہب حنفی بتایا تو امام صاحب اتنے مایوس ہوئے کہ شاید ان صاحب کے یہودی ہونے سے بھی نہ ہوتے!

شاہ ولی اللہ نے اس مسئلے میں بھی انصاف اور اعتدال اور سلیم الطبعی سے کام لیا ہے۔ وہ خواجہ محمد امین کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں "سوم سوال آنکہ عمل تو در مسائل فقہیہ بر کدام مذہب است۔ گفتم بقدر امکان جمع می کنم در مذاہب مشہورہ" یعنی مختلف مذاہب کو ایک دُوسرے پر منطبق کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم حنفی طریقے پر ہوئی تھی۔ ان کے والد اور چچا دونوں حنفی تھے، لیکن ان کے چہیتے اُستاد شیخ ابوالطاہر مدنی شافعی تھے۔ شاہ صاحب نے دونوں سے فیض حاصل کیا۔ اور وہ دونوں طریقوں کی خوبیوں اور ان کے اختلاف کی وجہ سمجھتے تھے اور جانتے تھے کہ ان اختلافات کو نمایاں کرنے کی نہ کوئی ضرورت ہے نہ اس میں کوئی مصلحت ہے۔

شاہ صاحب کا بس چلتا تو وہ چار مذاہب فقہی یا کم از کم دو مشہور طریقوں کو ملا کر ایک کر دیتے۔ تفہیمات میں لکھتے ہیں "میرے دل میں ایک خیال ڈالا گیا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے مذہب اُمت میں سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ سب سے زیادہ پیرو بھی ان دو کے پائے جاتے ہیں اور تصنیفات بھی انھی مذاہب کی زیادہ ہیں.... اس وقت جو امرِ حق ملاءِ اعلےٰ کے علوم سے مطابقت رکھتا ہے، وہ یہ ہے کہ دونوں کو ایک مذہب کی طرح کر دیا جائے۔ دونوں کے مسائل کو حدیثِ نبوی کے مجموعوں سے مقابلہ کر کے دیکھا جائے۔ جو کچھ ان کے موافق ہو اس کو رکھا جائے اور جس کی کچھ اصل نہ ہو اس کو ساقط کر دیا جائے۔ پھر جو چیزیں تنقید کے بعد ثابت نکلیں، اگر وہ دونوں میں متفق علیہ ہوں، تو مسئلہ میں دونوں قول تسلیم کیے جائیں۔"

جدید علم الکلام کی ابتدا: یہی حال علم الکلام کے متعلق ہے۔ آپ عام معتزلین اور متکلمین کے مخالف تھے اور کئی جگہ ان کے خلاف زور سے اظہارِ رائے کیا ہے۔

مثلاً ایک جگہ کہتے ہیں:۔

"در علوم شرعیہ پیشنیاں چیزہا آوردند۔ کہ مقصود در علوم پیشینیاں نبود بلکہ در سلف امت ازاں اثرے یافتہ نمے شود۔ مجموع کثیرہ فلسفہ و حکمت یونانیاں را با علم شریعت آمیختند و اصل اصول کتاب را از دست دادہ تا آنکہ ظاہر شریعت بنا بر کثرت ایراد و اصراف و تغلیط چیزے دیگر شدہ علوم اصول دیں را کہ افضل علوم است۔ بہ بیں کہ متکلمین در آں چہ صناعہ آفریدند۔ و در وادیِ جدل و تعمق تا بکجا رسیدند؟ حالانکہ سلف امت نکیر عظیم داشتند بریں جنس کلام و آں را خارج از شریعت پنداشتند۔"

لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایک لحاظ سے آپ اسلامی ہندوستان کے سب سے پہلے متکلم ہیں۔ عباسیہ دور میں علم کلام اس لیے وجود میں آیا کہ اسلامی خیالات کو یونانی فلسفہ کے مطابق ثابت کریں اور دورِ جدید میں سر سید اور ان کے رفقا کی کوشش تھی کہ وہ اسلامی مذہب و فلسفہ کو جدید سائنس اور تجربہ سے ہم آہنگ قرار دیں۔ شاہ صاحب اس قسم کے متکلمین میں سے نہیں لیکن اسلامی تعلیمات کو انسانی دُنیا کے بنیادی واقعات اور اصولوں سے ہم آہنگ ثابت کرنے کی کوشش ضرور ان کی تصانیف میں ہے۔ ان کی مشہور تصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں یہ کوشش خاص طور پر نمایاں ہے۔ اس میں انھوں نے اسلامی احکام کی مصلحتیں بیان کر کے ثابت کیا ہے کہ یہ احکام فلاح انسانی کے لیے بے حد مفید ہیں۔ اور ان کی غرض و غایت ہی انسانی اصلاح و تہذیب ہے شاہ صاحب نے اس کتاب اور دوسری تصانیف میں کئی ایسی باتیں کہی ہیں، جن سے متکلمین کی ترجمانی ہوتی ہے۔ تقلید کے خلاف انھوں نے بڑی سختی سے اظہار رائے کیا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں (ترجمہ) "تقلید سے میری جبلت اور سرشت انکار کرتی ہے اور بالکلیہ اس سے بھڑکتی ہے۔" ایک اور جگہ عام علما و مقلدین پر بالواسطہ طنز کرتے ہیں۔ "جمعے کہ سرمایہ علم ایشاں شرح وقایہ و ہدایہ باشد۔ کجا ادراک ایں سر دقیق توانند کرد۔" اس کے علاوہ حجۃ اللہ البالغہ کے دیباچے میں شاہ صاحب کا یہ مشہور فقرہ (ترجمہ)

"مصطفوی شریعت کے لیے وقت آگیا ہے کہ برہان اور دلیل کے پیراہنوں میں

ملبوس کر کے اسے میدان میں لایا جائے۔"

ایک نئے علم الکلام کا پیغام نہیں تو کیا ہے؟

شاہ ولی اللہ کے دیدہ ور معاصرین بھی سمجھتے تھے کہ انھوں نے ایک نئے طریق کار کا آغاز کیا تھا خاتم الاولیا شاہ غلام علیؒ اُن کی نسبت کہتے تھے: "ایشاں بسیار بزرگ بودند۔ و طریق نو آوردہ اند" (ملفوظات)

حکیم الامت کے علمی کارنامے

ان احسانات اور انداز خیال کی خوبیوں کے علاوہ اصل چیز شاہ ولی اللہ کا علمی پایہ ہے۔ وہ نہ صرف ہندوستانی علما کے صدر نشین ہیں بلکہ اسلامی دُنیا کی اہم ترین ہستیوں مثلاً امام غزالی یا علامہ ابن تیمیہ کے پہلو بہ پہلو بیٹھنے کے مستحق ہیں۔ ان کا ترجمۃ القرآن ہی ایک ایسا کارنامہ ہے کہ اگر وہ اور کچھ نہ کرتے تب بھی انھیں ہمارے علمی محسنوں کی صفِ اوّل میں جگہ ملتی لیکن انھوں نے اس پر اکتفا نہیں کی انھوں نے علوم اسلامی کی ہر شاخ مثلاً حدیث، تفسیر، تاریخ، فقہ، اسرارِ دین، تصوف کو لیا اور ان میں بلند پایہ اور بنیادی کتابیں تصنیف کر کے ان علوم کی ایک مستقل لائبریری یادگار چھوڑی۔ مولانا مودودی ایک مضمون میں شاہ ولی اللہ کی نسبت لکھتے ہیں:-

"انھوں نے اسلام کے پورے فکری، اخلاقی، شرعی اور تمدنی نظام کو مرتب صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ وہ کارنامہ ہے جس میں وہ اپنے تمام پیشروؤں سے بازی لے گئے ہیں۔ اگرچہ ابتدائی تین چار صدیوں میں بکثرت ایسے ائمہ گزرے ہیں جن کے کام کو دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے ذہن میں اسلام کے نظام حیات کا مکمل تصور رکھتے ہیں۔ اور اسی طرح بعد کی صدیوں میں بھی ایسے محققین ملتے ہیں، جن کے متعلق یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اس تصور سے خالی تھے، لیکن ان میں سے کسی نے بھی جامعیت اور منطقی ترتیب کے ساتھ اسلامی نظام کو بحیثیت ایک نظام کے مرتب کرنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ یہ شرف شاہ ولی اللہ ہی کے لیے مقدر ہو چکا تھا کہ اس راہ میں پیش قدمی کریں۔"

مولانا موصوف شاہ صاحب کے مرتب کردہ نظام اسلامی کی تفصیلات دے کر لکھتے ہیں:-

"پھر وہ نظام شریعت، عبادات، احکام اور قوانین کو پیش کرتے ہیں اور ہر ایک چیز کی حکمتیں سمجھاتے چلے جاتے ہیں۔ اس خاص مضمون پر جو کام انھوں نے کیا ہے، وہ اسی

نوعیت کا ہے جو ان سے پہلے امام غزالیؒ نے کیا تھا اور قدرتی بات ہے کہ وہ اس راہ میں امام موصوف سے آگے بڑھ گئے ہیں۔

ہماری قومی زندگی میں شاہ ولی اللہ کا مرتبہ: ۔شاہ ولی اللہؒ قومی زندگی کے ایک بڑے نازک دور میں پیدا ہوئے[1]۔ ان کا ظہور اس زمانے میں ہوا' جب اسلامی حکومت کی بنیادیں اکھڑ رہی تھیں۔ اور اس ملک میں صدیوں جاہ و جلال سے حکومت کرنے کے بعد مسلمان اس قدر آرام طلب اور کمزور ہو گئے تھے کہ وہ مرہٹوں اور سکھوں کے مقابلے میں تساہل اختیار کرتے تھے۔ شاہ صاحب کو اس صورت حالات کا افسوس ہوتا ہوگا' لیکن جو شخص عملی کام کرنا چاہے' اسے اپنا دائرہ عمل محدود اور معین کرنا پڑتا ہے۔ شاہ صاحب اپنے آپ کو اس امر کے لیے موزوں نہیں سمجھتے تھے کہ وہ عملی زندگی میں دخل انداز ہو کر واقعات کی رَو کو روکیں لیکن جس کام کے لیے وہ موزوں تھے اور جو کچھ کم ضروری نہ تھا (یعنی رسول اکرمؐ کی خلافت باطنیہ) اس کے لیے انھوں نے اپنی زندگی وقف کر دی۔ وہ ان عیوب اور کوتاہیوں سے پوری طرح واقف تھے جو مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں گھر کر گئی تھیں اور جن کی وجہ سے انھیں یہ روز بد دیکھنا نصیب ہو رہا تھا۔ شاہ صاحب نے انھیں پوری طرح بے نقاب کرنے کی کوشش کی تاکہ ان کا ازالہ ہو جائے۔ اس کے علاوہ انھوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کے ذہنی اور دینی اختلافات مٹانا ضروری ہے تاکہ وہ صحیح معنوں میں ایک جماعت بن جائیں اور آنے

---

[1] جن زہرہ شکن حالات سے شاہ ولی اللہ کو سابقہ پڑا' ہندوستان میں حکومتِ اسلامی کے آغاز کے بعد کبھی رُونما نہ ہوئے تھے۔ شاہ صاحب پر جو گزرتی ہوگی اس کا تصور کرنا مشکل نہیں۔ لیکن ٹھوس رُوحانی تربیت اور بلندیٔ حوصلہ اور سلیم الطبعی کا فیض ہے کہ ان حالات کی ایک جھلک ان کی تصانیف میں نہیں۔ کوئی شکایت نہیں' کوئی رونا نہیں' کہ دُوسروں کی ہمتیں بھی کمزور ہوں اور واقعہ یہ ہے کہ جن کی صلاحیتیں تمام تر تعمیری ہوں۔ ان کے پاس آنسو بہانے کے لیے وقت کہاں؟ نتیجہ یہ کہ اپنی خاموش محنت سے قوم کے گرد وہ ایسی دیوار تعمیر کر گئے' جس پر زمانے کے تھپیڑوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔

والی مصیبتوں کا مل کر مقابلہ کر سکیں۔ ان کی تمام کوششیں اس پر منعطف رہی ہیں۔ اور اگرچہ بہ تقاضائے فطرت انسانی تھوڑے بہت اختلافات ہمیشہ رہیں گے، لیکن شاہ صاحب نے قرآن، حدیث، فقہ، تصوف میں سالہا سال کی محنت کے بعد ایک ایسا دستور العمل مرتب کر دیا، جس سے اختلافات کی گنجائش تھوڑی ہے اور جس پر آج ہندوستان کے سمجھنے والے اور سوچنے والے علما، صوفیہ، فقہا اور عام مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد متفق ہے۔

خوش قسمتی سے اسلام میں ملک ملک کے لیے علٰحدہ مذہبی نظام (National church) نہیں ہوتا لیکن تاریخی، نسلی، لسانی، اثرات پھر بھی کارفرما رہتے ہیں اور مختلف ممالک میں مختلف طریقے بر سرِ کار آتے ہیں۔ ایران میں شیعیت نے عروج پایا۔ نجد میں وہابیت نے۔ کسی ملک میں شافعی فقہ رائج ہے۔ کسی میں حنفی اور کسی میں حنبلی۔ اگر اس نقطۂ نظر سے ہندوستانی مسلمانوں کے عقاید، فقہی روایات اور مذہبی میلانات دیکھے جائیں تو یہ نظر آئے گا کہ جو مذہبی نظام اسلامی ہندوستان میں سب سے زیادہ عام ہے، جسے بنگال میں مولوی کرامت علی جونپوری، بہار میں صادق پوری خاندان، اور شمالی ہندوستان میں شاہ عبد العزیز، مولانا سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے رائج کیا۔ اور جو آج دار العلوم دیوبند کی بدولت خواص سے گزر کر عوام کو متاثر کر رہا ہے۔ اسے شاہ ولی اللہؒ نے ترتیب دیا اور اگر کسی کو صحیح معنوں میں امام الہند یعنی اسلامی ہندوستان کے خاص مذہبی نظام کا مرتب کہا جا سکتا ہے تو وہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی ذاتِ بابرکات ہے۔[1]

---

[1] اس بیان سے پروفیسر محمدؐ فرمان نے خیال کیا ہے کہ اس سے شاہ صاحب کی حضرت مجددؒ پر فوقیت متصور ہوتی ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ تمام عالمِ اسلام کے مجدد الف ثانی کا مرتبہ ایک خطہ کی خاص ضروریات پوری کرنے والے سے بلند ہونا چاہیے۔ ہمارا مقصد شاہ صاحب کے طریق کا اور ان کے خاص مقام کی وضاحت ہے۔ ان کی فوقیت ثابت کرنا نہیں۔

حکیم الامت کو بھی اپنے کام کی اہمیت اور علو مرتبہ کا احساس تھا۔ الجزء اللطیف میں کہتے ہیں ؎

کہ باور دارد ایں حرف از فقیرِ خاکسارِ من — کہ ظلِّ عالمِ قدس است انکار و قبولِ او
ندارد باطنش از خویش آئینہ صفت رنگے — طلسمِ حیرت آلود است تمکین و فضولِ او
شعاعِ آفتاب از راہِ ایں روزن ہمی ریزد — بجز ایں نکتہ نتواں بست مضمونِ وصولِ او!

حکیم الامت کے فرزندانِ ارجمند

شاہ ولی اللہ صاحب نے کئی بلند پایہ کتابیں یادگار چھوڑیں، لیکن جس طرح وہ اولادِ معنوی میں خوش قسمت تھے، اسی طرح اولادِ صلبی میں بھی خوش نصیب تھے۔ اُن کے چار بیٹے علم و فضل میں ممتاز ہوئے۔ اور انھوں نے اپنے والد ماجد کے کام کو جاری رکھا۔
شاہ صاحب کی دو دفعہ شادی ہوئی۔ پہلی مرتبہ اپنے ماموں کی صاحبزادی سے شادی کی، جن سے مولوی شیخ محمد صاحب پیدا ہوئے۔ جو لاولد فوت ہوئے۔ زوجۂ اوّل کے انتقال کے بعد آپ کی شادی سونی پت کے سید ثناء اللہ صاحب کی دختر نیک اختر، بی بی ارادہ (کذا) سے ہوئی۔ ان سے پانچ بچے ہوئے۔ ایک صاحبزادی بی بی اُمتہ العزیز (جن کا سلسلہ مقالاتِ طریقت کی تصنیف ۱۲۹۲ھ تک قائم تھا) اور چار فرزندان گرامی[1]

شاہ عبدالعزیز

دوسری شادی سے جو اولاد ہوئی، اس میں شاہ عبدالعزیز آپ کے بڑے صاحبزادے تھے۔ وہ ۱۱۵۹ھ (۱۷۴۶ء) میں پیدا ہوئے اور اپنے والد اور ان کے ایک ممتاز شاگرد سے علم حاصل کر کے سترہ برس کی عمر میں والد کی وفات پر ان کے جانشین ہوئے۔ آپ نے ساٹھ سال تک درس دیا اور علم حدیث سے، جسے شاہ ولی اللہ نے از سرِ نو ہندوستان میں رائج کیا تھا۔ اُس کا

---

[1] یہ معلومات مقالاتِ طریقت سے اخذ کی گئی ہیں۔

فیض ملک میں عام کیا۔ ہندوستان کے اکثر محدثین کا سلسلۂ اسناد آپ تک اور آپ کے ذریعے شاہ ولی اللہ تک پہنچتا ہے۔ "تذکرۂ علمائے ہند میں لکھا ہے۔" بالجملہ وے جامع علوم بلکہ آیتے از آیاتِ الٰہی بود" اور حقیقت یہ ہے کہ آج ہم آپ کی عظمت کا اندازہ آپ کی تصانیف سے صحیح طور پر نہیں کر سکتے۔ آپ درس و تدریس اور ارشاد و ہدایت میں ہمہ تن مشغول رہے۔ اس لیے آپ کو تصنیف و تالیف کا بہت وقت نہیں ملا۔ لیکن آپ کی عظمت کا اندازہ کچھ تو آپ کے تلامذہ کی تعداد اور برگزیدگی سے ہو سکتا ہے اور کچھ معاصرانہ تذکروں اور تاریخی کتابوں سے۔ جن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اپنے زمانے میں آپ کی کس قدر عزت تھی۔ آپ کو کلکتہ میں کمپنی کے مدرسے کے لیے علامہ تفضل حسین کی وساطت سے بلایا گیا۔ دہلی میں آپ کے روزگار کا کوئی مستقل سلسلہ نہ تھا۔ لیکن پھر بھی آپ نے سادہ زندگی اور علوم اسلامی کی اشاعت زیادہ عزیز سمجھی۔ آپ کے شاگرد بے شمار تھے۔ ذیل میں چند نام درج کیے جاتے ہیں۔ جن میں سے ہر ایک صاحبِ علم و فضل تھا اور آپ سے علم حاصل کر کے خود فیض کا سرچشمہ بنا۔ شاہ رفیع الدین۔ شاہ محمد اسحٰق صاحب۔ مفتی صدرالدین دہلوی۔ شاہ غلام علی صاحب۔ مولوی مخصوص اللہ صاحب۔ مولوی عبدالحی صاحب۔ مولنا میر محبوب علی صاحب۔ مفتی الٰہی بخش صاحب کاندھلوی۔ مولنا فضل حق صاحب خیرآبادی۔ مولنا سید احمد بریلوی۔

آپ کی معلومات بے حد وسیع تھیں اور اسلامی علوم تک محدود نہ تھیں۔ آپ خود فرماتے تھے کہ جو علوم میں نے مطالعہ کیے ہیں اور اپنی استعداد کے مطابق مجھے یاد بھی ہیں، ان کی تعداد ایک سو پچاس ہے۔ ان میں سے نصف کے قریب ایسے علوم تھے جو امتِ اسلامی کی تخلیق تھے اور باقی نصف دوسری اُمتوں کے۔

اور تو اور آپ کو فنِ موسیقی کے علمی پہلوؤں سے بھی واقفیت تھی اور مختلف گتوں اور راگوں کو پہچانتے تھے۔ آپ کی عظمت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ نہ صرف امور مذہبی اور حدیث و تفسیر اور فقہ میں آپ کی رائے کو بڑی وقعت سے دیکھا جاتا

تھا، بلکہ ادبی معاملات میں بھی آپ کی رائے کی بڑی اہمیت تھی۔ چنانچہ ناظرین آبِ حیات کو یاد ہو گا کہ جب شاہ نصیر دہلوی نے ذوق کی غزل درست کرنے سے انکار کر دیا تو ذوق دہلی کے سب اساتذہ کو چھوڑ کر آپ ہی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور جب آپ نے اس کی غزل کے متعلق تسلی کر دی تو ذوق نے کسی سے اصلاح لیے بغیر بے دھڑک اس غزل کو مشاعرے میں پڑھا۔

اس کے علاوہ سید ناصر نذیر فراق نے لال قلعہ کی ایک جھلک میں لکھا ہے :۔

"کون نہیں جانتا کہ حضرت شاہ نصیر صاحب دہلوی، اکبر شاہ ثانی اور ابوظفر بہادر شاہ اور شیخ ابراہیم ذوق کے اُستاد تھے۔ جب شاہ نصیر صاحب کا ذوق سے دل کھٹا ہو گیا اور اصلاح موقوف ہوئی تو ذوق ہر جمعہ کو مولانا عبد العزیز صاحب کے وعظ میں جانے لگے اور وعظ بہت غور سے سُننے لگے۔ کسی دوست نے اس کا سبب پوچھا تو ذوق نے کہا۔ اُستاد مجھ گنہگار سے ناخوش ہو گئے۔ شعر و سخن میں اصلاح ملتی نہیں۔ اس کا بدل میں نے یہ نکالا ہے۔ کیونکہ مولانا عبد العزیز صاحب اُردو زبان دانی میں شاہ نصیر سے کسی طرح کم نہیں۔ ان کے بیان اور گفتگو کو سُنتا ہوں اور اُردو کے محاورے روزمرہ یاد کرتا ہوں۔ اس لیے کہ شاہ عبد العزیز صاحب اپنے والد ماجد کے حکم کے بموجب اُردو زبان سیکھنے کے لیے خواجہ میر درد صاحبؒ کی خدمت میں بچپن سے حاضر ہوتے تھے اور چُپ چاپ بیٹھے ہوئے آپ کی تقریر کو سُنا کرتے تھے اور محاورات کو دل ہی دل میں چُنا کرتے تھے۔ مولانا ولی اللہ صاحب اپنے بچوں سے کہا کرتے تھے۔ جس طرح اصولِ حدیث اور اصولِ فقہ فن ہے اسی طرح اصولِ زبان بھی فن ہے اور اُردو زبان کے مُوجد اور مجتہد خواجہ میر درد صاحب ہیں آپ کی صحبت کو اس فن کے واسطے سے غنیمت سمجھو۔ کیونکہ خواجہ صاحب پکے یار ہیں چنانچہ شاہ عبد القادر صاحب خاص طور پر میر درد صاحب کے شاگرد تھے۔

معتقدوں کی نظروں میں تو مولوی صاحب فقط ایک حلیم الطبع، مرنجاں مرنج اور مسکین عالم تھے، جنھیں تعبیرِ خواب میں اور جن بھوتوں کے نکالنے میں خاص ملکہ تھا۔ لیکن آپ کے ملفوظات دیکھنے سے خیال ہوتا ہے کہ آپ بڑے زندہ دل

اور حاضر جواب[1] تھے۔ آپ کے زمانے میں شیعہ سُنّی مباحثے زوروں پر تھے اور عیسائیوں اور مسلمانوں کے مباحثے شروع ہو گئے تھے۔ آپ کے پاس بھی لوگ اپنے اعتراض اور سوال لے کر آجاتے، جنھیں آپ بعض اوقات ٹھوس اور متین دلائل سے رد کرنے کی بجائے اس طرح چٹکیوں میں اُڑا دیتے کہ معترض قائل بھی ہو جاتے اور لاجواب بھی۔ چند ایک نمونے ملاحظہ ہوں:۔

لطیفہ:۔ ایک دفعہ ایک پادری صاحب شاہ صاحب کی خدمت میں آئے اور سوال کیا کہ کیا آپ کے پیغمبر حبیب اللہ ہیں؟ آپ نے فرمایا ہاں، وہ کہنے لگا، تو پھر اُنھوں نے بوقتِ قتلِ امام حسین فریاد کی۔ یا یہ فریاد سُنی نہ گئی؟ شاہ صاحب نے کہا کہ نبی صاحبؐ نے فریاد تو کی، لیکن انھیں جواب آیا کہ تمھارے نواسے کو قوم نے ظلم سے شہید کیا ہے۔ لیکن ہمیں اس وقت اپنے بیٹے عیسٰیؑ کا صلیب پر چڑھنا یاد آ رہا ہے۔

لطیفہ:۔ ایک شخص آپ کے پاس کسی مصوّر کی کھینچی ہوئی ایک تصویر لایا اور کہنے لگا کہ یہ تصویر جناب رسالت مآبؐ کی ہے۔ اسے کیا کرنا چاہیے؟ آپ نے کہا کہ حضرت پیغمبر صاحبؐ باقاعدہ غسل کرتے تھے۔ اس تصویر کو بھی غسل دے کر دھو ڈالو۔

لطیفہ:۔ ایک دفعہ ایک ہندو گاڑیبان آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور کہنے لگا کہ میری ایک بات بتلاؤ کہ خدا ہندو ہے یا مسلمان؟ آپ نے فرمایا کہ جو میں کہوں اُسے خوب سوچ لینا۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر خدا ہندو ہوتا، تو گئو ہتیا کبھی نہ ہوتی۔

لطیفہ:۔ ایک شخص نے آپ سے مسئلہ پوچھا کہ مولوی صاحب، یہ طوائف یعنی کسبی عورتیں مرتی ہیں تو ان کے جنازے کی نماز پڑھنی درست ہے یا نہیں؟ آپ نے فرمایا کہ جو مرد ان کے آشنا ہیں، ان کی نمازِ جنازہ پڑھتے ہو یا نہیں؟ اس نے عرض کیا کہ

---

[1] مقالات طریقت سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ "مزاج میں نہایت خوش طبعی اور ہر بات کا مذاق تھا۔" آپ کی بدنی حالت کی نسبت، اس کتاب میں لکھا ہے "دراز قد۔ لاغر اندام۔ گندم رنگ۔ کلاں چشم۔ صاف جسم تھے۔" لیکن بعض سخت بیماریوں سے سابقہ پڑا۔ اور بینائی جاتی رہی۔

ہاں پڑھتے ہیں۔ حضرت نے کہا تو پھر ان کی بھی پڑھ لیا کرو!!

ہنود کے راہنماؤں کی نسبت، مرزا مظہر جانجاناں کے خیالات ہم آگے چل کر درج کریں گے لیکن شاہ عبدالعزیز صاحب نے سری کرشن کے متعلق جو رائے ظاہر کی۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ اس معاملے میں وہ بھی مرزا صاحب کے ہم خیال تھے۔ آپ سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ حضور کنہیا جی کے حق میں کیا فرماتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ بہتر تو یہ ہے کہ ان کے حق میں چُپ ہی رہا جائے، لیکن بھاگوت گیتا سے، جو ہندوؤں کی ایک معتبر کتاب ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کنہیا جی اولیا میں سے تھے۔

مذہبی معاملات میں کئی اہم امور پر آپ کے فتوے یادگار ہیں۔ مثلاً جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے دہلی کالج قائم کیا اور لوگ وہاں تعلیم حاصل کرنے کے متعلق متامل تھے تو آپ نے ان سب کے شبہات کو رفع کیا اور علی گڑھ کالج قائم ہونے سے پچاس سال پہلے انگریزی درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرنے کا فتوےٰ دیا۔ اسی طرح اور کئی معرکۃ الآراء فتوے ہیں، جن میں انگریزوں بلکہ تمام غیر مسلموں کی مناسب نوکری اور دارالحرب میں حربی کافروں سے سود لینے کے جواز کے فتوے ہیں۔ آپ کے زمانے میں شیعہ سُنّی اختلافات زوروں پر تھے۔ آپ نے ان مسائل پر عربی فارسی میں کتابیں لکھیں۔ ان میں سے تحفہ اثنا عشریہ ایک مناظرانہ کتاب ہے، لیکن مخالفین بھی اس کی متانت، تہذیب اور شائستگی کے مدّاح ہیں۔ ان کے علاوہ تفسیر عزیزی میں آپ نے قرآن مجید کے پہلے سوا پارے اور آخری دو پاروں کی تفسیر فارسی میں لکھی ہے۔ اصولِ حدیث میں عجالۂ نافعہ اور تاریخ حدیث میں بستان المحدثین اور چند حواشی اور شرح کی کتابیں آپ سے یادگار ہیں۔ آپ کے فتووں کا مجموعہ بھی چھپ چکا ہے۔

تحفہ اثنا عشریہ

تاریخی حیثیت سے آپ کی سب سے اہم کتاب تحفہ اثنا عشریہ ہے۔ اس کی صحیح اہمیت کا اندازہ ہمیں اس وقت ہُوا۔ جب شیعہ علما کے حالات پڑھے اور دیکھا کہ کس کثرت سے انھوں نے اس کی تردید میں قوتِ بیان صرف کی ہے۔ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء سے پہلے اکابر شیعہ علما کے

سامنے سب سے بڑا مسئلہ اس کتاب کے اثر کو زائل کرنا تھا اور اس میں بہتوں نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ علماے لکھنؤ میں سب سے ممتاز نام مولوی دلدار علی مجتہد اوّل کا ہے۔ انھوں نے چھ کتابیں اور رسالے شاہ عبدالعزیز کی تحریروں کی تردید میں لکھے۔ صوارم الالہیات، حسام الاسلام، احیاے السنہ میں تحفہ اثنا عشریہ کے ان ابواب کا جواب ہے جو بالترتیب الٰہیات، نبوت اور معاد وحجت کے متعلق ہیں۔ رسالہ ذوالفقار تحفہ کے باب دوازدہم کے جواب میں ہے۔ خاتمۂ کتاب صوارم میں اثباتِ امامت کا ذکر ہے اور رسالہ غیبت میں شاہ صاحب کے اقوال دربارہ غیبت کا رد ہے۔ علامہ حکیم مرزا محمد کامل دہلوی نے تحفہ کے جواب میں نہ صرف نزہت اثنا عشریہ لکھی، بلکہ ان مباحث سے عہدہ برآ ہونے کے لیے جو تحفہ کی اشاعت سے پیدا ہوئے تھے انھوں نے اپنی عمر صرف کر دی۔ اسی طرح ہم مفتی محمدؐ قلی خاں کنتوری کا ذکر مولوی دلدار علی کے تلامذہ کے ضمن میں کریں گے۔ وہ ایک مدّت تک میرٹھ میں مفتیِ عدالت رہے۔ پھر ملازمت ترک کر کے لکھنؤ میں جا مقیم ہوئے اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے۔ ان کا وظیفۂ حیات تحفہ اثنا عشریہ کی تردید معلوم ہوتا ہے۔ تحفہ کے باب ہشتم کا جواب اُنھوں نے تشئید المطاعن و کشف الضغائن میں دیا۔ "و آں کتابیست نہایت مبسوط در دو مجلد کبیر۔" سیف ناصری میں بابِ اوّل کا جواب ہے۔ تقلیب المکائد میں باب دوم کا، برہان سعادت میں باب ہفتم کا۔ (کوئی تیس ہزار سطروں کی کتاب ہو گی) اور مصارع الافہام میں باب یازدہم کا۔ ان چار مشہور شیعہ علما کی کوششوں کے متعلق یہ معلومات نجوم السما سے حاصل ہوتی ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ اور کئی کتابیں تھیں جو تحفہ کی تردید میں لکھی گئیں مثلاً مولوی دلدار علی صاحب کے جانشین سلطان العلماء سیّد محمدؐ صاحب کی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ انھوں نے تحفہ اثنا عشریہ کی تردید میں رسالے لکھے۔ ان مباحث کی گونج دُور دُور تک پہنچی۔ مثلاً آسودگانِ ڈھاکہ میں حکیم حبیب الرحمان ڈھاکہ کے ایک مشہور رئیس میر اشرف علی کی نسبت لکھتے ہیں کہ جب کتاب تحفہ اثنا عشریہ یہاں پہنچی تو میر اشرف علی نے دس ہزار روپیہ تحفہ کا جواب لکھنے کے لیے عراق بھیجا تھا۔ یہ میر اشرف علی

فارسی کے مشہور شاعر سید محمدؐ آزاد جہانگیری اور اُردو کے مشہور ادیب نواب سید محمدؐ کے پردادا تھے، لیکن حکیم حبیب الرحمٰن کے بیان کے مطابق یہ دونوں صاحبان سُنی ہو گئے تھے۔

تحفہ اثنا عشریہ فی الحقیقت ایک معرکۃ الآرا کتاب تھی اور شاہ عبدالعزیز نے اس کی تالیف میں بے حد محنت اور جانفشانی سے کام لیا۔ اس سے پہلے مختلف شیعہ سُنی مسائل پر کتابیں تصنیف ہوئیں۔ خود شاہ ولی اللہ صاحب نے قرۃ العین فی تفضیل الشیخین، ازالۃ الخفا اور بعض رسائل میں ان مسائل سے بحث کی تھی، لیکن ایسی جامع اور مانع کتاب کوئی نہ تھی۔ فی الحقیقت تحفہ اثنا عشریہ شیعہ سُنی مسائل کا ایک انسائیکلوپیڈیا ہے۔ کتاب کا مطبوعہ نولکشوری ایڈیشن بڑی تقطیع کے تقریباً ساڑھے چھ سو صفحوں پر محیط ہے۔ لیکن چونکہ بیان میں بڑے ایجاز و اختصار سے کام لیا گیا ہے، اس لیے مطالب و معانی اور دلائل و حوالے بے شمار آ گئے ہیں۔ کتاب کے جامع و مانع ہونے کے علاوہ اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ روایات و بیانات کے انتخاب میں اصولِ حق کو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا ہے۔ شیعہ مذہب اور خیالات کے بیان میں فقط مستند اور معتبر شیعہ کتب پر انحصار کیا گیا ہے اور تواریخ و تفسیر میں سے فقط انھی چیزوں کو چُنا ہے۔ جن پر شیعہ سُنی دونوں فریق متفق ہیں۔ کتاب کی زبان اور طرزِ بیان بھی متین اور مہذبانہ ہے۔

کتاب کے بارہ باب ہیں۔ پہلا باب شیعہ مذہب کی ابتدا اور اس کے مختلف فرقوں کے آغاز کے متعلق ہے۔ دوسرے طویل باب میں ان طریقوں اور حیلوں کو گنایا گیا ہے۔ جن سے دوسروں کو گمراہ کیا جاتا ہے اور اپنے خیالات کی ترویج و ترقی کا انتظام ہوتا ہے۔ بابِ سوم میں اسلافِ شیعہ و علماء و کتب ایشاں کا بیان ہے۔ الواب پنجم، ششم اور ہفتم بالترتیب۔ الٰہیات۔ نبوّت اور امامت کے متعلق ہیں۔ بابِ دہم میں خلفائے ثلاثہ اور دُوسرے صحابہؓ کے خلاف الزامات کا بیان ہے۔ بابِ یازدہم میں شیعہ فرقے کے خیالات اور خصوصیات کا تجزیہ ہے۔ آخری باب تولّا اور تبرّا کے متعلق ہے۔

شروع میں شاہ صاحب نے کتاب کی وجہ تالیف بتائی ہے اور لکھا ہے کہ ہمارے زمانے اور ہمارے شہروں میں شیعہ مذہب کی اشاعت کی اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ شاید ہی کوئی گھر ہو گا جس میں ایک دو آدمی اس مذہب کے قائل اور شیعہ خیالات سے متاثر نہ ہوں (شاہ صاحب کے اپنے گھر میں ان کے قریبی عزیز اور مشہور فارسی شاعر میر قمر الدین منت نے شیعہ مذہب اختیار کر لیا تھا) لیکن چونکہ یہ صورتِ حالات ناواقفیت اور غلط فہمی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے اس کتاب میں اس کے تدارک کا انتظام کیا گیا ہے تاکہ مناظرہ کے وقت آسانی ہو۔

نجوم السما میں حکیم مرزا محمدؐ کامل کا یہ بیان نقل ہوا ہے کہ تحفہ اثنا عشریہ فی الحقیقت خواجہ نصر اللہ کابلی کی کتاب صواقع کا ترجمہ ہے۔ افسوس ہم اس کی تصدیق نہ کر سکے۔ لیکن نجوم السما کے بیان کے مطابق تحفہ اثنا عشریہ اپنے مقاصد میں کامیاب رہا۔ اس میں حکیم مرزا کے متعلق ایک رسالے کے حوالے سے لکھا ہے "چوں فاضل عزیز تحفہ خود را... ظاہر نمود و ضلالت شیوع گرفت و مردم جہال و ناحق بیں بطرفِ آں گردیدند"

امیر الروایات میں جو مولنا محمدؐ قاسم نانوتویؒ بانی دار العلوم دیوبند کے ایک خادم امیر خاں کی بیان کردہ روایات پر مبنی ہے۔ لکھا ہے کہ نجف خاں نے تحفہ کی تصنیف پر شاہ عبدالعزیز صاحب اور ان کے خاندان کی بڑی اہانت کی، اور انھیں سخت ایذائیں پہنچائیں۔ یہ بیانات مشتبہ ہیں لیکن شیعہ ذرائع سے بھی پتا چلتا ہے کہ تحفہ اثنا عشریہ کی تدوین و اشاعت فقط علمی محنت کا کارنامہ نہ تھا، بلکہ بڑی اخلاقی جراُت کا کام تھا۔ ہم تحفہ اثنا عشریہ کے شروع میں اور سرورق پر مصنف کا نام "حافظ غلام حلیم ابن شیخ محمدؐ قطب الدین احمد ابن شیخ ابو الفیض دہلوی" پڑھا کرتے تھے اور حیران ہوا کرتے تھے لیکن نجوم السما کے مطالعہ سے یہ حیرت رفع ہو گئی "فاضل عزیز تحفہ خود را کہ ترجمہ کتاب صواقع خواجہ نصر اللہ کابلی است بجہتِ خوف نواب نجف خاں مرحوم کہ سر آمد امرائے آں روزگار و از شیعیان ائمہ اطہار بود، آں را بطرفِ خود نسبت نکردہ، بلکہ اسمے فرضی غلام حلیم برائے آں تراشیدہ..." نجف خاں کی نسبت مشہور ہے کہ مرزا جانجاناں کی شہادت میں بھی

اس کی پُشت پناہی کو دخل تھا۔ غالباً وہ واقعہ فوری جوش کا نتیجہ تھا۔ نجف خاں کو اس میں دخل نہ تھا، لیکن اس کی عام شہرت کے پیشِ نظر اس کے زمانہ اقتدار میں تحفہ اثنا عشریہ کی تصنیف ایک دل لگی نہ تھی۔

شاہ عبدالعزیز صاحب نے تحفہ اثنا عشریہ سنہ ۱۲۰۴ھ یعنی نومبر ۱۷۸۹ء کے بعد شائع کی۔ خدا کا شکر ہے کہ اس زمانے کی تلخ بحثیں اب ختم ہو گئیں، لیکن شاید مذہبی تاریخ کا طالب علم یہ خیال کرنے میں حق بجانب ہے کہ اٹھارھویں صدی میں شیعہ مذہب کا جو فروغ شروع ہوا تھا۔ اسے رد کرنے میں تحفہ اثنا عشریہ کا بڑا دخل تھا۔

علمی وسعت اور محققانہ نظر کے علاوہ شاہ عبدالعزیز صاحب کو عربی انشا پردازی اور شاعری میں بڑا ملکہ حاصل تھا۔ آپ نے کئی عربی نظمیں لکھی ہیں۔ ایک منظوم عربی خط میں جو آپ نے اپنے عمِ بزرگوار شاہ اہل اللہ صاحب کو لکھا۔ آپ نے اپنے زمانے کے حالات اور مرہٹہ اور سکھ حملہ آوروں کے طریقے بڑی خوبی سے نظم کیے ہیں۔ ایک نہایت دلچسپ نظم دہلی کی تعریف میں ہے۔ ایک قصیدے میں آپ نے سوڈان کے حالات و واقعات کا نقشہ کھینچا ہے۔

شاہ عبدالعزیز کی اولاد نرینہ کوئی نہ تھی۔ فقط تین بیٹیاں تھیں۔ ایک مولانا عبدالحی سے بیاہی گئیں۔ دوسری مولانا شاہ رفیع الدین کے بڑے فرزند مولوی عیسےٰ صاحب سے اور تیسری شیخ محمد افضل سے۔ ان کے دو صاحبزادے تھے۔ مولانا محمد اسحٰق صاحب مہاجر اور مولوی محمد یعقوب صاحب۔ شاہ صاحب کی وفات پر لوگوں نے مولانا محمد اسحٰق صاحب کو آپ کا جانشین منتخب کیا۔ انھوں نے چند سال کے بعد سنہ ۱۸۴۲ء میں تمام قبائل کو لے کر مکہ معظمہ کی طرف ہجرت کی اور وہیں ۱۸۴۶ء میں انتقال فرمایا۔

شاہ عبدالعزیز کی وفات ۷۹ سال کی عمر میں ۷ شوال ۱۲۳۸ھ ہجری ۱۷ جولائی ۱۸۲۳ء کو ہوئی۔ مومن نے جو اپنے اصلی نام حبیب اللہ سے نہیں، بلکہ شاہ صاحب کے دیے ہوئے نام مومن خاں سے زیادہ مشہور ہے، تاریخ لکھی ہے

دستِ بیدادِ اجل سے بے سروپا ہو گئے　　فقر و دیں، فضل و ہنر، لطف و کرم، علم و عدل

شاہ رفیع الدین

شاہ ولی اللہ کے دُوسرے بیٹے مولوی شاہ رفیع الدین تھے آپ ۱۱۶۳ھ (۱۷۴۹ء) میں پیدا ہوئے۔ "والد ماجد کی آغوشِ عاطفت میں علومِ مروّجہ حاصل کیے اور حدیث شریف کی سند بھی اسی صاحب کمال کے دستِ شفقت سے حاصل کی اور زہد و تقوے میں اپنے باپ اور بھائی کے قدم بقدم تھے۔ جب آپ کے بڑے بھائی شاہ عبدالعزیز صاحب کبرسنی کثرتِ امراض و ضعفِ مزاج کی وجہ سے دماغی محنت اور تعلیم و تدریس کے متحمل نہ ہو سکے تو زیادہ تر یہ کام شاہ رفیع الدین صاحب ہی کے سپرد کیا گیا۔ آپ سے چند نظمیں اور کچھ نثر بھی یادگار ہے لیکن آپ کا سب سے اہم کام کلام مجید کا تحت اللفظ اُردو ترجمہ ہے، جو آج تک مقبولِ انام ہے اس کے علاوہ بھی آپ کی کئی تصنیفات ہیں۔ مثلاً راہِ نجات اور دمغ الباطل۔ آخر عمر تک آپ خدمتِ دین میں منہمک رہے اور ستر برس کی عمر میں (۱۲۳۳ھ ۱۸۱۷ء) میں انتقال کیا اور اپنے والد بزرگوار کے قریب پائیں کی طرف دفن ہوئے۔"

شاہ عبدالقادر صاحبؒ

شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہٗ کے تیسرے صاحبزادے مولوی شاہ عبدالقادر صاحب تھے۔ "آپ ۱۱۶۷ھ میں شمع افروز بزمِ جہاں ہوئے اور اپنے وجود باجُود سے عالم کو روشن کیا۔ ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے والد مکرم کے سایۂ عاطفت میں پائی اور علمِ فقہ و حدیث و تفسیر میں نام پیدا کیا۔ تحصیل علم سے فراغت پاکر اکبر آبادی مسجد کے حُجرے میں تمام عمر بسر کردی۔ گوشہ نشینی پسند خاطر تھی۔ اس سبب سے تصنیف و تالیف کی طرف چنداں توجہ نہ کی۔ لیکن قرآن شریف کا بامحاورہ ترجمہ یا موضح قرآن (۱۲۰۵ھ) آپ سے یادگار ہے جس پر بلا مبالغہ ہزاروں کتابیں نثار ہیں۔ یہ ترجمہ کثرت سے رائج ہے اور بہت مقبول ہے۔ آپ نے ۱۲۳۰ھ (۱۸۱۴ء-۱۵) میں تریسٹھ سال کی عمر میں وفات پائی اور اپنے جدِ امجد عبدالرحیم صاحب کے پائیں مدفون ہوئے۔"

شاہ عبدالقادر کا ترجمہ ۱۲۰۵ھ (۱۷۹۱ء) میں مکمل ہُوا۔ موضح قرآن اس کا تاریخی نام ہے۔ شاہ رفیع الدین کے ترجمے کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اس سے پہلے ہُوا

یا بعد میں۔ مقبولیت اور محاورے کی صحت کے لحاظ سے موضح قرآن دوسرے ترجمے سے بہتر ہے۔ اس کی دو بڑی خوبیاں ہیں۔ ایک تو اس میں شاہ رفیع الدین کے ترجمے کی طرح اُردو عبارت میں عربی جملوں کی ترکیب و ساخت کی نقل نہیں کی گئی۔ صحت مفہوم کے ساتھ ساتھ اُردو محاورے کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ دُوسرے ترجمے میں کم سے کم لفظوں میں صحیح مفہوم ادا کیا ہے۔ شاہ رفیع الدین کے ترجمے میں عربی نحوی ترکیب کی پابندی کی گئی ہے اور کئی جملے کانوں کو عجیب معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کے ترجمے میں بعض لفظوں اور ترکیبوں کا ترجمہ شاہ عبدالقادر کے ترجمے سے بہتر اور زیادہ صحیح ہے۔

آج ان دونوں ترجموں سے بہتر ترجمے مرتب ہو رہے ہیں لیکن جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ یہ ترجمے اُس زمانے میں ہوئے" جب اُردو نثر کی کتابیں انگلیوں پر گنی جا سکتی تھیں اور لوگ اس زبان میں تصنیف و تالیف کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے تو ان بزرگوں کی سمجھ اور فرض شناسی کی داد دینی پڑتی ہے کہ وہ اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلے اور مذہب کی اشاعت اور وقتی ضرورتوں کا پورا خیال رکھا۔

شاہ عبدالغنی

شاہ ولی اللہ کے چوتھے بیٹے شاہ عبدالغنی تھے۔ ان کے حالات بہت کم ملتے ہیں، لیکن اگر وہ باقی بھائیوں کی طرح مشہور نہیں ہوئے تو ان کی کمی ان کے صاحبزادے شاہ اسمٰعیل شہید نے پوری کر دی، جنھوں نے شاہ عبدالعزیز سے شاہ ولی اللہ کا علم و فضل سیکھ کر جمہور میں عام کیا اور ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی تاریخ میں ایک نئے دَور کا آغاز کر دیا۔

اس نئے دَور کا مطالعہ ہم اپنی تیسری کتاب موجِ کوثر میں کریں گے۔

عُلمائے متاخرین

زوالِ حکومت
۱۷۰۸ - ۱۸۵۷ء

اورنگ زیب کی وفات ۱۷۰۷ء میں ہوئی اور اس کے بہت جلد بعد مغلیہ حکومت کا زوال نمایاں ہو گیا! اورنگ زیب ۹۰ سال کی عمر میں فوت ہُوا۔ جب اُس کا بیٹا تخت نشین ہُوا تو وہ خود بوڑھا تھا اور اُسے پانچ سال سے زیادہ حکومت کرنے کا موقع نہ ملا۔ اُس کے زمانے میں پہلے راجپوتوں نے اور پھر سکھوں کے سرگروہ بندہ نے مغلوں کے علاقے کو لُوٹا۔ راجپوتوں کی بغاوت تو اس نے خود رفع کر دی، لیکن بندہ کا قلع قمع فرخ سیر نے کیا، جو ۱۷۱۳ء سے ۱۷۱۹ء تک حکمران رہا۔ کئی لحاظ سے وہ سمجھ دار اور قابل حکمران تھا، لیکن اس کے زمانے میں مسلمان اُمرا کے دو فریق ہو چکے تھے۔ ایرانی اور تورانی (شیعہ اور سُنی) ان کے اختلافات نے اسلامی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ ان قبائلی اور فرقہ وارانہ اختلافات کے علاوہ حکومت کو ضعف اس لیے بھی پہنچا کہ فرخ سیر کو تخت سید برادران (امیرالامرا سید حسین علی اور قطب الملک سید عبداللہ) کی مدد سے ملا تھا۔ وہ بادشاہ کی حیثیت شاہِ شطرنج سے زیادہ نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ سید عبداللہ وزیر سلطنت اور حسین علی دکن کا با اقتدار صوبیدار تھا۔ جب فرخ سیر نے سید برادران کا اقتدار کم کرنا چاہا تو حسین علی نے مرہٹوں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ ان سے وعدہ کیا کہ بادشاہ سے تمھیں چوتھ اور سردیش مکھی کا فرمان لے دوں گا۔ چنانچہ وہ ان کا لشکر لے کر دہلی کی طرف چلا۔ فرخ سیر معزول کر دیا گیا اور مرہٹوں کو دکن میں چوتھ اور سردیش مکھی کی اجازت مل گئی۔ خاندان مغلیہ کے زوال کی سب سے پہلی منزل یہ تھی۔

اس کے بعد سید برادران نے بادشاہ گری کا سلسلہ شروع کیا اور ۱۸ فروری ۱۷۱۹ء سے ۴ اگست ۱۷۱۹ء تک تین بادشاہ ہوئے۔ جب تورانی امرا نے ان بھائیوں کے

مظالم دیکھے تو انھیں قتل کر دیا گیا۔ دو دو روزہ بادشاہوں کے بعد محمد شاہ تخت نشین ہُوا جو ۱۷۱۹ء سے ۱۷۴۸ء تک حکمران رہا۔ اس کے زمانے میں نظام الملک آصف جاہ نے امورِ سلطنت کی اصلاح کی کوشش کی لیکن جب "رنگیلے بادشاہ" نے یہ گوارا نہ کیا تو نظام الملک مایوس ہو کر ۱۷۲۴ء میں دکن چلا گیا۔ وہاں حکومتِ آصفیہ کی بُنیاد ڈالی اور اسلامی حکومت کی تباہی و بربادی میں سے جو کچھ بچ سکتا تھا، اسے محفوظ کر لیا۔ اس کے بعد حکومتِ دہلی کا وقار و اقتدار بتدریج کم ہوتا گیا۔ مرہٹوں کے علاوہ روہیلوں اور جاٹوں نے بغاوتیں کیں اور بڑا ظلم یہ ہُوا کہ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ آ گیا۔ اس نے دل کھول کر دہلی کو لُوٹا اور قتلِ عام کیا اور دہلی کا خزانہ خالی اور فوج منتشر کر کے واپس چلا گیا۔ اس کے بعد شاہ دہلی میں اتنی سکت باقی نہ رہی کہ خود مختار صُوبیداروں اور دُوسرے دشمنوں کا مقابلہ کر سکے۔ چنانچہ بنگال میں علی وردی خاں، دکن میں نظام الملک اور اودھ میں برہان الملک سعادت خاں عملی طور پر خود مختار ہو گئے۔

محمد شاہ کی وفات ۱۷۴۸ء میں ہوئی۔ اس کے بعد احمد شاہ تخت نشین ہُوا، جس کے زمانے میں ایرانی اور تورانی اختلافات پھر بڑھ گئے۔ ایرانیوں کا سرگروہ برہان الملک کا جانشین صفدر جنگ تھا اور تورانیوں کا سرگروہ نظام الملک کا پوتا شہاب الدین، جس نے مرہٹوں کو اپنے ساتھ گانٹھ کر طرح طرح کے مظالم شروع کیے۔ ۱۷۵۴ء میں احمد شاہ کو اندھا کیا اور اس کی جگہ عالمگیر ثانی کو تخت پر بٹھایا۔ پانچ سال بعد اسے بھی مروا دیا۔ اور ایک اَور شہزادے کو تخت نشین کیا۔ ایرانی اور افغان امرا نے احمد شاہ ابدالی سے شہاب الدین اور اس کے مرہٹے ساتھیوں کی شکایت کی۔ احمد شاہ لاہور پر قابض ہو گیا تھا، لیکن مرہٹوں نے اس کے گورنر کو لاہور سے نکال دیا تھا۔ اب احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ اس کے حامی ایرانیوں کے سرگروہ شجاع الدولہ ابن سعادت علی خاں اور افغانوں کے سرگروہ نجیب الدولہ تھے۔ مرہٹوں کے ساتھ سورج مل جاٹ۔ ابراہیم گاردی اور دُوسرے لوگ تھے۔ ۱۷۶۱ء میں پانی پت کے میدان میں بڑا معرکہ ہُوا۔ جس میں مرہٹوں کو شکست فاش ہوئی۔ اس کے بعد احمد شاہ ابدالی

ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کر سکتا تھا، لیکن وہ شاہ عالم کی بادشاہت تسلیم کر کے واپس چلا گیا اور شاہ عالم عنانِ حکومت سنبھالنے کے قابل نہ تھا۔ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کا معرکہ ہوا تھا اور بنگال انگریزوں کے قبضے میں آگیا تھا۔ اس کے چند سال بعد آرہ کے مقام پر مشرقی صوبوں کی دیوانی ایسٹ انڈیا کمپنی کو مل گئی، لیکن شمالی ہندوستان میں زیادہ اقتدار مرہٹوں کا تھا۔ پانی پت کی شکست کے بعد وہ اس قابل نہ رہے تھے کہ انگریزوں کا اچھی طرح مقابلہ کر سکیں، لیکن اس قابل ضرور تھے کہ دہلی کے شاہِ شطرنج کو اپنے قابو میں رکھیں۔ شروع شروع میں ان کا اقتدار بہت مؤثر نہ تھا۔ لیکن جب رُہیلوں کی بغاوت ہوئی اور غلام قادر رہیلے نے بادشاہ کو اندھا کر کے تخت سے اُتار دیا اور اس کے بعد مرہٹوں نے غلام قادر رہیلے کو شکست دی اور اُسے قتل کر کے ۱۷۸۸ء میں شاہ عالم کو پھر تخت پر بٹھا دیا۔ تو وہ ۱۸۰۶ء تک بادشاہ رہا۔ لیکن اُس کی حالت "مُردہ بدست زندہ" سے بہتر نہ تھی۔ ۱۸۰۵ء میں لارڈ لیک نے مرہٹوں کو شکست دے کر دہلی پر قبضہ کر لیا اور شاہ عالم کو تخت نشین رہنے دیا۔ اس کے بعد ۱۸۰۶ء سے ۱۸۳۷ء تک اکبر شاہ ثانی اور ۱۸۳۷ء سے ۱۸۵۷ء تک بہادر شاہ تختِ دہلی پر مقیم رہے، لیکن ان کی حیثیت بھی شاہِ شطرنج سے زیادہ نہ تھی۔ درحقیقت دہلی کی اسلامی حکومت ۱۷۸۸ء ہی میں ختم ہو چکی تھی، جب غلام قادر رہیلے نے شاہ عالم کو اندھا کیا تھا اور وہ مرہٹوں کی مہربانی سے دوبارہ تخت نشین ہوا تھا۔

اس دَوران میں مشرق کی طرف ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت وسیع ہو رہی تھی۔ پنجاب میں احمد شاہ ابدالی کا پوتا شاہ زمان راجا رنجیت سنگھ کو لاہور کی گدی دے گیا تھا۔ وہ خود مختار ہو گیا۔ ۱۸۲۰ء کے قریب اس نے کشمیر اور پشاور فتح کر لیے۔ چنانچہ ۱۸۴۹ء تک یہ علاقے سکھوں کے ہاتھ میں رہے۔ شمالی ہندوستان میں شاہانِ اودھ مقابلۃً زیادہ دیر تک محفوظ رہے اور ۱۸۵۶ء تک جب یہ علاقہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت نہ آگیا، شجاع الدولہ کی اولاد یہاں حکمران رہی۔ سندھ کے امیروں کا خاتمہ ۱۸۴۳ء میں ہوا۔ جنوب میں سلطان حیدر علی نے میسور میں ایک نئی حکومت قائم کی تھی، لیکن ۱۷۹۹ء میں

ایسٹ انڈیا کمپنی، مرہٹوں اور نظام کی متحدہ افواج نے ٹیپو کو شکست دی اور اس سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ ان ہنگاموں میں فقط نظام دکن کا تاج و تخت سلامت رہا۔ ۱۹۴۸ء تک ریاست حیدرآباد مغلیہ حکومت اور تہذیب کی آخری یادگار سمجھی جاتی تھی، جس پہ اب انڈین یونین نے قبضہ کر لیا ہے۔

زوالِ حکومت کے اسباب

زوالِ حکومت کے بیان کے ساتھ اس سانحہ کے اسباب کا ذکر بھی متوقع ہے، لیکن یہاں ان کی تفصیل دینے کی ضرورت نہیں۔ بنیادی طور پر تو زوالِ حکومت کا اصل باعث وہ علمی، ذہنی اور عسکری کوتاہیاں تھیں، جنھیں ہم نے "عہدِ اکبری کی محدود ترقیاں" والے باب میں وضاحت سے بیان کر دیا۔ ان امور میں مغلوں کی جو روز افزوں کمزوریاں تھیں، ان کا قدرتی نتیجہ تھا کہ کسی نہ کسی وقت وہ ایک ایسی طاقت سے مغلوب ہو جائیں، جو ان باتوں میں ان پہ فوقیت رکھتی تھی۔ عہدِ اکبری کے بعد ایک اور مہلک خرابی رُونما ہوئی یعنی دربار اور اُمرا کی فضول خرچیاں، نمود و نمائش اور عیش کوشیاں۔ بنیادی طور پہ تو اس کی وجہ فتوحات سلطنت کی وجہ سے دولت و ثروت کی فراوانی تھی۔ لیکن اکبر ایک شاہانہ نظام قائم رکھنے کے ساتھ ساتھ طبیعت کا سادہ اور کفائت شعار تھا۔ جہانگیر کا مزاج دُوسرا تھا۔ اور نور جہاں تو خیر نورٌ علیٰ نور۔ اس کے علاوہ فرنگستان سے آنے والے سامانِ زیب و نمائش نے نمود و نمائش کے نئے دروازے کھول دیے تھے۔ ان سب چیزوں کا نتیجہ یہ ہُوا کہ مُغل اُمرا نے نہایت اُونچا معیارِ زندگی قائم رکھنا شروع کیا اور دولت و ثروت کی نمائش اور اخراجات کی فراوانی میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر قدم مارنے لگے۔ نتیجہ وہی ہُوا جو ہوتا تھا۔ یعنی فضول خرچی، تعیش کوشی اور اسے نباہنے کے لیے رعایا اور زیردستوں پر سختی اور رشوت ستانی اور اخلاقی انحطاط۔ اس سلسلے میں عالمگیر نے صورتِ حالات سُدھارنے کی کوشش کی، لیکن جو مزاج کئی پشتوں سے بگڑے ہوئے تھے، وہ درست نہ ہوئے[1]۔ بلکہ اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی حالات

[1] اس سلسلے میں حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ والے باب کا پہلا اندراج (سنہ ۱۷۰۳ء) ملاحظہ ہو۔

پہلے سے بھی بدتر ہوگئے۔ اس کی وفات کے پانچ سال بعد تختِ دہلی پر اس کا پوتا معز الدین جہاندار اورنگ نشین ہُوا۔ جس نے لال کنور کے ساتھ اس طرح رنگ رلیاں منائیں اور اس کے اقارب کو اتنے بڑے بڑے عہدے دے دیے کہ بادشاہت اور امارت کا وقار ختم ہوگیا۔ فرخ سیر کے زمانے میں حالات ذرا سنبھلے، لیکن یہ سنبھالا عارضی تھا۔ اس کی وفات کے ایک سال بعد محمدؐ شاہ تخت نشین ہُوا، جو تاریخ میں محمدؐ شاہ رنگیلا کے نام سے مشہور تھا۔ اس نے جہاندار شاہ کی طرح بدعنوانیاں نہیں کیں اور اس کے عہدِ حکومت کے بعض روشن پہلو بھی ہیں (مثلاً اُردو شاعری کی نشوونما، شاہ ولی اللہؒ کی تحریک کا آغاز وغیرہ) لیکن اب عیش کوشی اور اخلاقی انحطاط معاشرے کا جزو ہوگیا تھا۔ یہ کمزوریاں برقرار رہیں۔ رہی سہی کسر مرہٹوں اور نادر شاہ کے حملوں نے پُوری کر دی۔ اور بادشاہت کا فقط ایک کھوکھلا ڈھانچہ باقی رہ گیا۔

شاید اسبابِ زوال کے متعلق آخری شاہانِ دہلی کے ایک ممتاز عہدہ دار کا تجزیہ دلچسپی سے پڑھا جائے، جسے اُردو کی ایک قدیمی کتاب میں حکیم مومن خاں مومن کے ایک شاگرد نے درج کیا ہے اور جو اٹھارویں صدی کے طور طریقوں کی ایک دلآویز تصویر پیش کرتا ہے۔

نتائج المعانی میں آغا محمود بیگ راحت لکھتے ہیں:۔

ایک روز ابو نصر محمدؐ اکبر شاہ ثانی کے دربار میں ذکرِ زوالِ سلطنت آگیا۔ بخشی محمود خاں نے عرض کی۔ چار آدمیوں نے مملکت کو تباہ کر دیا۔ اوّل حکیموں نے فرمانروایانِ بیدار مغز کو وہ مقویات کھلائیں کہ تابِ تحمل نہ ہو سکی۔ مزاج عشرت طلب ہوگیا۔ دوسرے کلاونتوں نے ان کے گھر میں جو نو خیز ہوئی، اس کو پیش کیا۔ اور اس میں اپنا افتخار پیدا کیا۔ سلاطین کو رقص و سرود میں مائل رکھا۔ ڈوم ڈھاڑی مدار المہام ہوئے۔ انتظام فرمانروائی میں خلل واقع ہُوا۔ دشمنوں نے سر اٹھایا۔ بدخواہوں نے پر پھیلائے۔ جا بجا خودسر ہو گئے۔ شرفا کو دربار میں مداخلت نہ ہوئی۔ ان کی بات کسی نے نہ سُنی۔ وقت پر ان لوگوں نے طرح دی غنیم کی بن آئی۔ تیسرے کثرتِ عیال نے ادھر ازواج کی کثرت ہوئی۔ ادھر اولاد کی ترقی ہوئی۔ نزاعِ خانگی

سے خلش ہوئی۔

بوڑھے مشائخ و پیرزادوں نے جب کبھی حاضر ہوئے اور کچھ ذکر سلطنت آیا۔ اپنے تئیں عرش پر پہنچایا۔ مسائل تصوف بیان کرنے لگے۔ کنج عزلت کی خوبیاں عرض کرنے لگے۔ خوف بندگان خدا سے ڈرانے لگے۔ جب شیخ جی یہ شیخی بگھار چکے۔ پھر اپنی کرامت جتانے لگے ہم دعا کرتے ہیں۔ دعاؤں کا لشکر حضور کی فتح و نصرت کو کافی ہے۔ دشمن ادھر منہ بھی نہیں کرنے کا' خود پامال سم سمند ان لشکر دعا سے دولت و اقبال ہوگا۔ فرمانروا ان کے دم میں آگئے۔ پیر جی کی دعا پر تکیہ کیا۔ چار بالش عشرت پر تکیہ نشین ہوئے۔ ارکین گوشہ گزین ہوئے۔ غنیم نے قابو پایا' اقلیم پر زور لایا۔ دعا کی فوج آتی رہی' حکومت جاتی رہی۔ لیکن زوال حکومت سے علوم اسلامی کی اشاعت میں ضعف نہ آیا۔ بلکہ ان کا زیادہ فروغ ہوا۔ (ص ۱۷۰۔۱۷۱)

علوم اسلامی کا فروغ

فرنگی محل

سید سلیمان ندوی ایک مضمون میں لکھتے ہیں:۔

"...... اکبر کے زمانے میں حکیم فتح اللہ شیرازی نے یہاں معقولات کو فروغ دیا۔ شاہجہان اور عالمگیر کے زمانے میں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی اور میر زاہد ہروی نے منطق اور فلسفے کا درس عام کیا اور انھی کے تلامذہ سے شاہ ولی اللہ۔ فرنگی محل اور خیر آباد کی درسگاہوں میں متاخرین کے معقولات اور شروح ، حواشی کی بہار آئی۔ حکیم فتح اللہ شیرازی المتوفی ۹۹۷ھ کے شاگرد عبدالسلام لاہوری[1] اور ان کے شاگرد ملا عبدالسلام دیوی[2]۔ ان سے ملا قطب الدین سہالوی۔ ان سے ملا قطب الدین صاحب شمس بازغہ ملا امان اللہ بنارسی اور قاضی محب اللہ بہاری نے اور ملا قطب الدین سہالوی کے صاحبزادہ ملا نظام الدین نے ملا امان اللہ بنارسی سے

---

[1] "شاگرد میر فتح اللہ شیرازی فقیہ و مفسر بود۔ از شاگردان وے ملا عبدالسلام ساکن دیوہ مضاف لکھنو مشہور است۔ بر تفسیر بیضاوی حاشیہ برجستہ دارد۔ بسال ۱۰۳۷ھ (۱۶۲۷ء) وفات یافتہ"

[2] عہد شاہجہانی کے ایک رستگو آزاد منش فاضل تھے۔ پہلے اپنے استاد کی جگہ مدرسہ لاہور میں مدرس اعلیٰ رہے پھر بادشاہی لشکر میں مفتی ہوئے۔ ان کے تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ ہو۔ تذکرہ مشاہیر کاکوری

پڑھا۔ مگر نظام الدین کے وارث مُلّا بحر العلوم ہوئے۔ بحر العلوم سے خیرآباد کا علمی خاندان چلا۔ میر زاہد کا فیض شاہ عبدالرحیم صاحب دہلوی کو اور ان سے شاہ ولی اللہ صاحب کو۔ ان سے شاہ عبدالعزیز صاحب کو پہنچا اور اُن سے مُلک میں عام ہُوا۔

مولانا نے جو سلسلہ ترتیب دیا ہے۔ اس میں کئی بحث طلب امور ہیں، لیکن ان کے باوجود مولانا سلیمان ندوی کا مرتّب کردہ سلسلۂ تاریخ علوم اسلامی دلچسپ اور مفید ہے اور علوم اسلامی کی تاریخ میں فرنگی محل کے بزرگوں کی اہمیت اس سے بخوبی معلوم ہو سکتی ہے!

فرنگی محل لکھنؤ کا ایک محلّہ ہے۔ شروع میں وہاں ایک فرانسیسی تاجر مقیم تھا، جس کے تعلق کی وجہ سے یہ علاقہ فرنگی محل کہلاتا تھا۔ جب وہ تاجر اپنے وطن کو واپس چلا گیا تو یہ زمین "نزول" یعنی سرکاری ہو گئی۔ اورنگ زیب کے زمانے میں مُلّا قطب الدین نے فروغ حاصل کیا۔ وہ قصبہ سہالی میں رہتے تھے، جہاں انصاریوں اور عثمانیوں میں زمینداری پر کچھ جھگڑا تھا۔ مُلّا قطب الدین انصاری تھے۔ ۱۱۰۳ھ (۱۶۹۱ء) کی ایک رات کو چند عثمانی ان کے گھر پر چڑھ آئے اور مُلّا کو شہید کر کے ان کا گھر جلا دیا۔ اُن کے صاحبزادے مُلّا محمد سعید سہالوی نے عالمگیر کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کی تو فرنگی محل کا علاقہ انھیں معافی میں دیا گیا۔ مُلّا قطب الدین نے مُلّا عبدالسّلام دیوی کے شاگرد مُلّا دانیال اور شیخ محب اللہ الہ آبادی کے شاگرد قاضی گھاسی سے علم حاصل کیا تھا۔ آپ کی تصانیف میں سے ایک شرح عقائد علامہ دوّانی پر حاشیہ تھا، جو آپ کے گھر کی تباہی میں تلف ہو گیا۔

اولاد کے معاملے میں آپ بڑے خوش قسمت تھے۔ آپ کے چار بیٹے تھے۔ ایک سے ایک بڑھ کر، اور انھی کی وجہ سے ہندوستان میں آپ کا فیض جاری رہا۔ تذکرہ علمائے ہند میں لکھا ہے۔ "عمرِ عزیزش بشغلِ درس بسر برد۔ گوئی ریاستِ علمی بجوار لکھنؤ بروے ختم شد و سلسلۂ تلمذ اکثر علمائے ہند بوے منتہی می شود۔"

مُلّا قطب الدین کے بیٹوں میں سے سب سے برگزیدہ مُلّا نظام الدین تھے۔ جن کے نام پر "درسِ نظامی" مشہور ہے۔ تعلیم آپ نے اپنے والد، حافظ امان اللہ بنارسی اور

اس عہد کے ایک اور مشہور اور قابلِ ذکر اُستاد مولوی غلام نقشبند لکھنوی سے حاصل کی تھی۔ تصانیف آپ کی کئی ہیں۔ جن میں حاشیہ شرح ہدایت الحکمت۔ شرح مسلم ثبوت۔ حاشیہ شمس بازغہ۔ حاشیہ شرح عقائد دوانی بہت مشہور ہیں۔ آپ شاہ عبدالرزاق بانسوی کے مرید تھے۔ ان کے ملفوظات بھی آپ نے مرتب کیے۔ آپ کی وفات ۱۷۴۸ء میں یعنی نادر شاہ کے حملے سے تھوڑی دیر بعد ہوئی۔ آپ کی زیادہ شہرت بطور مدرس کے تھی۔ تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ آپ کے درس و تدریس کے مقابلے میں باقی سب علما کے درس بے رونق ہو گئے اور ہندوستان میں شاید ہی کوئی ہوگا جس کی شاگردی کا سلسلہ آپ کے شاگردوں یا فرزندوں میں سے کسی تک نہ پہنچتا ہو۔

درسِ نظامی

درسِ نظامی میں، جو ان کے نام سے مشہور ہے، مندرجہ ذیل کتب اور علوم کی تعلیم ہوتی تھی:۔

(۱) صرف:۔ میزان۔ منشعب۔ صرفِ میر۔ پنج گنج۔ زبدہ۔ فصول اکبری۔ شافیہ۔

(۲) نحو:۔ نحو میر۔ شرح مائۃ عامل۔ ہدایۃ النحو۔ کافیہ۔ شرح جامی۔

(۳) منطق:۔ صغریٰ۔ کبریٰ۔ ایساغوجی۔ تہذیب۔ شرح تہذیب۔ قطبی مع میر۔ سلم العلوم۔

(۴) حکمت:۔ میبذی۔ صدرا۔ شمس بازغہ۔

(۵) ریاضی:۔ خلاصۃ الحساب۔ تحریر اقلیدس مقالۂ اوّل۔ تشریح الافلاک۔ رسالہ قوشجیہ۔ شرح چغمنی باب اوّل۔

(۶) بلاغت:۔ مختصر معانی۔ مطوّل تا ما انا قلت۔

(۷) فقہ:۔ شرح وقایہ اوّلین۔ ہدایہ آخرین۔

(۸) اصولِ فقہ: نورالانوار۔ توضیح تلویح۔ مسلم الثبوت (مبادی کلامیہ)

(۹) کلام:۔ شرح عقائد نسفی۔ شرح عقاید جلالی۔ میر زاہد۔ شرح مواقف۔

(۱۰) تفسیر:۔ جلالین۔ بیضاوی۔

(۱۱) حدیث :- مشکوٰۃ المصابیح -

مولوی ابوالحسنات ندوی اس نصاب کو درج کر کے لکھتے ہیں: "اس کے بانی مُلّا نظام الدین تھے۔ انھوں نے اس کی بنیاد ایسے زبردست ہاتھوں سے رکھی کہ باوجود امتدادِ زمانہ آج تک اس میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی" لیکن صحیح بات یہ ہے کہ "درسِ نظامی" کی پائداری کی وجہ اس کی خوبیوں سے زیادہ کچھ تو علماے فرنگی محل کا اثر و اقتدار تھا اور کچھ علماے متاخرین کی عقیدت مندانہ روش۔ ظاہر ہے کہ جس نظام کے ماتحت علما نے خود تعلیم پائی ہو۔ اس سے انھیں اُنس ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ علما نے کوئی ایسا مجتہد ابھی تک پیدا نہیں کیا تھا جو پُرانے عربی مدرسوں کے نصاب میں مناسب تبدیلیاں کر کے اُسے تبدیل شدہ حالات کے مطابق مفید بنا دے۔

شاہ سلیمان سجادہ نشین پھلواری شریف کا تو خیال ہے کہ درسِ نظامی ایک خود رَد نظامِ تعلیم ہے، جس کا ہیولیٰ مُلّا فتح اللہ شیرازی نے ترتیب دیا اور جس پر بعد میں اضافہ ہوتا رہا۔ وہ اس موضوع پر "الندوہ" کے ایک نمبر میں لکھتے ہیں:-

اور اس درس موجودہ کو حضرت قبلہ مُلّا نظام الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا درس کہنا سراسر گستاخی و بے ادبی ہے۔ حضرت مُلّا صاحب (قدس سرہٗ) نے نہ یہ موجودہ کتابیں پڑھائیں اور نہ اکثر کتابیں ان کے وقت میں تالیف ہوئی تھیں۔ نہ ان کتابوں کی جناب کے مزاولت تھی۔ اس درس کو خود رَو درس کہنا نازیبا نہیں۔ کچھ تو بعض اُستادوں نے اپنے مذاق کے موافق کتابیں پڑھائیں اور کچھ طالب علموں کے مذاق اور کد نے اضافہ کیا۔ حضرت مُلّا صاحب علیہ الرحمۃ کا دامن اس سے پاک ہے۔ ہاں اگر مُلّا فتح اللہ شیرازی کو اس درس کا بانی کہا جائے تو بیجا نہیں ..... حضرت مُلّا صاحب (نظام الدین) قدس سرہٗ صوفی صافی عالی مشرب تھے۔ اگر وہ اس نظامِ درس کو درست فرماتے تو تصوف یا اخلاق کی کوئی کتاب اس میں ضرور داخل کرتے۔ حالانکہ اس درسِ نظامیہ میں تصوف و اخلاق کی کوئی ایک کتاب نہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ اس درس سے فارغ ہو کر نکلتے ہیں وہ تصوف و اخلاق سے بالکل کورے ہوتے ہیں۔ ہاں اگر کسی درویش صوفی کی

صحبت اختیار کی اور اس کے معتقد ہوئے تو کچھ تصوف و اخلاق کا اثر ان میں پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر افسوس اب تو درویش و مشائخ بھی اقل و قلیل نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تھوڑے دنوں سے غیر مقلدین اور وہابیوں کی تعداد مولویوں کی جماعت میں زیادہ ہو گئی ہے۔ کاش اگر تصوّف کی کوئی کتاب بھی ابتدا میں انھیں پڑھائی جاتی تو یہ خیالات فاسدہ ان کے دلوں میں پیدا نہ ہوتے۔

درسِ نظامی کی نسبت مولٰنا نیاز فتح پوری لکھتے ہیں: "اس میں سب سے بڑا نقص ایک تو یہ ہے کہ صرف و نحو کی تعلیم میں بہت فضول وقت ضائع ہو جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ادب و لغت کی طرف کوئی توجہ نہیں کی جاتی۔ اس کے ساتھ منطق۔ الٰہیات کی جتنی کتابیں اس میں شامل ہیں، وہ بھی اب تقویم پارینہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ اس لیے میری رائے میں صرف و نحو کی کتابوں کو کم کر کے زبانی خطبات کے ذریعے سمجھانا چاہیے اور مخصوص طور پر ایسی کتابیں لکھنا چاہئیں کہ زیادہ سے زیادہ چھ ماہ کے اندر قواعد پر عبور ہو جائے اور ایسی کتابیں مصر میں رائج ہیں۔ اسی طرح منطق و الٰہیات کی بھی بقدرِ ضرورت تعلیم دینی چاہیے۔ فقہ و اصولِ فقہ، حدیث و اصولِ حدیث بے شک نہایت ضروری ہیں، لیکن افسوس ہے کہ ان فنون کے متعلق جو کتابیں رائج ہیں، وہ موجودہ حالات کے لحاظ سے ناکافی ہیں۔ ان میں بھی ردّ و بدل ضروری ہے۔ معانی و بیان اور لغت و ادب کے لیے کتابوں کا معقول اضافہ کرنا چاہیے اور ہندسہ و ہیئت کے ساتھ علم الکیمیا۔ طبعیات۔ طبقات الارض۔ تاریخ اقتصادیات و سیاسیات کی تعلیم ضروری ہے۔"

دینی نقطۂ نظر سے درسِ نظامی کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں تفسیر و حدیث پر پوری توجہ نہیں اور منطق۔ حکمت۔ صرف و نحو پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ فی الحقیقت درسِ نظامی مذہبی اور روحانی تعلیم کا نظام نہ تھا، بلکہ دنیوی نظامِ تعلیم تھا، جس میں فقہ وغیرہ پر اس لیے توجہ ہو گئی تھی کہ اس کی طلبا کو اسلامی حکومت کے دوران میں قاضی، مفتی اور محتسب بننے کے لیے ضرورت تھی۔ ورنہ زیادہ توجہ

منطق ۔گرامر اور فلسفہ پڑھتی اور نظامِ تعلیم کا مقصد طلبا کی عام عقلی تربیت اور ذہنی ترقی تھا ۔

نام نہاد معقولات پر ضرورت سے زیادہ توجہ علمائے پورب کا پرانا مرض ہے اور اس کے اثرات درسِ نظامی میں بھی نمایاں ہیں ۔شاہ ولی اللہ کے طریقِ تعلیم میں معقولات کی نسبت جو طرزِ عمل ہے اس کا اندازہ دارالعلوم دیوبند کے سابق سرپرست مولانا رشید گنگوہی کی رائے سے ہو سکتا ہے ۔تذکرۃ الرشید میں لکھا ہے "اسی طرح منطق و فلسفہ کے ساتھ آپ کا تنفر عداوت کے درجہ پر پہنچا ہوا تھا ۔ایک دفعہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ میرا جو مُرید اور شاگرد فلسفہ کا شغل رکھے گا، وہ میرا مُرید اور شاگرد نہیں ۔ حضرت امام ربّانی بار بار فرمایا کرتے تھے کہ اس منطق و فلسفہ سے تو انگریزی بہتر کہ اس سے دنیا کے نفع کی امید تو ہے ۔"

فلسفہ اور معقولات کی اسلام کے کئی دُوسرے اہلِ نظر بزرگوں نے بھی مذمت کی ہے ۔شیخ عطار لکھتے ہیں ؎

فائے کفر ایں جا بہ حق المعرفہ   دوست تر دارم ز فائے فلسفہ
گر ازاں حکمت دلے افروختے   کے چناں فاروق بر ہم سوختے

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے بھی مختلف علوم کے مدارج معیّن کرتے ہوئے اسی رائے کا اظہار کیا ہے ۔

"اُستادِ علمِ کلام و فقہ اولےٰ است از اُستادِ علم نحو و صرف ۔ و اُستاد نحو و صرف اولےٰ است از استادِ علوم فلسفی ۔ با آنکہ علوم فلسفی داخل علوم معتبر نیست ۔ اکثر آں مسائل لاطائل است ودیے حاصل واقل مسائل آنکہ از کتبِ اسلامیہ اخذ نمودہ اند و تصرفات درآں کردہ از جہل مُرکّب خالی نیستند ۔"

لیکن اصلاحِ نصابِ تعلیم کے مسئلے پر سب سے تلخ تبصرہ مولانا محمد اسلم جیراجپوری کا ہے، جو مقالاتِ اسلم میں لکھتے ہیں :۔

دوسری یہ کہ نہ صرف عقائد و اصول و فقہ بلکہ منطق و فلسفہ و ہیئت وغیرہ پر بھی جو غیر شرعی

علوم ہیں۔ قدامت کے تقدس کا ایک غلاف چڑھا دیا گیا ہے اور جو کچھ بھی کتابوں میں لکھا جا چکا ہے، اساتذہ کی نگاہوں میں آخری الفاظ بلکہ مسلمات ہیں۔۔۔۔

اب اگر پوچھیے تو ایک مدت تک غور و فکر کرنے اور نتائج کو دیکھنے کے بعد ان درسی علوم کی نسبت جو مشرقی مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں میرا خیال یہ ہے کہ ان میں سے اکثر مُردہ علوم کی لاشیں ہیں، جن کو ہمارے اساتذہ صدیوں سے اپنے کندھوں پر اُٹھائے ہوئے ہیں اور جن کی عفونت سے عقل اور دین کوسوں بھاگتے ہیں۔

میں اس میں کسی تبدیلی یا ترمیم کا قائل نہیں ہوں بلکہ کلی انقلاب چاہتا ہوں۔

میری رائے یہ ہے کہ طلباء کو عربی زبان پختہ طور پر پڑھا کر خالص قرآن و سنت متواترہ یعنی عمل بالقرآن کی تعلیم دینی چاہیے اور بس۔ اس کے بعد ان کو زندہ دُنیاوی علوم سکھانے چاہئیں۔ جن سے وہ روزی پیدا کرسکیں اور دین کو دُنیا کمانے اور ملت میں تفرقہ ڈالنے کا ذریعہ نہ بنائیں۔"

مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی ایک مرتبہ الندوہ میں اسی طرح زوردار الفاظ میں نصابِ تعلیم کی شکایت کی تھی۔

"آج صدیوں سے مسلمانوں کی ذہنی ترقی کو جس چیز نے روک رکھا ہے، اس کا ذمہ دار صرف نصابِ تعلیم اور طرزِ تعلیم ہے۔"

ایک قوم کے بنانے اور بگاڑنے میں تعلیمی نصاب کو جو دخل ہو سکتا ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں، لیکن ہمارے تعلیمی مصلحین بھی بعض بنیادی باتیں نظرانداز کر دیتے ہیں (۱) کوئی نصابِ تعلیم دوامی نہیں ہو سکتا (۲) مختلف مقاصد کے لیے مختلف نصاب ہوں گے۔ ایک انجینئر کو اور طرح کی ضرورت ہے۔ ایک مذہبی عالم کی ضروریات اس سے بالکل مختلف ہیں۔ ہمارے قدیمی مدارس کی قومی نظام میں ایک باعزت جگہ ہے اور ہمارا مذہبی نظام اور قدیم تہذیب برقرار رکھنے میں انھوں نے مفید کام کیا ہے، لیکن افسوس یہ ہے کہ قدیمی نصاب سے چمٹے رہنے کی وجہ سے وہ ہماری مذہبی ضروریات بھی کماحقہ پوری نہیں کرسکتے۔ کئی علوم (مثلاً اسلامی تاریخ) کا دروازہ انھوں نے اپنے لیے

بند کر رکھا ہے۔ فقہ، حدیث، عربی، ادب اور منطق کے لیے کتابیں وہ رائج ہیں، جن سے مہینوں کا کام سالوں میں ہوتا ہے۔ ان باتوں میں کچھ وسعت اور لچک آ جائے تو اپنے مقاصد کو یہ مدرسے بہتر طریقے سے پورا کر سکیں۔

علمائے متاخرین

علامہ بحر العلوم:۔ درس نظامی کے بانی ملا نظام الدین کے کئی بیٹے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ شہرت ملا عبد العلی بحر العلوم لکھنوی نے پائی۔ وہ سترہ برس کے تھے کہ والد کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد انھیں ایک سانحہ پیش آیا، جس کی وجہ سے وہ لکھنو چھوڑ کر پہلے شاہ جہان پور گئے اور پھر وہاں سے رام پور اور بنگال ہوتے ہوئے مدراس پہنچے۔ کرناٹک کے رئیس نواب محمد علی خاں نے ان کی بڑی قدر کی۔ بحر العلوم کا خطاب دیا۔ درس کے لیے ایک بڑا مدرسہ تعمیر کیا، جہاں وہ اپنی وفات یعنی ۱۲۳۵ھ (۱۸۱۹ء) تک درس دیتے رہے۔ ان کی کئی تصانیف ہیں۔ ارکانِ اربعہ در اصولِ فقہ۔ شرح مثنوی مولانا روم۔ شرح فقہ اکبر اور رسالہ توحید وغیرہ۔ مولانا سلیمان ندوی نے ایک مضمون میں انھیں ابنِ خلدون اور حکیم الامت شاہ ولی اللہ کے ساتھ اس طبقے میں گنا ہے جنھوں نے متاخرین کے دورِ تقلید میں بھی مجتہدانہ انداز برقرار رکھا ہے۔ مولانا کی رائے بڑے احترام کی مستحق ہے، لیکن بعض باتوں سے خیال ہوتا ہے کہ علامہ بحر العلوم کی اصل جگہ علامہ عبد الحکیم سیالکوٹیؒ۔ علامہ وجیہ الدین گجراتی اور شیخ نور الدین احمد آبادی کے ساتھ ہے۔ جنھوں نے علوم درسی میں کمال حاصل کیا اور ان کی خوب اشاعت کی، لیکن جنھیں ابن خلدون یا شاہ ولی اللہ کا ہم پایہ نہیں سمجھا جا سکتا۔

ملا بحر العلوم فرنگی محل چھوڑ کر چلے گئے، لیکن ان کے بعد بھی یہ جگہ اسلامی علوم کا مرکز بنی رہی۔ ملا صاحب کے اپنے صاحبزادے مولوی عبد الرب کچھ دیر مدراس ٹھہر کر درس حاصل کر کے لکھنو آ گئے۔ ان کے علاوہ یہاں سینکڑوں علماء تحصیل علم و فضل سے فارغ ہوئے۔ گزشتہ صدی میں یہاں کے سربرآوردہ عالم مولانا عبد الحی تھے۔ جنھوں نے

عربی میں متعدد کتابیں لکھیں اور جن کے کئی شاگرد نامور عالم ہوئے۔ حال میں مولانا عبد الباری نے نام پیدا کیا۔ انھوں نے خلافت کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا اور مولانا محمد علی مرحوم نے ان سے طریقہ قادریہ میں بیعت بھی کی تھی۔

آزاد بلگرامی :- لکھنؤ کے قریب بلگرام کا مردم خیز خطہ ہے، جہاں سید عبد الجلیل اور ان کے بعد ان کے صاحبزادے سید محمد قابلِ ذکر علما تھے، لیکن شاید ان سے بھی زیادہ عزت و احترام کے مستحق سید غلام علی آزاد بلگرامی تھے جنھیں حسان الہند بھی کہا جاتا ہے۔ وہ بلگرام میں ۱۷۰۴ء میں پیدا ہوئے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کے ہمعصر تھے۔ سید محمد بلگرامی اور سید طفیل محمد بلگرامی سے تعلیم حاصل کی۔ چونتیس سال کی عمر میں حج کو گئے اور مدینہ منورہ میں شیخ محمد حیات سندھی سے "صحیح بخاری" پڑھی اور "صحاح ستہ" کا اجازہ حاصل کیا۔ پھر ہندوستان واپس آئے اور اورنگ آباد چلے گئے۔ نواب نظام الملک آصف جاہ کے صاحبزادے نواب نظام الدولہ ناصر جنگ نے ان کی بڑی قدر کی اور اپنے پاس رکھا۔ یہاں انھوں نے اپنا وقت تصنیف و تالیف میں گزرا۔ ۱۷۸۵ء میں وفات پائی۔ آپ کی تصانیف کئی ہیں۔ عربی میں ایک کتاب "صحیح بخاری" کے چند ابواب کی شرح میں ہے اور ایک اہم کتاب سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان ہے۔ فارسی میں انھوں نے سروِ آزاد، خزانہ عامرہ روضۃ الاولیا اور مآثر الکرام لکھیں۔ ان میں سے پہلی کتابوں میں شعرا اور روضۃ الاولیا میں روضہ (خلد آباد) کے اولیا کے حالات ہیں۔ مآثر الکرام بلگرام کے اولیا اور فضلا و شعرا کے متعلق ہے اور ضمناً بلگرام سے باہر کے کئی بزرگوں کے حالات بھی آ گئے ہیں۔ آپ کا طرز تحریر سلجھا ہوا۔ محققانہ۔ لفاظی اور اغراق سے پاک ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر آپ یہ کتابیں نہ لکھ جاتے تو مورخین کو اسلامی ہند کی ذہنی، ادبی اور مذہبی تاریخ مرتب کرنے میں بہت زیادہ دشواریاں ہوتیں، بلکہ سبحۃ المرجان کے شروع میں مولانا آزاد بلگرامی نے اس امر پہ بجا فخر کیا ہے کہ ہندوستانی علما و فضلا کے حالات کو انھوں نے پہلی مرتبہ منضبط کیا۔ ہندوستان میں اولیا کے تذکرے بہت تھے۔ علما کا کوئی نہ تھا۔ سبحۃ المرجان اور مآثر الکرام میں اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش ہوئی۔

سیّد مُرتضےٰ زبیدی بلگرامی - جس وقت مولانا آزاد مآثر الکرام میں بزرگان بلگرام کا تذکرہ لکھ رہے تھے - اس وقت اس کانِ جواہر کا ایک لعل بے بہا یمن میں جا کر چمکنا شروع ہوا تھا اور اس کی تابانی اور درخشانی نے عالمِ اسلام کو اس طرح مسخر کر لیا کہ شاید ہی کسی ہندی نژاد نے کیا ہو!

یہ فخرِ ہندوستان بزرگ، علامہ مُرتضےٰ تھے، جو یمن کے تعلیمی مرکز زبید میں اتنی دیر تک مقیم رہے کہ وہ بلادِ عرب میں زبیدی مشہور ہیں اور مصر و عرب میں بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ یمنی نہیں، ہندوستانی تھے - سیّد مرتضےٰ بلگرام میں پیدا ہوئے (۱۱۴۵ھ/۱۷۳۲ء) ابتدائی تعلیم کے بعد الہ آباد آ گئے - اور مُلّا فاخر الہ آبادی سے کچھ دیر فیض حاصل کیا پھر دلی پہنچے اور شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا - اس کے بعد عنفوانِ شباب میں ہی حج کے لیے مکّہ معظمہ گئے اور وہاں سے زبید کا رُخ کیا - جہاں انھوں نے مختلف بزرگوں سے تعلیم حاصل کی - قیامِ عرب کے دوران میں ان کی مُلاقات سیّد عبدالرحمٰن بن مصطفےٰ عیدروسی سے ہوئی، جنھوں نے انھیں سلسلہ عیدروسیہ میں داخل کیا اور اب علاّمہ کے علمی ساز کے ساتھ رُوحانی سوز شامل ہُوا - مُرشد کے زیرِ ہدایت انھوں نے مصر کا رُخ کیا - اور تالیف و تصنیف کو اپنا شغل قرار دیا - ان کی وفات ۱۲۰۵ھ (۹۱ - ۱۷۹۰ء) میں بعارضہ طاعون ہوئی -

علامہ مُرتضیٰ نے بیسیوں کتابیں لکھی ہیں - جُداگانہ علوم و فنون میں، لیکن ہر ایک اپنی اپنی جگہ بے نظیر ہے - ان کی ایک کتاب قاموس کی شرح تاج العروس ہے جو چودہ سال میں لکھی گئی اور بہت بڑی تقطیع کے چار پانچ ہزار صفحوں کا محیط ہے، لیکن فنِ لغت سے بھی زیادہ شہرت آپ کو علمِ حدیث میں حاصل ہوئی - اس علم میں دوسرے سینکڑوں طالبوں کے علاوہ خلیفۃ المسلمین سُلطان عبدالحمید اوّل اور ترکی کے صدرِ اعظم علامہ راغب پاشا نے آپ سے سندیں اور اجازت نامے حاصل کیے - تصوّف میں بھی آپ کا بڑا درجہ تھا اور نہ صرف بہت سے لوگ آپ سے فیض یاب ہوئے، بلکہ آپ نے امام غزالیؒ کی احیائے علوم الدین کی ایسی بلند پایہ شرح لکھی کہ مصر اور بلادِ عرب میں اصل کتاب کو

نئے سرے سے مقبولیت حاصل ہو گئی ۔ ڈی ۔ بی ۔ میکڈانلڈ جس نے اسلامی دینیات کی تاریخ لکھی ہے (اور اس میں اپنی واقفیت کے مطابق ایک ہندوستانی عالم کا ذکر نہیں کیا) ! عہدِ حاضر کے مذہبی اور روحانی رجحانات کا تذکرہ کرتا ہُوا لکھتا ہے :

”دوسری تحریک غزالی کے اثر کا احیا ہے ۔ یہ اثر کسی وقت بھی قطعی طور پر مُردہ نہ ہُوا تھا اور یمن میں تو شاید خاص طور پر یہ کارفرما رہا ۔ اسلامی دُنیا کے اس کونے میں صُوفیہ کی کئی نسلیں بلامزاحمت اپنا کام کرتی رہیں اور یہ اس ملک کا ایک باشندہ سیّد مرتضیٰ زبیدی تھا ۔ جس نے احیائے علوم الدین پر ایک معرکۃ الآراء شرح لکھ کر دَورِ حاضر میں اس کتاب کو نئے سرے سے مطالعہ کرنے کی بنا ڈالی ۔ یہ شرح بڑی تقطیع پر دس جلدوں میں چھپی ہے اور اس کے دو ایڈیشن چھپ چکے ہیں ۔“

چونکہ سیّد مرتضیٰ کے علمی کمالات پر ہندوستان سے باہر نکل کر بہار آئی ۔ اس لیے یہاں اکثر لوگ ان کے علمی پایہ سے ناواقف ہیں، لیکن اہلِ نظر ان کی قدر و قیمت خوب پہچانتے ہیں ۔ مولوی عبدالحق سیکرٹری انجمن ترقی اُردو ماثر الکرام کے دیباچہ میں لکھتے ہیں : ”خاکِ بلگرام میں ایک اور ایسا جیّد عالم ہو گزرا ہے جسے فخرِ علمائے ہند کہنا بجا ہو گا ۔ علمائے ہند کے حالات میں کوئی کتاب اس وقت تک کامل نہیں ہو سکتی، جب تک اس میں علّامہ سیّد مرتضیٰ صاحب تاج العروس کا تذکرہ نہ ہو ۔“ مولانا مناظر احسن جنھوں نے علّامہ کی ایک تصنیف نفحۂ قدسیہ کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے ۔ ان کی نسبت فرماتے ہیں ۔ ”وہ مصر میں ہی نہیں، بلکہ اپنے زمانہ میں دُنیائے اسلام کے سب سے بڑے محدّث، سب سے بڑے ادیب، سب سے بڑے لغوی اور آخر میں ایک مرتاض، صاحبِ باطن ولی اللہ تھے ۔“ تذکرہ علمائے ہند میں جہاں علّامہ کی چھیاسٹھ کتابوں کے نام درج ہیں ۔ مولوی رحمان علی خاں لکھتے ہیں ۔ ”بالجملہ بوفورِ علم و نشرِ علوم بتوسط تلامذہ و تصانیف کتب کہ بہ حیاتش صیت وے اکنافِ عالم را در گرفتہ ۔ اگر وے را مجدّدِ صدی سیزدہم گویند رواست ۔“

سیّد مرتضیٰ سے پہلے اور بعد میں کئی ہندوستانی علمائے نے عربی زبان میں تصنیف

وتالیف کا سلسلہ شروع کیا۔ لیکن افسوس کہ ان کو حقیقی کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ نہ ہی ان کی تصانیف کی عرب اور مصر کے علما نے قدر دانی کی اور ہندوستانی مسلمانوں کا بھی معتدبہ حصہ ان علما کے خیالات سے فیضیاب ہونے سے محروم ہو گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے عام علما، بلکہ ہمارے ادبی اداروں کے بلادِ اسلامی کے علمی حلقوں سے اس قدر مختصر روابط ہیں اور عام طور پر ہمارے علما کو جن کی زندگیاں ہندوستان میں گزریں، عربی زبان میں وہ مہارت حاصل کرنا جو اہلِ زبان کا حصہ ہے[1]۔ اس قدر مشکل ہے کہ ہمیں اس پر تعجب نہیں کرنا چاہیے کہ سوائے چند مستثنیات کے ہمارے بہترین علما کی عربی تصانیف اپنے مقصد میں کامیاب نہیں رہیں اور عام طور پر ان کا اثر دُنیائے اسلام کی علمی زندگی پر بہت تھوڑا ہُوا ہے [حجۃ اللہ البالغہ اب ازہر میں شاملِ درس ہو گئی ہے، لیکن جن مصری طُلبا سے ہمیں قیامِ انگلستان میں ملنے کا اتفاق ہُوا وہ سید امیر علی کی سپرٹ آف اسلام سے تو بخوبی واقف تھے، لیکن حجۃ اللہ البالغہ کا انھوں نے نام بھی نہ سُنا تھا۔] لیکن سید مرتضیٰ نے ثابت کر دیا کہ ذہنِ ہندی تو ایسا ہے کہ جن ہندوستانیوں کو اہلِ زبان میں رہ کر عربی زبان حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اور وہ ان کے درمیان تصنیف و تالیف کرتے ہیں، وہ اہلِ زبان سے بھی بازی لے جاتے ہیں اور عربی زبان میں ایسی

---

[1] شاید ہمارے ہاں عربی کی تعلیم میں بھی کچھ ترمیم کی ضرورت ہے۔ عام طور پر پاک و ہند میں جو عربی پڑھائی جاتی ہے۔ وہ کتابی ہے اور قدیم اور ایک زندہ زبان میں بہت تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ہم سے پروفیسر گب نے ایک مرتبہ بیان کیا کہ مستشرقین کی ایک کانفرنس میں ہندوستان سے ایک صاحب اپنا مضمون عربی میں لکھ کر لائے ہوئے تھے اور انھوں نے اسی زبان میں پڑھا۔ لیکن مصر، شام اور دوسرے عرب ممالک کے نمائندوں نے بعد میں کہا کہ وہ اس مضمون کے سمجھنے سے قطعاً قاصر رہے۔ پروفیسر موصوف نے فرمایا کہ چونکہ مجھے اور میرے بعض انگریز ساتھیوں کو ہندوستانی طلبہ کے پڑھانے کا تجربہ تھا اور ان کے لب و لہجہ اور لسانی خصوصیات سے واقفیت تھی۔ اس لیے ہم تو پھر بھی مضمون کو کسی حد تک سمجھ سکے، لیکن مسلمان عرب علما اس سے یکسر محروم رہے۔

دسترس حاصل کر لیتے ہیں کہ بلگرامی کو خود اہلِ زبان عجمی سمجھنے لگتے ہیں!

شیخ محمد حیات سندھی عربی زبان میں تصنیف و تالیف میں جو شہرت علامہ زبیدی نے حاصل کی وہ غالباً کسی دوسرے ہندستانی کو زمانۂ حال میں نصیب نہیں ہوئی۔ لیکن ایسے ہندوستانی علما کی تعداد بہت ہے۔ جنھوں نے مدینہ منورہ یا عرب کے دوسرے شہروں میں درس و تدریس کی محفلیں جمائیں اور ایک عالم کو سیراب کیا۔ افسوس کہ ایسے علما کا جداگانہ تذکرہ مرتب نہیں ہوا۔ ورنہ ان علمی اثرات کا پورا اندازہ ہوتا جو ہندوستانی علما نے عرب اور دوسرے اسلامی ممالک پر ڈالے، لیکن اس فہرست میں بڑے بڑے برگزیدہ نام شامل ہیں اور خوش قسمتی سے ابھی یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ ہم علما میں سے شیخ علی متقی اور شیخ عبدالوہاب متقی کا ذکر کر چکے ہیں اور صوفیہ میں شیخ تاج الدین سنبھلی (خلیفہ خواجہ باقی باللہ) اور شیخ صبغت اللہ بروجی کے کارنامے گنا چکے ہیں جنھوں نے حجاز کو اور حجاز کے راستے باقی عالم کو نقشبندی اور شطاری سلسلوں سے روشناس کیا۔ اس وقت بھی یہ سلسلہ جاری تھا جو علما تکمیلِ تعلیم کے بعد حجاز مقیم ہو گئے تھے اور اپنی قابلیت اور شغفِ علمی کی بدولت وہاں مرجع خاص و عام بن گئے۔ ان میں سندھ کے کئی فاضل تھے جن میں مولانا محمد حیات سندھی مدنی سب سے ممتاز تھے۔ وہ عادل پور (سندھ) کے قریب پیدا ہوئے۔ عنفوانِ شباب ہی میں حج کے لیے گئے اور حج کے بعد مدینہ منورہ میں مقیم ہو گئے۔ مولانا ابوالحسن سندھی مقیم مدینہ اور مولانا عبداللہ بن سالم بصری سے تکمیلِ تعلیم کی اور اپنے آپ کو درسِ حدیث کے لیے وقف کر دیا۔ آپ کا شمار اپنے زمانے کے سب سے نامور محدثوں میں ہوتا تھا۔ آپ مسجد نبوی میں صبح کی نماز سے قبل وعظ کہتے اور ایک جمِ غفیر آپ کے ارشادات سننے کے لیے حاضر ہوتا۔ آپ کے شاگردوں میں میر غلام علی آزاد بلگرامی۔ مولانا فاخر الہ آبادی بلکہ شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدیؒ کے نام لیے جاتے ہیں۔ آپ کی وفات ۱۱۶۳ء میں ہوئی۔

مولوی سلام اللہ محدث :۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا فیض ان کے بیٹے

شیخ نور الحق نے جاری رکھا۔ ان کے دو پوتوں شیخ سیف اللہ اور شیخ محب اللہ نے تصنیف و تالیف اور علم حدیث سے وابستگی کا سلسلہ برقرار رکھا اور بالترتیب شمائل ترمذی اور صحیح مسلم کی شرحیں لکھیں۔ شیخ محب اللہ کے صاحبزادے حافظ فخر الدین نے صحیح مسلم کی فارسی شرح لکھی تھی۔ ان کے بیٹے مولوی شیخ الاسلام صدر الصدور دہلی بھی کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ جن میں صحیح بخاری کی مبسوط فارسی شرح مشہور ہے۔ مولوی سلام اللہ نے بھی حدیث کی اشاعت کے لیے بڑی کوشش کی۔ صحیح بخاری اور شمائل ترمذی کا فارسی میں ترجمہ کیا اور اصول حدیث پر عربی میں ایک کتاب اور موطا کی شرح لکھی، جو شاہ ولی اللہ کی شرح موطا سے زیادہ جامع سمجھی جاتی ہے۔ شیخ سلام اللہ کی وفات ۱۸۱۵ء میں ہوئی۔

شیخ سلام اللہ کے بیٹے شیخ نور الاسلام نے حقیقت زمان و مکان پر دو رسالے لکھے تھے۔

خیر آبادی خاندان: خیر آباد کے علمی خاندان کا آغاز اسی زمانے میں ہوا۔ پہلے قابل ذکر بزرگ مولوی فضل امام خیر آبادی تھے، جو دہلی میں صدر الصدور ہوئے۔ ان کا آمد نامہ اب بھی فارسی کے طلبا استعمال کرتے ہیں۔ ان کے صاحبزادے مولوی فضل حق خیر آبادی تھے، جو غالب کے عزیز دوست اور بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ جنگ آزادی کے بعد آپ رنگون جلاوطن ہوئے اور وہیں ۱۸۵۹ء میں فوت ہو گئے۔ آپ نے علم طبیعیات پر کئی کتابیں لکھیں اور عربی میں ایک کتاب جنگ آزادی ہند پر بھی مرتب کی تھی۔ آپ کا سلسلۂ فیض مولوی عبد الحق خیر آبادی نے جاری رکھا، جو رامپور میں تھے۔ وہ علامہ شبلی کے استاد اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔

شیعہ فرقہ کا فروغ

اٹھارھویں صدی میں شیعیت کا فروغ

اٹھارھویں صدی میں شمالی ہندوستان میں شیعہ مذہب نے بڑا فروغ حاصل کیا۔ مغربی مستشرقین (مثلاً ہالسٹر) کا

اندازہ ہے کہ اورنگ زیب کے امراء کی اکثریت اس فرقہ سے تعلق رکھتی تھی۔ اگرچہ اپنے عقاید پر بعضوں نے احتیاط و مصلحت کوشی کا پردہ ڈال رکھا تھا۔ جب عالمگیر کی آنکھیں بند ہوئیں تو اس احتیاط کی بھی ضرورت نہ رہی۔ نئی روش میں پہل اورنگ زیب کے بیٹے اور جانشین نے کی۔ جس نے حکم دیا کہ خطبہ جمعہ میں علی ولی اللہ وصی رسول اللہ کے الفاظ اضافہ کیے جائیں۔ آگرہ۔ احمد آباد اور بعض دوسرے شہروں میں اہلِ سُنت والجماعت نے اس حکم کی مخالفت کی۔ احمد آباد میں خطیب نے اس پر عملدرآمد کیا تو ہجوم نے برافروختہ ہو کر اسے تہ تیغ کر ڈالا۔ لیکن بادشاہ اپنے فیصلے پر اڑا رہا حتیٰ کہ لاہور میں صورتِ حالات بہت نازک ہو گئی۔ یہاں بادشاہ نے سُنی علماء کو بحث مباحثہ کے لیے بُلایا اور زور سے اپنے فیصلے کی تائید کی۔ ان علماء کے سرگروہ حاجی یار محمد تھے، جو اس زمانے میں فضلائے لاہور میں سب سے زیادہ ممتاز تھے۔ انھوں نے بہادر شاہ کو کھری کھری سُنائیں۔ جب بادشاہ نے کہا کہ کیا تم میرے غضب سے نہیں ڈرتے تو اُنھوں نے جواب دیا کہ میری چار آرزوئیں تھیں۔ حصولِ علم۔ حفظِ قرآن۔ حج اور شہادت۔ خدا کے فضل سے پہلی تین تو پوری ہو گئیں۔ اب زہے قسمت، اگر چوتھی بھی حاصل ہو جائے۔ یہ بحث کئی روز جاری رہی اور بالآخر بادشاہ نے توپخانہ کے افسر کو حکم دیا کہ وہ بروز جمعہ (دوم اکتوبر ۱۷۱۰ء) بادشاہی مسجد کے منبر سے نئے احکام کے مطابق خطبہ پڑھے، لیکن لاہور کے عوام (اور پٹھان سپاہیوں نے طے کیا کہ اس اقدام کا وہ پوری طاقت کے ساتھ مقابلہ کریں گے اور قریباً ایک لاکھ کی تعداد میں جمع ہو گئے۔ جب جمعہ کے روز بادشاہ نے دیکھا کہ لاہور کے بازاروں میں لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ جمع ہیں تو اس نے اپنا حکم منسوخ کر دیا۔ اور سلطنت میں خطبے کے لیے وہی طرز اختیار کی گئی جو عہدِ عالمگیری میں رائج تھی۔ اہلِ لاہور کے اس کامیاب مظاہرے کے بعد کسی مغل بادشاہ نے شیعہ عقائد کی[1]

---

[1] آخری مغل بادشاہ، بہادر شاہ ثانی ظفر کی نسبت ایک زمانے میں لکھنؤ میں مشہور ہو گیا تھا۔ کہ اس نے شیعہ مذہب اختیار کر لیا ہے، لیکن جب سُنی علماء و اکابر نے اس پر مواخذہ کیا تو [باقی اگلے صفحہ پر]

پشت پناہی نہیں کی۔ لیکن اٹھارھویں صدی میں جو نئی ریاستیں اور حکومتیں قائم ہوئیں، ان میں بھاری اکثریت شیعہ حکام کی تھی۔ ان میں پہلی ریاست مرشد آباد کی تھی، جس کی بنیاد عالمگیر کے معتمد اور محبوب دیوان بنگالہ، مرشد قلی خاں نے رکھی۔ اس وسیع حکومت کے بڑے تہذیبی مرکز مرشد آباد، عظیم آباد اور جہانگیر نگر (ڈھاکہ) تھے۔ شاہانِ اودھ کے مورثِ اعلیٰ (برہان الملک سعادت خاں میر محمد امین نیشا پوری) کے خاندان کی پشت پناہی نظامت مرشد آباد نے کی۔ برہان الملک کے بھائی، میر محمد باقر کو نظامت سے وظیفہ ملتا تھا۔ اس بھائی اور اپنے والد سے ملنے کے لیے میر محمد امین نیشاپور سے بنگالہ میں آئے اور پھر محمد شاہی دربار سے بڑا مرتبہ حاصل کر کے حکومت لکھنؤ کے بانی ہوئے۔ بالآخر لکھنؤ شیعہ حکومت اور خیالات کا بڑا مرکز ہو گیا۔ نوابانِ رامپور میں بھی اکثریت اہلِ تشیع کی تھی۔ سندھ میں ریاست خیر پور کے بانی اور رؤسا انھی خیالات کے تھے۔ ان حکومتوں کے علاوہ عام عہدوں اور جاگیروں میں بھی شیعہ حضرات کا بڑا اثر اور رسوخ تھا۔ آخری مغل بادشاہوں کے کئی وزیر انھی عقائد کے تھے۔ مثلاً بہادر شاہ کا وزیر اعظم منعم خاں جس کے مشورے پر بادشاہ نے خطبہ کے الفاظ بدلنے چاہے۔ خود اورنگ زیب کے وزیر اعظم اسد خاں اور سپہ سالار ذوالفقار خاں کے عقائد کے متعلق شبہ ہے۔ سادات بارہہ جن میں "بادشاہ گر" سید برادران (قطب الملک سید عبداللہ خاں اور امیر الامرا سید حسین علی خاں) نے ایک زمانے میں بڑا اقتدار حاصل کر لیا تھا۔ وزیر الممالک صفدر جنگ۔ امیر الامرا نجف خاں تو یقیناً شیعہ خیالات کے تھے۔ عام عہدہ داروں کا تو کوئی شمار نہیں۔ علمی اور ادبی معاملات میں حضرات شیعہ کا مرتبہ اس سے بھی بلند تھا۔ خود اورنگ زیب نے اپنی بیٹی زیب النساء کی تعلیم ایک ممتاز شیعہ فاضل، ملا محمد سعید اشرف ماژندرانی کے

[بقیہ صفحہ ۶۱۷]

بادشاہ نے اس افواہ کی تردید کی اور مرزا غالب سے ایک فارسی مثنوی لکھوا کر عوام و خواص کو اپنے سنّی ہونے کا یقین دلایا۔

سپرد کر رکھی تھی۔ وہ مشہور شیعہ عالم، مولانا محمد تقی مجلسی اصفہانی کے نواسے تھے شیعہ علماء کی مستند تاریخ نجوم السما میں ان کا اپنا علحدہ تذکرہ ہے۔ شہزادی کی بارگاہ میں انھیں جو خصوصیت حاصل تھی، اس کا کچھ اندازہ اس قصیدے سے ہو سکتا ہے جو ایران واپس جانے کے وقت پر انھوں نے شہزادی سے رخصت لینے کے لیے پیش کیا ہ

یکبار از وطن نتواں برگرفت دل — در غربتم اگرچہ فزون است اعتبار

پیش تو قرب و بعد تفاوت نمی کند — گو خدمتِ حضور نباشد مرا شعار

نسبت بہ باطن است چہ دہلی چہ صفہاں — دل پیشِ تست تن چہ بہ کابل چہ در قندھار

وطن میں قیام کے بعد وہ پھر ہندوستان واپس آئے۔ اس وقت عالمگیر کی وفات ہو چکی تھی لیکن اس کے پوتے شہزادہ عظیم الشان حاکم عظیم آباد نے ان کی بڑی قدر کی اور وہ بالآخر مونگیر میں فوت ہوئے۔ اورنگ زیب کے دربار کا سب سے کامیاب نثر نگار اور شاعر نعمت خاں عالی شیعہ تھا اور اس زمانے کے متعدد ممتاز شعرا کا یہی مذہب تھا۔ فارسی شعر و ادب میں ایک ایسے فرقے کا امتیاز جس میں کثرت سے ایرانی الاصل اہلِ قلم شامل ہوں عجیب نہیں۔ لیکن مغلیہ سلطنت کے آخری دور میں علم تاریخ کے میدان میں بھی یہ فرقہ پیش پیش تھا۔ علامہ شبلی نے مضامین عالمگیر میں بڑے شکایت آمیز لہجے میں اس امر کا اظہار کیا ہے کہ عہدِ عالمگیری کے سب سے برگزیدہ مؤرخ شیعہ تھے اور انھوں نے اس زمانے کے واقعات جس انداز سے لکھے ہیں، ان کی بنا پر عالمگیر سے انصاف نہیں کیا جا سکتا۔ علامہ مرحوم کا یہ اظہار کئی لحاظ سے افسوسناک ہے۔ ایک تو یہ خیال کہ (مستثنیات کو چھوڑ کر) عہدِ عالمگیری کے ذمہ دار شیعہ مورخین نے واقعات جانبداری سے اور اصولِ فن کو نظر انداز کر کے لکھے ہیں، غلط ہے۔ دوسرے اہلِ سنت اہلِ علم کے لیے بھی کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ تاریخ کے فن میں عالمگیر کے طویل عہد میں ان کا ایک نامور تاریخ نگار نہ ہوا۔

اُردو ادب کی ابتدا اور ترقی میں بھی شیعہ اہلِ قلم کا بڑا ہاتھ تھا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ہماری علمی اور ادبی زندگی میں شیعہ حضرات کا حصہ ان کی تناسبِ تعداد سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کی ایک وجہ تو اس فرقے میں کثرت سے ایسے (سادات یا ایرانی النسل) اعلیٰ

خاندانوں کی شمولیت ہے، جنھوں نے ہر میدان میں ایک بلند معیار پیش نظر رکھا ہے۔ دوسرے چونکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے شیعہ حضرات کی عقیدت و محبت کی ایک اہم بُنیاد ان کا "باب مدینۃ العلم" ہونا ہے۔ اس لیے اس فرقے میں علم کی محبت ایک مذہبی فریضہ کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور اہلِ علم کا خاص احترام ہوتا ہے اور اٹھارھویں صدی میں (مثلاً میر غلام علی آزاد اور دوسرے سادات بلگرام کی کوششوں میں) اس خصوصیت کے بڑے کامیاب مظاہرے نظر آتے ہیں۔

سیاسی اقتدار اور علمی اور ادبی امتیاز کے علاوہ اٹھارھویں صدی میں شیعہ حضرات کا تجارتی کاروبار میں بھی بڑا عمل دخل تھا۔ بالخصوص سُورت اور ہگلی کی بحری تجارت میں ان کا حصہ بہت تھا۔ سُورت میں بوہرے اور خوجے تجارت میں پیش پیش تھے اور بنگالہ کے شیرازی اور اصفہانی تاجر خاندانوں کا آغاز بھی اسی زمانے میں ہُوا۔

حاجی محمد محسن

اٹھارھویں صدی کے شیعہ اکابر میں ایک نہایت مبارک نام حاجی محمد محسن کا ہے، جو ایک ایرانی تاجر خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ لیکن جن کی اپنی عمر دوسرے مشاغل میں گزری اور جن کی مخیرانہ کوششیں مسلمانانِ بنگالہ کی تاریخ کا سب سے روشن باب ہیں۔ ان کے دادا آغا فضل اللہ بہ شغلِ تجارت ایران سے آئے۔ پہلے مُرشد آباد میں کچھ عرصہ ٹھہرے اور پھر ہگلی میں اقامت اختیار کی، جو کلکتے کی آبادی سے پہلے مشرقی ہندوستان کی سب سے بڑی بندرگاہ تھا۔ یہاں ان دنوں ایک اور ایرانی اہلِ ثروت آغا مطہر مقیم تھے، جنھیں مشرقی پاکستان کے موجودہ ضلع جسور اور بعض دُوسرے علاقوں کی زمینداری اورنگ زیب کی طرف سے ملی تھی۔ آغا مطہر نے اپنے حسنِ انتظام سے اپنی جائیداد میں بڑا اضافہ کیا، لیکن ان کی اولادِ نرینہ کوئی نہ تھی۔ عمر کے آخری حصے میں ان کے ہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی، جس کا نام انھوں نے منوجان خانم رکھا۔ لڑکی کی عمر سات برس کی تھی جب آغا مطہر نے وفات پائی۔ لیکن مرنے سے پہلے انھوں نے اپنی تمام جائداد بیٹی کے نام منتقل کر دی۔ ان کی وفات کے بعد ان کی بیوہ نے آغا فضل اللہ کے بیٹے حاجی فیض اللہ سے شادی کر لی۔ ان کی واحد اولاد

(حاجی) محمد محسن ۱۷۳۲ء میں پیدا ہوئے۔ محمد محسن اور منوجان خانم سوتیلے بھائی بہن تھے، لیکن بہن نے، جو عمر میں آٹھ سال بڑی تھیں، انھیں سگے بھائیوں سے زیادہ عزیز رکھا۔ اور تعلیم و تربیت میں بھی ان کی نگرانی کی۔ ان دونوں کے اُستاد ہگلی کے آغا شیرازی تھے، جو نہ صرف ایک زبردست فاضل، بلکہ جہاندیدہ سیّاح تھے۔ اور انھوں نے اپنے سفر کی کہانیوں سے خردسال محسن کے دل میں بھی سیر و سیاحت کی لگن پیدا کر دی۔ ہگلی میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ مرشد آباد گئے اور وہاں کے مشہور مدرسے میں تکمیل تعلیم کی۔ اس کے بعد وہ ہگلی واپس آگئے اور اپنی ہمشیرہ کے کاموں میں اس کی مدد کی۔ اس کے بعد وہ تینتیس ۳۲ کی عمر میں حج کے لیے روانہ ہوئے۔ واپسی پر سخت تکلیف اٹھائی۔ راستے میں ڈاکوؤں نے قید کر لیا۔ ان سے گلو خلاصی ہوئی تو عراق کا رُخ کیا۔ اور تحصیل علم اور عراق اور ایران کی سیر و سیاحت میں سالہا سال صرف کیے اور ساٹھ سال کی عمر میں اصفہانیوں کے ایک قافلہ کے ساتھ ہندوستان واپس آئے۔ دہلی لکھنؤ۔ بنارس۔ عظیم آباد۔ مرشد آباد ہوتے ہوئے ہگلی پہنچے۔ کبھی قیام ڈھاکہ میں رہتا۔ کبھی مرشد آباد۔ کبھی ہگلی۔ بڑی سادہ زندگی تھی اور آزادانہ بسر کرتے تھے۔ کبھی شادی نہیں کی تھی اور ایک سوتیلی بہن کے علاوہ دُنیا میں کوئی رشتہ دار نہ تھا۔

منوجان خانم کے شوہر مرزا صلاح الدین لاولد فوت ہوئے تھے۔ انھوں نے حاجی محمد محسن کو اپنی تمام جائداد کا مختار بنایا۔ انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے انتظام کیا اور بہن نے مرتے وقت اپنی تمام جائداد ان کے نام منتقل کر دی۔

منوجان خانم کی وفات اکیاسی سال کی عمر میں ۱۸۰۳ء میں ہوئی اور ان کی وسیع جائداد کے وارث حاجی محمد محسن ہوئے، لیکن ان کی سادہ زندگی میں ذرہ بھر فرق نہ آیا۔ تین سال بعد انھوں نے وہ تمام جائداد جس کی سالانہ آمدنی اُس زمانے میں پینتالیس ہزار تھی، امورِ خیر کے لیے وقف کر دی۔ ذاتی مصارف کے لیے اتنی جائیداد رکھی جس کی ماہوار آمدنی سو روپے سے زیادہ نہ تھی۔

حاجی محمد محسن نے ۲۰ ر اپریل ۱۸۰۶ء کو وقف کی باقاعدہ رجسٹری کرائی اُس کے

چھ سال بعد تک وہ زندہ رہے اور یہ زمانہ انھوں نے وقف کے معاملات کو خوش اسلوبی سے سلجھانے میں گزارا۔ ان کی وفات بیاسی برس کی عمر میں نومبر ۱۸۱۲ء میں ہوئی۔ قاضی القضاۃ مولوی سراج الدین علی خاں نے تاریخ لکھی۔ ؎

عارفِ کاملِ زمانہ برفت

حاجی محمد محسن نے جائداد وقف کرتے وقت اس کی سالانہ آمدنی کے نو حصے کئے تھے۔ تین حصے تو امام باڑہ ہگلی کی نگہداشت، مجالسِ محرم اور دوسرے مراسم کے اخراجات اور فاتحہ خوانی کے لیے تھے۔ دو حصے متولیوں کے گزارہ کے لیے اور چار حصے ادارے اور وظائف کے لیے۔ لیکن واقف کی وفات کے بعد جانشین متولیوں نے جو بدعنوانیاں کیں اور جس طرح جعل سازی سے جائیداد اپنے نام دوامی پٹہ پر لینے کی کوشش کی، اس نے بورڈ آف ریونیو کو مجبور کر دیا کہ جائیداد کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے اور بالآخر پریوی کونسل کے فیصلے کے بعد ۱۸۳۵ء میں گورنمنٹ نے طے کیا کہ وہ وقف کی بجا آوری کی ذمہ داری لے۔ گورنمنٹ نے صرف ایک متولی مقرر کیا اور آمدنی کا ۴/۹ حصہ بچا لیا۔ وظائف وغیرہ کے لیے جو چار حصے مقرر ہوئے تھے (اور جنھیں واقف کے مقرر کردہ متولیوں نے دستاویز کے مطابق صرف نہیں کیا تھا) انھیں حکومت نے عام تعلیمی اخراجات کے لیے منتقل کر لیا اور محسن فنڈ کی مدد سے ۱۸۳۶ء میں ہگلی کالج قائم کیا اور سینتیس ۳۷ سال تک اسے محسن فنڈ کی مدد سے چلایا، لیکن مسلمان اس پر معترض تھے کہ ایک اسلامی وقف کو ایک ایسے کالج کے لیے کیوں استعمال کیا جائے، جس سے فائدہ اٹھانے والے بیشتر غیر مسلم تھے۔ ڈاکٹر ہنٹر نے "دی انڈین مسلمانز" میں بااثر طریقے سے اس استدلال کی حمایت کی۔ نواب عبداللطیف نے بھی کوشش کی اور ۱۸۷۳ء میں فیصلہ ہوا کہ ہگلی کالج کے اخراجات کا گورنمنٹ انتظام کرے۔ محسن فنڈ کی آمدنی ڈھاکہ، چٹا گانگ، راجشاہی اور ہگلی میں مدرسے قائم کرنے پر خرچ ہو اور کچھ حصہ مسلمان طلبا کے لیے وقف ہو، تاکہ جو مسلمان بنگال کے کسی انگریزی سکول یا کالج میں تعلیم پائے، اس کی فیس کا دو تہائی حصہ اس فنڈ سے دیا جائے۔

حاجی محمد محسن کے مذہبی عقائد کی نسبت طبقاتِ محسنیہ میں لکھا ہے۔ "در عقائدِ مذہبی طبعش بسوئے مذہبِ جعفری خیلے متوجہ بود۔ اکثرے سنیاں کہ ملازم او بودند حسبِ ہدایت و فرمائش مذہبِ امامیہ اختیار کردند۔ ازاں گروہ رجب علی خاں و شاکر علی خاں متوسلیانِ سابق بودند کہ شیعہ شدند۔"

دکن کے شیعہ علما

شمالی ہندوستان میں شیعہ اقتدار کے مرکز قائم ہو جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں نامور شیعہ علما ایران سے آنے شروع ہوئے یا مقامی باشندوں میں ہی فروغ پانے لگے۔ اس سے پہلے (قاضی نور اللہ شوستری اور ملا محمد یزدی کو چھوڑ کر) شیعہ علما کے نام دکن کی شیعہ سلطنتوں کے ضمن میں آتے ہیں۔ مثلاً میر محمد مومن استرآبادی جو شاہ طہماسپ صفوی کے دربار میں بڑا مرتبہ رکھتے تھے اور ایک شہزادہ اقتدار کی کشمکش میں ناکام رہا تو انھیں بھی اس سے قریبی تعلقات کی بنا پر ایران چھوڑنا پڑا۔ وہ شمالی ہندوستان کے رستے دکن چلے گئے اور سلطان محمد قلی قطب شاہ والیٔ گولکنڈہ کی ملازمت اختیار کی اور رفتہ رفتہ وکیل السلطنت ہو گئے اور کوئی پچیس سال اس عہدے پر فائز رہے۔ نجوم السما کے مطابق ۱۰۲۵ھ میں وہ زندہ تھے۔ اسی طرح میر نظام الدین احمد بن محمد معصوم الحسینی شیرازی تھے۔ ان کے والد شاہ عباس ثانی صفوی کے ہاں بڑا مرتبہ رکھتے تھے۔ جب بادشاہ کی ہمشیرہ حج کے لیے گئیں تو انھیں مناسکِ حج کی تعلیم کے لیے ساتھ بھیجا گیا۔ کچھ اتفاقات ایسے پیش آئے کہ اس سفر میں ہی ان کی شادی اپنی شاگردہ سے ہو گئی۔ اب بادشاہ کے ڈر سے دونوں ایران تو واپس نہ جا سکتے تھے۔ اس لیے مکہ معظمہ میں اقامت اختیار کی۔ وہیں میر نظام الدین احمد پیدا ہوئے اور تعلیم پائی۔ جب ان کے کمالات کا شہرہ ہوا تو میر جملہ نے، جو ان دنوں والیٔ حیدرآباد عبداللہ قطب شاہ کا وزیر تھا، انھیں اور نجف اشرف کے سید سلطان کو بلا بھیجا تاکہ ان عالی خاندان سیدوں سے اپنی دو بیٹیاں بیاہ دے۔ اتفاق سے عبداللہ قطب شاہ کی دو بیٹیاں تھیں۔ وہ بھی چاہتا تھا کہ ان عالی النسب سیدوں سے ان کی شادی ہو۔ اس پر میر جملہ برافروختہ ہو کر حیدرآباد سے چلا گیا اور

اورنگ زیب سے، جو ان دنوں دکن میں گورنر تھا جاملا۔ عبداللہ شاہ کی ایک بیٹی کی شادی میر نظام الدین سے ہوئی۔ لیکن انھوں نے اپنی سالی کی سید سلطان سے شادی کی مخالفت کی اور بالآخر اس لڑکی کی شادی ابوالحسن تاناشاہ سے ہوئی جو گولکنڈہ کا آخری بادشاہ تھا۔ میر نظام الدین ایک شاعر اور عالم اور شاعروں کے قدردان تھے۔ ان کی وفات ۱۶۶۷ء یا ۱۶۶۸ء میں بمقام حیدرآباد ہوئی۔ دکن میں آنے سے پہلے ان کی حجاز میں شادی ہوچکی تھی اور اس سے ان کے ہاں ایک بیٹا مولانا صدرالدین علی المعروف سید علی خاں مدنی مدینے میں پیدا ہوا تھا۔ جو علم و فضل میں اپنے باپ سے بھی بازی لے گیا۔ وہ ۱۰۵۲ھ میں پیدا ہوئے اور حصول تعلیم کے بعد والد سے ملنے حیدرآباد چلے گئے، لیکن اس کے جلد بعد عبداللہ قطب شاہ چل بسا اور اس کے ایک سال بعد ان کے والد بھی وفات پاگئے۔ اب ابوالحسن تاناشاہ تخت نشین تھا۔ اس نے میر نظام الدین کے متعلقین کو دِق کرنا شروع کیا۔ سید علی حیدرآباد چھوڑ کر برہان پور میں اورنگ زیب سے جاملے، جو اب بادشاہ تھا اور معاملاتِ دکن کو سلجھانے کے لیے یہاں پہنچا تھا۔ انھیں ایک اعلیٰ منصب ملا۔ اور ایک زمانے میں یہ برہان پور کے دیوان بھی مقرر ہوئے۔ لیکن بالآخر انھوں نے اورنگ زیب سے اجازت لی اور وطن کا رُخ کیا۔ پہلے اصفہان میں سلطان حسین صفوی کے پاس پہنچے لیکن جب اس نے کماحقہٗ قدر نہ کی تو اپنے وطن شیراز کا رُخ کیا۔ اور وہاں مدرسہ منصوریہ میں تعلیم و تدریس میں زندگی کے باقی دن گزار دیے اور وہیں اپنے بزرگوں یعنی امیر صدرالدین محمد اور امیر غیاث الدین منصور کے پہلو میں دفن ہوئے۔ مشہور شاعر حزیں جس نے ان سے اصفہان میں ملاقات کی۔ ان کی بڑی تعریف کرتا ہے۔ وہ عربی اور فارسی کے بڑے شاعر تھے۔ اور نثر میں دوسری تصانیف کے علاوہ انھوں نے اپنے زمانے کے ادیبوں کا ایک بیش قیمت تذکرہ سلافۃ العصر فی محاسن اعیان العصر کے نام سے عربی میں لکھا۔

مرشد آباد شمالی ہندوستان میں پہلا اہم شیعہ ثقافتی مرکز مرشد آباد

تھا۔ شروع میں اس کا نام مخصوص آباد تھا، لیکن جب مرشد قلی خاں دیوان بنگالہ نے سنہ ۱۷۰۴ء میں شہزادہ عظیم الشان ناظم بنگالہ سے چپقلش کی بنا پر صوبائی دارالحکومت ڈھاکہ کو خیر باد کہا اور نئے مقام میں ٹکسال اور دفاتر قائم کر کے اسے دیوانی کا صدر مقام بنایا تو اس کا نام بھی اپنے نام پر مرشد آباد رکھا۔ بعد میں وہ ناظم بنگالہ بھی ہو گیا اور بہار و اڑیسہ بھی اس کے تحت دے دیا گیا اور اس طرح یہ شہر بنگال، بہار، اڑیسہ کی نیم مختار حکومت کا دارالسلطنت ہو گیا۔ ڈھاکہ، عظیم آباد اور ہگلی اس کے تابع تھے۔ افسوس کہ مرشد آباد کی ثقافتی تاریخ نہیں لکھی گئی۔ اس موضوع کی اپنی دلچسپی بھی بہت ہے۔ اس کے علاوہ مرشد آباد شمالی ہندوستان اور مشرقی بنگال (ڈھاکہ) کے درمیان ایک ثقافتی سنگم تھا اور مشرقی پاکستان کی ثقافتی تاریخ اس کے مطالعہ کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ پھر لکھنؤ کے فروغ سے پہلے، جب دہلی، نادری اور درانی حملوں میں برباد ہوئی تو اہل علم کے لیے بڑی جائے پناہ مرشد آباد تھا۔ مثلاً مشہور شاعر سوزؔ، میر دردؔ کے صاحبزادے المؔ، فدوی دہلوی، شاہ رکن الدین عشقؔ، اشرف علی خاں فغاںؔ، شاہ قدرت اللہ خاں قدرتؔ اس سلسلے میں دہلی سے مرشد آباد پہنچے۔ ان میں سے کچھ تو حالات سدھرنے پر دہلی واپس چلے گئے۔ بعض نے عظیم آباد کو ترجیح دی، لیکن شاہ قدرت اللہ کی وفات مرشد آباد میں ہوئی۔ (سنہ ۱۷۹۱ء) مشہور شاعر انشا کا خاندان بھی زوال دہلی کے زمانے میں وہاں گیا اور انشا خود مرشد آباد میں پیدا ہوئے۔ وہ بعد ازاں دہلی واپس چلے گئے لیکن ان کی شاعری اور شخصیت میں کئی عناصر ایسے ہیں، جن میں مرشد آباد کا اثر صاف نظر آتا ہے۔

ہماری تہذیبی تاریخ میں مرشد آباد کا ایک خاص مقام ہے، لیکن شیعیت کی تاریخ میں مرشد آباد (اور اس کے ثقافتی جانشین عظیم آباد کی اہمیت اس سے بھی زیادہ ہے۔ بدقسمتی سے اب نظامت بنگالہ کی مذہبی تاریخ کے متعلق مواد دستیاب نہیں ہوتا۔ فقط سیر المتاخرین میں غلام حسین خاں طباطبائی نے علی وردی خاں کی وفات کے سلسلے میں چند شیعہ علما و مشائخ کے نام گنائے ہیں اور تذکرہ گلشن ہند میں اس علاقے کے

اُردو شعرا کے نام ملتے ہیں۔ سیر المتاخرین میں بعض اہم نام مصنف کے اپنے خاندان کے ہیں۔ مثلاً اس کے دادا سید علیم اللہ طباطبائی جو ۱۱۲۷ھ میں عظیم آباد آئے اور ۱۱۶۳ھ میں وہاں وفات پا گئے۔ ان کے حالات اور کرامات پر غلام حسین خاں نے ایک علیحدہ مثنوی بشارت الامت کے نام سے لکھی ہے۔ شاہ حیدری اس کی حقیقی دادی کے چچا تھے۔ "در تشیع نہایت مجاہر و بے باک"۔ وہ بھاگلپور میں مقیم تھے۔ جب یہاں پر ایک رئیس محمد غوث خاں سخت بیمار پڑے۔ شاہ حیدری ان کے پاس پہنچے اور کہا کہ تم شیعہ ہونے کا وعدہ کرو۔ میں تمھاری شفا کا ذمہ لیتا ہوں۔ انھوں نے قبول کیا۔ اتفاق سے وہ اچھے ہو گئے اور تمام عمر شاہ حیدری کے حلقہ بگوش رہے۔ بعض علما باہر سے آئے تھے اور بعض نے یہاں سے ایران جا کر تعلیم حاصل کی۔ مثلاً شیخ محمد حسن جو (مشہور شاعر حزیں کی طرح) ایران پر افغانوں کے غلبے کے بعد ہندوستان آئے۔ میر قاسم ناظم بنگالہ نے انھیں عظیم آباد میں زمین عطا کی۔ جہاں ان کا مزار ہے۔ سب سے بزرگ و با اثر علامہ سید محمد علی تھے۔ جن کی پیدائش دکن میں ہوئی، لیکن تعلیم ایران کے علما سے کبار سے حاصل کی۔ حج کے لیے مکہ معظمہ جا رہے تھے کہ جہاز طوفان میں تباہ ہو گیا اور یہ سندھ کے کنارے پر پہنچے۔ وہاں سے احمد آباد۔ سورت۔ اورنگ آباد۔ ہگلی۔ لکھنؤ۔ عظیم آباد ہوتے ہوئے پھر حج کو گئے اور حج اور زیارتوں کے بعد مرشد آباد پہنچے۔ سراج الدولہ نے ان کی قدر نہ کی بلکہ مکان سے نکال دیا۔ لیکن علی وردی خاں ان کا بڑا مداح و معتقد تھا۔ اس کے چچا حاجی احمد کا ایک بیٹا سراج اللہ کی مخالفت کی پروا نہ کرتے ہوئے برہنہ پا ان کی خدمت میں پہنچا اور دریا کے کنارے ایک مکان ان کی اقامت کے لیے نذر کیا۔ سید محمد علی نے یہاں درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا۔ انھوں نے عربی اور فارسی میں کئی کتابیں تصنیف کیں۔ مقفے عربی میں، قدیم محققین و عرفا کے طریقے پر حضرت پنجتن پاکؑ کے حالات لکھے اور مُلا محسن کاشی کی علمِ فقہ کی دو کتابوں کی عربی اور فارسی شرح لکھی۔ علمِ نحو میں بھی ایک نامکمل فارسی رسالہ لکھا اور رسائل اخوان الصفا کے کئی نسخے جمع کر کے تحقیق و مقابلہ کے بعد ایک

صحیح نسخہ مرتب کیا۔ سیر المتاخرین کا مصنف ۱۷۸۰ء میں عظیم آباد سے کلکتے جاتے ہوئے مرشد آباد ٹھہرا اور ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ مرشد آباد کے بیشتر اکابر سید محمد علی کی خدمت میں حاضر ہو کر مستفید ہوتے تھے۔

جن مقامی علما نے ایران میں تعلیم حاصل کر کے امتیاز حاصل کیا۔ ان میں شیخ پورہ (بہار) کے مولوی نصیر اور ان کے صاحبزادے تھے۔ جس زمانے میں امیر الامرا شائستہ خاں حاکم بنگالہ تھے، اس وقت یہاں ایران سے آخوند ملا شاہ محمد شیرازی تشریف لائے، لیکن جلد واپس چلے گئے۔ مولوی نصیر تحصیل علم کے لیے ان کے ساتھ ایران روانہ ہوئے۔ اور ان کی سواری کے ساتھ پا پیادہ چل کر ہر روز سبق حاصل کرتے۔ ایران میں وہ چوٹی کے علما کی خدمت میں پہنچے اور فقہ و احادیث اور علوم دنیوی، بالخصوص ہیئت، ہندسہ اور حساب میں امتیاز حاصل کیا۔ ایران میں ان کی بڑی عزت تھی، لیکن وہ ہندوستان واپس آئے اور عظیم آباد میں مقیم ہو گئے۔ ان کے بیٹے داؤد علی خاں ان سے تعلیم حاصل کر کے ان کے جانشین ہوئے۔ کچھ دیر بعد زیارتوں کے لیے گئے اور اس میں اتنا شغف حاصل کیا کہ ان کا لقب ہی زائر حسین خاں ہو گیا۔ ان کے صاحبزادے محمد حسن خاں ہوئے۔ مرشد آباد میں ایک قابل ذکر ہستی قاضی غلام مظفر کی تھی، جنھیں علی وردی خاں نے اپنا داروغۂ عدالت مقرر کیا تھا۔ "مردِ خوش تقریر باکثر فنونِ علمی ماہر و در نظم و نثر سلیقۂ لائق داشت۔"

شاہانِ اسلام کا عام دستور رہا ہے کہ خواہ دلی لگاؤ کی خاطر، خواہ عوام میں اپنی علم نوازی کا سکہ بٹھانے کے لیے علما سے خاص امتیاز کرتے۔ بلبن، بایں ہمہ طنطنہ و تکبر پورے کوکبۂ شاہی کے ساتھ برگزیدہ علما کے گھر جاتا۔ علما کو تمام شاہی دعوتوں میں بلانے اور ان سے علمی اختلاط کے لیے وقت نکالنے کا رواج تو عام تھا۔ مرشد آباد میں بھی اس پر عمل درآمد تھا۔ علی وردی خاں کے مصروف نظامِ اوقات میں علمی مجالس کے لیے بھی وقت تھا۔ جب وہ عصر کی نماز سے فارغ ہوتا تو علمی اور دینی مجلس برپا ہوتی۔ "افاضل و ابرار مثل سید الافاضل میر محمد علی فاضل ادام اللہ عزہ، و تقی قلی خاں و حکیم ہادی خاں و

مرزا محمد حسین صفوی و فاضلے دیگر ملتانی" (جس کا نام مؤلف سیر المتاخرین کو یاد نہیں رہا۔) دیوان خانے میں تشریف لاتے۔ سید محمد علی کا اس محل میں جو احترام ہوتا، وہ دیکھنے کی چیز ہے۔ دیوان خانے میں ناظم کی مسند کے بالمقابل ان کے لیے مستقل مسند رکھی تھی، جس پر ایک بڑا تکیہ پڑا رہتا۔ جب وہ باہر کے دروازے میں داخل ہوتے اور چبوترے پر قدم رکھتے۔ علی وردی خاں اپنی مسند پر کھڑا ہو جاتا اور جب وہ چبوترے اور صحن کا فاصلہ طے کر کے وسیع ایوانِ عمارت میں داخل ہوتے تو بُعد و فاصلہ کے باوجود علی وردی خاں مسند سے اُتر کران کو با ادب سلام کرتا۔ وہ جواب دیتے اور اپنی مسندِ معینہ پر جا بیٹھتے۔ اس وقت علی وردی خاں اپنے پہلو سے ایک تکیۂ کوچک ان کی خدمت میں پیش کرتا۔ پھر علما کے لیے حقّے لائے جاتے اور قہوے کا دَور شروع ہوتا۔ علی وردی خاں حُقّہ نہیں پیتا تھا، لیکن قہوے میں شریک ہوتا۔ ابتدائی مراسم ختم ہو جاتے تو فاضل مُلتانی کے سامنے تکیہ دھرا جاتا۔ جس پر امامیہ مذہب کی ایک نہایت اہم کتاب رکھی جاتی۔ وہ اس میں سے چند اجزا پڑھتے، جن کی تشریح و تفہیم سید محمد علی کرتے۔ پھر علمی اور دینی مسائل پر گفتگو ہوتی۔ دو گھنٹے تک یہ مجلس قائم رہتی۔ پھر سید محمد علی رخصت ہوتے اور اسی احترام و مراسم کے ساتھ جن سے ان کا خیر مقدم ہُوا تھا، علی وردی خاں انھیں خیر باد کہتا۔ آہستہ آہستہ دُوسرے علما تشریف لے جاتے اور یہ مجلس ختم ہوتی۔

مُرشد آباد کے تمدن میں فقط خوبیاں اور نیکیاں ہی نہ تھیں۔ جو باتیں دورِ زوال میں قائم شدہ اکثر شخصی ریاستوں میں عام تھیں، مرشد آباد ان سے مستثنیٰ نہ تھا، لیکن مُرشد قلی خاں جو ۱۷۲۷ء تک برسرِ اقتدار رہا اور علی وردی خاں جو ۱۷۴۰ء سے ۱۷۵۶ء تک ناظم تھا، وہ بڑے قابل اور منتظم حاکم تھے اور انھوں نے مُرشد آباد کو ایک اہم سیاسی اور ثقافتی مرکز بنا دیا تھا۔

عظیم آباد

مرشد آباد کے ساتھ ساتھ عظیم آباد کا ذکر بھی واجب ہے جو ۱۷۳۲ء میں مُرشد آباد کے تابع آگیا۔ لیکن اپنے محلِّ وقوع اور مرشد آباد

کے تیز سیاسی زوال) کی وجہ سے زیادہ اہم اور پائدار ثقافتی مرکز ثابت ہُوا۔ اس کی اہمیت اس وقت شروع ہوئی جب ۱۷۰۲ء میں شہزادہ عظیم الشان حاکم بنگالہ نے ڈھاکہ کی جگہ پٹنہ کو اپنا صدر مقام چُنا۔ کئی عمارتوں اور محلوں کا اضافہ کیا اور شہر کا نام اپنے نام پر عظیم آباد رکھا۔ بعد میں ناظم بنگالہ کا دارالحکومت مرشد آباد ہُوا لیکن بہار کا ناظم یا نائب ناظم عظیم آباد میں رہتا تھا اور شہر کا ثقافتی تسلسل برقرار رہا۔ مرشد آباد کے اثر سے یہاں کئی اہم شیعہ خاندان آباد ہوئے اور اب بھی موجود ہیں۔ لیکن اس معاملے میں یہاں کیفیت مرشد آباد سے کسی قدر مختلف رہی اور یہ محض اتفاق نہیں کہ نادری حملہ کے بعد جب دہلی کے شاعر اور ادیب منتشر ہوئے تو مظہر جانجاناں کے اکثر نامور تلامذہ و مرید جن میں سے بعض مثلاً ہیبت قلی خاں حسرت۔ میر محمد باقر حزیں محمد فقیہ درد مسند اساتذہ فن میں شمار ہونے کے لائق ہیں۔ مرشد آباد نہیں گئے۔ عظیم آباد آئے۔

عظیم آباد کی ثقافتی تاریخ لکھنا یہاں ممکن نہیں۔ صرف چند اہم ناموں کو گنایا جا سکتا ہے۔ شاید ان میں سرِفہرست سیر المتاخرین کے مصنف غلام حسین خاں طباطبائی کا نام ہے۔ ان کے والد علی وردی خاں کے قرابتدار تھے اور کچھ دنوں عظیم آباد میں صوبیدار رہے لیکن بیٹے کا اصل طرۂ افتخار سیر المتاخرین کی تصنیف ہے۔ اس میں کئی فنی نقص ہیں مصنف کا تعصب مذہبی تو صاف ظاہر ہے لیکن مغلوں کے عہدِ زوال کی اس سے زیادہ مکمل تاریخ کوئی نہیں۔ مصنف کی معلومات وسیع تھیں اور انگریزوں اور نئی ایسٹ انڈیا کمپنی کے کاموں اور اصولوں پر انھوں نے جس جراُت اور معاملہ فہمی سے تبصرہ کیا ہے، وہ اسلامی ہندوستان کے سیاسی ادب میں (سرسید کے اسبابِ بغاوت کی طرح) ایک معرکے کی چیز ہے۔ انھوں نے اپنے دادا شاہ علیم اللہ دہلوی کے حالات میں ایک مثنوی بشارت الامامت اور مثنوی مولانا روم کی ایک شرح بھی لکھی۔

جو مرتبہ طباطبائی کا سیاسی تاریخ نگاری میں ہے، قریب قریب وہی رتبہ نواب علی ابراہیم خاں کا ادبی تاریخ میں ہے۔ ان کے ادبی اور سیاسی کارناموں کا ابھی صحیح

جائزہ نہیں لیا گیا لیکن وہ ایک غیر معمولی شخصیت اور مستعدی کے انسان تھے۔
وہ عظیم آباد کے قریب شیخ پورہ میں پیدا ہوئے۔ مرشد آباد میں نشو و نما پائی۔ وہ ایک زمانے
میں عظیم آباد کے نائب ناظم ہو گئے اور میر قاسم کے وزیر با تدبیر اس زمانے میں تھے،
جب وہ انگریزوں سے برسرِ پرخاش تھا۔ اس کے باوجود انگریز ان کی قابلیت کے
معترف تھے۔ آخر میں وہ مرشد آباد میں خانہ نشین ہو گئے تھے (تذکرہ مسرت افزا)
لیکن ۱۷۸۱ء میں جب وارن ہیسٹنگز کلکتہ سے مغرب کی طرف تسخیرِ ممالک کے لیے چلا
تو راستے میں مرشد آباد سے نواب علی ابراہیم خاں کو "بصد اعزاز و اکرام" اپنے ساتھ لیا اور
جب راجا چیت سنگھ والیِ بنارس کو برطرف کیا تو نواب ابراہیم کو عدالتِ دیوانی ضلع
بنارس کا حاکمِ اعلیٰ مقرر کیا۔ لارڈ کارنوالس کے عہد میں وہ وہاں کے گورنر بھی رہے۔
قیامِ بنارس کے دوران میں انھوں نے ادبی اور سیاسی تاریخ نگاری کی طرف توجہ کی۔
ان کی مشہور ترین تصنیف اردو شعرا کا تذکرہ گلزارِ ابراہیم ہے جس کا اردو ترجمہ (گلشنِ ہند)
انجمن ترقی اردو نے شائع کیا ہے۔ اس کا زیادہ حصہ مرشد آباد میں لکھا گیا۔ مرشد آباد اور
عظیم آباد کی ادبی تاریخ جاننے کے لیے اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ فارسی شعرا
کا تذکرہ صحفِ ابراہیم انھی خوبیوں کا مخزن ہے جو اردو تذکرے کا مابہ الامتیاز ہیں۔
لیکن یہ زیورِ طبع سے محروم ہے۔ خلاصۃ الکلام مثنوی نگار فارسی شعرا کا تذکرہ ہے۔
ان کے علاوہ کئی تاریخی کتب اور "خطوط" ان سے یادگار ہیں ۱۷۹۳ء میں بمقام بنارس
وفات پائی۔ نواب کی ڈیوڑھی کے نام سے ایک محلہ اب تک ان کے نام سے وہاں
آباد ہے۔

اٹھارھویں صدی میں عظیم آباد کی ایک اور قابلِ ذکر خصوصیت یہاں کے بعض ہندو
کائستھ رؤسا کا فروغ ہے جنھوں نے اردو ادب کی سرپرستی کی۔ مثلاً مہاراجا شتاب رائے
جو عظیم آباد کے نائب صوبہ اور مرشد آباد کے نائب دیوان تھے۔ ان کے دربار سے
اشرف علی خاں فغاں جیسے شاعر وابستہ تھے۔ بڑے انقلابوں کے بعد ۱۷۷۵ء میں
وفات پائی۔ ان کے بیٹے مہاراجا کلیان رائے عاشق بھی صاحبِ دیوان شاعر تھے۔

ان سے پہلے میر جعفر کے زمانے میں مہاراجا رام نرائن موزوں عظیم آباد میں ناظم تھے۔ وہ فارسی میں حزیں کے شاگرد تھے اور اردو میں بھی صاف توشگوار شعر کہتے تھے۔ میر قاسم نے انھیں معزول کر کے ۱۷۶۳ء میں گنگا میں غرق کر دیا۔

عظیم آباد کی دوسری ادبی ہستیوں میں راسخ تھے جنھیں بہار کا میر کہا جاتا ہے۔ ۱۸۲۵ء میں وفات پائی۔ ان کے ہمعصر بلکہ پیشرو شاہ رکن تھے۔ انیسویں صدی کی قابل ذکر ہستیوں میں شاہ الفت حسین فریاد تھے، جو ۱۸۰۴ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۸۱ء میں وفات پا گئے۔ ۱۸۳۵ء میں وہ مرشد آباد چلے گئے۔ اور مرشد زادوں کے اتالیق مقرر ہوئے۔ چار سال بعد وہ ناظم مرشد آباد کی طرف سے سفیر ہو کر کلکتے گئے اور ۱۸۷۱ء تک وہیں رہے۔ ان ستیس سالوں میں وہ سولہ برس تک عہدہ سفارت پر مامور رہے۔ بعد میں استعفےٰ دے دیا، لیکن کلکتے میں علمی اور ادبی زندگی میں ان کا بڑا مقام تھا۔ انھوں نے فارسی زبان میں کئی اخبارات مثلاً آئینۂ گیتی نما نکالے۔ اکابر کلکتہ ان کا بڑا ادب کرتے تھے، بلکہ اکثر (مثلاً خان بہادر عبداللطیف بانی محمڈن لٹریری ایسوسی ایشن۔ عبیدی سہروردی۔ مولنا عبدالرؤف وحید) آپ کے شاگرد تھے۔ آپ کی مفصل سوانح عمری (حیات فریاد) آپ کے فخر استاد شاگرد جناب شاد عظیم آبادی نے اپنی وفات سے ایک سال پہلے ۱۹۲۶ء میں مکمل کی۔ فی الحقیقت یہ کتاب عظیم آباد۔ مرشد آباد۔ کلکتہ کی علمی اور ادبی زندگی کا مرقع ہے۔ شاد خود متعدد تاریخی اور ادبی کتب کے مصنف اور ایک قادر الکلام شاعر تھے۔

انیسویں صدی میں بہار کے جن بزرگوں نے نام پایا، ان میں صفیر بلگرامی تھے، جو آگرے میں بس گئے تھے اور دوسری کتب کے علاوہ جلوۂ خضر کے مؤلف تھے۔ ان کے علاوہ فرد۔ میر وزیر علی عبرتی۔ شاہ فرزند علی صوفی۔ سید شاہ امین احمد فردوسی شوق۔ آغا حسین قلی عاشقی مؤلف تذکرہ نشتر عشق بھی قابل یاد ہیں، لیکن شاید بہار کا اس صدی کا سب سے اہم ثقافتی کارنامہ بانکی پور لائبریری کا قیام ہے۔ جس کا آغاز خان بہادر مولوی خدا بخش کے والد نے کیا تھا، لیکن جسے انھوں نے بے انتہا

وسعت دے کر اسلامی دنیا کا ایک اہم کتب خانہ قائم کر دیا اور ۱۸۹۰ء میں اسے وقف کیا۔
اسی صدی میں عظیم آباد کے محلہ صادق پورہ نے شہرت پائی جو مولانا سید احمد شہید بریلوی کے سفر عظیم آباد (۱۸۲۱ء) کے بعد دینی اور علمی سرگرمیوں کا بڑا مرکز ہو گیا تھا۔ ان دینی سرگرمیوں کا ذکر ہم موج کوثر میں کریں گے۔ علمی حیثیت سے اس مرکز کے نمائندے حکیم مولانا عبدالحمید پریشان تھے، جن کے والد ماجد مولانا احمد اللہ صاحب کو ۱۸۶۵ء میں حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ملی تھی۔ حکیم صاحب کا علمی فیض ان کے نواسہ ڈاکٹر عظیم الدین عظیم نے جاری رکھا، جن کے بیٹے ڈاکٹر کلیم الدین احمد اردو تنقیدی حلقوں میں بڑی شہرت رکھتے ہیں۔

لکھنؤ کے اکابر شیعہ علما

شمالی ہندوستان میں شیعیت کا سب سے اہم مرکز لکھنؤ ہے۔ وہاں کی ادبی اور ثقافتی تاریخ پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ شیعہ علما پر بھی مستقل کتابیں ممتاز لکھنوی اہل قلم نے لکھی ہیں، لیکن ان کی زیادہ شہرت نہیں ہوئی۔ اور شیعہ علما کے حالات سے عام طور پر بے خبری ہے۔

مجتہد العصر مولانا دلدار علی صاحب

شیعہ علما میں سب سے اہم مولانا سید دلدار علی صاحب تھے۔ وہ ہندوستان کے پہلے مجتہد تسلیم کیے جاتے ہیں اور نجوم السما میں لکھا ہے کہ ان علاقوں میں جو کوئی شیعہ مذہب کا چرچا ہے۔ وہ ان کی بدولت ہے (" وآنچہ دریں دیار قدرے از دین و اسلام است۔ ہمہ از برکات آنجناب غفران مآب است") انھوں نے پہلی مرتبہ شمالی ہند میں شیعہ جماعت کی مذہبی تنظیم کی۔ ان کی علیحدہ نماز جمعہ اور باجماعت نماز کا سلسلہ شروع کیا اور اشاعت و ترویج شیعیت پر پوری توجہ کی۔ وہ نصیر آباد میں ۱۱۶۶ھ/۱۷۵۳ء پیدا ہوئے۔ ہندوستان کے فضلا سے علوم عقلیہ حاصل کرنے کے بعد وہ عراق تشریف لے گئے اور تکمیل تعلیم کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ کربلائے معلیٰ اور نجف اشرف میں جو مشہور اساتذہ تھے

ان کی خدمت میں پہنچے اور "فقہ و حدیث و اصول" کی تعلیم حاصل کی۔ پھر مشہد گئے اور وہاں کے بزرگوں سے فیض حاصل کیا۔ ہندوستان واپس آکر اہل و عیال کو لکھنؤ بلا لیا اور یہیں اپنے آپ کو تصنیف و تالیف اور اشاعت و تنظیمِ شیعیت کے لیے وقف کر دیا۔

اس زمانے میں فیض آباد میں (جو لکھنؤ کے فروغ سے پہلے کچھ عرصہ تک اودھ کا دارالحکومت رہا) مُلا محمد علی کشمیری کا بڑا شہرہ تھا۔ وہ مُلا عبدالحکیم کشمیری کے شاگرد تھے اور کشمیر سے آکر فیض آباد میں مقیم ہو گئے تھے۔ ان کی زیادہ توجہ علم فقہ پر تھی۔ انھوں نے فضیلتِ نمازِ جماعت پر ایک رسالہ لکھا، جس میں نواب آصف الدولہ کی توجہ اس طرف دلائی کہ اس کے مُلک میں مولٰنا سید دلدار علی جیسا دیندار اور مجتہدینِ کربلا و مشہد کا مانا ہُوا عالم موجود ہے جو پیش نماز ہونے کے ہر طرح لائق ہے۔ اگر نواب نمازِ پنجگانہ اس کے پیچھے پڑھیں تو ہر جگہ نماز با جماعت کا رواج ہو جائے گا۔ نواب نے مُلا محمد علی کشمیری کا یہ مشورہ قبول کیا اور مولٰنا دلدار علی کو نمازِ جماعت میں پیشِ امام بننے پر آمادہ کر لیا اور اودھ میں ایک نئی مذہبی زندگی کا آغاز ہُوا۔

مولٰنا دلدار علی کئی کتابوں کے مُصنف تھے۔ مثلاً مراۃ العقول (ملقب بہ عماد الاسلام) جو پانچ ضخیم جلدوں میں لکھی گئی۔ پہلی جلد مباحثِ توحید کے متعلق دوسری مباحثِ عدل اور متعلقہ مسائل کے بیان میں۔ تیسری نبوّت۔ چوتھی امامت اور پانچویں معادِ جسمانی و رُوحانی کے متعلق تھی۔ نجوم السما میں لکھا ہے "الحق کتابیست کہ گوشِ فلک نظیرش نشنیدہ و چشمِ روزگار عدیلش ندیدہ" اساس الاصول بھی اسی طرح کی ایک ٹھوس کتاب ہے۔ ان دو کے علاوہ آپ نے چھ کتابیں اور رسالے شاہ عبدالعزیز دہلوی کی تحفہ اثنا عشریہ کے مختلف ابواب و بیانات کی تردید میں لکھیں۔ تصوّف کے مخالف تھے۔ شہابِ ثاقب میں آپ نے "مذاہبِ مبتدعہ صوفیہ" پر نکتہ چینی کی ہے اور ان مشہور صوفیہ کی تردید کی، جو وحدت الوجود کے قائل تھے۔ اس مستقل کتاب کے علاوہ آپ نے مولوی محمد سمیع صُوفی کے جواب میں ایک رسالہ لکھا۔

جس میں تصوف کا ابطال کیا ہے اور شیعہ علما کو اس سے پاک ثابت کیا ہے۔ ان کے علاوہ کئی رسالے فقہی مسائل کے متعلق تھے۔ مثلاً رسالہ ذہبیہ جو ظروف ذہبی کے احکام کے متعلق ہے۔ رسالہ ارضیین جس میں املاک و اراضی اور ان معاملات کے جو کفار ہندو وغیرہ سے پیش آتے ہیں مسائل بیان ہوئے ہیں وغیرہ۔ مولٰنا دلدار علی نے ۴ مئی سنہ ۱۸۲۰ء میں وفات پائی۔ مزار لکھنؤ میں ہے۔

سلطان العلما سید محمدؒ صاحب مجتہد العصر:۔ مولٰنا دلدار علی صاحب کے کام کی اہمیت صرف ان کی تصانیف اور ذاتی تنظیمی کوششوں میں نہیں، بلکہ ان کے تلامذہ اور فرزندوں نے ان کا کام جاری رکھا اور اس کی بنیادیں گہری اور پختہ کر دیں۔ ان کے مشہور تلامذہ میں سے مفتی سید محمدؐ قلی خاں کنتوری۔ مرزا محمدؐ خلیل زائر۔ سید احمد علی محمد آبادی اور میر مرتضےٰ کے نام لیے جاتے ہیں۔ مولوی یاد علی نے جو آپ کے چچیرے بھائی اور شاگرد تھے، کلام مجید کی فارسی تفسیر شیعہ نقطۂ نظر سے لکھی، لیکن آپ کا اصل فیض آپ کے فرزندوں نے جاری رکھا۔ ان میں سب سے بڑے اور والد کے جانشین اور وہی سلطان العلما مولٰنا سید محمد تھے۔ "مرجع خلائق در ریاست دینی و دنیوی بود"۔ شاہانِ اودھ کے عہد میں ان کا وہی مرتبہ تھا جو بعض سنّی ممالک میں شیخ الاسلام کا ہوتا ہے۔ شاہانِ اودھ کی رسمِ تاجپوشی کے وقت سلطان العلما ہی ان کے سر پر تاج رکھتے۔ مملکت کے تمام شرعی اور مذہبی امور آپ کی رائے سے طے پاتے۔ محکمہ افتا آپ کے سپرد تھا اور آپ کی سفارش پر ہی مفتی اور اس محکمہ کے دوسرے ملازم مقرر ہوتے۔ آپ کے مشورے سے ایک مدرسۂ شاہی قائم کیا گیا۔ بادشاہ آپ کی رائے کا بڑا پاس کرتے اور وہ اپنا اثر و رسوخ شیعہ ضرورت مندوں کی حاجت پوری کرنے اور شیعہ مذہب کی اشاعت و تقویت کے لیے استعمال کرتے۔ غالب کے فارسی خطوط پڑھنے والے جانتے ہیں کہ اسے شاہانِ اودھ سے عطیہ اُس وقت وصول ہُوا، جب اس نے سلطان العلما کو اپنا ذریعہ و واسطہ بنایا۔ اور جب بہادر شاہ نے غالب سے ایک فارسی مثنوی لکھوا کر اپنی شیعیت کی تردید کرائی تو غالب کو مجتہد العصر سلطان العلما سید محمد صاحبؒ کے سامنے اس کے لیے

جواب دہ ہونا پڑا۔ اس خاندان کے ساتھ غالب کے خاص مراسم تھے۔ جب سلطان العلما کے بھائی سید العلما سید حسین نے وفات پائی تو غالب نے ایک بڑا پُردرد مرثیہ لکھا ؎

گشت داغِ غمِ حسینِ علی
تازہ در ماتمِ حسینِ علی

جس دبدبے اور اخلاقی جرأت کے انسان سلطان العلما تھے، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب چند روز کی راحت روی کے بعد واجد علی شاہ عیش و عشرت میں منہمک ہو گیا تو مجتہد العصر نے اپنے عہدے سے استعفیٰ پیش کیا، لیکن واجد علی شاہ نے اصرار کیا کہ یا تو خود یہ فرائض بجا لائیں یا اپنے خاندان سے کسی دوسرے کو نامزد کریں اور فرقہ امامیہ کی ضروریات کی طرف توجہ دلائی تو مجتہد العصر کو استعفیٰ واپس لینا پڑا۔ (۱۸۴۸ء) ہنومان گڑھی کے واقعہ پر بھی آپ نے مولوی فضل حق خیر آبادی اور مولوی سعد اللہ سے زیادہ جرأت ایمانی کا ثبوت دیا اور لکھا "قصاص مسلمانان از کافراں و قصاص کلام اللہ و بنا نهادن مسجد بر حکام وقت بہ تجویز حاکم شرع واجب است" (تاریخ اودھ حصہ پنجم ص ۲۲۴ و ص ۲۳۶)

شاہانِ اودھ (بالخصوص امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ) کے زمانے میں سلطان العلما کو جو اقتدار حاصل تھا۔ وہ ان کے والد بزرگوار کے حصے میں بھی نہ آیا، لیکن ان کے حصے میں تلخ لمحے بھی زیادہ تھے۔ اودھ کی حکومت کا خاتمہ آپ کی آنکھوں کے سامنے ہوا اور جنگِ آزادی کے بعد جب لکھنؤ پر دوبارہ انگریزی قبضہ ہوا۔ تو آپ کو لکھنؤ سے ہجرت کر کے قریب کے ایک قصبہ میں پناہ لینی پڑی اور اپنے خاندان اور عیال و اطفال کے ساتھ تشویش اور پریشانی کا ایک پُرآشوب زمانہ دیکھنا پڑا۔

آپ کی وفات ۲۴ جولائی ۱۸۶۸ء کو ہوئی اور اپنے خاندانی قبرستان میں مدفون ہوئے۔

آپ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ تحفہ اثنا عشریہ کے ایک حصہ (باب امامت) کا بھی آپ نے جواب لکھا جو نظر ثانی نہ ہو سکنے کے باعث شائع نہ ہوا۔ لیکن ایک رسالہ اس

کتاب کے بعض اندراجات کی تردید میں عام طور پر ملتا ہے۔ ایک رسالہ فوائد نصیریہ کے نام سے آپ نے احکامِ زکوٰۃ خمس کے متعلق لکھا اور غالباً آپ کے اثر سے ہی شاہانِ اودھ میں پہلی مرتبہ امجد علی شاہ نے باقاعدہ زکوٰۃ دینی شروع کی جو تین لاکھ سالانہ کے قریب تھی اور آپ کی نگرانی میں محتاجوں اور مستحقوں کو نصیب ہوتی۔

آپ کے جانشین آپ کے صاحبزادے سید ابوالحسن ہوئے جنھیں واجد علی شاہ نے مٹیا برج کے قیام کے دوران میں ملاذ العلما اور حکومت انگلشیہ نے شمس العلما کا خطاب دیا۔

سید دلدار علی صاحب کے دوسرے بیٹے بھی علم و فضل میں ممتاز تھے۔ سید علی ۱۷۸۶ء میں پیدا ہوئے اور عراق میں تعلیم پائی اور تصنیف و تالیف اور تعلیم و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ انھوں نے کئی مباحثوں اور مناظروں میں حصہ لیا اور واقعۂ فدک۔ متعہ۔ جواز تعزیہ داری کے متعلق رسائل لکھے۔ لیکن ان کا اہم ترین کام کلامِ مجید کی اُردو زبان میں تفسیر ہے جو دو جلدوں میں مکمل ہوئی اور امامیہ نقطۂ نظر کی ترجمان ہے۔ تفسیر کی تکمیل کے بعد وہ اپنے بعض دوستوں کے ساتھ زیارتوں کے لیے عراق کی طرف روانہ ہوئے اور اس سفر کے دوران میں ۱۸۴۱ء میں کربلائے معلّٰی میں وفات پا گئے۔ ایک اور صاحبزادے سید حسن تھے۔ انھوں نے اصولِ دین پر دوسری کتب کے علاوہ اُردو زبان میں ایک مبسوط کتاب لکھی۔ ان کی وفات ۱۸۴۴ء میں بمقام لکھنؤ ہوئی۔

پانچویں صاحبزادے سید مہدی تھے۔ وہ تیئیس برس کی عمر میں اپنے والد کی زندگی ہی میں وفات پا گئے۔ مولانا دلدار علی کو اس ہونہار بیٹے کی جوانمرگی کا بڑا رنج ہوا جس کا اظہار انھوں نے ایک کتاب مسکن القلوب میں کیا ہے۔

لکھنوی شیعیت کی خصوصیات

مولانا سید دلدار علی اور ان کے خاندان کی شمالی ہندوستان میں اثنا عشری خیالات کی تنظیم و اشاعت میں قریب قریب وہی حیثیت ہے جو عام مسلمانوں میں شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان کی ہے۔ لیکن تصوف کی جس طرح مولانا نے مخالفت کی۔ اس سے

کئی شیعہ اہل الرائے متفق نہیں۔ مثلاً حیاتِ فریاد میں سید علی محمد شاد صفوی بادشاہوں کی ان کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے جو سیاسی اور دوسری مصلحتوں کی بنا پر انھوں نے تصوف کو بیخ و بُن سے اکھاڑ دینے کے لیے کیں، لکھتے ہیں :۔

"اس شیعہ گروہ علمائے ریاضت، متصوفین با دین و دیانت کے مٹا ڈالنے اور ان کی جڑ بنیاد کھود ڈالنے کے لیے ایک زمانہ میں جبکہ شاہ سلطان حسین صفوی بادشاہ ایران تھا اور جناب علامہ مجلسی قاضی القضاۃ تھے، بارہ سو فاضل صرف اس امر کی تحقیق میں سرگرم تھے کہ دریافت کریں کہ کون الٰہیات و ریاضیات میں مشغول ہے تاکہ اس کی تردید کریں۔ علمائے ظاہر و شریعت محض کا نہایت سختی سے برتاؤ تھا۔ طہارتِ جسمانی کے آگے طہارتِ باطن کا دھیان اور خیال تک نہ رہا تھا۔ ان باتوں کی طرف متوجہ تھے کہ یوں ہاتھ کو غوطہ دو اور یوں پاؤں کا مسح کرو۔ اور اس قسم کے بیانوں میں بال کی کھال کھینچی جاتی، اصل جڑ طہارت باطن و صفائی قلب کے خیال کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ ہندوستان کی شیعہ جماعت تو تابع اور شاگرد علمائے عراق و ایران کی ہے۔ یہی حالت ہندوستان بھر کے شیعوں کی ہو گئی کہ باطنیت کا کہیں نام تک نہیں رہا۔ بقول جناب آقا احمد مجتہد بہبہانی کے شاخ کو پکڑ لیا۔ اور جڑ کھود ڈالی۔ جس زمانے میں جناب غفران مآب مولانا سید دلدار علی مغفور تحصیل علوم دینی کے لیے عراق تشریف لے گئے تھے تو علمائے باطن میں سے ایک بھی عراق و ایران میں نہ تھا اور اگر کوئی ہوگا تو بالکل پوشیدہ پہاڑوں میں چھپا ہوگا۔ حضرت غفران مآب جو سبق وہاں سے پڑھ آئے تھے یہاں کے شیعوں نے طوطوں اور میناؤں کی طرح رٹنے شروع کیے۔ پھر انیس مرحوم کے اس مصرعہ کو "جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے" خلافِ شریعت کیوں نہ سمجھا جاتا۔

راقم موجودہ شیعوں کے اعتقادات کو ہرگز بُرا نہیں جانتا، جو ظاہر شرع کے مطیع و منقاد ہیں۔ مگر یہ ضرور کہوں گا کہ تصوف ہر مذہب کی رُوح و جان ہے۔ اگر اس کو نکال دیا تو مذہب بے رُوح ہو کے رہ گیا۔"

سید علی محمد خود شیعہ تھے۔ اس لیے ہم نے ان کی رائے کو تفصیل سے نقل کر دیا لیکن تصوف کے متعلق یہ رائے ان تک محدود نہیں۔ ہندوستان میں تصوف کا رنگ عام طور پر

اس طرح چھایا ہوا ہے کہ شیعہ حضرات بھی اس سے پوری طرح آزاد نہیں مغربی پاکستان، بالخصوص سندھ اور جنوب مغربی پنجاب میں کئی صوفی خانوادے ایسے ہیں، جن کے بزرگ شیعہ خیالات کے ہیں۔ خود دہلی میں غالب شیعہ تھا اور مولانا دلدار علی کے خاندان سے اس کے خاص مراسم تھے، لیکن وہ وحدت الوجود کا قائل تھا اور چشتی خاندان کے ایک بزرگ کا مرید تھا۔ خاص طور پر متشرع اور ثقہ حلقوں اور مرکزوں کے باہر شیعیت اور تصوف کے اس امتزاج نے فرقہ وارانہ اختلافات کم کر دیے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس برعظیم[1] میں بالخصوص ان علاقوں میں جو اب پاکستان میں ہیں شیعہ سنّی تعلقات خوشگوار رہتے ہیں۔

دُوسرے عُلمائے شیعہ

مولانا سید دلدار علی کے خاندان کے علاوہ اس زمانے میں کئی اور نامور شیعہ علما تھے۔ ان میں مُلا محمد علی کشمیری کا ہم ذکر کر چکے۔ ایک اور سرگرم شیعی بزرگ مرزا محمد کامل بن عنایت احمد خاں کشمیری مقیم دہلی تھے۔ وہ ایک حاذق طبیب تھے، لیکن شیعہ سنّی مباحث میں بڑی دلچسپی لیا کرتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز سے ان کی تحفہ اثنا عشریہ سے پہلے ہی بحثیں ہُوا کرتی تھیں اور جب یہ کتاب عام ہوئی تو مرزا نے اس کے جواب میں نزہت اثنا عشریہ لکھی۔ اس کا ذکر ہم تحفہ اثنا عشریہ کے ضمن میں کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی مرزا نے متعدد کتب تصنیف کیں۔ مثلاً تاریخ العلماء "در منتخب کنز العمال ملا علی متقی کہ درآں احادیث مشعلہ بر امامت جناب امیرؑ و دیگر ائمہ ہدیٰ و مثالب و معائب خلفائے ثلاثہ و دگر اصحابہ انتخاب فرمودہ"۔ ایک اور کتاب علامہ ابن حجر عسقلانی کی ایک تالیف سے اخذ کی گئی تھی اور اس میں

---

[1] خود واجد علی شاہ کی نسبت مولوی عبدالحلیم شرر کا بیان پڑھنے کے قابل ہے۔ "بادشاہ اگرچہ شیعہ تھے مگر مزاج میں مطلق تعصب نہ تھا۔ ان کا پرانا مقولہ تھا۔ میری دو آنکھوں میں سے ایک شیعہ ہے اور ایک سُنّی ہے" (گذشتہ لکھنؤ)۔ مٹیا برج کلکتہ کے قیام میں واجد علی شاہ کا سارا انتظامی کاروبار سُنیوں کے ہاتھ میں تھا۔ وزیر اعظم (منصرم الدولہ) منشی السلطان وغیرہ سُنّی تھے۔ شیعہ مذہبی تقریبات کا انصرام بھی ان کے ہاتھ میں تھا۔

صحاح ستہ کی قابلِ اعتراض باتیں جمع کی تھیں یہ کتاب تنبیہ اہل الکمال والانصاف علی اختلال رجال اہل الخلاف دراں اسمار رجال کذابین و وضاعین و مجہولین و ضعفاء خوارج و نواصب قدریہ و مرجیہ راکہ اربابِ صحاح ستہ کہ بقول اصح عبارت از صحیح بخاری و مسلم و ترمذی و مالک و نسائی و ابوذر است ۔ در کتاب صحاح خود آوردہ اند۔ ایں کتاب را از تقریب ابن حجر عسقلانی استخراج فرمودہ" ایک اور کتاب میں اہلِ سنت کے تعصبات اور قابلِ اعتراض خیالات کو جمع کیا تھا۔

مرزا محمدؒ کی وفات بڑے افسوسناک حالات میں ہوئی اور اس سے اُس زمانے کے مذہبی مناقشات پر روشنی پڑتی ہے۔ نجوم السما کے بیان کے مطابق اس زمانے میں بادشاہِ وقت کا ایک رشتہ دار امیر نواحِ دہلی میں رہتا تھا۔ وہ بڑا متعصب سنّی تھا اور مرزا کی تصانیف پڑھ کر خون کے گھونٹ پیا کرتا تھا۔ اس نے ایک دفعہ بیماری کا بہانہ کیا اور بادشاہ کو کہلا بھیجا کہ اس کے شفا پانے کی واحد صورت یہ ہے کہ مرزا محمدؒ کو اس کے علاج کے لیے بھیجا جائے۔ بادشاہ نے باصرار انھیں جانے کے لیے کہا وہ نہیں جانا چاہتے تھے، لیکن بادشاہ کے حکم سے مجبور ہو گئے۔ روانگی کے وقت وہ کہتے تھے کہ میرے لیے یہ سفر موت کا بلاوا ہے اور سب سے حقوق بخشوا کر روانہ ہوئے چنانچہ یہی ہوا۔ انھیں زہر دے دیا گیا اور دہلی میں لا کر پنجہ شریف میں جہاں شیعہ اکابر کی قبریں ہیں، دفن کیا گیا۔ یہ واقعہ ۱۸۲۰ء میں رُونما ہوا۔

علّامہ تفضل حسین کاشمیری

مذکورہ بالا بزرگوں کے علاوہ اور کئی شیعہ علما نے اس زمانے میں شہرت پائی۔ لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس زمانے میں جب فرقہ وارانہ اختلافات زوروں پر تھے، سب سے زبردست شیعہ عالم ایک ایسا بزرگ تھا، جس نے اختلافی مسائل پر کچھ نہیں لکھا۔ یعنی علّامہ تفضل حسین خاں کشمیری۔ وہ شیعہ خیالات کے تھے۔ نجوم السما میں ان کی نسبت لکھا ہے "در تشیع خالی و نور ولائے ائمہ اطہار صلوٰۃ اللہ علیہم از سیمائے او لامع"۔ وہ کشمیری الاصل تھے۔ لاہور میں پیدا ہوئے۔ دہلی میں تربیت

پائی ۔ فلسفہ و حکمت میں تکمیلِ تعلیم بنارس جا کر شیخ علی حزیں سے کی اور تصنیف و تالیف اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے ۔ وہ علوم ریاضی کے بڑے ماہر تھے ۔ عربی، فارسی، انگریزی، لاطینی اور یونانی خوب جانتے تھے ۔ حکمائے مغرب کی کئی کتابیں انھوں نے عربی میں ترجمہ کیں اور جبر و مقابلہ، مغربی علمِ ہیئت، ہندسہ اور طبعیات کی کئی مستقل کتابیں خود لکھیں ۔ نمازِ ظہر سے پہلے فقہ امامیہ اور اس کے بعد فقہ حنفی کا درس دیا کرتے تھے ۔ آصف الدولہ نے انھیں لکھنؤ بلا کر اپنا نائب مقرر کر دیا، لیکن وہ اس کام سے خوش نہ تھے اور دُنیاداروں کا طریقہ اختیار کرنے سے انھوں نے انکار کر دیا ۔ انھوں نے نیابت کے زمانے میں بھی اپنی سادگی برقرار رکھی ۔ اور دروازے پر دربان تک مقرر نہ کیا جو عرضدار آتا سیدھا ان تک پہنچتا اور ہر وقت حاجتمندوں کا ہجوم رہتا ۔ آصف الدولہ کی مسند پر نواب سعادت علی خاں بیٹھا تو اس نے بھی آپ کی نیابت کو برقرار رکھنا چاہا ۔ لیکن آپ استعفیٰ دے کر کلکتہ چلے گئے اور گوشہ عزلت میں اپنے علمی مشاغل اور مطالعہ میں مصروف ہو گئے، لیکن اب دماغی محنت اور کثرتِ کار کی وجہ سے آپ کی صحت تباہ ہو چکی تھی ۔ ۱۷۹۹ء میں آپ پر فالج کا حملہ ہوا اور دماغ بھی متاثر ہو گیا ۔ جب کلکتے میں علاج سے فائدہ نہ ہوا تو تبدیلی آب و ہوا کے لیے لکھنؤ کی طرف روانہ ہوئے، لیکن لکھنؤ پہنچنے سے پہلے موت کا پیغام آ پہنچا اور یکم مارچ ۱۸۰۱ء کو وفات پا گئے ۔

اسماعیلی فرقے

ہم نے شمالی ہند کے علمائے شیعہ کے حالات کسی قدر تفصیل سے بیان کر دیے، لیکن یہ سب اثنا عشری تھے ۔ شیعوں کا ایک دُوسرا اہم فرقہ اسماعیلی ہے جو ایک زمانے میں اثنا عشری فرقے سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا اور شاید آج بھی پاکستان کے شیعہ حضرات میں اس فرقے کی تعداد کافی ہے ۔ افسوس ہے ان کے علما و زعما کے حالات دستیاب نہیں ہوئے ۔ تواریخ کی کتب سے اتنا پتا چلتا ہے کہ عہدِ عالمگیری میں جب ترویجِ شرع کی کوششیں ہوئیں تو گجرات کے اسماعیلیوں سے مواخذہ کیا گیا ۔ بعض بوہرہ سرگروہوں کو گرفتار کر لیا گیا اور اپنے پیروؤں سے جو رقمیں وہ وصول کرتے تھے، انھیں بند کرنے کی کوشش کی گئی ۔ لیکن اورنگ زیب کے بعد

یہ پالسی برقرار نہ رکھی گئی۔ بلکہ شاہ عالم اوّل نے بوہرہ داعی کو جس کا صدر مقام اس وقت اجین تھا، امتیازی خطابات دیے اور اجین شہر کا قاضی مقرر کر دیا! (ڈانلڈسن)

لیکن شاید اسماعیلی تاریخ میں دورِ آخر کا سب سے اہم واقعہ یہ تھا کہ خوجوں کے سرگروہ ایران سے ترکِ وطن کر کے ہندوستان میں آ مقیم ہوئے۔ آغا خان اوّل ۱۸۴۰ء میں فتح علی شاہ قاچار سے بگڑ کر ہندوستان میں پناہ گزیں ہوئے اور اُس وقت سے آغاخانی خوجوں کی نئی تنظیم کا آغاز ہوا۔ بوہرہ جماعت کے داعی نے بھی ۱۷۸۵ء میں سُورت کو اپنا صدر مقام بنایا، جو ان کی جماعت کے لیے زیادہ سازگار ثابت ہوا۔

اٹھارھویں صدی کے مشائخ

عہدِ عالمگیری میں کئی اہل اللہ ہوں گے اور رقعاتِ عالمگیری میں دو تین ایسے بزرگوں (مثلاً شیخ عبداللطیف برہانپوریؒ کے نام آتے ہیں، جن کا اورنگ زیب بڑا مدّاح تھا، لیکن شاید سیّد مرتضیٰ ملتانی کے سوا (جن کی عبرت آموز داستان خافی خاں نے تفصیل سے لکھی ہے اور جنھیں عہدِ عالمگیری کا شیخ علائی سمجھنا چاہیے) کوئی بھی ایسا نہیں، جس کا ذکر تاریخی کتب میں تفصیل سے آتا ہو۔

زوالِ حکومت کے زمانے میں البتہ تصوّف کو پھر فروغ ہوا۔ اور خانقاہ نشین بزرگوں میں نہ صرف بعض سربرآوردہ ہستیاں پیدا ہوئیں، بلکہ کئی نقشبندی بزرگوں (مثلاً وحدت۔ گلشن۔ مظہر) نے فارسی ادب میں نام حاصل کرنے کے علاوہ مقامی زبان کی سرپرستی کی اور اس عمل کو تقویت دی، جس کی بدولت ان کے شاگردوں (مثلاً ولی احمد آبادی۔ میر درد۔ یقین۔ تاباں) نے دکنی اور بھاشا کی کایا پلٹ کر جدید اُردو کی بنیاد رکھی اور اس زبان کا آغاز کیا، جو قومی خیالات اور احساسات کے اظہار کے لیے فارسی کی جگہ لینے والی تھی۔

چشتیہ سلسلے کا احیاء

اس زمانے کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ چشتیہ سلسلے نے دو تین سو سال کے بعد بارِ دگر

رونق پائی اور اس کا باعث اس طریقے کے دو تین بزرگ تھے جو یکے بعد دیگرے اس زمانے میں ظہور پذیر ہوئے۔ ایک شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی ہیں جو شاہجہاں آباد میں پیدا ہوئے اور سفرِ حج کے دوران میں شیخ یحییٰ مدنی سے بیعت ہوئے۔ انھوں نے واپس آ کر وطن میں چشتیہ سلسلے کی اشاعت شروع کی۔ کہتے ہیں کہ اورنگ زیب کا بیٹا بہادر شاہ شیعہ عقائد سے تائب ہونے کے بعد آپ کا مرید ہوا تھا۔ آپ کی وفات ۱۱۴۲ھ/۱۷۲۹ء میں ہوئی۔ آپ کے جانشین شیخ نظام الدین دلی اورنگ آبادی تھے، جو شمالی ہندوستان کے رہنے والے تھے، لیکن جنھیں آپ نے تعلیم دے کر اورنگ آباد دکن میں ارشاد و ہدایت کے لیے بھیجا۔ یہاں شیخ نظام الدین کو بڑا فروغ ہوا، بلکہ مشہور ہے کہ نظام الملک آصف جاہ آپ کے مرید ہو گئے تھے۔ سلسلے کی خدمت میں ان کے بیٹے مولانا فخر الدین فخر جہاں شاہجہاں آبادی ان سے بھی بڑھ گئے۔ وہ اورنگ آباد میں پیدا ہوئے تھے، لیکن ان کی کوششوں کا میدان شمالی ہندوستان تھا۔ یہاں دہلی میں بیٹھ کر آپ نے اطرافِ ملک میں خلفا بھیجے، جنھیں اپنے کام میں بڑی کامیابی ہوئی۔ پنجاب میں آپ نے مولانا نور محمد مہاروی کو بھیجا تھا، جنھوں نے خانقاہِ تونسہ (ضلع ڈیرہ غازی خاں) کے بانی خواجہ سلیمان تونسوی اور گولڑہ (ضلع راولپنڈی) جلالپور (ضلع گجرات) اور چاچڑاں کے بزرگوں کو مرید کیا۔ روہیل کھنڈ میں ان کے مرید اور مشہور صوفی شاعر مولانا نیاز احمد صاحب نیاز بریلوی نے چشتیہ نظامیہ سلسلے کو چمکایا۔ بادشاہِ وقت اکبر شاہ ثانی بھی آپ کا مرید تھا اور آپ کے حالات نظام الملک کے پوتے، نواب غازی الدین خاں وزیر سلطنت نے مناقبِ فخریہ کے نام سے جمع کیے ہیں۔ میاں کالے صاحب جن کا بہادر شاہ ظفر مرید تھا اور جو مشہور شاعر غالب کے مربی تھے، مولانا فخر الدین کے پوتے تھے۔ مولانا کی وفات ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۴-۸۵ء میں ہوئی۔

نقشبندیہ سلسلہ

نقشبندیہ سلسلے نے بھی اس صدی میں خوب رونق پائی اور اس سلسلے کے کئی بزرگوں نے اردو زبان اور شاعری کی تشکیل اور نشو و نما میں مدد دی۔ جب بندہ بیراگی نے سرہند کو تباہ و برباد کر دیا تو جو حضرات

یہاں سے ترکِ مکان کر کے دہلی چلے گئے، ان میں ایک بزرگ شیخ عبدالاحد سرہندیؒ معروف بہ شاہ گل وحدت حضرت مجدد الف ثانیؒ کے پوتے تھے۔ وہ دہلی میں علما ومشائخ کے اس حلقے میں داخل ہوئے، جس میں حکیم الامت شاہ ولی اللہ کے والد ماجد شاہ عبدالرحیم اور چچا شیخ ابوالرضا محمدؒ کا آنا جانا تھا۔ انفاس العارفین میں کئی جگہ ان کا ذکر آتا ہے اور شاہ ولی اللہ نے ان کے بعض مکاتیب بھی درجِ کتاب کیے ہیں۔ ان کے ایک مرید حاجی محمد افضل تھے، جن سے حکیم الامت نے حدیث پڑھی۔

شاہ گلشن دہلوی:۔ ان کے دوسرے مرید شیخ سعد اللہ گلشن دہلوی تھے، جن کا وطن برہانپور تھا، لیکن دہلی اس طرح جا کر بسے کہ دہلوی ہو گئے۔ وہ خود شاعر اور بہت سے شاعروں کے مرشد اور اُستاد تھے۔ کلمات الشعرا میں سرخوش نے انھیں اپنا شاگرد بتایا ہے۔ گو بعد میں ہمخیالی کی کشش سے انھوں نے بیدل کی صحبت اختیار کر لی تھی۔ ریختہ الفکر میں ان کی نسبت لکھا ہے:"آپ شیخ عبدالاحد کے خلیفہ ہیں۔ شعر بہت عمدہ کہتے ہیں۔ چنانچہ اکثر شعرا آپ ہی کے شاگرد ہیں۔ باطنی حالات بھی آپ کے اعلےٰ تھے"۔ آپ نے اپنے مرشد کے عُرف شاہ گل کی مناسبت سے اپنا تخلص گلشن رکھا۔ شاہ صاحب ایک تارک الدنیا بزرگ تھے۔ جامع مسجد دہلی میں رہتے۔ کئی کئی دن کے بعد کھانا کھاتے اور اکثر ترکاریوں کے چھلکوں اور ستوں پر گزارہ کرتے۔ آپ شاہ ولی اللہ کے ہمعصر تھے اور شاہ صاحب نے انفاس العارفین میں آپ کی زبانی بعض روایتیں نقل کی ہیں۔ آپ سیر وسیاحت کے سلسلے میں ایک عرصہ احمد آباد گجرات جا کر رہے تھے[1]۔

سروِ آزاد میں آپ کے ایک سیر ضخامت دیوان کا ذکر ہے اور میخانہ درد میں دو لاکھ اشعار کا اندازہ لگایا گیا ہے، لیکن ہمیں مختلف تذکروں سے فقط چند شعر دستیاب ہوئے ہیں[2]۔ تذکرہ نشترِ عشق میں لکھا ہے کہ آپ نے علمِ موسیقی میں ایسی تحقیقات کی کہ

---

[1] سرخوش لکھتا ہے: طبعے درست دارد۔ مدتے پیشِ فقیر مشق کردہ جنونے بہم رسانده از دار الخلافہ برآمد۔ الحال در گجرات بسر مے بُرد"۔ [2] ملاحظہ ہو ملفوظات شاہ غلام علیؒ (قلمی)۔ [3] انڈیا آفس لائبریری (مجموعۂ دہلی) کی غیر مطبوعہ فہرست دیکھنے سے پتا چلا کہ وہاں دیوان کے دو قلمی نسخے ہیں۔

آپ کو دوسرا امیر خسرو کہتے تھے۔ بائیس سال بلادِ دکن کی سیر کی اور بیس[۲] برس دہلی میں مقیم رہے۔ تذکروں میں آپ کے جو اشعار ملتے ہیں۔ وہ ملاحظہ ہوں ؎

بدرش رفتہ سجدہ ہا کردم — منتِ پائے ماست بر سرِ ما

صحبت جاناں نیستند از چارہ سازاں کامیاب — مومیائی نفع کے بخشد شکستِ سنگ را

کلکِ من صورت کشِ معنیٔ رنگیں رواست — گر کسند گلشن تخلص بلبلِ طبعم رواست

بہ چشمِ خویش نگر سحرِ سامری این است
نظر بہ آئینہ کن شیشۂ پری این است

گشتم شہید تیغ تغافل کشیدنت — جانم ز دست برد غزالانہ دیدنت

سرِ دیوانگی سلامت باد — راز مارا چہ پردہ پوشی کرد

حیرت بہارِ گلشنِ نظارۂ خودیم — آئینہ خانۂ دلِ صد پارۂ خودیم

بہ دقت مے تواں فہمید معنی ہائے نازِ او — کہ شرح حکمت العین است مژگانِ درازِ او

ز شوقِ مہرِ رخسار یکہ چشمم گریہ پیرا شد
چو گوہر در گرہ ہر اشکِ من دارد سحر گاہے

مکن با در بحر فے قطعِ الفت کر د شوخِ من — کہ چوں مقراض ایں ظالم زباں زیرِ زباں دارد

ماہ و سالم بے تو در روزِ سیاہ مستور بود — چوں نگاہِ کور عمرِ من شب دیجور بود

آدم الشعرائے اردو ولی دکنی شاہ گلشن کا شاگرد تھا اور شاید دہلی میں نہیں، بلکہ شاہ صاحب کے طویل قیام احمد آباد کے دوران میں ان سے فیضیاب ہوا۔ ولی نے شاہ گلشن ہی کے ایما پر اپنا دیوان فارسی دواوین کے طرز پر مرتب کیا اور اس میں وہ مضامین باندھے جو فارسی شاعری سے مخصوص تھے۔ اس سے پہلے زیادہ تر اردو میں بھاشا کے مضامین ہوتے تھے (ملاحظہ ہو سرو آزاد کا تتمہ) یا ریختہ کی فقرہ گری اور غیر تعینی خیالات۔ شاہ صاحب نے ولی کو مشورہ دیا "ایں ہمہ مضامین فارسی کہ بے کار افتادہ اند در ریختۂ خود بکار ببر از تو کہ محاسبہ خواہد گرفت" ... شما زبان دکنی را گذاشتہ ریختہ را موافق اردوئے معلی شاہجہاں آباد موزوں بکنید کہ تا موجبِ شہرت و رواج قبول خاطر صاحب طبعانِ عالی مزاج گردد" (تذکرہ قدرت) اور "ایں ہمہ مضامین فارسی کہ بے کار افتادہ اند

در ریختہ بکار بر۔ از تو کہ محاسبہ خواہد گرفت" ولی نے آپ کے مشوروں پر عمل کیا۔ اس وقت سے اُردو شاعری فارسی کے نقشِ قدم پہ چلی اور آہستہ آہستہ یہ زبان فارسی کی جانشین ہوئی۔

شاہ صاحب کے ایک اور شاعر مرید خواجہ محمد ناصر عندلیب تھے، جن کے صاحبزادے خواجہ میر درد اُردو کے بہترین صوفی شاعر ہونے کے علاوہ کئی ضخیم صوفیانہ کتابوں کے مصنف تھے۔ میر درد ایک شعر میں اپنے معنوی بزرگوں کا ذکر کر کے لکھتے ہیں ؎

قدرِ ایں ناچیز را داند جناب عندلیب
گرچہ جز کاہے نیم، اما گیاہ گلشنم

شاہ گلشن کی وفات ۱۷۲۶ء میں ہوئی۔ مزار دہلی میں ہے۔

مرزا مظہر جانجاناں:۔ ایک اور نقشبندی شاعر اور اُردو زبان کے محسن مرزا مظہر جانجاناں تھے، جو ۱۶۹۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۷۸۰ء میں ایک شیعہ کی گولی سے ہلاک ہوئے۔ وہ طبقۂ امرا کے رُکن تھے۔ ان کی پیدائش پر اورنگ زیب عالمگیر نے ان کے والد مرزا جان کے نام پر ان کا نام جانِ جاں رکھا، لیکن جانجاناں نے زیادہ شہرت پائی۔ انھوں نے ترکِ دنیا کر کے تصوّف اور شعر و ادب کے لیے زندگی وقف کر دی اور شیخ عبدالاحد سرہندی المتخلص وحدت والمعروف شاہ گل کے کئی خلفا سے فیض حاصل کیا۔

آزاد نے مظہر جانجاناں اور خواجہ میر درد کے حالات میں کسی قدر ہجوِ ملیح سے کام لیا ہے اور ان نقشبندی بزرگوں سے اُن خیالات کا انتقام لیا ہے، جو اس سلسلے کے کئی قدیمی بزرگ حضراتِ شیعہ کی نسبت رکھتے تھے، لیکن معاصرانہ تذکروں سے پتا چلتا ہے کہ غیر معمولی نازک مزاجی اور دل گداختگی کے باوجود مرزا صاحب، دقیقہ رسی، علمیت مذاقِ سلیم، انصاف پسندی اور تصوّف میں یگانۂ روزگار تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحب ان کی نسبت لکھتے ہیں:۔

"آنچہ قدرِ ایشاں ما مردم میدانیم۔ شما چہ دانید۔ احوال مردم ہند بر ما مخفی نیست کہ خود

مولد و منشا فقیر است در بلادِ عرب را نیز دیدہ ایم و سیر نمودہ ۔ احوال مردم ولایت از ثقات آنجا شنیدہ ایم و تحقیق کردہ کہ عزیزے کہ بر جادۂ شریعت و طریقت و اتباعِ کتاب و سنّت ہمچنیں استوار و مستقیم باشد و در ارشادِ طالبان شانِ عظیم و نفسِ قوی دارد ۔ دریں جزو زمان مثل ایشاں در بلادِ مذکور یافتہ نمیشود ۔ مگر در گزشتگان ' بلکہ در ہر جزو زماں وجودِ ایں چنیں عزیزاں کمتر بودہ است ۔ چہ جائے ایں زماں کہ پُر فتنہ و فساد است "

مرزا صاحب کئی کتابوں کے مصنّف تھے ۔ ان میں سے آپ کے مکتوبات خاص غور و فکر کے مستحق ہیں ۔ بعض مکتوبات میں حضرت مجدّد الف ثانی کے متعلق اعتراضات کا جواب دیا ہے ۔ بعض میں صوفیانہ اور شرعی مسائل کی توضیح ہے ۔ بعض خطوں سے اس زمانے کی بدنظمی اور بے ترتیبی پر روشنی پڑتی ہے ۔ ایک طویل خط میں ہندوؤں کے آئین و مذہب کی نسبت اپنی رائے لکھی ہے ۔ اور چونکہ ایک مسلّمہ بزرگ کے قلم سے اس مسئلے پر اس قدر تفصیلی اظہار شاذ و نادر ہی کہیں ہُوا ہوگا ۔ اس لیے ہم اس کا پورا ترجمہ درجِ ذیل کرتے ہیں :-

"آپ نے پوچھا تھا کہ ہند کے کافر عرب کے مشرکوں کی طرح بے اصل دین رکھتے ہیں یا اس دین کی کوئی اصل تھی اور اب منسوخ ہوگیا ہے ؟ دیگر ان لوگوں کے بزرگوں کے حق میں کیسا اعتقاد رکھنا چاہیے !

واضح رہے کہ اہلِ ہند کی قدیم کتابوں سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ نوعِ انسانی کے ابتدائی پیدائش کے شروع میں رحمتِ الٰہیہ نے ان لوگوں کی معاد و معاش کی اصلاح کے لیے ایک کتاب مسمّی بہ وید جس میں چار دفتر ہیں اور امر و نہی کے احکام اور ماضی و مستقبل کے واقعات ہیں ایک فرشتے برہما نامی کے وسیلے سے جو ایجادِ عالم کا واسطہ ہے ' نازل کی ۔ اس زمانے کے مجتہدوں نے

لہ علامہ اقبال کا بھی ایک زمانے میں یہی خیال تھا ۔ جب مخزن میں انھوں نے ہندوؤں کے مقدس بھجن گائتری کا ترجمہ شائع کرایا (۱۹۰۲ء) تو اس میں ایک شعر تھا ؎

ہر چیز کی حیات کا پروردگار تو زائیدگانِ نور کا ہے تاجدار تو

"زائیدگانِ نور" کی ترکیب کے متعلق اقبالؒ نے ایک نوٹ دیا تھا " زائیدگانِ نور یعنی دیوتے ۔ زبانی اکثر بعضو [illegible]

اس کتاب سے کچھ مذہب استخراج کیے اور اصول و عقائد کی بنا ان پر قائم کی۔ اس کو فنِ دھرم شاستر کہتے ہیں یعنی فنِ ایمانیات جس سے علم مُراد ہے۔ اسی طرح المجتہدین (انہوں نے) نوع کے چار فرقے بنائے اور ہر فرقے کے لیے الگ مسلک مقرر کیا اور فروعِ اعمال کی بنا اس پر قائم کی۔ اس فن کا نام کرم شاستر رکھا۔ یعنی فنِ عملیات جسے علم فقہ کہتے ہیں۔

یہ لوگ نسخ احکام کے منکر ہیں لیکن چونکہ وقت اور طبیعتوں کے مطابق مناسب تغیر اعمال بھی ضروری ہے اس لیے دُنیا کی ساری مُدت کو چار حِصّوں میں تقسیم کر کے ہر ایک حِصّے کا نام جُگ رکھا ہے۔ ہر ایک جُگ کی علامتیں انھیں چار دفتروں سے اخذ کی ہیں۔ جو کچھ متاخرین نے ان میں اپنے تصرفات کیے ہیں، وہ قابلِ اعتبار نہیں۔

ان کے تمام فرقے توحیدِ الٰہی کے بارے میں متفق ہیں۔ عالم کو مخلوق جانتے ہیں۔ فنائے عالم نیک و بد کی جزا و سزا، حشر و نشر جسمانی اور حساب و کتاب کے قائل ہیں۔ علومِ عقلی و نقلی۔ ریاضت، مجاہدات، تحقیقِ معارف اور مکاشفات میں ید طولےٰ رکھتے ہیں۔ ان کی بُت پرستی شرک کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس کے دوسرے اسباب ہیں۔

ان کے علما نے انسانی عمر کے چار حصے کیے ہیں۔ پہلا تحصیلِ علم کے لیے، دوسرا معاش اور اولاد کی غرض سے، تیسرا درستی اعمال اور تہذیبِ نفس کے لیے، چوتھا تجرد و تنہائی کی مشق کے لیے جو کمالِ انسانی کا انتہائی درجہ ہے اور نجاتِ کُبریٰ جسے مہا مُکت کہتے ہیں، اس پر موقوف ہے۔

ان کے دین کے قواعد و ضوابط میں نہایت اعلےٰ درجے کا نظم و نسق ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دین باقاعدہ مرتب ہُوا تھا، لیکن پھر منسوخ ہو گیا۔ ہماری شرع میں یہود و نصاریٰ کی

بقیہ صفحہ ۶۴۶

سنسکرت میں لفظ دیوتا کے معنی زائیدہ نور کے ہیں۔ یعنی ایسی ہستی جس کی پیدائش نور سے ہوئی ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہندو دیوتاؤں کو دیگر مخلوقات کی طرح مخلوق تصوّر کرتے تھے۔ ازلی نہیں سمجھتے تھے۔ غالباً ان کا مفہوم وہی ہوگا، جن کو ہم لفظ فرشتہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ کیونکہ فرشتوں کا وجُود بھی نوری تسلیم کیا گیا ہے۔ اگرچہ ان کو مخلوق مانا گیا ہے۔ پس ہندو مذہب کو شرک کا موجب گردانا میرے نزدیک صحیح نہیں معلوم ہوتا۔" اقبال

کے دین کے نسخ کے سوا اور کسی دین کے نسخ کا ذکر نہیں۔ حالانکہ ان کے علاوہ بہت سے دین منسوخ ہوئے اور کئی دین صفحۂ ہستی سے نابود ہو گئے۔ نیز واضح رہے کہ ان آیات کے مطابق "وان من امۃ الا خلا فیھا نذیر" (ہر ایک گروہ کا نبی گزرا ہے) "ولکل امۃ رسول" (اور ہر ایک اُمت کا رسول ہوتا ہے) سرزمین ہندوستان میں بھی نبی اور رسول بھیجے گئے، جن کے احوال ان کی کتابوں میں مندرج ہیں۔ ان کے اخبار و آثار سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صاحب کمال تھے۔ رحمتِ عامہ الٰہی نے مصلحتِ انسانی کو اس سرزمین میں فروگزاشت نہیں کیا۔ پیغمبر آخرالزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے ہر ایک قوم میں پیغمبر مبعوث ہوتا رہا ہے، جس کی اطاعت اور فرمانبرداری اس قوم کے لیے لازم تھی اور دوسری قوم کے نبی سے ان کو غرض نہ ہوتی، لیکن جب ہمارے پیغمبر خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے ہیں، تب سے لے کر جب تک دنیا باقی ہے کوئی اور نبی نہ ہوگا۔ شرق سے لے کر غرب تک تمام دُنیا کو آنحضرت ہی کی تابعداری اور فرمانبرداری لازم ہے اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کے مقابل تمام باقی دین منسوخ ہیں۔ آغازِ بعثت سے جس کو آج تک ایک ہزار ایک سو اسی سال ہوتے ہیں، جو اس دین کی طرف مائل نہیں ہوا۔ وہ کافر ہے۔ نہ کہ وہ لوگ جو اس سے پہلے گزر چکے تھے۔

نیز حسبِ تصریح آیۃ کریمہ "منھم من قصصنا علیک ومنھم من لم نقصص علیک" (ان میں سے بعض کا حال تمہارے روبرو بیان کیا اور بعض کا نہیں کیا) جب ہماری شریعت بہت سے انبیا کے حال میں ساکت ہے تو ہم کو بھی ہندوستان کے انبیاء کے حق میں خاموشی ہی بہتر ہے۔ نہ ہم کو ان کے مقلدین کے کفر والحاد پر ایمان واجب ہے اور نہ ان کی نجات کا اعتقاد لازم ہے، لیکن اگر تعصب نہ ہو۔ تو نیک گمان ضرور کرنا چاہیے۔ اہلِ فارس بلکہ تمام امم ماضیہ کے حق میں جو خاتم النبیین ؐ کے ظہور سے پہلے گزر چکی ہیں اور جن کی نسبت شرع میں کچھ بیان نہیں کیا گیا اور جن کے احکام و آثار راہِ اعتدال کے مناسب اور موافق ہوں اسی قسم کا عقیدہ رکھنا بہتر ہے۔ کسی کو بغیر قطعی دلیل کے کافر نہ کہہ دینا چاہیے۔ ان (اہل ہند) کی بُت پرستی کی حقیقت یہ ہے کہ بعض فرشتے جو

حکم الٰہی سے عالم کون و فساد میں دخل رکھتے ہیں۔ یا بعض کاملین کی رُوح میں جنھیں جسم سے الگ ہو کر اس دُنیا میں کچھ تصرّف حاصل ہے یا بعض زندہ آدمی جوان کے زعم میں حضرت خضر علیہ السلام کی طرح تا ابد زندہ رہیں گے یہ لوگ اُن کی مُورتیں یا تصویریں بنا کر ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اس توجہ کے سبب ایک مُدّت کے بعد صاحب صُورت سے مناسبت پیدا کر لیتے ہیں اور اسی نسبت سے حوائج معاش و معاد کو پُورا کرتے ہیں۔ ان کا یہ عمل ذکرِ رابطہ سے مشابہت رکھتا ہے جو اسلامی صوفیہ میں عام ہے' اور جس میں صُورتِ شیخ تصوّر کیا جاتا ہے اور فیض حاصل کیے جاتے ہیں۔ ہاں صرف اس قدر فرق ہے کہ صُوفیہ شیخ کی ظاہری تصویر نہیں بناتے' لیکن یہ بات کفارِ عرب کے عقیدے سے مناسبت نہیں رکھتی کیونکہ وہ بُتوں کو متصرّف اور مؤثّر بالذّات مانتے تھے نہ کہ تصرّفِ الٰہی کا ذریعہ اور انھیں کو زمین کا خدا مانتے تھے اور اللہ تعالیٰ کو آسمان کا خدا۔ مگر یہ شرک ہے۔ ان (اہلِ ہند) کا سجدہ سجدۂ عبُودیت نہیں' بلکہ سجدۂ تحیت ہے۔ جو کہ ان کے طریقے میں ماں۔ باپ۔ پیر اور اُستاد کے سلام کے لیے بھی عام ہے اور جسے ڈنڈوت کہتے ہیں۔

تناسخ کا اعتقاد رکھنے سے کفر لازم نہیں آتا۔ والسلام

مرزا جانجاناں کے خلفاء میں سے قاضی ثناء اللہ پانی پتی بہت مشہور ہیں۔ شاہ عبدالعزیز انھیں بیہقیِ وقت کہا کرتے تھے۔ وہ کئی کتابوں کے مصنّف تھے ان میں سے فقہ کے مسائل کی کتاب مالا بدّ منہ اب بھی مستعمل ہے۔ ان کے علاوہ انھوں نے سات جلدوں میں تفسیرِ مظہری لکھی۔ اس زمانے میں شاہانِ اودھ کی وجہ سے شیعہ سُنّی مسئلہ پھر پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ قاضی صاحب نے شیعہ عقائد کے خلاف سیف المسلول کے نام سے ایک رسالہ لکھا۔ اس کے علاوہ ارشاد الطالبین' حقوق الاسلام' شہاب ثاقب اور دُوسرے رسائل آپ کی یادگار ہیں۔ آپ کی وفات ۱۸۰۵ء میں ہوئی۔

خاتم الاولیا شاہ غلام علی قدس سرہ

مرزا مظہر جانجاناں کے سب سے نامور مُرید
شاہ عبداللہ المعروف شاہ غلام علی دہلوی

تھے، جن کا اپنے زمانے میں اتنا شہرہ تھا کہ انھیں عقیدتمند تیرھویں صدی کا مجدد کہتے تھے۔ اور اگر اس رُوحانی انقلاب کا اندازہ کریں جو ان کے ایک مُرید کی بدولت بلادِ رُوم و عراق و کردستان میں ہُوا تو یہ اظہارِ عقیدت عجیب نہیں معلوم ہوتا۔ ہندوستان میں بھی ان کا بڑا اثر و اقتدار تھا۔ اور دہلی میں ان کی خانقاہ شاہ عبدالعزیزؒ کے مدرسے کا مدِ مقابل سمجھی جاتی تھی۔ ایک میں ولی اللٰہی طریقے کی میانہ روی اور علم و عرفان تھا اور دوسرے میں مجدّدی مشرب کا احیائی ذوق و شوق اور متشرع تصوّف تھا۔ شاہ غلام علی کے ملفوظات اور حالات ان کے مریدوں مثلاً شاہ عبدالغنی صاحبؒ نے مرتب کیے ہیں۔ مکاتیب مدراس سے شائع ہو چکے ہیں[1]۔ لیکن شاید شاہ صاحب کے علوِ مرتبہ کا سب سے بہتر آئینہ سرسید احمد خاں کا وہ مختصر مضمون ہے جو انھوں نے شاہ صاحب کے متعلق آثار الصنادید میں لکھا اور بزرگانِ دہلی کے تذکرہ میں فاتحۃ الکتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ سیّد احمد خاں کے والد پر شاہ صاحب بڑی عنایت کرتے تھے۔ سیّد احمد خاں پیدا ہوئے تو خوش نصیب باپ نے انھیں ہی زحمت دی۔ مولود مسعود کے کان میں اذان شاہ صاحب نے دی اور اپنے مجدّدیہ سلسلہ کے سردار حضرت مجدّد الف ثانی شیخ احمد سرہندی قدس سرہ کے نام پر اس کا نام احمد رکھا۔ اور جب یہ سیّد زادہ گھٹنوں چلنے کے قابل ہُوا تو اس سے پوتوں سے زیادہ پیار کیا۔ سیّد احمد بھی شاہ صاحب کو دادا حضرت کہا کرتے تھے۔ انھوں نے ان کا تذکرہ بھی ایک خاص شیفتگی اور بڑے سلیقے سے لکھا ہے۔ اندازِ بیان میں وہ اشکال اور الجھنیں نہیں جو آثار الصنادید کے باقی بیانات اور اندراجات میں ہیں اور چونکہ شاہ صاحب کی شخصیت، طریقِ کار اور اہمیت کا بہترین اندازہ اسی مضمون سے ہو سکتا ہے، ہم اس کا بیشتر حصہ درج ذیل کرتے ہیں۔ سرسیّد لکھتے ہیں:-

[1] دُوسرا ایڈیشن حال ہی میں لاہور سے شائع ہُوا ہے۔

جناب حضرت شیخ الشیوخ مولٰنا شاہ غلام علی قدس سرہٗ

وطنِ اصلی بٹالہ[1] ہے' جو امرتسر (پنجاب) کے قریب واقع ہے۔ اور آپ سادات علوی سے ہیں۔ آپ کے والد ماجد بھی بڑے زاہد اور عابد تھے اور جنگلوں میں جا کر ذکرِ حق کیا کرتے تھے اور مہینوں بناس پتی پہ قناعت فرماتے تھے۔ آپ کے عمِ بزرگوار نے جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اشارت سراپا بشارت سے عبداللہ آپ کا نام رکھا۔ ۱۱۵۶ھ میں آپ نے اس عالم میں قدومِ فیض توام رکھا' اور اپنے جمالِ جہاں آرا سے عالم کو منور کیا۔

آپ نے سولہ برس کی عمر تک تو اسی نواحی میں بسر کی ۱۱۷۲ھ میں آپ کے والد ماجد نے اس ارادہ سے دہلی بلوایا کہ اپنے پیر شاہ ناصر الدین قادری سے' جن کا مزار نئی عیدگاہ کے پیچھے ہے' بیعت کرا دی جائے۔ آپ کے پہنچنے سے پہلے شاہ ناصر الدین صاحب نے انتقال کیا۔ اور چونکہ اللہ تعالیٰ کو پردہ غیب سے اور ہی کچھ ظاہر کرنا تھا' یہ بات نقابِ خفا وحلینِ التوا میں رہی۔ تب آپ کے والد ماجد نے اجازت و اختیار دیا کہ جس سے چاہو بیعت کر و ۱۱۷۸ھ میں بائیس برس کی عمر میں آپ نے جناب مرزا جانجاناں مظہر علیہ الرحمۃ سے بیعت کی اور یہ شعر پڑھا ؎

از برائے سجدہ عشق آستانے یافتم
سر زمینے بود منظور آسمانے یافتم

بعد بیعت کے سالہا سال آپ نے اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں اوقات بسر کی اور وہ زہد و مجاہدہ اور ریاضت کی کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ دن دن عروجِ کمال اور مشاہدہ جمالِ شاہدِ بے زوال اور مکاشفہ اور ترقیاتِ فائقہ ہوئی۔ یہاں تک کہ اپنے وقت کے شیخ الشیوخ اور صاحبِ ارشاد ہوئے اور تلقین و ارشادِ سلسلہ اپنے پیر و مرشد کے رُو بُرو جاری فرمایا۔ اگرچہ آپ نے بیعت سلسلہ قادریہ میں کی تھی'

---

[1] ضمیمہ مقامات مظہری میں "قصبہ پٹیالہ ضلع پنجاب" لکھا ہے۔ لیکن اصل مقام بٹالہ تھا جو مشرقی پنجاب کی پرانی مردم خیز بستی تھی۔ میاں سر فضل حسین کا خاندان بھی اسی قصبہ سے تھا۔

لیکن ذکر و اذکار و شغل و اشغال طریقہ علیہ نقشبندیہ مجددیہ میں جاری کیا اور ہر طریقہ کی اجازت حاصل کی اور اپنے پیر و مرشد کے انتقال کے بعد سجادہ نشین ہوئے اور حقیقت میں میرے اعتقاد بموجب اپنے پیر پر بھی فوقیت لے گئے۔ سبحان اللہ! کیا آزادی تھی کہ مطلق دُنیا کا لگاؤ نہ تھا۔ اللہ اللہ! کیا اطاعتِ سُنت تھی کہ سر مُو بھی فرق نہ تھا۔ توکل تو اس درجہ پر تھا کہ کبھی کسی طرح کا خیال دل میں نہ آتا۔ اُمرا اور بادشاہ آرزو رکھتے تھے کہ ہم خانقاہ کے فقرا کے لیے کچھ وظیفہ مقرر کریں۔ ہرگز آپ منظور نہ فرماتے! ایک دفعہ نواب امیر الدولہ امیر محمد خاں والیِ ٹونک نے بہت التجا سے درخواست تقرر وظیفہ کی اس کے جواب میں آپ نے صرف یہ شعر لکھ بھیجا ؎

ما آبروئے فقر و قناعت نمے بریم
با میر خاں بگوئے کہ روزی مقرر است

آپ کی ذات فیض آیات سے تمام جہاں میں فیض پھیلا اور مُلکوں مُلکوں کے لوگوں نے آکر بعیت اختیار کی۔ میں نے حضرت کی خانقاہ میں اپنی آنکھ سے رُوم اور شام اور بغداد اور مصر اور چین اور حبش کے لوگوں کو دیکھا ہے کہ حاضر ہو کر بیعت کی اور خدمتِ خانقاہ کو سعادتِ ابدی سمجھے اور قریب قریب کے شہروں کا مثل ہندوستان اور پنجاب اور افغانستان کا کچھ ذکر نہیں کہ ٹڈی دل کی طرح اُمڈتے تھے۔ سچ ہے ؎

چو کعبہ قبلۂ حاجت شد از دیارِ بعید
روند خلق بدیدارش از بسی فرسنگ

حضرت کی خانقاہ میں پانسو فقیر سے کم نہیں رہتا تھا اور سب کا روٹی کپڑا آپ کے ذمہ تھا اور باوجودیکہ کہیں سے ایک حبہ مقرر نہ تھا، اللہ تعالیٰ غیب سے کام چلاتا تھا۔ اس پر فیاضی اور سخاوت اس قدر تھی کہ کبھی سائل کو محروم نہیں پھیرا جو اس نے مانگا وہی دیا۔ جو چیز عمدہ اور تحفہ آپ کے پاس آتی اس کو بیچ کر فقرا پر صرف کرتے اور جیسا گزی گاڑھا موٹا تمام فقیروں کو میسر ہوتا ویسا ہی آپ بھی پہنتے اور جو کھانا کو میسر ہوتا وہی آپ کھاتے۔ بھلا غور کرو کہ بشر کی طاقت ہے کہ ایسی بات کر سکے

کہ اگر کوئی عرض کرتا کہ حضرت آپ اپنے لیے تو یہ کپڑا لے لیجیے اور یہ آرام کی چیز بنا لیجیے تو آپ یہ قطعہ پڑھا کرتے ۔ ؎

خاک نشینی است سلیمانیم
ننگ بود افسرِ سلطانیم
ہست بسے سال کہ می پوشش
کہنہ نہ شد جامۂ عریانیم

اور اگر کبھی کچھ اسباب اور سامانِ دُنیا کا ذکر آتا تو فرماتے ؎

حرص قانع نیست بیدل ورنہ اسبابِ جہاں
ہر چہ ما داریم زاں ہم اکثرے درکار نیست

آپ کی اوقات شریف نہایت منضبط تھی ۔ کلام اللہ آپ کو حفظ تھا اور تحقیق قرأت بھی بہت خوب تھی ۔ نمازِ صبح اوّل وقت ادا فرما کر دس سیپارہ کلام اللہ کے ادا فرماتے اور بعد اس کے حلقۂ مُریدین جمع ہوتا اور تا نمازِ اشراق سلسلۂ توجہ اور استغراق جاری رہتا ۔ بعد ادا کرنے نمازِ اشراق کے تدریسِ حدیث اور تفسیر کی شروع ہوتی ۔ جو لوگ اس جلسہ کے بیٹھنے والے ہیں ان سے پوچھا چاہیے کہ اس میں کیا کیفیت ہوتی تھی اور پڑھنے پڑھانے اور سُننے والوں کا کیا حال ہوتا تھا ۔ جہاں نام رسُولِ خدا آتا آپ بے تاب ہو جاتے اور اس بیتابی میں حاضرین پر عجیب کیفیّت طاری ہوتی تھی ۔ سبحان اللہ کیا شیخ تھے ۔ باقی باللہ اور عاشق رسُول اللہ ! علمِ حدیث اور تفسیر نہایت مستحضر تھا ۔ اگر باعتبار علومِ عقلی سر آمد فلسفیان متقدمین اور متاخرین لکھا جاوے تو بھی بجا ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کیا مجمع علوم پیدا کیا تھا کہ ہر ایک علم ظاہری اور باطنی میں درجہ کمال بہ انتہائے کمال حاصل تھا ۔ بعد اس درس تدریس کے آپ کچھ تھوڑا سا کھانا کہ عبادت معبُود کو کافی ہو تناول فرما کر بہ اتباع سنّت نبوی قیلولہ استراحت میں آرام کرتے ۔ تھوڑی دیر بعد اوّل وقت نمازِ ظہر ادا فرما کر پھر درس و تدریس حدیث و تفسیر و فقہ اور کتبِ تصوّف میں مشغول ہوتے اور نمازِ عصر تا نمازِ مغرب حلقۂ مریدین جمع ہوتا اور ہر ایک آپ کی توجہ سے علو مدارج حاصل کرتا ۔ ہمیشہ تمام رات آپ شب بیداری فرماتے تھے ۔ شاید کہ گھڑی دو گھڑی بمقتضائے بشریت غفلت آجاتی ہو سو وہ بھی

جانماز پر۔ برسوں آپ نے چارپائی پر استراحت نہیں فرمائی۔ اگر نیند کا بہت غلبہ ہوا یونہی اللہ اللہ کرتے پڑ رہے۔ آپ کی خانقاہ میں عجب عالم ہوتا تھا۔ بوریا کا فرش رہتا تھا اور اسی کے سرے پر ایک مصلّیٰ کبھی بوریا کا اور کبھی اور کسی چیز کا پڑا رہتا تھا اور وہیں ایک تکیہ چمڑے کا رکھا رہتا۔ آپ دن رات اسی مصلے پر بیٹھے رہتے اور عبادتِ معبود کیا کرتے اور سب طالبین گرداگرد آپ کے حلقہ باندھے بیٹھے رہتے اور ہر ایک کو جُدا جُدا فیض حاصل ہوتا۔ اگر کبھی کچھ فرش کا ذکر آتا تو آپ ارشاد فرماتے کہ

ننگلے زیر دُنگلے بالا — نے غمِ دُزد و نے غمِ کالا

گر کے بوریا د پوستکے — دِلکے پُر ز دردِ دوستکے

ایں قدر بس بود جمالی را — عاشقِ رند لا اُبالی را

حق یہ ہے کہ ایسا برشتہ جان دیکھنے میں نہیں آیا اور میں تو اس بات پر عاشق ہوں کہ باوجود اتنی آزادی اور خود رفتگی کے سرِمو احکام شریعت سے تجاوز نہ تھا۔ جو کام تھا وہ باتباع سنت تھا۔ لقمۂ مشتبہ سے نہایت پرہیز کرتے اور مالِ مشتبہ ہرگز نہ لیتے۔ جو شخص خلافِ شرع اور سنت ہوتا، اس سے نہایت خفا ہوتے اور اپنے پاس اس کا آنا گوارا نہ کرتے اور فرماتے ؎

یا مرو با یار ازرق پیرہن — یا بکش بر خانماں انگشت نیل

یا مکن با پیلبانان دوستی — یا بنا کن خانۂ درخورد پیل

میرے تمام خاندان کو اور خصوصاً جناب والد ماجد کو آپ سے نہایت اعتقاد تھا اور میرے جناب والد ماجد اور میرے بڑے بھائی احتشام الدولہ سید محمد خاں بہادر مرحوم کو آپ ہی سے بیعت تھی اور آپ کی میرے خاندان پر اس قدر شفقت اور محبت تھی کہ میرے والد ماجد کو اپنے فرزند سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ میرے والد ماجد بھی آپ کی صحبت کی برکت سے آزادہ مزاج اور وارستہ طبع تھے۔ کبھی کبھی بموجب اس مصرعہ کے ع۔

کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ

کوئی بات گستاخانہ عرض کرنا یا کوئی حرکت آپ کے خلافِ مرضی سرزد ہوتی تو آپ بارہا ارشاد فرماتے کہ اگرچہ میں نے اپنے تئیں غمِ زن و فرزند سے دُور رکھا تھا لیکن اللہ تعالیٰ کی مرضی نہ ہوئی کہ اس شخص کی محبت فرزندوں سے سوا دے دی - جو چاہو سو کہو اور جو چاہو کرو - میں ہر روز آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اور آپ اپنی شفقت اور محبت سے مجھ کو اپنے پاس مصلّے پر بٹھا لیتے اور نہایت شفقت فرماتے - لڑکپن میں کچھ تمیز تو ہوتی نہیں خصوصاً صغر سن میں جو چاہا سو کیا جو چاہتا سو کرتا اور حرکاتِ بےتمیزانہ مجھ سے سرزد ہوتیں اور آپ ان سب کو گوارا فرماتے - میں نے اپنے دادا کو تو نہیں دیکھا - آپ ہی کو دادا حضرت کہا کرتا تھا - آپ کے کمالات اور خرقِ عادات اس سے زائد کیا بیان میں آویں - اس واسطے اس مختصر میں اس کی گنجائش نہیں دیکھتا اور میرے نزدیک ایسے شخص کی کرامت کا بیان کرنا اس کے رتبہ سے کم ہے - کیونکہ فقیری کا رُتبہ اس سے آگے ہے - غرض کہ سالہا سال تک آپ کی ذات فیض آیات سے یہ عالم منوّر رہا - اور جو کہ ہر ایک کو اس دار الفنا سے دار البقا کو چلنا ہے، آپ نے بھی ہفتہ کے دن صفر کی بائیسویں سنہ ۱۲۴۰ھ میں اس جہان سے انتقال کیا اور آپ کی خانقاہ میں آپ کے پیر کے پہلو میں دفن کیا - اناللہ وانا الیہ راجعون - "نوراللہ مضجعہ" آپ کے انتقال کی تاریخ ہے ۔"

سرسید کے مندرجہ بالا بیان سے شاہ صاحب کی شخصی خوبیوں اور ان کی مقامی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے - انھوں نے واضح کر دیا ہے کہ اُنھوں نے شاہ صاحب کی خانقاہ میں روم شام اور دُوسرے بلادِ اسلامی کے باشندے دیکھے تھے - اور واقعہ یہ ہے کہ اگرچہ شاہ صاحب کو اپنے ملک میں بھی بڑا عروج حاصل تھا اور ہمسایہ مُلکوں میں بھی آپ کے ماننے والے تھے، لیکن تاریخ دان کی نظروں میں شاید آپ کا سب سے بڑا فیض بلادِ روم میں مجددیہ سلسلے کی وسیع اشاعت تھا - جس کے ذریعہ آپ کے مُرید اور خلیفہ شیخ خالد کُردی تھے، جنھوں نے دہلی میں آکر آپ سے فیض حاصل کیا[1] اور پھر مجددیہ طریقے کو دولتِ عثمانیہ میں عام کیا - [[1] اگلے صفحے پر ملاحظہ ہو]

نقشبندیہ طریقہ کی تنظیم خواجگان بخارا و سمرقند (ترکستان) نے کی اور فی الحقیقت یہ ایک ترکی الاصل طریقہ ہے۔ لیکن شیخ خالد سے پہلے جو طریقہ سلطنت عثمانیہ میں چھایا ہوا تھا بکیتاشی تھا جو (ہندوستان میں چشتی سلسلہ کی طرح) زیادہ تر ایک مقامی طریقہ تھا۔ نقشبندیہ سلسلے کی وسیع اشاعت پہلی مرتبہ شیخ خالد نے کی اور ان کی وجہ سے یہ سلسلہ وہاں جس شکل میں رائج ہوا وہ مجددی طریقہ تھا۔ قدیمی سلسلہ نہ تھا۔ اور اس کی اشاعت وہاں بھی احیائے علوم اور غلبہ شرع کا باعث ہوئی۔

شیخ خالد بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ ان کی کوششوں کی بدولت دولتِ عثمانیہ میں نقشبندیہ طریقہ دوسرے سب طریقوں پر غالب آگیا۔ جب مصطفےٰ کمال پاشا نے صوفیہ سلسلوں کا خاتمہ کیا تو اس وقت فقط استنبول میں اس سلسلے کے ۷۲ تکیے تھے۔ علاقہ کردستان میں اب بھی ان کا بڑا احترام کیا جاتا ہے۔ ان کے مناقب میں علامہ شامی نے "سل الحسام الہندی لنصرۃ مولٰنا خالد نقشبندی" کے نام سے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جو مصر میں چھپ چکا ہے۔ آپ عربی فارسی کے شاعر تھے۔ فارسی دیوان ۱۸۴۴ء میں استنبول میں شائع ہوا تھا۔ اب حال میں اس کا دوسرا ایڈیشن چھپا ہے[1] اور جدید ترکی کی ان محدود کتابوں میں سے ہے، جنھیں اصل (یعنی عربی) رسم الخط میں شائع کیا گیا ہے۔

کئی قصیدے شاہ غلام علیؒ کی تعریف میں ہیں۔ ایک کا مطلع ہے ؎

خبر از من رسید آں شاہِ خوباں را بہ پنہانی
کہ عالم زندہ شُد بارِ دگر از ابرِ نیسانی

آگے چل کر کہتے ہیں ؎

[فٹ نوٹ[1] متعلقہ صفحہ ۶۵۵]

شیخ خالد کردی کو ہندوستان آنے اور شاہ غلام علی کی خدمت میں حاضر ہونے کا مشورہ بہار کے ایک جہاں گرد درویش مرزا رحیم اللہ بیگ نے دیا تھا، جن سے شیخ کی اثنائے سفر میں ملاقات ہوئی تھی۔

[1] اس کا ایک نسخہ ہم نے کتب خانہ سراجیہ کندیاں شریف کی نذر کیا ہے۔

امامِ اولیا، سیّاحِ بیدائے خدا بینی — ندیمِ کبریا، سبّاحِ دریائے خدادانی
معینِ راہنمایاں، شمعِ جمعِ اولیائے دیں — دلیلِ پیشوایاں، قبلۂ اعیانِ روحانی
چراغِ آفرینش، مہرِ برجِ دانش و بینش — کلیدِ گنجِ حکمت، محرمِ اسرارِ سبحانی
امینِ قدسِ عبداللہ شہِ کز التفاتِ او — دہد سنگِ سیاہ خاصیتِ لعلِ بدخشانی

شاہ غلام علیؒ کے مطبوعہ مکاتیب میں چند خطوط شیخ خالد کے نام ہیں۔ ایک کے ساتھ علماء و مشائخ حجاز و روم کے نام ایک پیغام منسلک ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ شیخ کی شروع شروع میں مخالفت ہوئی، لیکن شاہ صاحب نے اس پیغام سے دولتِ عثمانی کے بزرگوں کی تشفی کی۔

شیخ خالدؒ نے جب حکومت عثمانیہ میں واپس جاکر شاہ غلام علیؒ کے مناقب بیان کیے اور طریقہ مجددیہ کی اشاعت کی تو وہاں سے دوسرے کئی بزرگ حصولِ فیض کے لیے شاہ صاحب کی خدمت میں دہلی پہنچے۔ مثلاً شاہ صاحب کے ایک خط میں حضرت سید احمد بغدادی اور حضرت سید اسمٰعیل مدنی کا ذکر ہے جو بڑے پایہ کے بزرگ تھے ("در وصفِ ایں سیداں بہ ادراک فن مقدور بیان نیست") اور مدینہ منورہ میں مولانا خالد سے نسبت حاصل کرنے کے بعد بہ غرض استفادہ دہلی آئے۔

ان کے علاوہ مولانا محمد جان کا ذکر بھی یہاں بیجا نہیں۔ وہ پیدا تو ہندوستان میں ہوئے۔ لیکن شاہ غلام علی صاحب سے اجازت و خلافت حاصل کرنے کے بعد عازمِ مکہ معظمہ ہوئے۔ شروع میں آپ کو بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن بعد ازاں آپ کو بڑا فروغ ہوا حتےٰ کہ والدۂ سلطان بھی آپ کے معتقدین میں سے ہو گئیں۔ استنبول و دیگر اضلاعِ روم میں آپ کے خلفا منتشر ہو گئے۔ ایک خانقاہ تیار کی، جس سے بہتوں نے فائدہ اٹھایا۔ آپ کی وفات ۱۸۴۹ء میں مکہ معظمہ میں ہوئی۔

سیاسی اعتبار سے یہ زمانہ اسلامی ہندوستان کے انتہائی زوال کا تھا، لیکن حضرت مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہؒ نے جو شمعیں جلائی تھیں وہ اب ہندوستان کی سرحدوں سے گزر کر بیرونِ ہندوستان کو منور کر رہی تھیں۔ بقول خالد ؎

بہ وہلی ظلمت کفراست گفتند و بہ دل گفتم
بہ ظلمت رو اگر جویی جستجوئے آب حیوانی

سلسلۂ مجددیہ کا دورِ جدید

مجددی حضرات شاہ غلام علی قدس سرہ کو تیرھویں صدی کا مجدّد مانتے ہیں۔ ان کی عظیم دینی خدمات اور وسیع اثر کا ہم نے کسی قدر تفصیل بیان کر دیا ہے۔ لیکن خاص مجددیہ سلسلے کے لیے انھوں نے جو کچھ کیا۔ اس کا پورا اندازہ اس بیان سے نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلے کو حضرت مجددؒ کی زندگی ہی میں بڑا فروغ حاصل ہو چکا تھا اور ملک کے دُور دراز حصّوں میں ممتاز بزرگ اس سے وابستہ تھے۔ خواجہ محمد معصومؒ نے اس سلسلے کو بڑی وسعت دی۔ ان کے صاحبزادے خواجہ نقشبند کا زمانہ بھی، عہدِ عالمگیری کی فقہی روایات کے باوجود، سلسلہ کے لیے بڑا سازگار تھا۔ اس وقت طریقۂ مجددیہ کا بڑا مرکز سرہند تھا۔ گو اطرافِ ملک میں بھی اس سلسلے کی کئی اہم خانقاہیں تھیں۔ خواجہ نقشبند ثانیؒ کی وفات کے چند سال بعد سلسلے میں انتشار شروع ہوا اس کی ایک وجہ یہ تھی۔ کہ عالمگیر کی وفات کے تین سال کے اندر مشرقی پنجاب میں ایک ایسا ہنگامہ بپا ہوا، جس نے اس علاقے کا امن تہ و بالا کر دیا۔ مئی ۱۷۱۰ء میں بندہ بیراگی نے سرہند پر قبضہ کر لیا۔ اور وہ تباہی مچائی کہ الامان! چار روز تک لوٹ مار اور سفاکانہ قتل و غارت کا بازار گرم رکھا۔ بندہ کا قلع قمع پانچ سال بعد نواب عبدالصمد خاں نے کیا (جن کی قبر بیگم پورہ لاہور میں "زندہ دلانِ" لاہور کی غفلت و بےحسی کا عبرتناک نقشہ پیش کرتی ہے) نواب عبدالصمد خاں اور ان کے بیٹے زکریا خاں کے عہدِ حکومت میں پھر سرہند کو عروج ہوا، لیکن اس کے بعد یہ شہر آلھا سنگھ بانیٔ ریاست پٹیالہ کے قبضے میں آ گیا جس نے اس شہر کو پھر لوٹ کر اجاڑ دیا۔ اس مسلسل بدامنی اور قتل و غارت سے شہر برباد ہو گیا اور حضرت مجدد الف ثانی کے خاندان کے اکثر افراد منتشر ہو گئے اور ان میں سے بعض دہلی آ گئے اور بعض دوسری جگہ آباد ہوئے۔ خود خواجہ محمد زبیرؒ جنھیں قیوم چہارم کہا جاتا ہے

عالمگیر کی وفات کے دوسرے یا تیسرے سال یعنی بندہ کے حملے سے پہلے "مع توابع ولواحق" سرہند سے دہلی چلے گئے تھے۔ اور اپنی وفات تک، جو حملۂ نادری کے چند ماہ بعد ہوئی، وہیں مقیم رہے۔ شیخ عبدالاحد گل ان کے ساتھ یا اس سے بھی پہلے دہلی پہنچ گئے۔ سرہند[1] میں سلسلہ کا جو نظام تھا، وہ بہت حد تک درہم برہم ہو گیا۔ اس کے علاوہ عہدِ عالمگیری کے اواخر سے ہی اکابر سرہند پر مشیخت غالب آگئی تھی۔ درویشی تھوڑی تھی بعض بزرگوں کے حالات پڑھیں تو رئیسانہ ٹھاٹھ کے مظاہرے کثرت سے ملتے ہیں۔ آپس میں اختلافات بھی شروع ہو گئے تھے۔

دہلی میں بعض بزرگانِ سرہند (مثلاً شیخ عبدالاحد گل) نے دارالخلافے کی علمی، ادبی اور روحانی زندگی کی رونق بڑھائی۔ اور مرزا مظہر جانجاناں جیسے بزرگ سلسلۂ مجددیہ میں داخل ہوئے۔ لیکن سلسلے کو نئی زندگی شاہ غلام علیؒ سے ملی۔ اس وقت انگریزوں کا اقتدار بڑھ رہا تھا، جو انھیں ناگوار تھا، لیکن بہرکیف اس سے سکھوں اور مرہٹوں کی ترکتازیاں تو ختم ہوئیں۔ ملک میں امن وامان تھا۔ اس کے علاوہ ان کے مزاج میں بڑی درویشی تھی۔ شرع کا بڑا خیال تھا۔ روحانی مرتبہ بہت بلند تھا۔ عنایتِ الٰہی سے ان کا فیض روم وکردستان تک پہنچا، لیکن ہند اور پاکستان میں بھی ان کا کام اتنا ہی اہم تھا۔ ان کی بدولت سلسلے میں بارِ دگر درویشی کو فروغ ہوا۔ بلکہ سلسلے نے ایک نئی صورت اختیار کی، جس میں اصل کی ساری خوبیاں موجود تھیں۔

---

[1] سرہند سے سکھوں کو خاص طور پر خصومت تھی۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ گورو گوبند سنگھ کے دو بیٹوں کو یہاں کے حاکم نے (ہندو دیوان کی انگیخت پر) زندہ چنوا دیا تھا۔ تواریخ خالصہ میں لکھا ہے کہ جب گورو گوبند سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو یہ خبر پہنچی تو سب کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، اور رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس وقت بیان کیا گیا ہے کہ گورو گوبند سنگھ صاحب نے اس عالم رنج وغم میں اپنے کارد سے ایک چھوٹی سی گھاس جڑ سے اکھیڑ دی۔ جس پر پیارے کلا نے پوچھا کہ آپ مہاراج کیا کر رہے ہیں۔ گورو صاحب نے فرمایا۔ ظالم ترکوں کی بیخ کنی کر رہا ہوں۔ ہمارے سکھ ایسے طاقتور ہوں گے جو اس سرہند کی اینٹوں تک اکھاڑ کر ستلج میں ڈال دیں گے ... سرہند کی بابت بھی تاریخوں سے ظاہر ہے کہ جب سکھوں نے زور پکڑا تو اس کی ایک ایک اینٹ جلا کر دی گئی۔" مفتی غلام سرور تاریخ مخزن پنجاب میں لکھتے ہیں: "سکھوں کو اس شہر کے ساتھ یہاں تک دشمنی ہے کہ جب کوئی سکھ اب بھی سرہند کے پاس سے گزرتا ہے۔ دو اینٹیں وہاں کے کھنڈرات سے اٹھا کر دریا میں ڈال دیتا ہے۔" نواب شیر محمد خاں رئیس مالیر کوٹلہ نے بچوں کی سزا دہی کی مخالفت کی تھی۔ چنانچہ مالیر کوٹلہ کی ریاست اٹھارویں صدی کے پُرآشوب زمانے میں بھی محفوظ رہی۔

لیکن جو تبدیل شدہ حالات کے لیے زیادہ موزوں تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ انھوں نے فیض کے جو چشمے لگائے، ان سے نکلی ہوئی نہروں نے مغربی پاکستان کے ان علاقوں کو سیراب کیا۔ جن کی شادابی ۱۹۴۷ء کے انقلاب اور سرہند و دہلی کے بھارت میں آجانے کے بعد بھی قائم رہی!

شاہ احمد سعید دہلوی ثم مدنیؒ

مغربی پاکستان میں شاہ غلام علی قدس سرہ کا فیض ایک ایسے بزرگ سے پہنچا جو خود خاندانِ مجددیہ کے چشم و چراغ تھے۔ شیخ ابن شیخ تھے، لیکن جنھوں نے پندرہ سال شاہ غلام علیؒ سے فیض حاصل کیا اور جو شاہ صاحب کو اس قدر عزیز تھے کہ بقول ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں شاہ صاحب نے انھیں اپنا متبنیٰ[1] قرار دیا تھا۔

یہ بزرگ حضرت شاہ احمد سعید[2] تھے، جو پیدا تو رام پور میں ہوئے، لیکن جن کا جسدِ خاکی مدینہ منورہ کی مبارک سرزمین میں مدفون ہے۔ آپ کے والد ماجد شاہ ابو سعیدؒ بھی شاہ صاحب کے خلیفہ اور بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ بھائی شاہ عبد الغنی مجددیؒ تھے، جنھوں نے تکملہ مقامات مظہری میں شاہ غلام علی صاحب اور ان کے خلفا کے حالات لکھے ہیں اور جن سے مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ جیسے بزرگوں نے حدیث پڑھی تھی۔ شاہ احمد سعیدؒ ۱۲۱۷ھ (۱۸۰۱ء) میں پیدا ہوئے۔ دس سال کی عمر میں شاہ غلام علیؒ کی خدمت میں پہنچے۔ اور ان کی وفات تک ان کی خدمت میں حاضر رہے۔ تصوف کی اکثر کتابیں مثلاً رسالہ قشیری، عوارف المعارف، احیاء العلوم۔ مکتوبات امام ربانی، مثنوی مولانا روم شاہ صاحب سے پڑھیں۔ اس وقت دہلی علما و صلحا سے بھری پڑی تھی۔ حدیث کی سند آپ نے شاہ عبد العزیزؒ سے لی۔ اور معقولات کی کتابیں مولوی فضل امام اور مولوی رشید الدین سے پڑھیں۔

---

[1] ڈاکٹر صاحب تحفۂ زواریہ کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔ "تا مدت پانزدہ سال از حضرت شاہ غلام علی قدس سرہ فیض یاب شد۔ و ہم متبنٰی ایشاں گشتند"۔ [2] شاہ غلام علی قدس سرہ اور خاندان سعیدیہ کے فیض یافتگان کے لیے ایک مستقل کتاب درکار ہے (مطبوعہ کتابوں کے علاوہ) اور اس کے لیے کافی سے زیادہ مواد موجود ہے۔

اخذِ طریقت شاہ صاحب سے کیا۔ اور پھر اس فیض کو عالم میں عام کیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ آپ یا آپ کے ساتھیوں نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں حصّہ لیا۔ کیونکہ اس کے بعد آپ کے دہلی سے مختلف سمتوں میں (بظاہر کسی قدر پریشانی کے عالم میں) جانے کا ذکر ملتا ہے۔ اور دہلی سے آپ کا سلامتی سے نکل جانا (جو ایک مسلمان فوجی عہدہ دار کی سعی سے ہُوا) آپ کے تصرفات میں شمار ہوتا ہے۔ بالآخر آپ مدینہ منوّرہ پہنچے۔ لیکن بزرگوں کا کوئی قدم فیض سے خالی نہیں ہوتا۔ آپ لاہور آئے اور وہاں سے ۲۸ نومبر ۱۸۵۷ء کو ڈیرہ اسماعیل خاں کے قریب موسئے زئی پہنچے۔ جہاں آپ کے محب اور جاں نثار خلیفہ حاجی دوست محمّد قندھاری مقیم تھے۔ اور جس جگہ آپ کی چند روزہ اقامت کی وجہ سے خانقاہ احمدیہ سعیدیہ قائم ہوئی، جس کی بدولت مغربی پاکستان میں سلسلۂ مجددیہ کے دوسرے کئی چشمہ ہائے فیض جاری ہوئے۔

شاہ احمد سعید قدس سرہ نے جو خطوط حاجی دوست محمّد قندھاری کے نام لکھے، انھیں ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب نے (مع چند دیگر خطوط کے) تحفۂ زواریہ کے نام سے شائع کروایا ہے۔ کوئی ڈیڑھ سو صفحے کا مختصر رسالہ ہے۔ اور مکاتیب بھی طویل نہیں۔ لیکن بعض بڑے دلچسپ ہیں۔ مدینہ منوّرہ میں بھی آپ کو خانقاہ (شاہ غلام علیؒ) کا خیال جس طرح بے قرار رکھتا تھا، اس کا اظہار کئی خطوں میں ہے۔ ۹ رجب ۱۲۷۷ھ کے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

مکرر آنکہ اگر چیزے از حال خانقاہ بعد یافت رسیدہ باشد۔ ازاں نیز مطلع سازند کہ کدام درویش درانجا مقیم گردید۔ نیز صورتِ آبادیش رسیدہ یا نہ

ایک اَور خط میں ہے:۔

لازم کہ پیوستہ بہ نگارش حالاتِ خویش مشتمل بر خیریتِ خود و احوالِ دہلی و احوالِ خانقاہ شریف نوشتہ باشد کہ ازاں اطمینانِ خاطر خواہد شد۔ فکرِ آبادی خانقاہ شریف از ہمہ چیز مدِنظر باشد۔ کہ سعادتِ دارین دراں متصوّر است۔

غالب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ غدر کے بعد دہلی کی ساری دولت لُٹ لٹا کر "حاطۂ پنجاب" میں پہنچ گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آزاد۔ حالی۔ نذیر احمد کے دہلی کی بربادی کے بعد پنجاب میں آجانے سے یہاں اُردو کو فروغ ہوا۔ اور وہ عمل شروع ہوا، جس کی بدولت لاہور اسلامی ہندوستان کا ایک اہم تہذیبی مرکز ہوگیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ اُردو ادب ہی تک محدود نہ تھا۔ روحانی امور میں بھی کچھ اسی طرح کا عمل کارفرما ہوا۔ بالخصوص مجددی سلسلے کو مغربی پنجاب میں ایک بالکل نئی زندگی ملی۔ دہلی کی بربادی کے بعد شاہ احمد سعیدؒ نے جس جگہ سے اپنی امیدیں وابستہ کیں، وہ ڈیرہ اسماعیل خاں کے قریب موسیٰ زئی کا مقام تھا۔ اور جس مخلص اور عقیدت مند بزرگ کو انھوں نے اپنا جانشین کیا، وہ اس علاقے کے حاجی دوست محمد قندھاری تھے۔ بلکہ انھوں نے تو دہلی کی خانقاہ، محل سرائے اور تسبیح خانے کو بھی ان کے سپرد کیا۔ اور یہ سند لکھ دی:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فقیر احمد سعید مجددی عفی عنہ، واضح می نماید کہ فقیر بارادۂ اللہ سبحانہ، از دہلی شریف متوجہ حرمین شریفین گردیدم و خانقاہ و مکانات محلسرائے خود و تسبیح خانہ را حوالہ خلیفۂ خود مقبولِ بارگاہ حاجی دوست محمد صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ نمودہ ام و حاجی صاحب را اختیار دادم کہ سند باشد۔ خواہ خود در آنجا باشند یا خلیفۂ خود را دارند۔ لہٰذا ایں چند کلمہ نوشتہ دادم کہ سند باشد و بوقتِ حاجت بکار آید و صلی اللہ علیٰ خیر خلقہ محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین۔ محررہ بتاریخ شانزدہم جمادی الاولیٰ ۱۲۷۴ھ

یہ سند ۲۸ جنوری ۱۸۵۸ء کی تحریر ہے۔ غالباً موسیٰ زئی میں لکھی گئی یہ وہ زمانہ تھا۔ جب دہلی ابھی مسلمانوں کے لیے قیامت زار بنی ہوئی تھی۔ سند میں دہلی شریف کا اندراج اس بیاباں نورد کی حسرتوں اور محبتوں کا مرقع ہے۔

اس زمانے کی تصانیف بلکہ خطوط سے بھی اس امر پر روشنی نہیں پڑتی، لیکن قیاس ہے کہ موسیٰ زئی، دہلی کے بعض دوسرے اربابِ سلسلہ کے لیے بھی اس

زمانے میں جائے پناہ بن گئی تھی۔ حاجی دوست محمدؒ صاحب کے ممتاز خلیفہ خواجہ محمد عثمانؒ کے ملفوظات میر اکبر علی دہلوی نے جمع کیے تھے۔ ان کی نسبت فوائدِ عثمانیہ کے دیباچے میں جناب "طالوت" ملتانی لکھتے ہیں:۔

میر اکبر علی صاحب کے والد حاجی حافظ میر احمد علی صاحب دہلوی تھے۔ ان کے آباد اجداد محمد شاہ کے زمانے میں خراسان سے آکر دہلی میں آباد ہوئے۔ اور "سرحوکئی خواصان" کے عہدہ پر مامور ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں، ان میں سے اکثر انگریزوں سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ ان کے والد حاجی (دوست محمدؒ) صاحب سے بیعت ہو کر اہل و عیال سمیت موسٰے زئی شریف میں آکر مقیم ہو گئے۔"

شاہ احمد سعیدؒ موسٰے زئی سے (دریا کے رستے؟) ٹھٹھہ نگر (کذا) پہنچے۔ وہاں سے گھوڑا باری کچھ روز قیام کے بعد بمبئی کو روانہ ہو گئے۔ جہاں آپ کی تاریخِ ورود ۲۳ مارچ ۱۸۵۸ء ہے۔ وہاں سے جہاز میں سوار ہو کر حجاز کا قصد کیا۔ چار ماہ کے قریب مکہ معظمہ میں قیام رہا۔ اس کے بعد مدینہ منورہ کی کشش غالب آئی۔ اکتوبر، نومبر میں وہاں پہنچے۔ اور مستقل قیام اختیار کیا۔ اگلے سال جولائی میں آپ کی کتابیں بھی (ڈیرہ اسماعیل خاں کے راستے) بمبئی سے پہنچ گئیں۔ حجاز میں آپ نے سلسلے کا کام باقاعدہ شروع کر دیا۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں کئی لوگ بیعت ہوئے، لیکن اب آپ کی صحت بگڑنی شروع ہوئی اور ۱۹ ستمبر ۱۸۶۰ء کو آپ کا وصال ہو گیا۔ جنت بقیع میں مدفون ہوئے۔ حجاز میں آپ کا کام آپ کے صاحبزادوں نے جاری رکھا۔ ان میں شاہ محمد مظہرؒ اس لیے بھی یاد کے لائق ہیں کہ انھوں نے مسجدِ نبوی کے قریب باب جمعہ کی طرف ایک نہایت خوشنما دو منزلہ خانقاہ[1]

---

[1] اب کسی قدر کہنہ ہو گئی ہے، لیکن پھر بھی بڑا روح افزا مقام ہے۔ افسوس کہ مدینہ منورہ کے آخری سفر (نومبر ۱۹۶۶ء) میں پتا چلا کہ شاید سڑک کی وسعت اور دُوسرے منصوبوں کی وجہ سے یہ متبرک مقام باقی نہ رہے، لیکن کتب خانے کی حفاظت کا پورا انتظام ہو گا۔

رباط مظہریہ تعمیر کرائی۔ اس میں ایک بیش قیمت کتاب خانہ ہے، جس میں علوم اسلامی اور بالخصوص سلسلے کی نادر کتب موجود ہیں۔

مغربی پاکستان میں مجدّدی سلسلہ

حاجی دوست محمدؒ صاحب قندھاری کی اہمیت شاہ احمد سعید صاحب کے

مندرجہ بالا حالات سے ظاہر ہے۔ وہ ایک زمانے میں تین اہم خانقاہوں (اقندہ موسیٰ زئی، دہلی) کے سربراہ تھے۔ افغانستان اور مغربی پاکستان میں آپ سے ہزاروں لوگ فیض یاب ہوئے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ دورِ آخر میں آپ کی بدولت ہی مغربی پنجاب میں سلسلۂ مجددیہ کو استحکام نصیب ہوا۔ وفات ۱۶ فروری ۱۸۶۸ء کو ہوئی۔ ان کے خلیفۂ اعظم خواجہ محمد عثمانؒ تھے۔ جن کے ملفوظات، مکتوبات اور معمولات فوائدِ عثمانیہ میں چھپ چکے ہیں۔ ان کے جانشین ان کے صاحبزادے مولوی سراج الدین تھے۔ خواجہ محمد عثمانؒ کی وفات ۲۷ جنوری ۱۸۹۷ء کو اور مولوی سراج الدین کی ۱۱ فروری ۱۹۱۵ء کو واقع ہوئی۔ یہ دونوں بزرگ اور جناب حاجی دوست محمدؒ صاحب قندھاری موسیٰ زئی میں آرام فرما ہیں۔ ان بزرگوں کی بدولت مغربی پاکستان میں سلسلۂ مجددیہ نے بڑی وسعت پائی۔ اور کئی خانقاہیں قائم ہوئیں۔ ان میں خانقاہ سراجیہ مجددیہ کندیاں شریف (ضلع میانوالی) جس کے موجودہ سربراہ، جامع علم و عرفان، مولانا ابوالخلیل خان محمدؒ صاحب مدظلہ ہیں، اس لیے بھی قابلِ ذکر ہے کہ وہاں کتب صوفیہ، بالخصوص نوادرِ سلسلہ کا ایک بیش بہا ذخیرہ ہے۔

حاجی صاحبؒ کی طرح خواجہ محمد عثمان صاحب بھی خانقاہ دہلی کے سربراہ تھے، لیکن انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں شاہ احمد سعیدؒ کے پوتے شاہ ابوالخیر محی الدین صاحب، جو ہنگامۂ ۱۸۵۷ء سے ڈیڑھ سال پہلے خانقاہ میں پیدا ہوئے تھے۔ حجاز سے آکر وہاں مقیم ہو گئے۔ انھوں نے پرانی روایات پھر تازہ کر دیں۔ موجودہ سربراہ ان بزرگوں کی یادگار جناب ابوالحسن زید فاروقی صاحب مدظلہ ہیں۔